بچوں کے بہترین باتصویر اخبار پریم کے متعلق پنجاب کے مقتدر انگریزی اخبار ٹریبون کی قابل قدر رائے

پریم لڑکوں اور لڑکیوں کا ہفتہ وار باتصویر رسالہ ہے۔ جو مشہور اُردو شاعر مولانا تاجور نجیب آبادی کی ادارت میں شائع ہوتا ہے۔ اسٹاف میں مولانا موصوف کے علاوہ لالہ چرنجیو لال ایم۔ اے دہلوی کا اسم گرامی قابل ذکر ہے۔ سرورق پر بھارت ماتا کی رنگین تصویر ہے۔ اس کے علاوہ ہر پرچے میں تصویریں بھی ہوتی ہیں۔ لکھائی چھپائی دیدہ زیب۔ طرز ادا صاف۔ زبان سادہ جسے ہر اُردو خواں بآسانی سمجھ سکتا ہے۔ مضامین آسان دلچسپ اور بچوں کے لئے ہر طرح موزوں و سبق آموز ہیں۔ رسالہ کی قابل ذکر امتیازی خصوصیت یہ ہے کہ ہر قسم کے فرقہ دارانہ مضامین سے پاک ہے اس کا واحد مقصد یہ ہے کہ بچوں میں اُخوت و ہمدردی کے پاکیزہ ترین جذبات پیدا کئے جائیں۔ ہم اپنے معاصر کی کامیابی کے خواہاں ہیں۔ اور امید کرتے ہیں کہ پبلک اس کا مُناسب طور پر استقبال کریگی +

جناب ڈاکٹر شیخ محمد اقبال

ایم۔ اے۔ پی۔ ایچ۔ ڈی پروفیسر پنجاب یونیورسٹی کی زرّیں رائے

بچوں کا یہ ہفتہ وار باتصویر رسالہ مولانا تاجور نجیب آبادی کے زیر ادارت شائع ہوتا ہے۔ اس کے جاری کرنے سے فاضل اڈیٹر کا مقصد یہ ہے کہ ہندو اور مسلم بچوں کے دلوں میں ابتدائے عمر سے باہمی اتحاد و اُلفت کا بیج بویا جائے۔ کسی کو یہ کہنے میں تامل نہ ہوگا۔ کہ یہ مقصد نہایت قابل عزت ہے۔ مولانا تاجور زبان اُردو کے مشہور ادیب اور ناقد ہیں۔ اور مجھے یہ کہنے کی ضرورت نہیں۔ کہ ان کی نگرانی میں جو مضامین چھاپے جائیں گے ضرور بلحاظ لفظی اور معنوی خوبیوں کے اعلےٰ معیار کے ہوں گے۔

بچوں کے لئے عمدہ نظمیں ہیں۔ سرورق دیدہ زیب۔ لکھائی چھپائی نہایت نفیس۔ اور باوجود ان اوصاف کے چندہ صرف چھ روپے سالانہ ہے۔ میری رائے میں اسکول کے ہر طالب علم کے لئے اس کا مطالعہ ضروری ہے +

۸۶
رجسٹرڈ　　ایل نمبر ۲۴۸۲

فہرست مضامین

جلد (۱)　　بابت ماہ جولائی ۱۹۲۹ء　　نمبر (۲)

تصاویر:- (۱) حسن معصوم سرینگی - (۲) میسولینی - (۳) چشمۂ محبت - (۴) میری لینگھم - (۵) روت اور نومی - (۶) میر ناظر حسین ناظم - (۷) گوئٹے - (۸) شیخ محمد ضیاالدین صاحب شمسی -

کہتی ہے ہم کو خلقِ خدا غائبانہ کیا

جناب خان بہادر سر میاں فضل حسینؒ صاحب ایم۔ اے۔ کے۔ سی۔ آئی۔ ای۔ ریونیو ممبر پنجاب گورنمنٹ۔

آپ کے ارادے نیک ہیں۔ اور خاصکر پہلا ارادہ کہ تحریر آسان فہم ہو۔ مگر ارادہ کو پورا کرنا عربی و فارسی کے عالم کے لئے کچھ آسان کام نہیں۔ میں آپکو آپکے ارادوں میں کامیاب ہونے کیلئے دعا دیتا ہوں۔

کپتان نواب جمشید علی خاں صاحب ممبر یو پی لیجسلیٹو کونسل

آجکل اہلِ نظر عام طور پر یہ دیکھ اور محسوس کر رہے ہیں۔ کہ ہندوستانی نوجوانوں کا ادبی مذاقِ سلیم نہایت پست ہوتا جا رہا ہے۔ اسمیں شک نہیں کہ یوں تو سینکڑوں جرائد و رسائل میدانِ عمل میں گامزن ہوئے اور ہو رہے ہیں۔ مگر ان میں بہت کم ایسے ہیں جو صحیح معنوں میں مقاصد جریدہ نگاری کو انجام دے رہے ہوں۔ زبان کے اعتبار سے اگر ان کو دیکھا جائے تو شاید ہی کوئی ایسا صفحہ نظر آئیگا جسمیں عجیب و غریب تراکیب مشکل و مغلق عربی الفاظ کی کثرت نہو۔ عام اس سے کہ مضمون عام فہم ہو یا نہو۔ سادہ اور سلیس اردو میں نفسِ مضمون ادا ہو سکے یا نہو سکے مگر مضمون نگار کی یہ کوشش ضرور ہوگی کہ شروع سے آخر تک عربی عنصر غالب رہے۔ جب جرائد نگاری کا یہ معیار ہو تو نتیجہ معلوم! یہی لیل و نہار رہے اور یہی روش رہی تو وہ زمانہ دور نہیں جبکہ زبانِ اردو ایک چیستان ہو کر رہجائیگی۔ خیر اس کے متعلق میں کچھ زیادہ کہنا نہیں چاہتا۔

"ادبی دنیا" کا پہلا پرچہ میری نظر سے گذرا رسالے کے اغراض و مقاصد نہایت صحیح اور درست ہیں جو ذرائع اور انتظامات اس کے کامیاب بنانے میں کئے گئے ہیں۔ وہ قابلِ تحسین و مسرت ہیں۔ خدا کرے کہ "ادبی دنیا" اسم بامسمیٰ ثابت ہو اور کارکنانِ جریدہ کی محنت و جانفشانی ٹھکانے لگے۔ سب سے زیادہ قابلِ تحسین بات یہ ہے کہ رسالے کے لئے خاص طور پر اس کا انتظام کیا گیا ہے کہ دنیا کی مختلف زبانوں کے تراجم سلیس اور عام فہم زبان میں شایع کئے جائیں۔

مولانا عبدالوحید صاحب غازی پوری ایڈیٹر روزنامہ مساوات لاہور

"ادبی دنیا" زیرِ تنقید نمبر اس رسالہ کا پہلا ہی نمبر ہے۔ جسے دیکھکر یہ کہنا پڑتا ہے "ادبی دنیا" اردو زبان میں اپنی نوعیت کا سب سے پہلا رسالہ ہے۔ اجراء رسالہ کے مقاصد نہایت مہتم بالشان اور ضروری ظاہر کئے گئے ہیں مثلاً اردو زبان کو دوسری زبانوں کی ملاوٹ سے پاک کر کے ایک نکھری ہوئی زبان بنانا۔ عربی۔ فارسی وغیرہ کے مشکل الفاظ کو کم کرنا۔ دنیا کی تمام ترقی یافتہ زبانوں کے تراجم شایع کر کے اردو ادب کو وسیع کرنا اردو زبان میں جدید الفاظ کا اضافہ اور قواعد اردو میں موجودہ اردو کے مطابق ترمیمات کرنا۔ متنازعہ فیہ ادبی مسائل کی بابت بحث و تمحیص کے بعد ادبی جماعتوں کے فیصلے شایع کرنا۔ اردو شاعری میں ضروری اور اصولی تبدیلیاں کرنا۔ وغیرہ۔

رسالہ کی ضخامت اور ظاہری صورت اسقدر شاندار ہے کہ بلا مبالغہ کوئی اردو کا رسالہ اسوقت اس کا ہم پلہ نہیں کہا جا سکتا ہے۔ کاغذ اور کتابت و طباعت نہایت عمدہ ہے۔ سرورق میں نظر فریبی کے علاوہ خاص جدت ہے۔ ادبی مضامین میں نظم و نثر بھی عمدہ اور بہت ہے ہیں۔ افسانوں کا عنصر بھی کافی ہے۔ دنیائے ادب کے زیرِ عنوان ہندوستان اور بیرون ہند کی تمام ترقی یافتہ زبانوں کے ادبی مضامین کے تراجم پیش کئے گئے ہیں۔ ہندوستانی زبانوں سے ہندی بنگالی پنجابی۔ گجراتی۔ مرہٹی۔ سندھی کشمیری۔ پشتو۔ مدراسی سنسکرت اور بیرونی ادبیات میں سے عربی، فارسی، ترکی، انگریزی، فرانسیسی، جرمنی، جاوی۔ ڈچ۔ ملایا۔ کے ترجمے شایع کئے ہیں۔ آخر میں تین صفحوں پر رسالہ کے مشکل الفاظ کی ایک فہرست لگا دی ہے۔ غرض رسالہ بحیثیت مجموعی قابلِ قدر ہے۔

ڈاکٹر لکشمن سروپ صاحب بی اے۔ پی۔ ایچ۔ ڈی۔ پروفیسر پنجاب یونیورسٹی؛۔

"ادبی دنیا" کے دو نمبر میری نظر سے گذرے۔ میں نہایت وثوق اور مسرت کے ساتھ کہہ سکتا ہوں کہ ادبی دنیا دنیائے ادب میں ایک قابلقدر اضافہ ہے۔ اس نے اردو صحافت کیلئے ایک جدید راستے کا افتتاح کر دیا ہے۔ اور میرا خیال ہے کہ ہندوستان میں یا کسی اور جگہ اس شان کا رسالہ اور کوئی نہیں ہے۔ اس کی تنقیدیں اور ادبی مباحثے نہایت عالمانہ ہوتے ہیں۔ زبان نہایت دلکش صاف اور شستہ۔ "ادبی دنیا" کا اسٹاف اس ادبی کارنامے کے لئے صد تحسین و آفریں کا مستحق ہے۔ میں تہ دل سے اس کی کامیابی کا متمنی ہوں۔

ڈاکٹر بنارسی داس صاحب ایم۔ اے۔ پی۔ ایچ۔ ڈی۔ لیکچرار پنجاب یونیورسٹی۔

میں نے ادبی دنیا کے دونوں نمبر نہایت دلچسپی کے ساتھ پڑھے ہیں۔ اسکی شاندار تصاویر اور مضامین کی دلکش ترتیب دل کو اپنا گرویدہ بنائے بغیر نہیں رہتی۔ ادبی دنیا ابھی بچہ ہے لیکن دنیائے ادب میں جو سرفرازی اسکو حاصل ہے کسی اور کو نہیں ہوسکتی۔ اس کا ہر ایک مضمون اُن اہل علم و اہل قلم کا لکھا ہوا ہے جو اپنے اپنے حلقے میں نہایت ممتاز ہیں۔ ادبی دنیا کی طباعت نہایت دلفریب ہے اور شاندار ہے۔ اور اس کے مقابلے میں قیمت نہایت کم ہے۔ میرے خیال میں اس قسم کے رسالے کی بہت عرصے سے ضرورت تھی جسکو مولانا تاجور نے ادبی دنیا کے اجرا سے پُورا کر دیا ہے۔ اس رسالے کا ایک لاجواب پہلو یہ ہے کہ دوسری زبانوں کے لٹریچر سے بہترین مضامین کے اقتباس دلکش اور پیاری زبان میں ترجمہ کر کے شایع کئے جاتے ہیں۔ مجھے امید ہے کہ موجودہ فرقہ دارانہ کشیدگی کو یہ رسالہ کامیاب طور پر دُور کر دے گا۔ کیونکہ یہ اپنے پڑھنے والوں کی اتحاد کی طرف راہنمائی کرتا ہے۔

مولانا رضا علی صاحب وحشت کلکتوی ایم۔ آر۔ اے۔ ایس (لندن)

"ادبی دنیا" کی دلکشی نے مجھے اپنی جانب کھینچا۔ میں نے اس میں علاوہ اس کے پیمانے کے جو ایک امتیازی شان رکھتا ہے متعدد خصوصیتیں دیکھیں۔ سب سے بڑی اسکا تنوع ہے۔ یکرنگی کے بجائے اسکی رنگینیاں ایک نیرنگ کا عالم پیدا کرتی ہیں

ز فرق تا بقدم ہر کجا کہ می نگرم
کرشمہ دامن دل میکشد کہ جا اینجاست

مولانا عبداللہ منہاس ایڈیٹر مسلم راجپوت امرتسر:۔

اردو اہل قلم کی لٹریری سعی و جہد کا تازہ ترین کارنامہ "رسالہ ادبی دنیا" ہے۔ جو اردو ادب کے مخلص خدمتگزار حضرت تاجور نجیب آبادی کے زیر ادارت اور قلم و ادب کے پختہ کار اور ثقہ رکن سر عبدالقادر کے زیر نگرانی جاری ہوا ہے۔ نمبر اول کے مضامین کے تنوع و ترتیب و انتخاب کی عالمگیری رسالہ کے نام کی موزونیت پر گواہ ہے۔ اور خاص محنت اور جستجو کا پتہ دیتی ہے۔ ہمت وسعی اور حسن مذاق کی جو رُوح اس کے صفحات پر نظر آرہی ہے اس کے پیش نظر ہمیں یہ کہنے میں تامل نہیں کہ یہ اپنے چلر گانہ مقاصد کی تکمیل میں کامیاب ہو جائیگا۔

"ادبی دنیا" تصنیفی اردو کو عام فہم اور اردو ادب کو دوسری علمی زبانوں کے خزانوں سے سرمایہ دار بنائیگا۔ وہ اردو انشاپردازی اور اردو شاعری کے متعلق طلبہ اور نوجوانوں میں صحیح ادبی ذوق پیدا کریگا۔ اردو شاعری کو غیر قدرتی پابندیوں سے آزاد اور موجودہ گرامر کی اصلاح بھی کریگا اس لحاظ سے یہ امر قابل ذکر ہے کہ اردو زبان کا یہ نیا رسالہ ایک مخصوص پروگرام کو لیکر میدان میں نکلا ہے۔ اور اس نے ایک امتیازی وصف کے ساتھ عام سطح سے بلند ہونے کی کوشش کی ہے۔ تمام حامیان ادب اردو کی دعائیں اس کے ساتھ ہیں۔

سید بشیر حسین صاحب بی۔ اے اسسٹنٹ ڈسٹرکٹ انسپکٹر مدارس گجرات

ضخامت۔ کتابت اور پھر محنت اور قیمت کا مقابلہ کیا جائے تو اس ایثار کا وہی لوگ اندازہ کرسکتے ہیں۔ جو قبلہ خان بہادر سر عبدالقادر اور آپ جیسے نامور ادیب ملک کے اس درد اور تڑپ سے واقف ہوں۔ جو آپ دونو اردو کی ترقی کے لئے محسوس کرتے ہیں۔

پنجاب ٹیکسٹ بک کمیٹی نے چند کاپیوں کی خریداری سے کوئی احسان آپ پر یا ادب پر نہیں کیا۔ بلکہ ارکان کمیٹی نے اس خریداری میں اپنے ذوق سلیم کا ثبوت دیا ہے۔ میں آپ کو آپ کی بلند پایہ اور مایۂ ناز محنت و عرق ریزی پر مبارکباد دیتا ہوں۔ کہ آپ ایک ایسے ادبی رسالہ کی بنیاد رکھنے میں کامیاب ہوئے ہیں جسکی مدت سے دنیائے ادب کو ضرورت تھی۔

حضرت مولانا ظفر علی خاں صاحب (اخبار زمیندار):۔

اہل نظر کا وہ طبقہ جو اردو کے مطالعہ کو ہندوستان کی سرکاری تعلیمی عدالتی اور کاروباری زبان کی حیثیت سے دیکھنے کا بدل متمنی ہے۔ یہ سُنکر خوش ہوگا۔ کہ جناب شیخ (سر عبدالقادر) کے زیر نگرانی ایک بلند پایہ ماہانہ رسالہ جس کا نام "ادبی دنیا" ہے۔ علامہ تاجور نجیب آبادی کی ادارت میں نکلنا شروع ہوا ہے۔ اس کا پہلا نمبر صحافت اور طباعت کے گوناگوں محاسن کے ساتھ مرکنٹائل پریس لاہور سے چھپ کر ہماری نظر سے گذرا نظم اور نثر کے متعدد مضامین کے ساتھ جو ۲۰×۲۶ کے بچانوے صفحات پر پھیلے ہوئے ہیں۔ مشرق و مغرب کے اس جدید و قدیم ادبی مرقع میں سات نفیس تصاویر بھی ہیں۔ مضمون نگاروں میں ہندو بھی ہیں۔ اور مسلمان بھی۔ اور اس لحاظ سے اس رسالہ کو ہندوستان کی آنے والی قومیت متحدہ کا نشان بردار سمجھنا چاہئے۔

ڈیلی کرانیکل دہلی:۔

پنجاب اردو زبان اور لٹریچر کی نشوونما کی جو قابل قدر خدمات سرانجام دے رہا ہے "ادبی دنیا" اس میں ایک اہم اضافہ ہے۔ یہ بلند پایہ رسالہ اپنی دلکش ترین معنوی اور صوری خوبیوں کے ساتھ اردو صحافت میں ایک قابل ذکر دور کا آغاز کرتا ہے۔ رسالے کی زبان اس سرمائے کا بہترین آئینہ دار ہے جو اردو نے ادبیات انگریزی سے حاصل کیا ہے۔ انداز بیان نہایت دلکش اور دلفریب ہے۔ مضامین کا تنوع اور ہمہ گیری کے

لحاظ سے اسے موجودہ اردو جرائد میں بلند ترین مقام پر جگہ دی جا سکتی ہے۔ اس کے علاوہ ڈائرکٹر کی حیثیت سے بلند پایہ اردو صحافت کے راہنما سر شیخ عبدالقادر کا اسم گرامی سر برآوردہ اردو رسائل کی صف میں اسے ممتاز اور قابل فخر جگہ دیتا ہے۔

اس وقت جو نمبر ہمارے سامنے ہے اس میں مختلف اہم موضوعات زبان، موسیقی ڈراما۔ ادبی تنقید، مجلس اقوام۔ اخلاقیات، ارتقا اور فلسفہ پر بہترین مضامین ہیں۔ اس کے علاوہ دیگر زبانوں۔ سندی گجراتی۔ پنجابی، کشمیری، پشتو، مرہٹی، تامل۔ بنگالی۔ سنسکرت، فارسی، عربی، ترکی، انگریزی، فرانسیسی۔ جرمن۔ جاپانی، ملایا، ہسپانوی، اطالوی، ڈچ۔ چینی اور لاطینی وغیرہ سے دلچسپ اقتباسات کا دلکش ترجمہ شائع کیا گیا ہے۔ ادبی دنیا ایک عظیم ترین ادبی مہم ہے۔

ہمیں امید ہے کہ مولانا تاجور اور مسٹر حنیف ہاشمی جو ملک کے ممتاز ادیب ہیں اپنی اس قابل رشک مہم میں ضرور کامیاب ہوں گے۔ رسالہ کی کتابت وطباعت اور صوری اور معنوی خوبیوں کے مقابلے میں تین روپے بہت ہی کم قیمت ہے۔ اس کی تلافی ان تمام حضرات کے گرمجوش استقبال سے ہو سکتی ہے جو اردو ادب کی ترقی اور نشو و نما میں دلچسپی رکھتے ہیں۔

جناب اختر سبحانی صاحب بیتاب :۔

"ادبی دنیا" اور پونے چار روپے میں! لوگ کہتے ہیں کہ اسکے مدیر کا دماغ خراب ہو گیا ہے۔ آپ کا کیا خیال ہے؟۔

پروفیسر ارشاد احمد صاحب خلیق ایم۔اے۔ایم او ایل :۔

میں السنۂ مشرقیہ کے ایک استاد ہونے کی حیثیت میں یہ کہہ سکتا ہوں کہ ہمارے محکمہائے تعلیم کو ادبی دنیا جیسے مفید رسالوں کی سخت ضرورت ہے۔ ہمارے طلبہ ملکی زبان سے بیگانہ ہوتے جا رہے ہیں۔ ملکی لٹریچر سے وہ مغلق نگاری کے سبب کوئی فائدہ نہیں اٹھا سکتے۔ ادبی دنیا نے جس شاندار اور مناسب طریقے سے طلبہ کی اصلی ضرورت کو پورا کرنے کی جانب قدم اٹھایا ہے اسکی وجہ یہ ہے کہ اس کا چیف ایڈیٹر ایک کالج کا پروفیسر ہے۔ اور طلبا کی ادبی استعداد کے فقدان سے براہ راست واقف ہے۔ مجھے یقین ہے کہ ادبی دنیا کا مطالعہ طلبا اور ورنیکولر زبانوں کے اساتذہ کے لئے بے حد مفید ثابت ہوگا۔

مولانا نظامی ایڈیٹر اخبار ذوالقرنین بدایوں :۔

"ادبی دنیا" ایک نیا ادبی رسالہ ہے جو حال ہی میں لاہور سے ماہوار شائع ہونا شروع ہوا ہے اس کا پہلا نمبر جو بابت مئی ۱۹۲۹ء ہے ہمارے پاس گذشتہ ہفتہ میں پہونچا ہے اس رسالہ کی نگرانی کا کام سر عبدالقادر بیرسٹر ایٹ لا لاہور نے اپنے ذمہ لیا ہے جن کا نام اردو ادب کی دنیا میں "مخزن" کی وجہ سے اتنی شہرت حاصل کر چکا ہے کہ اب ان کے تعارف کی ضرورت نہیں۔ اسی طرح اس کی ادارت کا بار مولانا تاجور نجیب آبادی جیسے مشہور اہل قلم نے اٹھایا ہے جو اس بات کی ضمانت ہے کہ رسالہ اپنے اس وسیع پروگرام کو جو اس نے اپنی زندگی کا قائم کیا ہے پورا کرنے میں کامیاب ہوگا۔ اس پہلے پرچے میں رسالہ کی اشاعت کے مقصد کو چار مدات میں تقسیم کیا گیا ہے۔ جن کا خلاصہ (۱) تصنیفی اردو کو عام فہم بنانا۔ (۲) اردو زبان کو دوسری علمی زبانوں کے خزانوں سے مالا مال کرنا۔ (۳) اردو انشا پردازی اور اردو شاعری پر آسان زبان میں تعلیمی مضامین لکھ کر نوجوان طلباء میں صحیح ذوق ادبی پیدا کرنا (۴) اردو شاعری کو غیر قدرتی پابندیوں سے آزاد کرکے آزاد زبانوں کی شاعرانہ خوبیوں کا اضافہ کرنا اسی کے ساتھ اردو صرف و نحو میں ضروری تغیر و تبدل کرنا دوسری زبانوں کے ایسے الفاظ کو جن کا مفہوم ہم معنی الفاظ کے مقابلہ میں زیادہ وسیع اور خاص معنی کا حامل ہے اردو میں داخل کرنا۔

مولینا محشر عابدی سکرٹری ینگ مین مسلم ایسوسی ایشن حیدرآباد دکن

پرچہ کا سرورق ہی دیکھ کر بیساختہ منہ سے نکل پڑا۔ ؎

عمرت دراز باشد　　حسنت مدام ماند

یقیناً اس پرچہ (ادبی دنیا) کے اجراء سے دنیائے ادب میں آپ نے ایک انقلاب پیدا کر دیا ہے اور اب ہندوستان بھی فخر کر سکتا ہے کہ اس میں بھی ایسے رسائل شایع ہوتے ہیں جو یورپ کے ممتاز رسائل کے مقابلہ میں پیش کئے جا سکتے ہیں۔ کیا بہ لحاظ، مضامین اور کیا بہ لحاظ تصاویر۔

ہندوستان کی انتہائی خوش نصیبی ہے کہ عرصۂ دراز کے بعد وہ اس قسم کا رسالہ اردو میں شایع کر سکا جس کی ٹکر کا یہاں کسی اور زبان میں ایسا رسالہ موجود نہیں۔ باوجود متعدد برسوں کے کوئی اردو رسالہ، دنیائے ادب میں کوئی انقلاب پیدا نہ کر سکا۔ اور نہ کسی نے وہ مقاصد پیش نظر رکھے جو "ادبی دنیا" نے اب ناظرین کے سامنے پیش کئے ہیں۔

"ادبی دنیا" کے مقاصد نہایت مفید اور اعلیٰ پایہ کے ہیں اور میرا خیال ہے کہ اردو رسائل کو اس کی تقلید کرنی چاہئے۔ اور "ادبی دنیا" کے مقاصد مدِ نظر رکھکر انہیں ترقی دینی چاہئے۔

میرا دل کبھی رسالہ کی شان و شوکت سے اسقدر جلد متاثر نہوا تھا جتنا "ادبی دنیا" کو دیکھکر۔ اور میں سمجھتا ہوں کہ جو شخص اس رسالہ کا مطالعہ نہ کرے۔ اس سے زیادہ بد مذاق اور کوئی نہیں ہو سکتا۔ دنیا بھر کی زبانوں

کا ایک کتابی صورت میں مجتمع کرنا۔ یقیناً بہت ہمت اور جرأت کا کام ہے شاید ہم خیال بھی نہ کرسکتے کہ ہندوستان کا ایک رسالہ یہ تمام باتیں مہیا کرسکتا ہے۔ مضامین جس قدر بلند پایہ ہیں وہ کسی تعریف کے محتاج نہیں۔ تصاویر جسقدر موزوں اور بلند معیار کی ہیں۔ اسکا اظہار بھی ناممکن ہے، غرض "ادبی دنیا" اسم بامسمٰی "ادبی دنیا" ہے۔ میں آپ کو تہ دل سے مبارکباد پیش کرتا ہوں۔ اور دعا کرتا ہوں۔ کہ خدا تعالیٰ رسالہ کو روز افزوں ترقی عطا فرمائے۔ اور خدا کرے "ادبی دنیا" دنیائے ادب میں ہمیشہ برقرار رہے۔

سردار موہن سنگھ صاحب دیوانہ ایم اے لکچرار پنجاب یونیورسٹی

"ادبی دنیا" سر عبدالقادر اور مولانا تاجور کا دنیائے ادب پر تازہ ترین اور گراں تر احسان ہے۔ محترم شیخ صاحب نے اردو کے حسین طفلی سے ایک عالم کو آگاہ کیا۔ اب ادبی دنیا اس نازنین کے آغاز شباب کے جلوے عیاں کریگا۔ زبان، بیان، مضمون غرض کہ ہر اعتبار سے "ادبی دنیا" اپنے "پنجابی بھائیوں" سے ابھی سے گوئے سبقت لے گیا ہے۔

مسٹر رشید احمد صاحب ایم۔ اے ایم آر اے ایس (لنڈن)

ادبی دنیا کا یہ مقصد کہ "ہندوستان کے لئے ایک عام فہم آسان تصنیفی زبان بنائی جائے" اس قدر اہم اور اتنا ضروری ہے کہ ہر بہی خواہ وطن کو اس مقصد کے حاصل کرنے کے لئے اپنے دل میں قیس عامری کا سا دنو طلب پیدا کرنا چاہئے۔ ادبی دنیا کی یہ خصوصیت کہ مشرق و مغرب کی علمی زبانوں کے بلند پایہ مضامین سے اقتباسات پیش کئے جاتے ہیں۔ اس رسالے کو نہ صرف اردو نہ صرف ہندوستان بلکہ دنیا کی تمام زبانوں کے تمام علمی رسائل میں ممتاز بنا دیتی ہے۔

خان بہادر سردار بہادر لفٹننٹ ڈاکٹر احمد اللہ خاں صاحب آئی ایم ڈی۔ آئی او ایم۔ او بی۔ ای۔

رسالہ ادبی دنیا کو دیکھ کر بمشکل یہ یقین آتا ہے کہ یہ ہندوستان کا کوئی لٹریری پرچہ ہے۔ یعنی اردو حروف کی بجائے ٹائیٹل پر اگر انگریزی الفاظ ہوں تو "امریکن میگزین" کزموپالیٹین یا لٹریری ڈائجسٹ کا کوئی نمبر معلوم ہوگا۔ بے شبہ اس جیسا شاندار پُر تنوع اور خصوصیات کا رسالہ ہندوستان کی کسی زبان میں نہیں شایع ہوتا۔ اور ان خصوصیات کا اسقدر سستا رسالہ تو دنیا کی کسی زبان میں بھی نہ ملیگا۔

ملک سلیمان خاں صاحب بی اے پی سی ایس مجسٹریٹ درجہ اول امرتسر

"رسالہ ادبی دنیا" جاری کرکے آپ نے اردو ادب کے ایک نہایت شاندار اور جدید دور کا آغاز کیا ہے۔ دوسرے رسالوں کے مقابلے میں اسکی زبان آسان متین اور سلجھی ہوئی ہے۔ مضامین سنجیدہ دلچسپ اور مفید ہیں۔ پھر لطف یہ کہ لڑکوں، نوجوانوں، ادھیڑوں بوڑھوں۔ مردوں عورتوں سب کے لئے اس میں دلچسپی کا سامان ہے۔ ادبی دنیا کو میرے بچے بھی پڑھتے ہیں۔ میرے گھر کی مستورات بھی پڑھتی ہیں اور میں بھی پڑھتا ہوں۔ اور ہم سب اپنی اپنی استعداد ادبی کے مطابق اس سے فائدہ اٹھاتے ہیں۔ ادبی دنیا کے جاری ہونے کے بعد اب کوئی شخص منہ اٹھا کے یہ نہیں کہہ سکتا۔ کہ اردو جرنلزم میں دھرا ہی کیا ہے۔ مولانا! سچ یہ ہے کہ آپ نے جس تندہی اور قابلقدر ایثار سے حاسدانہ فضا اور ناخوشگوار حالات میں ہمارے صوبے میں علمی خدمات سرانجام دی ہیں ہم اہل پنجاب ہمیشہ آپکی گراں مایہ خدمات کو شکر گذاری اور محبت سے یاد رکھیں گے۔

سردار اودے سنگھ شائق بی اے ایل ایل بی وکیل فیروزپور

سرسید کے بعد سر عبدالقادر "فادر آف اردو" کہلانے کے مستحق ہیں۔ سرسید نے اردو کے لئے ایک مناسب فضا پیدا کردی تھی مگر سر عبدالقادر نے اپنی درخشاں ادبی خدمات سے اس فضا کو روشن کر دیا ہے۔ علامہ تاجور علمی سرگرمیوں میں سر عبدالقادر کے ایک بہادر، بلند حوصلہ اور اپنی دھن کے پکے لفٹننٹ ہیں۔ ان دونوں حضرات نے اپنی رہنمایانہ امداد سے اردو زبان کو یادگار زمانہ مصنف، ادیب اور شاعر دیئے۔ اردو کا تصنیفی دور سرسید کے بعد انہیں حضرات کی کوششوں سے نشو و نما پا رہا ہے۔ "ادبی دنیا" کی شان اور امتیازی خصوصیات کا پرچہ اس سے پہلے ہندوستان میں جاری نہیں ہوا۔ اسے دیکھ کر کون کہہ سکتا ہے کہ اردو زبان خوش قسمت نہیں ہے۔ مولانا حنیف ہاشمی کی ہمہ گیر انشا پردازی ادبی دنیا کو اپنے معاصرین سے ممتاز بنا رہی ہے۔

میں اس گروہ سے (سکھ قوم) ہوں جو سیاسی نقطۂ نظر سے اردو سے غیر مانوس رہنا چاہتا ہے۔ لیکن ایک ہندوستانی ہونے کی حیثیت سے میں اپنے ملک کے اس قابل فخر رسالے کو دل سے خوش آمدید کہتا ہوں اور دو سو روپے کی حقیر رقم کا چک بطور ہدیہ ارسال خدمت کرکے اپنی ہمدردی کا عملی ثبوت پیش کرتا ہوں[1]۔

---

[1] سردار صاحب کی شرف نگاہی اور حوصلہ افزائی کا شکریہ۔ میرے لئے یہ مسرت بہت کافی ہے کہ میری ناچیز خدمات کو میرے احباب پسند فرماتے ہیں۔ چک واپس کر رہا ہوں۔ تاجور

عرضِ حال

"ادبی دنیا" کا تیسرا نمبر شائع ہو رہا ہے۔ اسے شائع کرتے ہوئے ہم خدائے برتر کا شکر ادا کرتے ہیں کہ وہ ہمیں اپنی بساط کے مطابق کام کرنے کی توفیق عنایت کر رہا ہے۔ اس نمبر کے مضامین دوسرے کی بہ نسبت زیادہ محنت سے تیار کئے گئے ہیں۔ اس کی تصویریں تعداد میں زیادہ، حجم میں بڑی اور شان میں بڑھ چڑھ کر ہیں۔ خدا ہماری اس دلی خواہش اور تمنا کو کامیاب فرمائے کہ ہم اسی طرح ہر دوسرا نمبر پہلے نمبر سے بڑھا چڑھا کر شائع کرتے رہیں۔

بعض اہلِ قلم نے ہمارے بھیجے ہوئے زرِ معاوضہ کو واپس کرتے ہوئے لکھا ہے کہ آپ مشرق کو مغرب بنانا چاہتے ہیں مگر یاد رکھئے کہ "مشرق مشرق ہے اور مغرب مغرب اور یہ دونوں کبھی نہیں مل سکتے"۔

بات یہ ہے کہ ہم نے اپنے مقررہ اصول کے مطابق اپنے سب اہلِ قلم کو معاوضہ بھیجا تھا۔ اور اس اصول پر اس سختی سے پابندی کی گئی تھی کہ ادبی دنیا کے محترم نگراں کی خدمت میں بھی اُن کے گراں مایہ مضمون کا معاوضہ ارسال کر دیا گیا تھا۔

ان اہلِ قلم میں سے کچھ حضرات نے تو ہمارا حقیر ہدیہ قبول فرما کر ہماری عزت بڑھائی تھی اور کچھ سرپرستوں نے اظہارِ ہمدردی کے طور پر معاوضہ واپس کر دیا تھا۔

بعض احباب نے معاوضے کے لفظ کو اپنے خلوص کی توہین سمجھ کر آئندہ سے اپنے مضامین کے لئے یہ لفظ استعمال کرنے کی ممانعت کر دی۔ کچھ کرم فرما ایسے بھی ہیں جنہوں نے معاوضہ کی رقم کو اپنے مضمون کے مقابلے میں کم بتایا۔ ہمارے محترم رہنما سر عبدالقادر سرے سے اس اصول ہی کے خلاف ہیں کہ ہر مضمون نگار کو معاوضہ ضرور دیا جائے۔

جن اہلِ قلم نے ہمارے حقیر ہدیہ کو منظور فرما لیا ہے۔ اُن کا شکریہ اور جنہوں نے ہمدردانہ انداز میں اُسے واپس کر دیا اُن کا بھی شکریہ۔ جو احباب اِس لفظ کو اپنے خلوص کی توہین تصور فرماتے ہیں۔ اُن سے معافی کے طلبگار۔ اور جو گراں پایہ ادیب زرِ معاوضہ کو کم بتاتے ہیں۔ اُن کی خدمت میں اس حقیقت کا اعتراف ہے اور ساتھ ہی یہ تمنا بھی کہ ہم اُنکی قدر کو پہچاننے اور پہچان کر قدر شناسی کا فرض ادا کرنے کے قابل ہو جائیں۔

مضامین پر معاوضے کی رسم ہم نے اس لئے جاری کی کہ جب ساہوں کے مالک رسالے جاری کر کے رسالے کی کمائی میں اپنے ذاتی اخراجات پورا کرتے ہیں۔ کاتب۔ پریس۔ کاغذ۔ ایڈیٹر۔ منیجر۔ چپراسی۔ ڈاک وغیرہ پر صرف کرتے ہیں۔ تو پھر مضمون نگار غریبوں نے کیا قصور کیا ہے؟ کہ ان کے لئے مفت گیر اور مفت خور بنجائیں۔

دوسرے یہ کہ معاوضے کی رسم جاری ہو گئی تو لٹریچر کی پستی دُور ہو جائیگی۔ ادبی رسالے بھرتی کے مضامین شائع کرنے بند کر دیں گے۔ معاوضہ لیکر لکھنے والے بیگاری کی طرح جو کچھ سُوجھا اُسے دھر گھسیٹنے سے قلم کو روکینگے اور معاوضہ دیکر لکھوانے والے ٹھوک بجا کر اچھے اور بلند مضامین چھاپیں گے۔ اور اس طرح ادبِ اردو "ادبِ عالیہ" کا رتبہ حاصل کر سکے گا۔

البتہ ہمیں مضامین کا معاوضہ ادا کرتے ہوئے ایک نیا تجربہ ہُوا جسکا ابتدا میں یا تو خیال نہ آیا تھا یا ہم نے اس پر غور نہیں کیا تھا۔ وہ یہ کہ بعض مضمون نگاروں کے مضامین اپنے خیالات اور مطالب کی حیثیت سے تو بلند اور مفید ہوتے ہیں۔ مگر کم مشقی کے سبب زبان اور پیرایۂ بیان کی رُو سے وہ اس قابل نہیں ہوتے کہ اُنہیں شائع کیا جا سکے۔ مضامین کو رد کر دینا تو ہونہار ادیبوں کی حوصلہ شکنی ہے۔ اور کانٹ چھانٹ کئے بغیر شائع کرنا رسالے کے معیار کو پست کر دینا ہے ہم نہ اس پر راضی ہیں نہ اُس پر خوش۔

اب تک یہی ہوتا رہا ہے کہ اس قسم کے مضامین کو عام حالات میں بہت کچھ ردّ و بدل کے بعد اور کبھی کبھی ازسرِ نو لکھ کر درج کیا گیا ہے۔ اور اُن پر معاوضہ نہیں دیا گیا۔ اور نہ انصافاً ایسے مضامین معاوضے کے مستحق ہو سکتے ہیں۔ معاوضہ ہم اُنہیں مضمون نگاروں کو دیتے ہیں اور دیں گے جن کے مضامین میں ہمیں برائے نام تبدیلی کرنی پڑے۔ کیونکہ درمیانہ درجے کے مضامین کو معاوضہ دیکر شائع کرنے سے یہ بہتر ہوگا کہ ہم اپنے اسٹاف میں ایک اچھے ایڈیٹر کا اضافہ کر لیں۔ اور اپنے بلند معیار کے مطابق اُس سے بلند پایہ مضامین لکھوائیں۔

تاجور

آئینۂ عالم

کیا جرمنی میں شہنشاہیت پھر قائم ہو جائیگی؟

کیا جرمنی میں شہنشاہیت پھر قائم ہو جائیگی؟ - وہ دن جب قیصر برلن میں واپس آئیگا جرمنی کی جمہوریت پسند لوگوں کے لئے نہایت پریشان کن ہوگا۔ اور انکا اور سوشلسٹوں کا خیال ہے کہ یہ دن کبھی نہیں آسکتا۔ لیکن ملک میں کچھ دنوں سے ایسے آثار نظر آرہے ہیں اگرچہ یہ نہیں کہا جاسکتا کہ جرمن خیالات کو ان میں کہاں تک دخل ہے اور یہ امر نظر انداز کرنے کے قابل نہیں ہے کہ ابھی کچھ زیادہ عرصہ نہیں ہوا جبکہ جرمنی کی قومی پارٹی کی طرف سے قیصر کو گرمجوش اور پُرتپاک مبارکباد پیش کی گئی تھی۔ چنانچہ جرمنی کا ایک باثر اور مقتدر اخبار لکھتا ہے :-

"بہت کم جرمن لوگ ایسے ہونگے جو ماضی کے ان ایام کو مڑکر افسوس سے نہ دیکھتے ہوں۔ جب ہم ایک آزاد اور خود مختار قوم کی حیثیت سے اپنے اس والیٔ ملک کی سالگرہ کے روز جس کو تمام جرمن قوم اپنا شہنشاہ ان کہتی تھی خوشی کے نعرے لگاتے تھے اور اس کی خدمت میں مبارکباد پیش کرتے تھے۔

"ہم میں سے اکثر لوگ یہ سننے کے لئے بھی تیار نہ ہوں گے کہ گذشتہ جنگ عظیم کے آغاز تک شہنشاہ ولیم ثانی کا عہد حکومت جرمنی کیلئے بہترین اور خوشحال ترین عہد حکومت تھا۔

"لیکن اس میں کسی کو کلام نہ ہوگا کہ اس کے عہد میں ہم ولیم اول اور پرنس بسمارک کے عہد کی مصیبتوں کا ثمرہ اٹھا رہے تھے۔ تجارت اور صنعت وحرفت ترقی پر تھی۔ مزدوروں کی کافی آمدنی تھی۔ بے روزگاری کی صورت بھی نظر نہ آتی تھی۔ زراعت سرسبز تھی۔ علم وفن گورنمنٹ کی مدد سے نہایت تیزی سے ترقی کر رہے تھے۔

"مالی حالت نہایت اچھی تھی اور ٹیکس اسقدر کم تھے کہ آجکل لوگ اس امر کا اندازہ نہیں کرسکتے کہ ان دنوں حکومت کا کاروبار کس طرح چلتا تھا۔

"یہ الزام کہ قیصر دوسرے جرمنی شہزادوں کو مٹا کر شہنشاہی کو مضبوط کرنا چاہتا تھا کچھ حقیقت نہیں رکھتا۔

"حکومت کی باگ اس عظیم الشان شہنشاہ کے ہاتھ میں تھی جو صرف اپنی ذاتی زندگی میں ہی لوگوں کے لئے ایک درخشاں مثال نہیں تھا بلکہ اپنی رعایا کا بہترین حکمران تھا جو جرمنوں کو کبھی نصیب نہ ہوا تھا۔ مزدور جماعتوں کی بہبودی کے لئے سوشل خدمات کرنے میں جرمنی یورپ کی سب طاقتوں سے آگے تھا۔

"قیصر جرمنی کے جنگی بیڑے کا ان تھک سرپرست تھا۔ وہ اس کو اپنے ملک کی تیزی سے بڑھتی ہوئی طاقت کی سپر خیال کرتا تھا۔

"سکاگرک کی چٹان کے معرکے میں اس جنگی بیڑے نے اپنی قوت و طاقت کا مظاہرہ کیا تھا اور ہر جگہ یہ جرمنی بیڑا اپنی شجاعت بہادری اور عزم کے لحاظ سے نہایت حیرت انگیز اور قابل تعریف ثابت ہوا تھا۔ جرمن سپاہ بھی زمانے بھر میں لاجواب تھی۔ قیصر نے اس زبردست فوج کو اپنے دادا سے وراثت میں لیا تھا اور اپنی فیصلہ کن شجاعت اور پیش بینی سے اس کی ہیبتناک طور پر توسیع کی تھی اور میدانی فوج کے لئے ایک خوفناک توپخانہ اس کا ذاتی کارنامہ تھا۔ چنانچہ جرمنی کے لوگوں کی یہ حالت تھی جب وہ شہنشاہی اور جرمنی تخت کے زیرنگیں تھے۔

"لیکن شروع ہی سے قیصر کی شخصیت کے خلاف کینہ اور حسد سے بھری ہوئی آواز اٹھائی گئی اور اس امر کو بھی نظرانداز نہ کرنا چاہئے کہ قیصر کی مصیبت کا آغاز اس وقت سے ہوتا ہے جب بسمارک کو انتظام سلطنت سے علیحدہ کردیا جاتا ہے۔

واقعات کو دیکھکر جرمنی کے لوگوں کی نگاہیں اپنے آقا کے خیال سے تیرہ وتار ہوجاتی ہیں اور اس سے بیرونی دنیا میں ایک ہنگامہ برپا ہو جاتا ہے۔

ہم اس کی غلطیوں کو چھپانا نہیں چاہتے لیکن جسقدر مکروہیوں کو اس کی طرف منسوب کیا جاتا ہے وہ تمام اس میں نہیں ہیں۔"

پریذیڈنٹ ہوور اور قانون

ریاستہائے متحدہ امریکہ کا نیا پریذیڈنٹ مسٹر ہوور نئے قانون کے جاری کرنے اور اہم مسائل کا فیصلہ کرنے کے دعووں کے ساتھ میدان میں آیا تھا۔ ان تمام وعدوں اور امیدوں کا پیش خیمہ جمہوریت کی قانون شکنی ہے۔ عام پبلک میں یہ مرض ادب لطیف کی حد تک پہنچ چکا ہے۔ دیگر قوانین شراب ٹریفک جنرل [illegible] کے علاوہ ان کو توڑنے سے ۲ ہزار

پونڈ جرمانہ اور پانچ سال تک قید کی سزا دی جاتی تھی۔ دیگر مجلسی قوانین اس کثرت کے ساتھ توڑے جاتے ہیں کہ کسی اور ملک میں ان کی مثال ملنا مشکل ہے۔ "ممانعت شراب" کے قانون کو لاکھوں آدمی روزانہ توڑتے ہیں۔ جمہوریت کے گورنر، میئر، جنرل، وکلاء، سینٹ کے ممبر، قانون ساز۔ اور وہ لوگ بھی جن کا فرض پبلک میں اس قانون کی نگرانی ہے اس قانون شکنی میں عوام کے ساتھی ہیں۔ اور جام پر جام لنڈھاتے ہیں ممکن ہے کہ موجودہ پریذیڈنٹ کے عہد میں اس قانون کا خاتمہ ہو جائے جس کی بنا اُن ہولناک جرموں پر ہے جو شراب نوش سوسائٹی کے ممبروں سے بکثرت سرزد ہوتے ہیں۔ شراب نوشی کے جرائم میں خدا جانے کسقدر اضافہ ہوگا جبکہ آج کل ریاستہائے متحدہ میں قتل کی وارداتوں کی تعداد گیارہ ہزار سالانہ ہے اور قتل کرنے والوں میں سے تقریباً نصف گرفتار ہوتے ہیں جن کا چھٹا یا ساتواں حصہ پھانسی پاتا ہے۔ اگر حساب کیا جائے تو امریکہ میں قتل انسان کی وارداتیں بیس گنا اور چوری کی تیس گنا اور ڈاکے کی پچاس گنا برطانیہ سے زیادہ ہوتی ہیں۔

اطالیہ اور بحیرہ قلزم

فرانسیسی ترکی معاہدہ جس کی رو سے ان دونوں ملکوں کے تمام اہم مسائل کا فیصلہ ہو جاتا ہے انگورہ پہنچ چکا ہے۔ اب کچھ عرصے بعد پیرس میں دوستانہ گفت و شنید ہوگی اور اس ڈرامے کا آخری سین کاغذات پر دستخط ہونے کے ساتھ ختم ہو جائیگا۔ لیکن اطالیہ کے جدید طرزِ عمل نے فرانس کو نہایت پریشان کر دیا ہے۔ کیونکہ اس کے خیال میں میسولینی کا رویہ اس معاہدے کی تکمیل کے اطمینان سے کہیں زیادہ پریشان کن ہے۔ انگورہ کے جنگی بیڑے کی تعمیر اطالیہ کی بندرگاہوں پر ہو رہی ہے اور ترکی افسروں کی تربیت اور جنگی بیڑے کی نگرانی کے لئے اطالوی بحری مشن کی خدمات جن کو پیشتر ازیں برطانیہ سرانجام دیتا تھا حاصل کی گئی ہیں۔ یونان اپنی ہمسایہ ترکی کی اس تیاری سے خائف نظر آتا ہے اور اپنے جنگی بیڑے کی تعمیر برطانیہ اور فرانس کے ہاتھ میں دینا چاہتا ہے۔ اطالیہ اس امر کو کبھی گوارا نہیں کر سکتا۔ یونان کے ساتھ بھی اُس کے دوستانہ معاہدے ہیں وہ لازمی طور پر یونان اور ترکی کے تعلقات کو خوشگوار بنانے کی کوشش کریگا۔ چنانچہ اگر وہ اس میں کامیاب ہو گیا تو ایک وقت آئیگا جب بحیرہ قلزم کی تمام بحری طاقت اس کے اشارے کی سرکردگی میں اُس کی پُشت پر ہوگی۔

پارلیمنٹ کی جدید شخصیتیں

انتخاب سے پارلیمنٹ میں چند جدید اور دلچسپ شخصیتوں کا اضافہ ہوگیا ہے۔ یہ پارلیمنٹ میں پہلی بار آئی ہیں۔ ان میں مسٹر نارمن۔ اینجل مصنف "گریٹ الیوژن" موجودہ ایڈیٹر "فارن افیرز" اور پروفیسر پی جے نوئیل بیکر فیلو آف کنگز کالج کیمبرج۔ بین الاقوامی اتحاد اور صلح کے پُرجوش مبلغ اور پرچارک ہیں۔ پروفیسر نوئیل بیکر مجلس اقوام کے اکثر عہدوں پر فائز رہ چکے ہیں ۱۹۲۴ء اور ۱۹۲۶ء کے درمیانی عرصہ میں آپ اقتصادیات کے کالج میں بین الاقوامی تعلقات کے پروفیسر تھے۔ برطانوی یونیورسٹیوں کی طرف سے انڈیپنڈنٹ نمائندے کی حیثیت سے مس راتھ بون کا انتخاب بھی نہایت دلچسپ ہے۔ مس موصوف تحریک نسواں کی پہلی ممتاز خاتون ہیں جنہیں پارلیمنٹ میں جگہ ملی ہے۔ خیال کیا جاتا ہے کہ اپنے وسیع تجربہ اور علم سے وہ پارلیمنٹ میں ایک نئی فضا پیدا کر دینگی۔ اور یہ امر کہ متحدہ یونیورسٹیوں سے ایک ایسی شخصیت کو اپنی نمائندگی کے لئے انتخاب کیا ہے جو کسی پارٹی سے بھی تعلق نہیں رکھتی۔ اس انتخاب کی اہمیت کو ظاہر کرتا ہے خاتون ممبروں میں مس میری اگینز ہملٹن بھی خاص طور پر قابل ذکر ہیں۔ یہ ایک ممتاز انشاپرداز اور بڑی نقاد ہیں۔ ادبی مذاق کے لوگ آپ کے دلکش انداز بیان سے اچھی طرح واقف ہیں۔ دیگر ممبروں میں مسٹر جے۔ ایف۔ ہوربابان ر کارٹونسٹ۔ مسٹر سانڈرس جس نے مسٹر سکلات والہ کو بیٹرسی میں شکست دی تھی اور نیو یسٹر کا ایڈیٹر مسٹر فلینر یا کو بھی قابل ذکر ہیں۔

جاپان اور رومن رسم الخط

مغربی تہذیب و تمدن نے مشرق کو بہت بُری طرح پچھاڑا ہے۔ اور اب یہ حالت ہے کہ مغرب کی ہر ناروا سے ناروا بات پر بھی اس کو آمنّا و صدقنا کہے بغیر چارہ نہیں۔ تہذیب یا دوسرے الفاظ میں مصنوعی زندگی کی اس ملمع سازی اور ظاہری زرق برق نے نگاہوں کو اسقدر خیرہ کر دیا ہے کہ ہمیں مغرب کے نقشِ قدم کے سوا ترقی کا اور کوئی راستہ ہی نظر نہیں آتا۔ ایشیائی ممالک میں جاپان تہذیب و ترقی میں سب سے پیش پیش ہے۔ لیکن بدقسمتی سے وہ بھی اپنے آپ کو مغرب ہی کے گوشت پوست کا ایک جزو سمجھتا ہے۔ مغربی تہذیب کی زنجیروں کو مضبوط کرنے کے لئے وہاں بھی رومن حروف کو روشناس کرایا گیا تھا۔ ابتدا میں تو چند سر پھرے۔ لوگوں نے اس کی مخالفت کی لیکن اب یہ حالت ہے کہ تحریر کا مستند ذریعہ تسلیم کر لیا گیا ہے ایک لاکھ صنعتی اسکولوں کی کتابیں ان حروف میں شایع ہوتی ہیں۔ جاپانی لکھنے کے لئے ان حروف کے ٹائپ رائٹر بھی تیار کئے گئے ہیں وہ اسوقت تک ہزاروں کی تعداد میں فروخت ہو چکے ہیں۔

پروفیسر دانیال جونز جو ایک ممتاز انگریز زبان دان اور ماہر صوتیات*

---

* ہیں اس تحریک کے بہت حامی ہیں ان کا خیال ہے کہ رومن حروف جاپانی زبان کے لئے وہ خدمت انجام دیتے ہیں جو بین الاقوامی اشارات صوت بھی نہیں دے سکتے۔ کیونکہ جاپانی زبان میں وہ آوازیں پائی جاتی ہیں جو کسی اور زبان میں نہیں ہیں۔ (ایڈیٹر)

میسولینی

اس سے پیشتر میرے ذہن میں میسولینی کی ایک خود ساختہ تصویر تھی لیکن یہ کوئی دلکش یا دلفریب تصویر نہ تھی بلکہ کہا جاسکتا ہے کہ آجتک کسی شخص نے اپنے ذہن میں اس کی ایسی تصویر نہ بنائی ہوگی۔ میرے خیال میں وہ ایک مہیب صورت چوڑے شانوں اور چپٹے رخساروں والا انسان تھا۔ اس کی تاریک اور خوفناک ابروؤں کے نیچے دو انگارہ سی غضبناک آنکھیں فروزاں تھیں۔ جن کے تصور سے جسم میں ایک لرزہ خیز لہر دوڑ جاتی تھی۔ چہرے پر ہمیشہ غور و فکر کی افسردگی اور روح کی تباہ کاری جھلکتی تھی۔

میں یہ کہوں گا کہ آجتک کسی شخص نے اس کی اس قدر مہیب تصویر اپنے تصور میں نہ کھینچی ہوگی

لیکن میں اُمید کرتا ہوں کہ مجھے تصور کی اس قسم کی پیکر نگاری پر معذور سمجھا جائیگا۔ .... گو میں نے اسے خود بخود نہیں بلکہ اطالوی آرٹ کے نمونوں کو سامنے رکھ کر بنایا تھا۔ کئی سال پیشتر جب میں متواتر کئی ہفتے اطالیہ میں رہا میں نے قدیم فن تعمیر کے کھنڈرات پر ایسی تصویروں کو نہایت تاریک نگاہوں اور وحشیانہ انداز میں راہروں کو گھورتے دیکھا تھا۔ ان تصاویر کی دیواروں پر اس قدر کثرت تھی کہ وہ نادانستہ طور پر ذہن میں نقش ہو جاتی تھیں اُن سے بالشت بھر جگہ بھی بچی ہوئی نہ تھی۔ چنانچہ میری میسولینی کی تصویر میں بھی رحم و ہمدردی کے جذبات نہ تھے۔ میں یہ بھی کہنے کو تیار ہوں کہ جن نمونوں کو دیکھ کر میں نے اس کی تکمیل کی ہے ان میں بھی یہ جذبات نہ تھے اور اسکے علاوہ خود میسولینی کی تصاویر میں جو میں نے دیکھا تھا شکل و صورت نہایت مہیب ہے۔ رخسار چوڑے ہیں اور ایک بازو اس طرح پھیلا ہے گویا ضرب لگانا چاہتا ہے۔ چہرے کے انداز اور پیشانی کی شکنوں سے معلوم ہوتا تھا کہ وہ کسی کو لڑائی کیلئے للکار رہا ہے۔ یہ اسکی زندگی کے کارہائے نمایاں تھے جو اسکی ذہنی تصویر بنانے میں میرے بہت حد تک شریک رہے تھے۔ میں اسکی زندگی کے زخار سمندر کی طوفانی موجوں پر غور کرتا تھا جو غیظ و غضب میں دنیا کی ناانصافیوں اور دروغ بافیوں کی چٹانوں پر زور شور سے ٹکراتی تھیں اور اُلٹا پھرنے کی بجائے ان کو پاش پاش کر کے آگے بڑھی چلی جاتیں۔ میری روح ان کی شورشوں میں محو ہو جاتی اور خیال کا موقلم پیکر نگاری میں لگ جاتا چنانچہ اُن کا نمونہ کا مجمل سا نقشہ ان الفاظ میں کھینچا جا سکتا ہے۔

میسولینی ایک گمنام گاؤں میں ایک لوہار کے گھر پیدا ہوا جو خود بھی عمر بھر ان منظم ناانصافیوں اور حق تلفیوں کے خلاف بغاوت کرتا رہا تھا۔ جو اس زمانۂ تہذیب میں قانون کی رو سے روا رکھی جاتی ہیں اور اسی بنی نوجوئز کے نام پر اُس کا نام رکھا گیا۔ جس نے شمالی امریکہ کی سرزمین میں آخری شہنشاہی حکومت کو پامال کر کے میکسیکو کی جمہوریت قائم کر دی تھی۔ گہوارہ سے لیکر اس کی پرورش اور تربیت ایک اشتراکی (سوشلسٹ) کی حیثیت سے ہوئی بچپن ہی سے وہ تلخ اور تباہ کن جماعتی سیاسیات کی خوفناک اور طوفانی موجوں میں کود پڑا۔ اور ایک مالدار شخص کے مقابلہ میں پارلیمنٹ کی نشست کیلئے مایوسانہ جد وجہد اور ناکام کوشش شروع کر دی۔ لیکن ناکامیابی کر انتخاب کو غلط اور ناجائز خیال کرتے ہوئے غیظ و غضب کے ایک بے پناہ جذبے کے ساتھ اُس نے انتخاب کے صندوق کو پاش پاش کر دیا اور قانونی سزا سے بچنے کے لئے سوئٹزرلینڈ کو بھاگ گیا۔ لیکن اس گوشۂ امن میں سوئٹزرلینڈ کے ارباب حل و عقد نے اسے زیادہ مدت تک نہ رہنے دیا۔ اُن کے خیال میں یہ شخص نہایت خطرناک اصول کا حامی اور ان کا پھیلانے والا تھا۔ یہاں سے نیم گرسنگی اور نیم برہنگی کی حالت میں بھاگ کر فرانس اور ترانتینو میں پناہ گزین ہوا۔ یہاں وہ ایک مزدور کی مانند کام کرتا اور معماروں کو پتھر اُٹھا اُٹھا کر دیتا تھا۔ نہ پیٹ بھر کر کھانا ملتا نہ رات کو سونے کے لئے جگہ۔ اکثر راتیں موسم سرما کے تند اور وحشی آسمان کے نیچے کاٹ دیتا۔ لیکن خوراک سے زیادہ اس کے دل میں حصول علم کی تڑپ تھی جب اس کے ساتھ کے مزدور گپوں میں مصروف ہوتے یا کاہلی سے پڑے اونگھتے وہ سیاست مدن کی کتابیں اور بڑے بڑے انقلابیوں کے حالات پڑھنے میں محو ہو جاتا

جلاوطنی کی میعاد ختم ہونے پر واپس آیا تو انسانی حقوق کے مطالبے کیلئے ایک اشتراکی اخبار جاری کیا جس کو اسکی پرجوش اور شعلہ خو سرگرمی کی وجہ سے نمایاں کامیابی ہوئی۔ اکثر اوقات وہ گرفتار کیا گیا اور قیدخانوں میں بند کر دیا گیا۔ دوبارہ ہتھکڑیاں پہنا کر گلیوں میں اُس کی تشہیر کرائی گئی ۱۹۱۱ء میں اپنی جماعت سے نکال دیا گیا۔ کیونکہ اس کی وطن پرستی کا جذبہ کسی ایسی جماعت کی عقیدت سے کہیں زیادہ مضبوط تھا۔ جس کی سرگرمیاں صحیح قومی نصب العین کے مطابق نہ ہوں۔ اس کے عقیدتمند دوستوں آشناؤں اور شاگردوں کی طرف سے اس پر غداری اور دغابازی کے الزام لگائے گئے

عام لوگوں میں اس کو ذلیل و رسوا کیا گیا اور منافقوں اور ملحدوں کی طرح اس پر لعنت کی گئی اور ۲۹ سال کی عمر میں صرف ایک رات کے مختصر سے عرصے میں ایک رہنما اور ترجمان کے رتبے سے گر کر وہ محض ایک بے یار و مددگار اور بے خانماں انسان رہ گیا جس پر ہر طرف سے نفرت و حقارت کے تیروں کی بوچھاڑ ہو رہی تھی۔ اُسی وقت اُس نے اتحادیوں کی طرف سے جنگ کرنے کی تائید میں ایک اور اخبار جاری کیا۔ ....

...... آتش فشاں مقالات لکھے۔ گرجتے ہوئے اعلانات شائع کئے۔ تمام دن مخالفین پر نہایت وحشیانہ حملے کئے جاتے اور آدھی رات تک بے اعتنا اور دل سرد جلسوں یا کھلم کھلا مخالفین کے مجمعوں میں زور شور سے دھواں دھار تقریریں کی جاتیں۔ لیکن جب جنگ شروع ہوئی تو اسے ایک رضاکار کی حیثیت سے مقدمۃ الجیش (F......) میں ہو کر لڑنے کے حق سے محروم کر دیا گیا۔ آخر کار وہ پیدل دستۂ فوج میں معمولی عہدہ دار کی حیثیت سے بھرتی ہو کر نہایت جرأت و شجاعت کے ساتھ لڑا۔ لڑائی کے دوران میں توپ کا ایک گولہ پھٹنے سے اسکے جسم میں ایک سو زخم آئے۔ جسم سر سے پاؤں تک چھلنی ہو گیا۔ اور وہ لڑائی کے ناقابل ہو گیا۔ بیماری کی حالت ہی میں اشتمالیت (بالشویزم) اور "سرخ" وردی والوں کی سخت مخالفت شروع کر دی۔ اب یہ حالت تھی کہ کبھی بے کار اور کمزور شاہی خاندان کو ملامت کی جا رہی ہے اور کبھی صلح پسند جماعت کے تار و پود بکھیرے جا رہے ہیں۔ اور آخر کار جدید اطالیہ کے تاریک ترین لمحوں میں جنگ تباہ کن خونخوار اور قتل و غارت کرنے والے بالشویزم کی بڑھتی ہوئی رو کے خلاف جس کے لئے پیٹرو گریڈ سے سرمایہ بہم پہنچایا جاتا تھا اور جس کی آبیاری لینن اور ٹراٹسکی کر رہے تھے۔ شرفا کی بکھری ہوئی طاقتوں کو منظم کرنا شروع کیا۔ اس کے بعد مسولینی ہمیں سیاہ پوشوں کے کپتان کے لباس میں نظر آتا ہے اور فوراً بعد ہی فتحیاب فسیٹی پارٹی Fascista کا بے حریف کمانڈر بن جاتا ہے۔ اب وہ اطالیہ کی اس تمام آبادی کی امن پسند طغیانی کا قائد اور راہنما تھا جس نے اس کو اس کی چالیسویں سالگرہ سے پہلے اطالیہ کا وزیر اعظم اور ملک کی قسمتوں کا مالک بنا دیا۔ اس وقت اُس کے ہاتھ میں وہ طاقت تھی جو اس کے ہموطنوں میں سے کبھی کسی کو نصیب نہیں ہوئی۔ لاکھوں کی تعداد میں بت پرستوں کی سی عقیدت کے ساتھ اس کے نقش قدم پر چلنے والے اس کے ہر فعل پر تحسین و آفرین کے نعرے لگاتے۔ خوشامدیں کرتے اور چاپلوسیوں میں لگے رہتے۔ مختصر اور سادہ الفاظ میں ہم کہہ سکتے ہیں کہ زمانہ قدیم کا یہ شیدائی اور گذشتہ دو دور کی یہ نمایاں ترین انسانی ہستی سولھویں صدی کے صلیبی معرکوں کا ایک مجاہد ہے جس نے بیسویں صدی میں جنم لیا ہے۔

اس قسم کی طرز زندگی اور تجربہ ان حالات کے آدمی کو اصول کا پکا متعصب خود مختار بلکہ مطلق العنان اور اس کے انداز کو تحکمانہ کیوں نہ بنا دیتے؟ اور اختیارات کی وسعت سے پر شکم ہو کر جو نا معلوم زمانوں سے مطلق العنان متکبروں کی مرغوب غذا رہی ہے۔ مسولینی اپنی کامرانی کی کامیاب ترین ساعت میں آخر کیوں تحکمانہ انداز اور آگے بڑھی ہوئی گھنی تاریک ابروؤں کے سایہ میں تیز چمکتی ہوئی آنکھوں کے ساتھ اپنے سے چھوٹے آدمیوں کو پیشانی کے ایک بل سے نہ لرزا دیتا۔ اور قدیم قیصر کے ایوانوں کی نشست پر بجا طور پر متمکن ہو کر ایک جدید قیصر کے شایانِ شان بہادرانہ کارنامے سر انجام نہ دیتا؟ ایک فانی انسان سے جو اپنی مختصر زندگی کے نصف عرصہ میں ایسے ایسے کام کرے اور اس قدر پستی سے زندگی شروع کر کے ایسی رفعت پر پہنچ جائے کس طرح توقع کی جا سکتی ہے کہ وہ خود غرضی اور خودستائی کے جنوں سے محفوظ رہے اور نپولین کی طرح سیاسی پیچیدگیوں میں نہ پڑ جائے؟

یہ خیالات تھے جو مسولینی کو دیکھنے سے پہلے میرے ذہن میں تھے۔ لیکن اس مضمون کو معرض تحریر میں لانے سے صرف دو روز پیشتر مسولینی کو پرائیویٹ طور پر ملاقات کرنے کیلئے فلورنس سے روما گیا۔ وقت پہلے سے مقرر کر لیا گیا تھا۔ چنانچہ اس وقت اور اسی مقام پر میں نے اپنے تمام خیالات پر نظر ثانی کی۔ جو میں اُس کی شخصیت اُس کی ذہنیت اُس کی جسمانی ڈیل ڈول اور روحانی امکانات کے متعلق رکھتا تھا۔

ہدایات کے مطابق میں وقت مقررہ پر چیگی پیلس میں پہنچا جو آج کل کیوری نال سے جہاں بادشاہ رہتا ہے بڑھکر حکومت اطالیہ کا حقیقی مرکز ہے۔ کسی معمولی شاہزادے سے ملاقات کرنے میں جن پر تکلف آداب و مراتب کا پابند ہونا پڑتا ہے یہاں اس کا عشر عشیر بھی نظر نہ آتا تھا۔ یہاں کے ہر کام میں آزادی کی وہ دلکش شان نمایاں تھی جو ایک معمولی امریکن کو دلفریب ترین طور پر متاثر کئے بغیر رہ سکتی۔

دروازے کے قریب پہلے فرش پر ایک محراب کے نیچے جس کی پشت پر ایک جنگلے والا صحن تھا اور قریب ہی متعدد موٹریں قطار میں کھڑی تھیں۔ دو یا تین سپاہی ایک سرکاری عہدہ دار سے جو اس وقت شہری لباس میں تھا باتیں کر رہے تھے۔ باوردی آدمی پوچھنے کے لئے آگے بڑھا اور قدیم رومی انداز میں جس کو فسیٹیوں نے پھر رائج کیا ہے۔ اپنا داہنا ہاتھ آگے کو پھیلاتے ہوئے سلام کیا۔ میں اطالوی زبان نہ جانتا تھا اس لئے میں نے وہ تار نکال کر دکھا دیا جو مجھے فلورنس کے پتہ پر وزیر اعظم

کے ایڈی کانگ کی طرف سے وصول ہوا تھا۔ اُس نے اُسے پڑھا مسکرایا اور تعظیم سے جھک کر دائیں ہاتھ کے فراخ زینہ کی طرف اشارہ کیا۔ دوسرے فرش پر مجھے ایک اور شخص ملا جو لباس اور انداز سے عرض بیگی معلوم ہوتا تھا وہ مجھے مختلف غلام گردشوں میں سے ملاقات کے کمرے میں لے گیا جہاں کئی ایک شرفا جو متانت اور وقار سے جہاندیدہ سیاست دان معلوم ہوتے تھے۔ خاموش لیکن منتظر بیٹھے تھے۔ ان حضرات کے پاس سے گذر نکلنے کے بعد پہلا عرض بیگی واپس آگیا اور دوسرا میرے ساتھ ہو لیا۔ اس کے بعد ہمیں ایک وسیع ایوان میں سے گذرنا پڑا جس کے اختتام پر ایک چھوٹا سا کمرہ تھا۔ یہاں میرے راہبر نے اس کے بند دروازہ کی طرف اشارہ کیا اور نہایت پراسرار طور پر غائب ہو گیا۔

میں کسی بیرونی کمرے یا دفتر میں جانے کی اُمید پر اندر چلا گیا۔ لیکن اس کے بجائے میں نے اپنے آپ کو ایک وسیع ایوان کی دہلیز پر کھڑے پایا۔ جو نہایت مختصر طور پر آراستہ تھا اور بظاہر خالی نظر آتا تھا۔ یہ ایوان یقیناً ستر فٹ مربع ہوگا۔ ترچھے طور پر میرے مقابل ایک کونے کے دریچے کے پاس دیواروں کے زاویے سے لگا ہوا ایک بلند اونچا ہموار سطح کا میز تھا۔ اور اس کے پیچھے سے ایک شخص ساکت بیٹھا میری طرف ٹکٹکی لگائے دیکھ رہا تھا۔ اُس کے اور میرے سوا دوسرا کوئی متنفس اس کمرہ میں نہ تھا۔ جب میں آگے بڑھا وہ پھرتی سے اُٹھا اور مجھے قدیم رومی طور پر سلام کیا۔ اور چونکہ میں اُس وقت تک اس رسم سے اچھی طرح واقف ہو چکا تھا۔ میں نے بھی اُسی انداز میں سلام کا جواب دیا اور پھر جب وہ تیزی کے ساتھ میز سے میری طرف آیا تو میں نے پہچان لیا کہ وہ مسولینی ہے۔

اسی مختصر سے عرصے میں جب ہم ایک دوسرے کی ملاقات کے لئے بڑھ رہے تھے میں نے اور چیزیں بھی دیکھیں۔ میں نے دیکھا اور تعجب وحیرانی کی ایک سنسنی کے ساتھ دیکھا کہ وہ چھوٹے قد کا آدمی ہے اور اس پیمانے کے مطابق جس سے ہم امریکہ میں بلوغت تک پہنچے ہوئے مردوں کی پیمایش کرتے ہیں نہایت چھوٹا آدمی ہے۔ میں نے دیکھا کہ وہ بلی کی سی دلکش تیزی اور شان کی دلفریبی کے ساتھ چلتا ہے جو اگرچہ اس کے لئے بالکل فطری اور تصنع اور بناوٹ سے مبرا ہے۔ لیکن محفل رقص وسرود کے کسی پیکر ناز کے لئے اس کی زندگی کی کم از کم بیس بہاروں کے مطالعے سے اور متواتر مشق کا نتیجہ ہوتی۔ اس کے لباس کو دیکھ کر جو دیگر تفصیلات کے علاوہ ایک بند بٹنوں کے کوٹ۔ استری شدہ خوبصورت پاجامے سیاہ بیٹوں اور نہایت چمکدار جوتوں اور آستینوں کے دو غیر معمولی طور پر بڑے اور سفید کتان کے کفوں پر مشتمل تھا۔ ذہن فوراً کسی سنجیدہ تمثیل کے پیشرو ایکٹر کی طرف چلا جاتا تھا۔ لیکن اس کے سلام کے انداز میں کوئی ایکٹروں کی سی بات نہ تھی۔

اس نے میرے ہاتھ کو نہایت گرمجوشی سے دباکر مصافحہ کیا اور نہایت سادگی سے صرف یہ الفاظ کہے کہ میں آپ سے مل کر بہت خوش ہوا ہوں۔ وہ اُصول صوتیات کے لحاظ سے تو بہت اچھی طرح انگریزی بولتا تھا۔ لیکن گفتگو کا لب ولہجہ اُس شخص کا سا تھا جس نے انگریزی بولنے والی اقوام کے افراد سے ملنے کی بجائے اسکول کے نصاب سے زبان سیکھی ہو۔

"آپ اطالوی زبان جانتے ہیں؟ ---- نہیں!"

اُس نے پوچھا اور میرے سرہلانے پر خود ہی جواب گھڑ لیا۔

"فرانسیسی ---- شاید؟"

میں نے اسے بتایا کہ گذشتہ چند موقعوں پر میں نے فرانسیسی بولنے کی کوشش کی تھی لیکن میرے چند مہربان فرانسیسی احباب نے مجھے تاسف آمیز الفاظ میں یقین دلایا کہ میں فرانسیسی نہیں بولتا۔" پس اُس نے کہا ہم انگریزی ہی میں گفتگو کریں گے۔ لیکن آپ بالکل آہستہ بولیں تیز نہیں ورنہ میں سمجھ نہ سکوں گا۔ آپ تشریف رکھئے خانہ بے تکلف ہے۔"

جب وہ مجھے وہاں لیجا رہا تھا جہاں اس کے میز کے پاس دو سخت اور اونچی کرسیاں بالمقابل پڑی تھیں مجھے اس شخص کا جائزہ لینے کا ایک اور مختصر سا موقع مل گیا۔ میں نے دیکھا اس کے ہاتھ متناسب چھوٹے اور لچکدار تھے۔ آپ کہہ سکتے ہیں کہ وہ ایک مغنی یا مصور کے حساس ہاتھ تھے نہ کہ اُس جفاکش مزدور کے جو ایک زمانے میں نہایت محنت اور مشقت سے اپنی روزی کماتا تھا۔ اُس وقت اُس کی کلائیوں کے غیر معمولی چوڑے کفوں کی ممکن وجہ بھی میرے ذہن میں آگئی۔ میرے خیال میں یہ ایک قابل معافی ذاتی خودنمائی تھی۔ کیونکہ بڑھے ہوئے چوڑے کفوں سے اس کے خوبصورت ہاتھ اور بھی چھوٹے معلوم ہوتے تھے۔ اس کی جلد میں ایک خفیف سی سبزی مائل جھلک تھی جو پرمشقت کام یا حد سے زیادہ غور وفکر کرنے اور معدہ کی کسی مزمن بیماری سے پیدا ہو جاتی ہے یہ کوئی صحت کی علامت نہ تھی میرا خیال ہے ڈاکٹر اس رنگ کو خرابی صحت پر محمول کرے گا۔ لیکن اگر اس سے قطع نظر کر لی جائے تو اس کی کمر مضبوط اور پہلوانوں کی سی تھی۔ سینہ کھلا اور شانے پیچھے کو تنے ہوئے ٹانگیں اور بازو قوت اور طاقت کے ساتھ حرکت کرتے تھے اور حرکات وسکنات جو وہ ایک اطالوی کی حیثیت سے بہت کم استعمال کرتا تھا ایک ان تھک

جسمانی طور پر بیب اور چابک جو بنہ شخص کی سی تھیں۔

یہ بات مجھے بعد میں معلوم ہوئی کہ میسولینی کیوں اپنے ماتحتوں سے زیادہ عرصہ کام کرسکتا اور تندرست رہ سکتا ہے۔ اس کا سبب یہ معلوم ہوتا ہے کہ فوراً فیصلہ کر لینے کی قابلیت کے ساتھ اس کو قدرت کی طرف سے انہماک اور محویت کا بیش بہا قابلِ رشک عطیہ بھی ملا ہے۔ اس کے ساتھ اس حقیقت کو بھی نظر انداز نہیں کر دینا چاہیے کہ وہ بہت کم غذا کھاتا ہے اور نہایت پرمشقت کاموں موٹر چلانا۔ گھوڑے کی پشت پر سواری کرنا اور شمشیر زنی وغیرہ میں مصروف رہتا ہے۔ اور اپنی فرصت کے اوقات میں سارنگی بھی اچھی طرح بجا سکتا ہے۔

ہم دونوں اس طرح بیٹھے تھے کہ ہمارے زانو تقریباً ایک دوسرے سے چھوتے تھے۔ شام کے آفتاب کی کرنیں اس کے شانوں پر پشت کی طرف سے پڑکر چہرے کو اور بھی نمایاں کر رہی تھیں۔ یہ دیکھ کر میری حیرت کی ایک بار پھر کوئی انتہا نہ رہی کہ اسکی پیشانی آگے کو جھکی یا اُبھری ہوئی نہیں بلکہ وہ ایک فلسفی یا طالب علم کی پیشانی کی مانند خوبصورت مستقیم اونچی اور ہموار تھی۔ سامنے زیادہ بال نہیں تھے اور کنپٹیوں کے پاس جاکر تنگ ہوگئی تھی کاسۂ سر صرف پیچھے سے کچھ اُبھر کر یہ ظاہر کرتا تھا کہ وہ ایک ثابت قدم مستقل مزاج اور ان تھک آدمی ہے۔ اس کا چہرہ چوڑا اور پرجلال تھا اور اگر میں غلطی نہیں کرتا تو اس کے ہونٹ نازک۔ لچکدار اور ایک فصیح بیان خطیب کے ہونٹ تھے لیکن اُن سے شرمیلے پن۔ تجربہ کاری۔ شرافت اور ہمدردی کی ایک جھلک نمایاں تھی اور وہ خفیف سی حقارت کے ساتھ کناروں پر جھکے ہوئے تھے۔

لیکن آنکھ ذہنی اور قلبی وارداتوں کی صحیح آئینہ دار تھی۔ نگاہ تیز اور خدا جانتا ہے کس قدر تیز تاڑ جانے اور پرکھنے والی تھی۔ لیکن یہ ویران سرد غضبناک اور وحشیانہ آنکھ نہ تھی بلکہ بڑی۔ شربتی آنکھ تھی جس میں مروت اور ہمدردی ملی ہوئی افسردگی اور پژمردگی پائی جاتی تھی اور اگر یہ نہیں تو میرا اندازہ سراسر غلط تھا۔ میں نہیں جانتا میسولینی کی آنکھ میں انسانی کمزوری سے اس ہمدردی اس قوت اور فہم و ادراک اور اس مضبوط ارادے کے آثار بھی موجود ہیں جو لنکن کی آنکھوں میں پائے جاتے تھے۔

اس سے بیشتر کہ میں دیگر امور کا تذکرہ کروں میں کہنا چاہتا ہوں کہ اگر میسولینی اطالوی نہ ہو تو ایک ہجوم میں اُسے نہایت آسانی سے ایک شامی سمجھا جا سکتا ہے۔ میں حیران ہوں اطالوی مخصوصاً پادری اور راہبہ عورتیں شکل و صورت میں اس قدر کیوں یہودی معلوم ہوتے ہیں اور میسولینی تو اگر سو فیصدی بھی رومی ہو تو بھی چہرے کی ساخت سے شامی نسل کا ہی نظر آئیگا۔ یہ بھی ہوسکتا ہے کہ یہ محض میرا ذاتی خیال ہو۔

"آپ نے مجھے لکھا تھا کہ آپکا ایڈیٹر چاہتا ہے۔ آپ مجھ سے ملاقات کریں"

اُس نے کہا "جناب" میں نے جواب دیا "یہ صحیح ہے"

"خوب" اُس نے کہا "یہ انٹرویو نہیں۔ تو ہم آزادی سے صحیفہ نگاروں کی طرح گفتگو کرسکتے ہیں۔ اگر مضائقہ نہ ہو تو آپ سے چند امور کے متعلق پوچھ سکتا ہوں"

چنانچہ اُس نے نہایت بے تکلفی اور بے باکی سے ایک تجربہ کار تیر انداز کی طرح جو سیدھا ہدف پر تیر مارتا ہے پوچھنا شروع کیا۔ وہ امریکہ کے مسئلہ عال پر میری رائے دریافت کرنا چاہتا تھا۔ اُس نے امریکہ کی بڑی بڑی زندہ شخصیتوں کے متعلق پوچھا اور دو ایک کے نام بھی لئے۔ پھر بالشویک تحریک کے متعلق سوال کیا۔ کہ اگر امریکہ میں اس کا وجود ہے تو اسے کس قدر خطرناک خیال کیا جاتا ہے۔ امریکہ کی اندرونی اقتصادی حالت کیا ہے۔ اور مختلف مسائل میں ہماری قومی حکومت کا کیا موجودہ طرز عمل ہے۔ میرا خیال ہے۔ میں نے اس کے لب و لہجہ اور انداز گفتگو میں امریکہ کے چند اداروں کے متعلق مدح و توصیف کی ایک لہر دوڑتی ہوئی محسوس کی۔ ابھی تک میسولینی نے ہماری کُھلم کُھلا تعریف شروع نہ کی تھی۔

یہ جواب سُنکر وہ اپنے ہر ایک سوال کو فصیح اور بلیغ اشارات سے واضح کرتا تھا میں نہیں جانتا تھا کہ نقرئی آواز اور عوام کے مجمع میں آگ لگانے والا میسولینی تقریر کے وقت کیسی کیسی متاثر کن اور بیشہ ورانہ چالیں اختیار کرتا ہوگا میں نے کبھی میسولینی کو عوام میں تقریر کرتے نہیں دیکھا۔ اس لئے نہیں کہہ سکتا اس وقت اس کا طرز عمل کیا ہوتا ہوگا۔ اور وہ نفسیات کے کس قلعہ شکن اصول کو بروئے کار لاتا ہوگا اور اپنے دوستوں کو بیدار اور آمادۂ کار کرنے اور مخالفین کو ڈرانے دھمکانے کے لئے کن شاندار حرکات کا مظاہرہ کرتا ہوگا۔ لیکن میں اس قدر کہہ سکتا ہوں کہ اپنی نجی گفتگو میں وہ ہر قسم کی دانستہ متاثر کن حرکات۔ آواز کے پھیر اور تصنع سے قطعاً آزاد ہوتا ہے لیکن اس سے میری یہ مراد نہیں کہ اس میں ڈرامیت نہیں ہوتی۔

میں نے آج تک ایسا کوئی اطالوی نہیں دیکھا جس میں فطری ڈرامیت نہ ہو۔ لیکن میں کہہ سکتا ہوں کہ ہماری تمام گفتگو کے دوران میں اُس نے ایک بار بھی کوئی ایسی حرکت نہیں کی جس سے تصنع یا بناوٹ ظاہر ہوتی ہو۔ ذوق و شوق سادگی اور گہری دلچسپی کی تو فراوانی تھی لیکن کوئی ریاکارانہ یا بناوٹ سے پیدا کیا ہوا جذبہ موجود نہ تھا۔

میں نے اپنے علم کی مختصر سی مقدار کے مطابق امریکن لوگوں کے

اخلاق و عادات کے بیشمار پہلوؤں پر حتی الوسع روشنی ڈالی اور جرأت کر کے یہاں تک بتا دیا کہ اطلانٹک کے اس پار عوام اس کو کس عزت کی نگاہ سے دیکھتے ہیں۔ اُس نے تمام باتیں نہایت توجہ اور انہماک کے ساتھ سنیں اور جب میں نے بتایا کہ ہم میں سے اکثر کا خیال ہے کہ اطالیہ سے اشتراکیت کو محو کرنے کے لئے جارحانہ قدم اُٹھا کر آپ نے انگریزی بولنے والے لوگوں کو انارکی کے بڑھتے ہوئے طوفان سے بچا لیا ہے تو اس کا چہرہ بے تکلفی کی مسرت انگیز مسکراہٹ سے جگمگا اُٹھا میں نے کہا۔

"کیا یور ایکسیلنسی جانتے ہیں کہ کثیر التعداد امریکن آپ کو کس نام سے یاد کرتے ہیں۔ وہ آپ کو اطالوی روزویلٹ کہتے ہیں۔"

اس فقرہ پر وہ بہت زیادہ ممنون ہوا۔

اس پر اُس نے کہا "میں بہت خوش ہوں اور فخر کرتا ہوں۔ میں رزویلٹ کا بہت مداح ہوں' اُس نے اپنی مٹھیاں بند کر لیں" رزولٹ طاقت اور قوت رکھتا تھا۔ اُس کا ارادہ مستحکم اور غیر متزلزل تھا۔ وہ جو کام چاہتا تھا ثابت قدمی کے ساتھ کر سکتا تھا۔ وہ عظمت کا مالک تھا اور میں نے ——— میں نے" یہاں وہ پہلی بار رکا اور فوراً دلفریب اور دلکش اطالوی زبان کا ایک چشمہ پھوٹ نکلا۔ اس کے پہلو سے سرگوشی کی سی ایک آواز پیدا ہوئی اور اس وقت مجھے پہلی بار علم ہوا کہ خلا میں سے ایک سکرٹری پیدا ہو گیا ہے "ہز ایکسیلنسی یہ کہنا چاہتے ہیں کہ اُنھوں نے سابق پریزیڈنٹ روزولٹ کی تمام تحریریں پڑھی ہیں"! ترجمان نے کہا۔ یہ ان اولین کتابوں میں سے ہیں جو ہز ایکسلنسی نے انگریزی سیکھنے کے بعد پڑھی ہیں"۔ میسولینی نے اشارہ سے تیسرے آدمی کو چپ کرایا اور میری طرف متوجہ ہوا۔

"آپ اطالیہ میں کیا کرتے ہیں؟"۔

"میں یہاں یا فلورنس میں سیر کے لئے آیا ہوا ہوں"! میں نے کہا" آجکل میرا داماد اور میری لڑکی اطالیہ میں رہتے ہیں۔ ان کا پہلا بچہ سرزمین اطالیہ میں پیدا ہو گا۔ پیدائش کی آجکل میں توقع کی جاتی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ میں یہاں ہوں۔ میں اور میری بیوی"!

اس کا چہرہ جگمگا اُٹھا اور اس کی آنکھوں میں ایک چمک پیدا ہو گئی

"خوب۔ میں سُنکر نہایت خوش ہوا ہوں۔ میں آپ کو تہ دل سے مبارکباد دیتا ہوں۔ میرے دل کی بہترین دعائیں اور اُمیدیں آپ کی لڑکی اور اس کے خاوند کے ساتھ ہیں۔ براہ مہربانی میرا یہ پیغام اُن تک ضرور پہنچا دیجیے"!

میں نے اُس سے اپنی لڑکی کے لئے ایک ایسے فوٹو گراف کی درخواست کی جس پر اس کے دستخط ہوں۔

"بہ طیب خاطر" اُس نے کہا اور سکرٹری جس کے قدم کی آہٹ تک سنائی نہ دیتی تھی تصویر لینے چلا گیا۔

"تو آپ اطالیہ میں پہلے کبھی نہیں آئے"! میسولینی نے پوچھا۔

"ہاں آیا تھا" میں نے کہا" تیرہ سال ہوئے ——— یہ ۱۹۱۴ء کی بات ہے ——— میں ایک مہینے یہاں رہا تھا"

"تیرہ سال؟ کیا آپ اطالیہ کو بدلا ہوا پاتے ہیں"

"بہت بدلا ہوا۔ اور بہتر حالت میں"

"بدلا ہوا؟ اس کی آواز میں اشتیاق تھا" فرمائیے وہ کیسے"؟

"سُنئے جناب" میں نے کہا" اطالیہ گداگروں سے پُر تھی۔ ہر طرف گداگر ہی نظر آتے تھے اور مجھے معاف فرمائیے لیکن چونکہ آپ نے پوچھا ہے اس لئے عرض کرتا ہوں چوری بھی کثرت سے تھی۔ مجھے بتایا گیا ہے۔ کہ بذریعہ ڈاک قیمتی اشیاء بھیجنا خطرہ سے خالی نہ تھا۔ یہ بھی کہا جاتا ہے کہ گاڑیوں میں مسافروں کا اسباب بزور چھین لیا جاتا تھا اور میں پھر معافی چاہتا ہوں۔ کوچہ و بازار ریل کی گاڑیاں کثیف اور گندی اور لوگوں کا کثیر طبقہ آوارہ تھا"۔ یہ الفاظ کہتے ہوئے میں نہایت انہماک کے ساتھ اُس کے ہاتھوں کی حرکات دیکھ رہا تھا اور حیران تھا کہ اس وقت نادانستہ طور پر وہ ایک ماہر اشارات[۱] بن گیا ہے۔ جب میں نے گداگروں کا ذکر کیا اُس نے دائیں ہاتھ کی پیالی سی بنالی اور پھر اپنی بڑھی ہوئی اُنگلیوں کے سروں کو انگوٹھے کی جڑ سے لگا لیا۔ جیسا کہ دنیا بھر میں مانگنے کا طریقہ ہے۔ جب میں چوروں کا ذکر کر رہا تھا اُس کے ہاتھ جیب کاٹنے کی سی تیز حرکت میں مصروف تھے۔ میں نے سلسلۂ کلام جاری رکھا۔

لیکن اب گداگر تمام غائب ہو چکے ہیں۔ چوری کی وارداتیں اس قدر نہیں ہوتیں۔ میں جانتا ہوں ڈاک بھی محفوظ رہتی ہے۔ لوگ اب اس قدر وحشی۔ اور بداخلاق نہیں۔ کوچہ و بازار پاکیزہ' اور گاڑیاں صاف ستھری ہیں اور ہر طرف جسمانی اور اخلاقی ترقی کے آثار نمایاں ہیں۔ القصہ میں کہہ سکتا ہوں کہ تیرہ سال پیشتر اطالیہ ایک ایسا ملک تھا جو محض فکر امروز میں زندہ رہتا تھا۔ لیکن اب اسے کل کی فکر مستقبل کا سودا ہے۔ جو میرے خیال میں نہایت شاندار اور پُرعظمت ہو گا۔ اس کا مضبوط مُکا پُرزور دھمکے کے ساتھ میز پر پڑا اور اس نے ترچھی نظروں سے جن میں اطمینان کی جھلک تھی سکرٹری کی طرف دیکھا جو اب تک واپس آ چکا

[۱] Pantomimist

تھا۔"

"آپ بجا ارشاد فرماتے ہیں۔" اُس نے کہا۔ "میں خوش ہوں آپ نے ان امور کا مشاہدہ کیا ہے۔ اور میں خوش ہوں کہ آپ نے اس کا ذکر کر دیا ہے۔ مجھے اُمید ہے کہ آپ اپنے رسالے میں بھی ان امور کا تذکرہ کر دیں گے تاکہ امریکن جدید اطالیہ کو اچھی طرح سمجھ سکیں۔ آپ اُن کو ہمارے اطالیہ کے حالات سُنا دیں۔" اس نے آخری الفاظ کو اس زور کے ساتھ کہا کہ وہ میرے ذہن میں خاص طور پر نمایاں ہو گئے۔

"اب میں آپ سے اطالیہ کے متعلق اس قدر کہوں گا۔" اُس نے کہا "کام اور تنظیم یہ ہے جو ہم چاہتے ہیں۔ یہ ہے جس کے لئے میں کوشاں ہوں۔ کام ہم کر رہے ہیں اور تنظیم ہم سیکھ رہے ہیں۔"

"امریکہ کے لئے بھی یہ بہترین لائحہ عمل ہے۔" میں نے کہا۔ "من حیث القوم ہم کافی طور پر جفاکش ہیں۔ لیکن میرا خیال ہے ہم اس قدر منظم نہیں ہیں۔ جس قدر ہمیں ہونا چاہئے۔"

"یہ آپ کیا فرماتے ہیں؟" اُس نے فوٹوگراف پر دستخط کرتے ہوئے سر اُٹھا کر کہا۔ "امریکہ اس قدر پر عظمت ہے۔ ——— ——— کیا اس کے پاس حقیقی عظمت کے تمام ضروری ذرائع نہیں ہیں؟"

"میں نہیں کہہ سکتا لیکن ہمیں تنظیم کی بھی ضرورت ہے۔"

"تو اطالیہ بھی منظم ہو گی اور ہم اسے روز بروز زیادہ منظم کرتے جائیں گے۔"

"یور ایکسیلنسی" میں نے کہا "میں نے عرض کر دیا ہے کہ میں ۱۹۲۶ء کی اٹلی کے متعلق جنگ کی پیشتر کی اٹلی سے مقابلہ کرتے ہوئے کیا خیالات رکھتا ہوں۔ میں آپ کو بتانا چاہتا ہوں کہ آپ کی مستقل مزاجی، ثابت قدمی اور بلند حوصلگی کا عکس اطالیہ کے تمام انتظام و انصرام میں دیکھ کر آپ کے متعلق میرا کیا خیال ہے۔"

"میں سُن رہا ہوں!"

دیگر تمام امور کے علاوہ ایک راہنما اور قوم ساز کی حیثیت سے آپ کے کارہائے نمایاں کو نظر انداز کرتے ہوئے میں آپ کو دنیائے جدید میں عظیم ترین متجرب حکومت سمجھتا ہوں۔"

"متجرب؟" معلوم ہوتا تھا اس نئے لفظ نے اس کو حیران سا کر دیا ہے۔ اس کی پیشانی پر بل آگیا اور میں نے اس کے چہرے سے اس کے دل کے خیالات کو پڑھ لیا میرا خیال ہے اس کا ذہن خیالات کی رو میں بہتا ہوا اس سرزمین کی طرف چلا گیا تھا جس کی موجودہ سیاسی تعلیم سے اسے سخت نفرت ہے یعنی روس کی طرف "لینن اور ٹراٹسکی بھی متجرب تھے" میں نے اپنے الفاظ میں اضافہ کرتے ہوئے کہا۔ "لیکن بالکل ایک مختلف نوع کے وہ بعنوان جو بے عنوانی اور تخریب میں ماہر تھے اور آپ" میں کہہ سکتا ہوں "تنظیم و تعمیر اور صحیح قوانین کے نفاذ میں ماہر ہیں۔ وہ آگ اور شعلے بھڑکاتے تھے لیکن آپ زخموں کی چارہ سازی فرماتے ہیں۔ وہ دیوانے اور مجنون تھے لیکن آپ دلیر اور فرزانہ ہیں۔"

میرے اس بیان پر اُس نے شکریہ کا اظہار کیا۔ یہ شکریہ بھی ایسا ہی صدق دل اور اخلاص کے ساتھ تھا جس طرح میرے الفاظ بے ریب و ریا تھے۔

"ایک بات اور عرض کرنا چاہتا ہوں" میں نے کہا "اس سوال کا جواب میں روئداد ملاقات میں لکھنا چاہتا ہوں۔ آجکل یہ ہر جگہ لکھا جاتا ہے کہ اطالیہ کا تمامتریں بار آپ کے کندھوں پر ہے۔ آپ گذشتہ چھ سال میں اس کی نئی زندگی کا موجب ہیں اور آپ نے اپنی ذات کو اس امر کا ذمہ دار بنا لیا ہے کہ اطالیہ کی اور شاندار زمانے کی طرف راہ نمائی کریں۔ لیکن فرض کیجئے آپ مر جائیں۔ آج شب کو اس دنیا سے اُٹھا لئے جائیں۔ تو اطالیہ کا کیا حشر ہو گا؟"

اس کی آواز جو شاندار لچدار اور موثر ہے۔ بانگ دہل کی مانند میرے کان میں آئی۔

"آپ میرا یہ جواب لکھ سکتے ہیں۔" اس نے گونج کر نہایت اعتماد نفس کے ساتھ کہا "ہر چیز تیار ہے ہر شے منظم ہے۔ اگر میں زندہ رہوں جدید اطالیہ ترقی پذیر رہیگا" اور اگر میں مر جاؤں تو اس میں کوئی رکاوٹ ہو گی۔ میری جانشینی کیلئے لوگوں کی تربیت ہو چکی ہے۔ اور وہ تیار ہیں۔ اطالیہ ہمیشہ بلند سے بلند تر ہوتا جائیگا۔"

وہ اصرار کر کے دروازے تک میرے ہمراہ آیا اور دروازے پر دوبارہ مجھ سے مصافحہ کیا۔

"خدا حافظ سائنور کوب!" اُس نے کہا۔ "آپ اہلِ امریکہ کو یہ بتانا نہ بھول جائیے کہ اطالیہ کیا ہے۔ اس کیلئے میں آپ کا ہمیشہ ممنون رہوں گا۔"

میں باہر آگیا۔ اس کے بعد میں کبھی میسولینی کو خونخوار شیر، جنگلی بھینسا یا عقاب تصور نہ کروں گا۔ میرے دل میں اس کا خیال اس انسان اس عظیم ترین انسان کی حیثیت سے ہو گا۔ جس کا دل انسانی ہمدردی کے جذبات سے لبریز ہے۔

یقیناً ایک انسان کے لئے یہ نہایت تعجب خیز کارنامہ ہے کہ وہ ایک قوم کو تباہی سے بچا لے۔ اور اس سے بڑھ کر حیرانی کی بات یہ ہے کہ اس کو تباہی سے بچا کر اس کے ارتقا کی نشو و نما۔ اسکی بہبودی اور سرفرازی کا ضامن ہو کر ایضد ماغی توازن، فرزانگی اور تواضع انسانیت کو فراموش نہ کرے۔ اگر آپ دریافت کریں گے کہ ایسا کون شخص ہے تو میں کہوں گا کہ وہ بینٹو میسولینی ہے!" (ارون کوب)

حنیف ہاشمی

احساسِ گناہ

اس واقعہ کو جو میں بیان کرنے والا ہوں اور جو میرے افسانہ زندگی کے ناقابلِ فراموش پر درد واقعات میں سے ہے پانچ سال کا عرصہ ہوچکا ہے اور اب میں اپنے تئیں اخفائے راز کے اس اقرار سے آزاد محسوس کرتا ہوں جو میں نے اپنے دل میں کیا تھا۔

میں بنک کے محکمہ مبادلات خارجہ کا افسر اعلےٰ ہوں میں نے ابھی تک شادی نہیں کی اور میں اپنی ماں کے ساتھ رہتا ہوں۔ اپنی تنخواہ اور اپنے باپ کی جاگیر کی کچھ آمدنی ملا کر میں آرام و آسایش سے زندگی بسر کرسکتا ہوں۔

۱۴ر نومبر ۱۹۰۳ء کو شام کے پانچ بجے میں دفتر سے واپس آ رہا تھا۔ میرا راستہ ایڈلیسن بار کی طرف ہو کر جاتا تھا جو شہر میں شرفاء کی پُر رونق بستی ہے۔ میں ابھی دیا سر میدہ کے سب سے اونچے مقام تک ہی پہنچا تھا۔ کہ میری آنکھوں نے ایک رُوح فرسا نظارہ دیکھا۔ ایک شخص نے تیزی سے کھڑکی کھول کر مکان کی تیسری منزل سے مجھ سے چند قدم کے فاصلے پر اپنے تئیں سر کے بل گلی میں گرا دیا۔ میں خوفزدہ ہو کر ایک لمحے کے لئے چپ کھڑا رہا۔ اور پھر لپک کر اس مصیبت زدہ کو اٹھانے کے لئے جھپٹا۔ یہ دیکھ کر میرے خوف اور دہشت کی کوئی انتہا نہ رہی کہ خودکشی کرنے والا میرا آشنا بلکہ میں لکھ سکتا ہوں میرا دوست جارج نریٹی ایک جہاز ان کمپنی کا مالک تھا۔ میں نے دیکھا کہ اس نے ایک کاغذ کا ایک پرزہ نہایت مضبوطی سے پکڑ رکھا ہے اس سے پیشتر کہ دیکھنے والوں میں سے کوئی نزدیک آتا میں نے جلدی سے اس کاغذ کو جیب میں ڈال لیا۔

عمارت کے ایوان میں رونے پیٹنے کی آوازیں گونج اٹھیں۔ ایک خاتون ہجوم میں بے تابانہ دوڑ آئی اور اپنے تئیں لاش پر گرا دیا۔ پولیس کے افسر نے صلیب احمر کے رضاکاروں کو لاش ہسپتال میں لے جانے کی ہدایت کی۔ جب یہ دردناک جلوس روانہ ہو چکا تو ہجوم نے جو اب تک خاموش تھا طویل خیالات اور اظہار افسوس کا سلسلہ شروع کیا اور ایک موٹر میں اخبارات کے کئی ایک نمایندے بھی موقعہ پر آ موجود ہوئے۔

گلی کی نکڑ پر جا کر میں نے اپنی جیب سے وہ کاغذ نکالا جو میں نے خودکشی کرنے والے کے ہاتھ سے چھین کر چھپا لیا تھا۔ یہ پولیس کمشنر کی طرف تھا۔ یہ دیکھ کر میں نے فوراً فیصلہ کر لیا۔ کہ یہ اصلی مکتوب الیہ تک نہ پہنچنا چاہئے میں نے ایک لمحہ پس و پیش کے بغیر اسکو اپنے بٹوے کی اندر کی تہ میں رکھ لیا۔ لیکن دل کی ایک آواز مجھے چیخ چیخ کر کہہ رہی تھی کہ میرا یہ فعل مجرمانہ ہے اور مجھے بھی اس کا اعتراف تھا۔ لیکن پولیس کمشنر اگر اس خودکشی کے اسباب سے واقف نہ بھی ہو۔ تو حرج ہی کیا ہے؟

ایک پولیس افسر کے لئے یہ معمولی تحریر اور کاغذ کا محض ایک پرزہ ہے لیکن ہوسکتا ہے میرے لئے یہ غیر معمولی اہمیت رکھتا ہو۔ اس کے علاوہ غلط فہمی کو دور کرنے کے لئے مجھے تسلیم کرنا پڑیگا کہ مجھ ناکارہ کی زندگی کا کوئی اخلاقی اصول نہیں ہے۔

میں اُلٹے پاؤں نریٹی کے مکان پر گیا۔ اور دروازے پر دستک دی۔ ایک خادمہ نے کہا نستے ہوئے دروازہ کھولا۔ ملاقات کے کمرے میں ایک اور خادمہ نے جو رو رہی تھی مجھے بتایا کہ سانتورا اس وقت ملاقات نہیں کرسکتی۔ لیکن میں نے اُس کی بات پر کچھ دھیان نہ دیا اور اندر چلا گیا۔

پردے کو اُٹھاتے ہوئے ہلکی ہلکی سسکیوں کی آواز سُنکر میں ٹھٹھکا اور پھر اندر داخل ہُوا۔ نریٹی کی بیوی چاندی کی بڑی صلیب کے سامنے گھٹنوں کے بل سبک سبک کر دعا مانگ رہی تھی۔ اس کا بیٹا گنتو مجھے ملنے کے لئے آگے بڑھا۔ بیوہ نے کچھ کہے بغیر پھر کر دیکھا اور زیادہ سبکنا شروع کیا۔ میری طبیعت کی شیطنت اور بدفطرتی اسوقت بھی چھپی نہ رہی۔ غم و الم کے اس نظارے نے میرے دل پر کچھ اثر نہ کیا۔ میں اپنا ہاتھ آہستہ آہستہ گنتو کے دلفریب اور خوبصورت گھونگر والے بالوں پر پھیرتا رہا۔ اس کے ہونٹوں پر غم بڑھانے والی مسکراہٹ تھی اور میں سوچ رہا تھا خاوند تو مر چکا ہے اور اس کے ساتھ ہر ایک حماقت آمیز ڈر اور خوف کا بھی خاتمہ ہو گیا ہے۔ اب میں بے فکری سے ہر آہٹ پر ٹھٹھکے بغیر اپنے تئیں حماقت کی ایک ساعت کے سپرد کر سکونگا۔ میری

al Foreign exchang section

نفس کیسی ایک دلکش اطمینان کی صورت اختیار کرچکی تھی - مَیں نے سوچا آہ! میری حسین بیوہ کا غم بھی اُسوقت تک ہے جب تک اس کی سیاہ آنکھوں کا سرمایہ اشک ختم نہیں ہوتا۔"

اور کیا آپ یقین کریں گے ؟ اس ماتمی کمرے میں قہقہہ لگانے کی ایک مجنونانہ خواہش نے مجھے آپکڑا - غم و الم کی اس تضحیک سے بچنے کے لئے مَیں اُٹھ کھڑا ہوا -

"خاتون صبر کرو"

لیکن ماتم گسار بیوہ نے پھر کر بھی نہ دیکھا -

مَیں بھی دروازے تک پہنچ چکا تھا - مَیں نے بدمزہ ہو کر کہا - "خاتون صبر کرو! زندگی ایک رقص ہے اور موت اس موسیقی کا انجام" زندگی کی اس تعریف پر خودستائی یا اسی قسم کے جذبات محسوس کرتے ہوئے مَیں نے گینٹو کو پیار کیا اور رخصت ہوا -

دوسری صبح مَیں نے اس واقع کو ایک خاص انداز میں ملاحظہ کیا مَیں اس دن گھر پر رہا - اور سپرنٹنڈنٹ جنرل دفتر مبادلات خارجہ کو ایک مختصر سا رقعہ لکھ کر بھیج دیا اور اس میں اپنی غیر حاضری کی وجہ بیان کرتے ہوئے جوڑوں کے درد کا بہانہ کیا - مَیں نے روزانہ اخبارات منگوائے - جہاز راں کمپنی کے مالک نربٹی کی خودکشی کے واقعہ سے کئی کالم پُر تھے - رپورٹروں نے اس کی وجوہات معلوم کرنے میں اپنی تمام تر قوت ایجاد کو صرف کر دیا تھا -

مالی تفکرات ؟ یقیناً نہیں - سانٹو نربٹی کے کاروباری معاملات ہمیشہ کامیاب رہے ہیں - خاندانی تنازعات ؟ نہیں یہ بھی نہیں - ایک رپورٹر دلکش اور متاثر کن الفاظ میں سانٹو اور الڈیا کی خانہ داری کی تعریف کے پُل باندھ رہا تھا - لیکن اس امر پر سب یک زبان تھے کہ یہ دماغی خلل کا نتیجہ ہے" پانچویں کالم میں بھی مجھے معمولی تعزیت کے الفاظ کے علاوہ کچھ نظر نہ آیا - صرف مَیں اس کی موت کے بھید سے واقف تھا!

اتنے میں اماں کمرے میں آئیں اور کہا کہ تین صاحب تم سے ملنا چاہتے ہیں -

"اماں انہیں اندر ہی بھیج دو"

تین صاحب آئے اور کچھ کہے بغیر بیٹھ گئے - ایک مرحوم کا بھائی سانٹو رگیتانو نربٹی تھا - دوسرا ڈاکٹر ہیفور شینی - انجمن ارباب شہنشاہیت کا پریذیڈنٹ - تیسرا افولی اسی انجمن کا اکونٹنٹ اور معتمد خزانہ -

"فرمائیے!"

سانٹو ہیفور شینی نے کہا - "گذشتہ شب جب سانٹو نربٹی کی موت کی المناک خبر شہر میں مشہور ہوئی تو ہماری انجمن کی انتظامیہ کمیٹی نے جس کا مرحوم بیس سال سے ممبر تھا ایک خاص اجلاس منعقد کیا اور یہ فیصلہ کیا گیا کہ تجہیز و تکفین اور کفن دفن کے موقعہ پر ہم انجمن کے خاص نشان کے ساتھ موجود رہیں - قبرستان میں تقریر کرنے کے لئے کمیٹی نے آپ کو منتخب کیا ہے اور ہم اسی غرض کے لئے آپ کی خدمت میں حاضر ہوئے ہیں"

ان الفاظ پر مَیں چونک اُٹھا اور اگر مرحوم کے بھائی کی موجودگی کا خیال نہ ہوتا تو مَیں یقیناً قہقہہ لگا کر ہنستا - لیکن اب غمگین آواز اور اندوہ ناک انداز میں مَیں نے اس دردناک فرض سے معذرت چاہنے کی کوشش کی -

" آپ جانتے ہیں" مَیں نے کہا " مَیں کوئی مقرر نہیں ہوں اور جوش و خروش ———"

"او" ہیفور شینی نے قطع کلام کرتے ہوئے کہا "کسی لمبی چوڑی تقریر کی ضرورت نہیں ہے - صرف چند الوداعی الفاظ کافی ہیں"۔

" واقعی!" افولی نے کہا " الوداعی!"

باوجودیکہ نربٹی کے بھائی کی موجودگی نے میری پوزیشن کو نازک بنا دیا تھا - مَیں اس ماتمی تقریر کے خیال سے متواتر گریز کرتا رہا - اور اس سے یہ غالب گمان تھا کہ مَیں صاف انکار کردوں - چند لمحوں کی خاموشی کے بعد اکونٹنٹ افولی نے میری پس و پیش پر غلبہ پانے کے لئے ایک مضبوط ترین دلیل پیش کی - جماعتی نظام کی خاطر اس بار کو اٹھانا مجھ پر فرض ہوگیا تھا - اب مجھ پر واضح ہوگیا کہ انکار بے مزید اصرار بے حاصل ہے - مَیں تقریر کرنے پر راضی ہوگیا - لیکن معاملات پیچیدہ ہو رہے تھے - مَیں دل سے پوچھتا تھا انجمن نے تقریر کرنے کے لئے مجھے کیوں انتخاب کیا ہے ؟ ان ایام میں مَیں اجلاسوں میں شریک نہ ہوتا تھا - انجمن کے اراکین کو بھی نہ جانتا تھا - نہ مقامی اور قومی سیاست میں دلچسپی لیتا تھا - ماتمی تقریر کا تکلیف دہ اور غم آلود فرض کسی اور کے کیوں نہ سپرد کر دیا جائے ؟ لیکن ان لوگوں کو جو اس قسم کی تقریر کرنے کے اہل ہو سکتے تھے ایک ایک کر کے دیکھتے ہوئے مجھے معلوم ہوگیا کہ ان کے لئے کسی نہ کسی وجہ سے ایسا کرنا ناممکن تھا -

لیکن میری طبیعت میں بغاوت اور سرکشی کا ایک زبردست جذبہ تھا - میرا دل قدیم بہانے "اتفاقی بیماری" کے عذر کی تلاش میں

تھا۔ میں تین بار کمرے میں ادھر ادھر ٹہلا لیکن ہاتھی دانت کی ایک مرمریں صلیب کو دیکھ کر جو دیوار پر لٹک رہی تھی۔ میرے دل میں اچانک حسین بیوہ کا خیال آیا جو غالباً ابھی تک مسیح کے طویل نقری مجسمے کے حضور میں جو تانبے کی صلیب پر مصلوب تھا مو دعا تھی ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔

ہماری محبت ایک ٹوٹتے ہوئے نورانی ستارے کی مانند میری روح کے آکاس پر سے گذر گئی تھی۔ (میں نے اِن الفاظ کو اکثر بار تسلی بخش اثر کے ساتھ استعمال کیا ہے) اور مجھے اپنے دل میں اس امر کا اعتراف تھا کہ میں بہت حد تک غریب نریٹی کا ممنون احسان ہوں اور مجھے اس احسان کی ادائیگی کے موقعہ سے بے پروائی نہ برتنی چاہئے۔

اس کے دل میں اپنی بیوی کی وفاشعاری کے متعلق کئی سال سے پوشیدہ شک تھا لیکن وہ اس کی بے وفائی کے ثبوت فراہم نہ کرسکتا تھا۔ سائنور الڈیا نے قابل داد فہم و فراست کے ساتھ محبت کے تمام ظاہری آثار چھپا رکھے تھے اور اس بدباطن کینہ ور کو بالکل نہتا کر رکھا تھا۔ اس کے علاوہ شہر کی وسعت ہماری ملاقاتوں کی معاون تھی۔

تو کیا یہ بالکل اخلاق کا اقتضا ——— ہاں اخلاق کا اقتضاء نہیں تھا کہ میں سائنور نریٹی کے متعلق اپنی ممنونیت اور شکر گذاری کے جذبات کا اظہار کردوں۔ یہ صحیح ہے کہ اس امر میں مجھے کافی دیر ہو چکی تھی۔ لیکن یہ کس کا قصور تھا؟ بخلاف اس کے کیا یہ ماتمی تقریر ایک ذلت آمیز دیدہ دلیری نہ تھی؟ سینکڑوں کمزور دل میرے خلوص دل کے قائل ہو جائیں گے۔ یہ موقعہ ایک قائم مزاج شخص کی حیثیت سے جس کے سامنے مستقبل کا شاندار میدان ہو میری شہرت کی بنیادیں مضبوط کر دے گا۔ میں خیال ہی خیال میں اپنے ہمسائے کی خیالی حماقت کا مذاق اڑا رہا تھا۔ کلیسا کا واعظ اور اشبانی خیال و اخلاقیات کا عالم اس قسم کی لطف اندوزی کو یقیناً ذہنی پستی کی پیدائش کہے گا ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔

اے تشخیص جرائم کے طالبعلمو! میں اپنا کاسۂ سر تمہارے سپرد کر جاؤں گا۔

تمام جھجک دُور ہوگئی۔ میں نے گھنٹی بجائی خادمہ نمودار ہوئی۔

"جیانینا کل میرے لئے ضروری سامان تیار رہے"!

"سائنور ایسا ہی ہوگا۔ کھانا تیار ہے"۔

"بہتر! تم جا سکتی ہو!"

کافی پینے کے دوران میں میں نے اخبارات لانے کا حکم دیا۔ مجھے تقریر کو ترتیب دے لینا چاہئے۔ لیکن نریٹی کے حالات زندگی نہایت قلیل اور پریشان تھے۔ کوئی خاص بات قابل ذکر نہ تھی۔ اس کی تمام زندگی خاموش اور پُرسکوت تھی۔ عمر بھر میں بڑے سے بڑا عہدہ جس پر وہ فائز ہُوا تھا بورڈ آف ڈائرکٹرز انجمن مالکان جہاز کی صدارت تھی۔ صبح کے اخبار کے تازہ ترین نمبر نے اس کی وصیت کا کچھ حصہ شائع کیا تھا۔ جو اس کے کاغذات کے درمیان پائی گئی تھی۔ میں نے اعداد و شمار کو دیکھنا شروع کیا۔ شاید کوئی فیاضانہ وقف مجھے اپنی فصاحت و بلاغت کے جوہر دکھانے کا موقعہ دے سکے۔ لیکن آہ! یہ بھی ایک سراب تھا۔ مایوس کن سراب ۱۱۵ لاکھ پونڈ کی رقم کثیر میں سے صرف دو سو پونڈ ملاحوں کے بچوں کے لئے ایک امدادی فنڈ قائم کرنے کے لئے دئے گئے تھے شیطان!

اس حبشیانہ اور خونخوار تنگ دلی نے میرے دل کو خون کر دیا!

لیکن یہ جیسا کہ آپ جانتے ہیں ملاحوں کے بچوں کے خیال سے نہیں بلکہ اپنی تقریر کی کم مائیگی کی وجہ سے تھا۔ میں نے اپنی تقریر کو دوبارہ ترتیب دیا۔ چند نوٹ لکھے اور انہیں دیکھکر اندازہ کرلیا کہ میری تقریر نہایت مختصر ہوگی۔

اس صبح قبرستان میں خزاں کے آخری سورج کی شعاعیں مرمریں کتبوں اور سنگی صلیبوں کو بوسہ دے رہی تھیں۔ ہجوم نے ایک حلقے کی صورت اختیار کرلی۔ اور ایک لمحے میں اس موزونیت کے ساتھ اپنی ٹوپیاں اُتار لیں گویا اس بات کے لئے وہ کسی اشارے کے منتظر تھے۔ اب چمکدار سروں کا ایک سمندر پیش نظر تھا۔ میرے پندرہ منٹ کی گھنٹی ہونے والی تھی۔ میں آگے بڑھا۔ ایک ہاتھ پتلون کی جیب میں تھا اور دوسرا اس تمکین، پُروقار لیکن غمگین اور آہستہ انداز میں آگے بڑھا ہُوا تھا۔ جو فن خطابت کے مطابق ماتمی تقریر کے ہمراہ ضروری ہے۔

میں نے محسوس کیا۔ ہزاروں نگاہیں مجھ پر جمی ہوئی تھیں۔ تابوت کے قریب جاکر میں بھونچکا سا ہو کر رُک گیا۔ مردے کا چہرہ دیکھنے کیلئے صندوق کے آئینے پر ایک چھوٹا سا بیضوی سوراخ تھا جس پر شیشہ لگا ہوا تھا۔ مردے کا تمام سر کفن میں لپٹا ہُوا تھا۔ اور سوراخ میں سے جو کچھ دکھائی دیتا تھا وہ دو کھلی آنکھیں تھیں۔

آہ! وہ آنکھیں، وہ سفید آنکھیں جو میں جانتا تھا مجھے گھور رہی ہیں، ہاں وہ باریک جھلی کے مہین پردوں میں سے گھور رہی تھیں۔ میری حالت نازک تھی۔ میرے دل میں غیظ و غضب کا طوفان اُمنڈ آیا۔

"تو تُو مرا نہیں! اے بدقماش!"

یہ غضبناک اور ذلیل کن کلمہ میری زبان پر آکر رُک گیا۔ کیونکہ میرا

خیال ہے میں نے ان خوفناک کھلی آنکھوں میں ایک خفیف سی چمک دیکھی۔ کیا یہ حقیقت تھی یا میں ہی غلط فہمی کا شکار تھا۔ میری اس گھبراہٹ کو بیوہ نے بھانپ لیا اور اس کا خیال ہٹانے کے لئے میں نے تقریر شروع کردی۔ میں نے مردے پر ٹکٹکی لگا رکھی تھی۔ گویا میں اسے للکار رہا ہوں اس ماتمی تقریر کا آغاز نہایت تکلیف دہ تھا لیکن میں نے محسوس کیا کہ میں نے پھر ایک بار اپنے اوپر قابو پالیا ہے۔ آٹھ منٹ میری فصاحت و بلاغت کے ذخیرے کو ختم کرنے کے لئے کافی سے زیادہ تھے۔ میں اپنی اس امید کو ظاہر کرنا بھی بھول گیا کہ قبر کی منزل مرحوم پر آسان رہے گی۔

لیکن میں نے اپنی کھوکھلی آواز میں لاطینی لفظ "ویل" یعنی الوداع کہہ دیا میں نے آخری نگاہ نریٹی پر ڈالی۔ اس کی نگاہوں سے کیا ظاہر ہوتا تھا؟ نفرت و حقارت؟ احسان مندی؟ چند لوگوں نے مجھ سے مصافحہ کیا اور تھوڑی دیر کے بعد میں نے اپنے تئیں پھر گاڑی میں پایا اور پکار کر کہا:۔

"سرسیٹ چل اکو جوان!"

دو دن بعد مجھے لڑیا کا ایک رقعہ ملا جس میں صرف ایک لفظ "گستاخ" لکھا تھا۔

اس وقت میں نے خودکشی کا راز معلوم کرنے کا فیصلہ کیا میں نے اپنے تئیں ایک کمرے میں بند کرلیا اور اس فعل کو انتہائی تقدس اور پاکیزگی کا رنگ دینے کا ارادہ کرکے گویا میں کوئی وصیت پڑھنا چاہتا ہوں۔ دو شمعیں روشن کیں۔

آہستہ سے میں نے لفافہ چاک کیا۔ لکھا تھا:۔

"سائنور پولیس کمشنر۔

وہ امر جس نے مجھے خودکشی پر مجبور کیا میری بیوی کا رویہ ہے میں اس کو اس شخص کے ساتھ جو اس کی خود بینی اور خود آرائی کا موجب ہے قتل کرسکتا تھا۔ وہ مبادلات خارجہ میں میرا مدمقابل بنا ہوا ہے لیکن میں خودکشی کو ذلت اور رسوائی پر ترجیح دیتا ہوں۔ اگر آپ مناسب خیال فرمائیں تو آپ ان خیالات یا ارادوں کی تردید کرسکتے ہیں جو میری موت کی وجہ مالی مشکلات بتائیں۔"

سہ شنبہ ۱۴ نومبر ۸ بجے شام۔

جارج نریٹی مالک جہاز۔

آہ! آج بھی میرے لئے ممکن نہیں کہ میں ان گوناگوں خیالات کے الجھے ہوئے تاروں کو کاغذ پر رکھ سکوں جو اس رقعے کے پڑھنے سے میری روح کی فضا میں تن گئے تھے۔ لیکن وہ امر جس نے مجھے گوناگوں بدگمانیوں کے دہکتے ہوئے انگاروں پر لوٹا دیا۔ ایک نئے راز کا انکشاف تھا۔ نریٹی میری وجہ سے موت سے ہمکنار نہ ہوا تھا۔ بلکہ یہ کسی اور کی کارفرمائی تھی۔ اب اس محفوظ اور قابل اعتماد تحریر کی وجہ سے میں اس نتیجے پر پہنچنے کے لئے مجبور تھا کہ میرا کوئی رقیب بھی ہے۔

میں اس واقعہ کو فراموش کرنے کے لئے اپنے جذبات اور احساسات کو مُردہ کردینا چاہتا تھا۔ میں رات اس خود فراموشی کے عالم میں بسر کرنا چاہتا تھا۔ ایڈیلین بار میں مجھے ایسے رفیق مل گئے جن کی میں تلاش میں تھا۔ اس رات میں پُرتکلف رنگ رلیوں میں غرق رہا۔ اور جب گھر جانے کے اٹھا، تو نومبر کی سرد صبح بار کے دریچوں میں سے جھانک رہی تھی۔ میری نیند نے جو اس دن چار بجے شام تک رہی میرے جسمانی نظام کے حیوانی عناصر کے توازن کو پھر قائم کردیا۔ شام کے وقت میں ذرا چہل قدمی کیلئے باہر نکلا اگرچہ شروع میں میرا ارادہ نہ تھا۔ میں ویا ماجیدیں ٹھہر گیا۔ نریٹی کے مکان کی کھڑکیاں بند تھیں۔ میں نے دیوار کی محراب کو دیکھا۔ اس پر اب تک خون کے نشان تھے۔ میں کپکپا گیا۔ مجھے ایسا معلوم ہوا کہ میں ابھی تک نریٹی کو اس کی سفید کھلی آنکھوں کے ساتھ دیکھ رہا ہوں۔ اب بغض و حسد کی روح نے مجھے پھر عذاب دینا شروع کیا۔ جو تھا شخص کہاں تھا؟ یہ کون تھا؟ مبادلات خارجہ پر غریب نریٹی کا مدمقابل اور بارگاہ الفت میں میرا رقیب آخر یہ تھا کون؟

میں نے تہیہ کرلیا کہ اس کا کھوج لگاؤنگا۔ اس کو معلوم کرونگا۔ اس کو میدان میں للکارونگا اور اپنے تیز چمکدار خنجر کی نوک اس کے دل و جگر میں اتار دوں گا۔ میں نے قسم کھائی کہ اپنا اور مرحوم جارج نریٹی کا انتقام لونگا۔ آہ! میں نے کس قدر مردانہ، جرأت آمیز اور شاندار کارناموں کے سلسلہ کو عمل میں لانے کا ارادہ کیا اور انہیں اپنے بہادرانہ اور تباہ کن غیظ و غضب کا شکار بنانا چاہا۔

چوتھا آدمی دریافت کرنے کے لئے نریٹی کی خادمہ سے گفتگو کرنا ضروری تھا۔ چند دن بعد میں نے اس سے پبلک مارکٹ کے راستے پر ملاقات کی۔ میں نے اس سے اس کی مالکہ کی خیریت دریافت کی۔

اپنی چالاک آنکھوں سے ٹکٹکی باندھ کر مجھے دیکھتے ہوئے اس نے جواب دیا۔ "سائنورا اچھی طرح ہے!"

"دیکھو مینکا مجھے تم سے ایک نہایت اہم امر کے متعلق گفتگو کرنی ہے"۔ خادمہ نے میری اس پُراعتماد آواز پر حیران ہوکر اپنی بھوری اور کینہ دوز آنکھیں لمبی بھی کھول دیں۔

"میں کچھ جاننا چاہتا ہوں۔ تمہاری مالکہ کے پاس کوئی شخص آتا ہے؟"

"نہیں نہیں میں نے کسی کو نہیں دیکھا۔ میں کچھ نہیں جانتی"۔

میں نے سونے کا ایک سکہ اس کے ہاتھ پر رکھ دیا۔ خادمہ نے سامان کی ٹوکری نیچے رکھ دی۔ جیب سے ایک دھاری دار رومال نکال کر سکّے کو مضبوطی سے باندھا اور پھر میری طرف متوجہ ہوئی۔

جہاز کا کپتان ہنری ناستاریٹی نریٹی کی خودکشی سے پیشتر سائنور لڈیا کے پاس اکثر آتا جاتا تھا ——— آپ جانتے ہیں؟

"میلکا میں تمہارا ممنون ہوں"۔

دوسری شام میں اس کافی خانے میں گیا جہاں ملاح اکٹھے ہوتے تھے۔ میں نے سائنور ناستاریٹی کے متعلق پوچھا۔ خادمہ نے ایک میانہ قد اور چوڑے سینے والے شخص کی طرف اشارہ کیا جس کی آنکھیں گھنے اور گھنی ابروؤں کے نیچے چمک رہی تھیں۔ اس کا پتلا چہرہ گندم رنگ کا تھا میں نے فوراً اس کا اور اپنا مقابلہ کیا۔ وہ مجھ سے غالباً زیادہ وجیہ اور عمر میں یقیناً بڑا تھا۔ میں نے ہر طرف دیکھا میں وہاں کی تمام چیزوں سے ناآشنا تھا۔

آدھی رات گئے ایک جہاز کا ایجنٹ جو میرا دور کا رشتہ دار تھا آیا۔ میں اُسکو ایک طرف لے گیا اور ناستاریٹی کے متعلق باتیں دریافت کرتا رہا۔ میں نے اُسے بتایا کہ بینک کے کاروبار کے لئے ان کی ضرورت ہے۔

وہ تباہ شدہ آدمی ہے۔ آخری ضرب دو سال ہوئے جارج نریٹی نے لگائی تھی۔ ایک عرصے کی رفاقت کے بعد وہ ایک دم سے دشمن بن گئے۔ اور ایک دوسرے کے خلاف جنگ کا اعلان کر دیا۔ تھا لیکن کوئی ناستاریٹی کی شکست کی وجہ نہیں جانتا۔ معلوم ہوتا ہے خاوند کی دوستی گنوا کر وہ اس کی بیوی کی الفت اور محبت حاصل کرنے میں کامیاب ہو گیا کس قدر عجیب انتقام تھا!

میں نے ناستاریٹی پر جو ایک دیوتا کے سے سکون اور وقار کے ساتھ ایک موٹا سگار پی رہا تھا قہر و غضب کی ایک نگاہ ڈالی اور دل برداشتہ ہو کر رخصت ہوا۔

میرا دل نفرت و حقارت سے پاش پاش ہو رہا تھا۔ ناستاریٹی سے زیادہ میرے دل میں حسین لڈیا سے نفرت تھی جو رنج و غم کے لشکروں میں محصور ہونے کے باوجود حسن و عشق کی رنگینیوں کے لئے وقت نکال سکتی تھی۔

دسمبر اور جنوری گذر گئے۔ ان ایام میں میں باہر نہ نکلا۔ لیکن مجھے اس امر کا بھی اعتراف کرنا پڑیگا کہ جس دن سے ناستاریٹی اپنے جہاز لاتوینیا کے ساتھ ایک طویل سمندری سفر پر روانہ ہوا۔ محبت کی گرفت مجھ پر ڈھیلی ہو گئی۔ اب جبکہ میرا رقیب میرے راستے میں نہیں تھا۔ میں اپنے تئیں مظلوم خیال نہ کرتا تھا۔

مارچ کے آخر میں مجھے نریٹی کی بیوہ سے ملاقات کرنے کا خیال آیا۔ اس واقعہ کے بعد وہ گھر سے باہر نہ نکلی تھی۔ میرا خیال تھا یہ ملاقات آخری ہوگی اور اس کے بعد میں مرض محبت سے شفا پا جاؤں گا۔

اس ابر آلود اور گرم شام کو لوگ بازاروں میں افسردہ اور خاموش چل پھر رہے تھے۔ گویا تھکان اور گرمی نے انہیں ناکارہ کر دیا ہے۔ میں اپنے خون میں ایک خاموش اور پوشیدہ حرارت کی تپش محسوس کرتا تھا۔ نریٹی کے مکان پر جا کر مجھے معلوم ہوا۔ کہ سائنورا وارثت کے متعلق اپنے قانونی مشیر سے مشورہ کرنے گئی ہے۔ اس اتفاق نے میری طبیعت کو اور بھی مکدّر کر دیا۔ میں نے انتظار کرنے کا ارادہ کر لیا۔ خادم مجھے ایک چھوٹے سے کمرے میں لے گیا۔ جس سے میں اچھی طرح واقف تھا۔ وقت گذارنے کے لئے میں نے ایک البم اٹھا کر ورق گردانی شروع کر دی۔ اس کے پہلے حصے میں معمولی بے معنے اور احمقانہ چیزوں کی تصاویر تھیں۔ دوسرے میں عمدہ تصویری کارڈ تھے۔ البم کے آخر میں ایک کارڈ تھا جس نے فوراً میری توجہ کو اپنی طرف کھینچ لیا۔ اس پر ناستاریٹی کے جہاز لاتوینیا کی تصویر تھی اور ڈاک کی مُہر کی تاریخ ۲۵ ر فروری تھی۔ یہ راز معلوم ہونے کے بعد حملے کے لئے میرے ہاتھ ایک اور زبردست آلہ آ گیا۔ اس سے میرے ظاہری غیظ و غضب میں بہت کچھ اضافہ ہو سکتا تھا چند لمحوں کے بعد سائنورا نریٹی بھی آ گئی۔

ہم نے نہایت خاموشی سے ایک لفظ تک کہے بغیر ایک دوسرے کو جھک کر سلام کیا۔

"گینٹو کہاں ہے؟"

"میری ایک بہن کے پاس!"

لڈیا ایک میز کے مقابل کرسی پر بیٹھ گئی اور مجھ پر اپنی سرد اور بے مہر نگاہیں گاڑ دیں۔ میں نے محسوس کیا میرا دل بیٹھا جا رہا ہے۔ شاید یہ میرے دل کی آبادی کے تاریک اور بلند بُرجوں کی آزادی کے لئے جد و جہد ہو۔

"سائنورا! میں آپ سے جواب طلب کرنے آیا ہوں"۔

"آپ کو یہ حق کس نے دیا ہے؟"

"ہمارے ایام رفتہ نے!"

"آہ! میں آپ سے التجا کرتی ہوں۔ اُن کی یاد تازہ نہ کیجئے۔ مجھے نہ ستائیے" اور یہ الفاظ کہتے ہوئے اسکے نازک ہونٹ درد کی شدت سے

لرز رہے تھے۔

"اور سائتورا اب آپ ان ایام رفتہ کی یاد سے پشیمان ہیں؟ کیا یہ زود پشیمانی بعد از وقت نہیں ہے؟"

"توبہ کا دروازہ ہمیشہ کھلا ہے۔ میں ان کو فراموش کر کے نجات حاصل کرنا چاہتی ہوں۔ ملامت اور پشیمانی نے میری روح کو پاش پاش کر دیا ہے۔ ایک گہرائی! ایک ناپیدا کنار گہرائی مجھے ماضی سے جدا کرتی ہے مستقبل سے جدا کرتی ہے۔ ایک گہرائی جس پر صلیب کا نشان آویزاں ہے!"

"سائتورا وہ کیا گناہ ہیں جو آپ کی روح کو عذاب دے رہے ہیں؟ کیا وہ جن میں میں آپ کا شریک تھا؟ یا کوئی اور؟ مجھے یقین ہے سائتور ناستاریتی بھی یہاں آتا تھا؟"

اس نام پر وہ چونک پڑی اور جلدی سے بولی "ٹھہریئے! ٹھہریئے" "تو کیا کپتان ناستاریتی تقریبیں کرنے آتا تھا میری جگہ لینے نہیں؟" "ٹھہریئے! میں بتاتی ہوں ——— آپ کے شکوک غلط ہیں! غلط!"

"سائتورا میرے پاس آپ کو ملزم ٹھہرانے کے لئے ایک تحریر ہے۔" میں نے اپنے بٹوے سے خودکشی کرنے والے کا رقعہ نکالا۔

"یہ مردہ آدمی ہے جو آپ کی تردید کرتا ہے!" سائتورا لڈیا نے اپنے خاوند کی تحریر پہچان لی۔ اُس نے یہ پڑھی اور پھوٹ پھوٹ کر رونا شروع کر دیا۔

"آہ! غریب نریٹی! ناستاریتی میری الفت کا خریدار تھا۔ لیکن کبھی اُسے نہ خرید سکا۔ میں بے گناہ ہوں"۔

لیکن اس بیان نے مجھے یقین نہ دلایا۔ ہاں حسین لیکن بے وفا بیوہ کے رونے سے میرے دل کو ایک گونہ تسلی ہو گئی۔

"سائتورا اگر آپ تائب ہونا چاہتی ہیں تو مجھے سچ سچ بتا دیجئے۔ آپ جانتی ہیں میں معاف کرنے کو تیار ہوں۔ مجھے کچھ خیال نہیں اپنے شوہر یا عاشق سے بے وفائی کرنا تو آجکل کا رواج ہے۔ اور محبوبہ کے جرم کی پاداش میں الفت سے دست بردار ہونا جیسا کہ میں کر رہا ہوں ایک بزدلانہ فعل ہے!"

"مجھے معاف کر دیجئے" لڈیا نے رُک رُک کر کہا "مجھ پر اعتماد کیجئے۔ میں نے آپ کو کبھی دھوکا نہیں دیا"۔

"سائتورا مجھے آپ پر اعتماد ہے۔ میں ایک دن اخبار میں جہاز لاتونیا کی اپنے مسافروں اور کپتان سمیت غرقابی کی خبر پڑھنے کی امید رکھتا ہوں۔ لیکن لڈیا آپ اپنے گناہوں کا کفارہ ادا کریں۔ لڈیا اپنے گناہوں سے تائب ہو جائیں! میں معاف کرتا ہوں۔ لڈیا آپ کیوں روتی ہیں! اپنی سیاہ آنکھوں کی جھپک کیوں کھوتی ہیں—......

الوداع لڈیا! ہر ایک روک کا اٹھ جانا ہمیں زندگی کے فرومایہ تعلقات کے عام پھیر میں لا رہا ہے۔ آہ! کاش ہماری توبہ ایام رفتہ کی یاد کو محو کر دے! لیکن انہیں آلودہ نہ کرے!

میں جلدی سے زینہ سے اُتر آیا اب میں بالکل تندرست تھا۔

چراگاہ کے انتہائی سرے پر نریٹی کے خاندان کا مقبرہ ہے وہاں ایک سنگی کتبہ پر یہ الفاظ کندہ ہیں:۔

"جہاز ران کمپنی کا مالک جارج نریٹی یہاں ابدی نیند سوتا ہے"۔

اس کے پہلو میں ایک اور قبر ہے جس پر یہ کتبہ نصب ہے:۔

"اُس کی باوفا بیوی لڈیا ۲۷ مارچ ۱۹۰۶ء کو اس سے جا ملی"

اور یہ اشعار لاطینی زبان میں لکھے ہیں:۔

"کیونکہ میں اپنی بے اعتدالیوں کی معترف ہوں اور میرے گناہ ہمیشہ میرے سامنے ہیں۔ آہ! مجھے اپنی رحمت سے معاف کر دے میں پاک ہو جاؤنگی۔ مجھے دھو ڈال میں برف سے زیادہ سفید نکلونگی"

ان اشعار کا مصنف یقیناً کوئی کلیسا کا راہب ہوگا جس کے سامنے توبہ کرتے ہوئے لڈیا نے اپنے گناہوں کا اعتراف کیا ہوگا۔

(مسولینی) **حنیف ہاشمی**

ستارہ

اے غمناک ستارے میں تیری قسمت پر آنسو بہاتا ہوں، تیری قسمت پر جس کی ٹمٹماتی ہوئی روشنی سمندر کے تاریک طوفانوں میں ملاحوں کی راہنمائی کرتی ہے۔ اور جس کی شرگیں نگاہوں نے آسمان کی محفل کو سجا رکھا ہے دیوتا اور انسان دونوں تجھ سے بیزار ہیں۔ تو محبت نہیں کرتا اور نہیں جانتا محبت کس طرح کی جاتی ہے تو فضائے بسیط میں مسلسل رقص کرتا اور پستی کے رہنے والوں کی نگاہوں کو مسحور کرتا ہے لیکن میں محویت کے عالم میں تجھے اور نصف شب کے اس پُرسکوت منظر کو فراموش کر چکا ہوں۔

گوئٹے **ممتاز**

مسولینی کی کہانی اُس کی اپنی زبانی

"میں ہمیشہ سے ایثار کی زندگی کے گیت گاتا رہا ہوں میں نے بہت سے میدان بھی مارے ہیں لیکن کبھی اپنے ذاتی فائدے کی خاطر جنگ نہیں کی۔ میں نے ہمیشہ اپنے قومی فوائد کو ملحوظ رکھا ہے۔ لوگوں نے بہت سے موقعوں پر میری تعریف کی ہے کوئی مجھے فاتح کہتا ہے اور کوئی قوم کا نجات دہندہ ان خوشامدانہ اور نمائشی القاب نے میرے دماغ میں نخوت بھر دی لیکن ان بے جا تعریفوں سے میں کبھی مغرور نہیں ہوا۔

میرے اندر اتنی طاقت اور صلاحیت تھی۔ کہ فرانس کے نمونے پر جمہوری طریق حکومت کی بنیاد رکھ دیتا لیکن میں اس سے بھی بے خبر نہ تھا کہ افسران ماتحت جن کے رگ و پے میں حسد و کینہ اور شرارت و سازش کوٹ کوٹ کر بھری ہوتی تھی ہمیشہ اس موقعہ کی تاک میں بیٹھے رہتے تھے۔ کہ مجھے قید و بند کی سلاسل میں جکڑ دیں۔ حکومت دیکھ رہی تھی۔ کہ آئینی قواعد و حدود کے اندر رہ کر میں کیا کچھ کرسکتا ہوں۔

میرا معمول تھا۔ کہ ہر بات کو دیکھنا، دوبارہ دیکھنا اور سہ بارہ بنظر غور دیکھنا۔ میں مسلسل کئی کئی راتیں آنکھوں میں کاٹتا لیکن وہ راتیں غور و فکر اور عملی تجاویز میں سوچنے کے لئے وقف ہوتی تھیں۔ اس شور نے اور پرانے ہال (پارلیمنٹ) کو میں ایک میدان کارزار بنا سکتا تھا۔ جو یا بیا نعشوں سے پٹا پڑا ہو میں پارلیمنٹ کے دروازوں کو تیغہ کر کے بند کرسکتا تھا۔ اور ایسٹ (مجسٹریٹی) گورنمنٹ قائم کرسکتا تھا۔ یہ تمام باتیں سرانجام دینے کی طاقت میرے اندر ودیعت تھی۔

میں نے دنیا کی غیر ضروری آسائش و زیبائش کو ذرہ بھر تاسف کئے بغیر ہمیشہ کے لئے خیر باد کہہ دیا لیکن کھیل کود اور ورزشی تفریحوں کو میں نے قائم رکھا۔ مجھے ان کا اس لئے بھی شوق تھا۔ کہ یہ میرے بدن میں چستی اور پھرتی پیدا کرنے کی ذمہ دار تھیں اس سے میری مصروف زندگی کے لئے صحت اور انبساط کے مشاغل بہم پہنچتے تھے ان چھ سال میں — سوائے سرکاری ضیافتوں کے — میں نے کبھی کسی رئیس کے دیوان خانے یا کسی سوداگر کی دوکان پر قدم نہیں رکھا۔

میں اس قدر مصروف کار رہتا ہوں کہ کسی درد باف کی ہرزہ سرائی سننے کیلئے میرے پاس قطعاً کوئی وقت نہیں تھا۔

میں تمام کھیلوں سے محبت رکھتا ہوں۔ میں موٹر پورے پورے اعتماد سے چلا سکتا ہوں۔ میں نے کئی مقامات کا دورہ کیا ہے جسے کہنہ مشق اور تجربہ کار موٹر چلانے والوں نے تعجب کی نظروں سے دیکھا ہے۔ میں ہوائی جہاز سے بھی محبت کرتا ہوں جب حکومت کے اندیشوں نے مجھے مشغول کر رکھا تھا۔ تو مجھے ہوائی جہاز کے کپتان کا اجازت نامہ (لائسنس) حاصل کرنے کے لئے چند اسباق کی ضرورت تھی۔ ایک بار میں پچاس میٹر کی بلندی سے گر پڑا لیکن اس حادثے نے مجھے پرواز کے اشتیاق سے باز نہ رکھا۔

کسی ٹی پارٹی کی تقریب پر شہسواری کرنا بھی میرے لئے پُر مسرت وقت گذاری ہے۔ اور شمشیر زنی (جس سے مجھے دلی رغبت ہے) کی ورزش سے مجھے سب سے زیادہ اطمینان قلب حاصل ہوتا ہے غم و یاس کے عالم میں اگر میرا رفیق اور مونس تنہائی ہوتا ہے۔

میں تخیلی چیزوں سے پرہیز کرتا ہوں اور تاکو نوشی تک سے بھی بچتا رہتا ہوں تاش اور بڑے کھیلوں مثلاً کرکٹ، ہاکی، فٹ بال وغیرہ سے مجھے قطعاً دلچسپی نہیں ہے۔ مجھے ان لوگوں کی حالت زار پر رحم آتا ہے۔ جو اپنا عزیز وقت، مال و دولت اور بعض وقت اپنا تمام سرمایہ حیات کھیل کود کی نذر کر دیتے ہیں۔

مجھے اس بات کا فخر حاصل ہے۔ کہ گذشتہ شش سالہ زندگی میں میں نے نہ تو دل کا اطمینان کھویا ہے۔ اور نہ توازن دماغ اور نہ جذبۂ انصاف پروری کا رشتہ ہاتھ سے چھوٹنے دیا۔ جب صوبۂ روم میں عام ہڑتال کا خوف طاری تھا۔ تو میں نے فلورنس کے فوجی سپاہیوں کو حکم دے دیا تھا۔ کہ دارالسلطنت کے گلی کوچوں میں مظاہرہ کریں۔

مسلح فوج جب جنگی گیت گاتی تھی۔ تو لوگوں میں ترغیب پیدا ہوتی تھی۔ یہ ایک ایسا طریق ہے جس سے عوام کو اپنا ہمنوا بنایا جاتا ہے۔ میں نے اُن مجسٹریٹوں سے تہور آمیز الفاظ میں خطاب کیا۔ جو بڑے بہادر اور شجاع تھے۔ کہ "ہم اپنے دشمنوں کو خس و خاشاک کا انبار بنا دینگے"۔

میں اور میری زندگی اس چیز سے جو میرے پیش نظر ہے۔ اور جو کچھ میں اب کر رہا ہوں۔ ہرگز ہرگز جدا نہیں۔ مجسریٹی حکومت کے ماتحت طلوع آفتاب سے نصف شب تک پیٹ پر پتھر باندھ کر دوسرے دن کی مشقتوں کے انتظار میں گذارہ کرنا سخت مشکل ہے۔ میں اس پُر مشقت زندگی کا ایک نمونہ ہوں۔ یہ نظام اور میں ایک ہی جگہ سیئے ہوئے ہیں۔ لوگوں کے خیال میں جنبش ہوگی شاید کوئی افسانہ ہے۔ لیکن میں وہ ہوں۔ جسے قسمت اور دست تقدیر نے ایسی ہستی بنایا ہے جس کی آنکھیں، کان اور جملہ حواس خیالات، تمام وقت اور حتیٰ کہ تمام

قوت ملکی زندگی کے دائرے میں محصور ہے۔
میرا افسانہ کوئی عام قصہ کہانی نہیں۔ بلکہ وہ اصول حکمت عملیوں اور کسی حکومت کے مستقبل کا افسانہ ہے۔
میں اپنے لئے کوئی چیز نہیں مانگتا۔ اور نہ اپنے اقربا کے لئے کسی شے کا مطالبہ کرتا ہوں۔ نہ مجھے کسی مادی فائدے یا اعزاز اور شخصی رضامندی کی قراردادوں کی ضرورت ہے۔ جن سے تاریخ عالم میں شہرت پانے کا خیال پیدا ہو۔
میری غایت وغرض بہت ہی مخصوص ہے۔ میں اٹلی کو ہمسایہ اقوام میں بزرگ، معزز اور مہیب بنانا چاہتا ہوں۔ اور بس ؛

(مسولینی)　**فیروز حسن بٹ ایم اے ایم او ایل**

جذباتِ داس مرحوم

آ اے کہ تیری ہر لہر سدا　مشغول ہے قطرہ نوازی میں
تو مست ہے عشوہ طرازی میں　میں گم تری شعبدہ بازی میں
تو نور وضیا کا سمندر ہے　ظلمت سے بھری ہستی ہے مری
تو موج پہ ہے، تو اوج پہ ہے　مشتاق تری پستی ہے مری
اسوقت کہ دنیا نیند میں ہے　سنسان ہے سطح سمندر کی
ہے چاندنی پھیلی چار طرف　دلچسپ فضا ہے منظر کی
کیا سچ ہے کہ تو بھی جلوہ نما　ہے جلووں کے اس منظر میں
کیا تیری نشیلی آنکھوں نے　مستی یہ بھری ہے سمندر میں
یہ سچ ہے۔ تو ڈال اے حسنِ ازل　پرتو مرے اس غم خانے پر
مشتاق ہوں تیرے کرشمے کا　ہوں شیفتہ تیرے ترانے پر
پہناؤں گا جامہ نظم کا میں　جب اپنے دل کی صداؤں کو
رگ رگ میں برنگِ برق تپاں　دوڑاؤں گا تیری اداؤں کو
اے مطربِ روح ہو جلوہ فگن　پھر آج شبِ تنہائی میں
ہے چھیڑتا اپنے ترنم کو　تو روحوں کی گہرائی میں

(۲)

اس وقت ہے نورِ سحر کی کرن　ہے بحرِ تلاطم خیز عیاں
پھیلی ہیں فضا میں روشنیاں　دوڑی ہیں ہوا میں روشنیاں
سن سن کے صدائیں مست تری　موجوں پہ سماں ہے عجب طاری
اٹھتی ہیں کبھی سب جوش میں آ　گرتی ہیں کبھی بے خود ساری
یہ سچ ہے کہ تیرے ساز میں ہے　موسیقی کی اک شان نئی
پر ہے یہ کسی کے اشارے سے　ہر تان نئی ہر آن نئی
پھر بھی مری فکر بلند و رسا　کر سکتی نہیں اس راز کو حل
ہے کس کا اشارہ مخفی یہ　ہے کس کا پس پردہ عمل
جو تیرے ساز کی تانوں میں　بھرتا ہے عجب مستانہ دھنیں
دلچسپ دھنیں پُر جوش دھنیں　سر اپنا دھنیں جو ان کو سنیں

(۳)

آنکھوں سے زمین وزماں کی سُنی　ہے ہستی پُر اسرار تری
پر صبح کے نور میں جلوہ نما　ہے روشنئ رخسار تری
جب انگلیاں تیری چھیڑتی ہیں　بادِ سحری کے ارگن کو
ہیں کرتی مست سمندر کو　ہیں رقص میں لاتی گلشن کو
کرتا ہے سروں کو بلند اگر　تو اپنی چلبلی تانوں میں
ہلچل سی ہے پڑتی آندھیوں میں　جوش اٹھتا ہے طوفانوں میں
کیا چیز ہے یہ پوشیدہ بتا　نغموں میں تیرے اے مست ادا
ہوتی ہے کبھی جو آہ وفغاں　بنتی ہے کبھی ہنسنے کی صدا
لرزہ میں ہے دنیا کی رگِ جاں　سن سن کے تری آہنگوں کو
رعشہ ہے امنگوں پر طاری　ہے جوش ولوں کی ترنگوں کو

(۴)

دی صبح نے بانسری چھیڑ اپنی　ہے گونج رہی آواز اُس کی
آواز ہے دلکش اور دھیمی　کم کم ہے ابھی پرواز اُس کی
پھوٹی ہے ابھی سورج کی کرن　ہے جھلمل جھلمل پانی میں
منہ بند کنول جو تیرے ہیں　کھلنے پہ ہیں مائل پانی میں
جب کرنیں جھیل کے پانی کو　چمکا کے سنہری کر دینگی
پھولوں کو ہنسا کے تجلی سی　پانی کی فضا میں بھر دینگی
ہے صبح کی نے میں تیری صدا　کرتی ہے جو یوں مدہوش مجھے
یہ وجد میں لانے والی ہوا　رکھ سکتی نہیں خاموش مجھے

وحید الدین سلیم

بسمارک اور فرانس

اگرچہ نپولین سوم نے بسمارک کے ساتھ سمجھونہ کرکے آسٹریا اور پرشیا کی جنگ میں غیرجانبدار رہنا منظور کرلیا تھا لیکن اسے اس بات کا گمان تک نہ تھا کہ پرشیا کی فتوحات کی رفتار اس قدر تیز ہوگی۔ اس لئے کونی گراٹز کی لڑائی کے بعد جب آسٹریا نے اس سے بیچ میں پڑنے کی درخواست کی، تو وہ فوراً آمادہ ہوگیا۔ پھر گفت وشنید کے دوران میں ایک وقت ایسا آیا۔ جب صاف طور پر یہ معلوم ہوتا تھا کہ وہ آسٹریا کی خاطر پرشیا پر دباؤ ڈالنا چاہتا ہے۔ بسمارک نے اسوقت تو اس کو کسی نہ کسی طرح راضی کرلیا۔ اور اس طرح پر فرانس سے مسلح کشیدگی کا خطرہ ٹل گیا۔ مگر جب عارضی صلح کی شرائط طے ہوگئیں تو اس کے فوراً بعد بین ڈیٹی نے گورنمنٹ فرانس کے زیر ہدایت غیرجانبداری کا معاوضہ مانگا اور مطالبہ کیا کہ دریائے رائن کے دائیں کنارے کا جرمن علاقہ فرانس کے حوالے کر دیا جائے۔ یہ بات بسمارک کے مصلحت پسندانہ تحمل کے لئے بھی ناقابل برداشت تھی۔ چنانچہ اس نے جواب دیا کہ میں اس علاقہ کو فرانس کے حوالے کرنے کی بجائے فرانس سے جنگ کرنا اچھا سمجھونگا۔

اب نپولین اور بسمارک دونوں اس تاک میں رہنے لگے کہ جب فریق ثانی کمزور ہو۔ اُسی وقت اس پر حملہ کر دیا جائے ۱۸۶۷ء میں لکسمبرگ میں فوج رکھنے کے حق پر جھگڑا ہوگیا۔ اس وقت بسمارک نے وہ معاہدے پیش کر دیئے جو اُس نے جرمنی کی جنوبی ریاستوں کے ساتھ کئے تھے۔ یہ ایک چیلنج تھا۔ جو تمام جرمنی کی طرف سے فرانس کو دیا گیا۔ نپولین مجبوراً خاموش ہو رہا اور آسٹریا کے ساتھ اتحاد کی بات چیت کرنے لگا۔ جہاں بسمارک کا پرانا مخالف بیوسٹ ان دنوں چانسلر یعنی وزیراعظم تھا۔ آخر ۱۸۷۰ء میں سپین کی تخت نشینی کے سوال پر جھگڑا اٹھ گیا۔ سپین کے مارشل پرم نے بسمارک پر زور دیا کہ خاندان ہوہنزولرن کے پرنس لیوپولڈ کو سپین کا بادشاہ منظور کرلیا جائے جب نپولین کو اس تجویز کا علم ہوا۔ تو اس نے بین ڈیٹی کی معرفت شاہ پرشیا سے جواب طلب کیا۔ پرشیا کے دفتر خارجہ نے بسمارک کے حسب ہدایت اس تجویز کے متعلق نہ صرف ہر قسم کی ذمہ داری سے انکار کر دیا۔ بلکہ لاعلمی کا اظہار بھی کیا۔ شاہ پرشیا نے بین ڈیٹی کو اس سلسلہ میں شرف باریابی بخشا۔ لیکن جب نپولین نے شاہ پرشیا کو جھکتے دیکھا۔ تو اپنے مطالبات میں اضافہ کر دیا۔ اور اصرار کیا کہ پرشیا نے سپین کی تخت نشینی کے معاملہ میں جو دست اندازی کی ہے اس کے لئے فرانس سے معافی مانگی جائے۔ یہ ایک ایسا مطالبہ تھا۔ جس کی تعمیل کرنا پرشیا کیلئے ذلت کا موجب تھا۔ اس لئے جنگ اٹل ہوگئی۔ نپولین نے جنگ کی تیاریاں کر رکھی تھیں۔ فرانسیسی فوجوں نے فوراً پرشیا کے خلاف پیشقدمی شروع کر دی۔ لیکن ایسی شکست کھائی کہ چند ہی ماہ کے بعد پیرس پر پرشین فوجوں کا قبضہ ہوگیا۔

۱۸۶۶ء والی جنگ کی طرح بسمارک اس جنگ کی رفتار میں بھی ذاتی طور پر دلچسپی لیتا رہا۔ اس نے وقتاً فوقتاً فوج کے ہیڈ کوارٹر کا معائنہ اور فوجی انتظامات کے متعلق محکمہ جنگ سے تبادلہ خیالات کیا۔ گریو لوٹ کی لڑائی اور سیڈن کی تسخیر اس جنگ کے اہم ترین واقعات میں سے ہے۔ ان دونوں موقعوں پر بھی وہ بذات خود فوج کے ساتھ تھا۔ جب فرانسیسی فوج نے ہتھیار ڈال دیئے تو اس کے بعد ۲ ستمبر کو نپولین کے ساتھ اسکی ملاقات ہوئی۔ جو تاریخ کا ایک قابل یادگار واقعہ ہے۔ وہ شاہ پرشیا کے ہمراہ فاتحانہ حیثیت سے پیرس میں داخل ہوا۔ اور کئی ماہ تک ورسیلز میں رہا۔ یہاں بیٹھکر اُسنے سلطنت جرمنی کا دستور آئینی مکمل کیا۔ ان دنوں اسے اس وجہ سے بڑی تشویش رہی کہ مبادا تھیئرس غیرجانبدار طاقتوں کو فرانس کے حق میں مداخلت کرنے کی ترغیب دینے میں کامیاب ہو جائے۔ پیرس کو حوالے کرنے سے پہلے اس نے فرانسیسیوں سے عارضی صلح کی شرائط بھی خود ہی طے کیں۔

فرانس اور پرشیا کی جنگ کے دو اہم ترین نتیجے یہ نکلے کہ فرانس میں شہنشاہیت کی بجائے جمہوری حکومت قائم ہوگئی اور جرمنی پرشیا کی قیادت میں ایک عظیم الشان سلطنت بن گیا۔

۱۸۷۰ء کے بعد

۱۸۷۰ء کے بعد بسمارک کلیتہً ملکی معاملات میں منہمک ہوگیا۔ پہلے یہ بیان کیا جاچکا ہے کہ ۱۸۶۶ء کے بعد آسٹریا کو شکست دینے اور جرمن ریاستوں میں اُس کا زور توڑنے کے بعد اُس نے اپنے پارلیمنٹری مخالفوں سے سمجھوتہ کیا اور ایک نیشنل پارٹی قائم کرلی۔ اس سے کنسرویٹو پارٹی کے ساتھ اُس کی کشیدگی ہوگئی تھی۔ ۱۸۷۰ء کے بعد یہ کشیدگی اس حد تک

بڑھی کہ اُس کے بہت سے پرانے دوست بھی اُس سے الگ ہو گئے۔ ۱۸۷۲ء میں وہ وزیراعظم پرشیا کے عہدہ سے ریٹائر ہو گیا۔ لیکن چند ماہ کے بعد پھر واپس آ گیا ۱۸۷۳ء میں رومن کیتھالک چرچ کے ساتھ اُس کی جدوجہد شروع ہوئی۔ اس سلسلہ میں اس کے خلاف اسقدر نفرت پھیلائی گئی کہ ایک نوجوان نے اس پر گولی چلا دی۔ ۱۸۷۷ء میں اس نے خرابی صحت کی وجہ سے دس ماہ کی طویل رخصت لے لی۔ ۱۸۷۸ء میں برلن کانگرس کی صدارت کی اور یورپ کو ایک عالمگیر جنگ میں مبتلا ہونے سے بچا لیا۔ اس کانگرس کی کامیابی کا شمار اُس کی زندگی کے اہم ترین کارناموں میں کیا جاتا ہے۔ اس کے بعد اس نے چند سال تک اپنی توجہات تجارتی اصلاحات پر صرف کیں۔ ان اصلاحات کو وہ اسقدر اہم سمجھتا تھا کہ اس زمانہ میں پرشیا کا وزیر تجارت بھی وہ خود ہی بن گیا۔ ۱۸۸۸ء میں ولیم اول کی وفات سے جو شاہ پرشیا کے علاوہ اب قیصر جرمنی بھی بن گیا تھا۔ بسمارک کی پوزیشن میں بڑا فرق آ گیا۔ اگرچہ نیا قیصر فریڈرک جو زمانہ ولیعہدی سے اس کا مخالف تھا۔ چند ہی ماہ کے بعد راہی عدم ہوا۔ مگر قیصر ولیم دوم کے ساتھ بھی اس کے اختلافات تھوڑے سے عرصہ کے بعد اسقدر نمایاں ہو گئے کہ اس نے ہمیشہ کے لئے ریٹائر ہو جانا مناسب سمجھا۔ یہ ۱۸۹۰ء کا واقعہ ہے۔

قیصر سے کشیدگی

ریٹائر ہونے کے بعد وہ ہمبرگ کے قریب فریڈرک سرا میں قیام پذیر ہو گیا۔ یہ ایک عالیشان محل تھا۔ جو اس نے اپنی لائن برگ کی جاگیر میں بنوا لیا تھا۔ اس کے ریٹائر ہونے سے قیصر بڑی سخت مشکلات میں گھر گیا۔ ان مشکلات کا نقشہ قیصر نے اپنی یادداشتوں میں بدیں الفاظ کیا ہے:-

"مجھے اس کے جانشین کے تقرر کا مسئلہ سخت پریشان کن نظر آیا۔ جو کوئی بھی اس کا جانشین ہوتا۔ وہ اس کے سوا کچھ توقع نہیں کر سکتا تھا۔ کہ اس پر چاروں طرف سے نکتہ چینی کے تیروں کی بارش ہو گی۔ اور اسے ایک ایسے عہدے کا غاصب سمجھا جائیگا۔ جس کا وہ اہل اور حقدار نہیں۔ یہ بات یقینی تھی کہ اس کے کسی کارنمایاں کا اعتراف تو بالکل نہیں کیا جائیگا۔ البتہ وہ عالمگیر مخالفت کا نشانہ ضرور بنجائیگا اور مخالفوں میں نہ صرف وہ لوگ شامل ہونگے۔ جو بسمارک کو عقیدت کی نگاہوں سے دیکھتے ہیں بلکہ وہ بھی جو اس سے پہلے بسمارک کے مخالف تھے۔ مگر ان کی مخالفت موثر طریق پر نہیں کر سکے۔ یہ بھی یقینی ہے کہ نئے چانسلر کے خلاف عداوت کی جو زبردست لہر پیدا ہو گی۔ اس میں خود بسمارک بھی کچھ کم خطرناک عنصر نہیں ہو گا۔"

آگے چل کر قیصر نے لکھا ہے کہ ان سب باتوں کو مدنظر رکھکر کسی ایسے شخص کو چانسلر مقرر کرنے کا فیصلہ کیا گیا۔ جو بسمارک کے حلقہ سے تعلق رکھتا ہو۔ جس نے زمانہ ہائے جنگ میں اہم ذمہ داریوں کو سر انجام دیا ہو اور جو خود بسمارک کے ماتحت حکومت کے کسی ممتاز عہدے پر سرفراز رہا ہو۔ اس لئے میری نظر انتخاب کپریوی پر پڑی۔ اس کا عمر رسیدہ ہونا اس بات کی ضمانت تھا کہ وہ "تعلیم" اور نوجوان شہنشاہ کا محتاط اور سکون پسند مشیر ہو گا۔

مگر ان تمام احتیاطوں کے باوجود بسمارک اور اس کے مداحوں نے گورنمنٹ پر نکتہ چینی کی بوچھاڑ جاری رکھی۔ خود بسمارک بعض اوقات دوران گفتگو میں اور بعض اوقات اخبارات کے کالموں میں گورنمنٹ پر ایسی تلخ نکتہ چینی کرتا تھا کہ کئی مرتبہ اس کے اور قیصر کے درمیان کھلی کشیدگی پیدا ہو گئی۔ ایک بار یہاں تک نوبت پہنچی کہ کونٹ کپریوی نے جرمن سفیروں کے نام ایک خفیہ گشتی مراسلہ جاری کیا۔ جس میں ان کو متنبہ کیا گیا کہ بسمارک جو کچھ کہتا ہے یا لکھتا ہے اسکو ہرگز کوئی اہمیت نہ دی جائے۔ ایک مرتبہ جب بسمارک اپنے لڑکے کی شادی کے سلسلہ میں ویانا گیا۔ تو وہاں کے جرمن سفیر پرنس ریوس کو ہدایت کر دی گئی۔ کہ اس کی آمد کا کوئی نوٹس نہ لیا جائے۔

وفات

آخر ۱۸۹۳ء میں قیصر کے ساتھ بسمارک کے تعلقات بحال ہو گئے ۱۸۹۵ء میں اس کی سالگرہ سارے جرمنی میں بڑی دھوم دھام سے منائی گئی۔ ۱۸۹۱ء میں یعنی ریٹائر ہونے کے ایک سال بعد پارلیمنٹ کا ممبر بھی منتخب ہو گیا۔ مگر اس کے اجلاسوں میں کبھی شریک نہ ہوا۔ قیصر کے ساتھ صلح ہو جانے کے بعد وہ عام طور پر گوشہ نشینی کی زندگی بسر کرتا رہا۔ ۳۱ جولائی ۱۸۹۸ء کو بمقام فریڈرک سرا میں اسکا انتقال ہو گیا۔

بسمارک کی خدمات کا اعتراف

پہلے بتایا جا چکا ہے۔ شاہ ولیم اول بسمارک کو وزیراعظم بنانا نہیں چاہتا تھا۔ کیونکہ بسمارک نے یہ شرط پیش کی تھی کہ میں خارجہ پالیسی میں شاہ کو دخل انداز نہیں ہونے دونگا۔ لیکن جب پارلیمنٹ سے جھگڑا بڑھ جانے کی صورت میں اُسے اپنا تاج و تخت غیر محفوظ نظر آیا۔ تو اس کے لئے اس کے سوا اور کوئی چارہ نہ رہا کہ وہ بسمارک کی شرائط منظور کر

لے۔ بسمارک نے بھی وزارت سنبھالنے کے بعد بادشاہ اور اور ملک کی خدمت ایسی تندہی اور وفاداری سے انجام دیں کہ چار ہی سال کے قلیل عرصہ میں بادشاہ کو پرشیا میں اور پرشیا کو جرمنی میں غلبہ حاصل ہو گیا۔ پھر فرانس کو شکست دیکر اس نے پرشیا کی قیادت میں جرمن سلطنت قائم کی۔ ان شاندار کارناموں اور دوسری گرانقدر خدمات کی وجہ سے ولیم اوّل اور عام اہل ملک اس کی اسقدر عزت کرتے تھے کہ وہ متواتر ۲۸ سال تک پرشیا اور جرمنی کا چانسلر رہا۔ یہ اسکی خدمات کا عملی اعتراف تھا۔ ان خدمات کا دوسرا بڑا اور موثر تر اعتراف وہ پریشانی تھی۔ جو قیصر ولیم دوم کو اس کا جانشین مقرر کرنے کے سوال پر لاحق ہوئی۔

مالی طور پر بھی اس کی خدمات کا اعتراف کرنے میں ملک و قوم نے بڑی دریادلی کا ثبوت دیا۔ ۱۸۶۶ء میں جنگ آسٹریا کے بعد پارلیمنٹ نے فتحمند جرنیلوں کے لئے ایک گرانقدر رقم منظور کی جس میں سے حصہ رسدی ۴۰ ہزار پونڈ بسمارک کو ملے۔ اس روپیہ سے اس نے پومرنیا میں وسذن کی جاگیر خریدی۔ جسے وہ بقیہ زندگی میں سکون ہاسن کی بجائے اپنی دیہاتی رہائش گاہ کے طور پر استعمال کرتا رہا۔ اس کی سترویں سالگرہ کے موقعہ پر پبلک چندے سے ۲ لاکھ ۷ ہزار پونڈ کی کثیر رقم جمع کی گئی۔ اس رقم کے نصف حصہ سے سکون ہاسن کی وہ جاگیریں خرید کر اسے واپس دے دی گئیں جن کو اس کے باپ نے چالیس سال پہلے مالی مشکلات کے باعث فروخت کر دیا تھا۔ باقی رقم سے اس نے سکول ماسٹروں کی امداد کے لئے ایک فنڈ قائم کر دیا۔

ذاتی اعزاز کے اعتبار سے بھی بسمارک اس بلندی پر پہنچ گیا تھا۔ جو شاہی خاندان کے اراکین کا حصہ سمجھی جاتی تھی۔ ۱۸۷۱ء میں اسے سفارتی خدمات کے صلے میں کونٹ کا خطاب دیا گیا اور ۱۸۹۰ء میں جب وہ ریٹائر ہؤا قیصر ولیم دوم نے اسے ڈیوک آف لائن برگ بنا دیا۔ ۱۸۹۱ء میں اس کو پرنس کا درجہ عطا کیا گیا۔ ڈیوک آف لائن برگ کا خطاب اس نے کبھی استعمال نہ کیا اور نہ اس کے بیٹے کو ورثے میں ملا۔

مذہبی حیثیت سے اسکی جو عزت افزائی ہوئی۔ اس کا اندازہ اس بات سے لگایا جاسکتا ہے۔ کہ وہ پہلا پراٹسٹنٹ تھا۔ جسے پوپ نے آرڈر آف کرائسٹ عطا کیا۔ اس عزت افزائی کو اگر اس کشمکش کی روشنی میں دیکھا جائے۔ جو اس کے اور رومن کیتھولک چرچ کے درمیان پیدا ہو گئی تھی۔ اور جس کی وجہ سے ایک نوجوان نے اس پر گولی چلا دی تھی۔ تو تسلیم کرنا پڑتا ہے کہ دنیا کے مذہبی بادشاہ بھی بسمارک جیسے رفیع الشان مدبروں کو مقدس خطابات دینے میں فخر محسوس کرتے ہیں۔

بسمارک کی عظمت

اس میں کلام نہیں کہ بسمارک اپنے زمانہ کا سب سے بڑا مدبر تھا۔ روس۔ فرانس۔ آسٹریا۔ اور انگلستان سب اس کا جواب پیش کرنے میں عجز کا اعتراف کرتے تھے۔ اس کی حکمت عملی کو کبھی ناکامی کا منہ نہ دیکھنا پڑا نتائج کے لحاظ سے اس کی کوئی چال غلط نہ ہوتی تھی۔ بین الاقوامی گتھیوں کو سلجھانے اور صورت حالات کو اپنے موافق بنا لینے میں کوئی اس کے کمال کا حریف نہیں تھا۔

ولیم اول نے بسمارک کو نہ صرف مجبور ہو کر چانسلر بنایا تھا۔ بلکہ ساری عمر اس کو چانسلر بنائے رکھنے پر مجبور رہا۔ اس نے کئی بار ریٹائر ہو جانے کی خواہش ظاہر کی۔ لیکن اس کی یہ خواہش ہمیشہ رد کر دی گئی۔ ایک بار ولیم نے اس سے بڑے زور کے ساتھ یہ کہا کہ میں آپ کو ہرگز ہرگز ریٹائر نہیں ہونے دونگا۔ بسمارک ولیم کو اپنے کام میں دخل انداز نہ ہونے دیتا تھا۔ کئی مرتبہ دونوں میں سخت اختلاف بھی ہو گیا۔ مگر ہر مرتبہ ولیم کو جھکنا پڑا۔ ایک دفعہ بسمارک کے ساتھ گفتگو کرنے کے بعد ولیم اضطراب کی حالت میں بیٹھا ہؤا تھا کہ اس کے کابینہ کا رکن اعلےٰ جنرل ایلبڈل اس کے پاس آنکلا۔ ولیم کا چہرہ غصے سے تمتما رہا تھا۔ جنرل ایلبڈل نے جب بسمارک کے ساتھ اس کی جھڑپ کا حال سنا۔ تو اسے اندیشہ ہؤا کہ کہیں شہنشاہ کی صحت پر اس کا برا اثر نہ پڑے۔ اس نے بڑے ادب کے ساتھ کہا "جہاں پناہ! آپ کو آئندہ کے لئے اس قسم کی کاہشوں کے امکان کا خاتمہ کر دینا چاہئیے اور اگر بسمارک جہاں پناہ کی مرضی کے مطابق کام نہیں کرنا چاہتا۔ تو اس کا بہترین علاج یہ ہے کہ آپ اسے برطرف کر دیں"۔ اس پر ولیم نے بے بسی کے انداز میں جواب دیا "تعریف اور شکر گذاری کے ان جذبات کے باوجود جو چانسلر اعظم کے متعلق میرے دل میں موجزن ہیں۔ میں اس سے پیشتر کئی بار اس کو برطرف کر دینے کا خیال کر چکا ہوں۔ کیونکہ اس کی خود سرانہ روش اکثر اوقات حد سے زیادہ ناقابل برداشت ہو جاتی ہے۔ لیکن میں اور میرا ملک دونوں بری طرح اس کے محتاج ہیں۔ صرف وہی ایک ایسا شخص ہے جو بیک وقت پانچ گیندوں کے ساتھ کھیل سکتا ہے۔ جن میں سے دو ہر وقت ہوا میں رہتے ہیں۔ یہ ایک ایسا کھیل ہے جس کا کھیلنا میری طاقت سے باہر ہے"۔

اس کھیل سے ولیم کی مراد بین الاقوامی جوڑ توڑ تھی اور پانچ گیندجن کو اوپر پھینکنے اور نیچے سے دبوچنے کا عمل بسمارک کا عزیز مشغلہ تھا۔ یوروپ کی پانچ بڑی طاقتیں تھیں۔ جن میں انگلستان بھی شامل تھا۔

بحری طاقت سے بے پروائی

حیرت کا مقام ہے کہ بین الاقوامی سیاسیات کا یہ عدیم النظیر ماہر بحری طاقت کو ذرا بھی اہمیت نہیں دیتا تھا جس کی بدولت انگلستان نے دنیا کے ہر حصے میں ایسی عظیم الشان سلطنت قائم کرلی ہے۔ قیصر ولیم دوم اپنی یادداشتوں میں لکھتا ہے :۔

"ہم نے نو آبادیات کے سوال پر متعدد بار پرنس بسمارک سے گفتگو کی۔ مگر اسے ہمیشہ اس رائے پر قائم پایا کہ نو آبادیوں کو فادر لینڈ[1] کیلئے مفید بنانا یا خام پیداوار بہم پہنچانے والی منڈیوں کے طور پر استعمال کرنا اتنا منفعت بخش نہیں۔ جتنا پولیٹیکل سوددوں کی غرض سے کام میں لانا"۔

"جیساکہ میرا فرض تھا۔ میں نے پرنس کو اس بات پر توجہ دلائی۔ کہ ہمارے تاجروں اور سرمایہ داروں نے بڑی تندہی کے ساتھ نو آبادیوں کی نشوو ارتقا کا آغاز کردیا ہے۔ میں نے اسے بتایا کہ یہ تاجر اور سرمایہ دار اپنے مفاد کی حفاظت کیلئے بحری فوج پر انحصار رکھتے ہیں۔ اس لئے جرمنی کو ایک جنگی بیڑا بنانے کے لئے ضروری تدابیر عمل میں لانا چاہئے۔ تاکہ جرمنی کے غیر ملکی مفاد غیر محفوظ حالت میں نہ رہیں۔ میں نے اسے یہ بھی بتایا کہ چونکہ آپ نے جرمن جھنڈا غیر ممالک میں نصب کردیا ہے اور باشندگان جرمنی اس جھنڈے کی پشت پر ہیں۔ لہٰذا اس کے حفاظت کے لئے بحری فوج بھی ہونی چاہئے۔ لیکن پرنس نے میرے بیانات کو بہرے کانوں سے سُنا اور اس کے جواب میں محض یہ فقرہ جو ایسے موقعوں پر اُس کا تکیہ کلام ہوتا تھا۔ استعمال کیا :۔

"اگر انگریز ہماری سرزمین پر قدم رکھیں گے تو میرا یہ کام ہوگا۔ کہ انہیں گرفتار کرلیا جائے"۔

"پرنس کا خیال تھا کہ ہم نو آبادیوں کی حفاظت اپنے گھر میں بیٹھکر کریں گے۔ وہ اس خیال کو کوئی اہمیت نہیں دیتا تھا۔ کہ یہ بات جرمنی کے لئے ناقابل برداشت ہے۔ کہ انگریز بلا مزاحمت اپنی فوجوں کو جرمنی میں اتار سکتے ہیں۔ کیونکہ ہیلی گولینڈ پر ان کا قبضہ ہے۔ نہ وہ اس خیال کو خاطر میں لاتا تھا کہ انگریزوں کے لئے جرمنی میں فوجیں اتارنے کو قطعاً ناممکن بنانے کے لئے ہمیں زبردست بحری فوج بنانے اور ہیلی گولینڈ کا قبضہ حاصل کرنے کی ضرورت ہے"۔

بسمارک کے ریٹائر ہو جانے پر جب کپرلوی کے عہد وزارت میں مشرقی افریقہ کے دو غیر اہم مقبوضات سے جو جرمنی نے تھوڑا ہی عرصہ پہلے حاصل کئے تھے۔ ہیلی گولینڈ کا تبادلہ کرنے کی تجویز پیش ہوئی اور اسوقت کا وزیر اعظم انگلستان لارڈ سالسبری بھی اس تبادلہ کے لئے رضامند ہوگیا۔ تو بسمارک نے اس تجویز کی مخالفت میں ایک طوفان برپا کردیا۔ اگرچہ یہ مخالفت کامیاب نہ ہوئی۔ لیکن اس سے یہ تو ظاہر ہے کہ بسمارک بحری طاقت کو جرمنی کے لئے کس قدر غیر ضروری سمجھتا تھا۔

بسمارک کے متعلق قیصر کی رائے

جیسا کے سطور گذشتہ میں بیان ہوچکا ہے۔ پرنس بسمارک معزول قیصر کے ساتھ اختلافات کی وجہ سے بدول ہوکر ریٹائر ہوگیا تھا اور اس کے بعد بڑے زور شور سے اسکی مخالفت بھی کرتا رہا۔ اس لئے عام طور پر یہ خیال کیا جاتا ہے کہ اس کے متعلق قیصر کی رائے اچھی نہیں تھی۔ مگر قیصر کے اپنے الفاظ سے اس خیال کی تردید ہوتی ہے۔ چنانچہ اپنی یادداشتوں میں وہ لکھتا ہے :۔

"ایک مدبر کی حیثیت سے پرنس بسمارک کی عظمت اور پرشیا اور جرمنی کے متعلق اسکی لافانی خدمات اس قسم کے نمایاں تاریخی واقعات ہیں کہ کسی شخص کو خواہ وہ کسی پارٹی سے تعلق رکھتا ہو۔ ان میں شک کرنے کی جرأت نہیں ہوسکتی۔ صرف یہی ایک وجہ ایسی ہے جس کی موجودگی میں مجھ پر یہ الزام لگانا محض حماقت ہے کہ میں پرنس بسمارک کی عظمت کو تسلیم نہیں کرتا۔ اسی سلسلہ میں یہ بات اچھی طرح ذہن نشین کرلینی چاہئے۔ کہ میں نے جس زمانہ میں اپنی زندگی کی ابتدائی منزلیں طے کیں وہ بسمارک کے عقیدت مندوں کا زمانہ تھا۔ وہ سلطنت جرمنی کا بانی اور میرے دادا کے وقت سے چانسلر تھا۔ ہم سب اسکو اپنے زمانہ کا سب سے بڑا مدبر سمجھتے تھے۔ اور اس بات پر فخر کرتے تھے کہ وہ جرمن ہے۔ وہ میرے دل کے مندر کا بت تھا۔ اور میں اُس کا پرستار۔

"لیکن فرمانروا بھی دوسرے انسانوں کی طرح گوشت پوست کے ہوتے ہیں۔ اور دوسروں کے طریقہائے عمل کے اثرات ان پر بھی پڑتے ہیں۔"

---

[1] دنیا کی تقریباً ہر ایک قوم اپنے آبائی ملک کو مادر وطن کہتی ہے۔ انگریزی زبان میں اس کا ہم معنی لفظ مدر لینڈ ہے۔ مگر جرمنی میں فادر لینڈ کہا جاتا ہے۔ فادر کے معنی باپ کے ہیں۔

پانی

یہ واقعہ ترکوں اور روسیوں کی اُس جنگ میں پیش آیا جو قفقاز کے قرب و جوار میں ہوئی تھی۔ ایک مشکوک سی لڑائی کے بعد جس میں ظاہری حالات و قرائن ہمارے خلاف تھے، ہم مشہور کوہ سُرخ پر دوبارہ قبضہ کرنے میں کامیاب ہو چکے تھے۔ دفعتہً ہماری رجمنٹ صفِ اوّل کی درماندہ اور تھکی ہوئی فوج کو کمک دینے اور اُسی علاقے کو دشمنوں کے وجود سے بالکل پاک کر دینے کے لئے آگے بڑھی۔ سات کا وقت تھا جب ہمیں کوچ کا حکم ملا۔ نیلگوں آسمان کے تابناک ستارے بستی کے رہنے والوں کو پُرتبسم نگاہوں سے دیکھ رہے تھے۔ ایک قسم کا پُر اسرار سکوت میدان کی وسعتوں پر چھا رہا تھا اور شفق کی دُھندلی روشنی میں چمکتے ہوئے نقطوں کی ایک ترچھی لکیر نظر آ رہی تھی ہم سب جانتے تھے کہ یہ روسیوں کا خیمہ و خرگاہ ہے جن سے دوسرے دن علی الصباح ہمیں لڑنا ہے۔

تمام سپاہی نہایت خاموشی سے چلے جا رہے تھے۔ کسی قسم کا شور کرنے یا تمباکو پینے کی قطعاً ممانعت تھی۔ اگر کسی قسم کی بے پروائی سے سنگینیں بھی ایک دوسرے سے ٹکرا جاتی تھیں تو افسرانِ بالا کی طرف سے قصوروار سپاہیوں کو دھیمی آواز میں سخت ڈانٹ بتائی جاتی تھی۔ اگر خوش قسمتی سے کوئی افسر قریب نہ ہوتا تو ہمراہی ہی ایک ہلکی سی کہنی لگا کر خبردار کر دیتے تھے۔

ہماری فوج سانپ کی طرح پیچدار پہاڑی راستہ طے کر رہی تھی اور ریت پر چلنے والے آٹھ ہزار قدموں کی آواز ایک متلاطم ندی کے شور سے مشابہ تھی۔ دوریٔ منزل کی وجہ سے پیدا ہونے والی تھکان دلوں میں ایک قسم کی افسردگی پیدا کر رہی تھی اور جتنا ہم اس بددلی کے خلاف جدوجہد کرتے تھے اُسی قدر اُس سے رہائی حاصل کرنا دشوار ہو رہا تھا۔ اپنی بندوق کاندھے پر رکھے اور تسموں کو مضبوطی سے باندھے میں آدمیوں کے اس ہجوم میں قدم بڑھاتے چلا جا رہا تھا۔ اور اس کوشش میں تھا کہ ہر قدم آرام سے اُٹھے تاکہ جس قدر بھی ممکن ہو اپنی کچھ نہ کچھ طاقت بچا لوں۔

میرے پہلو بہ پہلو اسی فوج کا ایک رضاکار رشید بے جا رہا تھا۔ وہ بالکل نوجوان لڑکا معلوم ہوتا تھا۔ اگرچہ میں رات کی تاریکی میں اُس کی شکل اچھی طرح نہ دیکھ سکتا تھا لیکن پھر بھی مجھے ایسا محسوس ہوتا تھا جیسے اُس کے چہرے سے خوف اور تھکاوٹ کے آثار ہویدا ہو رہے ہیں۔ یکایک اُس نے اپنا دایاں ہاتھ میرے بازو پر رکھ کر آہستہ آواز میں پوچھا "کیا ہمیں رات ہی کو لڑنا پڑے گا؟"

میں نے جواب دیا "اگر ایسا ہو بھی جائے تو پھر کیا ہے کیا تم اس بات سے خائف ہو؟"

ایک لمبی آہ اُس کا جواب تھا۔ ہر طرف مکمل سکوت طاری تھا۔ متفکرانہ اور ایک ساتھ اُٹھنے والے قدموں سے سپاہی اپنا راستہ طے کر رہے تھے۔

بالآخر ہم منزلِ مقصود پر پہنچ گئے۔ روسی پڑاؤ کی روشنیاں اب صاف دکھائی دے رہی تھیں۔ دشمن کے کیمپ پر قبرستان کی سی خاموشی چھائی ہوئی تھی۔ ہماری فوج ایک جگہ ٹھیر گئی پھر ہم نے آرام کرنے کی خاطر کمریں کھول دیں۔ سڑک پر چلنے کی نسبت دشمن کے قریب تر ہو کر ہم زیادہ آزادی سے سانس لے رہے تھے۔ اگرچہ ہمارے اور دشمن کے درمیان رات کے اندھیرے کی لامتناہی دیوار حائل تھی لیکن پھر بھی ہمیں معلوم تھا کہ یہ دیوار کیا چیز ہماری آنکھوں سے چھپائے ہے۔ روسیوں کی طرف سے ہوا کا ایک سرد جھونکا دلوں میں مبہم خیالات پیدا کرتا ہوا آہستہ سے گذر گیا۔

رشید بے میرے قریب ہی لیٹا تھا اُس نے آہستہ سے کہا "یہاں قریب ہی ایک دریا بہتا ہے۔ لیکن علی مغیث تمہارا کیا خیال ہے کل کچھ زیادہ گرمی تو نہیں ہو گی؟"

میں نے جواب دیا "آسمان ستاروں سے جگمگا رہا ہے، میرا خیال ہے کہ کل ضرور گرمی ہو گی۔"

یہ سُنتے ہی میرے دوسرے ہمراہی رافت بے نے بغیر کسی استفسار کے کہا "اگر روسیوں نے کل ہم پر حملہ کیا تو سورج کے بغیر بھی کافی گرمی ہو گی۔ ہمیں حکم ہے کہ اس مقام کو اپنے قبضہ میں رکھیں اور جہاں تک ممکن ہو سکے دوسرا دستہ پہنچنے تک اسی پہاڑ کی مدافعت کریں۔"

رشید بے نے پھر مجھ سے پوچھا "ہم خندقیں کیوں نہیں کھودتے؟"

رافت نے لاپرواہی سے جواب دیا "ہماری چوکی سے کچھ فاصلے پر

خندقیں بھی کھودی جارہی ہیں" پھر ذرا ہمدردانہ لہجہ میں اسے مخاطب کرکے کہنے لگا" تم سو کیوں نہیں جاتے۔ کل تمہیں سارا دن پر مشقت کام کرنا ہوگا"

لیکن اس نصیحت کا جس میں ایک قسم کا پدرانہ جذبہ شامل تھا' رشید پر کوئی اثر نہ ہوا۔ تمام فوج اس لڑکے کے اعلیٰ اطوار واخلاق کی بدولت اُس کی گرویدہ تھی۔ اس وقت وہ اپنے سر کو ہتھیلی پر رکھے متفکرانہ انداز سے دشمن کے پڑاؤ میں دور فاصلے پر جلنے والی آگ کی طرف دیکھ رہا تھا۔

"رشید تمہیں کس چیز نے فوج میں شامل ہونے کیلئے مجبور کیا تھا؟" میں نے نرمی سے پوچھا۔

اُس نے نہایت شریفانہ انداز میں جواب دیا" کیا کہوں عجیب بات ہے۔ کالج میں میں کوئی ہونہار طالب علم نہ تھا اور پڑھنے سے ہمیشہ جی کتراتا تھا۔ میرے ایک ماموں فوج میں ملازم تھے اُن کی دیکھا دیکھی مجھے بھی لفٹنٹ بننے کا شوق چرایا۔ اس امید پر کہ شاید ایک روز میں بھی کسی اعلیٰ عہدے تک پہنچ جاؤں گا۔ بس یہ بات تھی جس نے مجھے فوجی کاغذات میں اپنا نام درج کرانے کیلئے مجبور کیا تھا۔ بدقسمتی دیکھئے کہ میرے بھرتی ہونے سے چند ہی ماہ بعد لڑائی شروع ہوگئی"۔ پھر نہایت ہلکا سا قہقہہ لگا کر کہنے لگا" تم سمجھتے ہو میں لڑائی میں آنے کے لئے بیتاب تھا؟"

اس بات کا میں نے کوئی جواب نہ دیا۔ اس نازک اندام لڑکے کی طرف جس کی ابھی مسیں بھی نہ بھیگی تھیں اور جس کا معصوم چہرہ آفتاب کی تیز کرنوں کو بھی برداشت نہ کرسکتا تھا دیکھنے سے صاف ظاہر ہوتا تھا کہ وہ برضا ورغبت لڑائی پر آنے کیلئے آمادہ نہ تھا اور شاید اس کی یہ معصومیت اور مجبوری ہی تمام سپاہیوں کو اُس کے ساتھ محبت وشفقت سے پیش آنیکا باعث ہوئی تھی۔

"بہرحال" اُس نے چند لمحوں کے توقف کے بعد کہا" میں اپنے کئے پر پشیمان نہیں ہوں۔ کیونکہ اس قسم کی بزدلی ایک ترک کے شایانِ شان نہیں۔ البتہ جب کبھی مجھے اپنے گھر کا خیال آتا ہے تو طبیعت اُداس ہوجاتی ہے۔ ہمارے خاندان کے بہت سے افراد تھے۔ لیکن میری والدہ کا ہرگز یہ منشا نہ تھا کہ میں فوج میں بطور ایک سپاہی کے بھرتی ہوتا۔ ہم دیہات کے رہنے والے ہیں۔ جہاں لطف ومسرت سے زندگی بسر ہوتی ہے۔ گاؤں کے قریب ہی ایک خوبصورت دریا ہے۔ اور مجھے مچھلی کے شکار کا بہت شوق ہے"۔

میں اور رشید نے تمام رات آہستہ آہستہ باتیں کرتے رہے۔ حتیٰ کہ سپیدۂ صبح نے رات کی تاریکی پر آہستہ آہستہ غلبہ حاصل کرنا شروع کیا۔ ستارے یکے بعد دیگرے نظروں سے نہاں ہونے لگے اس وقت تک روسیوں کے الاؤ سرد پڑ گئے تھے۔ اور پہاڑ کی بلند چوٹیوں کے پیچھے سورج کی چوندھیا دینے والی گیند حیرت انگیز خوبصورتی سے بلند ہورہی تھی۔ سورج بتدریج بالائے افق آنے لگا ایسا معلوم ہوتا تھا کہ خون میں ڈوب کر نکلا ہے اور دیکھنے والوں کو دیکھتے ہوئے پہاڑ کی طرح جلا کر خاک سیاہ کردیگا۔

اتنے میں فوج کا کپتان ہمارے نزدیک سے گذرا۔ پھر سپاہیوں کو مخاطب کرکے کہنے لگا" اگر تمہاری کپیوں میں کچھ پانی باقی ہے تو اُسے نہایت احتیاط وحفاظت سے رکھنا۔ کیونکہ ہمارے پاس پانی کا ایک قطرہ بھی نہیں رہا۔ تمام پیپے واپس کردیے گئے ہیں اور شام سے پہلے یہاں نہیں پہنچ سکتے"۔

"لیکن توفیق بے" ایک نوجوان لفٹنٹ نے روسیوں کیجانب اشارہ کرکے کہا" وہاں کانی پانی موجود ہے ایک پورا دریا ہے"

"ہمیں اُس طرف ایک سپاہی بھیجنے کی بھی سخت ممانعت ہے۔ کیونکہ ہر ایسا فعل روسیوں کو ہم پر فوراً حملہ کرنے کی ترغیب دے سکتا ہے۔ فوج کا دوسرا دستہ شام سے پہلے یہاں نہیں پہنچ سکتا۔ اور اُس وقت تک ہمیں اسی جگہ ٹھیرنا ہے"۔

"پانی ختم ہوگیا ہے" بجلی کی سی تیزی کیساتھ یہ الفاظ ہر سپاہی کے کانوں تک پہنچ گئے۔ ناتجربہ کار رنگروٹ جنہیں اس سے پہلے میدان جنگ کی صعوبتیں برداشت کرنے کا تجربہ نہ تھا' زیادہ متفکر نظر نہ آتے تھے۔ لیکن سرد وگرم چشیدہ سپاہی جانتے تھے کہ ان الفاظ میں کتنی تلخی کتنی پریشانی اور کتنی ہیبت پنہاں ہے۔ اُس وقت تک فوجی جوانوں نے ان الفاظ کو زیادہ اہمیت نہ دی تھی حالانکہ افسران بالا کے نزدیک یہی الفاظ موت کے مترادف اور ہم معنے تھے۔

ایک نوجوان آدمی نے جو مجھ سے کچھ زیادہ فاصلے پر نہ تھا ذرا بلند آواز میں کہا" پانی کے بغیر کتنے عرصے کوئی زندہ رہ سکتا ہے؟ روٹی کے بغیر زندہ رہنا ممکن ہے لیکن پانی کے بغیر ہرگز نہیں"۔

"عبدالمجید۔ اس قسم کی احمقانہ گفتگو نہ کرو" رافت نے ذرا ترش لہجہ میں کہا۔ کیا تمہیں معلوم نہیں ہر سپاہی اس قابل ہونا چاہیے کہ سردی' بھوک اور ہر ضرورت کا مقابلہ کرسکے"۔

"بھوک۔ سردی اور دوسری ضروریات برداشت کی جاسکتی ہیں لیکن پیارے رافت

پیاس کا آپ نے ذکر نہیں فرمایا۔ پیاس ہرگز برداشت نہیں ہو سکتی۔"

"تیمو قوعت" رافت نے ذرا حاکمانہ انداز میں کہا "کیا تم اتنا بھی نہیں سمجھ سکتے کہ ہر ضرورت میں پیاس بھی شامل ہے؟"

سپاہیوں نے ایک قہقہہ لگایا اور عبدالمجید کچھ شرمندہ ہو کر خاموش ہو گیا۔ لیکن یہ خندہ مسرور اُس قہقہے کی مانند تھا جیسے ایک پھانسی پانے والے گنہگار نے کسی دار پر چڑھے ہوئے مجرم کو دیکھ کر لگایا ہو۔ کس کا دل تھا جو پانی کی عدم موجودگی پر دھڑک نہ رہا ہو اور کس کے حواس تھے جنہیں اس لرزہ خیز خیال نے پریشان نہ کر دیا ہو۔ ہر شخص یہ سوچ رہا تھا کہ جب ہمارے پاس پانی موجود ہی نہیں تو اُسے بچائیں گے کیا کیونکہ پانی کا ہر قطرہ گذشتہ رات کے طویل سفر میں سڑک ہی پر ختم ہو چکا تھا۔

تمام سپاہیوں کے چہروں پر ایک قسم کی اُداسی اور سراسیمگی چھا رہی تھی "پانی ختم ہو گیا ہے!" قابلِ تشویش امر یہ تھا کہ آیا پانی کے بھرے ہوئے پیپے اس پہاڑی خطے میں اتنی تیزی سے واپس بھی لائے جا سکیں گے کہ وہ ضرورت کے وقت یہاں پہنچ جائیں۔ رشید بے نے خوف و حیرت سے بھری ہوئی طفلانہ نگاہوں سے میری طرف دیکھ کر کہا "پانی کے بغیر ہم کس طرح زندہ رہ سکتے ہیں؟ مجھے تو اس وقت بھی پیاس محسوس ہو رہی ہے۔"

سورج ہر لحظہ بلند ہو رہا تھا اور اُس کی تابناک شعاعیں ہمارے چہروں پر پڑ رہی تھیں۔ ہر شخص یہ محسوس کر رہا تھا کہ پانی کے بغیر اتنی شدید حدت و گرمی سے عہدہ برا ہونا ناممکن ہے۔ اُدھر روسی افواج بالکل خاموش پڑی تھیں۔ انہیں پروا ہی کیا تھی؟ اُن کے پاس پانی موجود تھا۔ ایک پورا دریا اُن کے قدموں میں لہریں لے رہا تھا۔ شاید وہ اس بات کے منتظر تھے کہ دیکھیں تمازتِ آفتاب اُن کی مدد کے بغیر کس حد تک ہمیں تباہ و برباد کر سکتی ہے۔ پتھریلی چٹانیں جن کی اوٹ میں ہم جھلسے ہوئے چہرے چھپا رہے تھے، تنور کی طرح دہک رہی تھیں

انتظار اور درد و کرب کی طویل ساعتیں نہایت سست رفتاری سے گزر رہی تھیں اب گرمی ناقابلِ برداشت ہو چکی تھی۔ یہاں تک کہ سانس لیتے وقت ہوا کی بجائے آگ کے شرارے ناک اور منہ میں گھستے ہوئے معلوم ہوتے تھے۔ خشک ہونٹوں پر پپڑیاں جم گئی تھیں اور زبانوں میں اتنی نمی بھی باقی نہ تھی کہ جلے ہوئے لب ہی تر کئے جا سکیں۔ ہر طرف یہی لفظ سنائی دیتا تھا "پانی! پانی!"

فوج کے کسی سپاہی کو دنیا کی کسی چیز سے کوئی رغبت نہ رہی تھی آفتاب کی حدت و تیزی لحظہ بلحظہ بڑھ رہی تھی۔ یہاں تک کہ بندوق کی نالی پر ہاتھ رکھنا غیر ممکن ہو گیا تھا۔

رشید بے نے ایک قسم کی نیم مدہوشی کے عالم میں کہا "ہمارا دریا کتنا خوبصورت، کتنا چمکدار، صاف ستھرا اور کتنا گہرا ہے۔ اُس کا ٹھنڈا اور صاف پانی موتیوں کی طرح چمکنے والے خوبصورت رنگین پتھروں پر بہتا ہوا یوں دکھائی دیتا ہے جس طرح یاقوت و لاجورد کی چٹانوں پر پگھلی ہوئی چاندی۔ پھر وہاں ایک حباب اُٹھتا ہے۔ بڑا بلور کی طرح شفاف کیسی دھیمی رفتار میں ندی کے ساتھ ہی ساتھ تیرتا ہوا چلا جاتا ہے حتیٰ کہ ایک نوک دار پتھر سے ٹکرا کر پھٹ جاتا ہے۔ چھوٹی چھوٹی مچھلیاں اس کے کنارے کے قریب نہایت بے پروائی سے تیرتی پھرتی ہیں۔ اگر تم انہیں پکڑنے کیلئے اپنا ہاتھ بڑھاؤ تو وہ کمان سے نکلے ہوئے تیروں کی طرح مختلف اطراف و جوانب کو نکل جائیں گی۔ اگر تم پانی پینا چاہو تو نہایت آسانی سے گھٹنے ٹیک کر اپنے چلو میں برف جیسا سرد پانی بھر سکتے ہو۔"

یکایک کسی نے اشتعال آمیز آواز میں کہا "چپ رہ شیطان! ہم پیاس سے جاں بلب ہیں اور یہ پانی کی مدح سرائی کر رہا ہے۔"

معلوم ہوتا تھا کہ رشید بے نے اس آواز کو سُنا نہ تھا کیونکہ اسی قسم کی مدہوشانہ گفتگو کے بعد وہ خود بخود چپ ہو گیا۔

سورج کی جھلس دینے والی شعاعیں اب زیادہ تیز اور زیادہ بے رحم و بیدرد بن رہی تھیں۔ بدن دہکتے ہوئے انگاروں کی طرح تپ رہے تھے اور آنکھوں کے سامنے اندھیرا چھا رہا تھا۔ ایک ایک منٹ ایک ایک سال سے زیادہ طویل معلوم ہوتا تھا۔ اتنے میں ہمارے کپتان نے ذرا حوصلہ دلانے والے انداز میں کہا "بھائیو پانی کے پیپے بہت جلد یہاں پہنچ جائیں گے۔ اگر ان پیپوں میں زار روس کے جواہر یا سونا بھرا ہوتا تو شاید اس بے صبری سے ہم اُن کا انتظار نہ کرتے۔ میں آپ کو یقین دلانا چاہتا ہوں کہ ہمارے لئے خالص پانی آ رہا ہے۔ کیا اس دنیا میں پانی سے بہتر بھی کوئی چیز ہو سکتی ہے؟"

"پانی! ——— پانی!"

بخلاف اس کے روسیوں کے کیمپ میں بالکل سکون تھا۔ صرف گھوڑوں کے ہنہنانے کی دھیمی سی آوازیں ہمارے کانوں تک پہنچتی تھیں جس سے ہم یہ نتیجہ نکالتے تھے کہ انہیں نہلانے کے لئے دریا پر لے جا رہے ہیں۔ ہم کتنی بے بسی کے عالم میں تھے۔ دشمن کے پاس پانی کی اتنی فراوانی کہ وہ جانوروں تک کو نہلائیں اور اِدھر اتنی

قلت کہ صرف گلا تر کرنے کے لئے پانی کا ایک قطرہ بھی موجود نہ ہو۔"

"پانی!"

لیکن یہاں اس طرح پڑے رہنے سے حاصل؟" رافت بے نے پرجوش آواز میں کہا اگر وہ صرف دشمنوں تک پہنچنے کی ہمیں اجازت دے دیں تو ہم پانی حاصل کرسکتے ہیں! اللہ اکبر! ہم کس شجاعانہ انداز میں لڑیں گے! ہمیں کسی کمک وغیرہ کی ضرورت نہیں!"

میں نے آنکھ اُٹھا کر سپاہیوں کی طرف دیکھا۔ اُن میں سے کچھ بیٹھے تھے۔ کچھ اپنے بازوؤں پر سر رکھے لیٹے ہوئے تھے اور ساکت و جامد دشمن کے کیمپ کی طرف دیکھ رہے تھے۔ قاتل آفتاب نصف النہار پر پہنچ چکا تھا۔ اُس کی تڑپا دینے والی شعاعیں نہایت بیدردی و سفاکی سے ہلاک کر رہی تھیں اور ہم ماہی بے آب کی طرح تڑپ رہے تھے۔

اسی طرح دو گھنٹے گذر گئے۔ آفتاب ابھی تک ہمارے سروں پر تھا کئی سپاہی "صدمۂ آفتاب" سے بیہوش ہوگئے جنہیں اُٹھا کر فوجی ہسپتال میں لایا گیا اور پانی کے چند قطرے اُن کے حلق میں ٹپکائے گئے۔ میں سورج سے منہ چھپائے اوندھے منہ لیٹا تھا اور ہر لحظہ بڑھنے والی پیاس خون حیات کو میری رگوں میں خشک کئے دیتی تھی۔ اُس وقت میں سوچ رہا تھا کہ آیا پیاس کی شدت سے بڑھ کر دنیا میں کوئی اور چیز بھی اتنا دکھ اور اتنی تکلیف دے سکتی ہے۔ میری زبان خشک ہو کر تالو سے چمٹ گئی تھی اور میرا سر فضائے بسیط میں تیرتا ہوا نظر آتا تھا۔ بایں ہمہ بیرحم سورج ابھی تک بالائے سر چمک رہا تھا۔

اگرچہ مجھ پر بھی کسی وقت ایک نوع کی بیہوشی یا غنودگی طاری ہو جاتی تھی۔ لیکن پھر بھی میں اپنے اردگرد کے شور سے واقف تھا۔ میں نے سچ مچ پانی دیکھا۔ اُس کے بہنے کی ترنم ریز آواز سُنی اُسے دھیمے سُروں میں گنگناتے بھی سُنا اور اُس کے ٹھنڈک پہنچانے والے اثرات کو بھی محسوس کیا۔ لیکن جونہی میں نے سر اُٹھایا وہ دلفریب خواب میری نظروں سے غائب ہوگیا اور پانی کی بجائے میں نے گرم اور جھلسی ہوئی ریت دیکھی۔

رشید بے میرے قریب ہی دونوں ہاتھ اپنے گھٹنوں کے گرد حلقہ کئے بیٹھا تھا اُس کی مرجھائی ہوئی آنکھوں سے ہراس اور بیماری کے آثار نظر آ رہے تھے۔ اس نوعمر سپاہی کو دیکھ دیکھ کر میری تکلیف کی شدت میں اور اضافہ ہو رہا تھا۔ میں نے نرمی سے دریافت کیا "کیا تم بہت زیادہ تکلیف محسوس کر رہے ہو؟"

اُس نے لجاجت آمیز نظروں سے میری طرف دیکھا۔ اُس میں گفتگو کرنے کی سکت باقی نہ رہی تھی۔ چنانچہ نہایت دقت سے اُس نے جواب دیا۔ میں زیادہ دیر تک زندہ نہیں رہ سکتا۔ پیاس کی تکلیف اب مجھ سے برداشت نہیں ہو سکتی۔ دنیا کی ہر چیز میری دھندلی نگاہوں کے سامنے تیر رہی ہے"۔ پھر آنسو آہستہ آہستہ اُس کی آنکھوں سے نکل کر رخساروں پر بہنے لگے۔

بجلی کی سی تڑپ کے ساتھ ایک خیال میرے دل میں پیدا ہوا لیکن وہ آنسو میں نے کتنی للچائی ہوئی نگاہوں سے اُن کی طرف دیکھا۔ یہ بھی تو اصلی پانی تھا اور اتنا کہ اُس سے حلق بخوبی تر ہو جاتا میں سوچ ہی رہا تھا کہ رشید بے نے یکایک اپنے ہاتھ اُٹھا کر سر پر رکھے پھر زمین پر لیٹ گیا۔ میں فوراً سمجھ گیا کہ یہ "صدمۂ آفتاب" ہے

اتنے میں ہمارا فیلڈ سرجن اُسی طرف سے گذرا اور کسی نے چلا کر کہا "ڈاکٹر اسے ہسپتال میں لیجاؤ"۔ اس کے جواب میں ایک غصّہ آمیز آواز نے کہا "ہسپتال میں کیا رکھا ہے۔ خواہ وہ ہسپتال میں جائے یا جہاں پڑا ہے وہیں رہے اس کے لئے برابر ہے۔ نہ پانی وہاں موجود ہے نہ یہاں دستیاب ہو سکتا ہے"۔

رافت نے، جو ابھی ابھی وہاں سے آیا تھا۔ ان الفاظ کی تصدیق کی پھر کہنے لگا "فی الحقیقت پانی وہاں موجود نہیں۔ دوسری طرف پورا دستۂ فوج "صدمۂ آفتاب" سے بیہوش پڑا ہے مجھے ڈر ہے کہ پانی اگر بہت جلد نہ آگیا اُن میں سے بہت آدمی شہید ہو جائیں گے"۔ پھر رشید بے کی طرف اشارہ کرکے کہنے لگا "اور یہ غریب بھی مر جائیگا۔ آہ۔ ماں باپ کا لاڈلا بچہ"۔

ہمارے سپاہی مکھیوں کی طرح گر رہے تھے۔ اگر روسی اُس وقت ہم پر حملہ آور ہوتے تو تھوڑی سی جدوجہد سے ہمیں پسپا ہونے پر مجبور کرسکتے تھے۔ لیکن ایسا معلوم ہوتا تھا کہ گرمی کی اِس شدت نے اُن کے حوصلے بھی پست کر رکھے تھے حالانکہ اُن کے پاس حیات بخش پانی کی اتنی مقدار تھی۔

میں بے ہوش رشید بے کے قریب ہی لیٹا تھا کہ کسی نے نہایت سختی سے میرے شانے کو جھنجوڑا اور ایک آواز اس طرح میرے کان میں آئی "یہ پانی! پیپے پہنچ گئے ہیں!"

میں اُٹھ بیٹھا — نہیں، صحیح تر الفاظ میں یوں کہنا چاہئے کہ کسی نے مجھے اُٹھا دیا اور میں اُڑتا ہوا وہاں پہنچا جہاں پیپوں کے گرد بیشمار آدمی ہجوم کئے ہوئے تھے۔ رافت بے میرے ساتھ تھا۔ صرف وہ لوگ

پیچھے رہ گئے تھے جنھیں جہنم نما گرمی نے ہلنے سے معذور کر رکھا تھا اور اُن میں رشید بے بھی تھا۔

پیپوں کے گرد اتنا ہجوم تھا کہ غیر معمولی طاقت سے بھی کسی کو ہٹا کر آگے نکل جانا ناممکن تھا۔ افسر بے سود طور پر پستولوں سے امن و انتظام قائم کرنے کی سعی میں مبتلا تھے۔ پیاس تادیب و سرزنش سے زیادہ طاقتور تھی۔ اتنی آہ و زاری۔ اتنی چیخ و پکار اور اتنا شور و غل تھا جیسے ہر آدمی دیوانہ ہو گیا ہے۔ اس ہما ہمی اور ریل پیل میں مجھے رافت بے سے بھی پیچھے دھکیل دیا گیا اور ایک لمحے بعد مجھے معلوم ہو گیا کہ میں سب سے پیچھے کھڑا ہوں زندگی بخشنے والے پانی سے دور۔ بہت دور۔ مجھے اچھی طرح یاد ہے کہ میں نے جان کنی کی سی حالت میں چیخنا شروع کیا۔ اور اُن لوگوں کی پشت پر زور زور سے مکے مارنے شروع کئے۔ جو مجھے آگے بڑھنے سے روک رہے تھے۔ لیکن سوائے اس کے وہ مجھے گالیاں دیں اور اپنے پاؤں سے ٹھوکریں ماریں کسی نے میری اس شدید تکلیف کا ذرا احساس نہ کیا۔

رافت بے کو میں نے ایک بار پھر دیکھا۔ ایسا معلوم ہوتا تھا کہ وہ خاک پر لوٹ کر اُٹھا ہے۔ اُس کا چہرہ بیر بہوٹی کی طرح سُرخ اور پسینہ میں تربتر تھا اُس کی ٹوپی گم تھی اور پانی والی کپی دونوں ہاتھوں سے تھام کر اس نے چھاتی سے لگا رکھی تھی۔ میں نے اُس میں سے قلقل کی آواز سُنی۔ اُس میں پانی تھا۔ لیکن یہ بات میرے ذہن میں نہ آتی تھی کہ اتنے دیوانے ہجوم سے وہ کس طرح پانی حاصل کر لینے میں کامیاب ہو گیا تھا۔ میں اُس کی طرف تیزی سے بڑھا اور نہایت زاری سے بولا "رافت۔ مجھے تھوڑا سا پانی دو۔ اسکے عوض جو چیز تم طلب کرو میں دینے کو تیار ہوں!

اُس نے میری طرف رحم بھری نگاہوں سے دیکھ کر کہا "تو کیا تم خود کچھ بھی حاصل نہیں کر سکے؟ پانی تو بالکل ختم ہو گیا ہے۔ تمام پیپے خالی پڑے ہیں۔"

گرمی و تپش کے باوجود یہ سُنتے ہی میرا بدن سرد ہو گیا۔ میں نے لجاجت آمیز انداز میں بے صبری سے کہا "مجھے کچھ بھی نہیں ملا صرف ایک گھونٹ ہی دیدو۔ جو چیز چاہو میں دینے کو تیار ہوں۔"

رافت نے مستقل مزاجی سے جواب دیا "افسوس میرے پاس صرف اتنا پانی ہے جس سے میری اور رشید کی جان بچ سکے۔ کم از کم میں اُسے ایسی بُری حالت میں مرتے نہیں دیکھ سکتا۔"

میری حالت بد سے بدتر ہو رہی تھی۔ اس وقت نہ رشید بے نہ کسی اور کی زندگی مجھے اپنی جان سے زیادہ گرامی اور عزیز نظر آتی تھی میں نے سوچا کہ رشید بے کو کوئی اور اپنے حصّے میں سے پانی کے چند قطرات دیدیگا۔ آہستہ آہستہ میرا یقین پختہ ہو رہا تھا کہ اگر نصف ساعت تک پانی کے دو ایک گھونٹ مجھے میسر نہ آئے تو میری روح جسد خاکی سے پرواز کر جائیگی۔ برق آسا تیزی سے ایک خیال میرے دل میں پیدا ہوا۔ مجھے اس وقت مکاری اختیار کرنی چاہئے اور رافت کو یقین دلانا چاہئے کہ رشید مر گیا ہے تاکہ میں اُس کے حصّے کا پانی حاصل کر سکوں۔

جان کتنی عزیز ہوتی ہے! امتحان کے وقت محبت والفت اور شفقت و مہربانی کے کیسے کیسے دعوے بے نبیاد اور باطل ثابت ہوتے ہیں؟ صرف چند گھنٹے پہلے میں چاہتا تھا کہ اگر تھوڑا سا پانی بھی میسر آجائے تو میں تمام کا تمام رشید بے کو دیدوں گا۔ کیونکہ اس تکلیف کو برداشت کرنے کے لئے میں بہتر حالت میں تھا۔ لیکن اس وقت کہ فضائے محیط کرۂ نار میں تبدیل ہو چکی تھی۔ میرے مہر و مروّت کے جذبات پست اور عنصر اخلاق و تہذیب کمینگی اور فریب کاری میں منتقل ہو رہا تھا میں نے مری ہوئی آواز میں اُسے مخاطب کر کے کہا "رافت، رشید تو مر چکا ہے۔ میں نے اپنی آنکھوں سے اُسے دم توڑتے دیکھا تھا۔ اُسے اب پانی کی کوئی ضرورت نہیں رہی۔ کیا تم ایک مردہ انسان کے لئے پانی بچا رکھنا چاہتے ہو؟ لیکن میں پیاس کے مارے ہلکان ہو رہا ہوں۔ یہ لو دو قرش نصف پانی کے لئے ــــ خدا کے لئے مجھے پانی دو۔ مجھے پانی دو اُف! پانی! پانی!

یہ کہکر میں دو زانو ہو گیا۔ اور سر جھکا کر اُس کے گھٹنے پکڑ لئے۔ مجھے معلوم ہے کہ میری حالت زار اُس کے رحم کے جذبات کو بیدار کرنے میں کسی حد تک کامیاب ہو گئی تھی۔ لیکن رافت ابھی تک کشمکش میں تھا۔ چنانچہ کچھ لمحوں کے توقف کے بعد اُس نے کہا "اچھا اگر وہ مر چکا ہے تو خدا اُسے خلد بریں میں جگہ دے۔ اور اُس کی روح کو اطمینان نصیب کرے۔ وہ بہت زندہ دل اور خوش اطوار آدمی تھا۔ لیکن کیا کیا جائے سپاہی کی زندگی ہی کچھ ایسی ہوتی ہے۔ اب تم مجھے اپنی کپی دو تو میں اُس میں تھوڑا پانی اُنڈیل دوں۔ اور یہ چاندی کے سکے تم اپنے ہی پاس رہنے دو۔"

جس غرض کے لئے اُس نے میری کپی مانگی تھی مجھے معلوم تھا اُسے خوف تھا کہ اگر اُس نے اپنی کپی میرے حوالے کر دی تو میں تمام کا تمام پانی پی جاؤں گا۔ اور اُس کا خیال بالکل صحیح تھا۔

پانی مل جانے کے خیال ہی سے میری آنکھیں چمک اُٹھیں۔ میں نے

اُسی گرم اور گندے پانی کو جس میں سے مٹی کی بُو آ رہی تھی۔ نہایت بے صبری کے ساتھ حلق سے نیچے اُتارنا شروع کیا۔ اپنی ساری زندگی میں یہ پہلا موقعہ تھا کہ پانی مجھے اتنا لذیذ۔ اتنا شیریں اور اتنا خوشگوار معلوم ہوا رافت نے بھی چند قطرات منہ میں ڈالے۔ پھر اپنی کپی کو نہایت پیار سے تھپکی دے کر کہنے لگا "اسے میں سخت ضرورت کے لئے محفوظ رکھوں گا۔ لیکن خدا کے بندے تو کبتک بغیر پانی کے زندہ رہ سکتا ہے؟"

میں نے اس کا کوئی جواب نہ دیا۔ مجھے ابھی اور پانی پینے کی خواہش تھی۔ البتہ اتنا ضرور ہوا کہ جانگسل پیاس کی شدت اور جانکنی کی سی تکلیف، جس نے دنیا کی ہر چیز کا خیال میرے ذہن سے محو کر دیا تھا، اب مفقود تھی۔ حواس درست ہونے پر میں اپنے خود غرضانہ فعل پر ندامت و الم سے زمین میں غرق ہوا جاتا تھا۔ مجھے رہ رہکر غریب رشید کا خیال آ رہا تھا۔ کس طرح وہ اپنے تصور میں پانی کی تعریف کرتا تھا۔ اور کس بے کسی اور بے بسی سے غش کھا کر تپتے ہوئے سنگزار پر لیٹ گیا تھا۔ ہمارے قریب ہی مشتعل ہجوم کے افراد ایک دوسرے کو دھکیل کر خالی پیپوں کو اِدھر اُدھر اُلٹ رہے تھے اس موہوم اُمید پر کہ شاید وہ پانی کا صرف ایک ہی قطرہ حاصل کرنے میں کامیاب ہو جائیں۔ میں نے کئی سپاہیوں کو دیکھا۔ وہ گیلی ریت کو زبان سے چاٹ رہے تھے اور کئی اپنے گرم رخساروں کو پیپوں کے نمدار تختوں سے لگا لگا کر اپنے بے چین دلوں کو دھوکا دینے کی سعی میں مصروف تھے۔

"آؤ اپنی کمپنی میں چلیں"۔ رافت نے کہا "یہاں تو پانی کا ایک قطرہ بھی نہیں مل سکتا"۔ چند قدم کا فاصلہ طے کر کے میں نے مُنہ دوسری طرف پھیر لیا پھر ندامت و انفعال آمیز آواز میں بولا "رافت۔ میں نے تم سے جھوٹ بولا ہے۔ رشید بے زندہ ہے اُس غش آ گیا ہے۔ ....."

میں ابھی فقرہ پورا بھی نہ کرنے پایا تھا کہ رافت نے ایک لخت اپنا قدم روک لیا۔ اور میں بھی غیر اختیاری طور پر ٹھیر گیا۔ میں نے اپنا سر اُٹھا کر اُس کی طرف دیکھا۔ صرف ایک لمحے کے لئے ہم دونوں کی آنکھیں ایک دوسرے سے ملیں۔ لیکن مجھے جراءت نہ ہو سکی کہ اُس کی شعلہ بار آنکھوں کی طرف دیکھوں جو مجھے انتہائی حقارت و نفرت سے دیکھ رہی تھیں۔ میں نے شرم و خجالت کے جذبات سے مغلوب ہو کر پھر اپنا سر جھکا لیا۔

"کمینے ......" غیظ و غضب کے لہجے میں اُس کے منہ سے نکلا۔ پھر میرے مُنہ پر تھوک کر کہنے لگا "تم اُس سے زیادہ طاقتور ہو۔ شام تک پانی کا انتظار کر سکتے تھے۔ ممکن ہے اُس وقت تک کوئی سامان ہو جاتا۔ وہ غریب اب مرجائیگا! کتنا ذلیل اور کتنا شرمناک فعل ہے۔ ایک سپاہی ایک ترک ایک مسلمان کی شان سے گرا ہوا۔"

یہ کہکر اُس نے مُنہ پھیر لیا اور دوڑ کر رشید بے کی طرف گیا۔ میں دیکھ رہا تھا کہ وہ کس طرح سے دوڑتا چلا جا رہا تھا اور پھر یہ بھی دیکھا کہ کس پدرانہ شفقت سے جھک کر اُس نے رشید بے کے سر کو پس ماندہ پانی سے تر کرنا شروع کیا۔ اور کس محبت و ہمدردی سے اُس کا مُنہ کھول کر پانی کے قطرات نہایت احتیاط سے اُس کے مُنہ میں ٹپکائے۔ مبادا تمام دنیا کے زر و جواہر سے زیادہ قیمتی پانی کا قطرہ کہیں ضائع نہ ہو جائے۔ اُس کا یہ ایثار۔ اُسکی نیک نفسی اور اُس کا جذبۂ ترحم میرے دل کو شرم و خجالت کے بے پناہ تیروں سے چھلنی کر رہا تھا۔ اُسے اپنی جان کا کچھ خیال نہ تھا۔

مجھے جراءت نہ ہو سکی کہ میں اُسکے قریب چلا جاتا۔ میں اسکی گالیاں اور سب و شتم کی آواز سن رہا تھا اور فی الحقیقت اسی کا سزاوار تھا۔ اس وقت ایک قسم کی دہشت مجھ پر طاری تھی۔ لیکن اس کے باوجود میری دلی تمنا تھی کہ بہادر سپاہی اپنی چمکدار سنگینوں کے کچوکوں سے مجھے ہلاک کر ڈالیں کیونکہ اس کمینگی اس بزدلی کا احساس نہ صرف اُس وقت ناقابل برداشت تھا بلکہ اب بھی سال ہا سال گذر جانے کے بعد جب کبھی اس روح فرسا واقعہ کی یاد آتی ہے تو شرم و انفعال سے گردن جھکا لیتا ہوں +

ماخوذ

محمد ضیاء الدین شمسی

میں اپنے ہوش میں اے فتنہ گر نہیں نہ سہی — تری خبر تو ہے اپنی خبر نہیں نہ سہی

اُن مریضوں میں مرے عیسیٰ نے رکھا ہے مجھے — جن کے حق میں درد اچھا ہے دوا اچھی نہیں

کون ہے بزم کے قابل وہ سمجھ جاتے ہیں — سب نکالے گئے پروانے نکالے نہ گئے

تربیتِ اطفال کا پہلا اصول

کیا تم کسی ایسے لڑکے کو جانتے ہو جس کی لگاتار نگرانی کی جاتی رہی ہو۔ اور جس کے ہر ایک کام میں سختی کے ساتھ کسی خاص قسم کی آمیزش، کسی خاص بات کو ڈھونڈا جاتا ہے۔ کیا تم نے کبھی ایسا لڑکا بھی دیکھا ہے۔ جس نے اس طرح بہت سی ناخوش آیند عادتوں کو نہ بڑھا لیا ہو۔ کیا تمہیں کسی ایسے آدمی کا کھوج ملا ہے۔ جو اپنے ماں باپ یا اُستاد کے ظن و گمان کی خوردبین کے ہمیشہ سامنے رہا ہو اور پھر اس سے اُمید یہ رکھی گئی ہو کہ وہ کیرکٹر میں فراخ حوصلہ اور سورما بن جائے؟ ہر ایک قاعدہ کی طرح اس میں بھی استثنا ممکن ہے لیکن عام طور پر تم اس بات کو صحیح پاؤ گے کہ جن بچوں پر بھروسہ نہیں کیا جاتا اور ان کو ان کی ذاتی خودداری پر نہیں رہنے دیا جاتا وہ ہمیشہ بڑے ہو کر کمینہ اور ذلیل۔ تنگ حوصلہ۔ وہمی اور شکی مزاج کے مرد و عورت بن کر رہ جاتے ہیں۔ جیسا کرو ویسا بھرو اور یہ قدرتی قانون ہے الجنس یمیل الی الجنس یعنی ہر چیز اپنی ایسی ہر چیز ہی کی طرف جھکتی ہے۔ کے مطابق نکتہ چین۔ دوسروں کے عیوب ڈھونڈنے والی اور شکی طبیعت دوسری طبائع میں بھی جن سے اسے واسطہ پڑتا ہے۔ انہی اخلاقی کمزوریوں کو بیدار کر دیتی اور اُن کو بھی ایسی ہی خفیف حرکات کا بلاوا دیتی ہے۔ شکی مزاج آقاؤں کے نوکر بعض اوقات اس لئے خائن ہو جاتے ہیں کہ اُن کے متعلق شکی خیالات کو یہاں تک ترقی دی جاتی ہے کہ وہ بیچارے خود ہی اپنی استبازی و امانت میں شک کرنے لگتے ہیں اور آخر کار خود بھی اُسی تدبیر میں مصروف ہو جاتے ہیں وہ سوچتے ہیں کہ کیوں نہ وہ کھیل شروع کر دیں۔ جس کا انہیں کھلاڑی بتایا جاتا ہے۔ وہ بچے جنہیں احساس ہے کہ اُن کے متعلق اُن کے سرپرستوں اور نگرانوں کا یہ خیال ہے کہ وہ اپنے کام سے جی چُراتے اور اپنے روزمرہ فرائض کی بجا آوری میں سہل انگاری اور بھول سے کام لیتے ہیں۔ یقیناً تھوڑے عرصے بعد خود اُن ہی کا اپنے متعلق یہ خیال ہو جاتا ہے کہ وہ بھروسہ کے قابل نہیں اور یقیناً اُن میں سچ مچ کچھ بُری باتیں موجود ہیں۔ ورنہ اُن کے ماں باپ یا اُستاد ان کو ایسا کیوں خیال کرتے؟

اگر مضبوط اور شریفانہ کیرکٹر کو نشو و نما دینے کے لئے کوئی بات سب سے زیادہ اہم ہے تو وہ آزادی کا احساس ہے۔ اس لئے ایک بچے کو ضروری طور پر یہ محسوس ہونا چاہیئے کہ اس پر بھروسہ کیا جاتا ہے۔ اور یہ کہ وہ لگاتار شک و شبہ کا تختۂ مشق نہیں بنایا جاتا۔ اور یہ کہ اُس کے ماں باپ اور اُستادوں کو اُس پر اعتماد ہے۔ وہ اس کی مردانگی و انسانیت اس کے مقصد کی دیانت کو باور کرتے ہیں۔ ورنہ اس کے وہ اچھے اخلاق جو خدا نے اس میں ودیعت کئے ہیں بگڑ کر خراب و برباد ہو جائیں گے۔ اگر تم ہمیشہ اپنے بچے کی تاک جھانک میں لگے رہو گے اور اس پر بھروسہ نہیں کرو گے تو تمہارے اس رویّہ کی وجہ سے اُس کے عمدہ اوصاف جو قدرت نے اسے عطا کئے ہیں۔ کبھی بھی نہیں اُبھر سکیں گے بلکہ بچے کا یہ خیال کہ تم اسکی جاسوسی کر رہے ہو اسے حساس بنا دیگا۔ اور اس کی طبیعت کی جولانی اور خودمختاری کو برباد اور اس کی سرگرمی اور کام کے ولولے کو افسردہ کر دیگا۔

اپنے بچے کو نصیحت کرو۔ اسے پیار کرو۔ اسکی اُمیدوں اور تجویزوں سے ہمدردی کرو اور اس کو دکھا دو کہ تم اس سے توقع رکھتے ہو کہ وہ ہمیشہ اچھا کام ہی کریگا اور تمہیں اس پر بالکل اعتماد ہے۔ اگر ایسا کرو تو پھر تم اس کی فطرت میں چھپی ہوئی تمام بہترین اور شریف ترین قابلیتوں کو باہر لے آؤ گے۔ لیکن جتنا تم اسے بار بار دباتے رہو گے اس کی دیانت اور عزت میں شبہ کرتے رہو گے اور اپنے خیال کے مطابق کہ ایک بچے کے لئے کیا مناسب حال ہے۔ اس کی ہر ایک فروگذاشت پر ڈانٹ ڈپٹ اور سرزنش کرتے رہو گے تو یاد رکھو کہ تم اسے ہرگز ایک شریف آدمی کی صورت میں نشو و نما پاتے ہوئے نہیں دیکھو گے۔ ایک بُری طرح دبی ہوئی اور غلام بنائی ہوئی نسل نہ تو ترقی و عروج حاصل کر سکتی ہے اور نہ مضبوط کیرکٹر ہی پیدا کر سکتی ہے۔ اسی طرح دبایا ہوا۔ غلام بنایا ہوا سوسائیٹی کا ایک فرد بھی جو خواہ مرد ہو۔ یا عورت یا بچہ ہرگز ذہنی بلندی اور وسعت نہیں پا سکتا۔

جس وقت ہارورڈ یونیورسٹی کے پریزیڈنٹ اور پروفیسروں نے یہ فیصلہ کر لیا کہ وہ ہر ایک طالب علم کو آزاد چھوڑ دیں گے اور اس کی نگرانی نہ کرینگے۔ نہ اس کو اس بات کا احساس ہونے دینگے کہ وہ آٹھوں پہر کسی نکتہ چین کی نگاہ میں ہے۔ تو ان پر ملک کی طرف سے بہت سختی سے لے دے ہو رہی تھی۔ اور جب اُنہوں نے اعلان کیا کہ طالبعلموں پر مجالس وعظ یا کلیسائی عبادات میں شامل ہونا لازمی نہیں ہے تو ملک بھر میں ہارورڈ یونیورسٹی کے طلبہ کے ماں باپ نے خوف و خطر سے

ہاتھ اُٹھا اُٹھاکر کہنا شروع کر دیا کہ بس اب تو اُن کے لڑکے آوارہ گرد اور شیطان سے بدتر ہو کر رہ جائیں گے۔ مگر پریذیڈنٹ چارلس ڈبلیو۔ ایلیٹ کا اس سے مختلف خیال تھا کیونکہ اُسے اس کے اپنے پیشے اور فن کے متعلق مشاہدہ اور تجربے نے بالکل مطمئن کر دیا تھا کہ وہ طالب علم جس کی نگرانی کی جاتی ہو کبھی پسندیدہ کیرکٹر اور اعلےٰ اطوار میں نمایاں نہیں ہو سکتا۔ اس لئے اُس نے مضطرب ماں باپ اور سرپرستوں کو یقین دلایا کہ قدیم لازمی قواعد کی برطرفی سے اُس کا اور ہارورڈ یونیورسٹی کے دیگر ارکان کا یہی مقصد ہے کہ طلبہ کے لئے بہتر صورت حال پیدا کی جائے۔ اُس نے اُن کو بتایا کہ اس صورت میں لڑکوں کو خود بخود اپنی عزت کا جذبہ محتاط بنا دیگا۔ اور یہ احساس کہ ان پر اعتماد کیا جاتا ہے ان کو منظم کر دیگا۔ ورنہ اگر ہمیشہ ان کو آہنی ڈنڈے کے نیچے اور نکتہ چین نگاہ ہی میں رکھا جائے تو اس میں شک نہیں کہ وہ ڈپلوموں سے آراستہ ہو کر تو نکلیں گے اور حیثیتوں سے وہ دل کے کچے اور کمزور ہوں گے۔ انہیں اپنی ذات پر بھروسہ نہ ہوگا اور کسی کام میں پہل کرنے کی ہمت نہ ہوگی۔ حتیٰ کہ بالکل دنیا میں جد و جہد کرنے کے ناقابل ہوں گے۔

یہ وہ زمانہ تھا جبکہ امریکہ میں تمام کالجوں کے طلبہ کی نگرانی کی جاتی تھی اور انہیں اس طرح آہنی قوانین کی چار دیواری میں گھیر کر رکھا جاتا تھا کہ گویا وہ نادان چھوکرے ہیں۔ جو سیلف گورنمنٹ کے ناقابل ہیں۔ یہی حال ہماری دوسری تربیت گاہوں اور مدرسوں کا تھا کہ ہر وقت سپاہی اُن کے پیچھے اس طرح لگے رہتے تھے کہ گویا وہ چور ہیں۔ انہیں مجبور کیا جاتا تھا کہ نمازوں اور کلیسا کی عبادات و ریاضات میں حاضر ہوں اور جب کبھی اتفاقاً وہ وعظ و خطبہ کی مجلس سے غیر حاضر رہ جاتے تھے تو ان سے بری طرح باز پرس کی جاتی تھی۔ باقاعدہ حاضری لی جاتی تھی۔ اس طریق عمل کا نتیجہ یہ تھا کہ وہ نہ صرف اپنی غیر حاضری کیلئے جھوٹے عذر تراشتے تھے بلکہ جھوٹ بھی بول لیا کرتے تھے۔ ہر وقت ان سے بالکل اُن غیر ذمہ دار لوگوں کی طرح سلوک کیا جاتا تھا کہ گویا وہ اس قابل ہی نہیں کہ وہ اپنے اعمال و افعال کا آپ اندازہ کر لیں اور منظم رہ سکیں۔ ان سختیوں کے باعث جب کبھی بھی طلبہ اپنے پروفیسروں کی نگاہ سے اوجھل ہو جانیکا موقعہ پاتے تھے تو وہ روک تھام کو ایکطرف رکھدیتے اور بدترین قسم کی اوباشیوں میں مبتلا ہو کر ایسی بے اعتدالیوں کے گڑھے میں کود پڑتے تھے کہ جس سے اُن کا نکلنا اکثر ناممکن ہوتا تھا۔

اصلاح کا وہ قدم جو اوّل اوّل ہارورڈ یونیورسٹی نے اُٹھایا تھا آخر کار ملک بھر کے تمام سربرآوردہ تعلیمی مرکزوں میں اختیار کر لیا گیا۔ اور آج تو یہ حال ہے کہ ہمارے بہترین کالجوں نے اپنے طلبہ کو عملاً ہر قسم کی روک ٹوک سے آزاد کر رکھا ہے۔ اُنھوں نے ان کا معاملہ اُن کی انسانیت۔ اُن کی عزت پر رکھدیا ہے۔ اُن پر اعتماد کیا جاتا ہے کہ وہ اپنے اوپر قابو پائیں گے۔ اُن کی تربیت ہی ایسی ہوئی ہے کہ وہ اپنے عمل و خیال میں آزادی اور حریت سے کام لیتے ہیں۔ اور اس بات نے ان کو مضبوط اور زیادہ آزاد اور بہت زیادہ باقاعدہ انسان بنا دیا ہے۔ آج اگرچہ ہارورڈ یونیورسٹی کا تعلیمی مرکز پہلے سے بہت زیادہ ترقی کر گیا ہے لیکن جس وقت پریذیڈنٹ موصوف نے یہ اصلاحات وہاں روشناس کرائی تھیں۔ اس کے مقابلہ میں اب وہاں کے طلبہ کی گرفتاریاں ان کی بم بازیاں بہت کم ہو گئی ہیں۔

حریت کامل اور انفرادیت کو نشو و نما دینے کے لئے آزادئ عمل کی نہایت ضرورت ہے۔ کسی ایک لڑکے کے لئے یہ امر ہزار بار بہتر ہے کہ وہ جب اپنی مختار اور ذمہ داری پر کوئی کام کر رہا ہو تو غلطی پر غلطی کرتا چلا جائے۔ بہ نسبت اس کے کہ وہ چلے تو سیدھا مگر ساتھیوں کے سہارے پر یا دوسرے کے جبر سے لڑکے کیلئے بہتر ہے کہ وہ تنہا چلتے ہوئے کسی قدر لڑکھڑا بھی جائے بہ نسبت اسکے کہ وہ بالکل سیدھا چلے لیکن اس کی باگ کسی دوسرے کے ہاتھ میں ہو سخت ناکامی اور ٹھوکریں کھانیکے بعد ہی مگر یہ بہتر ہے کہ وہ اپنا راستہ آپ چلے بہ نسبت اسکے کہ دوسرے نے اسکی انگلی پکڑ رکھی ہو۔

(مہر محمد خاں شہاب - مالیر کوٹلوی)　　(سویٹ مارڈن)

فطرت

آؤ کہ ہم ان مسرتوں کا لطف اُٹھائیں۔ جن کا مزا صرف دانا لوگ ہی اُٹھاتے ہیں۔ آفتاب کی پاکیزہ روشنی ہمیں کھیتوں کی طرف بُلاتی ہے۔ جہاں معصوم اور سادہ مسرت ہماری منتظر ہے۔ آؤ کہ ہم پھولوں سے بھری ہوئی وادی میں چہل قدمی کریں اور اپنے خالق کے گیت گائیں۔ دیکھو نسیم آہستہ آہستہ جھاڑیوں کے ساز پر اپنے راگ چھیڑ رہی ہے۔ ایک ڈالی پر ننھے ننھے گانیوالے پرندے چہچہا رہے ہیں۔ انکی مسرت بھری آنکھوں میں خوشی کی چمک ہے اور ان کے نرم نرم نغموں میں محبت کا رس بھرا ہے سارے گھنے کنج اِلے واویلا۔ اور اے بہارِ دوام یہ قدرت کی کس قدر عنایتیں ہیں۔ تمہارا منظر کس طرح پاکیزہ روح کو اطمینان و مسرت بخشتا ہے۔ تمہاری کلیاں کسی آرٹ کی محتاج نہیں ہیں۔ اور یہ مناظر چمنستان کی ان رنگینیوں اور شادابیوں سے کہیں زیادہ دلآویز ہیں۔ جس پر انسانی ہاتھوں کو فخر ہے۔

(پرستارِ فطرت)

پورس

ارکان

سکندر = شاہِ یونان
پورس = ہندوستان کا ایک راجہ
ٹکسلا = ٹکسلا کا راجہ
اکشیانا = ہندوستان کی ایک مہارانی
کلیوفیلا = راجہ ٹکسلا کی بہن
ہپ فستیان سکندر کا سفیر

(دریائے جہلم کے کنارے راجہ ٹکسلا کا کیمپ)

ایکٹ اوّل

پہلا سین

کلیوفیلا۔ ذرا ہوش کی دوائیے اُس بادشاہ کے مقابلے کا دعویٰ جس کے جلال کے سامنے آسمان سرنیاز خم کرتا ہے۔ ایشیا کے سب بادشاہ جس کے قدموں سے لگے پڑے ہیں جس نے تقدیر کو بال باندھی لونڈی بنا رکھا ہے۔ یہ خیال خام دل سے نکال دو بھیا! آنکھیں کھولو اور دیکھو سکندر کس طرح سلطنتوں کو الٹ دیتا ہے۔ کیونکر خود مختار بادشاہوں کو پابزنجیر کرتا ہے۔ اور قوموں کی قوموں کے کانوں میں حلقہ غلامی ڈلوا دیتا ہے۔ اس لئے زمانہ کی آواز پہچانو۔ اُن کے انجام سے سبق لو اور وقت پر گولی بچاؤ۔

ٹکسلا۔ آپ یہ چاہتی ہیں کہ اس کی عالمگیر گرفت سے کانپ کر اپنی گردن پر اس کا جوا رکھ لوں۔ تاکہ سارا ہندوستان ایک زبان ہو کر یہ طعنہ دے کہ میں اپنے ساتھ قوم کو بھی غلامی کے گڑھے میں لے ڈوبا۔ آپ یہ چاہتی ہیں کہ پورس سے منہ موڑ لوں۔ اُن راجوں سے غداری کروں جو وطن کی آزادی کے لئے جان ہتھیلی پر لئے پھرتے ہیں جنہوں نے کھلے بندوں۔ ہانکے پکارے کہہ دیا ہے کہ اُن کی زندگی اور موت راجوں کی شان کے شایاں ہوگی۔ کوئی ایک ہی بتائیے جو سکندر کا نام سن کر کانپ اٹھا ہو۔ جس نے لڑنے سے جی چرایا ہو اور اس کے غلاموں کے زمرے میں داخل ہونے کے لئے ہاتھ پھیلائے ہوں یا خالی زبان ہی سے اسے ہفت اقلیم کا بادشاہ تسلیم کیا ہو۔ اُس کی شہرت سے سہم جانا تو کجا وہ تو یہ جتا کر رہیں گے کہ وہ فتح و نصرت کا واحد اجارہ دار نہیں۔ اور بہن! آپ مجھے اُس سے مدد مانگنے کی صلاح دیتی ہیں جس کے ساتھ دو بدو لڑنے کیلئے میری تلوار میان سے باہر ہو رہی ہے۔

کلیوفیلا۔ کہتی کچھ ہوں سمجھتے کچھ ہو۔ وہ تو آپ کی رفاقت اور محبت منت سے مانگتا ہے۔ اس سے کیا واسطہ کہ کسی اور کو خاطر میں نہیں لاتا۔ ہائے کس قدر آپ کا پاس ہے کہ جب اس کے قہر و غضب کی بجلیاں کوندتی ہیں تو وہ چپکے چپکے آپ کے بچاؤ کا بھی انتظام کرتا جاتا ہے۔

ٹکسلا۔ مگر حیرت ہے اس شرف کیلئے مجھے کیوں چنا گیا۔ اس کے دشمنوں سے جہلم کا کنارا پٹا پڑا ہے۔ اُن میں سے کسی پر یہ نظر عنایت کیوں نہ پڑی فرمائیے آخر میری جان اُنہیں کیوں اتنی عزیز ہے کہ مجھے دیکھ کر اپنے شعلۂ غضب کو دامن میں چھپا لیتے ہیں اس لئے تو نہیں کہ انہیں بس ذلت آفرین کرم کا سزاوار مجھ سے زیادہ کوئی نظر نہیں آتا۔ پورس موجود تھا۔ اُسے کیوں نہ کہا؟ شاید سکندر یہ جانتا ہے کہ اس کی ہمت مردانہ وطن فروشی کی روادار نہیں۔ وہ ایسی دعوت قبول نہیں کر سکتا۔ جو مجسم ذلت و رسوائی ہو۔ بس یہ ہے وجہ کہ جو تاج غیور سپاہیوں نے ٹھکرا دیا اس سے مجھے سرفراز کرنا منظور ہے۔

کلیوفیلا۔ وہ اور آپ کو ہیٹا خیال کرے۔ کوئی عقل کی بات ہے

بلکہ اُس کے خیال میں اُن تمام راجوں مہاراجوں میں آپ کی ٹکر کا سورما سپاہی ایک بھی نہیں اُسے یقین ہے کہ اگر آپ صرف اس جنگ سے ہاتھ کھینچ لیں تو باقی آن کی آن میں ہتھیار ڈالدیں۔ اُس کا حسن انتخاب موجب ننگ نہیں۔ سرمایۂ افتخار ہے کہ جس دوستی کی آپ کو دعوت لرہی ہے اُسے کوئی بڑے دل گردے کا انسان ہی قبول کر سکتا ہے کم ظرف اس کا لنگر نہیں سنبھال سکتے۔ بیشک وہ ساری دنیا کو اپنے زیر نگین دیکھنا چاہتا ہے۔ مگر یہ اُسے ہرگز پسند نہیں کہ اُس کے حلقۂ احباب میں کوئی غلام شامل ہو۔ بھائی اگر اس کی دوستی سے عار ہے تو آپ نے مجھے اس داغ سے کیوں نہ بچایا جس کی سیاہی روز بروز شوخ ہوتی جاتی ہے۔ آپ جانتے ہیں کہ وہ مجھ پر نت نئی عنایت کرتا ہے لیکن آپ نے کبھی اس سلسلہ کی روک تھام نہ کی۔ آپ جانتے ہیں میں اُس کی منظور نظر ہوں اور اُس کے سینکڑوں خفیہ پیغام اس کی محبت کا زندہ ثبوت ہیں۔ میرے فراق میں وہ جو آہیں بھرتا ہے۔ وہ حریفوں کی صفوں کو چیر کر میرے دل تک پہنچ جاتی ہیں۔ آپ کو زیبا تھا کہ آپ میری غیرت وحیا کے جذبات کو بیدار نہ کرتے اور ان تعلقات کو کچے دھاگے کی طرح توڑ کر رکھدیتے۔ اس کے خلاف آپ ہمیشہ مجھے یہی فرماتے رہے کہ میں اس سے پیار محبت سے پیش آیا کروں خود۔ مجھے اس کی محبت قبول کرنے پر اُبھارا اور بتایا۔ کہ رفتہ رفتہ میرے دل میں بھی اس کی محبت پیدا ہوجائیگی۔

ٹکسلا۔ اگر سکندر جیسا جیوٹ سپاہی اس حسن فسوں ساز کی تاب نہ لا سکا تو اس میں لجانے کی کون بات ہے۔ اگر وہ طاقت آپ کے دل پر مسلط ہوگئی جو فرات کے بہاؤ میں رُکاؤ پیدا کرسکتی ہے تو کیا اچنبھا ہے یہ سب درست! پر بہن میری تقدیر اور میرے وطن کی قسمت میں چولی دامن کا ساتھ ہے۔ یہ جانی بوجھی بات ہے کہ میری رہبری کے بغیر وطن کی نجات محال ہے۔ آپ چاہتی ہیں کہ میں اس کام پر ہاتھ نہ ڈالوں۔ مگر وقت چاہتا ہے کہ آزادی وطن کیلئے سینہ سپر ہوجاؤں۔ جانتا ہوں میری باتیں ناگوار گذر رہی ہوں گی۔ مگر بہن میں بھی تمہاری طرح دل رکھتا ہوں اور اس فانوس میں بھی محبت کی شمع جل رہی ہے۔ آپ ہی کہیں جب اکشیانا کی قہر آلود آنکھیں سکندر پر حملہ کرنے کا حکم دیں تو کس طرح روگردانی کروں۔ اس دلوں کی مہارانی کا حکم ہے کہ اس کی ساری پرجا وطن کی آزادی کیلئے صف باندھ کر کھڑی ہوجائے۔ کون پرجا جسے صرف اس کی زلف گرہ گیر اپنے دام میں پھنسا سکتی ہے کون پرجا جو قید و بند کی دھمکیوں کو مذاق سمجھتی ہے۔ کون پرجا جس نے اپنا سر صرف اُس کی مشق ستم کے لئے اُٹھا رکھا ہے۔ میں بھی اس آبادی کا ایک فرد ہوں۔ اُس لئے میری تلوار پر بھی اکشیانا کا قبضہ ہے اور جس چال وہ چلائیگی اُسے چلنا ہوگا۔

کلیوفیلا۔ تو روکتا کون ہے آپ کو۔ شوق سے بسمل ہوکر اُسے اپنے تڑپنے کا تماشا دکھلایئے۔ ایسی تیز و تند آہیں بھریئے کہ آپ کے رقیب کی کامیابی کا راستہ صاف ہوجائے۔ اُس دشمن جان اور حسین ساحرہ کے حکموں کی تعمیل میں جان لڑایئے اور اپنے خون سے اپنے رقیب کی کشت آرزو کو سینچئے! جایئے بجا لایئے اکشیانا کا حکم ہے۔ کہ پورس کی کامیابی کے لئے معرکہ کارزار گرم ہو تاکہ وہ اکشیانا کے دل کی مملکت پر آرام اور اطمینان سے حکومت کرسکے کون دل؟ جسے آپ اپنی طرف مائل کرنے میں ناکام رہے ہیں۔

ٹکسلا۔ ہاں۔ ہاں تو بہن آپ کا مطلب ہے کہ پورس ....

کلیوفیلا۔ کیا آپ کو اس میں کلام ہے کہ اکشیانا پورس پر مرتی ہے۔ کیا آپ کے کانوں نے نہیں سنا کہ وہ کیسے مزے لے لیکر اس کے گیت گاتی ہے۔ کیا آپ کی آنکھوں نے نہیں دیکھا کہ اُس کی تعریف سُن کر وہ کس طرح مستانہ وار جھومتی ہے اور یہی اس جنگ میں اپنا لہو پانی ایک کردیں گے۔ اپنی مردانگی کے جھنڈے گاڑدیں گے مگر دنیا جانتی ہے کہ فتح کا سہرا پورس ہی کے سر رہے گا۔ آپ لاکھ تدبیریں کریں لیکن جب تک پورس سر نہ ہلائیگا ایک بھی نہ چلے گی۔ گویا ہندوستان کی آزادی کا مدار فقط اس کی ذات پر ہے یعنی اگر اس کا قدم بیچ میں نہ ہوتا تو ہماری فصیل مدت کی راکھ کا ڈھیر ہوگئی ہوتی۔ صرف وہی ایک ہستی ہے جو فاتح کی پیش قدمی کے سامنے سد سکندری کا کام دے سکتی ہے اس دلربا راجا کو اکشیانا نے اپنا دیوتا بنا رکھا ہے۔ آپ لاکھ باور نہ کریں مگر میری کہی بھی لکھ رکھیئے کہ اکشیانا پورس ہی سے شادی کرے گی۔

ٹکسلا۔ بجا! مگر چاہتا ہوں کہ یہ حقیقت افسانہ ثابت ہو۔ ایسا لفظ نہیں سننا چاہتا جو شمع اُمید گل کردے۔ مجھے وہ تصویر نہ دکھایئے۔ جس پر نگاہ ڈالنے سے دنیا آنکھوں میں اندھیر ہوجائے کوشش کیجئے کہ میری آنکھوں پر پردے پڑے رہیں اور میری دلفریب غلط فہمی کے نشے کا تار ٹوٹنے میں نہ آئے۔ حسن کو غرور زیب دیتا ہے۔ بس اتنا کہہ دیجئے کہ وہ سب کے ساتھ میرے

جیسا سلوک روا رکھتی ہے۔ مجھے زندہ رہنے کے لئے اتنا ہی کافی ہے۔

محبت

کلیوفیلا۔ نااُمید ہونے کی کوئی بات نہیں۔ ہاں یہ ضرور ہے کہ آپ کی اس سنگ دل کو موم نہیں کر سکتی یہ آہیں بے سُود اور یہ نالے بیکار ہیں۔ آپ جس چیز کو میدان جنگ میں تلاش کرتے ہیں۔ وہ سکندر خود تمہارے حوالے کئے دیتا ہے۔ غور سے دیکھئے تو آپ کی جنگ سکندر سے نہیں بلکہ پورس سے ٹھنی ہے جو اس مجسمۂ حسن کو چھیننا چاہتا ہے۔ شہرت نے اوروں کے کمالات کی طرف سے آنکھیں بند کر لی ہیں اور صرف پورس کا راگ الاپتی پھرتی ہے خواہ کام کوئی کرے مگر تحسین ناشناس کا مستحق پورس ٹھہرتا ہے۔ اور آپ سب تو نوکروں چاکروں کی طرح اُس کے پیچھے دوڑنے کے لئے پیدا ہوئے ہیں۔ کم بختو! اگر نوکر بننا ہی منظور خاطر ہے تو کیوں نہ بہتر آقا منتخب کرو اور یونانیوں اور ایرانیوں کی صف میں کھڑے ہو جاؤ۔ اس غلامی میں کئی بادشاہوں کا قرب نصیب ہوگا۔ اور ایک دن پورس ہی نہیں بلکہ دنیا جہان کے فرمانروا تمہارے ساتھ آملیں گے۔ لیکن آپ کو تو سکندر غلام بنانا نہیں چاہتا بلکہ اس کی یہ خواہش ہے کہ وہ تاج جس کی ضیا باری آپ کے مغرور رقیب کی آنکھوں میں چکا چوند پیدا کر رہی ہے آپ کے سر پر چمکتا رہے۔ سکندر نہیں پورس آپ کو غلام بنانا چاہتا ہے اس لئے ابھی وقت ہے اس کے جال کو توڑ کر نکل جاؤ۔ یادش بخیر آپ کے مہربان تشریف لا رہے ہیں۔

ٹکسلا۔ بہن اس منحوس شکل کو دیکھ کر میرے دل کی دھڑکن گواہی دیتی ہے کہ اکشیاما اس کو چاہتی ہے۔

کلیوفیلا۔ وقت زیادہ گفتگو کی اجازت نہیں دیتا جاتی ہوں۔ اب چاہے سکندر کے دوست بنو یا پورس کے غلام۔ آپ کی قسمت آپ کے ہاتھ میں ہے۔

سین دوسرا

پورس اور ٹکسلا

پورس۔ مہاراج! اگر میری اطلاع صحیح ہے تو ہمارے مغرور دشمن کی آسانی سے قدم نہیں بڑھا سکتے۔ سُنتا ہوں کہ ہمارے سپاہیوں کی تلواریں سُرخرو ہونے کے لئے میانوں میں مچل رہی ہیں۔ فوج کے حوصلے بلند اور ارادے اُستوار ہیں اور فتح کا جیکارا بلانے کیلئے ایک ایک سورما سبقت لیجانا چاہتا ہے۔ ہر صف غرور و جوش سے مست ہاتھیوں کی قطار معلوم ہوتی ہے۔ اور بہادروں کے نعرے آسمان کی خبر لا رہے ہیں۔ انہیں شکایت ہے تو صرف اس بات کی کہ انہیں شجاعت کے امتحان کا موقع نہیں ملتا۔ اور وہ کیمپ میں بیکار پڑے وقت ضائع کر رہے ہیں۔ آخر کب تک انہیں روکے رکھوں۔ مکار دشمن خوب جانتا ہے کہ ہماری غفلت اس کے لئے کس قدر مفید ہے۔ اسے اپنی کمزوری کا علم ہے۔ اس لئے اُس نے ہیپ فستیان کو بھیجا ہے کہ ہمیں باتوں میں لگائے رکھے۔ اور حملہ نہ کرنے دے۔

ٹکسلا۔ گو مہاراج! نامناسب ہی معلوم ہوتا ہے کہ اسے فخر باریابی بخشا جائے۔ کیا جانے وہ کیا شرائط لیکر آیا ہے۔ عین ممکن ہے کہ سکندر صلح کا خواہشمند ہو۔

پورس۔ صلح؟ تو کیا آپ اس کی بخشی ہوئی صلح قبول کریں گے۔ جس نے پے در پے حملوں سے ہمارے امن و آسایش کو درہم برہم کر ڈالا ہے۔ بھُول گئے مہاراج! وہ وقت جب وہ تیغ بکف بلا وجہ ہمارے ملک میں در آیا اور ان بے گناہ راجوں کو تلوار کے گھاٹ اتار دیا جنہوں نے خواب میں بھی اُسے میلی آنکھ سے نہ دیکھا تھا۔ یہی صلح ہے نا جس نے ہماری آبادیوں کو ویران کر ڈالا۔ جس نے ہماری دھرتی پر جا کے خون کی ندیاں بہادیں۔ اور اب دیوتاؤں نے اسے ہمارے بس میں کر دیا ہے۔ تو میں اتنا احمق نہیں کہ اُس وقت کا انتظار کروں جب ہماری زندگی اس کے رحم و کرم پر منحصر ہو۔

ٹکسلا۔ اگر دیوتا اس سے بگڑتے تو اس کا یہ جاہ و جلال نہ ہوتا۔ وہ ابھی تک اس کے پشت و پناہ ہیں۔ مہاراج! ذرا صبر سے کام لیجئے۔ وہ بادشاہ جس کے ابرو کے ایک اشارے سے بڑی بڑی سلطنتیں کانپ جائیں ایسا دشمن نہیں جسے کوئی راج حقارت سے دیکھے۔

پورس۔ میں اُسے حقیر نہیں سمجھتا۔ اُس کی شجاعت کا مداح اُس کی ہمت کا معترف ہوں۔ لیکن میں وہ خراج خود لینا چاہتا ہوں جو اس کی خوبیاں مجھ سے طلب کر رہی ہیں۔ مہاراج آپ کیوں فکر کرتے ہیں سکندر اگر آسمان پر جا کر دیوتاؤں کی گود میں پناہ لے تو میں وہاں سے بھی کھینچ لاؤں گا۔ میں اُن ہیکلوں کی اینٹ سے اینٹ بجا دونگا جو انسانوں کے کانپتے ہوئے ہاتھوں نے اُس دیوتا کی یادگار بنائی ہیں۔ آج تک یہی سلوک سکندر نے ان بادشاہوں سے

کیا ہے جن کے ممالک پر آج اس کا پرچم لہرا رہا ہے۔ اگر ایشیا میں داخل ہونے کے بعد اس کی مردم آزاری میں فرق آگیا ہوتا تو دارا کو یہ زحمت نہ گوارا کرنی پڑتی کہ دم واپسین اس کی شاہنشاہی کا کلمہ پڑھتا۔

ٹکسلا۔ اگر دارا کو یہ احساس ہوتا کہ وہ کس قدر کمزور ہے تو آج اس کے ملک پر اُس کی بجائے کوئی اور حکومت نہ کرتا۔ پھر بھی اُس کا غرور آپ کی موجودہ حقارت سے زیادہ باسامان تھا۔ اس وقت سکندر کی ناموری کا آفتاب گمنامی کے بادلوں سے نہ نکلا تھا۔ دارا کے کان اس کے نام تک سے ناآشنا تھے۔ اور وہ آسانی سے فتح حاصل کرنیکے خواب دیکھ رہا تھا۔ لیکن اُسے جلد معلوم ہوگیا کہ سکندر کسے کہتے ہیں۔ اس کی بے شمار فوج کے دھوئیں اُڑ گئے اور ایک پنجہ فولادی نے اُسے پیس کر سرمہ بنا ڈالا۔ یہ بجلی پہلے گری ہوتی تو دارا کی آنکھیں کھل جاتیں۔

پورس۔ اچھا تو بتائیے اس صلح کے عوض ہمیں کیا ادا کرنا ہوگا۔ مہاراج! آپ کو سینکڑوں قومیں بتائیں گی کہ ایسی صلح کے پھیر میں اُن کے پاؤں میں زنجیریں پڑ گئیں۔ مہاراج فریب کار مسکراہٹ پر نہ جائیے۔ اس کی دوستی کی دعوت ہمیشہ کیلئے غلام بنا دیگی۔ ادھوری اطاعت کسی کام نہ آئے گی۔ دو ٹوک فیصلہ کیجئے۔ یا اس کے غلام بن جائیے یا دشمن رہیئے۔

ٹکسلا۔ اندھا دھند حملہ کرنے سے مُنہ موڑنے کو بزدلی نہیں کہتے۔ ممکن ہے کہ سکندر بے ضرر اطاعت پر قناعت کرے۔ گُڑ سے مرے تو زہر کیوں دیں۔ باتوں سے مان جائے تو لاتوں کی کیا ضرورت۔ بہلائے جائیے جبتک یہ بلا اوپر ہی اوپر کسی اور ملک کو نہ ٹل جائے بہلائے جائیے۔ اس وقت وہ پہاڑی ندی کی طرح اُمڈا آرہا ہے اور جو چیز اس کے رستہ میں پڑتی ہے اُسے بہالے جاتا ہے اس سیلاب کے پیٹ میں ہزاروں تباہ کاریوں کے تخم ہیں اور اس سیلے کے غراٹے کی آواز سے دنیا گونج رہی ہے۔ میں کہتا ہوں کہ محض بیجا غرور کے لئے اسے جوش دلانا کہاں کی دانشمندی ہے۔ میری تو یہ رائے ہے کہ اس کا تپاک سے استقبال کیجئے۔ اور اُن حقوق سے دست بردار ہو جائیے جنہیں ہم بعد میں پھر حاصل کرسکتے ہیں۔ بہرحال اس چیز کو نہ جانے دیجئے جو مفت ہاتھ آرہی ہے

پورس۔ آپ باور کرتے ہیں مہاراج یہ صلح بغیر کچھ دیے ہو جائیگی یا آپ عزت کی کچھ قیمت ہی نہیں سمجھتے۔ میرے خیال میں بزدلی کے داغ کے بدلے تاج حاصل کرنا بہت گراں سودا ہے۔ اس کے علاوہ کیا آپ کو یقین ہے کہ اسکندر جیسا بہادر اور نامور بادشاہ اس ملک میں آئے اور اپنی آمد کا کوئی نشان چھوڑے بغیر چلا جائے۔ دیکھ لیجئے جتنے بادشاہ سکندر نے تباہ کئے ہیں۔ اُن کے خطاب محض اس لئے قائم ہیں کہ سکندر کی شان میں اضافہ کریں یاد رکھئے اگر ہمنے خراج دینا قبول کیا تو ہمارے لئے اپنے تاجوں کا سنبھالنا مشکل ہو جائیگا۔ اور اگر کبھی وہ ناراض ہوگیا تو سمجھو کہ حکومت کی باگ ہم سے چھن گئی۔ کون مانیگا کہ وہ یوں ہی ملک بملک مارا مارا پھرتا ہے۔ اور انہیں اپنی حالت پر جوں کا توں چھوڑ کر چلا جاتا ہے۔ مہاراج جو گرہ وہ باندھتا ہے اس کی گرفت سے کوئی راجہ نکلنے نہیں پاتا۔ اور وہ مٹی کے مادھو بنا کر انہیں غلاموں پر حکومت کرنے کے لئے مامور کر دیتا ہے۔ مگر میرے ارادے کو ان فضول خیالات سے کیا علاقہ یہ جو کچھ کہا محض آپکا وسوسہ دور کرانے کے لئے تھا۔ پورس شرائط صلح پر غور کرنے سے انکار کرتا ہے جب اقبال اس سے ہمکلام ہو تو وہ کسی کی نہیں سُنا کرتا۔

ٹکسلا۔ مہاراج! مجھے بھی عزت کا اسی قدر پاس ہے جتنا آپ کو ہے مگر عزت کا تقاضا ہے کہ خواہ کچھ ہو میں وطن کو آفت سے بچا لوں۔

پورس۔ صرف وطن ہی نہیں بلکہ عزت کو بھی بچائیے۔ آج ہی وہ دن ہے جب آپ حملہ آور پر حملہ کر سکتے ہیں۔ اس لئے بڑھئے۔ اور اس کے لشکر کو تہس نہس کر ڈالئے۔

ٹکسلا۔ عجلت اور حقارت ناقابل اعتبار رہبر ہیں!

پورس۔ بزدل کے حصّے ندامت کے سوا کچھ نہیں آتا!

ٹکسلا۔ وہ راجے جو اپنی رعایا کی حفاظت کرتے ہیں ان کے محبوب ہو جاتے ہیں!

پورس۔ مگر اُن کی زیادہ عزت ہوتی ہے۔ جو جانتے ہیں کہ حکومت کس طرح کی جاتی ہے!

ٹکسلا۔ اس کی تائید غرور کے سوا کوئی نہیں کر سکتا!

پورس۔ راجے اس پر سر دھنیں گے۔ اور مہارانیاں آنچل پر باندھے پھریں گی!

ٹکسلا۔ مگر مہارانی کی آنکھوں میں تو آپ بس رہے ہیں اُسے تو

کچھ سوجھتا ہی نہیں۔

پورس۔ وہ سب کچھ دیکھتی ہے مگر اسکی نگاہ کسی غلام پر پڑتی ہے تو نفرت وحقارت دکھائی دیتی ہے!

ٹکسلا۔ ہاں یہ فرمائیے کہ یہ کہاں کی محبت ہے کہ آپ اپنے ساتھ آئے اور اس کی رعایا کو لئے مرتے ہیں۔ میرے خیال میں آپکا یہ قدم مہارانی کی محبت کے لئے نہیں بلکہ سکندر سے عداوت کی بدولت اُٹھ رہا ہے۔

پورس۔ میں مانتا ہوں کہ میری غیرت اسی قدر جنگ کی خواہاں ہے جس قدر آپ صلح کے طالب ہیں۔ یہ آگ ہے جو میرے سینہ میں سلگ رہی ہے اور مجھے اُکساتی ہے کہ اپنی تلوار کا لوہا سکندر کے پُرغرور سر سے منواؤں۔ یقین مانئے جب اس کی بہادری کا قصہ سُنتا ہوں تو میرا خون کھول اُٹھتا ہے۔ یہی وجہ ہے۔ اس مبارک دن کا انتظار کرتے کرتے میری آنکھیں پتھرا گئیں ابھی اُسے ہم پر حملہ کرنے کا خیال تک نہ آیا تھا کہ میں اس کی دست درازیوں کی خبریں سُنکر دانت پیسا کرتا تھا۔ جب مجھے اطلاع ملی کہ اُس نے اِدھر کا رُخ کیا تو میں دعائیں مانگتا تھا کہ زمین کی طنابیں کھینچ جائیں اور وہ کل کا آتا آج آ جائے۔ بعض اوقات بے صبری مجھے مجبور کرتی تھی کہ سرزمین ایران میں پہنچکر اس کا رستہ روک لوں۔ اب اگر وہ میرے سامنے سے ٹل جانے کی کوشش کرے اور اس ملک سے نکل بھاگنے کی ٹھانے تو میں اس کی ناکہ بندی کرونگا اور اس صلح کے قبول کرنے سے انکار کروں گا جسکی اس وقت وہ ہمیں دعوت دے رہا ہے۔

ٹکسلا۔ ضرور ہے کہ اس قدر عالی حوصلہ اور مستقل مزاج انسان کو تاریخ میں نمایاں جگہ ملے۔ اور گو آپ اس سر فروش کارنامے کی بھینٹ چڑھ جائیں آپ کا نام رہتی دنیا تک زندہ رہیگا۔ اچھا اب اجازت دیجئے مہارانی تشریف لا رہی ہیں۔ اُن کے سامنے اُس جوش و خروش کی نمائش کا رنگ خوب جمے گا۔ میری موجودگی اس محفل رازونیاز میں مخل ہوگی اور میری بزدلانہ دوراندیشی آپ کی سرگرمی پر اوس برسائیگی۔

سین تیسرا

پورس۔ اکشیانا

اکشیانا۔ ٹکسلا نے مجھے آتے دیکھا اور رستہ کاٹ کر چلا گیا۔ آخر اسکی وجہ؟

پورس۔ ندامت کے چھپانے کو روپوشی سے بہتر نقاب اُسے مل ہی نہ سکتا تھا۔ حوصلہ ہار کر کس منہ سے آپ کے سامنے آتا۔ مہارانی اسے اس کے حال پر چھوڑ دیجئے۔ وہ اپنی بہن کو ساتھ لیکر سکندر کی قدمبوسی کو جانا چاہتا ہے۔ تو جانے دیجئے۔ لیکن ہمیں اس مقام سے ہٹ جانا چاہئے جہاں ٹکسلا اپنے شہنشاہ کی راہ میں آنکھیں بچھا رہا ہو۔

اکشیانا۔ مگر مہاراج! میں بھی تو سنوں کہتا کیا ہے۔

پورس۔ صاف تو کچھ نہیں کہتا۔ مگر اس کی باتوں سے اس کے دل کی کیفیت آشکارا ہونے سے نہیں رہتی۔ اس کی ذہنیت کا اس سے اندازہ لگا لیجئے کہ آنجناب ابھی ابھی اُس کی غلامی پر اترا رہے تھے۔ اس پر بس نہیں بلکہ مجھے بھی اس نعمت سے ممنون فرمانا چاہتے تھے۔

اکشیانا۔ جوش میں نہ آئیے۔ روٹھے کو منانا مجھے آتا ہے۔ دل شکستہ ہو گیا ہے تو کیا ہوا۔ ہنوز محبت کی چنگاری اس میں دبک رہی ہے۔ خیر، خواہ کچھ ہو میں اس سے دو باتیں کئے بغیر کوئی فیصلہ نہیں کر سکتی۔ مہاراج! نفرت اور حقارت سے آپ کسی شخص کو اپنا نہیں بنا سکتے!

پورس۔ میں غلط عرض نہیں کر رہا۔ مہارانی! اس آستین کے سانپ پر بھروسہ نہ کیجئے وہ موقعہ ملتے ہی آپ کو سکندر کے حوالے کر دیگا اور پھر آپ کو اس سے انعام میں مانگیگا۔ صاف ظاہر ہے کہ اس پر اعتماد کرنا اپنے آپ کو دھوکا دینا ہے۔ ....

.... وہ بیشک مجھ سے وہ نعمت چھین لے جو مجھے جان سے زیادہ عزیز ہے مگر آپ پر اپنا سر نثار کرنا میری تمنا ہے اور یہ وہ سعادت ہے جسے دیکھ کر اس کی رقیبانہ لاگ ڈانٹ شرمندہ ہو جاتی ہے

اکشیانا۔ تو آپ سمجھتے ہیں کہ میرا جذبۂ محبت اتنا گر گیا ہے کہ اس کمینہ حرکت کا روادار ہو گا۔ اور میرا دل اس کی حکومت کو قبول کر لیگا؟ مہاراج! یہ الزام لگاتے وقت آپ کو شرمانا چاہئے۔ بتائیے آجتک آپ نے کبھی میری طبیعت کا میلان اُس کی طرف دیکھا ہے۔ اگر مجھے دونوں میں سے کسی کو منتخب کرنا ہوتا تو شاید مجھے زیادہ سوچنے کی ضرورت نہ ہوتی۔ کیا میں نہیں

جانتی کہ اس کا دل بیم و رجا کی کشمکش میں پھنسا ہے اور اگر میں دخل نہ دیتی تو اس کا مغرور دل ایک مدت کا اپنی بہن کی مکاری کی نذر ہو گیا ہوتا۔ آپ کو معلوم ہے کہ جب وہ اسکندر کی قید میں رہکر پھر ٹکسلا آئی۔ تو میں فوراً بھانپ گئی کہ وہ بھائی کو اپنا ہم قفس بنانا چاہتی ہے۔

پورس۔ اور باوجود ان باتوں کے آپ کو اس کے پاس رہنا گوارا ہے۔ مہارانی اُسے اپنے جرم و عصیان کی تاریکی میں پڑا رہنے دیجئے۔ اور ایک راجہ ہاتھ سے جاتا ہے تو جانے دیجئے۔

اکسیشانا۔ میں اس کا دل آپ کی فتح کے لئے جیتنا چاہتی ہوں۔ میں نہیں چاہتی کہ مدافعت کا سارا بار آپ کے کندھوں پر پڑے۔ اور آپ تن اکیلے اس دیو ہیکل دشمن سے دوچار ہوں۔ میں چاہتی ہوں کہ ٹکسلا معرکۂ کارزار میں آپ کے ساتھ ہو کر لڑے اور اس کی بہن کی ریشہ دوانیاں طاق پر دھری رہ جائیں۔ مہاراج! کاش دولہ جنگ میں آپ کو کچھ میرا بھی دھیان رہتا۔ مگر ایسی خفیف باتیں شاید آپ کے دل پر اثر ہی نہ کر سکتی ہوں۔ آپ تو صرف یہ چاہتے ہیں کہ آپ کے دشمن میدان جنگ میں تیغ بکف کام آئیں اور پھر میرا جو برا لکھا ہو تو ہوا کرے۔ حیران ہوں کہ آپ اتنا بھی نہیں سوچتے کہ میں سکندر سے بھاگ کر کہاں جاؤں گی اور آپ کے رقیب کی ہوسناکی سے کہاں جان بچاؤں گی جب وہ مجھے قید کر کے ذلت میں دیکھے گا تو آپ کے خون کے انعام میں مجھے طلب کریگا۔ مگر آپ کو ان فکروں سے واسطہ۔ جائیے اور میدان جنگ میں اپنے جان سپارانہ کارنامے دکھائیے۔ صرف معرکہ آرائی کا خیال کیجئے۔ اور اپنی جان کی حفاظت کو قطعاً فراموش کر ڈالئے۔ اور یہ بھی بھول جائیے کہ دیوتاؤں نے آپ کے لئے گلشن مسرت کے دروازے کھول رکھے ہیں۔ ممکن ہے اکسیشانا بھی جلد آپکے پاس پہنچ جائے۔ مگر آہ! کون کہہ سکتا ہے کہ کیا ہوگا اچھا۔ خیر۔ سدھاریئے۔ اور فوج کو میدان میں لیجائیے۔ جی بھر کے باتیں ہو چکیں اور شاید آپ بھی تاخیر سے تنگ آگئے ہوں۔

پورس۔ مہارانی! ذرا ٹھیر جائیے اور میرے دل میں جھانک کر دیکھئے کہ اس میں محبت اور وفا کے کس قدر بیتاب جذبے تڑپ رہے ہیں۔ سر صدقہ اُترنے کے لئے وبال دوش ہو رہا ہے روح قدموں پر نثار ہونے کے لئے ملتیں کر رہی ہے۔ میں مانتا ہوں کہ ناموری میرے دل پر چھا رہی ہے۔ مگر آپ کی اداؤں کو دیکھ کر وہ بھی مسحور ہوئی جاتی ہے۔ میں بھول رہا ہوں کہ ہمیں کیا کچھ کرنا ہے بیشک میری سب سے بڑی آرزو یہی تھی کہ اپنی فتح کا علم بلند کر کے اپنے رقیب کا سر ہمیشہ کے لئے نیچا کر دوں مگر ان باتوں کا زمانہ گذر گیا۔ اور اب مہارانی آپ کے حکم کا منتظر ہوں ناموری اور انتقام دونوں آپ کے قدموں پر پڑے ہیں۔

اکسیشانا۔ تو اطمینان رکھئے کہ یہ فرمانبردار دل ایسے ہاتھوں میں نہیں پڑا جو امانت میں خیانت کریں اسکی خوشی مجھے اس قدر منظور ہے کہ میں اسے میدان میں فتح کا جھنڈا گاڑنے کی اجازت دیتی ہوں۔ مہاراج! شوق سے دشمن پر حملہ کیجئے۔ مگر اتنا دھیان رہے کہ رفیق ساتھ چھوڑنا نہ پائیں ہر پہلو سے ان کی دلداری کیجئے اور مجھے ٹھنڈے دل سے ٹکسلا کو راہ راست پر لانے دیجئے میرا خیال ہے کہ وحشی رام ہو جائیگا۔ اور تھوڑی دیر کے بعد وہ آپکے جھنڈے تلے کھڑا ہوگا۔

پورس۔ مہارانی میں صدق دل سے تعمیل حکم کا عہد کرتا ہوں۔ اب میں دیکھتا ہوں کہ ہیپ فستیان کیا رنگ لاتا ہے۔ اس کے بعد تلوار کھینچے لیتا ہوں۔

(نور الٰہی محمد عمر)

اے ہوش تجھکو آنے سے میں روکتا نہیں　　ساقی کو تیرے آنے کی لیکن خبر نہ ہو

میں عکس ہوں آئینہ امکاں میں تمہارا　　تم سا جو نہیں کوئی تو مجھ سا بھی نہیں اور

جانتے ہیں تجھے ہم روز ازل سے لیکن　　یہ نہیں جانتے کیوں کر تجھے ہم جانتے ہیں

وفا کا نقش ہے وہ نقش جو مٹکر ابھرتا ہے　　جنہیں دل سے بھلا دوگے وہ پیہم یاد آئینگے

عنبر، مشک اور سیویٹ

سونا۔ چاندی۔ پلاٹینم اور جواہرات بہت بیش قیمت چیزیں ہیں اور جب سے مہذب دنیا ان کی خاصیتوں سے واقف ہوئی ہے۔ ان کی قیمت میں دن بدن اضافہ ہی ہوتا گیا ہے۔ جس کے پاس یہ چیزیں زیادہ مقدار میں ہوں۔ وہی سب سے امیر۔ ان کی چمک دمک امیر و غریب سب کو بھلی معلوم ہوتی ہے۔ اور دنیا میں کون شخص ہے جو ان کے حاصل کرنے میں دن رات کوشش نہیں کرتا۔ لیکن قدرت نے چند چیزیں اور بھی ایسی پیدا کی ہیں۔ جو دیکھنے میں کالی کلوٹی۔ مگر قیمت میں سونے جواہرات کے ہم پلہ۔ اگرچہ ان کی رنگت دلفریب نہیں ہوتی۔ مگر اپنی بھینی بھینی خوشبو سے ہر امیر و غریب کے دل کو لبھالیتی ہیں۔ ان میں سے ایک عنبر ہے دوسرا مشک اور تیسری چیز سیویٹ کے نام سے مشہور ہے۔ عنبر کو آگر مچھلی پیدا کرتی ہے۔ تو مشک ہرن سے حاصل ہوتا ہے۔ اور سیویٹ افریقہ کی بلی سے۔

عنبر سمندر کے کناروں پر عموماً ملتا ہے۔ اس کی موجودگی اس کی تیز بو سے پہچانی جاتی ہے۔ بس ایسا معلوم ہوتا ہے۔ کہ کسی اندھیری کوٹھری میں جو ہوں سے جس قسم کی بو پیدا ہو جاتی ہے۔ اس سے کئی درجہ زیادہ وہاں ہوتی ہے۔ انجان شخص وہاں کبھی نہ ٹھیر سکے۔ البتہ جو اس بو سے واقف ہیں۔ بے جھجکتے بغیر وہاں پہنچ جاتے ہیں۔ اور اپنی خوش قسمتی پر ناز کرتے ہیں۔

بہت کم لوگ ہیں جو اس کے فائدے جانتے ہوں گے۔ عنبر دواؤں میں استعمال ہوتا ہے۔ دوسری خوشبوؤں میں جب اس کی تہ دی جائے۔ تو وہ بہت عمدہ خوشبوئیں بن جاتی ہیں۔ اور زیادہ قیمت میں بکتی ہیں۔ مختلف دواؤں کے ساتھ مل کر کبھی تو گلاب کی خوشبو پیدا ہوتی ہے۔ کبھی موتیا چنبیلی کی۔ اور بھی کئی نفیس اور دل لبھانے والی خوشبوئیں بنائی جاتی ہیں۔ اور یہ تجارتی بھید ہیں۔ جو مشکل معلوم ہو سکتے ہیں۔ بس یہی سمجھ لو کہ جیسے اگلے زمانے میں کیمیاگر سونا بنانے کی فکر میں رہتے تھے۔ اور کچھ حاصل وصول نہیں ہوتا تھا۔ البتہ امریکہ اور یورپ والے علم کے زور سے بدبو کو خوشبو میں تبدیل کر رہے ہیں۔ ان کی کیمیاگری میں آنچ کی کسر نہیں رہتی۔

عنبر سپرم وہیل (ایک قسم کی مچھلی جو سمندر میں ہوتی ہے) پیدا کرتی ہے۔ اگر سونا اور جواہرات تلاش کرنے والے جنگل بیابان پہاڑ اور صحرا ایک کر دیتے ہیں۔ تو عنبر کی تلاش میں ملاح سمندر چھان مارتے ہیں۔ عنبر کی پیدائش کے لئے ساتوں سمندر ہیں اور ہر ملک اور ہر جزیرہ کے کناروں پر یہ ملتا ہے۔ لیکن سب سے زیادہ اُن ملکوں کے کناروں پر پایا جاتا ہے۔ جن کے سمندروں میں سپرم وہیل کی کثرت ہو۔ سپرم وہیل سرد پانیوں کو بہت پسند کرتی ہے۔ عنبر تیرتا رہتا ہے۔ اور اس کے ٹکڑے جو مچھلی کے بدن سے علیحدہ ہو جائیں۔ سمندر میں بہتے بہتے ہوا کے زور سے سینکڑوں ہزاروں میل نکل جاتے ہیں۔ سمندر کی موجیں اور جوار بھاٹا انہیں اٹھائے اٹھائے پھرتا ہے اور ساحل پر بعض اوقات آ کر رہ جاتا ہے۔ تو پڑا رہتا ہے۔ کوئی نہ کوئی اللہ کا بندہ جو خوش قسمتی سے پہچان لے اٹھا لیتا ہے۔

عنبر دنیا میں کافی مقدار میں نہیں ملتا۔ یہی وجہ ہے۔ کہ اس کی قیمت کبھی نہیں گرتی۔ نہ کوئی چیز ہی ایسی بن سکتی ہے۔ جو اس کا بدل ہو۔ اور اس کی قیمت کو گھٹا سکے۔ عنبر دو قسموں کا ہوتا ہے۔ سیاہ اور بھورا اور انہی دونوں رنگوں پر اس کی قیمت کا دار و مدار ہے۔ بھورا عنبر اعلیٰ قسم کا خیال کیا جاتا ہے۔ اس واسطے اس کی مانگ بھی زیادہ ہے۔ اور یہ ملتا بھی تھوڑی مقدار میں ہے۔ امریکہ میں بحر اٹلانٹک کے ساحل پر عنبر زیادہ مقدار میں ملتا ہے۔ اور بحر الکاہل کے ساحل پر کم۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ بحر الکاہل میں سپرم وہیل کم ملتی ہیں۔ اور بحر اٹلانٹک میں زیادہ۔ عنبر کے ٹکڑے چھوٹے چھوٹے ملتے ہیں۔ اور کبھی کبھی بڑے بھی جن کا وزن ۲۰ سے ۲۵۰ پاونڈ تک ہوتا ہے۔ سپرم وہیل جب پکڑتے ہیں۔ تو بڑی احتیاط سے اسے کاٹتے ہیں۔ اور ذرہ برابر عنبر ضائع نہیں جانے دیتے۔ اس کے بعد عنبر کی تقسیم ہوتی ہے اور حصہ رسدی مالک جہاز اور ملاحوں میں بٹ جاتا ہے۔ بحر ہند اور بحیرۂ چین میں بہت ملتا ہے۔ چھوٹی کشتیوں پر سوار ہو کر مچھیرے عنبر کی تلاش میں سمندر میں گھومتے پھرتے ہیں۔ اس کی پہچان صرف خوشبو سے ہی ہو سکتی ہے۔ کہیں سے ذرا بھی بدبو یا خوشبو معلوم ہوتی۔ اور یہ لوگ کشتیاں لے کر تلاش میں نکل پڑتے ہیں۔

سمیع اللہ

پس پردہ

جیسا کہ کہا گیا ہے میدانِ کارزار کی فلم لینا بڑی جان جوکھوں کا کام ہے۔ ایکٹروں اور فالتو کیرکٹروں کے علاوہ ان لوگوں کی زندگی بھی معرضِ خطر میں ہوتی ہے جنہیں کیمرہ اور میگافون .... کے پیچھے کام کرنا ہوتا ہے۔

"وردن" اس نوع کے فلموں کی لاثانی مثال ہے یہ مشہور میدانِ جنگ کا انگریزی فلم ہے اور گومونٹ برٹش کمپنی .....

نے اسے عین معرکہ کارزار میں جبکہ گولیاں مینہ کی طرح برس رہی تھیں اور بڑے بڑے تباہ کن گولے ہر طرف لڑھکتے پھر رہے تھے۔ فلم کیا ہے اس کی خوفناک واقعیت اور ہر تفصیل کی صحت سے قطعاً انکار نہیں کیا جا سکتا۔ فلم سازی سے عام دستور کے برعکس اس کے لئے خاص طور پر اس غلیظ اور بے کیف موسم کا انتظار کیا گیا جو ایام جنگ میں واقع ہوا تھا۔ تیاری میں اصلی گولے استعمال کئے گئے۔ اور میدان جنگ کو خطرہ دامن کے دو حلقوں میں منقسم کر لیا گیا۔

اس دوران میں کئی ایک حادثات رونما ہوئے لیکن اس سے کچھ زیادہ نقصان نہ ہوا۔ دو کیمرے والے منظر کی تصویر لینے میں مصروف تھے۔ کہ ایک بڑے سے گولے کا ایک ٹکڑا اڑ کر اُن کے پاؤں میں آ پڑا اس ٹکڑے کا طول دو فٹ اور عرض و ضخامت ایک ایک فٹ تھی اور وزن میں پندرہ پونڈ تھا۔

حفظ ما تقدم کے طور پر کوئی ممکن احتیاط اٹھا نہ رکھی گئی تھی۔ نزدیک کی تصاویر لینے کیلئے خندقیں کھودی گئیں۔ ریت کے تھیلے مہیا کئے گئے۔ تاکہ کیمرہ والا اُن کے پیچھے خطرے سے مامون ہو کر اپنا کام کر سکے۔ بایں ہمہ فوٹوگرافر موسیو باتان کے سر میں شدید زخم آیا اور صلیب احمر کی جماعت جو فلم کمپنی کے ہمراہ تھی انہیں موقع پر سے اٹھا لے گئی تاکہ زخم کی شست و شو کرے۔

فلم ساز کو اس حصے کی تکمیل میں بھی سخت خطرے کا مقابلہ کرنا پڑا جس میں ۲۵ آدمیوں سے بھری ہوئی لاری کے ڈرائیور کی تصویر لینا تھا۔ کیمرہ والا اور اس کا ڈائرکٹر لاری کے سامنے کے انجن پر کھڑے تھے۔ انہیں صرف آگے کے چھجے سے کچھ سہارا ملتا تھا۔ لاری انتہائی رفتار پر جا رہی تھی۔ اور وہ فلم لینے میں مصروف تھے اس حالت میں اُنہوں نے ہزاروں فٹ لمبا فلم تیار کیا۔ تین بار اُن کا توازن قائم نہ رہ سکا۔ اگر ان کی کمین میں حفاظت کے لئے پہلے ہی سے رسے نہ باندھے ہوئے ہوتے تو ان کی زندگی کا خاتمہ ہو جاتا۔

لاہور میں گذشتہ سال کرسمس کے ایام میں ایک زبردست فلم "دی ونگز" دکھایا گیا تھا۔ جن حضرات نے اسے دیکھا ہے وہ جانتے ہیں کہ اس کا ہر سین کس قدر حیرت انگیز اور سنسنی پیدا کرنے والا تھا۔ لیکن ساتھ ہی بہت کم اصحاب جانتے ہوں گے کہ اسکی تیاری میں کیا خطرات پیش آئے ہوں گے۔ اس امر سے واقفیت حاصل کرنے کے لئے ضروری ہے کہ اس کے ڈائرکٹر ولیم ویلمن کے اس بیان کا ایک اقتباس پیش کیا جائے جو اُنہوں نے اس کے اختتام پر "ہائی وڈ" میں آ کر دیا۔ وہ کہتے ہیں کہ "میں کبھی خواہ مجھے کوئی لاکھوں ڈالر پیش کرے "ونگز" کے سے خطرناک فلم کی تیاری اپنے ذمے نہ لوں گا۔ کام شروع کرنے سے پیشتر میں نے کمپنی کے ہر فرد سے کہہ دیا تھا کہ جو شخص خطرے کا نام بھی زبان پر لائیگا میں اسے گولی سے اُڑا دوں گا۔ لیکن جب کام شروع کیا گیا ہم میں سے کسی کا دل بھی خوف سے خالی نہ تھا — ایک گہرے دریا کے کناروں پر عمودی سنگلاخ چٹانیں کھڑی تھیں۔ اور دونوں کے درمیان بہت تنگ فاصلہ تھا۔ رچرڈ آرلین کے ہوائی جہاز کو اس گہرائی میں غوطہ لگانا تھا۔ اس موقعہ پر اُس کی جان بال بال بچی۔ اگر وہ فوراً اس میں سے کود نہ جاتا تو جہاز کے ساتھ جو چٹانوں سے ٹکرا کر پاش پاش ہو گیا اس کی زندگی کا بھی فیصلہ ہو جاتا۔

ہوائی جہازوں کا جو معرکہ اس میں دکھایا گیا ہے۔ وہ ان تدبیروں اور گھاتوں کا نقشہ ہے جن سے جنگ عظیم میں کام لیا گیا تھا۔ فوج کو منتشر کرنے کے لئے طیاروں کو اکثر بہت دور تک زمین کی سطح کے ساتھ ساتھ اُڑانا پڑتا تھا۔ ایک موقع پر ایک ہواباز اپنے طیارے سے ایک

پہنچ سکے اس قدر نزدیک لے آیا کہ سپاہیوں کو جو اس پر مارچ کر رہے تھے اپنی جان بچانے کے لئے دریا میں غوطہ لگانا پڑا۔ اگر ایک ہوائی جہاز اپنے مقررہ راستے سے چھ فٹ بھی ایک طرف ہو جاتا تو کم از کم پچاس آدمیوں کی جانیں تلف ہو جاتیں۔ ہر سین میں سٹر و ہلیمن ایکٹروں کے ہمراہ ہوتے تھے اور تا وقتیکہ خود اس میں حصہ نہ لیتے انہیں کوئی خطرناک ایکٹ کرنے کی اجازت نہ دیتے جب ہوائی جہاز زمین سے کچھ بلندی پر اُڑ رہے ہوتے وہ اکثر ان تک پہنچ جاتے اور ہاتھ لگا کر واپس آتے ہزاروں سپاہیوں ہوا بازوں اور فالتو کارکنوں کی حفاظت کا بار ان کی گردن پر تھا اور اس کے علاوہ اسسٹنٹ ڈائرکٹر ل

کیمرہ والوں اور ایکٹروں کی نگہداشت بھی انہیں ہی کرنی پڑتی تھی اُنہوں نے بیجان پتلوں اور دیگر شعبدوں سے کام لینے سے قطعاً انکار کر دیا۔ چنانچہ ہر سین صحیح واقعہ کی تصویر ہے ستر کیمرہ والوں نے اپنی زندگی کو خطرہ میں ڈال رکھا تھا۔ کوئی انجن کے بڈ پر پروپلر سے چند انچ کے فاصلہ پر بندھا ہوا تھا۔ کئی جہازوں کے بازووں سے مربوط تھے۔ اور جہاز کبھی تیر کی سی سُرعت کے ساتھ بلندی پر سے نیچے کی طرف گرتے۔ زمین سے دور بلندیوں پر قلابازیاں لگاتے۔ اور کبھی خرگوش کی مانند ایک سمت چھوڑ کر اچانک دوسری سمت پھر جاتے۔ اور یہ اپنے کیمرے متواتر ٹک ٹک چلاتے جاتے صرف اس امید پر کہ زمین پر صحیح سلامت پہنچ جائیں گے۔ جہازوں کی تیز پروازی اور سریع الحرکتی کا متحمل بننے کے لئے انہیں کچھ عرصے (studio) سٹڈیو میں کام کرنا پڑتا تھا ایک جہاز نما تختے پر انہیں بٹھا کر ہر ممکن سمت میں آہستہ آہستہ اور تیزی کے ساتھ حرکت دی جاتی۔ یہانتک کہ وہ اس کے عادی ہو جاتے۔

وار ڈون کی طرح "رسام" میں بھی اصلی گولے استعمال کئے گئے تھے۔ سپاہیوں کے چلنے پھرنے کی جگہ سوراخوں میں تباہ کن بارود بھرا ہوا تھا جس کو آگ لگنے سے کئی فٹ زمین سخت دھماکے کے ساتھ پھٹ جاتی تھی۔ ہر سپاہی کو اس کی نقل و حرکت کے متعلق نہایت دقیق ہدایات ملی ہوئی تھیں۔ اس فلم کی تیاری میں کئی ہزار آدمیوں نے کام کیا۔ انتہائی احتیاط کے باوجود ناگوار حادثات بھی وقوع پذیر ہوتے رہے۔ کارپول ویل دی۔سی۔ جوش و خروش میں ایک پھٹتے ہوئے گولے کے اس قدر نزدیک چلے گئے کہ ان کا تمام چہرہ بُری طرح جھلسا گیا۔

حیرت انگیز بحری فلم "کیو شب" جس کا ہر سین رگ و پے میں سنسنی پیدا کر دیتا ہے۔ ایسے واقعات سے بھرا ہوا ہے جس میں تیار کرنے والوں اور ایکٹروں کی زندگی سخت خطرے میں تھی۔ سب سے زیادہ مشکلات کا باعث پُر اسرار جہاز "آرمی" ثابت ہوا۔ سین اس امر کا مقتضی تھا کہ اسے غرق ہوتا دکھایا جائے۔ چار بار اس کو ڈبونے کی کوششیں بالکل ناکام رہیں۔ پانچویں دفعہ اس کے بادبانوں کو تیل میں تر کر کے تختوں پر پٹرول بہا دیا گیا اور جوف میں بھک سے اُڑ جانے والا بارود رکھ دیا گیا اور ارد گرد کی کشتیوں سے گولہ بازوں نے گولے برسانے شروع کئے۔ آگ دکھانے والوں کو حکم دیا گیا تھا کہ جب جہاز غرق ہونے لگے تو سمندر میں کود کر اپنی جانیں بچالیں۔ لیکن جہاز اس سُرعت کے ساتھ ڈوب رہا تھا کہ دو آدمیوں کی جانیں سخت خطرے میں پڑ گئیں۔ اگر اس وقت کمال دانشمندی سے کام نہ لیا جاتا تو جہاز کے ساتھ وہ بھی نذرِ آتش ہو جاتے۔

بعض ڈراموں کی تیاری کے لئے فلم سازوں کو مناظر خود نہیں بنانے پڑتے۔ یہ سین فطرت سے لئے جاتے ہیں۔ بظاہر تو یہ امر بہت آسان نظر آتا ہے۔ لیکن اس میں بھی موسم کی اچانک تبدیلی سے ہزاروں لوگوں کی جانیں خطرے میں پڑ جاتی ہیں۔ لارنس سٹالنگ کے مشہور ناول اولڈ آئرن سائڈ کا فلم "مسٹر آف دی سی" تیار کرنے میں ان لوگوں نے جنہیں اسے ایکٹ کرنا تھا امریکہ کے ساحلوں کے سخت خوفناک طوفان برداشت کئے۔ ان میں ایستھر رالسٹن چارلس فارل، والیس بیری اور جارج بینکروفٹ بھی تھے۔ ایک بار یہ ایک شدید طوفان میں گھر گئے اور متواتر ۲ گھنٹے سمندر میں پھرتے رہے۔ آٹھ جہاز جنہیں تصویر لینے کے لئے فوجی ترتیب سے آراستہ کیا گیا تھا ایک اور طوفان میں غرقاب ہو گئے۔ یہ طوفان اسقدر تند اور سخت تھا کہ بڑے عسکری جہاز کانسٹیٹیوشن کے تین بھاری مستول ٹوٹ گئے اور تختہ "پرستاروں" سے چند قدم کے فاصلہ پر بڑے دھماکے سے گرے ان میں سے ہر ایک کئی من وزنی تھا۔

فوٹو کے کام میں نیچر کی دست اندازی کے دو واقعات خاص طور پر قابل ذکر ہیں۔ جب اس نے لرزہ خیز مناظر کی تصویر لیتے وقت مخل ہو کر جدید خطرات کا اضافہ کر دیا۔ ان میں سے ایک حادثہ تو اُس وقت رونما ہوا جب لیلین گش برف کے عظیم الجثہ اور سمندر میں مسلسل بہتے ہوئے تودے پر ایکٹ کر رہی تھی۔ اس وقت قریب تھا کہ اس کی زندگی ضائع ہو جائے۔ دوسرا حادثہ "فلورا لا برتاں" کا ہے۔ جب وہ "جپسی کویلیر" میں ایکٹ کر رہی تھی سین میں یہ دکھانا مقصود تھا کہ فلورا کوچ پر بیٹھی ہے۔ اور اچانک سلاب آ جاتا ہے اور اس کیلئے کوئی جائے فرار باقی نہیں رہتی۔ اس نازک موقع پر ہیرو جس کا پارٹ جارج کارپنیٹر ادا کر رہا تھا۔ ظاہر ہوتا ہے اور اپنی جان کو خطرے میں ڈال کر حیرت انگیز طور پر اسے نجات دیتا ہے۔ سیلاب کا انتظام پہلے ہی سے دریا کے ایک حصے میں بند باندھ کر کیا گیا تھا۔ لیکن جب بند توڑے گئے سیلاب غیر متوقع طور پر نہایت شدت سے آیا۔ اس کی وجہ یہ تھی کہ غیر معمولی طور پر سخت بارش نے پانی کے حجم میں خوفناک اضافہ کر دیا تھا۔

اور مہتم نے اس کا کچھ خیال نہ کیا تھا۔ جارج کا رینیٹر زبردست تیراک ہے لیکن اس سیلاب میں انتہائی جد و جہد کے بعد وہ فلورا کے نزدیک بمشکل اُس وقت پہنچا جب کوہِ یخ پانی کی سطح پر چھت سے جا لگا تھا۔

سیلاب کے مناظر کے وہ حصص بھی سخت خطرناک ہیں جن کو اتفاقاً افسانہ سے برفانی علاقوں میں تیار کیا جاتا ہے۔ چپانام کا مشہور فلم جو کچھ عرصہ ہوا لاہور میں دکھایا جا چکا ہے۔ اس میں "الینرا" کا برف کے میدان کو عبور کرنا ایک ایسا سین ہے جس کے دیکھنے سے جسم پر لرزہ طاری ہو جاتا ہے الینرا کا پارٹ مارگرٹ فشر ادا کر رہی تھی۔ اسی دوران میں بے شمار ایسے حادثے درپیش ہوئے جن کا اعادہ قطعاً ناممکن ہے۔ کئی بار برف کے تودوں پر سے اس کا پاؤں پھسل گیا۔ اور وہ یخ بستہ پانی میں گر پڑی۔ برف اور ثلج کا طوفان جس کا کئی دن سے انتظار کیا جا رہا تھا۔ توقع سے بڑھ کر ثابت ہوا اور جماعت کے کئی ارکان زندہ دفن ہو گئے۔ فلم کے ڈائرکٹر کو یخ کے سے سرد پانی میں کئی دن تک متواتر گھنٹوں کھڑے رہنے کی وجہ سے نمونیا اور انفلوانزا کی شکایت ہو گئی اور خون میں زہر پھیل گیا۔ اور اس فلم کی تیاری میں پورے تین ماہ کی تاخیر واقع ہو گئی۔

وہ سین جو موقع اور محل کے لحاظ سے صحراؤں میں تیار کئے جاتے ہیں فلم کمپنیوں کے لئے گوناگوں مشکلات اور تکالیف کا باعث ہوتے ہیں۔ صنف نازک کو تو سخت مصیبت کا سامنا ہوتا ہے لیلین گِش نے تو سخت شد و مد کے ساتھ اعلان کر دیا ہے کہ وہ پھر کبھی ریگستان میں ایکٹ کرنے نہ جائیگی۔ "دی ونڈ" غالباً اس کا شاہ کار ہے اس کی تیاری میں اسے بارہ گھنٹے روزانہ صحرائے "موجاوی" کی تابناک دھوپ میں کام کرنا پڑا دن کے کثیر حصے میں آندھی، جھکڑ چلتے رہتے تھے جب یہ ذرا تھمتے تو ہوائی مشینیں افسانے کا ماحول پیدا کرنے کے لئے ان کا پارٹ ادا کرتیں لیلین گش کا چہرہ ریت کے تیز اور تپتے ہوئے ذرات سے چھل گیا ہاتھ جو بھی پارٹ کے مطابق باریک اور نازک ہوتا تھا صحرا کی تپش سے جھلس گئے اور اُن میں چھالے پڑ گئے سورج کی خیرہ کن چمک سے عارضی نابینائی نے کئی بار حملہ کیا۔ ڈائرکٹر اور کیمرہ والا تو موٹے چمڑے کے جوتوں سے محفوظ تھے اور ہوا اور دھوپ کی شدت سے بچنے کے لئے آنکھوں پر گاگلز اور آفتابے لگا رکھے تھے اور تمام تکالیف اور زحمتیں کمزور اور نازک اندام ستارے کا حصہ تھیں

(رشید احمد ایم ۔ اے)

موسمِ برسات ہے جنگل ہے وقت شام ہے
ایک تارا ہے سو وہ بھی رعشہ بر اندام ہے

بادلوں کی سرزمین پر نغمہ ہائے جانفزا
مُرغِ خوش پرواز آزادی اسی کا نام ہے

وہ آرہے ہیں ستاروں کو نیند کے جھونکے
اثر کسی پہ تو ہوتا ہے میرے فسانے کا

ہم جسکو موت سمجھتے ہیں پیغام حیات جدید ہے وہ
یہ پھول چمن میں جتنے ہیں پھر کھلنے کو مرجھاتے ہیں

دو شخص جب ایسے ملتے ہیں آپس میں جنکو محبت ہو
خاموشی طاری ہوتی ہے لب کھل کھل کر رہ جاتے ہیں

یہ بھی اک تماشہ ہے کارزارِ الفت میں
دل کسی کا ہوتا ہے بس کسی کا چلتا ہے

حامد اللہ افسر

مکافاتِ عمل

از مکافاتِ عمل غافل مشو
گندم از گندم بروید جو ز جو

"خیالات تقدیر کا دوسرا نام ہے۔ اپنی تقدیر کو خود انتخاب کرو۔ اور منتظر رہو۔ کیونکہ محبت سے محبت اور نفرت سے نفرت کا پھل لگتا ہے"

——— ایلا ویلر ولکاکس۔

"خوبصورت خیالاتِ شرافت اور ہمدردی کی ان عادات میں رونما ہوتے ہیں۔ جو جاں بخش اور روشن ساعتوں میں استوار ہوتی ہیں۔

کس قدر تعجب کا مقام ہے۔ کہ تمام لوگ جانتے ہیں کہ جو وہ زمین میں بوتے یا جس چیز کا پودا لگاتے ہیں۔ زمین سے اُن کو وہی چیز ملتی ہے۔ اور جو بو کر گندم کاٹنا قطعاً ناممکن ہے۔ لیکن جب ذہنی اور دماغی کاشت کا سوال آتا ہے۔ تو اس قانون کو یکسر نظرانداز کر دیا جاتا ہے۔

جب ہم سالہا سال سے ان کے مخالف جذبات کا بیج بو رہے ہوں۔ تو اب مسرت و اطمینان کی فصل کی کس طرح امید رکھ سکتے ہیں؟ جب اس تمام عرصے میں مریضانہ خیالات کی پرورش کی گئی ہو تو اچھی صحت کی امید کس طرح کی جا سکتی ہے؟ اگر کسان کانٹے بو کر گیہوں کی فصل کے انتظار میں ہو تو ہم اسے دیوانہ خیال کریں گے۔ لیکن ہم تخم ریزی تو غم، فکر، خوف اور شک کے خیالات کو کرتے ہیں۔ اور پھر تعجب کرتے ہیں۔ کہ ہماری زندگی یکساں اور پُراطمینان کیوں نہیں؟ ہمارے ذہن اور دماغ کی فصل بھی تو اسی قانون کی پابند ہے جو کسان کی فصل پر حاوی ہے۔ کیا تم نے

گندم از گندم بروید جو ز جو

نہیں سنا؟

انسان کی کارکردگی اس کی فصل ہے جس کی کثرت و قلت اور شادابی اور پژمردگی کا انحصار اُس کے خیالات پر ہے جس طرح ایک کسان کانٹے بو کر گندم نہیں کاٹ سکتا۔ وہ آدمی بھی جو ناکامی کے خیالات کی آبیاری کرتا ہے کامیابی کی صورت نہیں دیکھ سکتا۔ اگر وہ روشن، پاکیزہ اور زندگی بخش خیالات، راست بازی اور حق پرستی کے خیالات، کامرانی اور فراوانی کے خیالات اور اعتماد اور یقین کے خیالات بوتا ہے تو وہ یقیناً فصل بھی ایسی ہی حاصل کرے گا۔ لیکن اگر وہ آوارگی و پریشانی اور نفرت و نفاق کے بیج بوتا ہے۔ تو فصل بھی آوارگی و پریشانی اور نفرت و نفاق کی ہوگی۔

طمانیت قلب طاقت ہے۔ اور پریشانی خیالات کمزوری۔ مایوسانہ خیالات کانٹے دار جھاڑیاں ہیں۔ جو اچھی پیداوار کا گلا گھونٹ کر کھیتی کو تباہ کر دیتی ہیں

اگر ہم اس امر کو اچھی طرح ذہن نشین کر لیں۔ کہ ذہنی قانون بھی فطری قوانین کی مانند اٹل اور غیر متبدل ہوتے ہیں۔ تو زندگی کے پیچیدہ مسائل نہایت آسان ہو جائیں ہر خیال جو دل میں پیدا ہوتا ہے۔ اپنا پودا کانٹا یا گلاب، جو یا گیہوں اُگاتا ہے۔

ہماری زندگی کے واقعات ہماری ذہنی کاشت کا حاصل ہوتے ہیں۔ اگر ہم آندھی بوتی تو بگولہ کاٹتے ہیں۔

اگر ہم کثرت و فراوانی کے خیالات کا بیج بوئیں۔ تو ہم فصل بھی ایسی کاٹتے ہیں۔ لیکن اگر ہم ذلت، قلاشی، بیکاری اور ناکامیابی کے خیالات کی پرورش کریں تو فصل بھی قلاش اور فلاکت زدہ ہوگی زندگی خیالات ہی سے بنتی اور خیالات ہی سے بگڑتی ہے۔

جب ہم ایک خودغرض اور نفرت انگیز چہرہ دیکھتے ہیں تو ہم سمجھ جاتے ہیں۔ کہ یہ خودغرضی اور بدی کے خیالات کا نتیجہ ہے۔ لیکن جب ہم ایک پُرسکون، مطمئن اور مسرت افروز چہرہ دیکھتے ہیں۔ تو جان لیتے ہیں۔ یہ طمانیت و اطمینان اور امید افزا خیالات کی تخم ریزی کا پھل ہے۔

اگر آئینِ فطرت میں کوئی ایسا آئین ہے۔ جسے سب سے زیادہ اہمیت دی جا سکتی ہے۔ تو وہ ہمیشہ یہ ہے۔

"گندم از گندم بروید جو ز جو"

ایک شخص جو چاقو لے کر اپنے جسم کو کاٹنا شروع کر دے۔ یہاں تک کہ خون بہ نکلے۔ یقیناً پاگل خانے میں بند کر دیا جائے گا۔ لیکن ہم اپنی ذہنی قوتوں کو ہمیشہ تیز خیالی آلات نفرت، انتقام، غصہ، شک و حسد سے کاٹتے رہتے ہیں۔ اور اپنے تئیں صحیح العقل سلیم الطبع اور سمجھدار خیال کرتے ہیں۔

ہر خیال ایک بیج ہے جس سے تقریباً اس جیسا ہی ایک ذہنی پودا

پیدا ہوتا ہے۔ اگر خیالات کے درخت کے بیج میں زہر ہے۔ تو اُس کا پھل بھی یقیناً زہر آلود ہوگا جس سے زندگی میں زہر پھیل جائے گا۔ اور اُس کا اثر مسرت و انبساط اور قوت عمل کو تباہ کر دے گا۔

اگر تم اپنے آپکو خواہشات کے ہاتھ میں فروخت کرتے ہو تو تمہیں اپنی شان کے شایاں قیمت کی توقع ضرور رکھنی چاہیئے۔ اُس شخص کو جو اپنے تئیں خود غرضانہ زندگی کے لئے فروخت کر دیتا ہے۔ اس خود غرضی کی زندگی کے لئے جولاہ لاڈ تو پکارتی ہے لیکن خرچ کرنا نہیں جانتی۔ ایسے شخص کو تو ان کانٹے دار جھاڑیوں اور پر خار پودوں کی شکایت نہ کرنی چاہیئے۔ جو اس کی کھیتی میں اُگ آتے ہیں۔ زندگی منصف اور عادل ہے۔ وہ ہمیں وہی چیز دیتی ہے۔ جس کی ہم قیمت ادا کرتے ہیں۔ لیکن حقیقت یہ ہے کہ ہم میں سے بہت اُن چیزوں کو طلب کرتے ہیں جن کی وہ قیمت ادا کرنا نہیں چاہتے۔

آئندہ انسان جان لے گا۔ کہ اگر وہ کثرت، فراوانی اور آسودگی کی فصل پیدا کرنا چاہتا ہے۔ تو اسے ناکامی، افلاس، حوصلہ شکنی اور تذبذب اور تشکک و شبہ کا بیج نہ بونا چاہیئے۔ وہ ان بیجوں کو بوئے گا۔ جو اس کی حسب منشا فصل پیدا کرینگے اگر وہ خوبصورتی، دلکشی اور دلآویزی کے اوصاف کی فصل حاصل کرنا چاہیگا تو وہ محبت، مہربانی اور حوصلہ افزائی کا بیج بوئے گا۔ اس کو علم ہوگا۔ کہ اگر وہ نفرت، رشک و حسد، تلخی اور انتقام کی تخم ریزی کرے گا۔ تو وہ فصل بھی ایسی مضر اور ضرر رساں پیدا کرے گا۔

آئندہ انسان خاص آئین و قوانین کے ماتحت رہے گا۔ وہ جان لے گا۔ کہ جسمانی نشو و نما قوت اور نیک روی کا صرف ایک ہی راستہ ہے اور وہ ان بیجوں کا بونا ہے۔ جن کی فصل وہ چاہتا ہے۔

جسم دل کا صرف ایک عکس ہے اس کے سوا کچھ بھی نہیں۔ یہ ناممکن ہے کہ ایک شخص کے دل میں تو خوبصورت اور محبت آمیز خیالات ہوں اور اس کا جسم اُن کے مطابق نہ ہو۔ یہ صرف وقت کا سوال ہے۔ مدارج کے متعلق اندازہ نہیں کیا جا سکتا۔ یہ ایک قطعاً ناقابل تبدیل قانون ہے۔

گندم از گندم بروید جو ز جو

یہ ناممکن ہے کہ ایک چور اس شخص کو جس کی وہ چوری کرتا ہے۔ اس سے نصف نقصان بھی پہنچا سکے جو وہ اپنے تئیں پہنچاتا ہے۔ وہ اپنے شکار کو اذیت دیتا ہے لیکن اپنے دل میں ایک زہر سے بجھا ہوا خنجر بھی بھونک لیتا ہے۔ ہماری افتاد ہی ایسی ہے۔ کہ ہم کبھی دوسرے کو اُس وقت تک نقصان نہیں پہنچا سکتے۔ جب تک کہ اپنے آپ کو نقصان نہ پہنچا لیں۔ اگر ہم اپنے آپ سے نیکی کرنا چاہیں۔ تو ہمیں دوسروں سے بھی نیکی کرنی پڑے گی۔

(ترجمہ)

سلیمان خاں بی اے۔ پی سی۔ ایس

مجھ سے لاکھوں خاک کے پتلے بنا سکتا ہے تو میں کہاں سے ایک تیرا سا خدا پیدا کروں

بندہ تو اس اقرار پہ بکتا ہے ترے ہاتھ لیتا ہے اگر مول تو آزاد نہ کرنا

محفل طرازیاں وہ کہاں اب تو کام ہے گھر میں پڑے ہوئے در و دیوار دیکھنا

مدت سے التفات میرے حال پر نہیں کچھ تو کمی ہے دل میں کہ سیدھی نظر نہیں

اُن کی یہ خوبیٔ اخلاق کہ وعدہ تو کیا میری یہ شومیٔ تقدیر کہ ایفا نہ ہوا

اس شمع تجلی پہ جھکی جاتی ہیں آنکھیں نظارہ جسے کہتے ہیں پروانہ ہے اسکا

عدو سے تمکو جو ربط نہاں ہی کیوں کہو مجھ سے عنایت سے میں باز آیا نہ سمجھو راز داں مجھکو

ایک غلط تاریخی واقعہ

بسا اوقات حسن ظن اپنے ممدوح کیلئے بجائے مفید ثابت ہونے کے مضر ثابت ہوتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ آج اکثر واقعات کی تفتیش میں غلط فہمیاں پیدا ہو رہی ہیں۔ اگر کسی سیاسی مذہبی پیشوا کی صحیح سوانح عمری دریافت کرنا ہوتی ہے تو ہمیں اس حسن ظن کی وجہ سے کھرے کو کھوٹے سے الگ کرنے میں بڑی بڑی دشواریاں پیش آتی ہیں اور کبھی ایسا بھی ہوا ہے کہ اصلیت کے گوہر درخشاں بے نقلی موتیوں میں چھپ کر قدر شناس جوہری کو اپنی خریداری سے محروم کر دیا ہے۔ یہی اختلاف کی بنیاد ہے اور قبول حق کے لئے سخت سد راہ تاریخ میں اس سے تاریکی چھا گئی اور سیاسیات کی فضا پہلے سے بھی زیادہ گرد آلود نظر آنے لگی۔

ایک معزز اخبار نے اپنی قریبی اشاعت میں عدل جہانگیری کے عنوان سے نورجہاں کے بھائی آصف خاں کا ایک غلط واقعہ درج کر دیا ہے جس کی نقل اکثر اردو اخباروں میں چھپ چکی ہے۔ اس سے پہلے کہ اس غلطی کا ازالہ روایۃً درایۃً کیا جائے اس واقعہ کو اختصار کے ساتھ ہدیہ ناظرین کرتا ہوں، وہ معزز اخبار بیان کرتا ہے کہ۔

آصف جاہ نورجہاں کے بھائی اور ممتاز محل کے باپ تھے، جہانگیر کے دربار میں ان کی بڑی قدر تھی بادشاہ نے ان کو لاہور کا صوبہ دار مقرر کیا تھا آصف جاہ لاہور کی صوبہ داری کے زمانہ میں ایک دن آدھی رات ناچ رنگ دیکھنے کے بعد ابھی آیا ہی تھا کہ پڑوس کے گھر سے (جس میں ایک بوڑھا مسلمان ولی محمد نامی رہتا تھا کوئی اولاد نہ تھی اس بڑھاپے میں اللہ نے ایک اولاد بخشی گھر کے لوگ خوشیاں منا رہے تھے) ترانہ مسرت کی بلند آہنگی نے والئ لاہور کی میٹھی نیند حرام کر دی۔ آنکھیں کھلیں، اُٹھ بیٹھا اور غیظ و غضب کی حالت میں حکم دیا کہ اس بدتمیز بوڑھے کو جلد پکڑ لاؤ۔ فوراً حکم کی تعمیل ہوئی۔ غریب بوڑھا اور بوڑھی پکڑ کر لائے گئے۔ نواب نے غصہ کے لہجہ میں کہا "اتنی رات گئے تم نے شور کیوں مچایا۔ تم جہنم کی سیر کرنا چاہتے ہو"! اس غریب بوڑھے نے دست بستہ عرض کی "خداوند! بڑھاپے میں میں نے اولاد پائی ہے۔ اس لئے رات کو خوشی منائی گئی۔ دُہائی حضور کی میرا قصور معاف ہو۔ نواب نے ہنس کر کہا، ہاں اس بوڑھے کو لڑکا پیدا ہونیکی اس قدر خوشی ہے۔ اچھا اب اس خوشی کا خاتمہ ہو۔ اُس نے اپنے نوکر سے کہا کہ جا اُس لڑکے کو اٹھا لا۔ حکم ہوتے ہی نوکر لڑکے کو لے آیا۔ نواب نے حکم دیا۔

"سُن! شیطان جس لڑکے کے لئے تو نے اتنی خوشی کا سامان کیا اس لڑکے کے بہشت میں جانے کا سامان کر۔ ایسا ہونے سے خوشی کی انتہا نہ رہیگی اس بچے کو ابھی گناہ نے چھوا تک نہیں، اسی وقت اس کی جان لینے سے یہ سیدھا بہشت کو جائیگا"۔

اس حکم سے سب لوگ حیران ہو گئے۔ بوڑھے اور بوڑھی نے خوفزدہ ہو کر آنسو پونچھتے ہوئے ہاتھ جوڑ کر رقت آمیز آواز میں کہا خداوند آپ رعایا کے ماں باپ ہیں قصور معاف کیجئے۔ لیکن اس آہ وزاری پر بھی اس ظالم نواب نے ایک نہ سُنی اور اُن دونوں کو مجبور کیا کہ وہ اپنے ہاتھوں معصوم بچے کی جان لیں، مجبوراً اُن دونوں نے نواب کے حکم کی تعمیل کی اور جگر پارے کے سر کو گردن سے الگ کر دیا۔

دونوں گھر بار چھوڑ کر آگرے پہنچے۔ دربار جہانگیری میں حاضر ہو کر یہ دردناک ماجرا بادشاہ کو سُنایا۔ بادشاہ آگ بگولا ہو گیا۔ فوراً مع خدم و حشم دونوں کو ساتھ لے کر لاہور پہنچا۔ اور دوسرے قلعہ میں ایک بڑا دربار کیا اور بوڑھے بوڑھی کو پوشیدہ رکھا۔ اہل دربار سے پوچھا کہ "حاکم کا سلوک رعایا کے ساتھ کیا ہونا چاہیئے" آصف جاہ اور اہل دربار نے یک آواز کہا کہ جہاں پناہ رعایا کی عزت و ناموس اور جان کی حفاظت کیلئے اگر جان بھی دینا ہو تو بلا پس و پیش حاکم اپنی جان تک دے سکتا ہے۔ بادشاہ نے مسکرا کر کہا صحیح ہے۔ اگر حاکم اپنے آرام کی نیند میں خلل پڑنے پر کسی معصوم بچے کی جان لے تو کیا وہ حاکم ظلم عدولی نہیں کرتا؟"

بادشاہ کی یہ بات سُن کر آصف جاہ کانپ اُٹھے اور آنکھیں نیچی کر کے بیٹھ گئے۔ بادشاہ نے ہنس کر حاضرین دربار سے کہا۔ آپ نے دیکھا میرا بھائی آصف جاہ رعایا کے آرام کا کس قدر خواہشمند ہے۔ رعایا پر ظلم کی بات سُن کر زمین پر بیٹھ گیا۔ نورجہاں سے پوچھا ایسے ظالم کی کیا سزا ہونی چاہیئے نورجہاں نے عرض کیا جس طرح اُس ظالم سنگدل نے والدین کے ہاتھوں ننھے معصوم بچے کو ذبح کرایا ہے اسی طرح اُس ظالم کو اُس کے عزیز کے ہاتھوں ذبح کرانا چاہیئے۔ بادشاہ کے اشارہ سے وہ دونوں مصیبت زدہ دربار میں حاضر کئے گئے۔ اُنہوں نے من و عن تمام بیتا کہہ سُنائی۔ اہل دربار کی آنکھوں سے آنسو ٹپک پڑے، دل قابو سے باہر ہو گئے۔ واقعہ کے ثبوت پر شہادتیں گذریں اُس وقت نورجہاں بجلی کی طرح تڑپ کر تخت سے نیچے

اُتری تیغ کے قبضے پر ہاتھ رکھکر بجلی کی طرح گرج کر بولی۔ جو آدمی ایک معصوم بچے کی جان لیتے وقت ذرا بھی متاثر نہیں ہوتا۔ جو سنگ دل ماں کے ہاتھ سے اُس کے لختِ جگر کے ٹکڑے ٹکڑے کرتا ہے، ظالم اور باپ اس وقت جان کی امان کے لئے دوسرے کے پاؤں پر کتے کی طرح لیٹتا ہے میر غیاث الدین کا فرزند اور نورجہاں کا بھائی ایسا سنگدل اور نامرد نہیں ہو سکتا۔ تلوار نیام سے کوند کر آصف جاہ کے خرمن حیات پر گری۔ اور غرور اور تکبر سے بھرا ہوا سر خاک پر جا پڑا۔

آصف جاہ کے غرور و ظلم کے اس واقعہ کو صحیح ثابت کرنے کے لئے اخبار مذکور اثنائے تحریر میں لکھتا ہے کہ ہندوؤں میں برہمنوں کی ایک کہانی مشہور ہے کہ ایک مہمان کے بھیک مانگنے پر ایک رانی نے اپنے بیٹے کو کاٹ ڈالا تھا۔ رانی نے اپنے بیٹے کو دونوں ہاتھوں سے پکڑ لیا اور راجہ نے تلوار سے اُس کا سر کاٹا۔ ایک مہمان کی یہ تواضع ہو سکتی ہے۔ تو کیا ایک نواب کے حکم سے ایسا نہیں ہو سکتا؟"

اب قابل غور امر یہ ہے کہ یہ واقعہ کہاں تک صحیح ہے۔ آصف جاہ نامی کوئی نواب یا افسر دور اکبری سے دور شاہجہانی تک دربار مغلیہ میں نہیں گذرا۔

آصف جاہ خطاب کا ایک امیر جس کا اصلی نام محمد شاہ تھا، اورنگ زیب کا تجربہ کار افسر تھا، دکن کی جنگ میں کار نمایاں دکھا چکا تھا، بیجاپور کی گورنری پر معمور تھا، زیادہ تر نظام الملک کے خطاب سے مشہور تھا۔ اس کے اقبال کا ستارا ۱۷۱۹ء سے ۱۷۴۸ء تک چمکتا رہا۔

"آصف الدولہ" اودھ کا نواب تھا، دس برس تک اودھ کی حکومت کی اور ۱۷۹۷ء میں انتقال کر گیا۔

ہاں البتہ "آصف خاں" نامی عہد اکبری سے دور شاہجہانی تک موجود تھا۔ یہ نورجہاں بیگم کا بھائی۔ شاہ جہاں کا خسر۔ ممتاز محل کا والد۔ جہاں گیر کا سالہ تھا، دور اکبری میں۔ صوبجات مشرقی کا گورنر تھا عہد جہانگیری کے آخر میں وزیر اعظم مقرر ہوا تھا۔

جہانگیر جب ۱۶۲۷ء میں انتقال کر گیا تو شاہ جہاں نے ۱۶۲۸ء میں اپنے خسر آصف خان کی مدد سے حکومت حاصل کی۔ گولکنڈہ کی جنگ میں جو ۱۶۳۲ء میں ہوئی تھی وہ اس مہم کا سپہ سالار تھا۔ اس کی موت جنگ گولکنڈہ کے بعد ہوئی اور اپنی موت مرا۔

واقعہ نویس نے آصف جاہ کو نورجہاں کا بھائی لکھا ہے۔ حالانکہ آصف جاہ نامی کوئی آدمی دور جہانگیری میں موجود نہ تھا۔ نورجہاں کے بھائی کا نام آصف خاں تھا۔ وہ جہانگیر کے حکم سے نورجہاں کی تلوار کا شکار نہیں ہوتا اور اس کی موت جہانگیر کی موت سے پہلے ہرگز نہیں ہوئی۔ جہانگیر ۱۶۲۷ء میں دنیائے فانی سے عالم باقی کا سفر کرتا ہے۔ آصف خاں جنازے کے ہمراہ موجود تھا۔ شہریار اور شاہ جہاں میں حصول تخت کیلئے رقابت پھیلتی ہے۔ آصف خاں شاہجہاں کی مدد کرتا ہے اور شاہ جہاں آصف خاں کی مدد سے ۱۶۲۸ء میں تختِ حکومت کا مالک ہو جاتا ہے۔

شاہ جہاں بادشاہ ہو کر اپنے خسر آصف خاں کو جو ممتاز محل کا باپ اور نورجہاں کا بھائی ہے وزیر اعظم بناتا ہے۔

کسی فارسی یا انگریزی مورخ نے اس خونچکاں واقعہ کو آصف خاں کی طرف منسوب نہیں کیا ہے۔ مذکورہ بالا اخبار نے اس خونی کہانی کو دورِ جہانگیر کا واقعہ لکھا ہے۔ حالانکہ عہد جہانگیری کا زبردست تاریخی آئینہ تزک جہانگیری ہے جس میں دورِ جہانگیری کا ادنیٰ سے ادنیٰ واقعہ قلمبند ہے۔ اس میں اس واقعہ کا کہیں ذکر تک نہیں ہے" انارکلی" کے فرضی واقعہ کا بھی تزک جہانگیری میں کہیں پتہ نہیں چلتا۔ جہانگیر کا عدل بہت مشہور و معروف ہے۔ تاریخ میں بہت سے صحیح واقعات موجود ہیں جن سے کسی کو انکار نہیں۔ اور یہ عدل جہانگیری کے درخشاں سوتی ہیں۔

رہا آصف خاں تو اُس کی رحمدلی کا ہر مؤرخ قایل ہے۔ صرف اس کی وجہ سے شاہ جہاں میں نرم دلی اور رعایا پروری کے اوصاف ظاہر ہوئے نورجہاں جب مہابت خاں کی جان کی گاہک بنی ہوئی تھی اور وہ بھاگا بھاگا پھرتا تھا تو یہی آصف خاں نورجہاں کی حرکت سے متنفر ہو کر مہابت خاں پر رحم کرتا ہے اور اپنے دامن میں اُسے جگہ دیتا ہے۔

اس واقعہ کو صحیح تسلیم کرنے سے یہ ماننا پڑے گا کہ آصف خاں جہانگیر کی موت سے پہلے مارا جاتا ہے۔ حالانکہ جہانگیر کی موت کے پانچ سال بعد گولکنڈہ کی لڑائی ہوتی ہے۔ شاہ جہاں اس میں آصف خاں کو افواج سلطانی کا سپہ سالار بنا کر بھیجتا ہے۔ یہ دکنی جنگ ۱۶۳۲ء میں واقع ہوئی، آصف خاں اس جنگ سے بخیر و خوبی واپس گھر ہوتا ہے۔ اس کی موت گولکنڈہ کی جنگ کے بعد بیماری سے واقع ہوئی تھی۔ ایک دفعہ دربار شاہجہاں میں یہ تذکرہ چلا کہ چار شہزادوں۔ داراشکوہ، شجاع، اورنگ زیب، مراد میں سے کون حکومت کی صحیح قابلیت رکھتا ہے۔ اور دربار نے آصف خاں وزیر اعظم کو اس جوہر شناسی کے امتحان کیلئے مقرر کیا۔ اور اُس نے اس کام کو بحسن و خوبی انجام دیا۔

ممکن ہے واقعہ نگار کو خود بھی اس واقعہ کی صحت میں شک ہو۔ اور اس بنا پر اُس نے ایک ہندو واقعہ کو ثبوت کے طور پر پیش کیا ہے۔ لیکن یہ واقعہ بھی کسی ظالم حاکم کے حکم سے نہیں ہوا ہے بلکہ ہندوؤں کے

علم الاصنام کا ایک افسانہ ہے جو سنسکرت کی کتابوں میں یوں لکھا ہے کہ راجہ کرن ستیہ جگ میں گذرا ہے۔ سخاوت میں اپنا ثانی نہیں رکھتا تھا ایک دن بھگوان نے یہ خیال کیا کہ چلو اس راجہ کی آزمائش کی جائے چنانچہ ایک بوڑھے برہمن کی صورت میں راج دربار میں حاضر ہوا۔ راجہ نے تعظیم و تکریم عرض کیا۔ کیا ارشاد ہے؟ برہمن نے کہا میں نے برت رکھا ہے ابتک کچھ نہیں کھایا ہے۔ تیرے گھر برت کھولوں گا تو وعدہ کر کہ میں جو کچھ کھاؤں گا کھلائیگا؟ راجہ نے کہا جو کچھ ارشاد ہوگا بجالاؤں گا۔ برہمن نے کہا میرا یہ عہد ہے کہ میں گوشت سے برت کھولوں گا۔ راجہ نے عرض کیا کہ ہر طرح کا گوشت حاضر کیا جائیگا؟

برہمن نے کہا جلدی نہ کرو سُنو جب تمنے وعدہ کرلیا ہے تو اب اس کا پورا کرنا فرض ہے۔

تم بی بی شوہر اپنے ہاتھ سے اپنے لخت جگر کو پکڑ کر ذبح کرکے اسکا گوشت پکاکر مجھے دو۔ میں اس سے برت کھولوں گا ورنہ میں واپس جاتا ہوں عہد شکنی کا وبال تیری گردن پر ہوگا۔ راجہ رانی نے کہا کہ یقیناً ایشور ہمارے امتحان کو برہمن کی صورت میں ظاہر ہوا ہے۔ ورنہ برہمن اور گوشت کا ایک جگہ جمع ہونا ممکن نہیں، لڑکے سے کہا گیا۔ وہ بھی بخوشی تیار ہوگیا۔ لڑکا ماں باپ کے ہاتھوں ذبح کیا گیا۔ گوشت پکاکر دسترخوان پر چنا گیا۔ برہمن نے کہا کہ میری ایک یہ بھی عادت ہے کہ کبھی میں تنہا نہیں کھاتا۔ ایک معصوم بچے کو ضرور شریک طعام رکھتا ہوں، تم اپنے بچے کو بُلالو۔ راجہ نے کہا، وہ کہاں سے آئے، وہ تو ذبح ہوچکا ہے۔ برہمن نے کہا غلط، وہ دوسرے بچوں کے ساتھ گلی میں کھیل رہا ہے۔ آواز دی گئی بچہ فوراً دوڑتا ہوا آگیا ماں نے گلے لگایا، برہمن نے اشیرباد دی اور کہا تو سچا ہے۔"

یہ واقعہ ہے جسے تاریخی واقعات کی شہادت میں پیش کیا جاتا ہے! آصف جاہ کا واقعہ بالکل غلط ہے۔ تاریخی غلطی تو ظاہر ہوچکی ہے۔ مگر یہ عقل کے بھی بالکل خلاف ہے۔ کوئی والدین جابر سے جابر حاکم کے حکم سے اپنے معصوم بچے کو خود اپنے ہاتھ سے ذبح نہیں کرسکتے۔ اپنی جان دے سکتے ہیں مگر حکومت کے حکم سے اپنی جان بچانے کے لئے اپنے ہاتھوں اپنے ننھے بچے کو ذبح نہیں کرسکتے۔ اور نہ تاریخ میں اس طرح کا کوئی واقعہ موجود ہے۔

محمد عمر زکریا۔ بھاگلپوری

نکتہ چیں ہے غمِ دل اسکو سنائے نہ بنے
کیا بنے بات جہاں بات بنائے نہ بنے

میں بلاتا تو ہوں اُسکو مگر اے جذبۂ دل
اُس پہ بنجائے کچھ ایسی کہ بن آئے نہ بنے

غیر پھرتا ہے لئے یوں ترے خط کو کہ اگر
کوئی پوچھے کہ یہ کیا ہے تو چھپائے نہ بنے

کہہ سکے کون کہ یہ جلوہ گری کس کی ہے
پردہ چھوڑا ہے وہ اس نے کہ اٹھائے نہ بنے

موت کی راہ نہ دیکھوں کہ بن آئے نہ رہے
تم کو چاہوں کہ نہ آؤ تو بلائے نہ بنے

بوجھ وہ سر سے گرا ہے کہ اٹھائے نہ اٹھے
کام وہ آن پڑا ہے کہ بنائے نہ بنے

عشق پر زور نہیں ہے یہ وہ آتش غالب
کہ لگائے نہ لگے اور بجھائے نہ بنے

غالب

نقائصِ شعری

یہ بات ہر شخص جانتا ہے کہ نثر کی نسبت نظم لکھنا زیادہ مشکل ہے کیونکہ نثر میں تو صرف قواعدِ زبان کی پابندی کرنی ہے مگر نظم میں وزن اور قافیہ کا بھی خیال رکھنا ہوتا ہے۔ بسا اوقات اکثر نادر مضامین اور اچھوتے خیالات محض اس لئے نظم ہونے سے رہ جاتے ہیں کہ شاعر ایک نظم کیلئے جو وزن اور قافیہ مقرر کرلیتا ہے۔ اُس میں اُن مضامین اور خیالات کو ادا کرنے والے الفاظ بندھ ہی نہیں سکتے۔ یہ وہ دشواری ہے جس کی وجہ سے فنِ شاعری کے جاننے میں یہ خیال پیدا ہوگیا ہے کہ ضرورتِ شعری قواعدِ زبان کی خلاف ورزی کو جائز ٹھیراتی ہے۔

اس میں شک نہیں کہ اساتذہ نے ضرورتِ شعری کی حالت میں زبان وغیرہ کی بعض پابندیوں سے آزاد ہوجانا جائز قرار دیا ہے۔ لیکن اس کا یہ مطلب نہیں کہ جہاں بھی طبیعت رُک جائے وہیں ضرورتِ شعری کا اُصول برت لیا جائے بلکہ ضرورتِ شعری کیلئے قواعدِ زبان سے انحراف کرنے کیلئے خاص قواعد ہیں محض وزن اور قافیہ کی قید اختیار کرکے کسی شخص کو یہ حق حاصل نہیں ہوجاتا کہ وہ باقی تمام قیودِ سخن کو بالائے طاق رکھدے اور جو کچھ جس طرح اُس کے جی میں آئے لکھ مارے وزن اور قافیہ تو ایسی چیزیں ہیں کہ جو شخص اُن کو نباہنے پر قادر نہ ہو اُسے شعر کہنے کی زحمت ہی نہیں اُٹھانی چاہیے۔ شاعر کی کم از کم تعریف یہ ہے کہ وہ وزن اور قافیہ کی قید میں رہتا ہوا قواعدِ زبان اور اُصولِ بلاغت کی پابندیوں کو بوجوہِ احسن نباہ سکے۔ ورنہ اگر شعر صرف اُن چند الفاظ کے دو با قافیہ ٹکروں کا نام ہو جن کے ملنے سے ایک وزن پیدا ہوجائے تو دنیا ایسے آدمیوں سے خالی نظر آنے لگے گی جن کو شاعر کہلانے سے عار ہو۔

فی زمانہ شعر کے صحیح مذاق کا جو فقدان نظر آرہا ہے اُس کی ذمہ داری بھی زیادہ تر ضرورتِ شعری کے عذرِ لنگ پر ہے۔ حد تو یہ ہے کہ اگر آپ کسی اچھے خاصے تعلیم یافتہ انسان کے سامنے یہ کہہ بیٹھیں کہ فلاں شعر میں صبر بروزن خبر بندھ گیا ہے جو غلط ہے تو وہ فوراً یہ جواب دے کر اپنی حاضر جوابی کا ثبوت مہیا کرے گا کہ ضرورتِ شعری کی وجہ سے ایسا کیا گیا ہے۔ گویا ضرورتِ شعری ایک ایسی چادر ہے جو تمام عیوبِ شعر کی پردہ پوشی بڑی آسانی سے کرسکتی ہے۔ شتر گربہ تعقید محاورے کا غلط استعمال۔ الفاظ کا ناقص انتخاب۔ غرضیکہ کوئی عیب بھی ضرورتِ شعری کی موجودگی میں عیب نہیں رہ جاتا۔ بلکہ حسن میں تبدیل ہوجاتا ہے۔ ضرورت کے صدقے عوام کے نزدیک کسی شعر کا غلط ہونا ایسا ہی ناممکن ہے جیسا ایک مطلق العنان بادشاہ سے کسی جرم کا سرزد ہونا۔

نثر کی نسبت نظم صرف اس لئے مشکل نہیں کہ نظم میں وزن قافیے کی پابندی کرنی پڑتی ہے۔ بلکہ اس لئے کہ وزن اور قافیے کی پابندی کے ساتھ ہی ساتھ اُن تمام اُصولوں کا احترام کرنا بھی لازمی ہوتا ہے۔ جن کے بغیر نثر صحیح معنوں میں نثر نہیں ہوسکتی۔ اور یہ بات تو بہت کم لوگوں کو معلوم ہے کہ کسی شعر کی زبان نثر کے جس قدر قریب ہو۔ اُتنا ہی وہ شعر اچھا سمجھا جاتا ہے حقیقت یہ ہے کہ جب ہم کسی شعر سے لطف اندوز ہوتے ہیں تو غیر محسوس طور پر ہم اس بات کا اندازہ کرلیتے ہیں کہ اِس کے لکھنے میں شاعر نے کون کونسی مشکلات پر غلبہ پایا ہے۔ اس طرح سے مشکلاتِ نظم کا مصرف یہ نہیں کہ ان کا عذر رکھ کر ہم شاعری کی زبان کو بالکل بگاڑ دیں اور اسبات کا خیال تک نہ رکھیں کہ ہم جو الفاظ استعمال کرتے ہیں اُن سے ہمارے مافی الضمیر کا اظہار صحیح طور پر ہوتا ہے یا نہیں۔ کسی شعر کو شعر اُسی صورت میں کہا جاسکتا ہے کہ اس میں جو الفاظ استعمال کئے جائیں وہ نہ تو ضرورت سے زیادہ ہوں نہ ادائے مطلب میں قاصر۔

فارسی زبان کا ایک شعر ہے ؎

صائب دو چیز مے شکند قدر شعر را
تحسینِ ناشناس و سکوتِ سخن شناس

اِس شعر کا حوالہ دادِ سخن کے سلسلہ میں اگرچہ بھی کثرت کے ساتھ دیا جاتا ہے۔ مگر آنکھوں دیکھی بات یہ ہے کہ عام شعرا "تحسین ناشناس" ہی کو سرمایۂ افتخار جانتے ہیں "سکوتِ سخن شناس" کو خاطر میں بھی نہیں لاتے۔ بلکہ اُسے معاصرانہ رقابت پر محمول کرتے ہیں بالفاظ دیگر آجکل "تحسین ناشناس" ہی شعرا کی حقیقی رہنما ہے وہ دیکھتے ہیں کہ عام لوگوں میں اُن کے شعر خامیوں کے باوجود پسند کئے جاتے ہیں اُنہیں بے تحاشا داد مل جاتی ہے۔ کبھی کوئی اعتراض یا نکتہ چینی نہیں کرتا اس لئے وہ شعر لکھنے میں محتاط رہنے کی کوشش نہیں کرتے بلکہ ایسا کرنا تضیع اوقات میں داخل سمجھتے ہیں۔ رفتہ رفتہ نوبت یہاں تک پہنچ جاتی ہے کہ اُنہیں خامیوں کا احساس بھی نہیں رہتا یہ ایک ایسی خرابی ہے کہ اگر اس کا مناسب اور بروقت تدارک نہ کیا گیا تو خطرہ ہے کہ اُردو شاعری کا معیار کچھ عرصہ کے بعد بہت ہی پست ہوجائیگا۔ اندریں حالات ضروری معلوم ہوتا ہے

کہ عوام میں شعر کا صحیح مذاق پیدا کیا جائے اور انہیں بتایا جائے کہ وہ کونسی باتیں ہیں جن کی وجہ سے شعر ناقص ہو جاتا ہے۔ اس اُصول کے مطابق دُکاندار اُنہی چیزوں کی نمائش کرتا ہے جن کی خریداری زیادہ ہو۔ اگر عوام میں شعر کی داد دیتے وقت اُس کے حسن وقبح پر غور کر لینے کی عادت راسخ ہو جائے تو شعرا بھی اپنی کوئی نظم عوام کے سامنے پیش کرنے سے پہلے یہ دیکھ لیا کریں گے کہ اس میں کوئی نقص تو نہیں رہ گیا۔

نقائص شعری کی توضیح کرنے کے لئے جو شعر منتخب کئے گئے ہیں۔ اُن کے مصنفین میں بعض ایسے بھی ہیں جن کی قابلیت مسلم ہے اور جو بجا طور پر آسمانِ سخن کے روشن ستارے تسلیم کئے جاتے ہیں۔ ان حضرات سے اگر وہ بقید حیات ہوں راقم السطور کی گذارش یہ ہے کہ اس مضمون سے کسی کی تنقیص مقصود نہیں۔ بلکہ مذاق عام کی اصلاح مطلوب ہے۔ چنانچہ اس سلسلہ میں کسی شعر کے مصنف کا نام ظاہر نہیں کیا جائیگا۔ بلکہ بعض شعروں کے متعلق خود راقم السطور کو بھی یہ معلوم نہیں کہ ان کا وجود کون کون سے شعرا کی کاوش فکر کا رہین منت ہے۔ بہر حال ذیل میں ایسے اشعار کے نمونے درج کئے جاتے ہیں جو قواعد زبان اور اُصول فن کی کسوٹی پر پورے نہیں اُتر سکتے ؎

حملہ غضب ہے بازوئے شاہ حجاز کا
(۱) لنگر نہ ٹوٹ جائے زمیں کے جہاز کا

اس میں شک نہیں کہ زور بیان اور صفائی زبان کے اعتبار سے یہ شعر ایک امتیازی شان اپنے اندر رکھتا ہے۔ مگر پہلے مصرعے میں لفظ "بازو" بلاضرورت یا ضرورت شعری سے استعمال کیا گیا ہے۔ نفس مضمون کی ضرورت کو پورا کرنے کے لئے شاہ حجاز کا حملہ لکھ دینا ہی کافی تھا۔ پھر یہاں بازو کا استعمال محاورے کے بھی سراسر خلاف ہے۔ فوج کا حملہ، شیر کا حملہ۔ امان اللہ خاں کا حملہ تو بولا اور لکھا جاتا ہے۔ لیکن فوج کے قدموں کا حملہ، شیر کے پنجے کا حملہ یا امان اللہ خاں کے ہاتھ کا حملہ کبھی نہیں سُنا۔ اسی طرح شاہ حجاز کے بازو کا بھی ذوق سلیم پر گراں گزرتا ہے۔ اس کی بجائے اگر شاہِ حجاز کی فوج کے بازو کا حملہ ہوتا تو ایک بات تھی کہ فوج کا جو حصہ باہر کی طرف پھیلا ہوتا ہے اُسے بازو کہتے ہیں۔ لیکن فوج کی رعایت سے جہاز اور جہازی اصطلاحات کو قید نظم میں لانے کی ضرورت نہ تھی۔ اگر یہ کہا جائے کہ بازو کا استعمال جہاز اور لنگر کی رعایت سے کیا گیا ہے اور بازو سے مراد مچھلی ہے جس کا گھر جہاز کی طرح سمندر یا دریا ہوتا ہے تو اس میں بھی یہ اعتراض پیدا ہوگا کہ معمولی مچھلی سے جہاز کو کوئی خطرہ نہیں ہو سکتا اور وہیل مچھلی یا شارک کا وجود الفاظِ شعر سے ثابت نہیں اس کے علاوہ مچھلی کو بازو یا بازو کو مچھلی کے تلازمات میں تو استعمال کیا جا سکتا ہے۔ لیکن مچھلی کے معنے بازو یا بازو کے معنے مچھلی لینا کسی طرح بھی جائز نہیں نہ اس قسم کے دور از کار استعارات سے شاعری کو کوئی فائدہ پہنچ سکتا ہے ؎

آئے اجل نہ عیسیٰ بے موت ہی مریں گے
(۲) دونوں کو ہو مبارک تاخیر اپنی اپنی

پہلے مصرعے میں "بے موت ہی مریں گے" اس طرح بندھا ہے۔ گویا اجل کی طرح عیسیٰ کا کام بھی ہلاک کرنا ہے۔ شاعر کہتا ہے کہ اگر اجل بھی نہیں آتی تو نہ آئے۔ اور حضرت عیسیٰ بھی تشریف نہیں لاتے تو نہ لائیں ہمیں دونوں میں سے کسی کی پروا نہیں۔ نہ اُن کا انتظار کرنے کی ضرورت ہے۔ کیونکہ ہم بے موت ہی مر سکتے ہیں۔ مگر مسیحائی جو حضرت عیسیٰ کے دوسرے نام مسیح سے مشتق ہے ہمیشہ زندہ کرنے کی طاقت کے معنوں میں استعمال ہوتا ہے۔ دوسرے مصرعے میں اپنی اپنی محض برائے ردیف ہے جسے کسی طرح بھی مستحسن قرار نہیں دیا جا سکتا۔ اگر تاخیر کے مفہوم کو اچھی طرح ذہن نشین کر لیا جائے تو صاف معلوم ہو گا کہ اس کے ساتھ اپنی اپنی لکھنا محاورے کا خون کرنا ہے ؎

کون سی راہ چلوں کفر و محبت سچ کہہ
(۳) کام آئیگا وہاں مذہبِ اسلام کہ تو

اس شعر کا شمار ان شعروں میں بھی نہیں ہو سکتا۔ جن کے معنی نہاں خانۂ بطن شاعر میں مستور رہتے ہیں یا زیادہ سے زیادہ عقیدت مندوں کی آئندہ نسلوں میں سینہ بسینہ منتقل ہوتے چلے جاتے ہیں۔ سخن فہمی کی ساری طاقتیں اس بات کا سُراغ نکالنے میں زائل ہو کر رہ جاتی ہیں کہ پہلے مصرع میں شاعر کا مخاطب کون ہے۔ اگر خطاب کا نشانہ کفر و محبت کو بنایا گیا ہے تو یہ معمہ سمجھ میں نہیں آتا کہ ان کے لئے صیغہ واحد حاضر کیوں استعمال کیا گیا ہے اور دوسرے مصرعے میں ان کو لفظ "تو" سے مخاطب کرنے کا جواز کیا ہے۔ اس کے علاوہ "سچ کہہ" کا محل استعمال بھی غلط ہے شعر کے سیاق سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ شاعر اپنے مخاطب سے مشورہ طلب کر رہا ہے۔ حالانکہ جب کسی سے سچ کہنے کی تاکید کی جاتی ہے۔ تو ایک نزاعی بحث واقعہ کی تصدیق یا تردید کرانا مقصود ہوتا ہے۔ "مذہب اسلام" کی ترکیب بھی شاعر کی بے پروائی کا شکوہ کر رہی ہے جب پہلے مصرعے میں کفر و محبت کو صرف کفر و محبت لکھنے پر اکتفا کی گئی ہے۔ تو دوسرے مصرعے میں اسلام کے ساتھ مذہب کا دُم چھلا لگانے کی قطعاً کوئی ضرورت نہ تھی۔ اگر کفر و محبت شاعر کے نزدیک دو قریب المعانی الفاظ ہیں۔ تو اسلام کے ساتھ کوئی ایسا لفظ بھی لگانا چاہئے تھا۔ جو قریب قریب اس کا ہم معنی ہوتا

پھر کفر تو مسلمہ طور پر اسلام کی ضد ہے۔ مگر محبت کے متعلق ہر حالت میں یہ فتویٰ صادر نہیں کیا جا سکتا۔ عاقبت کے معنوں میں لفظ "وہاں" کا استعمال بھی عجز طبع پر دلالت کر رہا ہے۔ پہلے مصرع میں "کونسی راہ چلوں" لکھنے کے بعد دوسرے مصرع میں "کام آئیگا" لکھنا بھی رعایت لفظی یا معنوی میں داخل نہیں "راہ چلنے" پکر باندھی جائے تو "منزل پر پہنچے" کی بات کرنی چاہیئے ؎

بجائے مے دیا پانی کا اک گلاس مجھے
(۴) سمجھ لیا مرے ساقی نے بدحواس مجھے

یہ شعر حالیہ شاعری کے بہترین نمونوں میں شمار ہونے کے قابل ہے شاعر شراب پینے کی عادت میں بُری طرح مبتلا تھا۔ اس عادت نے اسکی صحت کو خطرناک حد تک خراب کر دیا تھا اور انجام کار اس کی جان بھی لے لی۔ حالت نزع میں اس نے اپنے ملازم سے شراب مانگی۔ مگر ملازم نے خیر خواہی کے خیال سے اسے پانی دیدیا۔ شاعر نے ملازم کا مطلب سمجھ لیا۔ اور یہ شعر اس کی زبان سے نکل گیا۔ متکلم کا یہ کہنا کہ ساقی نے مجھے بدحواس سمجھ لیا ہے۔ ورنہ وہ شراب کی بجائے مجھے پانی کا گلاس ہرگز نہ دیتا۔ ایک ایسی رندانہ چوٹ ہے جس کا لطف اُٹھانا ذوق سلیم سے تعلق رکھتا ہے لیکن پہلے مصرعے میں لفظ "اک" محض وزن پورا کرنے کے لئے استعمال کیا گیا ہے اور یہ ایک ایسا نقص ہے جسے آسانی سے نظر انداز نہیں کیا جا سکتا ؎

حقیقت میں ہو تم دنیا سے اچھے
(۵) حقیقت میں مگر دنیا ہی کیا ہے

بادی النظر میں یہ شعر بہت ہی اچھا ہے۔ دونوں مصرعوں کے شروع میں "حقیقت میں" ایسی برجستگی کے ساتھ آیا ہے کہ لطف تکرار کے ساتھ ہی شعر میں کمال کی صفائی اور روانی بھی پیدا ہو گئی ہے لیکن اگر گوہر معانی کی تلاش کیلئے غور و فکر کے سمندر میں غوطہ لگایا جائے تو مایوسی کے سوا کچھ بھی ہاتھ نہیں آتا۔ شاعر اپنے معشوق سے کہتا ہے کہ تم حقیقت میں دنیا سے اچھے ہو۔ مگر حقیقت میں دنیا ہی کچھ نہیں ہے معشوق کو ایک ایسی چیز سے اچھا ثابت کرنا جو خود اچھی نہ ہو کسی طرح بھی کمال سخن میں داخل نہیں شاعر نے تہیّہ کیا تھا اپنے معشوق کی تعریف کرنے کا مگر الفاظ کے ہیر پھیر آ کر کر گیا اُس کی مذمت۔ ایک مستند شاعر اور مسلم الثبوت اُستاد سے ایسی صریح لغزش ہو جانا بلاشبہ باعث تعجب ہے۔ دھوم دھام کے ساتھ اُٹھنا۔ اور قدم اُٹھانے سے پہلے دھم سے زمین پر گر پڑنا اس کو کہتے ہیں۔ اغلب ہے کہ شاعر کی یہ لغزش غیر ارادی ہو مگر ہے لغزش۔

میلا رام وفاؔ
ایڈیٹر روزانہ ویربھارت لاہور

دیکھا کئے وہ مست نگاہوں سے بار بار   جب تک چلی شراب کئی دور ہو گئے
فرنگی سے کہا پنشن بھی لیکر بس یہیں رہئے   کہا جینے کو آئے ہیں یہاں مرنے نہیں آئے
لے جائیں آہ مجھکو مری بدگمانیاں   ظالم وہاں کہ تیرا پتہ بھی جہاں نہ ہو
شکائتوں سے محبّت کی اور کیا حاصل   کچھ انفعال تمہیں ہو کچھ انفعال مجھے
کیونکر نہ مریں موت پہ بیمار محبت   ایسا یہ مزہ ہے کہ مکرر نہیں ملتا
دنیا میں وضعدار حسین اور بھی تو ہیں   معشوق اک تمہیں تو نہیں اور بھی تو ہیں
وہاں جھوٹے وعدہ پہ لب ہل گیا   توقع یہاں کس قدر ہو گئی

ایکٹرس

"سائینورا! سائینورا!"

دروازہ کھلا اور خادمہ بے تابانہ کمرہ میں داخل ہوئی۔ اُس کے پیچھے پیچھے ایک اور آدمی تھا۔ جس کا قد چھوٹا اور جسم موٹا تھا۔ اور اس کا چہرہ گھبراہٹ سے زرد ہو رہا تھا

"خدایا تیرا شکر! وہ موجود ہے۔"

گوڈٹا نے جو اپنا پیانو کھول رہی تھی۔ اس کا ڈھکنا گر جانے دیا۔ وہ گرا اور پیانو کے سُر گونج اُٹھے۔

اس گھبراہٹ میں اُس آدمی نے دفعتہً ہانپتے ہوئے کہا۔

"لیمبرٹی بیمار ہے۔ مرگئی۔ ختم ہوگئی۔ ہمنے آج رات "رقص بہار" رکھا تھا اور اسے اس میں بیشیرو مغنیہ کا پارٹ کرنا تھا۔ بادشاہ اور ملکہ بھی موجود ہوں گے۔ گوڈٹا تمہارے سوا اس پارٹ کو کوئی نہیں گا سکتا۔ گوڈٹا تمہیں کو گانا ہوگا! تمہیں آؤ اور اس تمثیل کو پورا کرو۔ ہاں یہ پارٹ تم جانتی ہو؟ کیوں نہیں؟ کیا تمام یاد ہے؟"

"تمام" نوخیز ایکٹرس نے کہا جو پیانو کے قریب ایک ملبوس مجسمے کی مانند کھڑی تھی۔ اس کا چہرہ منیجر کے چہرہ سے زیادہ زرد تھا۔ "میں "رقص بہار" گا سکتی ہوں اور لیمبرٹی سے بہتر اس پارٹ کو ادا کرسکتی ہوں۔ اُس نے میرے لئے میدان چھوڑ ہی دیا نا، کیا نہیں؟"

"گوڈٹا۔ کیا تمہیں ریہرسل کی ضرورت نہیں؟ میں ایک منٹ میں آرکسٹرا جمع کئے دیتا ہوں...."

وہ کرسی میں پیچھے کی طرف بے قابو سا ہو کر گر پڑا۔ گویا کانپتے ہوئے گوشت کا ایک لوتھڑا ہے۔ وہ تباہی سے بچا لیا گیا تھا۔ وہ گوڈٹا کی بلبل کی سی آواز کو اچھی طرح جانتا تھا۔

"نہیں" اُس نے کہا "مجھے کسی چیز کی ضرورت نہیں۔ میں ہر ایک ریہرسل میں موجود رہتی ہوں۔ میں نے اس پارٹ کو اچھی طرح مطالعہ کیا ہے۔ اسی انتظار میں کہ کوئی معجزہ ظاہر ہو۔ میں ہر ایک انداز نظر۔ ہر ایک سُر۔ ہر ایک قدم اور تبسم سے آگاہ ہوں۔ میں گاؤں گی اور ضرور کامیاب بھی ہوں گی۔ لیمبرٹی مر رہی ہے۔ تم یہی کہتے ہو نا؟"

منیجر نے اسے گلے سے لگا لیا اور تیزی کے ساتھ کمرہ سے نکل کر پریس والے کی طرف چلا گیا کہ وہ آج کے تماشے کے اشتہارات میں گوڈٹا کا نام درج کردے۔ جن کی زمین سبز اور حروف سیاہ ہونا چاہئیں۔ رقص اور نغمے کی ملکہ مر رہی تھی۔ اس کی جانشین گوڈٹا ہی ہونی چاہئے۔ اور ہوگی۔

جس وقت سے گوڈٹا اسٹیج پر آئی تھی وہ اب تک محض خواصوں اور دہقانی لڑکیوں اور ہیروئن کی کسی حقیر اور غیر نمایاں خادمہ کا پارٹ گاتی رہی تھی۔

جس وقت منیجر کمرے سے باہر چلا گیا وہ مجسمہ کی طرح بے حس و حرکت تھی۔ مگر لمبے لمبے سانس لیتی اور نرم نرم سسکیاں بھر رہی تھی۔

"ایلینا سامان باندھ لو"۔ اُس نے خادمہ سے با آواز بلند کہا "سبع بالوں کی ٹوپی۔ موتی۔ مونگے۔ سرخ ریشمی جوتے۔ سنہرے اور روپہلے بھی ان میں سے کوئی چیز رہ نہ جائے۔ میں لیمبرٹی ہی کا لباس پہنوں گی۔ وہ میری ہی قد و قامت کی ہے۔ اگرچہ میں اس سے زیادہ دُبلی پتلی ہوں۔ ہمیں تھیٹر میں ضرور پہنچنا ہے۔ لو جلدی کرو۔ وہاں تمہیں کچھ سینا بھی تو ہوگا۔ وقت کیا ہے ابھی پانچ بجے تھے اور تماشا آٹھ بجے ہونا تھا۔ وہ اپنا سر پیچھے کو ڈالے کر بیٹھ گئی۔ وہ دوسرے ایکٹ کے ابتدائی نغمے کی تان پر گلا بازی کر رہی تھی کہ اتنے میں اُس نے دروازے پر گھنٹی کی آواز سنی۔

"ایلینا کسی کو اندر مت آنے دو۔ خواہ بادشاہ ہی کیوں نہ ہو۔

وہ ایک صاف لطیف میٹھے سروں کا دلآویز راگ گا رہی تھی کہ دروازہ اچانک کھل گیا۔

"ارکول! ارے تم کیا چاہتے ہو ارکول؟"

یہ شخص اس کے قدیم مربی شہزادے کا خادم تھا۔ اسے معلوم تھا کہ پرنس سٹیلیو بیمار ہے۔ بہت بیمار۔ کیا اُس کے خادم کی آمد کے یہ معنے ہیں کہ وہ مر رہا ہے۔ اور کیا اسے دوسرا وقت چھوڑ کر اسی وقت مرنا ہے۔ غریب خدمتگار کانپ رہا تھا۔ اس کے منہ سے بات نہ نکلتی تھی اور وہ غصہ میں گھونسہ تان رہی تھی۔ ہاں تو شہزادہ مر رہا ہے اور اسی وقت مر رہا ہے۔ اُسی نے اُسے بلایا ہے۔ اور اپنے وفادار خدمتگار کو بھیجا ہے کہ وہ اس کو لیجائے۔ کیا اسے ضرور جانا ہوگا؟ ہاں اسے جانا ہی چاہئے۔ کیونکہ وہی تو اس کے معلموں اس کے موسیقی کے اُستادوں اور دیگر خانگی ملازموں کو تنخواہیں دیا کرتا تھا۔ اسی نے اُسے زندگی دی۔ اُسے آرٹ سکھایا۔ ملک میں اُستاد بنایا۔ اگر اس کی

سرپرستی اسے حاصل نہ ہوتی تو وہ ابھی تک کہیں وایالار گاہی میں پڑی رنگترے بیچ رہی ہوتی۔

"ایلینا"۔ اُس نے کہا "تم تھیئٹر کو جاؤ۔ اور میں ابھی ایک گھنٹہ میں وہاں پہنچتی ہوں۔ دیکھو سب سامان لیس رہے۔ شہد اور فنیل کا ایک مرکب بنا لینا اور۔ ہاں میرے لئے تین انڈے ۔ اور یوکلپٹس آئل کے چند قطرے تیار رہیں۔"

اُس نے اپنے چھوٹے خوبصورت سنہرے بالوں پر اوڑھنی سی ڈال لی۔

سائنورا! موٹر باہر حاضر ہے"۔ ارکول بولا۔

اُس نے کمرے کے چاروں طرف دیکھا کہ اب جب وہ دوبارہ اس کمرہ میں داخل ہوگی تو یہاں کی ہر ایک چیز پہلے سے مختلف ہوگی۔ بادشاہ اُسے مبارک باد کہیگا۔ وہ مشہور ہوگی۔ ہجوم اُس کے نام کے نعرے لگائیگا۔ اُس نے گھر سے باہر قدم رکھا کہ اُس تغیر سے ملاقات کرے جس کا اُس نے خواب دیکھا ہے۔ اُس کی موٹر روما کی سڑکوں پر سے اُڑی چلی جارہی تھی۔ اور ستون۔ فوارے۔ گرجا گھروں کے دروازے محلات کی فصیلیں بادلوں کی سی تیزی سے اس کے پاس سے گذرتے جارہے تھے۔ شہر کی مختلف آوازیں شور انگیز موجوں کی مانند اسکی موٹر سے ٹکرائی تھیں۔ آج کے بعد کل اسے ہر ایک شخص کی طرف سے مبارک باد ملیگی۔ سر تعظیم کے لئے اس کے سامنے جھکیں گے۔ لوگ اس کی آمد کی آواز سُنتے ہی اس کے لئے راستہ چھوڑ دیں گے۔ آج نہیں کل۔ ....

وہ اُچھل کر موٹر سے نکلی۔ لیکن پرنس سٹیلیو مر رہا ہے۔ مر رہا ہے تو پھر اسے کیا؟ اس کے پاس اب کسی کے لئے وقت نہیں ہے۔ حتیٰ کہ اتنا بھی نہیں کہ وہ اپنے سرپرست سینٹ جیسٹینا سے دعا ہی کرسکے۔ برابر کے کمرے میں ڈاکٹر تھا جو واپس جانے کی تیاری کر رہا تھا۔

"سائنورا میں پھر آتا ہوں"۔ ڈاکٹر نے کہا۔ غالباً شہزادہ تین گھنٹہ تک اور زندہ رہے گا۔ اب درد کا کچھ احساس نہیں ۔ میں کچھ نہیں کرسکتا خاموش ہو جانے سے پہلے اس کی زبان پر لگاتار تمہارا ہی نام تھا۔ اس کی آنکھیں تمہیں بند کردینا چاہئیں۔ اس کے الفاظ ہیں کہ وہ تمہیں دیکھے بغیر نہیں مرسکتا تمہیں ضرور اس کے پاس ٹھیرنا چاہیئے۔

"تین گھنٹے ....."

"میں ایک گھنٹہ میں پھر واپس آتا ہوں اور اب اسے کسی چیز کی ضرورت بھی نہ ہوگی۔ تم خاموشی سے اس کے پاس بیٹھی رہو۔ یہی آخری عطیہ ہے جو اس زندگی میں تم اسے دے سکتی ہو۔ یہی محبت اور فرض کی آخری خدمت ہے۔ تم اسے مرجانے کے لئے تنہا نہیں چھوڑ سکو گی"۔

گوڈنا نے ڈاکٹر کی ان باتوں پر کان نہیں دھرا۔ اور بددلی سے کہا۔ "تم نے تین گھنٹے بتائے ہیں"۔

"ہاں قریباً تین گھنٹے۔ سائنورا دنیا کی کوئی چیز نہیں ان تین گھنٹوں کو کھو دینے پر مائل نہیں کرسکتی۔ آج ہی صبح اُس نے اپنی وصیت مکمل کی ہے اسے پتہ تھا کہ وہ مر رہا ہے۔ سائنورا اُس نے اپنی آدھی جائداد تمہارے نام منتقل کردی ہے۔ اور تم جانتی ہی ہو کہ یہ ایک دولتمند شخص ہے"۔

"تین گھنٹے ....."

اس نے تکبر اور حقارت سے بھری ہوئی نگاہ ڈاکٹر پر ڈالی۔

"بہت اچھا اب تم جاسکتے ہو۔ میں جانتی ہوں کہ میرا فرض کیا ہے"۔

اُس نے ڈاکٹر کی طرف سے مُنہ موڑ لیا۔ اسے خوب معلوم تھا اس کا بلند ترین فرض کیا ہے۔ آرٹ! آرٹ! آرٹ! وہ ضرور گائے گی۔ وہ ضرور پبلک کے سامنے اپنے رقص کا کمال دکھائیگی۔ قسمت کا معجزہ ہماری زندگی میں ایک ہی بار دکھایا جاتا ہے۔ اگر ہم اپنا وہ موقعہ کھو دیں تو پھر ہمیں دوسرا موقع ہاتھ نہیں آتا۔

وہ کمروں میں سے گذری اُس نے دیکھا کہ پرنس کے خدمتگار دروازوں پہ گھٹنوں کے بل ہو ہو کر گڑگڑاتے۔ سسکیاں بھرتے۔ اور آہستہ آہستہ منتیں مان رہے ہیں۔ سردی کی شام بڑھی چلی آرہی تھی۔ بجلی بتی ہر شمعدان میں روشن ہو چکی تھی۔

وہ بیٹھ گئی اور حساب کرنے لگی۔ اسے اپنے ڈرائنگ روم میں چھ بجے پہنچ جانا چاہیئے۔ کیونکہ تبدیل لباس اور تیاری کیلئے ایک گھنٹہ سے زیادہ کی ضرورت ہے۔ اور سٹیج پر جانے سے پہلے آدھ گھنٹہ اسے بغیر کسی قسم کے دغدغے کے پورے طور پر استراحت کر لینا چاہیئے ورنہ وہ گا نہیں سکے گی۔ بدبخت یہ اس وقت کیوں مرتا ہے۔ کیا اس نے اس کو تمام مدد اسی گھڑی کے لئے دی تھی۔ کہ اسے آخری وقت میں اپنی مشقت وجانفشانی کے انعام سے محروم کردے؟ کیا یہ شہزادے کی طرف سے اسکی سرد مہریوں کا انتقام ہے جو وہ اس سے برتتی رہی اور جس کے چھپانے کی اسے قدرت نہ تھی؟ وہ محبت اور اس کی گرمیاں اور سخاوت۔ یہ سب باتیں اس کے گانے کے کمال کے ساتھ رخصت ہوگئیں۔ بھلا اب وہ ایک آدمی کیلئے گانا کیسے چھوڑ سکتی ہے۔ اسکی زندگی کا سارا جذبہ تو اس کی آواز میں ہے۔ اور پھر کس طرح اس کا دل سرد نہ ہو۔ اور کس طرح کوئی اس سے اس وفا اور شیفتگی کا مطالبہ کرسکتا ہے۔ جو اس کے فن ہی کیلئے وقف ہو چکی ہے۔ ہرگز نہیں۔ اسے اس شخص پر مطلق رحم نہیں آنا چاہیئے جو اس کی پورے پانچ برس کی ریاضت اور شوق و آرزو کا پھل اس سے

چھین کر اسے مایوس اور حرماں نصیب بنا دینا چاہتا ہے۔

شہزادہ اپنی بڑی مسہری پر یوں لیٹا ہوا تھا کہ شمع کی روشنی اس کے چہرے پر پڑ رہی تھی۔ وہ دم توڑ رہا تھا۔ اور سُرخ روشنی کی شعاعیں ابدی راحت حاصل ہونے سے پہلے اس پر پڑ رہی تھیں

ارکول کمرہ سے باہر چلا گیا۔ گوڈٹا ۔۔۔ ریشمی لباس کی سرسراہٹ کے ساتھ بیمار کے بستر کے پاس گئی۔ اُس نے کمرے کے اِدھر اُدھر نظر ڈالی۔ مگر کمرہ خالی تھا۔ فقط مرنے والے کی اُکھڑی اُکھڑی سانس کی آواز سُنائی دے رہی تھی۔ شمع کی روشنی میں ایسا معلوم ہوتا تھا گویا پریاں منقش دیوار پر حرکت کر رہی ہیں۔ اور روم کے گڈریوں کے محافظ دیوتا۔ محافظت کے لئے اُن کے پیچھے پیچھے ہیں اور عشق کا دیوتا کیوپڈ ان پر مسکرا رہا ہے۔

مرنے والے نے اپنی آنکھیں کھولیں ان میں دھندلا سا جالا آیا ہوا تھا۔ کیا وہ اندھا ہو گیا؟ ایسا معلوم ہوتا تھا کہ وہ کوئی چیز ڈھونڈ رہا ہے۔ گوڈٹا نے اُس کا ہاتھ تھام لیا کہ اچانک پرنس سٹیلیو نے اس کا دایاں ہاتھ پکڑ لیا۔ اور اپنے دونوں ہاتھوں سے مضبوطی کے ساتھ اسے دبایا اور بھینچا۔ اب گوڈٹا اس کی گرفت میں تھی۔ گویا کہ وہ ایک وحشی درندے کے جبڑوں کے درمیان ہے۔

"مجھے چھوڑ دو! ورنہ میں تمہارا بازو توڑ ڈالوں گی۔"

لیکن وہ اس طاقت سے بیخبر تھی جو مرنے والوں میں غیب سے آجاتی ہے۔

پرنس سٹیلیو نے اسے اپنی فولادی گرفت میں لے رکھا تھا۔ وہ اب نہ ہلتا تھا۔ نہ دیکھتا تھا۔ اور نہ سُنتا تھا۔ زندگی تمام جسم سے کھنچ کر اس کے بازوؤں کے عضلات میں آگئی تھی۔ آخر گوڈٹا نے جدوجہد چھوڑ دی اور اپنا ہاتھ مرنے والے آدمی کی گرفت ہی میں رہنے دیا۔ اس سے اس کی روح گھلی جاتی تھی۔ اُس نے خیال کیا۔

"مجھے اس کمرے سے آدھ گھنٹہ بعد چلے ہی جانا چاہئے۔ ورنہ بہت زیادہ دیر ہو جائیگی۔ اب گیبو کے کلیسا سے سوا پانچ بجنے کی آواز آرہی ہے۔ مجھے چھ بجے تھیٹر میں حاضر ہونا چاہئے۔ ورنہ آج کی رات میں نہیں گاؤنگی نہیں گا سکوں گی۔ ہائے! یہ مر کیوں نہیں جاتا؟"

کیا وہ اپنی مدد کیلئے چلاتی؟ چلاتی؟ تو کون اسے چھڑانے آتا؟ سب لوگ اسی کو مجبور کرتے کہ یہیں ٹھیری رہے۔ جب تک کہ یہ مر چکے۔ مر چکے۔ تین گھنٹوں میں شہزادے کی نگاہ اس پر جمی ہوئی تھی۔ کیا وہ اسے پہچانتا تھا؟ اگر پہچانتا تھا تو اس پراسرار ساعت میں کس قدر پہچانتا تھا؟ کیا گوڈٹا کے دل کا راز اس پر کھل گیا تھا؟ کیا وہ ان خواہشات اور خیالات کو جو اس کے دل میں بھرے تھے دیکھتا تھا؟ ابھی تک اس نے اس کا ہاتھ نہیں چھوڑا۔ نہیں چھوڑتا۔ گوڈٹا نے اُسے دیکھا اسی طرح جس طرح کہ وہ اسے دیکھ رہا تھا کہ دفعۃً اُس نے چلا کر کہا۔

"میں تمہیں مار ڈالوں گی۔ آخر کیوں اور کس لئے۔ میں اپنا مستقبل اپنی زندگی تمہاری بے ہوشی کی آخری ساعتوں پر قربان کر ڈالوں؟ واہ کیا تمہاری موت اتنی گراں قیمت ہے جتنی کہ میری شہرت۔ سٹیلیو! میرے لئے ایثار کرو۔ وہ روپیہ جو تم نے مجھ پر اور میرے لئے اُٹھایا وہ تمہارے واسطے کوئی چیز نہ تھا۔ کچھ قیمت نہیں رکھتا تھا تم میری ساری زندگی میں سے صرف دو گھنٹے مجھے دیدو۔ لو معاملہ طے ہو گیا۔ ہاں طے ہو گیا۔ کیونکہ تمہیں نے مجھے بنایا اور پیدا کیا ہے۔ اور آج کی رات تو مجھے گانا ہے۔

پھر اُس نے اپنے بائیں ہاتھ سے نائٹ ٹیبل کا ایک دراز کھولا۔ اور اس میں سے ایک ڈبیہ نکالا جس میں کچھ سفوف رکھے تھے اُن میں سے ایک اُس نے اکثر دفعہ شہزادے کو سُلانے کے لئے استعمال کرایا تھا۔ اور وہ اس کی طاقت سے واقف تھی۔ اس بکس میں اب تین قسم کے سفوف موجود تھے۔ اُس نے ان تینوں کو لیکر ایک گلاس میں ڈالا۔ ان میں پانی ملایا۔ اور پانی کے نتھر جانے کا انتظار کیا۔ مرنے والے کا منہ کھلا تھا۔ گوڈٹا نے اپنے بائیں ہاتھ ہی سے باوجود اس کے بھاری بھرکم ہونے کے اسے بستر ہی میں بٹھلایا۔ اور اس کے سر کو سہارا دیا۔ گلاس اُٹھایا اور مرکب اس کے منہ میں اُنڈیل دیا۔ شہزادے نے مرکب کو حلق سے اُتارا۔ کچھ تھوکا۔ پھر پی لیا۔

گوڈٹا کے دل میں رحم کا کوئی شائبہ نہ تھا۔ اُس نے پرنس کو مرکب کا آخری قطرہ تک نگل جانے پر مجبور کر دیا۔ اور خالی گلاس کو دھویا اور پانی پلنگ کے پچھلی طرف کے قالین پر گرا دیا۔ اس کی سانس اور کتنی دیر تک چلیگی؟

فقط بیس منٹ اور اس کے بعد گوڈٹا آزاد ہو جائے گی۔

ایک لرزا دینے والا خوف اس کے دل میں آیا کہ اس کی نغمہ نوازی کا کیا انجام ہوا چاہتا ہے۔ یہ خیال اسکے سر میں تھا۔ زبان پر نہ تھا۔ وہ گانے لگی وہ گا رہی تھی اور اس کا ہاتھ ابھی تک مرنے والے کی گرفت ہی میں تھا۔ اور وہ اس کے بستر پر جھکی ہوئی تھی۔

دروازہ کُھلا اور ارکول کا اشک آلود چہرہ نظر آیا۔ گوڈٹا نے اپنا راگ بند کر کے بے صبری سے کہا۔

"اس کی خواہش ہے کہ میں گاؤں۔ تم چپ رہو۔"

ارکول دروازے میں کھڑا رہا۔ گوڈٹا گاتی رہی۔ ہاں وہ گا رہی تھی وہ پیارا راگ جو اسے بہت پیارا تھا۔ اس کی بانسری کی سی آواز کا زیر و بم

آواز کی قیامت خیز لہک، مدھم، نرم ہو کر پھر غائب ہو جاتی تھی۔

ایکٹرس نے گہرا سانس لیا اور اپنا ہاتھ کھینچکر چھڑا لیا۔ پرنس مر چکا تھا گو ڈٹا آزاد تھی وہ سیدھی کھڑی ہو گئی۔ اور کول جو کمرے کے دوسرے سرے سے اس کے چہرے کا تغیر دیکھ رہا تھا۔ دوڑ کر پلنگ کے پاس آیا اور سسکیاں بھرنے لگا۔

"مر گیا"۔ ! مر گیا! آہ میرا آقا مر گیا"۔

"مر گیا" ایکٹرس نے اس کی آنکھیں بند کرتے ہوئے کہا وہ کمرے سے نکلی اور غلام گردش میں سے جھپٹ کر بڑھی چلی گئی

"مر گیا" اس نے گھٹنوں کے بل جھکے، دعائیں کرتے اور سسکیاں بھرتے ہوئے نوکروں کو چلا کر کہا "مر گیا! مر گیا!"

اب وہ سرتا بہ قدم کامیابی اور فتح تھی وہ جانتی تھی کہ اس کی آواز میں غیر فانی حسن اور ترنم ہے۔ وہ آج رات اپنی آواز سے دنیا کو مسخر کریگی۔ اور کل شہزادے کی جائیداد کی وارث شہرہ آفاق ایکٹرس، شہنشاہ اور پوپ سے زیادہ مقتدر عورت ہوگی۔

وہ موٹر میں بیٹھی اور بولی "تھیٹر"

ماخوذ مہر محمد خان شہاب مالیر کوٹلوی

غزل

ہوسِ سود میں سودائے زیاں کرتا ہوں
جو مجھے چاہئے کرنا وہ کہاں کرتا ہوں

دل پھنکا جاتا ہے پر آہ کہاں کرتا ہوں
کسقدر پاس ترا سوزِ نہاں کرتا ہوں

حالِ دل کچھ تو نگاہوں سے عیاں کرتا ہوں
اور کچھ طرزِ خموشی سے بیاں کرتا ہوں

شغلِ الفت میں کوئی دم بھی نہیں ہے بیکار
اور جب کچھ نہیں کرتا ہوں فغاں کرتا ہوں

ہمنشیں میرے بہت ہیں نہیں ہمراز کوئی
دل کی جو بات ہے کب وقف زباں کرتا ہوں

عقل حیران ہے خود اپنی کہ میں کیا کیا کچھ
دوستی میں تری اے دشمنِ جاں کرتا ہوں

جانتا کیا نہیں میں تیری وفا کو لیکن
صرف رنگینئ عنوانِ بیاں کرتا ہوں

شغل مے سے مجھے کیا کام مگر جب ناصح
پوچھتا ہے تو میں کہتا ہوں کہ ہاں کرتا ہوں

لطف آجاتا ہے اربابِ سخن کو وحشتؔ
جب کبھی تذکرۂ حسنِ بتاں کرتا ہوں

وحشت کلکتوی

تلاشِ مسرّت

دنیا خوشی اور مسرت کی تلاش میں ہے۔ کچھ لوگ اسے بنوں اور جنگلوں انسانی آبادیوں اور دنیا کی شور شوں سے دور ڈھونڈتے ہیں اور کچھ دنیا کے مجلسوں، دولت کے کاشانوں، ناچ رنگ کی محفلوں میں تلاش کرتے ہیں۔ لیکن آہ! مسرت تیرا کہیں بھی پتہ نہیں ملتا۔ غریب خیال کرتے ہیں تو امیروں کے سر بفلک ایوانوں اور بادشاہوں کے محلوں میں رہتی ہے۔ اور امیر کہتے ہیں۔ غریبوں کی جھونپڑیاں تجھے مرغوب ہیں لیکن حقیقت یہ ہے یہ دونو تجھ سے ناآشنا ہیں۔ اگر غریبوں کو شکوہ ہے کہ تو ان کی آشنا نہیں بنتی تو امیروں کو بھی شکایت ہو کہ وہ اپنے قارون کے سے خزانوں سے بھی تجھے نہیں خرید سکتے۔ لیکن کام اور مسلسل کام تجھے اسیر کر سکتا ہو جو تجھ سے بے اعتنا ہو کہ کام میں مصروف ہو جاتا ہے۔ نامعلوم طور پر آتی ہے اور اس کے سر پر اپنے بازوؤں کا سایہ ڈال دیتی ہے۔ دنیا والے تیری تلاش میں مایا کے دیوتا کی پوجا ضروری خیال کرتے ہیں لیکن ہم دیکھتے ہیں کہ دنیا کے سب سے زیادہ دولتمند اور سب سے بڑے موجد اس بارے میں کیا کہتے ہیں۔ ایڈیٹر۔

کیا مسٹر فورڈ خوش ہے؟

(از ایڈیسن)

میں ابھی وہاں موجود تھا کہ لوگ کس طرح فورڈ کی نئی ایجاد شدہ موٹر کے گرد جمع تھے۔ دنیا بھر میں اس موٹر کا کس شان سے استقبال کیا گیا ہے یقیناً ایک شخص خیال کریگا کہ اس واقعہ نے فورڈ کو بقیہ عمر کے لئے مسرور و شاداں بنا دیا ہوگا۔ لیکن ایسا نہیں۔ کیونکہ فورڈ اس قسم کا آدمی ہی نہیں جو زیادہ دیر تک خوش رہ سکے۔ اس کا ذہن ہر وقت کام میں لگا رہتا ہے۔ اسے نظر آتا ہے کہ ابھی کس قدر کام ہے۔ جو اسے کرنا ہے۔ جب وہ کوئی کام کرتا ہے اور اسے اسمیں کامیابی ہو گئی ہے تو یہ کامیابی کچھ وقت کیلئے اسے ضرور خوش کر دیتی ہے۔ لیکن ایسی خوشیاں فوراً ہی ختم ہو جاتی ہیں۔ کیونکہ ایک اور کام اس کے سامنے آجاتا ہے۔

موجودہ حالت میں نسل انسانی کے حالات کچھ اس قسم کے ہو گئے ہیں۔ کہ ان کے لئے بہت زیادہ خوش رہنا ناممکن ہے۔ ہاں جو لوگ ہمیشہ لگاتار خوش ہی رہا کرتے ہیں وہ ایسے لوگ ہوتے ہیں جن کے دل میں ولولے کم ہوتے ہیں اور چھوٹے چھوٹے کام یا معمولی کام کیا کرتے ہیں۔ بھلا وہ آدمی جس کا کام ہی یہ ہو کہ وہ بیٹریاں پکڑتا رہے یقیناً وہ ہمیشہ خوش نظر آئیگا۔ حبشی لوگ بھی حد سے زیادہ خوش رہتے ہیں۔ لیکن مسٹر کولج خوش نہیں ہے۔ برسوں پہلے جب وہ مانچسٹر میں رہا کرتا تھا۔ اس کی خواہش تھی کہ وہ ریاستہائے امریکہ کا پریذیڈنٹ ہو جائے۔ لیکن اب جبکہ وہ وہائٹ ہاؤس میں مقیم ہے۔ تو اس کی خوشی اسمیں ہے کہ کسی طرح وہ یہاں سے نکل جائے۔ کیونکہ اس کے عہدے کی ذمہ واریاں اس قدر زیادہ اور بڑی ہیں جنکی موجودگی میں کوئی شخص زیادہ دیر تک خوش نہیں رہ سکتا۔ میری زندگی کا سب سے زیادہ پُر مسرت وقت وہ تھا جب میری عمر ۱۲ سال کی تھی۔ میں کافی عمر کا تھا کہ جب میں دنیا میں خوش تھا لیکن اتنی عمر کا نہ تھا کہ دنیا کی تکالیف کو سمجھ سکتا۔ اب جب میں

کیا ایڈیسن خوش ہے؟

(از ہنری فورڈ)

مجھے کوئی ایسا انسان دکھاؤ جو اپنے کام میں بہت زیادہ دلچسپی لے رہا ہو اور جو تنخواہ کے لئے کام نہ کرتا ہو۔ تو پھر میں تمہیں ایک خوش اور مسرور آدمی دکھا دونگا۔

مسٹر ایڈیسن کا خیال ہے کہ دنیا میں کوئی بھی خوش نہیں۔ لیکن مجھے اس خیال سے کسیقدر اختلاف ہے۔ کیونکہ میں مسٹر ایڈیسن ہی کو بطور مثال کے مسرور آدمی کی حیثیت میں پیش کروں گا۔

میرا خیال ہے کہ کام کرنا اور اپنے کام سے دلچسپی لینا ہی وہ چیز ہے جو ایک انسان کے لئے کسی دوسری شے کے مقابلہ میں باعث مسرت ہو سکتی ہے۔

بڑے کام کرنے اور اُن کو انجام تک پہنچانے کا ولولہ ہی وہ چیز ہے جو انسانی زندگی کی بڑی مسرت ہے۔ بطور مثال مسٹر ایڈیسن کی طرف دیکھو کیونکہ میرے علم میں وہ اس بات کی بہترین مثال ہے۔ وہ اپنے کام میں مگن ہے اور خوش۔ وہ کام کرتے ہوئے دنیا و مافیہا کو بھول جاتا ہے باوجودیکہ اس نے اخبار والوں سے یہ کہا ہے کہ وہ کسی مسرور آدمی سے واقف نہیں پھر بھی وہ خوش ہے۔

تم ضرور دریافت کروگے کہ مسٹر ایڈیسن اس قدر خوش کیوں ہے۔ اور اس نے کس طرح یہ خوشی حاصل کی ہے۔ یہ سچ ہے کہ بچپن میں وہ بہت خوش تھا۔ بچپن میں اس نے بڑی خوشی سے وقت گذارا ہے۔ اور ان مسرتوں کی کہانیاں وہ خود بھی سنایا کرتا ہے۔ نوجوانی میں بھی یہ خوش تھا۔ جب یہ تار گھر میں کام کرتا تھا۔ جب یہ ایک اخبار کا ایڈیٹر تھا۔ اور بالآخر جب وہ ایک نوجوان موجد تھا خوش تھا۔ اور محض اس لئے کہ یہ ایک منزل پہ پہنچنے کے لئے کام کرتا تھا اور کام ہی اسکا ایک نصب العین تھا۔

کام کرنے کی اس کے دل میں ایک لگن تھی۔ ایک حرص تھی۔ اس

اپنے گذشتہ ۸۲ برس کے زمانے پر مڑ کر نگاہ ڈالتا ہوں۔ تو میں یہ دیکھ سکتا ہوں۔ کہ اس وقت خوش تھا۔ اور مجھے اسوقت دوسرے لوگوں سے زیادہ خوشی کا موقع حاصل تھا۔ لیکن اسی کے ساتھ مجھے بہت ناخوشی دیکھنی پڑی ہے

مجھے معلوم ہے کہ جب کبھی میں کبھی تکلیف سے دوچار ہوا ہوں۔ تو اس سے نجات پانے کا میرے لئے ایک ہی ذریعہ تھا وہ یہ کہ بہت محنت سے کام کروں۔ اور اس چیز کو بھلا دوں۔ جو مجھے تکلیف دے رہی ہے۔

میرے دماغ میں عجیب عجیب خواب سمائے ہوئے تھے۔ یہ رات کو دن بنا دینے کے خواب دیکھ رہا تھا۔ چنانچہ اس نے برقی روشنی کے ذریعہ اپنے خوابوں کو سچا کر دکھایا۔ اس کا ایک خواب یہ بھی تھا کہ یہ انسانی آواز کو ریکارڈ میں محفوظ کرے۔ وہ کام کرتا رہا۔ حتیٰ کہ اس کے خواب حقیقت میں تبدیل ہو گئے۔ ایڈیسن اپنے کام میں ہمیشہ خوش رہا ہے۔

پس جو آدمی اپنے کام سے محبت کرتا ہے وہ عموماً مسرور رہتا ہے۔

ڈاکٹر احمد اللہ خاں آئی۔ ایم۔ ڈی

ننھّی لڑکی

زلفیں یہ ناگنیں سی آنکھیں یہ کالی کالی — لب گل کی پتیاں ہیں صورت ہی بھولی بھالی
نازک بدن ہے اس کا یا نخل گل کی ڈالی — چہرے کا رنگ دیکھو۔ کہدو کہ پھول والی
رُخ پر جو آ رہی ہیں اُڑ کر لٹیں ہوا سے — سرکا رہی ہے ان کو کس ناز کس ادا سے
دلچسپ ہیں ادائیں لیکن یہ بے خبر خود — دلکش نظر ہے لیکن واقف نہیں نظر خود
ماتھا ہے خود شگفتہ لب پتلے پتلے تر خود — بالوں میں بن رہے ہیں گھونگر اِدھر اُدھر خود
کتنا دہن ہے پیارا۔ کتنا ہے تنگ دیکھو — آنکھوں میں لال ڈورے لائے ہیں رنگ دیکھو
اُلجھا ہوا پڑا ہے بالوں میں ایک بُندا — یہ محو کھیل میں ہے ہو کان کی خبر کیا
کاجل بہا ہوا ہے اس کو نہیں ہے پروا — باچھوں میں جم گیا ہے کچھ رنگ پیک کا سا
چوٹی میں بندھ گئے ہیں وہ بال جو بڑے ہیں — کچھ چھوٹے چھوٹے اُڑ کر ماتھے پہ آ پڑے ہیں
کیں بند دونوں آنکھیں گرد آئی جب ہوا سے — جھونکا جو آیا پھیرا چہرے کو کس ادا سے
بالوں پہ جمتی ہے گرد۔ اڑ اڑ کے جابجا سے — ذرّے چمک رہے ہیں سر پہ ذرا ذرا سے
کُرتا کریب کا ہے۔ جھاڑی میں اڑ کے اٹکا — دامن پھٹا الجھ کر کھینچا جو دے کے جھٹکا
کُرتے کو دیکھ کر یہ پہلے تو مسکرائی — پھر کچھ جو دھیان آیا حیرت سی رُخ پہ چھائی
پوچھیگی ماں کہاں سے کُرتے کو پھاڑ لائی — یہ ڈر نہیں تو چھوٹی چہرے پہ کیوں ہوائی
کُرتے کو دیکھتی ہے جھاڑی کو دیکھتی ہے — ماں سے یہ کیا کہے گی بس سوچ اسے یہی ہے

شوق قدوائی

اُردو اور اُس کی وسعت

یہ مضمون آج سے پچیس سال پیشتر مولانا محمود علی صاحب پروفیسر رندھیر کالج کپور تھلہ نے تحریر فرمایا تھا۔ اس وقت اردو خصوصاً پنجاب میں اس راستے کی کئی منزلیں طے کر چکی ہے جو اردو کے قافلے کے لئے مولانا موصوف نے تجویز فرمایا تھا۔ لیکن اردو کی موجودہ روش کو دیکھ کر جس پر سنجیدہ اور متین مضامین کی نسبت "ٹیگوریت" اور "ادب لطیف" کھیں کہیں زیادہ غالب ہے اس امر کی ضرورت محسوس ہوتی ہے کہ اس آواز کو اُردو کے ایوان میں پھر بلند کیا جائے کسی زبان کا "ادب لطیف" اس کے لٹریچر کے ارتقاء کی آخری منزل پر وجود میں آتا ہے لیکن بدقسمتی سے چند خارجی اثرات کی بناء پر خیالات کا یہ انتشار اور پریشانی اردو میں ابھی سے رونما ہو گئی ہے اور یہ روش اُردو کیلئے اس قدر خطرناک ثابت ہوئی ہے کہ نوجوان ادیبوں کا اکثر حصہ سنجیدہ اور متین علمی مضامین پر قلم اُٹھانے کی بجائے "قلبی اثرات" کی اسی نام نہاد ترجمانی میں غرق رہا۔ اگر علمی مضامین سے یہی بے پروائی برتی گئی اور ادب لطیف کی طوفانی موج کا یہی عالم رہا تو سو سال کے بعد بھی ہنوز روز اول کا نقشہ نظر آئیگا ضرورت ہے کہ نوجوان اس مضمون کو غور سے پڑھیں اور اردو کے مستقل سرمایہ کی کچھ فکر کریں　　(ایڈیٹر)

مروّجہ یا معلوم زبانوں میں غالباً اُردو ایک ایسی زبان ہے جس کا سن ولادت نہیں تو زمانہ ولادت سب جانتے ہیں۔ اور زبانوں میں سے کسی کی ہسٹری معلوم بھی ہو تو وہ بھی اُس کے آغاز کی کیفیت ضرور ہوش و حواس کی گرفت سے باہر ہے اُردو کو قدیم زبانوں سے اس بارے میں بھی تفاوت ہے کہ اُس کی ولادت شہر میں ہوئی ہے۔ ورنہ قدیم زبانیں بالعموم ایسے وقت میں پیدا ہوئی ہونگی۔ جبکہ اُن کے موجدوں کو شہریت اور مجتمعہ آبادی کا ڈھنگ بھی نہ آیا ہوگا۔ کم از کم سنسکرت بولنے والوں کا ہندوستان میں اُس وقت آنے کا پتہ ملتا ہے جبکہ وہ دہقانی اور صحرا دانہ زندگی بسر کرتے تھے اور ظاہر ہے کہ ایسے لوگوں کی زندگی جنگلوں یا چھوٹی چھوٹی بستیوں میں گذرتی ہوگی اور اس سے بڑھ کر عربی کی نسبت معلوم ہے کہ وہ بدوؤں اور خانہ بدوشوں کی زبان ہے۔ اور اب جبکہ عربی نے شہروں اور ملکوں پر تصرف کر لیا ہے اب تک بھی فصیح زبان بدویوں کی سمجھی جاتی ہے۔ اور شہروں کی زبان خواہ اُسی ملک عرب کے شہر ہوں فصاحت میں کمتر مانی جاتی ہے۔ یہی حال اُردو زبان کا بھی ہوگا جنگل اور ویرانوں میں پیدا ہو کر پہلے زبان میں وہی الفاظ ایجاد ہوتے ہوں گے جن کی صحرائی سادہ زندگی میں ضرورت ہے۔ اور ظاہر ہے کہ اس حال میں زبان کے اندر بہت ہی مختصر سرمایہ اور بہت ہی کم الفاظ ہوں گے۔ کیونکہ اس وقت سادہ سادہ آلات کشاورزی اور بہت تھوڑی قسموں کے اسلحہ بہ لحاظ دفعت یا شکار کیلئے درکار ہوتے ہوں گے اور محض سادہ اجناس یا آلات کا لین دین کرنے کو زبان کی ضرورت پیش آتی ہو گی۔ لیکن پھر عقل و شعور اور تہذیب و تمدن میں ترقی کرنے پر اور صحرائی سکونت کو سوسائٹی اور شہریت میں بدلنے پر نئی چیزیں نئے سامان اور نئے کاروبار پیدا ہوتے ہوں گے اور زبان کو ترقی پانے کا موقع ملتا ہوگا۔ اور آیندہ کے لئے وہ قوم جس قدر تہذیب و تمدن میں ترقی کرتی جاتی ہوگی اور نئے معاملات پیش آتے جاتے ہوں گے۔

اُسی قدر الفاظ کا ذخیرہ بڑھتا جاتا ہوگا۔ اور حسب الضرورت مقالے کنائے ضرب الامثال اور اشعار پیدا ہوتے رہتے ہوں گے۔ حتیٰ کہ ایک وقت پر وہ قوم علوم و فنون کو اپنی زبان میں لانے کا شوق کرتی ہو گی۔ اور اس طرح سے زبان میں علمی اور اصطلاحی الفاظ اور عالمانہ خیالات کو ادا کرنے کے قابل محاورات داخل ہونیکے بعد اُس زبان کو وسیع اور مہذب اور مکمل زبان ہونیکا فخر حاصل ہوتا ہوگا۔ اور اگرچہ دنیا میں تکمیل کسی چیز کو حاصل نہیں اور ترقی کا رستہ ہر کمال کے لئے کھلا ہے اور اس لئے کسی قوم اور کسی زمانے کے علوم و فنون اور اُن کے ساتھ اُس وقت کی زبان بھی کسی حد پر جا کر ٹھیر نہیں سکتی۔ بلکہ اگر قوم میں جذبۂ ترقی موجود ہے۔ تو ان کے علوم و فنون اور ان کی زبان غیر متناہی ترقی کے قابل ہے اور کسی حالت میں مکمل نہیں کہلا سکتی۔ تاہم جب کسی زبان میں ابتدائی ذرائع زیست یعنی کاشتکاری اور گلہ بانی کے متعلق اور اعلیٰ مدارج زندگی یعنی شہریت اور اُس کے مختلف کاروبار اور تکلفات کے متعلق اور روحانی ضروریات یعنی علوم و فنون کے متعلق الفاظ کا کافی ذخیرہ موجود ہو۔ اُس کو وسیع اور بدیں وجہ کامل کہہ سکتے ہیں کہ موجودہ ضرورتوں کو پورا کرنے کے علاوہ اس سے آیندہ مدارج ترقی میں ساتھ دینے اور متوقعہ ضرورتوں کو پورا کرنے کی اُمید ہے۔

غرض زبان کے وسیع اور مکمل ہونے کی صورت میرے خیال میں

یہی سبب ہے کہ اس میں دیہقانی اور شہری اور علمی ضرورتوں کیلئے الفاظ کا ذخیرہ موجود ہو۔ اس قاعدے کو پیش نظر رکھ کر جب اُردو کو دیکھیں تو اس میں ابتدا سے شہری ضروریات اور شہری تکلفات کا سامان کثرت سے موجود پاتے ہیں اور اس سے پہلے درجے کا سامان یعنی دیہاتی ضرورتوں کے الفاظ اور زراعت کے متعلق مختلف اصطلاحیں اگرچہ حقیقت میں اُردو کی ملکیت نہیں ہیں کیونکہ وہ شہر میں پیدا ہی ہے تاہم چونکہ شہروں اور گاؤں کا باہم تعلق ہے۔ اس لئے ضرورت ہو تو وہ الفاظ اُردو میں بخوبی استعمال ہو سکتے ہیں اور آگے کا سلسلہ یعنی علمی اور اصطلاحی الفاظ ان کی جانب ابھی توجہ نہیں ہوئی اور جیسا کہ واویلا کیا جا رہا ہے اور ضرورت محسوس ہوتی ہے اگر کبھی اس طرف توجہ ہوئی تو جس طرح علمی الفاظ اور زبانوں میں ایجاد ہوا کرتے ہیں۔ اُردو میں بھی ممکن ہیں۔ یعنی اُردو زبان میں کچھ تو خود اپنے مصادر اور مادوں سے نئی شکلیں ایجاد کی جاتی ہیں اور کچھ علمی سبقوں کیساتھ غیر زبانوں کے الفاظ سیکھے جاتے ہیں اور اپنی زبان میں برتنے لگتے ہیں۔ اور ہم دیکھتے ہیں کہ اپنے مصادر سے اُسی قدر الفاظ نکل سکتے ہیں جس قدر مصادر پہلے وضع ہو چکے ہوں اور دوسری زبان میں کم ہیں کسی میں زیادہ اور غیر زبان سے لفظ لیتے وقت اکثر زبانیں بہت تامل کرتی ہیں اور اس تامل کی علامت یہ ہے کہ لفظ کو اُس کی اپنی شکل اور تلفظ پر رہنے نہیں دیا جاتا۔ بلکہ خود اپنی شکل اور اپنے تلفظ کا کچھ نہ کچھ سایہ ڈال کر اور معرّب یا مفرّس وغیرہ بناکر استعمال کیا جاتا ہے اس کے برخلاف اُردو کا یہ حال ہے کہ اس کا اپنے مصادر کا سرمایہ ایک لحاظ سے کچھ بھی نہیں۔ کیونکہ وہ بنی ہی بن بن کی لکڑی جمع کرنے سے ہے۔ اور ایک لحاظ سے جس قدر اندرونی سرمایہ اس کے پاس ہے اور کسی زبان میں کاہے کو ہوگا۔ کیونکہ عربی فارسی اور سنسکرت یہ تین وسیع اور علمی زبانیں اس کی امہات میں داخل ہیں اور یہ ان میں سے کسی کا لفظ لے لے تو شیر مادر کی طرح اجنبی نہیں معلوم ہوتا اور اس طرح جس قدر ذخیرے پر اس کو تصرف ہے وہ اور زبان کو کہاں نصیب۔ اور پھر ان تینوں کے علاوہ اور زبانوں کے الفاظ جو علوم یا دیگر کاروبار کے ساتھ آئیں اُردو کو اور زبانوں کی طرح اُن سے کوئی تعصب نہیں۔ چنانچہ اجنبی الفاظ کی جہاں عربی اور فارسی وغیرہ میں ایسی گت بنتی ہے کہ پہچانے نہیں جاتے مثلاً لاندرہ (لنڈن) اطریش (آسٹریا) دکتور (ڈاکٹر) ستیہ (سٹی)، وہاں اُردو میں ان کو سر آنکھوں پر جگہ دی جاتی اور میلا ہاتھ نہیں لگنے پاتا۔ اور اسی طرح امن وامان سے رکھے ہوتے ہیں گویا اپنے گھر میں ہیں یعنی وہی تلفظ ہے اور وہی لہجہ۔ اور اسکی وجہ یہ ہے کہ ایک تو اہلِ ہند ملکوں کے لب و لہجہ کی نقل کرنے میں جو کمال رکھتے ہیں دنیا کی کسی قوم میں نہیں۔ انگریز ہندوستان میں عمریں بسر کرتے ہیں۔ کابلی ایرانی اور عربی اکثر آتے رہتے ہیں۔ مگر ایک لفظ یہاں کے خاص لب ولہجہ کا ادا نہیں کرسکتے۔ اور ہندوستانی سب نہیں تو اکثر اور سب کچھ نہیں تو بہت کچھ اجنبی زبان کو اس قدرت سے ادا کرتے ہیں۔ کہ اہلِ زبان کا دھوکا ہوتا ہے اور دوسرے جہاں اور زبانوں میں غیر زبانوں کی بعض آوازوں کیلئے حروف نہیں ہیں وہاں اُردو میں اکثر مروجہ زبانوں کی قریباً تمام آوازوں کیلئے حروف موجود ہیں اور اسلئے غیر زبانوں کا لفظ آتا ہے تو اسی کی مناسب حال حروف میں لکھا جا کر صحیح بولا جا سکتا ہے۔

اُردو کے ان اوصاف کو دیکھ کر یقین ہوتا ہے کہ اس میں ترقی کرنے اور تمام کاروباری اور علمی خیالات کو ادا کرنے کی قابلیت اور زبانوں سے زیادہ ہے اور چند ایک زبانوں کے مادی سرمائے پر قابض ہونے اور دیگر زبانوں کے الفاظ کو آسانی کے ساتھ لے لینے کی وجہ سے اس کی دولت لازوال ہے اور ہم لوگ جو افسوس اور حسرت اپنی زبان کے عدم وسعت کے متعلق ظاہر کیا کرتے ہیں اس کا باعث خود ہماری کوتاہی اور غفلت ہے ورنہ کوشش کرنے سے ہم ترقی کے تمام مدارج طے کر سکتے ہیں۔ اور ضرورت ہے تو اسی قدر کہ ہم لوگ علوم کی طرف توجہ کریں اور ان کو اپنی زبان میں لانے کی ٹھان لیں۔ پہلے جو کام کیا جائے مشکل ہوتا ہے۔ مگر عزم صادق کے بعد دیکھیں گے۔ کہ الفاظ کی وجہ سے کسی دقت کا اندیشہ نہیں۔ میں نے ابھی تک اُردو کا صرف ایک پہلو دیکھا ہے اور ایک امر میں غور کرنا باقی ہے۔ اور وہی ایک وقت ہے جو میرے خیال میں اُردو کی ترقی کو مانع ہے اور کوشش کرنے والوں کا حوصلہ پست کر دیتی ہے اور وہ یہ ہے کہ زبان کا سرمایہ۔ بے شک الفاظ ہوتے ہیں مگر صرف الفاظ ہی پر زبان کا مدار نہیں بلکہ الفاظ کو ترکیب دینا اور کسی کو آگے اور کسی کو پیچھے رکھ کر کلام کو موزوں کرنا جس کو محاورہ کہتے ہیں۔ یہ بھی ایک کام ہے اور اُردو کی کیفیت ہے کہ وہ ایک خاص شہر میں پیدا ہوئی ہے۔ اور اُس شہر میں الفاظ کو ترکیب دینے کا جو دستور یعنی محاورہ تھا اس کو اُردو کا جزو لاینفک قرار دے لیا گیا ہے۔ البتہ واقعات نے کچھ مدد کی کہ اُردو کے مولد یعنی دلّی پر آفت آئی اور اہلِ سخن کی تو تیتر بتر ہوئی اور اُدھر لکھنؤ والوں نے قدر افزائی کے دریا بہا دیئے سب باکمال سمٹ کر وہاں جمع ہو گئے۔ اور پھر یہ بھی قانون قدرت تھا کہ دو شہروں کا لب ولہجہ اور محاورہ ایک ہو۔ چنانچہ تخم دلی کا تھا۔ مگر لکھنؤ کی سرزمین میں پرورش پاکر رنگ روپ میں کچھ نہ کچھ فرق آگیا اور یوں اُردو کو ایک شہر کی بجائے دو شہروں کے محاورے مل گئے۔ اگرچہ میر تقی اُس وقت بھی جامع مسجد کی سیڑھیوں اور گدڑی کے بازار ہی کو اُردو کی صحت کا مدار کہتے رہے اور زبان بگڑنے کے ڈر سے راہ چلتے باہر والوں سے بات کرنی گوارا نہ کی۔ مگر زمانے کا ہاتھ زبردست تھا۔ اُن کی بات کون سنتا۔ دلّی کے ساتھ لکھنؤ

برابر کا حق دار قرار پا گیا اور حسین آباد کے مرثیوں نے لال قلعے کی غزلوں جیسا سند بننے کا استحقاق حاصل کیا۔ اور اس طرح دتی کی بربادی اور اہلِ سخن کی جلاوطنی کا یہ خوشگوار نتیجہ بے شک برآمد ہوا کہ جہاں پہلے دتی کے محاوروں کے خلاف بولنا غلط سمجھا جاتا تھا۔ وہاں یہ عذر پیدا ہو گیا۔ کہ دتی نہیں تو لکھنؤ والے ایسا کہتے ہیں اور محاورے میں ذرا وسعت آ گئی۔ مگر پھر بھی زبان کے لئے دو شہروں کی کیا حقیقت ہے؟ وہ چاہے کیسے ہی بڑے شہر ہوں اور کیسے ہی بڑے بڑے کاروبار کے متعلق بول چال کا اتفاق ہوتا ہو۔ تاہم وہ محاورے محدود ہیں اور زبان کو وسیع اور علمی زبان بننے کیلئے جس طرح پر دو شہروں میں استعمال ہونیوالے الفاظ کافی نہیں ہیں۔ اور آئندہ اور الفاظ ایجاد کرنے کی ضرورت ہے۔ اسی طرح الفاظ کے برابر نہ سہی الفاظ سے کم مگر پھر بھی بہت بڑی مقدار مختلف طرزِ ادا اور محاورات کی درکار رہے۔ اور الفاظ کی طرح اس غرض کو بھی دو شہر پورا نہیں کر سکتے۔ اور بدقسمتی یہ کہ لکھنؤ کے بعد کہیں اور اہلِ سخن کا وہ جمگھٹا نہ ہوا۔ اور جدید محاورات نے زبان میں دخل نہ پایا اور مان لیا گیا کہ اردو وہ ہے جو دلی اور لکھنؤ کے محاورے کے مطابق ہو۔ اور اس نئے اور شہروں کا کوئی کیسا ہی قادر الکلام سخن ور ہو اس کے کلام میں ذرا کوئی محاورہ دونوں شہروں کے خلاف آیا۔ اُسے غلط اور کہنے والے کو اُردو سے ناواقف قرار دیا گیا اور یہ دتی اور لکھنؤ کا رعب ایسا بیٹھا کہ اب اکثر اہلِ علم جو علوم و فنون کے ذخیرے اردو میں جمع کر سکتے ہیں۔ ترجمہ کرتے ہوئے یا کتاب لکھتے ہوئے جھجکتے ہیں کہ ہم دتی یا لکھنؤ کے محاوروں پر قدرت نہیں رکھتے مبادا غلط اُردو لکھ کر زبان والوں کی ملامت کا نشانہ بنیں اور واقع میں جو شخص اپنے شوق سے مجبور ہو کر کوئی تصنیف کر بیٹھتا ہے۔ تو زبان کے ٹھیکہ دار "پنجابی اُردو" یا "دکنی اُردو" کہکر اُسے پتے نہیں باندھتے حالانکہ یہ نہایت دشوار ہے کہ کوئی شخص گاؤں میں پیدا ہوا اور شہر میں اُس سے بولنے کے وقت دلی کی تقلید میں ذرہ بھر لغزش نہ ہو۔ کیونکہ جس طرح ہر شہر کے عادات۔ اخلاق اور رسم و رواج میں اختلاف ہوتا ہے اور ممکن نہیں کہ دو شہر ہر بات میں یکساں ہوں اسی طرح الفاظ کو ترکیب دینے اور اسماء و افعال کے ساتھ حروف کو ملانے میں ہر شہر کا انداز جُدا ہوتا ہے اور ناممکن ہے کہ اہلِ شہر اپنے شہر کے طرزِ ادا کا اشتہار نہ ہونے دیں۔

غرض زبان ہو تمام ملک کی اور اُس کی صحت کا اجارہ صرف دو شہروں کو دیا جائے۔ اُردو کا یہ ایک ایسا خاصہ بلکہ نقص ہے جو اور کسی زبان میں نہیں اور یہ پیدا ہوا اسی سے کہ دتی اور لکھنؤ جیسے دار الخلافے اُردو کے مالک قرار پائے۔ اور اُنہوں نے اپنی طراری کے آگے کسی کو بات کرنے کے قابل نہ سمجھا۔ ورنہ ہم دیکھتے ہیں کہ عربی جنگل میں پیدا ہوئی اور جب شہر بسے اور شہر والوں نے اُس میں تراش خراش کی تو جنگل والوں کی مجال نہ تھی جو اُن کے منہ آتے۔ وہ جس طرح شہر والوں کے رسم و رواج اور تکلفات سے مرعوب ہو جاتے ہیں۔ اسی طرح اُن کے طرزِ کلام پر بھی نہ بول سکے۔ اور ادھر شہر والوں کی چونکہ اپنے گھر کی جائداد نہ تھی اُن کو بھی اُس کے متعلق تعصب نہ ہوا۔ اور ایک شہر سے دوسرے شہر میں جا کر جو تغیر ہوتا گیا اُسے زبان کی معمولی رفتار جانا گیا۔ اور ایک کو دوسرے کی زبان کو غلط کہنے کی جرأت نہ ہوئی۔ اور کہیں سے کوئی لطیف استعارہ کہیں سے کوئی باریک کنایہ زبان میں داخل ہوتا ہوا اس کو وسعت دیتا گیا۔ حتیٰ کہ زبان ایک ملک سے نکل کر دوسرے ملکوں میں پہنچی اور وہاں کا اثر قبول کرنیکے بعد بھی صحیح زبان سمجھی جاتی رہی۔ اور گو کوفیوں اور بصریوں کے مباحثے ہوتے رہے اور عرب و مصر کی نوک جھونک جاری رہی مگر کسی نے اپنی زبان کو ترجیح دی تو اسی قدر کہ اس کو فصیح کہا اور دوسری کو غیر فصیح۔ لیکن ایک کو صحیح اور دوسری کو غلط نہیں مانا گیا۔ اور اگرچہ مصر کی زبان عرب کے استعمال اور اس کے قواعد صرف و نحو و معانی و بیان کو معیار گردان کر دیکھی جائے تو غلط ہے لیکن وہاں کوئی دلی و لکھنؤ ہوتا اور مصر کی زبان پر غلط اور خلاف محاورہ ہونے کا فتویٰ صادر کیا جاتا تو آج جس قدر جدید علوم و فنون کا ذخیرہ اور جدید خیالات ادا کرنے کی قابلیت عربی زبان کو مصر والوں کی بدولت حاصل ہوئی ہے بالکل نہ ہوتی۔ یہی حال دیگر زبانوں کا ہے میں انگریزی کی نسبت کوئی رائے دینے کے قابل نہیں مگر اس قدر یقین ہے کہ انگریزی صرف لندن کی زبان نہیں۔ اور ضرور انگلینڈ کے شہروں اور بستیوں میں باہم محاوروں کا تفاوت ہوگا۔ مگر سب کی انگریزی انگریزی ہے۔ اور انگلینڈ سے باہر امریکہ کے انگریزی محاورے یقیناً مختلف ہیں مگر امریکن انگلش کو غلط کہنے کی مجال کسی کو نہیں اور یہی بے تعصبی ہے جس سے اس زبان کو روز افزوں ترقی حاصل ہے۔ اور اسی طرح ویدوں کی سنسکرت جو وسط ایشیا سے آئی تھی اور کالیداس کی سنسکرت جو ہندوستان میں پیدا ہوئی باہم مختلف ہیں۔ لیکن دونوں سنسکرت ہیں۔

شیراز کی فارسی بے شک فصیح ہے۔ مگر ہرات کی فارسی بھی فارسی ہی ہے اور سعدی کی تعریف کرتے ہوئے جامی پر خندہ زن ہونیکا مجاز کوئی نہیں اور یہاں لاہور والوں کی غزل دیکھ کر اور ذرا اپنی بول چال سے خلاف پا کر دلی والوں کے پیٹ میں بل پڑ پڑ جاتے ہیں اور لکھنؤ والے اصلاح اُردو کی انجمن بنا کر ملک کے مروّجہ محاوروں کو غلط بتلانے اور ان کو اپنے محاورے کے مطابق صحیح کرنے کی کوشش میں مصروف ہیں اور لکھنے والوں کے حوصلے پست کئے جاتے ہیں۔

غرض میرے خیال میں اُردو کا یہ بہت بڑا نقص ہے کہ دلی اور لکھنؤ کے

محاوروں کے خلاف لکھنا غلط سمجھا جاتا ہے اور باہر والوں کو لفظ لفظ پر خیال رکھنا پڑتا ہے کہ کوئی بات ان دونوں شہروں کے خلاف طبع نہ نکل جائے ورنہ ہماری تحریر اُردو نہ رہے گی۔ اور اس طرح پر جو قابلیت مختلف طبیعتوں میں مضمون کو مختلف اسلوبوں سے ظاہر کرنے کی ہوتی ہے اور زبان کو وسعت دیتی ہے۔ اردو اس کے فائدے سے محروم رہی جاتی ہے لیکن یہ نقص اگرچہ بڑا ہے مگر اُردو کی فطرت میں داخل نہیں بلکہ اہلِ زبان کی تنگ خیالی سے پیدا ہوا ہے دلی والے "پھول جیسا چہرہ" کہتے تھے۔ لکھنؤ والے "پھول کا ایسا چہرہ" کہنے لگے۔ دلی والوں کے ماتھے پر بل آیا۔ مگر زبردست کا ٹھینگا سر پر مجبوراً ماننا پڑا کہ اچھا یہ بھی ایک محاورہ ہے۔ اور ایک مضمون کے لئے دو اسلوب پیدا ہو گئے۔ اسی طرح اگر کسی شہر کے لوگ "پھول کا" لکھنؤ سے اور "جیسا" دلی سے لیکر "پھول کا جیسا چہرہ" کہنے لگیں اور یہ محاورہ بھی شہرت پا جائے تو دلی والوں کا کیا حرج ہے اور جب لکھنؤ کا رواج قبولیت کا خلعت پہن سکتا ہے تو "جدت آباد" دو کی جگہ تین اسلوب پیدا کرنے پر کیوں قابل ملامت ہو اور اس کے لئے معیار میرے خیال میں یہ ہونا چاہیے کہ جو نیا محاورہ کوئی ایک شخص استعمال کرے اور کوئی اور اُس کا ساتھ نہ دیتا ہو اُسے غلط سمجھا جائے لیکن جب کوئی اُسلوب ایک جماعت میں رائج ہو تو دلی کا محاورہ نہ کہو مگر اُردو کا ایک محاورہ ضرور سمجھو اور ہنسی میں نہ اُڑاؤ۔ اور اس اُصول کے مطابق اگر خود دلی کا قادر الکلام اقرار کو قرار یا غمز کو شمر باندھے تو اکیلا ہونے کے سبب غلط سمجھو۔ اور اگر پنجاب والے "مجھے جانا ہے" کی جگہ "میں نے جانا ہے" استعمال کریں تو کثرت استعمال کی وجہ سے "غلط العام فصیح" کی دفعہ عائد کرو اور جواز کا فتویٰ دو۔ کیوں کہ زبان میں وسعت اور تمام ملک کو اُردو بولنے کی جرأت پیدا ہو گی تو اسی طرح۔

اور میں تو اس قاعدہ کو یہاں تک وسیع دیکھنا چاہتا ہوں کہ انگریز جو بولتے ہیں "ڈیل بیرا ہمارا گاڑی لاؤ۔ باوا لوگ سیر کو جانا مانگتا ہے۔ پیچر ٹوٹ جائے گا۔ میم صاحب ان کے ساتھ جانا سکتا ہے" چونکہ یہ طرز بھی ایک جماعت کثیر کی زبان ہے اور یورپ والے جس قدر اُردو بولتے ہیں عموماً انہی محاوروں کو استعمال کرتے ہیں اور نہ صرف وہ بلکہ ہندوستانی جنٹلمین جو انگریزی طرز پسند کرتے ہیں وہ بھی اکثر اپنے نوکروں۔ ماتحتوں اور ایسے لوگوں کے ساتھ جن سے انگریزی بولنی نہ چاہیں اسی کھڑی بولی میں بات کرتے ہیں تو میرے نزدیک اس کو بھی اُردو کا ایک محاورہ قرار دینا چاہیے۔ بیشک یہ دلی کی اُردو نہیں اور مانا کہ فصیح اُردو بھی نہیں۔ مگر انگریزی فارسی بھی نہیں۔ اُردو ہے۔ کیونکہ الفاظ تمام اُردو ہیں۔ البتہ اُن کے استعمال کرنیکا ڈھنگ اور ہے اور مطلب سمجھ میں آ سکتا ہے۔ تو پھر اس کو اُردو کا ایک نیا مگر صحیح اسلوب کیوں نہ کہا جائے۔

دلی والے مصدر کو مذکر۔ مؤنث، واحد۔ جمع کر لیتے ہیں اور "شعر کہنا" "بات کرنی" "قصیدے لکھنے" بولتے ہیں۔ لکھنؤ والے اس تغیر کو ناپسند کرتے ہیں اور "مجھے کھانا کھانا پڑا" "دوا پینا پڑی" "آم کھانا پڑے" ہر جگہ الف برقرار رکھتے ہیں۔ اور ان کا یہ کہنا مان کیا گیا۔ اسی طرح انگریزوں سے "" جانا سکتا ہے کہکر مصدر کو برقرار رکھنے کی رسم نکالی تو کیا بُرا کیا۔

بے شک اہل دہلی و لکھنؤ دونوں موجد باب فصاحت ہیں اور کوئی اردو کو کیا سمجھے گا۔ جیسا وہ سمجھتے ہیں۔ مگر جب وہ کسی اور شہر اور کسی اور جماعت کے کلام کا مطلب ایسا ہی آسانی سے سمجھ سکیں۔ جیسا اپنے شہر کی زبان کا سمجھتے ہیں اور الفاظ بھی بیشتر اُردو کے ہوں اور کلام سے اسی قدر غرض ہے کہ مضمون سمجھ میں آ جائے تو اسلوب مختلف ہونے کی وجہ سے اس کو غلط اور قابل تضحیک اُردو کیوں کہا جائے۔

کچھ عرصہ ہوا مخزن میں مولانا آزاد کے مکتوبات شائع ہوئے تھے۔ حسرت موہانی اپنے پرچے میں اُن کا ذکر کرتے ہوئے ایک جملے پر اُلجھے ہیں۔ وہ جملہ کچھ ایسا تھا "لاہور کے ساتھ میرا نکاح تھوڑی پڑھا ہوا ہے" موہانی صاحب فرماتے ہیں کہ یہ غلط ہے اور غالباً پنجاب میں رہنے کے باعث آزاد کی زبان سے ایسی غلطی ہو گئی۔ یہ ایک مثال ہے اُس نکتہ چینی اور کوہ کندن و کاہ برآوردن کی جو اہلِ دلی و لکھنؤ باہر کے محاوروں کو زبان سے علیحدہ رکھنے کے لئے کرتے رہتے ہیں۔ ورنہ اگر آزاد کا یہ جملہ لکھنؤ یا دلی والوں کے محاورے کے خلاف ہے اور لاہور والے یوں بولتے ہیں تو میرے نزدیک آزاد نے اُسے بول کر زبان میں ایک اسلوب کا اضافہ کیا ہے۔ یا اسے قبولیت کا خلعت بخشا ہے۔ اور ایسا ہی ہونا چاہیے۔ بلکہ کرنا پڑیگا۔ اور اگر اُردو تمام ملک کی زبان بنے گی۔ اور اگر اُردو میں وسعت پیدا ہو گی تو اسی طرح کہ یہ صرف دو شہروں میں قید نہ رہے۔ بلکہ ہندوستان کے تمام شہروں کو اس کا حقدار مانا جائے اور ان سب کے محاوروں کو بلکہ بعض بعض الفاظ کو بھی جو پنجابی یا دکنی وغیرہ زبانوں سے کثرت استعمال کے ساتھ اس میں داخل ہو جائیں اُردو کا اپنا سرمایہ اور اس کو وسعت اور ترقی دینے کا ذریعہ مانا جائے اور جیسے کسی شعر کو دلی والوں کے سامنے صحیح ثابت کرنے کے لئے یہ دلیل کافی ہوتی ہے۔ کہ لکھنؤ کا شاعر یوں کہتا ہے۔ اسی طرح کوئی جملہ لاہور والوں کے محاورے پر اور کوئی فقرہ حیدر آباد والوں کی طرز پر ہونے کے سبب صحیح اور با محاورہ سمجھ کر "ایسا" اور "جیسا" اور "میں" اور "سے" کے اختلاف سے باہم دگر تنقید و تغلیط کرنے سے اجتناب کیا جائے۔ فقط۔

محمود علی رندھیر کالج کپورتھلہ

دیہات کی رات

چپکے چپکے گیت خاموشی کے گاتی ہے فضا
دیکھ کر تاروں کی جانب مسکراتی ہے فضا

اوڑھ کر اپنے تنِ نازک پہ چادر چاندنی
بامِ گردوں سے اترتی ہے زمیں پر چاندنی

مسجد و محراب سے شورِ اذاں اٹھتا نہیں
سرد اور خاموش چولھوں سے دھواں اٹھتا نہیں

لیٹ جاتی ہیں گھروں میں بیبیاں آرام سے
آدمی بے فکر ہو جاتے ہیں اپنے کام سے

ساگ لے لے کر گھروں میں پھرنے والی عورتیں
شوخ اور منہ پھٹ مگر شب رنگ کالی عورتیں

سارا دن چکی پہ محنت کرنے والی لڑکیاں
کم سے کم اجرت پہ پانی بھرنے والی لڑکیاں

بھاری بھرکم اور ضدی گاؤں کے سادہ رئیس
پہلوانوں، مجلسوں، کتوں کے دلدادہ رئیس

مسجدوں کی کہنہ دیواروں کے رکھوالے امام
آئے دن پردیسیوں سے بھڑنے والے امام

خانقاہوں کے مجاور اور بھک منگے فقیر
ادھ موئے گستاخ، سر اور پاؤں سے ننگے فقیر

موسمی گیتوں سے واقف خوش گلو میراسنیں
ہر کسی سے لڑنے والی تند خو میراسنیں

ڈوم جن کی مبتذل باتوں پہ سر دھنتے ہیں سب
اپنا اپنا من گھڑت شجرہ نسب سنتے ہیں سب

وہ مدرس جن کے دم سے مدرسہ آباد ہے
جن کو سعدیؒ کی گلستاں کچھ زبانی یاد ہے

رفتہ رفتہ نیند سے مدہوش ہو جاتے ہیں سب
اور اس پُر کیفیت وادی میں کھو جاتے ہیں سب

آدمی اعمال سے دوچار ہوتے ہیں جہاں
خواب روحوں کے لئے تیار ہوتے ہیں جہاں

(فاخرہ ہریانوی بی۔اے)

شہنشاہِ اشوک

سکندر اعظم کے جرنیل سلیوکس سے چندر گپت نے ہندوستان کے چند صوبجات چھین لئے تھے۔ چندر گپت خاندان موریہ کا بانی تھا۔ اُس کے بعد اُس کا بیٹا بندوسار جانشین ہوا۔ اشوک بندوسار کا بیٹا تھا۔ اپنے باپ کے عہد میں اشوک کشمیر وغیرہ ممالک کا وائسرائے تھا۔ بیان کیا جاتا ہے کہ سرینگر اُسی نے بنایا تھا۔ جب اشوک تخت پر بیٹھا تو اُس وقت وہ ہندو دھرم رکھتا تھا۔ اُس نے کلنگا قوم پر دھاوا کرکے انہیں مغلوب کیا۔ جب میدان جنگ میں اُس نے لاشیں دیکھیں تو کانپ اُٹھا۔ اُس کے دل پہ سخت صدمہ ہوا۔ یہ جنگ اُس کے نویں سال جلوس میں ہوئی تھی۔ تیرھویں سن جلوس میں اُس نے قسم اُٹھائی کہ جنگ سے ملک فتح نہیں کریگا۔ بلکہ دھرم کے پرچار سے دلوں کو تسخیر کرے گا۔ چنانچہ اُس نے ایسا ہی کیا۔ اُس کی سلطنت کی حدود صحیح تو معلوم نہیں لیکن پتہ چلتا ہے کہ ہندوکش سے شروع کرکے افغانستان بلوچستان۔ ہمالیہ تک شمالی ہند سے جنوبی ہند نظام حیدرآباد کی انتہائی جنوبی حد تک۔ سندھ۔ کشمیر۔ نیپال بھی اُس میں شامل تھے۔ سوات کی وادی بھی شامل تھی۔ گویا اُس کی سلطنت کا رقبہ برٹش امپائر سے اگر برما خارج کردیں تو زیادہ تھا۔

اُس کے کتبوں سے ثابت ہوتا ہے کہ اُس نے ہندوستان کی ہر سمت میں بودھی بھکشو بھیجے اور بدھ دھرم کا پرچار کیا بلکہ یونان اور مصر وغیرہ ملکوں تک اُس نے ایلچی روانہ کئے جس کی تفصیل اُس کے کتبوں میں پتھر پر کھدی ہے۔ بہت عرصے تک اُس کے کتبے پڑھے نہیں جاتے تھے آخر اُس کی ابجد دریافت ہوگئی بعض کی عبارت دائیں سے بائیں چلتی ہے اور بعض کی بائیں سے دائیں۔ جس سے پایا جاتا ہے کہ برمی اور خوراشتری حروف میں مضمون کندہ کئے گئے ہیں۔

اسی شہنشاہ کے عہد میں بہت سے کوئیں کھودے گئے۔ سایہ دار اور ثمردار شجر لگائے گئے۔ ادویہ کے لئے جڑی بوٹیاں غیر ممالک سے لاکر ہندوستان میں بوئی گئیں۔ ممالک غیر میں جغرافیائی یا قومی حدود سے تجاوز کرکے ایلچی بھیجے گئے اور بدھ دھرم پھیلایا گیا بھکشو طبیب بھی ہوتے تھے طبی مشنریوں کا دستور اُس کے عہد سے شروع ہوا۔ ہندو ایک قسم کی تبلیغ ضرور کرتے رہے ہیں لیکن اس طور کی نہ تھی کہ ہر رنگ ہر نسل ہر قوم و ہر ملک کا ہر متنفس دھرم کے دائرہ میں بلا تکلف آسکے بعینہ وہ

کا طریق تھا کہ وہ اپنا دھرم اور تہذیب پھیلاتے تھے۔ لوگ خود بخود ان کا طرز عمل اختیار کرلیتے تھے۔ باضابطہ دھرم کے دائرے میں آنا اُس کے لئے قاعدہ مقرر کرنا دنیا میں سب سے پہلے بدھ مت والوں نے شروع کیا ہے اُن کے بعد نصارا اور اُن کے بعد اسلام نے زور شور کی تبلیغ کی ہے۔ جماعتی پرستش۔ درگاہوں کا ماننا۔ بزرگوں کے مقبرے بنانا۔ مقدس کتابوں کا غیر زبانوں میں ترجمہ کرنا بدھی زمانہ سے شروع ہوا ہے۔

شہنشاہ اشوک نے اپنے لڑکے اور اپنی لڑکی کو لنکا بھیجا۔ وہ اپنے ہمراہ اُس پیپل کی ایک ٹہنی لے گئے تھے جہاں بدھ کو کشف حاصل ہوا تھا وہ ٹہنی انورادھاپور میں لگائی گئی اور اِس وقت تک وہ پیپل بڑی احتیاط سے رکھا گیا ہے اور وہ دنیا کے موجودہ درختوں میں سے سب سے بڈھا ہے۔ اشوک کے شہزادے اور شہزادی نے شاہ سیلون لنکا کو بدھ بنایا۔ تب سے بدھ دھرم سیلون میں رائج ہوا۔

خود شہنشاہ بھی آخری عمر میں بھکشو ہوگیا۔ اور مذہبی زندگی بسر کرتا رہا مسٹر ولسن لکھتے ہیں حال یا ماضی کا کوئی شہنشاہ اُس کی شان کو نہیں پہنچا۔ وہ تاریخ میں ایک بے مثل حکمران ہوا ہے۔ بہت سے مورخ متفق ہیں کہ اشوک ایک چمکدار ستارہ ہے جس کے آگے سب شاہ اور شہنشاہ ماند ہیں۔

باوجودیکہ وہ خود بدھ مت کا پیرو تھا۔ لیکن ہندو دیوتاؤں کے مندروں اور برہمنوں کو بھی اُس نے اپنے فیض سے محروم نہیں کیا۔

ہندوؤں کے زمانہ میں کوئی راجہ مہاراجہ نہیں گذرا جس کے زیر نگین ہندوستان کا اس قدر حصہ ہو۔ شمالی ہند اور دکھن اور راجپوتانہ۔ اودھ پنجاب وغیرہ ممالک میں مختلف راج رہے ہیں۔ صرف اشوک کا ہی ایک زریں اس ملک میں آیا ہے جس کے زیر حکومت ہندوستانی مملکت برطانیہ سے زیادہ ممالک محروسہ ہوں۔ اب ہم کندہ کتبوں سے مختصر اقتباس پیش کرتے ہیں جو ہمنے ٹراس کی کتاب کے اُردو ترجمہ سے نقل کئے ہیں۔

ان احکام میں سے جو پتھروں پہ کندہ ہیں ہم ایسا مختصر اقتباس پیش کرینگے جن سے مطلب فوت ہونیکے بغیر اس شہنشاہ کے اوصاف ظاہر ہوسکیں کہا جاتا ہے کہ بدھ مت اختیار کرنے سے پہلے اس شہنشاہ کی ظالم اور خونخوار ہونے کی شہرت تھی۔

"اپنی مملکت اور اپنے ہمسایوں میں میں نے انسانوں اور مویشیوں

کے لئے معالجے کا انتظام کیا ہے۔ جہاں جڑی بوٹیاں نہ ہوتی تھیں۔ میں نے باہر سے منگوا کر کاشت کرائی ہیں۔ جو انسانوں اور مویشیوں کے لئے مفید ہیں۔ سڑکوں پر میں نے کنوئیں کھدوائے ہیں۔ اور اُن کے لئے آرام گاہیں بنوادی ہیں۔ میری مملکت میں اہلکار ہر پانچویں سال دورہ پر جائیں۔ اور علاوہ اور کام کے تقویٰ کا پرچار کریں۔ یعنی۔

"ماں باپ کی اطاعت۔ دوستوں۔ واقفوں۔ رشتہ داروں برہمنوں اور تارکوں کے ساتھ سخاوت کا برتاؤ نیک کام ہے۔"

"جاندار کے مارنے سے بچنا نیک کام ہے۔ کم خرچی اور کم جمع کرنا کار ثواب ہے۔" سرکاری کام میں کچھ عرصہ سے تاخیر ہوگئی ہے۔ اب میں نے یہ انتظام کیا ہے۔ کہ خواہ میں کھانا کھا رہا ہوں۔ رنواس میں ہوں۔ یا سونے کے کمرے میں۔ یا اپنے حمام کمرے میں ہوں۔ یا گاڑی پر سوار ہوں یا محلات کے باغ میں ہوں۔ سرکاری رپورٹروں کو چاہئیے کہ رعایا کا کام پیش کریں۔ اور میں ہر جگہ رعایا کا کام کرنے کو تیار ہوں کیونکہ مجھے اپنی ذاتی کوشش اور کاربراری پر پورا اطمینان نہیں ہے سب لوگوں کی بھلائی کے لئے کام کرنا چاہئے۔ اس کا گر یہ ہے۔ کام سے جی نہ چرائے اور اسے التوا میں نہ ڈالے۔ میں اپنے کام کو انجام تک پہنچاؤں گا۔ سب جانداروں کا دین ادا کروں گا۔ تاکہ وہ سب خوش رہیں۔

"ایں جانب کی خواہش ہے۔ کہ ہر جگہ ہر قسم کے لوگ بسیں۔ وہ سب خواہشوں کو محکوم صفائی قلب حاصل کریں۔ لوگ خواہشیں اور میلان مختلف رکھتے ہیں۔ بعض جزواً اور بعض کلاً احکام کی تعمیل کریں گے۔"

ہر شخص کے لئے زیادہ سخاوت ناممکن ہے۔ تاہم اُس کے لئے حواس پر قابو پانا صفائی قلب حاصل کرنا ضروری ہے۔"

"میرے اہلکار ناجائز بند دگرنہ ہونے دیں گے۔ رکاوٹیں دور کریں گے۔ غربا۔ ضعیف العمر۔ بڑے کنبے والے لوگوں کو امداد دیں گے ہر شخص کی عزت کا لحاظ رکھیں گے۔ خواہ وہ غریب ہو یا مفلوک الحال نوکر ہو یا آقا۔"

"پہلے شاہی باورچی خانہ میں سینکڑوں جانور ذبح ہوتے تھے اب ہر روز صرف تین جانور ذبح ہوتے ہیں۔ آئندہ یہ تین جانور بھی ذبح نہیں ہوں گے۔ میری مملکت میں قربانی کے لئے کوئی جانور ذبح نہ ہوگا"

"ایں جانب ظاہری تعظیم یا دان کی چنداں پروا نہیں کرتے۔ ہر فرقہ میں نفس معاملہ کے لب لباب کی ترقی چاہئے۔ اس کی کئی شکلیں ہیں۔ لیکن سب کی جڑ ضبط کلام ہے۔ بلا کسی وجہ کے اپنے فرقہ کی توصیف یا دوسروں کے فرقہ کی مذمت نہیں کرنی چاہئے۔ کیونکہ دوسروں کے فرقہ کی عزت اپنے فرقہ کی عزت کرنا ہے۔

"کلنگوں کو ایں جانب نے مفتوح کیا۔ ایک لاکھ پچاس ہزار اسیر ہوئے ایک لاکھ قتل کئے گئے۔ اور اس سے کئی گنا زیادہ تباہ ہوئے۔ الحاق کلنگ اور کلنگوں کو مفتوح کرنے سے پشیمانی پیدا ہوئی کیونکہ ملک کی فتح سے کشت و خون ہوتا ہے۔ بہت لوگ اسیر ہوئے ہیں۔ ایں جانب کو اس کا سخت افسوس اور پشیمانی ہے۔"

"اگر کوئی شخص ایں جانب کو اذیت پہنچائے تو ایں جانب جہاں تک ہو سکے گا برداشت کریں گے۔ کیونکہ ایں جانب کی خواہش یہ ہے کہ ہر ایک آدمی امن میں رہے۔ اور سکون اور اطمینان حاصل کرے

"ایں جانب کی رائے میں سب سے بڑی فتح ... قانون تقویٰ کی ہے۔ اور ایسی فتح سے انبساط حاصل ہوتا ہے۔"

"ایں جانب کو قانون تقویٰ پسند آیا ہے۔"

(مسٹر ایچ جی ولسن لکھتے ہیں کہ دنیا کے فرمانرواؤں میں سے صرف اشوک ہی ایک ہے جس نے فتح کے بعد جنگ جوئی بند کر دی تھی۔)

"وہ سب لوگ میرے بچے ہیں جیسا کہ میں اپنے بچوں کی خوشی اور بہبودی چاہتا ہوں۔ رعایا کی بھی چاہتا ہوں۔"

شیو نرائن شمیم

رباعی

غافل جو شباب میں نہیں دانا ہے
اپنا جو اُسے کہے وہ دیوانہ ہے
رہتی ہی نہیں سبزۂ عارض کی بہار
یہ رنگ ہے عارضی وہ بیگانہ ہے

میر ناظر حسین خان ناظم مغفور

دیوانِ مغرب

(نغمہ سنجی کی تلاش میں نغمات کی مملکت کو نکل جا اور معنی کو جاننے کیلئے اس کے وطن کی جستجو کر)

گوئٹے اسی مجموعہ کلام کی تمام نظمیں ایرانی انداز میں ہیں اور جس کامیابی کے ساتھ اس مغربی مغنی نے اپنے دل پر تمام تر مشرقی کیفیات طاری کر کے مشرقی شاعری کی روح کو ...... ہم آہنگی اور کمال کے ساتھ ادا کیا ہے۔ مشرق کی فلسفی مزاج طبیعتیں اس کی مداح ہو جاتی ہیں۔ ہائنے کو یہ امر نہایت تعجب انگیز نظر آتا ہے کہ جرمنی زبان اس قدر دلکش اور لطیف اور لوچدار خیالات کے بیان کی بھی طاقت رکھتی ہے۔ وہ لکھتا ہے کہ گوئٹے نے اس میں مشرق کی ان تمام دلآویزیوں اور دلفریبیوں کو رکھ دیا ہے جن کو مغربی زبان میں مشرق کی رومانیت کہا جاتا ہے۔ اس کتاب کی دلآویزی بیان نہیں کی جا سکتی۔ یہ نایاب پودوں کے چمنستانوں سے چنے ہوئے پھولوں کا گلدستہ ہے جسے عقیدت کے طور پر مغرب کی طرف سے مشرق کی بارگاہ میں پیش کیا گیا ہے...........

.... یہ سرخ گلاب کے پھولوں، داؤدی کے غنچوں اور مہندی کی پتیوں سے تیار کیا گیا ہے جس کے درمیان جرمن بنفشہ کا ایک شاداب شگوفہ ہے۔ یہ گلدستہ مشرق کی طرف یہ پیام لے کر جاتا ہے کہ مغرب اپنی نام نہاد اور افسردہ روحانیت سے بیزار ہو کر اس کے تابناک سینہ میں زندگی تلاش کرنا چاہتا ہے۔ اس کی اکثر نظمیں ۱۸۱۴ء اور ۱۸۱۹ء کے درمیانی عرصے میں لکھی گئی تھیں اور آخری سال انہیں شائع کر دیا گیا تھا۔ یہ مجموعہ کلام بارہ کتابوں پر مشتمل ہے جن میں سے زلیخا نامہ کو جو نغمات عشق کا شیریں آوازنامہ ہے بہترین خیال کیا جاتا ہے۔ چنانچہ اس کتاب کی ایک مشہور ترین نظم کو آج پہلی بار اُردو میں شائع کیا جاتا ہے۔ (ایڈیٹر)

زلیخا نامہ

میرا خیال ہے کہ ایک سرد رات کے لمحوں میں مَیں نے خواب میں چاند دیکھا۔ لیکن جب میں نیند سے بیدار ہوا تو دیکھا کہ آفتاب نامعلوم طور پر پانی کی گہرائی سے طلوع ہو رہا ہے۔

اس میں کیا کلام ہو سکتا ہے کہ زلیخا کو یوسف سے نہایت محبّت تھی۔ وہ جوان تھا اور شباب آنکھوں کو بھاتا ہے۔ وہ خوبصورت تھا اور بے انتہا خوبصورت تھا۔ وہ بھی حسین و جمیل تھی اور دونوں حسن و عشق کے متوالے تھے۔

اے تو جو میرے انتظار میں ہے۔ اور مجھ پر شباب آفریں نگاہیں ڈال رہی ہے تو کبھی اپنی محبّت سے مجھے سرفراز کرے گی؟ آہ میرے نغمے تیرا گیت گائیں گے اور میں تجھے ہمیشہ کے لئے زلیخا کہوں گا۔

آفتاب طلوع ہو رہا ہے! کس قدر شاندار نظارہ ہے۔ ہلال اس کے گرد لپٹا ہوا ہے۔ اس حیرت انگیز وصال اور اس معمے کو کس طرح حل کیا جا سکتا ہے۔

میری محبوبہ ان شاداب اور گھنی شاخوں کو دیکھ۔ دیکھ ان کے خوشرنگ پھلوں کو بھی دیکھ۔
ابھی تک وہ خام ہیں۔ انہیں اپنی دلکشی اور دلفریبی کا احساس نہیں۔ صرف ایک لٹکی ہوئی شاخ انہیں جھولا جھلاتی ہے۔
لیکن وہ اندر سے پک رہے ہیں۔ ان کا رنگ شوخ ہوتا جا رہا ہے۔ اب انہیں ہوا کی تمنا ہے اور آفتاب کی خواہش
اب وہ خوشی سے شگفتہ ہو رہے ہیں۔ یہی شان میرے نغموں کی ہے۔ وہ ہر روز تیرے پاؤں پر نثار ہوتے ہیں۔ "زوینی"

میر ناظر حسین خاں ناظم

"ناظم الہند" میر "ناظر حسین" کی ولادت ۱۲۷۹ھ میں ہوئی سن ولادت نام سے نکلتا ہے۔ والد کا نام میر ولایت حسین خاں تھا۔ وطن مکرولی ضلع مظفر نگر۔ تعلیم و تربیت والد بزرگوار کے زیر سایہ ہوئی۔ فارسی میں ایرانیت کی شان نمایاں تھی۔ عربی میں بھی درک رکھتے تھے۔ اور اُردو زبان میں تو وہ کمال حاصل تھا کہ اساتذہ عصر امیر مینائیؒ۔ مرزا داغ اور میر جلال سب آپکی عظمت کے معترف تھے۔ شاعری میں میر انیس کے خاندان سے تلمذ تھا۔ جب آپ پنجاب میں آئے اردو کو یہ ہر دلعزیزی اور مقبولیت عام حاصل نہ تھی جو آج نظر آتی ہے آپ نے اس خلوص اور سرگرمی کے ساتھ اُردو زبان کی خدمت انجام دی کہ وہ زبان جو کچھ عرصہ پہلے صرف اہل علم کی زبان سمجھی جاتی تھی۔ اب عوام بھی اسی کو اپنی زبان سمجھ کر بولنے اور اس میں فکر کرنے لگے۔ یہ ناظم مغفور ہی کا دم تھا جس نے لاہور کی علمی ادبی اور مذہبی مجلسوں کو گرما کر عوام کو اردو کے دلکش اور شیریں ترانوں سے آشنا کر دیا۔ شاعری سے آپ کو فطری لگاؤ تھا بارہ چودہ سال کی عمر ہی سے مجالس عزا میں سوز اور سلام پڑھنے لگے تھے۔ اور پھر تو مشق سخن نے وہ رنگ پیدا کیا کہ آپ کے اشعار سند میں پیش کئے جانے لگے۔ سلاست روانی۔ فصاحت و بلاغت میں معنی آفرینی اور محاورہ کی سادگی آپکے کلام میں نمایاں ہے۔ غیر مانوس الفاظ سے زبان قلم آشنا نہیں الفاظ کے تکرار سے جو خوبی آپ پیدا کرتے ہیں وہ داغ کے سوا کہیں اور کم نظر آتی ہے۔ نظم کی طرح نثر میں بھی بہت مہارت رکھتے تھے "نسیم جنت" اور "ناظم الہند" نام کے پرچے مدتوں آپ کی ایڈیٹری میں شائع ہوتے رہے آپ نے بہت سی تصانیف یادگار چھوڑی تھیں۔ مگر دست برد زمانہ سے ضائع ہوگئیں۔ جو باقی ہیں اُن کے نام یہ ہیں۔ دیوان دار السلام۔ خطبہ بے الف یہ خطبہ حضرت علیؓ کے ایک بے الف خطبہ کا کامیاب ترجمہ ہے۔ جس کے ۴۴ بندوں میں ایک بار بھی الف نہیں نہیں آیا (۳) پنجہ نگارین (۴) مجموعہ مراثی (۵) نعرہ توحید ان تصانیف میں سے جو تلف ہو چکی ہیں ایک دیوان "ساغر خون" تھا۔ جو ناظم مغفور نے داغ کے دیوان کے جواب میں لکھا تھا۔ جسے علامہ تاجور نجیب آبادی نے بہت عرصہ ہوا ایک ہندو صاحب ذوق کے پاس دیکھا تھا۔ داغ کی ہر غزل کے جواب میں ایک مرصع غزل تھی۔

مسلمانوں کے علاوہ ہندو حضرات اور اراکین حکومت سے بھی آپکی راہ و رسم تھی۔ قیام پنجاب کے بعد آپ کئی سال حکومت برطانیہ کی طرف سے سفارت کے عہدہ پر فائز رہے۔ کاغذات میں آپ کو ناظم الہند سفیر گورنمنٹ لکھا جاتا تھا۔ آپکا انتقال ۱۱ محرم الحرام ۱۳۳۶ھ کو قلیل عرصہ کی علالت کے بعد لاہور میں ہوا اور وہ چراغ ادب جس نے پنجاب کی محفل ادب کی شمعیں روشن کی تھیں گل ہو گیا۔

انتخاب کلام

حمد

(منقول از خطبہ بے الف)

پوشیدہ حق سے کچھ بھی نہیں وہ خبیر ہے ہر وقت پردہ پوش صغیر و کبیر ہے
بس وہ گرے ہوؤں کیلئے دستگیر ہے رحمت میں بھی نہ فرد ہو کیوں دستگیر ہے
ہے حکم عین عدل مشیت درست ہے
وہ سب کے بعد بھی ہے جو سب سے نخست ہے

نعت

پھیلی ہوئی تھی تیرگئ جہل سر بسر بخت سیہ کی شکل تھے کل تیرہ دل بشر
نے خیر کی خبر تھی کسی کو نہ شر سے ڈر ظلمت کدے تھے کفر کی ظلمت سے دشت و در
یہ شکل تھی کہ صورت بعثت عیاں ہوئی

خورشید دیں کے نور سے روشن زمیں ہوئی

ہے تاج سر حمد خدا میم محمدؐ وارفتۂ محمود ہے ترمیم محمدؐ
تاخیر ہے خود شاہد تقدیم محمدؐ قرآن ہے دیباچۂ تقدیم محمدؐ
ہے اُن کے تقرب کی گواہی بھی سند بھی
الحمد میں ہے آل بھی احمد بھی احد بھی

آنحضرت صلعم کے مبعوث ہونے پر

آنے کی خبر جس کے تھی ناگاہ وہ آیا اِک ہاتھ میں تیغ ایک میں قانون کو لایا
پردہ جو جہالت کا بڑا تھا وہ اُٹھایا امّی نے سبق علم الٰہی کا پڑھایا

سنا گر دھوئے طاق غرض علم و ادب میں
رب رب کی صدا چار طرف گونجی عرب میں

منقبت

دریائے فیض جود علیؑ کی جناب ہے — بحر کرم وصی رسالت مآب ہے
حیدرؑ کے در سے آبرو پانی ثواب ہے — نہر علیؑ سے چشمۂ نور آفتاب ہے
ماہی سے تا بماہ ہے جو کچھ گواہ ہے
ہر خشک و تر میں ساقئ کوثر کی چاہ ہے

پند و نصائح

فخر حسب کرو نہ غرور نسب کرو — پھنس کر مصیبتوں میں بھی تم شکر رب کرو
ہر دم حضور رب میں عرض عجز سب کرو — معبود سے طلب کرو گر کچھ طلب کرو
کچھ درد ہو کہ غم ہو عطش ہو کہ جوع ہو
ہر وقت حق کی سمت مگر دل رجوع ہو (از خطبۂ بے الف)

حضرت عباس علمدار کی آمد

اس شان سے آئے صف اعدا کے مقابل — ہو قہر خدا جیسے گنہگار پہ نازل
جب فوج سمٹتی ہوئی دیکھی سوئے ساحل — ہنس کر کہا یہ خام خیالی ہیں ہر داخل
کس واسطے سب فوج یہ دریا پہ جھکی ہے
گرتی ہوئی بجلی کبھی خرمن سے رکی ہے

تیغ کی تعریف

عالم کے جلانے کا مگر تیغ سبب تھی
جو طور پہ چمکی تھی یہ وہ برق غضب تھی
خنجر جو علم کر کے بڑھا کوئی رسالہ — چوندھیا گیا اس برق کا دیکھا جو اجالا
سر تن پہ نہ تھا ہاتھ جہاں باگ پہ ڈالا — میداں میں ہوئے اک و مرکب تہ و بالا
گر گر کے جو یہ برق غضب کوندر رہی تھی
خاکستر خرمن کو قضا روند رہی تھی
گرتا تھا جو سر کٹ تو فرس کرتا تھا پامال — ہر وار میں رہتی تھی اجل تیغ کے دنبال
انبار تھے لاشوں کے نہ کر سکتی تھی پڑتال — دم لیتی تھی دم لیکے جو ہوتا تھا برا حال
جنات لرزتے تھے ملک کانپ رہے تھے
تھک کر ملک الموت کھڑے ہانپ رہے تھے

گھوڑے کی تعریف

ہر وقت سواری میں تھا نعل در آتش — ٹاپوں کی صدا سے دل دشمن تھا مشوش
ان تیزیوں پر سخت وہاں تھا وہ سرکش — شائستگی ایسی کہ ملک کرتے تھے غش غش
رفتار پہ غش ہونا جو عادت تھی ہوا کی
باگیں نہ تھیں باہیں تھیں گلے میں صبا کی

مشک و علم

سوکھی ہوئی وہ مشک لٹکتی تھی علم پر — یاد امن طوبےٰ سے ہم آغوش تھا کوثر
با تشنگئ آل محمدؐ کی خبر پر — لائے تھے خضر چشمۂ حیواں کو اٹھا کر
مشکیزہ ہی زیب علم شاہ اگر تھا
سر چشمۂ خورشید کا تفتیدہ جگر تھا

قتل گاہ کا نقشہ

موت کی گھٹا اک طرف اور مرگ کا جال اک طرف — بخت کی ہا اک طرف اور برگشتہ اقبال اک طرف
ذبح اعظم زیر خنجر خستہ احوال اک طرف — عصمت کبریٰ کے میداں میں کھلے بال اک طرف
شور و شیون اک طرف فریاد زینب اک طرف
یہ اکیلی اک طرف دشمن جہاں سب اک طرف

بھائی کے لئے بہن کی آہ و زاری

چھوڑ دے بھائی کو میرے کاٹ سیر اگلا — زخمی سینے سے اُتر ظالم تو اب بہر خدا
خاک پر لیٹے ہیں بھائی تجھ پری چادر بچھا — زینت زخموں سے چھڑانے آئی ہوں ہٹ جا ذرا
چھوڑ دے گیسو نہیں برسے گا خون افلاک سے
پاک کرنے دے ستمگر ریش اقدس خاک سے

ہوش میں زخمی کو آلینے دے سینے سے اتر — حال دل کا بھائی سے کہہ لینے دے اے بد گہر
سُن تو لینے دے وصیت صبر کر اتنا ٹھہر — ساتھ برسوں کا چھڑاتا ہے تو پھر جلدی نہ کر
سر اُڑا دے بھائی سے پہلے تو اس ماں جائی کا
موت سے بدتر بہن کو ہے بچھڑنا بھائی کا

حضرت ناظم مغفور کے ایک مشہور و مقبول اور مرصع مرثیہ المعروف بہ شام غریباں کا ایک بند

اللہ رے شان شام غریبان اہل بیت — مضمون اس کا دست و گریبان اہل بیت
زلف اس کی دود آہ یتیمان اہل بیت — خود رنگ چادر سر عریان اہل بیت
تاریکی اس کی چھائی تھی کون و مکان پر
شال عزا یہ شام تھی دوش جہان پر

(نازش رضوی)

ایثار

میرا خیال ہے دوسری عورتوں کو بھی میرے جیسے حالات پیش آئے ہونگے۔ صرف میں ہی ایک ایسی بیوی نہیں ہوسکتی جسے کئی سال کی ازدواجی زندگی کے بعد اچانک معلوم ہوا ہو کہ اب اس کا خاوند اس کا نہیں رہا۔ لیکن میری طرح ان خواتین کے لئے بھی ان باہمی تعلقات کا خاتمہ کردینا۔ نہایت مشکل ہوگا جن میں ان کی مشترک مسرتیں اور غم برابر کے شریک رہے ہوں اور فی الواقع اکثر اوقات میں حیران ہوتی ہوں کہ جس وقت میں نے اپنے خاوند سے طلاق لی تو کیا میں نے دل کے ان تمام رشتوں کا بھی خاتمہ کر دیا تھا جن سے گھر کی دلکش فضا پیدا ہوتی ہے۔

میں نے یہ چرچا سُنا تھا کہ دل اپنی حسین و جمیل سکرٹری کو چاہتا ہے۔ لیکن میں نے اس کو بالکل معمولی بات خیال کر کے اپنے دل میں جگہ نہ دی۔ روتھ ایلیسن ایک ہوشیار لڑکی تھی اور دل کے کاروبار میں نہایت سرگرمی سے دلچسپی لیتی تھی۔ میرا خاوند وکیل ہے۔ اس وقت اس کی کافی آمدنی تھی لیکن وہ اپنے پیشے کی کامیابی اور رتبے کے باوجود روتھ کی امداد پر خوش تھا۔ اس کی وجہ سے میں بھی خوش تھی۔ اور اس کے علاوہ مجھے اس لڑکی سے محبت بھی تھی۔

میں اس کو اپنے ساتھ دریا کے کنارے والے مکان میں لے جاتی تھی اور اگرچہ روتھ اور دل وقت کا ایک کثیر حصّہ اکٹھے رہتے تھے۔ مجھے ان کی بے ریا دوستی کے سوا کبھی کوئی خیال بھی نہ آیا تھا۔

مجھے یہ علم بالکل اتفاقی طور پر ہوا۔ ان دنوں دل انفلوئنزا کے حملے کی وجہ سے گھر پر رہتا تھا۔ وہ اپنے مقدموں کے متعلق نہایت فکرمند تھا۔ اور روتھ اس کی خواہش کے مطابق شام کے وقت تازہ ترین تفصیلات لیکر آتی تھی۔ اس شام دل اپنے مطالعہ کے کمرے میں روتھ کے انتظار میں شام کے اخبارات پڑھ رہا تھا۔ میں باغ کی روش پر ٹہل رہی تھی۔ ٹہلتے ٹہلتے میں نے کھڑکی میں سے اُسے دیکھا۔ وہ میز کے مقابل کرسی پر نہ تھا۔ بلکہ کھڑا ہوا دروازے کو اس شوق اور انتظار سے دیکھ رہا تھا جسے دیکھ کر میرا دل سرد پڑ گیا۔ اس کی نگاہوں میں یہ چمک میں نے بارہا دیکھی تھی اور اسے دیکھ کر ہر بار میرے جسم میں ایک لرزش پیدا ہو جاتی تھی۔ میں جانتی تھی کیا ہونے والا ہے، ہاں میں جانتی تھی!

دروازہ کھُلا اور روتھ اندر داخل ہوئی۔ اُس نے اپنا مختصر سا کیس ایک طرف رکھ دیا اور بے تابانہ میرے خاوند کی طرف بڑھی۔ اور نہایت محبت سے ہاتھ ملایا۔

ان کی گفتگو سے میں نے اندازہ کیا کہ دونوں ایک دوسرے سے مستقل طور پر کوئی عہد و پیماں کرنا چاہتے ہیں۔

میں یہاں زیادہ دیر کھڑی نہ رہ سکی اور کھڑکی کے مقابل سے چلی آئی اور اپنے کمرے میں آکر دروازے کو اندر سے مقفل کر لیا۔

صاف ظاہر ہے کہ دل میری موجودگی کو بالکل فراموش کر چکا تھا۔ کیونکہ جب اس نے آکر دروازے پر دستک دی اس بات کو پورا ایک گھنٹہ ہو چکا تھا۔ میں دروازہ نہ کھول سکتی تھی۔ میں نے اپنی معمولی آواز میں یہ کوشش کرتے ہوئے کہ کہیں میرے دل کی یہ کیفیت ظاہر نہ ہو جائے۔ کہہ دیا کہ مجھے اس وقت دردِ سر کی شکایت ہے اور میں آرام چاہتی ہوں۔

میرے سامنے مستقبل تھا جس کا ان کے طوفانی دنوں میں میرے ذہن میں خیال تک بھی نہ آیا تھا۔ مجھے اس مستقبل سے دوچار ہونا تھا۔ جس میں اس مرد کا پتہ نہ تھا جس سے مجھے محبت تھی۔

دوسری صبح دل شہر کو گیا۔ جب وہ مجھے خدا حافظ کہنے آیا۔ وہ نہایت متفکر تھا۔ وہ پلنگ کے پاس کھڑا رہا اور اس کی پیشانی پر بل تھے۔

"میری پیاری میں تمہیں اس حال میں نہیں دیکھ سکتا۔ میں چاہتا ہوں ڈاکٹر بلوایا جائے"

یہ کہتے ہوئے اس نے محبت کے پیرائے میں میرا ہاتھ اپنے ہاتھ میں دبایا اور چلا گیا۔ میں بستر پر لیٹی گذشتہ چند ہفتے کے واقعات پر غور کر رہی تھی۔ اس وقت مجھے معلوم ہوا کہ ان ایام میں اس کا پیار اور محبت ظاہری اور مجبوری تھا۔ لیکن میں نے اس کی طرف کوئی توجہ نہیں کی تھی۔ مرد کی محبت کی کئی ایک حالتیں ہوتی ہیں۔ لیکن جب تک اس کی محبت اور وفا شعاری

پر اعتماد ہو اس کی ہر ادا کا جواب مسکراہٹ سے دیا جا سکتا ہے۔

لیکن اگر اعتماد نہ ہو؟ میں اُٹھ کر بیٹھ گئی اور میرا دل زور زور سے دھڑک رہا تھا۔

میں نے ول کو اس انداز سے روتھ سے اظہار محبت کرتے دیکھا تھا جس کے صرف ایک ہی معنے ہو سکتے تھے۔ اف مجھے کیا کرنا ہے؟

میں نے ارادہ کر لیا کہ میں مات نہ کھاؤنگی۔ میں اپنے رفیق حیات کو مقابلے کے بغیر ہاتھ سے نہ دونگی۔ میں نے ٹھنڈے دل سے اپنا اور اس لڑکی کا مقابلہ کیا۔ اور میں کسی لحاظ سے اس سے کم نہ تھی۔ آپ جانتے ہیں میں بھی حسن و جمال رکھتی ہوں۔ اگرچہ یہ خود نمائی معلوم ہوتی ہے لیکن یہ حقیقت ہے۔

اب دوسرا مسئلہ جس کا مجھے فیصلہ کرنا تھا یہ تھا کہ کیا ول جذبات کے اس اندھا دھند طوفان سے سلامت نکل آئیگا۔ یا یہ لڑکی اس کی زندگی کا مستقل جزو بن کر رہ جائیگی؟

یہ موقعہ توقع سے کچھ پہلے ہاتھ آ گیا۔ ایک شام ول کی بہن سلویا ہمارے ہاں آئی۔ ہم دریا کے کنارے والے مکان کو چھوڑ کر شہر کے پُر مسرت مکان میں چلے گئے تھے۔

سلویا اس بات پر ہمیشہ بجا طور پر فخر کیا کرتی ہے کہ وہ سچی بات کو بلا تکلف کہہ دیتی ہے۔ چنانچہ اس شام بھی اس نے اپنے معمول کے مطابق کیا اور مجھے صاف صاف بتا دیا کہ اس نے ول اور روتھ کو برگنٹن میں دیکھا ہے۔ میں نے نہایت بے پروائی سے اس بات کو ٹال دیا اور کہا شاید وہ کاروبار کے لئے وہاں گئے ہوں گے۔

ول سلویا کو اسوقت ملا جب وہ واپس جا رہی تھی۔ اس نے اسے دیکھ کر ناک بھوں چڑھائی اور اس سے حقارت سے اس حق بجانب حقارت سے ہمکلام ہوئی جس کو مرد ہمیشہ سمجھتا ہے۔

ول نے مسکراتے ہوئے یا کانپتی ہوئی مسکراہٹ کے ساتھ کہا "میری! سلویا نے تمہیں کیا کچھ بتایا ہے"؟ وہ کچھ مجھ سے خائف اور ضد پر اُترا ہوا نظر آتا تھا۔ میں نے دیکھا کہ وقت آ گیا ہے۔

"میرا خیال ہے تم جانتے ہو"۔

اس نے بے تابی سے ایک پاؤں سے دوسرے پر سہارا دیتے ہوئے کہا "تمہاری مراد ہے تم ——— روتھ کے متعلق جانتی ہو"

میں نے سر ہلایا "میں اس دن سے جانتی ہوں جب سے میں نے تم کو بنگلے میں دیکھا ہے۔ تم دونوں کو" اس کا چہرہ شرم سے سُرخ ہو گیا۔ معلوم ہوتا ہے میری اس بات سے اس کے دل کو سخت اذیت پہنچی۔ اس کا خیال تھا کہ میں جوش و خروش میں کچھ اور کہونگی لیکن میں خاموش رہی، اور وہ اپنی خوش قسمتی پر خوش تھا۔

اُس نے کہا "شاید تم مجھے جوان خیال کرتی ہو لیکن ——— میری! میں تمہیں کیا بتاؤں۔ تم جانتی ہو مجھے تم سے کسقدر محبت ہے۔ خطرناک طور پر محبت ہے۔ لیکن آہ تم نہیں جانتیں۔ تم خیال نہیں کر سکتیں۔ روتھ کسقدر سحر کار لڑکی ہے"۔

یہ بات سوچنے میں بڑی حیران کن ہے کہ مرد کے لئے بیوی سے اپنی محبوبہ کا تذکرہ نہ کرنا کسقدر دشوار امر ہے۔ تمام مرد ایک سے ہوتے ہیں۔ اور وہ اس تذکرے سے باز نہیں رہ سکتے۔ ول مجھ سے میری حریف زندگی کے متعلق اس طرح باتیں کرتا تھا گویا مجھے اس سے یا روتھ سے کوئی تعلق ہی نہیں ہے۔

"میری تم سمجھتی ہو نا؟ میرا کیا مطلب ہے"؟

"ہاں ول میرا خیال ہے میں سمجھتی ہوں روتھ تمہارے لئے شعریت کا پیکر اور رومان ہے"۔

"آہ! وہ آسمانی مسرت ہے میرے لئے!"

میں کیا کہوں۔ اس کی آواز میں کچھ ایسی کیفیت تھی کہ میں لڑھکنیاں کھاتی ہوئی ماضی میں چلی گئی۔ اس وقت وہ بالکل وہی تھا جس نے بیس سال ہوئے مجھ سے پہلی بار محبت کی تھی۔ "میری وہ اسقدر پُر تپاک ہے ——— اور اسقدر خندہ رو۔ اسے دیکھ کر مجھے محسوس ہوتا ہے کہ میں وہ کام بھی کر سکتا ہوں جس کی مجھ میں قابلیت نہیں ہے۔

میں نے جواب دیا "میں جانتی ہوں۔ تم اسے چاہتے ہو۔ اس کی تمنا رکھتے ہو۔ تمہیں رومان اور شعریت کی آرزو ہے۔ تم آسمانی مسرت کے خواہاں ہو۔ میرے پیارے میں تمہیں باز نہیں رکھ سکتی۔ رکھ سکتی ہوں کیا؟ میں تمہاری مخالفت نہیں کرونگی۔ اگر روتھ کے دل میں بھی یہ جذبۂ عشق ہے اور وہ بدنامی اور ننگ و ناموس کے خیال سے ترساں نہیں ہے۔ تو میں تمہیں جانے کی اجازت دے سکتی ہوں۔ میں تمہاری منتظر ہونگی اور تمہارے واپس آنے تک انتظار کرونگی"۔

"تم انتظار کرو گی میری؟" اس نے بالکل ایک ننھے بچے کی مانند مجھے دیکھا۔ "تم نہیں سمجھتیں میری! آہ میں جانتا ہوں یہ انتہائی درجے کی زندگی

اور سنگدلی ہے۔ لیکن میں کیا کر سکتا ہوں؟ - بات یہ ہے میں روتھ سے شادی کرنا چاہتا ہوں۔ میں اس کے ساتھ رہنا چاہتا ہوں —

——— تم مجھ سے طلاق لوگی۔ میری"؟

اس وقت ضبط و تحمل کی باگ میرے ہاتھ سے جاتی رہی۔

اب میں ایک قدیم عورت تھی جو اپنے ہمراہی کے لئے لڑ رہی تھی۔

"طلاق لوں؟" میں نے کہا تم مجھے یہ کہہ سکتے ہو؟ - میں نے تمہیں آزادی دے رکھی ہے۔ میں نے تمہیں اپنی محبوبہ کے پاس جانے کی اجازت دے دی ہے۔ اور میں نے طعن و تشنیع کا ایک لفظ تک نہیں کہا۔ لیکن یہ میری روح کی برداشت سے باہر ہے۔ اگر میں تم سے طلاق لے لوں تو میرے پاس کیا رہ جائیگا؟ اور میں اپنی زندگی کے باقی ماندہ ایام کس طرح بسر کروں گی!

ول کا انداز اس کشمکش کی آواز پر فوراً بدل گیا "کس طرح بسر کرونگی؟ - تم حسین اور ہوشمند عورت۔ یقیناً میرے علاوہ تمہارے لئے کچھ اور دلچسپی کا سامان بھی ہو سکتا ہے"!

ہائے کیا تم نہیں دیکھتے؟ کہ میں نے تنہائی کی زحمت کو بھی فراموش کر دیا ہے؟ میں تنہائی کی مصیبتوں کو بھول گئی ہوں۔ ول کیا ان ایام رفتہ کی تمہارے دل میں کچھ وقعت نہیں؟ وہ زرین ماضی تمہارے لئے کچھ بھی نہیں؟ جب میں نے یہ الفاظ کہے میں نے محسوس کیا۔ کہ میں صرف اپنے لئے نہیں بلکہ تمام شادی شدہ عورتوں کے حقوق کے لئے آواز اٹھا رہی ہوں"!

لیکن اُس نے کوئی جواب نہ دیا۔ وہ خاموش کھڑا تھا اور اُس کے چہرے پر ضد اور شرمندگی کے آثار تھے اور میں جانتی تھی کہ میں جسقدر زیادہ غضبناک ہونگی اتنا ہی وہ سنگدل ہوتا جائیگا۔

میں تمام رات رو رو کر جان ہلکان کرتی رہی۔ میں یہ برداشت نہ کر سکتی تھی۔ کسی طرح نہیں کر سکتی تھی۔ لیکن صبح ہوتے ہی ٹھیس لگے ہوئے اور پامال جذبات کا یہ اندھادھند طوفان اتر گیا۔ اور میں نے واقعات کو دن کی پاکیزہ اور نور پاش روشنی میں دیکھا۔

میں نے اس امر کا فیصلہ کر لیا کہ ول سے طلاق لے لوں —

آہ میں اپنے خاوند سے اس امید پر، ہاں صرف اس مجنونانہ امید پر جیسا کہ میں خود محسوس کرتی ہوں۔ دست بردار ہو جاؤں گی کہ اسے دنیاوی رسوم کی قیود سے آزاد کر کے پھر اپنی محبت کی سحرکار زنجیروں میں اسیر کر لوں۔ میں نے بیس سال بعد تعلقات کے اس محل کو جس کی تعمیر جوانی کی امنگوں اور جذباتِ حسن و عشق کی رنگینیوں نے کی تھی۔ صرف اُسے بچانے کے لئے ڈھا دیا۔

میں نے کہا "ول میں تم سے طلاق لیتی ہوں"!

آہ! کسقدر خوفناک تھی وہ چمک! جو بجلی کی سی تیزی کے ساتھ اُس کی آنکھوں میں پیدا ہو گئی - وہ خوشی میں آپے سے باہر تھا اور ممنونیت اور احسان مندوں کے جذبات کے سمندر کو جو اس کے دل کی گہرائی میں اُمڈا چلا آرہا تھا روک نہ سکتا تھا۔ میرے اور ول کے رشتہ دار سخت خفا تھے اور چند احباب کا خیال تھا کہ مجھ سے یہ ایک نہایت احمقانہ فعل سرزد ہوا ہے۔ مجھے اس امر کا اعتراف ہے کہ میری زندگی میں ایسے لمحے بھی آئے ہیں جن میں مجھے احمق کہا جا سکتا تھا۔ صرف اسی ایک واقعہ کو دیکھ لیجئے - ول کے محض ایک اشارے پر جس نے مستقبل ہی کو نہیں بلکہ ماضی کو بھی خطرے میں ڈال دیا تھا۔ اس وقت چاروں طرف تاریکی تھی۔ ہرطرف ناکامی اور مایوسی، صرف امید کا ایک ٹمٹماتا ہوا دیا دُور سے دکھائی دے رہا تھا۔ جس پر میری زندگی کا انحصار تھا۔

طلاق کے مقدمے کا فیصلہ ہونے سے پیشتر میں باہر چلی گئی۔ مقدمے کی تفصیلات میرے لئے نہایت تکلیف دہ اور بھیانک تھیں۔ مجھے اس کا گمان بھی نہ تھا۔ کہ مجھے عدالت میں پیش ہو کر خوشی اپنی مسرتوں کا خاتمہ کرنا ہوگا۔ اس وقت میری روح کی فضا میں یہ زبردست وحشیانہ خواہش ایک بگولے کی طرح پیدا ہوئی کہ میں اس تمام کارروائی کو روک دوں۔ میں یہ بھی نہیں جانتی کہ صبر و تحمل کی اس جانسوز آزمائش سے میں کس طرح عہدہ برا ہوئی۔ صرف اسقدر یاد ہے کہ بیست سالہ رشتۂ ازدواج پندرہ منٹ میں تار تار ہو گیا ہو۔

اگلے چھ مہینے میں نے دیہات میں گذارنے کا فیصلہ کیا۔ اس عرصے کے بعد طلاق کے کاغذ کی تصدیق ہو جائیگی۔ اور ول دوسری شادی کر سکیگا"۔ میں سوچتی تھی۔ لیکن یہ عجیب بات ہے میں دوبارہ شادی کا تصور بھی نہ کر سکتی تھی۔ میری شمع حسن کے پروانوں کی کمی نہ تھی۔ اس انبوہ میں دو ایک ایسے بھی تھے جو مجھ سے دلی محبت رکھتے تھے۔ خصوصاً ایک شخص نے جو مجھے اسوقت سے جب کہ میں نے شباب کی گلپوش وادی میں قدم بھی نہ رکھا تھا جانتا تھا۔ مجھ سے اُسنے کئی بار شادی کے لئے پوچھا اور وہ بھی ایکبار نہیں کئی بار۔

میں خاوند کی حیثیت سے اُس کا تصور کیوں نہ کر سکتی تھی؟ آہ یہاں پھر میرے شیشۂ دل کو ٹھیس لگتی ہے۔ دوسری شادی مجھ جسٹر نصیب کے لئے نہ تھی۔ وہ ول سے ہر لحاظ میں بہتر اور مردانہ حسن کی سحرکاری کا اس سے کہیں بڑھ کر مالک تھا۔ لیکن میں اپنے شباب کی

اوّلین محبت اپنی آرزوئیں اور تمنائیں اور اپنی ناکامیاں، دِل کے عشق کی قربانگاہ پر بھینٹ چڑھا چکی تھی۔ ہم ایک جان دو قالب تھے اور یہ میرے تصوّر میں بھی نہ آسکتا تھا کہ کبھی مجھے اس سے جُدا ہونا ہے۔ اور میں اس کے بغیر ایک لحہ بھی زندہ رہ سکتی ہوں .... لیکن آہ! اب مجھے خود جُدا ہونا تھا اس کے رشتہ داروں نے مجھے بتایا کہ وہ روتھ سے شادی کرنے والا ہے اور مجھے معلوم ہُوا کہ وہ بھی اس رشتے کے خیال سے مانوس ہوتے جاتے ہیں۔

بالآخر فیصلہ ہوگیا اور اب دِل اور میں قانون کے الفاظ میں میاں بیوی نہ تھے۔ سلویا نے مجھے اطلاع دی کہ اُن کی شادی آنے والی خزاں میں ہوگی۔ آہ! خزاں میں جب کائنات کا ذرّہ ذرّہ کسی نامعلوم کشش کی ایک دوسرے سے ہم آغوش ہوجاتا ہے۔

اس کے بعد انگلستان میں میرے لئے ٹھہرنا دوبھر تھا۔ میں وہاں ایک لمحے کے لئے بھی نہ رہ سکتی تھی۔ میں نے اطالیہ جانے کا فیصلہ کرلیا۔ اطالیہ کے سبز سبز و شاداب مناظر، نیلگوں کھاڑیوں پر سنگترے کے دلکش اور خوش رنگ کنجوں کا سایہ، جھیلوں کی اٹھلاتی ہوئی موجوں کا زیر و بم کبھی ہمارے عہدِ جوانی کے خوابوں کی زینت رہے تھے۔ اور اب میرا خیال تھا میں اس سرزمین خواب میں زندگی کی تلخیوں کو فراموش کرسکونگی۔ دِل کی شادی ستمبر میں ہونے والی تھی اور یہ اگست کی آخری رات تھی جو میں نے لنڈن میں گذاری۔

میرا خیال ہے میرے دل پر فراموشی کی سی ایک کیفیت طاری رہتی ہے۔ کیونکہ اگرچہ اس روز میں تمام دن اس خیال کو دباتی رہی۔ لیکن شام کو میرا دل کشاں کشاں مجھے اس مکان کے نواح میں لے گیا۔ جہاں ہم اسقدر مسرت و اطمینان کے دن بسر کرچکے تھے۔ میری نگاہیں دھندلی ہورہی تھیں اور میں ایک شخص سے جو دوسری جانب سے آرہا تھا بے اختیار ٹکرانے کو تھی۔

اس سے پیشتر کہ وہ کچھ کہتا میں نے اسے پہچان لیا۔ وہ دِل تھا۔ میں اس امر کو بالکل بھول گئی تھی کہ اب وہ میرا خاوند نہیں تھا۔ میں نے بے اختیار اپنا ہاتھ اس کی طرف بڑھایا۔ وہ مسکرایا اور اس مسکراہٹ میں کچھ حماقت سی ملی تھی۔

"تم تو بہت جوان معلوم ہوتی ہو" اس نے کہا تم وہی لڑکی ہونا جس سے مجھے محبت تھی؟ ——— آؤ کچھ چائے تو پی لیں!" میں نے اپنی اس مُلاقات کا بارہا تصوّر کیا ہے۔ مجھے اس میں ذرا بھی اصلیت معلوم نہ ہوتی تھی۔ ہم نے کچھ دیر بیٹھے باتیں کیں اور قہقہے لگائے اور تمام چیزوں کے متعلق ہنستے رہے اسوقت مجھے اچانک یاد آیا۔

میں نے کہا "اب مجھے ضرور جانا چاہئیے۔ مجھے بہت سا سامان باندھنا ہے۔ میں کل انگلستان سے جارہی ہوں"۔

اس نے چونک کر میری طرف دیکھا۔ گویا وہ مایوس ہوگیا ہے۔

"طویل عرصے کے لئے؟"

"میں ——— میں کچھ نہیں کہہ سکتی"۔ ہم بیٹھے ایک دوسرے کو تکتے رہے "اور تمہاری شادی کب ہوگی؟"

میرے بالمقابل ایک آئینہ تھا میں یہ دیکھ کر اپنے دل میں فخر کر رہی تھی کہ دِل کے طوفانِ الم کو دبا کر میں کس آسانی سے مسکرا رہی تھی۔

"میں کچھ نہیں کہہ سکتا ——— میں تم سے کہنا چاہتا ہوں میری! میں تمہیں کچھ کہنا چاہتا ہوں"؟

"اب ہم اپنے مکان میں نہیں جاسکتے" میں نے جواب دیا "وہاں کوئی آچکا ہے ——— اور میں نہیں خیال کرتی کہ ابھی کچھ باقی ہو"۔

لیکن دِل نے اس بات پر کچھ دھیان نہ دیا۔ وہ میرے ساتھ ہوٹل میں آیا اور مجھے بہت سی باتیں بتاتا رہا۔

"یہ عجیب مضحکہ خیز بات ہے۔ لیکن جب سے تم مجھ سے جدا ہوئی ہو میرے دل میں کسی اور سے زیادہ تمہارا خیال ہے۔ آہ وہ تمہارا بال سنوارنے کا انداز۔ وہ تمہارا بے موقعہ قہقہہ ——— آہ میری! ہم نے محبت سے دن گذارے ہیں"۔

میں نے سر جھکا دیا۔ میری آواز مجھے فریب دے رہی ہے۔ میں بول نہ سکتی تھی۔

"آہ! اس کو فراموش کرنا آسان کام نہیں ہے میرا خیال تھا۔ یہ آسان ہوگا ——— لیکن یہ بہت مشکل ہے اور نئی زندگی شروع کرنا بھی دشوار امر ہے"۔

یہ ہے جو اس نے اُس شام مجھ سے کہا ——— لیکن وہ مجھے اطالیہ میں آملیگا۔ اس نے مجھ سے آنے کے متعلق اجازت چاہی اور کوئی وجہ نہ تھی کہ میں انکار کرتی۔ لیکن اگر وہ آیا تو وہ روتھ سے شادی نہ کرسکیگا ——— میرے دل پر پھر امید کی حکومت ہے۔ میں خیال کرتی ہوں۔ ہاں میرا خیال ہے میں ایکبار پھر خوشی کی ملکہ ہونے والی ہوں، بہت عرصہ ہُوا میرا یہی خیال تھا۔ میں نے اپنے تعلقات کے رنگین قصر کو مسمار کردیا۔

کیا میں نے اسے بچا لیا ہے؟
یہ مجھے اطالیہ میں معلوم ہوگا۔

(میری لنگیم) حنیف ہاشمی

دنیائے ادب

شام عید

میری نظروں میں ہے وہ انجمن بزمِ حسن — وہ جنونِ تپشِ عشق وہ خوئے رمِ حسن
بزمِ ہستی پہ ہے چھایا ہوا اک عالمِ حسن — ذرّہ ذرّہ نظر آتا ہے مجھے محرمِ حسن

ایک مہتاب لطافت کی جھلک دیکھی ہے
حسن دیکھا ہے کہ پھولوں کی مہک دیکھی ہے

اُس کی آنکھوں سے ہے سرمستیٔ صہبائے بہار — اُس کے جلووں سے ہے رنگینیٔ گلہائے بہار
روحِ تنویر ہے وہ انجمن آرائے بہار — سامنے اُس کے اگر آئے تو شرمائے بہار

اُس کی باتوں سے محبت کا فسانہ رنگین
اُس کی اِک برقِ تبسم سے زمانہ رنگین

عشقِ پامال کہاں حسن سرافراز کہاں — دامنِ عرش پہ ہو خاک کی پرواز کہاں
میری تقدیر میں وہ انجمنِ ناز کہاں — اتفاقات یہ ہوتے ہیں خدا ساز کہاں

فلکِ حسن کے تارے سے محبت ہے مجھے
اپنی تقدیر کی رفعت سے شکایت ہے مجھے

(ہمایوں)

فلسفی

دنیا کا ہر ہوسناک فلسفہ کی کتابیں پڑھ لینے سے فلسفی نہیں ہو سکتا۔

(۱) مطالعہ قدرت کے سوا جس فلسفی کی زندگی کا کوئی دوسرا مقصد بھی ہو وہ کامل فلسفی نہیں کہا جا سکتا

(۲) جو فلسفی لذائذیات و کوائف زندگی سے متاثر ہو سکتا ہو وہ فلسفہ کی حقیقت سے بہت دور ہے۔

(۳) جس فلسفہ میں زبان اور اعمال کی سنجیدگی اور متانت بدرجہ اولیٰ نہ پائی جائے اور جن کی زندگی کی روش اور معاشرت کا طریقہ ملکانہ اور اعمال صالحہ سے خالی ہو وہ فلسفی نہیں بلکہ ایک نقلی جواہر۔ ایک کھوٹا سکہ اور مصنوعی مال ہے جو فلسفیانہ زندگی کے معیار پر چڑھکر ہمیشہ کھوٹا ثابت ہوگا۔ اور اُسے حقایق کی صلاحیت اُس کی طبیعت میں پیدا نہیں ہو سکتی جب تک کہ نفس نفسانیت کی آلودگیوں سے پاک نہ ہو۔ احساس قدرت ہو نہیں سکتا۔ جبتک کہ علایق دنیوی زنجیر پا ہوں اور اسرار کائنات کی عقدہ کشائی ناممکن ہے تاوقتیکہ شہرت، عزت

دولت . . . . . کے عارضی جذبات کے علائق سے آزاد ہونا نصیب ہو۔
جو فلسفی آجتک دنیا کی علمی مجلسوں کے شمع محفل ہیں اُن کی زندگی کے عجیب و غریب افسانے عام نگاہوں میں مجنونانہ کہے جائیں گے لیکن اُن کی زندگیاں نفس کشی کے ایسے عدیم المثال نمونے ہیں جن کا پورا ادراک معمولی دماغ کی قدرت سے باہر ہے پھر کیا نفس کشی مذہب کی سب سے پہلی تعلیم نہیں ہے؟

ہرقیطس نے جاہ و دولت کو لات مار کر حکومت کے عتاب کا شکار ہونا گوارا کیا۔

ہرمیس نے اپنی آبائی دولت و عزت کو خیرباد کہکر اپنی تمام عمر تلاش حقیقت میں گذاری۔

انکساغورس نے اپنی تمام ذاتی وجاہت اور آبائی جائداد حقائق زندگی ولازوال دولت حاصل کرنے پر قربان کر دی اور پیشانی پر بل بھی نہ لایا۔

دیمقراطس نے جس کے باپ دادا کو کسریٰ جیسے شہنشاہ کی مہمانداری کا فخر حاصل تھا اپنی ساری املاک کو خیرباد کہکر مصر کی درسگاہوں میں اپنی عمر صرف کر دی اور جب وطن واپس آیا تو نان شبینہ کے لئے محتاج تھا!

دیوجانس کی تمام تر کائنات ایک عصا اور ایک پیالہ تھا۔ لیکن جس دن اُس نے ایک بچے کو اوک سے پانی پیتے دیکھا تو اُس پیالہ کو پھینک دیا اور یہ خیال کیا کہ دیوجانس جب تیری پیاس چلو سے بجھ سکتی ہے تو پیالہ کا رکھنا نفس کی تعیش کو قایم رکھنا ہے۔ اس لئے تن آسانی کا یہ ذرا سا سلسلہ بھی کیوں قائم ہے۔ ان حکما کی زندگی میں تزکیہ نفس کی عجیب عجیب مثالیں نظر آتی ہیں۔

فیثاغورس اپنے شاگردوں کو تزکیہ نفس کا اولین اُصول اس طرح سکھایا کرتا تھا کہ پانچ سال تک بات چیت کرنے کی ممانعت کر دیتا تھا۔

فلاطون کو تمام عمر میں صرف ایک دفعہ ہنسی آئی۔

دیمقراطس نے یہ دیکھ کر کہ اُس کے محسوسات خارجی اُس کے قوائے متفکرہ کی راہ میں حائل ہیں۔ اپنے ہاتھ سے اپنی آنکھیں نکال ڈالیں۔

اسوہ حسنہ

کل صراحی کی تھی مٹی اب ہے پیمانے کی خاک
اپنی حد میں کروٹیں لیتی ہے میخانے کی خاک

دوری منزل سے ہے واماندگی بھی شوق بھی
بیٹھتی اُٹھتی چلی جاتی ہے دیوانے کی خاک

چلتے ہی باد بہاری ہو گیا میدان صاف
تھی مگر زندان کی دیواروں میں ویرانے کی خاک

جذب کامل کی بدولت اُٹھ گیا فرق دوئی
اب بجائے شمع لو دیتی ہے پروانے کی خاک

دیکھ لینا وادی وحشت سے تا میدان حشر
آگے آگے ناقہ پیچھے پیچھے دیوانے کی خاک

توبہ کیا ہو ترک مے ہے میری فطرت کے خلاف
دل کا پیمانہ بنا ہے لے کے میخانے کی خاک

زلزلوں سے قبر ٹوٹی قبر سے آندھی اُٹھی
قید ہو کر رہ نہیں سکتی تھی دیوانے کی خاک

آرزو اب کس جگہ دیں کہاں آنسو بہائیں
ایک کر دی آسماں نے اپنے بیگانے کی خاک

مبصر لکھنؤ

سندھی

پند و نصائح

اگر تم اپنا مکان پہاڑی پر بناتے ہو تو جنگلی درندوں سے کیوں خوف کھاتے ہو؟

اگر تم اپنا مکان سمندر کے کنارے بناتے ہو تو اُس کی لہروں کا کیا ڈر ہے؟

اور اگر تمہارا مکان شہر میں ہے تو شور و غوغا سے کیوں خائف ہو؟

اس دنیا میں ہمیں مدح و توصیف اور طعن و تشنیع کو بلا چون و چرا برداشت کرنا چاہیئے۔

اگر نیک تباہ و برباد بھی ہو جائیں تو وہ نیک ہی رہیں گے۔

لیکن اگر بد تباہ ہوں تو وہ کہیں کے نہیں رہتے۔ اگر سونے کا برتن ٹوٹ جائے تو وہ پھر بھی سونا ہی رہتا ہے۔

لیکن اگر مٹی کا برتن ٹوٹ جائے تو وہ کسی کام کا نہیں رہتا

اے وہ جو محنتوں اور مشقتوں سے زر و مال کماتا ہے اور اسے ضائع ہونے سے بچانے کے لئے زمین میں دبا دیتا ہے۔ جب تیری روح اس قفس عنصری سے پرواز کر جائے گی تو یہ تیرے کس کام آئے گا۔

سنسکرت

خزاں

کنول کے شگفتہ پھول کی سی آنکھوں کے ساتھ اپنے دلفریب چہرے کو دیکھنے کیلئے خزاں نے اپنی بادلوں کی انگیا میں سے سورج کا آئینہ نکالا

شہد کی مکھی

اے شہد کی آوارہ مزاج مکھی۔ اب ان پھولدار جھاڑیوں کی طرف متوجہ ہو۔ جو تیرا بار برداشت کر سکتی ہیں تو بلا وجہ چنبیلی کی ان کلیوں کو کیوں ستاتی ہے جس میں ابھی غبار گل تک پیدا نہیں ہوا

چاندنی

چاندنی کی سفید روشنی آکاس سے آکر دھرتی پر پڑ رہی تھی۔ ہاتھی تاریک جنگلوں میں اسے دیکھتا اور پانی سمجھ کر رک جاتا تھا۔ بلی جو کہیں اسے دودھ سمجھ کر چاٹتی تھی اور مزانہ پاکر حیران ہوتی تھی اور ایک کنواری بستر پر اسے اپنا سفید دوپٹہ سمجھ کر اپنے گرم جسم سے لپٹنا چاہتی تھی لیکن ناکام رہتی۔

انگریزی

وکٹر ہیگو ایک خوش بیان کی حیثیت سے

۹ بجے کے قریب وکٹر ہیگو کے خیالات نہایت بلند فضاؤں میں پرواز کرتے اس وقت وہ خدا کے صفات اور دعا کی ضرورت الحاد اور مادہ پرستی کی حماقت پر بحث کرتا۔ "خدا کی ہستی سے انکار کرنا کس قدر حماقت آمیز ہے! خدا موجود ہے مجھے اس کا ایسا ہی یقین ہے جیسا کہ اپنی ہستی کا۔ اگر خدا نے مجھے فرصت دی تو میں ایک کتاب لکھوں گا جس میں دکھاؤں گا کہ دعا مانگنا کس قدر روح پرور اور ضروری ہے۔ اور میرا تو یہ حال ہے کہ متواتر چار گھنٹے دعا کے ..... بغیر نہیں رہ سکتا۔

میں خدا سے کیا مانگتا ہوں؟ مجھے طاقت دے۔ میں نیک و بد میں تمیز کر سکتا ہوں لیکن میں کمزور ہوں اور مجھے اپنی کمزوری کا احساس ہے میں خود اس امر کے ناقابل ہوں کہ جس چیز کو نیک جانتا ہوں اس کو کر سکوں۔ میں صرف خدا کے سہارے پر زندہ رہتا ہوں۔ ہمارا وجود اس کے دم سے ہے۔ ہماری زندگی اور نقل و حرکت غرضیکہ ہر شے صرف اسی سے ہے

وہ خالق عالم ہے لیکن یہ کہنا صحیح نہیں کہ اس نے دنیا کو پیدا کیا وہ ابدی طور پر خلق کرتا ہے۔ وہ کائنات کی روح ہے۔ وہ لامحدود "انا" ہے وہ۔ تم سو رہی ہو"۔

یہ الفاظ وہ اپنی بیوی سے کہتا جو کھانے کے وقت سے ایک بازو والی کرسی میں آرام سے بیٹھی ہوتی۔ اپنے خاموش تصورات سے بیدار ہو کر اپنی زخمی معصومیت کی تمامتر قوت کے ساتھ وہ احتجاج کرتی "تم کس طرح کہہ سکتے ہو کہ جتنا عرصہ تم نے باتیں کیں میں سوتی رہی"

ہندوستانی آرٹ

برطانیہ عظمیٰ کی نارمنوں کی فتح کے وقت ہندوستان کی سرزمین میں بھی ایک معرکہ انقلاب برپا تھا۔ یہ مسلمانوں کا حملہ تھا جو تین ہزار برس قبل کے آرین نو واردوں کی طرح شمال مغرب کے پہاڑی راستوں سے ہندوستان کے میدانوں میں اُتر آئے تھے۔ وہ ایک خاص مذہب ایک تہذیب اور فن کے معیار اپنے ساتھ لائے تھے اور ان میں اور ہندوؤں میں باہم بہت فرق تھا ہندوستان کے آرٹ اور خصوصاً فن تعمیر میں اُنہوں نے ایک نمایاں اضافہ کیا۔ اکثر ممتاز ترین عمارتیں۔ آگرہ کا شہرہ آفاق مقبرہ تاج محل اور دیگر شہروں کی مسجدیں اور محلات ان کی دماغی قابلیت کی اختراع ہیں۔ اسی طرح ہندوستان کے فن مصوری میں بھی اُنہوں نے نہایت قابل قدر اضافہ کیا۔ مغلیہ آرٹ کی تصاویر صحت، تفصیلات کی باریکی اور لطافت کے لحاظ سے نہایت قابل تعریف ہیں اور مصوروں نے آرٹ کے اس پہلو پر خاص طور پر موشگافی کی ہے۔ مغلیہ آرٹ کا مقصد تصوریت کی بجائے واقعیت ہے اور مصور ان تمام اشیاء کو نہایت وفاداری کے ساتھ صفحہ قرطاس پر رکھ دیتا ہے جو وہ دیکھتا ہے۔ چنانچہ مغلیہ آرٹ کی کسی فطری منظر کی تصویر میں درختوں کی اقسام کو نہایت آسانی سے پہچانا جا سکتا ہے۔ اور وہ یہی مقام ہے جہاں پر فاتحین کا آرٹ مفتوحین کے دیسی آرٹ سے جس کے نمایاں پہلو تصوف آمیز دلکشی اور سادگی ہیں۔ تفاوت رکھتا ہے۔ ہندوستانی آرٹ کی اس خاص شان کا انحصار ہندوستانی مصور کے مطمح نظر پر ہے۔ ہندوستانی مصور یا سنگتراش ہندوستانی فلسفی کی مانند مادی عالم کو طلسم فریب سمجھ کر کچھ اہمیت نہیں دیتا۔ بلکہ وہ کسی شے کی ظاہری شکل و صورت کی بجائے اس حقیقت کی ترجمانی کی کوشش کرتا ہے جسے وہ مجاز کے پردے میں دیکھتا ہے۔ جب ایک ہندوستانی مصور کسی دیوی یا دیوتا کی لامحدود طاقت کا تصور ظاہر کرنا چاہتا ہے تو وہ ایک ایسی صورت بناتا ہے جس کے بازوؤں اور سروں کی تعداد غیر فطری طور پر زیادہ ہوتی ہے۔ ایک مغربی کے لئے جو اس کے انداز بیان سے اچھی طرح واقف نہ ہو۔ تصویر نہایت مضحکہ خیز ہوگی۔ لیکن ایک ہندوستانی کے لئے ایسا نہیں ہے وہ ان خاص تصنع آمیز اشکال سے جن کو مصوری اور ادب میں خاص طور پر برتا جاتا ہے اُن کے روایتی ہونے کی وجہ سے اچھی طرح مانوس ہوتا ہے اور جانتا ہے۔ مثال کے طور پر بھگوت گیتا کا یہ اقتباس پیش کیا جا سکتا ہے جس میں بیان کیا گیا ہے کہ میدان جنگ کا ہیرو کشف کی حالت میں خدا کو اسکی اصلی شکل و صورت کیساتھ دیکھتا ہے اور اس طرح بیان کرتا ہے۔

"اے لامحدود میں تجھے ہر جگہ تیرے بیشمار چہروں۔ آنکھوں بازوؤں اور سینوں کے ساتھ دیکھتا ہوں"

"ہندوستان ریویو" الہ آباد

یونانی

موت کیا ہے

بادہ خوار جب دنیا کے الام و مصائب کی اُلجھنوں سے آزاد ہو کر میکدے میں بیٹھتے ہیں پیمانہ گردش میں ہوتا ہے۔ اور ہر طرف نا و نوش کی صدا بلند ہوتی ہے۔ اُس وقت یہ آواز جو اُن کے دل سے نکلتی ہے عام طور پر سُنی جاتی ہے "خوشی کی گھڑی بہت مختصر ہے اور یہ پھر ہمیں نصیب نہ ہوگی" گویا کہ موت کے بعد سب سے پہلے انہیں شراب کی تشنگی ستائے گی۔ ان کی سب سے بڑی خواہش شراب کیلئے ہوگی اور اس کیلئے اُن کا حلق خشک ہو رہا ہوگا لیکن وہ نہیں جانتے کہ جب دل اور جسم ایک مدہوشی کی حالت میں آرام کر رہے ہوں تو کوئی شخص زندگی کی تمنا نہیں کرتا۔ کیونکہ ہماری موت پر ہمارے عناصر میں ایک ہنگامہ اور پریشانی کا آغاز ہوتا ہے اور جسم میں ایک بار موت کی خنکی آ کر وہ پھر بیدار ہونے کے قابل نہیں رہتا۔

لیکن خیال فرمائیے کہ اگر فطرت اشیا اچانک آواز اٹھا کر ان الفاظ میں ہمیں ملامت کرے "موت تجھ پر اتنی بھاری کیوں ہے اے فانی انسان ؟ تو ہمیشہ بیزار کن نالہ و ماتم کی آواز بلند کرتا ہے۔ احمق اگر تیری زندگی بہت پر مسرت تھی اور تیرا ہر روز روز عید اور ہر شب شب برات تھی نواب تو

ایک مہمان کی طرح جو مجلس سے اُٹھ کر آرام کیلئے خلوت میں چلا جاتا ہے اس عظیم الشان سکوں سے ہم آغوش نہیں ہوتا جو موت نے تیرے لئے تیار کیا ہے اور جس میں کوئی فکر و مصیبت نہیں۔ اور اگر تو تمام زندگی اپنے مصائب کا ماتم گسار رہا ہے تو اب اس مصیبت کی زندگی کے ختم ہونے پر یہ کیا چیخ و پکار ہے کیونکہ میرے پاس اب کچھ نہیں ہے کہ میں تجھے دیکر خوش کر سکوں۔ تمام اشیاء اپنی فطرت پر ہیں اور اُن میں کوئی تغیر نہیں آیا۔ اگر تیرا جسم ضعیف نہیں اور اعضا بھی صحیح و سالم ہیں تو کیا ہے۔ ہر ایک شے اپنی حالت پر رہتی ہے۔ اور اگر تو ہزار سال کیا ہمیشہ کیلئے بھی زندہ رہے تو تیرے عناصر میں کبھی تغیر نہ آئیگا۔"

فرانسیسی

نفع نقصان

ایک یونانی فلسفی نے شہر میں تجہیز و تکفین کا سامان فروخت کرنے والوں کو بہت ملامت کی ہے۔ اس کا خیال تھا کہ اس پیشہ کے آدمی کافی نفع کماتے ہیں اور یہ نفع تا وقتیکہ بہت سے لوگ نہ مریں ان کو نہیں مل سکتا۔ یہ نظریہ مجھے صحیح معلوم نہیں ہوتا۔ کیونکہ کوئی شخص اس وقت تک فائدہ نہیں اُٹھا سکتا جبتک کہ دوسرے کا نقصان نہ ہو اور یہی وجہ ہے کہ اکثر لوگ ہر قسم کے نفع کو اپنے لئے اچھا نہیں سمجھتے۔ ایک سوداگر صرف اُسی حالت میں متمول ہوتا ہے جبکہ نوجوان زیادہ شوقین اور فضول خرچ ہوں۔ اور غلہ فروخت کرنے والا اُس وقت خوش ہوتا ہے جس وقت شہر میں کال پڑ رہا ہو۔ یہی حال وکیل کا ہے اسکی چاندی ہمیشہ مقدموں اور لوگوں کے باہمی لڑائی جھگڑے میں ہوتی ہے اور اعزاز و اکرام اور مذہبی رسومات کی بناء بھی تو ہماری موت پر ہے

ایک قدیم یونانی مقولہ ہے کہ کوئی حکیم اپنے احباب کو اچھی صحت میں دیکھ کر خوش نہیں ہوتا۔ اور اسی طرح کوئی سپاہی شہروں کے امن و امان اور فوجوں کے سکون سے مطمئن نہیں ہو سکتا۔ میں کہتا ہوں ہم میں سے ہر ایک اپنے ضمیر کا جائزہ لے اور وہ دیکھے گا کہ ہماری دلی تمنائیں اور آرزوئیں دوسروں کو نقصان پہنچانے کی اُمید پر پرورش پاتی ہیں۔ میرا خیال روز بروز مضبوط ہوتا جاتا ہے کہ تمام قوانین فطرت اس اصول کے ماتحت ہیں۔ اطبا ہمیں بتاتے ہیں کہ پیدائش فراوانی اور زیادتی تبدیلی اور موت کی دلیل ہے۔

جرمنی

موسیقی

لیکن موسیقی کیا ہے؟

رات یہ خیال سونے سے پہلے متواتر ایک گھنٹہ تک میرے ذہن میں رہا میں کہہ سکتا ہوں کہ موسیقی میں کوئی حیرت انگیز اور لغریب عنصر ہے اور یہ عنصر کیا ہے۔ خیال اور بصر کی حد فاصل یا روح اور مادے کی درمیانی کڑی ہے جو دونوں سے ہم آغوش اور نہ دونوں سے متفاوت ہے۔ یہ ایک روح ہے جسے وقت اور مادے کے بچانے کی ضرورت ہے۔ جو اسے مکان کی بندشوں سے آزاد کرتی ہے ہم نہیں جانتے کہ موسیقی کیا ہے۔ لیکن یہ کہ موسیقی کس قدر عالم فریب ہوتی ہے۔ یہ ہم سب جانتے ہیں اور یقیناً جانتے ہیں۔ یہ بھی جانتے ہیں کہ اچھی اور بری موسیقی میں کیا فرق ہے۔ کیونکہ ہم عام طور پر بُری موسیقی سُنتے ہیں

موسیقی کی تنقید کی بنا ہمیشہ تجربہ پر ہوتی ہے۔ تجزیہ پر نہیں۔ اس سے موسیقی کی اقسام مقرر کی جاتی اور قوانین بنائے جاتے ہیں۔

لیکن موسیقی کے بنانے سے زیادہ غیر تسلی بخش اور کوئی شے نہ ہوگی۔ اس میں شک نہیں کہ یہاں قوانین اور صحیح قوانین ہوتے ہیں۔ لیکن یہ قوانین موسیقی نہیں ہوتے یہ صرف ایک مقصد کے حصول کے ذرائع ہوتے ہیں اور فن پیکر نگاری میں جو اہمیت مو قلم اور رنگ کی ہے وہی موسیقی میں قوانین کی ہوتی ہے۔ مو قلم اور رنگ تصویر نہیں ہوتے بلکہ اس کے حصول کا ایک ذریعہ ہوتے ہیں۔

موسیقی کی روح الہام ہے۔ اور اس سے زیادہ اور کچھ نہیں کہا جا سکتا کہ موسیقی کی تنقید کی بنا صرف تجربے اور مشاہدے پر ہوتی ہے۔

بنگالی

انسان کا مذہب

وہ مذہب جو ہمیں خارجی نوشتوں سے ملتا ہے کبھی ہمارے دل کا مذہب نہیں ہوتا۔ بلکہ وہ محض ایک عادت ہوتا ہے جس کی زنجیروں میں ہم جکڑے رہتے ہیں لیکن اپنے دل کا مذہب اختیار کرنا انسانی زندگی کا سب سے بڑا کارنامہ ہے انتہائی مصائب اور تکالیف کا رفیق بنتا ہے اور خون حیات پر زندہ رہتا ہے اور پھر خواہ وہ انسان کے دل کو مسرت اور آنند سے معمور کرے یا نہ کرے۔ لیکن اس کی یاترا ضرور خوشی پر جاکر ختم ہوتی ہے۔

ہم اس امر کا بہت کم احساس کرتے ہیں کہ جو مذہب ہم لوگوں سے سنتے یا اپنی زبان سے رٹتے رہتے ہیں۔ حالانکہ ہمارے دل میں حقیقت کا مندر بتدریج تعمیر ہو رہا ہے۔ وہ مذہب کس قدر فریب کاہے جب ہم اپنی مسرتوں اور غموں سے ایک طرف ہو کر اُن پر نظر کرتے ہیں اور وقت اپنی تیز رفتاری سے اُڑا چلا جاتا ہے۔ ہم اس لافانی قصّے کے اسرار معلوم نہیں کر سکتے۔ اس کی مثال بالکل اس جملہ کی سی ہوتی ہے جس کا مفہوم ہم الفاظ کے گورکھ دھندے میں پڑکر دریافت نہیں کر سکتے۔

جب ایک بار ہمیں اس تعمیر کے قانون کی وحدت کا ادراک ہوجاتا ہے جو ہمارے دل میں ہو رہی ہے تو ہم اپنے اور پراسرار کائنات کے رشتے سے بھی آگاہ ہو جاتے ہیں۔ ہم کو اس امر کا بھی احساس ہوجاتا ہے کہ ابھی ہماری اور آسمان کے نورباس کرّوں کی تخلیق ہو رہی ہے اور ہماری آرزوئیں اور تمنائیں ایوان کائنات میں اپنا صبح شام تلاش کر رہی ہیں۔ ہو سکتا ہے کہ ہم نہ جان سکیں کہ کیا ہو رہا ہے۔ ہم خاک کے ایک ذرّے کے متعلق بھی یقین سے کچھ نہیں کہہ سکتے۔ لیکن جب ہم محسوس کرتے ہیں کہ ہماری زندگی کی رو خارجی عالمگیر زندگی کی روح سے ہم آہنگ ہے تو ہماری تمام خوشیاں اور غم سکون اور اطمینان کے ایک رشتے میں منسلک نظر آتے ہیں اس حقیقت کا احساس کہ 'میں ہوں' 'میں حرکت کرتا ہوں' 'میں نشو و نما پاتا ہوں' صرف اُسی وقت ہو سکتا ہے جب ہم اس حقیقت سے بھی روشناس ہوجائیں کہ کائنات کی ہر شے میری ہمنوا ہے اور میرے بغیر خاک کا ایک ذرہ بھی برقرار نہیں رہ سکتا۔ خزاں کی اس دلفریب اور دلکش صبح۔ اس عظیم نور سے میری روح کا نہایت قریب کا رشتہ ہے۔ یہ تمام عالم رنگ و بو اور موسیقی میری روح اور کائنات کی مخفی ہم آغوشی کا رنا ہیں۔ یہ ہم آغوشی جن کا مجھے احساس ہو یا نہ ہو میرے دل کو آمادہ کار رکھتی ہے۔ میری داخلی اور خارجی دنیا اُن کی اس ہم آغوشی سے مجھے مذہب حاصل ہوتا ہے یہ اور بات ہے کہ وہ کم ہے یا زیادہ یہ میری استعداد پر منحصر ہے اور مجھے آسمانی نوشتوں کو اس سے پیشتر کہ میں انہیں اپنا بناؤں۔ اسی رونما ہیں دیکھنا ہے۔

تلنگو

برسات

تاریک بادلوں میں سے برق کی رقاصہ نے دیکھا کہ کیساری کے پھول کھل چکے ہیں یا ابھی اس کی کونپلیں ہی پھوٹ رہی ہیں۔ دلفریب مندرا کے شگفتہ پھول فضا میں لہرا کر دلکش آواز میں شہد کی محو پروانہ مکھی کا خیر مقدم کر رہے تھے نوک دار چٹانوں کے پہلو میں کنول کے غنچوں کی سی آنکھوں والی تیز رفتار اور محبت پاش پہاڑی ندی مچل رہی تھی کہ جاکر اپنے پریتم ناپیدا کنار سمندر سے ہم آغوش ہوجائے۔ مدہوش اور مست دوشیزہ زمین کی شرمگین ادائیں زمردیں چراگاہوں میں لرزشیں پیدا کر رہی تھیں۔ آہ! کالے کالے بادلوں کی بلند آہنگ موسیقی! مور کا پُرمسرت ناچ۔ آہ یہ حقیقت ہے کہ یہ پُرمسرت کنج خدائے رقص کی رقص گاہ ہے۔

تامل

بوڑھی ماں

ایک بوڑھی عورت کو جس کے جسم پر بڑھاپے کی وجہ سے جھُریاں پڑ گئی تھیں اور ہاتھ پاؤں سوکھ کر ہڈیاں رہ گئے تھے بتایا گیا کہ اس کا

بیٹا بزدلی سے میدان جنگ سے اپنے ہتھیار چھوڑ کر بھاگ گیا ہے۔ شرم نے بڑھیا کے کلیجے میں برچھی ماری اور اس نے غضبناک ہو کر کہا۔ جری اور بہادر سورماؤں کا یہ بزدل جانشین میرا بیٹا نہیں ہو سکتا۔ اگر وہ واقعی مرنے کے ڈر سے بھاگ نکلا ہے تو میں اپنی چھاتیاں جنہوں نے اسے دودھ پلا کر پرورش کیا ہے کاٹ دوں گی۔ لیکن میرا دل کہتا ہے میرا بیٹا میدان سے نہیں بھاگ سکتا یہ کہتے ہوئے اُس نے غصہ سے دیوانی ہو کر کٹار کھینچ لی اور مجنونانہ میدان جنگ کی طرف بھاگی۔ آہ! یہاں آخر کار لاشوں کے پشتوں میں اسے اپنے بیٹے کی لاش مل گئی۔ اُس کے ہاتھ پاؤں سب کٹ چکے تھے صرف خون میں نہایا ہوا دھڑ باقی تھا لیکن بڑھیا کا دل خوشی اور مسرت سے معمور ہو گیا۔ وہ اپنے بیٹے کی شہادت پر فخر کر رہی تھی اور اُس دن سے بھی زیادہ خوش تھی جس دن اُس جانباز نے جنم لیا۔

کشمیری

بے ثباتی

ابھی میں نے ایک دریا بہتا دیکھا تھا۔
اب پل ہے نہ کوئی کشتی۔
ابھی میں نے پھولوں سے لدی ایک جھاڑی دیکھی تھی۔
اب پھول ہے نہ کوئی کانٹا۔
ابھی میں نے ایک چولھا جلتا دیکھا تھا۔
اب دھواں ہے نہ کوئی شعلہ
اور آہ! ابھی میں نے تمام پانڈوں کی ماں کو دیکھا تھا۔
اور اب میں ایک کمہار عورت کو دیکھتی ہوں۔

تلاش دوست

غافل۔ پو پھٹ چکی ہے تیزی سے قدم اُٹھا اور تلاش دوست میں کھو جا
دیکھ صبح ہونے کو ہے۔ اپنے پر پیدا کر اور تلاش دوست میں نکل جا۔

"میں لالہ اس کی تلاش اور جستجو میں نکلی۔ میں نے اپنی بساط سے زیادہ مشقت کی اور اپنے آپ کو بن بن پھرنے سے تھکا لیا۔ میں نے اُسے دیکھا۔ لیکن اُس کے دروازے مقفل تھے۔ اور وہ میرے اس دل میں تھا جس میں اس کے وصال کی خواہش تھی اور میں کھڑی اُس کے جمال کو دیکھ رہی تھی۔"

"لال دو"

مرہٹی

جس طرح دریا اپنی ہستی کو سمندر سے ہم آغوش ہو کر فنا کر دیتا ہے اسی طرح دلھن بھی خاوند کے گھر میں جا کر غیر نہیں رہتی۔

یہ صرف شادی نہیں ہوتی بلکہ ان کی زندگیاں محبت میں ایک ہو جاتی ہیں اور آسمانی وحدت کی یہ کیفیت الفاظ میں بیان نہیں ہو سکتی۔

محبت کا یہ رشتہ زندگی کے سمندر کی خوشی اور غم کی لہروں میں بھیگ کر ہمیشہ کے لئے مضبوط ہو جاتا ہے۔

خاوند اور بیوی کے دلوں پر کارکنان قدرت ہمیشہ امرت کے چھینٹے دیتے ہیں جس پر خوشی اور غم کا یہ رشتہ زیادہ مضبوط زیادہ الہامی اور زیادہ دلفریب ہو جاتا ہے۔ خاوند اور بیوی کے تعلقات ہمیشہ پاکیزہ محبت سے خوشگوار رہتے ہیں اور محبت کی معطر اور ٹھنڈی ہوا سے ان کی دنیا کی فضائیں معمور رہتی ہیں۔

صرف وہی میاں بیوی کہلانے کے مستحق ہیں جن کی روح ایک ہو گی اُن کے جسم اور خیالات جُدا جُدا ہوں۔

وہ زندگی کی گاڑی میں دو پہیوں کی مانند ہیں اور یہ گاڑی کو ایک دوسرے کی مدد کے بغیر حرکت نہیں کر سکتی۔

جہاں میاں بیوی کے یہ تعلقات نہیں ہیں وہاں زندگی نہایت بیزار کن ہے خاوند بیوی کے بغیر اپاہج ہے۔

جب تیل اور بتی دونوں ملتے ہیں تو نور کی لاٹ جلتی ہے۔
صرف روحوں کے اتحاد سے دنیا قائم ہے۔

پالی

آزادی کا سانس

ہر چند میں ضعیف و کمزور ہوں اور میری جوانی کی بہار رخصت ہو چکی ہے۔ میں اپنے عصا کے سہارے پہاڑ کی بلند ترین چوٹی پر

چڑھنے میں کامیاب ہوگیا ہوں۔

میں نے اپنی گدڑی اُتار کر پھینک دی ہے اور کشکول اوندھا کر دیا ہے۔ میں یہاں چٹان پر بیٹھا ہوں میری روح آزادی کے سانس لے رہی ہے۔ آہ میں نے حاصل کرلیا ہے۔ کرلیا ہے۔ کرلیا ہے۔ وہ گیان وہ عرفان حاصل کرلیا ہے۔ جس کا بدھ متلاشی تھا۔

گھر بار میں چھوڑ چکا ہوں کیونکہ میں نے اپنی دنیا کو ہی تیاگ دیدیا ہے۔ میں نے اپنے بچے کو چھوڑ دیا ہے۔ اپنی خوبصورت اور سفید سفید بھیڑوں کو چھوڑ آیا ہوں۔ خواہشات سے اب میں آزاد ہوں اور دل کا کینہ اور بغض بھی جا چکے ہیں۔ جہل کی تاریکی منتشر ہو چکی ہے۔ حرص و آز شکست کھا کر میرے پاؤں میں لوٹ رہے ہیں۔ اور میں اب آزاد ہوں۔ میرے دل کو سکون حاصل ہے۔ میں گیان میں مگن ہوں۔

ہندی

آقا

اے پیارے آقا! اے چشمۂ مسرت! اے کائنات کے محبوب! تیری تعریف ہو۔ تو عالم القلوب ہے۔ دلوں کے بھید جانتا ہے۔ اے رحمٰن۔

داتا تیرے حضور میں جھکتا ہے!

تیری لامکان ہستی ابدیت کے عمیق اور ناپیدا کنار سمندر کی مانند ہے خوشی کی لہریں متواتر اُٹھتی ہیں!۔

لیکن میرا دل بیکل اور مضطرب ہے۔ تیری ظاہری صورت ایسی ہے کہ دیکھ کر میرے دل کی تمام آرزوئیں پوری ہوجاتی ہیں۔ اور داتا یہ جمال حیرت انگیز دیکھ کر تیرے حضور میں سر جھکاتا ہے۔

میں اپنے پیتم کی وفادار ہوں۔ سکھی اس میں شرمانے کی کیا بات ہے دن کے وقت مجھے بھوک نہیں لگتی۔ اور رات میں بچھونے سے آنکھوں میں کاٹ دیتی ہوں۔ میں مصیبتوں اور تکلیفوں کو چھوڑ کر اُس پار چلی جاؤں گی کیونکہ علم کے خزانوں کی کنجیاں مجھے مل گئی ہیں۔ تیرے تمام عزیز واقارب میرے گرد شہد کی مکھیوں کی طرح جمع ہیں لیکن میں اپنے پیتم کی داسی ہوں جو دنیا کے بلند پہاڑوں کا مالک ہے۔ اگر کوئی مجھ پر ہنستا ہے تو مجھے کوئی پروا نہیں

گجراتی

قدرت کے بھید

خدائے مطلق کے بھیدوں کو صرف وہی جان سکتا ہے جس نے اُن پر غور کیا ہے۔

ان بھیدوں کے جاننے کے بغیر انسان گمراہی سے نہیں بچ سکتا اور جبتک گمراہی دور نہ ہوجائے اعمال اچھے نہیں ہو سکتے۔ اور جبتک اعمال اچھے نہ ہوں یہ بھید معلوم نہیں ہو سکتے اور خدائے مطلق کے بھیدوں کو صرف وہی جان سکتا ہے جس نے ان پر غور کیا ہے۔

ان بھیدوں کے جاننے کے بغیر شکوک دور نہیں ہو سکتے۔ اور شکوک دور ہوئے بغیر کوئی شے یقینی نہیں۔ کہانی سُنانے سے اس کا مفہوم ذہن میں آجاتا ہے۔ لیکن ان بھیدوں کو جاننے کے بغیر اصلی زندگی محال ہے۔ اور خدائے مطلق کے بھیدوں کو صرف وہی جان سکتا ہے۔ جس نے ان پر غور کیا ہو۔

لیکن یہ بھی معلوم ہونا چاہئے کہ خدائے مطلق کو جاننے کے بعد کوئی مادی چیز باقی نہیں رہتی۔ صرف لطیف جسم رہ جاتا ہے۔ وہ جان لیتا ہے کہ انسان کی آتما۔ اور پرماتما جس سے تمام کائنات زندگی پاتی ہے۔ ایک ہے! میں بھی جانتا ہوں کہ آتما اور پرماتما ایک ہیں۔ لیکن لوگوں کے لئے یہ اعتقاد چھوڑنا بہت مشکل ہے کہ وہ دو ہیں اور خدائے مطلق کے بھیدوں کو صرف وہی جان سکتا ہے جو ان پر غور کرتا ہے۔

عربی

صداقت و امانت

سچائی اور امانت ایک درخت کی دو ملی جلی شاخیں ہیں۔ یا ایک ماں کے دو جوڑواں بچے ہیں حقیقت یہ ہے کہ امانت سچائی کا دوسرا نام ہے اور سچائی دراصل امانت ہی کا دوسرا پہلو ہے۔ سچائی انسان کی عظمت کی بنیاد ہے امانت باعظمت انسانوں کے دلوں میں گھر کرتی ہے۔ سچائی مروّت کی روح ہے، شرافت کا جوہر اور بزرگی کا حصہ ہے۔ آدمیت کی پہلی شرطوں میں داخل ہے۔ ہم اس زمانہ میں سچائی اور صداقت سے زیادہ کسی چیز کے محتاج نہیں ہیں۔

جھوٹ اگرچہ دنیا میں عام ہو رہا ہے۔ مگر ہر جگہ ہر شخص اُسے بُرا سمجھتا ہے اور تو اور خود جھوٹ بولنے والا آدمی بھی جھوٹ کو بُرا خیال کرتا ہے جب جھوٹا آدمی تم سے قسم کھا کر یہ کہتا ہے کہ میں جو بات کہوں گا اُس میں جھوٹ نہ ہوگا تو دوسرے لفظوں میں وہ یہ کہہ رہا ہے کہ جھوٹ قابلِ نفرت گناہ ہے اور سچائی جہاں بھی ہو اچھی صفت ہے۔

جھوٹ دوسرے گناہوں کی بہ نسبت لوگوں میں سب سے زیادہ عام اور اُن کے لئے سب سے زیادہ آسان ہو گیا ہے معاشرت میں بے تکلف اور بے جھجک برتا جاتا ہے۔ اکثر لوگوں نے اُسے اپنا شعار بنالیا ہے۔ کوئی کسی کو گھر پر پوچھنے آئے تو بے ضرورت کہلا دیا جاتا ہے کہ گھر میں نہیں۔ حالانکہ گھر میں موجود ہوتا ہے۔

رسکن کا قول ہے۔

کہ جھوٹ خواہ کتنا ہی معمولی اور حقیر ہو دل کو ناپاک اور ضمیر کو آلودہ کر دیتا ہے۔"

جھوٹ کی ایک قسم پولیٹکل صورت میں ظاہر ہوتی ہے۔ وہ یہ کہ ملکی مصلحت کیلئے سیاسی رہنما جھوٹ بولنے میں پس و پیش نہیں کرتے لیکن دراصل یہ ایک کمینہ پن اور درجہ کی بزدلی اور ظلم ہے۔ انسان کے فرائض میں یہ داخل ہے کہ زبان سے کوئی بات کہتے وقت اس ضمیر کا زیادہ خیال رکھے جو اُس کے دونوں پہلوؤں میں ہے۔

اہلِ قرطاجنہ (کارتھیج) اور رومیوں کی جنگ کے اثنا میں رومیوں کا مشہور لیڈر ریجیلیوس غنیم کے ہاتھ گرفتار ہو گیا تھا۔ اہلِ قرطاجنہ نے اُسے اس مقصد سے قید سے رہائی دی کہ ممکن ہے روما جا کر اپنے اہلِ وطن کو صلح پر مجبور کر دے۔ مگر اُس سے شرط یہ کر لی کہ اگر وہ صلح پر آمادہ نہ ہوں تو تمہیں ہمارے پاس واپس آنا پڑے گا۔

ریجیلیوس نے یہ شرط مان کر رہائی حاصل کی اُن کی ایک جماعت کے ساتھ روما آیا۔

جب روما میں پہنچا تو رومی حکومت مجلس میں کھڑے ہو کر اُس نے اہلِ روما کو جنگ پر اُبھارا اور اس بات پر زور دیا کہ لڑائی مسلسل طور پر جاری رکھی جائے۔ اور یہ کہ قیدیوں کا تبادلہ ہرگز نہ کیا جائے اس کے بعد اُس نے شرط کے مطابق واپسی کا ارادہ کیا تو روما کے بڑے بڑے لوگوں نے اُسے روکا اور بتایا کہ تمہاری قسم ساقط ہو گئی ہے۔ کیونکہ قیدی کی قسم اختیاری نہیں ہوا کرتی اور ایسی قسم ٹوٹ جائے تو اُس پر کچھ گناہ بھی نہیں ہوتا ہے اس پر ریجیلیوس نے کہا کہ تم روما کی بڑی بڑی شخصیتوں کے لوگ کیا اس لئے جمع ہوئے ہو؟ کہ میری عزت، میری شرافت اور میرے وقار کو زمانے کی گالیوں اور ابدی لعنتوں کے حوالے کر دو۔ میں جانتا ہوں کہ دشمنوں میں میری واپسی دردناک عذاب اور قتل میرا منتظر ہے۔ لیکن اس قتل اور عذاب کو میں اپنے واسطے آسان اور قابلِ برداشت سمجھتا ہوں اس کمینہ پن سے کہ میں وعدہ خلافی کرکے اپنی قسم کو پامال کروں اور اپنے ضمیر کو زخم پہنچاؤں۔

میں دشمنوں کے نرغے میں رہوں یا غنیم کی قید میں ہر حال میں میرے پہلو میں ایک آدمی دل حرکت کرے گا میں نے اُن کے سامنے قسم کھائی تھی کہ میں واپس آؤں گا۔ اب میرا واپس جانا یقینی ہے۔ میں اس قول سے کبھی نہیں پھر سکتا۔ خدا جو چاہتا ہے وہی ہوتا ہے۔"

غرضکہ ریجیلیوس نے وعدہ خلافی کی ذلت گوارا نہ کی اور اپنی بات پورا کرنے کی دشمنوں کے پاس واپس گیا۔ اہلِ قرطاجنہ کو معلوم ہو چکا تھا کہ اس نے جا کر اہلِ روما کو صلح کی بجائے جنگ پر اُبھارا ہے۔ اس لئے اُنہوں نے بڑے بڑے عذاب دیکر ریجیلیوس کو مار ڈالا۔

حقیقت یہ ہے کہ بہادروں اور مردوں کی زندگی ایسی ہوتی ہے۔

شہنشاہ مارکوئس اوریلیس کا قول ہے کہ جو شخص ظلم کرتا ہے وہ کافر ہے اور بے دین۔ کیونکہ جب خدائے تعالیٰ نے انسانوں کو ایک دوسرے کا معاون و مددگار بنا کر پیدا کیا ہے۔ تاکہ ہر شخص دوسروں کی راحت کا سبب بنے اور دنیا سے تکلیف اور مصیبت دور ہو تو جو شخص اس خدائی قانون اور الٰہی مذہب کو توڑتا ہے دراصل وہ بہت بڑا کافر ہے۔ تاجور

(البلاغ قاہرہ)

فارسی

ایرانی ماں کا گیت

اُٹھ ماں تجھ پر قربان! اُٹھ کہ اب تو بہت سو چکا! اُٹھ کہ اب تجھ پر سونا حرام ہے! اُٹھ کہ تیرا باپ آزادی کی راہ میں مارا گیا۔ اور اپنی جگہ تیرے سپرد کر گیا۔ اُٹھ! کہ میرا دودھ تیرے لئے حلال ہو۔ میری جان تجھ پر فدا ہو! تو میرے جگر کا ٹکڑا ہے! تو اپنے باپ کی یادگار رہے!

اُٹھ! کہ میں تیرے باپ کی یہ تلوار تیری کمر سے باندھ دوں اور تجھے میدان جنگ میں بھیج دوں۔ اُٹھ کہ دشمن گھر کے دروازے تک پہنچ چکا ہے اپنے باپ کی جگہ کھڑا ہو اور اس کا بدلہ لے! اُٹھ! میرا دودھ تجھ پر حلال ہو اور میری جان تجھ پر فدا ہو۔ تو میرے جگر کا ٹکڑا ہے! تو اپنے باپ کی یادگار رہے!

اُٹھ! میری دونوں آنکھوں کے چراغ تیرے باپ کے بعد تیری ماں بیکس ہے بیدادرس ہے اور تیرے سوا اس کے لئے کوئی اُمید گاہ اور پشت و پناہ نہیں۔ دشمن دروازہ کی چوکھٹ پر پہنچ چکا ہے۔ اُٹھ اور اپنی ماں کے ناموس کی حفاظت کر۔! اُٹھ کہ میرا دودھ تجھ پر حلال ہو۔ میری جان تجھ پر فدا ہو تو میرے دل کا ٹکڑا ہے! اور اپنے باپ کی یادگار رہے! اُٹھ میرے دل کے پر تو اُٹھ! اپنی آنکھیں کھول کہ میں تیری آنکھوں میں غیرت و شجاعت کے وہ نشان دیکھوں جو تیرے باپ کی نگاہ میں موجود تھے!۔

آہ! تیری آنکھیں تیرے باپ کی آنکھوں کے کس قدر مشابہ ہیں! اُٹھ کہ میرا دودھ تجھ پر حلال ہو! میری جان تجھ پر فدا ہو! تو میرے جگر کا ٹکڑا ہے تو اپنے باپ کی یادگار رہے۔

اُٹھ! میری جان کی روح اُٹھ! کیا تو ناقوس کی آواز اور اپنے بھائیوں کی فریاد نہیں سنتا۔ تیرے رفیق تیرا انتظار کر رہے ہیں اور تجھے مدد کیلئے بُلا رہے ہیں اُٹھ! اور میدان جنگ کی طرف دوڑ! یا تو سربلندی اور فیروزی کے ساتھ واپس آ یا اپنے باپ کی جگہ آزادی وطن کی راہ میں اپنے باپ کی طرح جان قربان کر! اُٹھ کہ میرا دودھ تجھ پر حلال ہو۔ میری جان تجھ پر فدا ہو۔ تو میرے جگر کا ٹکڑا ہے تو اپنے باپ کی یادگار رہے!۔

مہر محمد خاں شہر مالیر کوٹلوی

جاوی

روشنی

ہم روشنی کی اولاد ہیں اور روشنی کس قدر نا پیدا کنار ہے ہمارا بیدار ہونا اور سونا سب روشنی میں ہے۔ ہم روشنی میں جیتے ہیں روشنی میں تیرتے ہیں اور ہماری زندگی ایک کھیل ہے۔

ایک عظیم الشان شامیانے کے نیچے ایک عظیم آفتاب کی شعاعوں میں آہستہ آہستہ بہت آہستہ زندگی کے بیشمار لیمپ جلتے ہیں۔ میں ناپیدا کنار روشنی میں رستہ گم کر چکا ہوں اور اس کی خیرہ کن چمک میں میں اندھوں کی طرح پھرتا ہوں۔ ہم واقعی روشنی کی اولاد ہیں تو پھر ہم روشنی کو دیکھ کر اس سے خائف کیوں ہوں؟ آؤ ہم ہر طرف دیکھیں یہاں کسی کا ڈر نہیں ہے

روشنی کے اس ناپیدا کنار سمندر میں اگر کوئی دیا بجھتا ہے: تو بجھنے دو کون کہہ سکتا ہے کہ یہ پھر کبھی روشن نہ ہوگا۔

اطلاع

بیرونی مضامین کی کثرت کے سبب اس بار "اردو ادب کے اہل طرز" کا مضمون شائع نہیں کیا جا سکا۔ آئندہ نمبر سے شائع ہوگا

(ایڈیٹر)

ہسپانوی

دریا کے اس پار

اے دریا تیرے کناروں پر سرکنڈوں کی قطاریں اُگ رہی ہیں اک لمحے کے لئے اپنے پانی کو ٹھہرا لے مجھے اپنی محبوبہ کے پاس جانا ہے۔ تیرا کوئی پُل نہیں ہے۔ نہ کوئی کشتی ہے۔ پار جانے کا کوئی اور ذریعہ بھی نہیں۔ مجھے یاد ہے تو ایک چھوٹی سی ندی تھا۔ اور میں تیرے پار جانے سے نہیں جھجکتا تھا۔ اس وقت تیری سطح کی لہریں بمشکل میرے گھٹنوں تک آتی تھیں۔ لیکن اب تو پہاڑ کے اس درّے سے آتا ہے۔ تیری پرورش برف سے ہوتی ہے اور تیرے طوفانی پانی میں کیچڑ ملا ہوتا ہے۔ لیکن اب میری اس جلدی کرنے کا کیا فائدہ۔ کیسا فائدہ ہوا مجھے اس قدر کم عرصہ آرام کا؟ اور رات بھر جاگنے کا اگر میں یہاں ٹھہرا رہوں اور اگر کسی ذریعے سے بھی مجھے تیرے اُس پار جانے کی اجازت نہیں۔

اے دریا اپنے پانی کو ایک لمحے کیلئے ٹھہرا لے۔ ہوا زور کی چل رہی ہے اور تیری موجیں جوش سے بڑبڑا رہی ہیں۔ فضا میں ایک عجیب موسیقی رقص کر رہی ہے اے سرکنڈوں والے دریا اپنے پانی کو ایک لمحے کیلئے ٹھہرا لے مجھے اپنی محبوبہ کے پاس پہنچ جانا ہے۔

ملایا

میں دل چاہتا ہوں

میں دل چاہتا ہوں اے خدا مجھے لعل و جواہر کے خزانوں کی ضرورت نہیں مجھے حکومت کی ضرورت نہیں۔ میں عزت نہیں چاہتا۔ اگر مجھے دل مل جائے تو میں اپنی زندگی کو ہر چند کہ وہ تیری نظر میں ناکارہ ہے تیرے حضور میں پیش کر دونگا

میں دل چاہتا ہوں۔ دل ایک قابل پرستش دل۔

میں ایک بچے کا سا معصوم دل چاہتا ہوں۔ اُس کے ہونٹ معصومیت سے لبریز ہوں اور اس کے الفاظ میں بناوٹ نہ ہو وہ یہ بھی نہ جانے کہ لوگوں پر کس طرح آوازے کسے جاتے ہیں اور اُن کی ہنسی اُڑائی جاتی ہے۔ وہ اپنے آپ کو فراموش کر دے اور وہ تیری محبت سے بھر جائے۔ میں ایسا دل چاہتا ہوں

میں آسمانی اور پاکیزہ دل چاہتا ہوں۔

میں خوبصورت اور سحر کار دل چاہتا ہوں۔ وہ پاکیزہ ہو آفتاب سے منور صبح کی مانند اور نرم اتھاہ سمندر کی ہلکی ہلکی آوازوں کی طرح۔ وہ خوشی میں خزاں کے چاند کی طرح ہو اور ایک ایسی جھیل کی مانند ہو جس کو بارش نے کناروں تک بھر دیا ہو۔ میں خوبصورت اور سحر کار دل چاہتا ہوں۔ اس دل سے محبت کرتا ہوں جو محبت کا دیوانہ ہے۔ جو دوسروں سے اُن کی خوشی کی اُمید میں محبت کرتا ہے۔

ڈچ

آرزو

یہ کیا ہے کہ تو اُداس ہے۔ بال پریشان ہیں اور چہرہ اُترا ہوا ہے۔ حالانکہ دنیا کی ہر چیز خوش نظر آتی ہے۔ تیری گلابی آنکھوں سے معلوم ہوتا ہے کہ تو رو رہی تھی آہ کس قدر آنسو بہے ہوں گے۔!

اگر میں دوسروں کو کیا میرا کوئی شریک غم نہیں ہے صرف میرے دکھی نغمے ہیں اس سے سمونے ہیں آہ! جب میرا دل گھٹنے لگتا ہے آنسو۔ یہ کہ میرے دل سے بوجھ اُٹھا دیتے ہیں۔

دیکھو میں تیرا خوش نصیب دوست ہوں اور تجھے بُلاتا ہوں۔ آہ! مجھے اپنے دل کا غم بتا شاید میں کوئی مداوا کر سکوں۔ تو شور و غوغا سے میرے دل کو اور ٹھیس لگاتا ہے۔ تو نہیں جانتا کیا غم ہے جو اسے کھائے جاتا ہے۔ اور کیا خون شدہ آرزوئیں ہیں جنکا مجھے ماتم کرنا ہے۔

اگر یہ بات ہے تو اُٹھ تو ابھی جوان ہے۔ آرزوئیں پھر زندہ ہو سکتی ہیں اور حسرتوں کی اُمیدیں بن سکتی ہیں۔ تیری ابھی عمر ہی کیا ہے۔

مجھے نہیں پتا مجھے کس شے کی آرزو ہے وہ بہت دور ہے وہ آسمانوں سے بلند اور سمندروں سے گہری ہے وہ ستاروں کی مملکت میں ہے اور شبنم کے کاشانوں میں۔ مشرقی اسکو صحرا کی بلند آوازوں میں تلاش کرتے ہیں اور مغربی اسکو کلیسا کی صداؤں میں۔

فرہنگ الفاظ

الف

انتقام — بدلہ
اعتراف کرنا — اقرار کرنا۔
افسردہ — مرجھایا ہوا۔ غمگین۔ ابر آلود اور بادلوں سے گھرا ہوا
ابدی نیند — ہمیشہ کو سوجانا یعنی مرجانا
اہمیت — قدر۔ رتبہ اور وقعت
آبیاری — پانی دینا۔
افلاس — غریبی۔
اعتماد — بھروسہ
امید افزا — اُمید کو بڑھانیوالی بات
انکشاف — کھل جانا۔
اخلاقیات کا معلم — اخلاق کی تعلیم دینے والا۔
اضافی خیال — اہل فلسفہ کا یہ خیال کہ انسان حوادث طبعی کے علاوہ اور کسی شے کا علم نہیں رکھ سکتا اور یہ علم مطلق نہیں بلکہ اضافی ہوتا ہے۔
الوداعی تقریر — رخصت ہوتے وقت کی تقریر
استعجاب — تعجب
اختصار کرنا — چھوٹا کرنا خلاصہ کرنا

(ب)

بارگاہ الفت — محبت کا دربار
بتدریج — درجہ بدرجہ آہستہ آہستہ
بالائے افق — آسمان کے کنارے کے نیچے
بدفطرتی — پیدائشی نقص
بے اعتدالی — حد سے بڑھنا۔
بدباطن — بُری طبیعت کا آدمی
بسا اوقات — اکثر مرتبہ۔ اکثر دفعہ

(پ)

پنہاں — چھپا ہوا۔
پژمردگی — مرجھایا پن۔
پردہ پوشی — عیب چھپانا عیب ڈھانپنا۔

(ت)

تحسین ناشناس — انجان اور جاہل کی تعریف
توضیح — صاف صاف بات بتانا
تضیع اوقات — وقت کو بیکار ضائع کرنا۔
تائب — توبہ کرنیوالا۔
تباہ کن — برباد کرنے والا۔
تخم ریزی — بیج بکھیرنا۔ بوائی۔
توازن — برابر سرابر کرنا
تشخیص — پتہ لگانا۔ حکیم نے مرض کی صحیح تشخیص کی۔ یعنی پتہ لگالیا
تعزیت — صبر دلانا۔ پُرسا۔
تفتیش — چھان بین۔ چھان پھٹک۔

(ج)

جسمانی نظام — بدن کی بناوٹ جسم کی مشنری
جرأت آمیز — جو کام دلیری سے کیا گیا ہو۔

(ح)

حسن و قبح — اچھائی اور بُرائی
حق پرستی — سچائی کی پوجا
حوصلہ افزائی — دل بڑھانا۔
حسن ظن — نیک گمان۔

(خ)

خودستائی — اپنی تعریف آپ کرنا
خودبینی — اپنے آپ کو بڑا سمجھنا۔
خود آرائی — اپنے آپ کو بنا سجا کر دکھانا

(ذ)

ذہن نشین کرنا — ذہن میں جالینا۔
ذلت آمیز — ذلت سے بھرا ہوا۔
ذوق سلیم — کسی چیز کا اچھا ذوق

(ر)

راقم السطور — سطروں کو لکھنے والا۔ یعنی خود لکھنے والا۔
رفاقت — ساتھ دینا۔
راستبازی — سچائی کی عادت

(ز)

زود پشیمانی — جلد شرمندہ ہونا۔

(س)

سخن شناس — بات کو سمجھنے والا۔
سرمایۂ اشک — آنسوؤں کی پونجی

(ش)

شادابی — سرسبزی

(ص)

صحیح العقل — جس کی عقل اور سمجھ درست ہو
صریح لغزش — کھلی غلطی

(ط)

طمانیت قلب — دل کا اطمینان

(ع)

عوام الناس — عام لوگ۔ پبلک۔

(غ)

غلط فہمی — غلط سمجھنا۔

(ف)

فراہم — اکٹھا۔
فقدان — کمی۔
فراوانی — زیادتی۔
فلاکت زدہ — مصیبت کا مارا۔

(ق)

قائم مزاج — مستقل مزاج کا آدمی
قانونی مشیر — قانون کا مشورہ دینے والا
قلاش — خالی ہاتھ

(ک)

کفارہ — گناہ۔ تلافی یا بدلہ۔
کامرانی — کامیابی۔
کارکردگی — کارگذاری
کارفرمائی — کام کو پورا کرنا
کاسہ — پیالہ

(م)

مکافات عمل — کام کا بدلہ۔ کرم کا پھل
مصرف — خرچ کرنیکی جگہ اور محل
منتخب — چھانٹا ہوا۔ چنا ہوا۔
مرحوم — جس پر رحم کیا گیا ہو مردے کو نیک فالی کے طور پر کہتے ہیں
مُضر — نقصان دینے والا۔
مسرت افروز — خوشی بڑھانیوالی۔
مبادلات خارجہ — محکمۂ تبادلۂ سکہ جات۔
موزونیت — ٹھیک ٹھیک۔
محو دعا — دعا میں مشغول
معاون — مددگار
مسلم الثبوت — مانا ہوا۔
مستند آدمی — سند یافتہ۔ مانا ہوا۔
مستحسن — اچھا۔

(ن)

نقائص — نقص کی جمع۔ کمیاں۔ کمزوریاں
نفس پرستی — نفس کی پوجا نفس کے کہنے میں چلنا
نفاق — ظاہر کچھ اور دل میں کچھ ظاہرداری
ناآشنا — انجان
نظرانداز کرنا — خطا سے درگذر کرنا نظر سے گرانا۔
نغمات — جمع نغمہ۔ راگ۔ گیت
نغمہ سنجی کرنا — گانا۔ تقریر کرنا
نفرت انگیز لہجہ — بُرا لہجہ۔

کتابیات

…انہ ڈائری۔ یوسود حساب خانہ داری۔ مولفہ سید افتخار حسین صاحب سلطانہ بیگم چاندنی چوک دہلی۔ اس میں مفید معلومات درج ہیں جو نہایت …ہیں خصلاً ڈاک تار ریلوے ٹکٹوں کا تبادلہ۔ پرست فنون پیمانے وغیرہ درج … علاوہ ازیں خانہ داری کے متعلق بھی مختصر ہدایتیں درج ہیں۔ نقشہ تنخواہ …ج کیا گیا۔ ہم یہ مشورہ دیتے ہیں۔

اول تقطیع لش ڈائری کے برابر ہونی چاہئے۔

(۲) دھوبی کے کپڑوں کے نقشہ میں اقسام درج کرنے ضروری ہیں۔ محرم کا …یج کرنا چاہیئے

(۳) ہر مہینے کے ساتھ نقشہ تنخواہ ضروری نہیں۔

(۴) تمیں ہدایتیں ڈائری کے اغراض سے بے تعلق ہیں

(۵) نقشہ جنس میں … تفصیل کی ضرورت نہیں پنجاب میں کتھ تیل … چھالیہ کا استعمال کم ہے۔

(٦) ہر مہینے کے حساب میں برقعہ نوابجاؤ کا اشتہار ضروری نہیں۔

اس ڈائری کی قیمت ہم کو کہیں نظر نہیں پڑی۔ ہم یہ کہکر اکتفا کرتے … ضخامت ضرورت سے زیادہ ہے جس کی وجہ سے قیمت بھی زیادہ ہی …

خطابت۔ مؤلفہ مرتبہ پیرزادہ سید [illegible] حسن صاحب نظامی ایڈیٹر … دہلی۔ ابتدا میں مؤلف کا دیباچہ اور بعض مشہور ہندوستانی ادیبوں کے … خطابت پر قابل قدر مضمون ہیں۔ پہلا مضمون مولینا عبدالسلام صاحب … کا ہے جس میں مشرقی خطابت سے بحث ہے اور دوسرا مضمون مولینا … حسین صاحب ایل۔ ایل۔ بی کا جس میں مغربی خطابت سے بحث ہے … مضمون مولینا ڈاکٹر سید احمد صاحب۔ آئی۔ ایم۔ ڈی کے بعد … نتیجہ ہے۔ … دلچسپ … مفید اور کارآمد معلومات … ہیں۔ اس کا … ہر شخص کے … کا ہے … طباعت عمدہ ہے … [illegible]

… بت۔ اس … [illegible]

گو مؤلف کا زور قلم قابل داد ہے کہ وہ قادر بیانی کے بل پر پریس ایکٹ کی زد سے دامن بچا کر نکل گیا ہے۔ کاغذ طباعت وغیرہ خاصی ہے حجم ۱۹۲ صفحات اور قیمت دو روپے ہے۔ ملنے کا پتہ منیجر اور نٹیل بک ڈپو پوسٹ بکس نمبر ۱۰۵ دہلی۔

چاند (ناول) مصنفہ جناب رائے بہادر پنڈت شیو نرائن صاحب شمیم ایڈوکیٹ ہائیکورٹ پنجاب لاہور۔ یہ ناول اخلاقی معلومات اور دلچسپ خیالات کا مجموعہ ہے حجم ۲۶۳ صفحہ۔ قیمت (عہ/)

شانتی۔ ناول۔ یہ مفید ناول بھی حضرت شمیم کے زور قلم کا نتیجہ ہے ناول کی غرض یہ ہے کہ دولت محنت و دیانت سے کمائی جاتی ہے۔ زندگی بسر کرنے کا طریقہ سادہ ہونا چاہیئے۔ اور دولت کا مصرف اغراض نیک ہونا چاہیئے۔ اس کتاب کے نو باب ہیں اور ۱۰۵ صفحات ہیں۔ تقطیع چھوٹی ہے کتاب قابل دید ہے۔ یہ دونوں کتابیں جناب مصنف کے پتہ سے مل سکتی ہیں۔

پتھر سے ہیرا۔ یہ ایک مختصر اور دلچسپ اصلاحی افسانہ ہے جسے جناب ڈاکٹر سعید احمد صاحب بریلوی نے لکھا ہے رسالہ کا ہر لفظ تاثیر میں ڈوبا ہوا ہے اور نتیجہ بہت ہی اچھا ہے۔ اس قسم کے مفید افسانوں کی اردو ادب کو ضرورت ہے۔ ضخامت ۱۱۲ صفحات کاغذ طباعت وغیرہ خاصی ہے۔ ملنے کا پتہ منیجر رسالہ نظام المشائخ دہلی۔

روحانی ترقی۔ مؤلفہ لالہ کدارناتھ صاحب میرٹھی۔ دلچسپ رسالہ ہے۔ اس میں نظم بھی اور نثر بھی۔ زبان اور نظم خا … سے خالی نہیں۔ مطالب بُرے نہیں۔ دیکھنے کے قابل چیز ہے۔ بمبئی سے شائع ہوا ہے حجم ۵۲ صفحات قیمت (۶/) ملنے کا پتہ۔ گوسائیں راجہ لال۔ منیجر دی انڈین آرٹ سٹڈیو۔ کالبا دیوی روڈ بمبئی نمبر۲۔

مخزن نجات۔ پہلا حصہ۔ پیغمبر اسلام علیہ السلام کی چالیس حدیثوں کا منظوم ترجمہ مولینا جامی نے فارسی میں کیا تھا۔ مولوی شرف الدین خاں صاحب امپوری نے اُردو میں ترجمہ کیا ہے۔ حجم ۱۶ صفحات سائز چھوٹا۔ قیمت (۲/) ملنے کا پتہ ریاست رامپور۔ محلہ کھاری کنواں۔

ہشتم کے خطوط نمبر ۳-۴-۵-۶ - یہ خطوط جرمنی زبان سے انگریزی میں ترجمہ ہوکر … اور انگریزی سے اُردو میں جناب مولوی شرف الدین خاں صاحب رامپوری نے ترجمہ کیے۔ نصیحت آمیز مفید خطوط ہیں جیتے جی جہنم کی سیر اگر کرلی جائے تو مرنے کے بعد جہنم میں لیجانے والے عادات و اعمال سے اجتناب کی تحریک ہوسکتی ہے۔ قیمت فی نمبر (۲/)

ملنے کا پتہ۔ مولوی شرف الدین خاں۔ ریاست رامپور محلہ کھاری کنواں۔

پہاڑی مقامات کی ملکہ نارتھ ویسٹرن ریلوے نے جہاں پنجاب کے ذرائع آمدورفت کو وسیع کر کے صوبہ بھر کیلئے اقتصادی اور تجارتی ترقیوں کا دروازہ کھول دیا ہے اور صوبے کو ہندوستان کا صحیح معنوں میں مضبوط اور محکم دروازہ بنا دیا ہے۔ وہاں ملک کے لٹریچر میں بھی قابل قدر اضافہ کیا ہے۔ بجا اگر یوں کہا جائے کہ اردو پر احسان کیا ہے تو بیجا نہ ہوگا کیونکہ اردو میں ہندوستانی مقامات کی سیاحت کے متعلق آج تک اس قسم کا لٹریچر پیدا نہیں کیا گیا۔ زیر نظر پمفلٹ بھی ادارہ کی اس خدمت کے سلسلہ کی ایک کڑی ہے اس میں ہر وہ بات نہایت دلکش، سادہ اور عام فہم زبان میں بیان کر دی گئی ہے جو پہاڑی مقامات کی ملکہ شملہ کے متعلق جاننی ضروری ہے۔ پمفلٹ کے شروع میں حکومت کے اس گرمائی صدر مقام کی جائے وقوع سطح سمندر سے بلندی وغیرہ بیان کر کے مختصر سی تاریخ دی گئی ہے اور یہ بھی بتایا گیا ہے کہ ریل سے پیشتر اس مقام کی کیا حالت تھی اور اب کیا ہے اور اسے کیا تاریخی اہمیت حاصل ہے۔ اس کے بعد شملہ کے روز و شب کے مناظر کی دلکش الفاظ میں تصاویر کھینچی گئی ہیں اور ان کے مقابل بلاک کی نہایت عمدہ بڑے سائز کی تصاویر ہیں شملہ کی آب و ہوا اور یہاں کے مشاغل بھی نہایت وضاحت سے بیان کئے گئے ہیں اور آخر میں نوواردوں کی سہولت کیلئے انگریزی اور ہندوستانی طرز کے ہوٹلوں کی فہرست اور کالکا شملہ لائن پر اسباب لے جانے کی ضروری ہدایات درج ہیں تمام پمفلٹ آرٹ پیپر پر چھپا ہوا ہے جا بجا بلاک کی بڑے سائز کی تصاویر نے اسے اور بھی دلفریب بنا دیا ہے۔ ٹائیٹل اعلےٰ درجہ کے ۲۷ پونڈ کے آرٹ پیپر کا ہے اور اس کے دونوں طرف پہاڑی مناظر کی ایک دلکش سہ رنگی تصویر ہے۔ پمفلٹ مذکور نارتھ ویسٹرن ریلوے پبلیسٹی آفس سے مل سکتا ہے۔ قیمت درج نہیں ہے۔

کوہستان کانگڑہ کی دلفریب وادی یہ پمفلٹ بھی نارتھ ویسٹرن ریلوے کی طرف سے شائع کیا گیا ہے۔ اس میں بھی مذکورہ بالا پمفلٹ کی تمام خوبیاں اور دلفریبیاں موجود ہیں۔ ٹائیٹل نہایت دیدہ زیب طرز بیان نہایت دلکش اور تصاویر نہایت سحر افزا۔ نیچر اپنے اصلی لباس میں نظر آتی ہے شہر کی بند فضا میں بیٹھ کر اسے پڑھنے والا محسوس کرتا ہے کہ وہ فطرت کی آزاد فضاؤں کی سیر کر رہا ہے۔ یہ بھی نارتھ ویسٹرن ریلوے پبلیسٹی آفس سے مل سکتا ہے

قیمت درج نہیں

ناٹک کتھا جناب نور الٰہی محمد عمر صاحبان اپنے مخصوص دلچسپ انداز بیان اور شگفتہ اور دلکش طرز تحریر کے لئے اب ادبی دنیا میں محتاج تعارف نہیں۔ ناٹک ساگر کے علاوہ جو دنیائے اردو میں فن ڈرامہ نویسی کی پہلی تاریخ ہے سربرآوردہ مغربی ڈرامہ نگاروں کے ترجمہ کر کے ان دونوں حضرات نے اردو ڈرامہ نویسی میں ایک جدید باب کا آغاز کر دیا ہے۔ شاید آئندہ کسی محفل میں ہم ان تراجم پر فن ڈرامہ نویسی کے نقطۂ نظر سے تبصرہ کر سکیں۔ زیر نظر کتاب جو آٹھ دلچسپ افسانوں کا مجموعہ ہے ہندوستان قدیم کے ڈراموں سے ماخوذ ہے ایک تاریخی واقعہ افسانے کے رنگ میں لکھا گیا ہے۔ ابتدا میں ایک مختصر دیباچہ اور پنڈت کیفی کے قلم کی تقریب ہے۔ زبان نہایت دلچسپ۔ عربی۔ فارسی۔ سنسکرت غیر مانوس الفاظ سے پاک ہے اکثر کہا جاتا ہے کہ مشکل الفاظ اور انداز بیان کے افسانے میں ادماں پیدا نہیں ہو سکتا۔ اس کتاب کو پڑھ کر یہ عذر لنگ معلوم ہوتا ہے مؤلفین نے سادہ زبان میں نہایت دلکش افسانے تحریر کئے ہیں ہمارے خیال میں سکولوں کی لائبریریوں اور طلبا کیلئے یہ کتاب نہایت مفید ہے طباعت و کتابت ہر طرح اچھی ہے حجم ۲۰۴ صفحے قیمت (۲؍) پتہ محمود برادرس جموں۔

اعلان ضروری ادبی دنیا شروع سے دو قسم کا چھپ رہا ہے قسم اول اور قسم خاص۔ قسم خاص کا ٹائیٹل ۲۷ پونڈ پر فینسی آرٹ پیپر اور ۳۴ پونڈ ولایتی کاغذ کا ہوتا ہے قسم خاص کی تصاویر کا کاغذ بھی ۳۸ پونڈ آرٹ پیپر ہوتا ہے جو قسم اول کے ٹائیٹل کے لئے استعمال کیا جاتا ہے۔ قسم اول اور قسم خاص کی سالانہ قیمت میں ایک روپے کا فرق ہے ہم نے یہ تفصیل اپنے مطبوعہ اغراض و مقاصد کی فہرست میں درج کر دی تھی مگر خریداران نے اسے پڑھنے کی تکلیف نہیں کی اور قسم اول کے خریدار بن گئے۔ اب جب انہوں نے اخبارات کی ایجنسیوں پر قسم خاص کے پرچے دیکھے تو شکایتوں کے طومار باندھ دیئے کہ ہمیں نہیں بتایا گیا کہ قسم خاص کا پرچہ بھی چھاپا جاتا ہے۔ بہت سے خریداروں نے جو قسم اول کے خریدار بن چکے تھے ایک ایک روپے کے ٹکٹ بھیج کر ہم سے مطالبہ کیا کہ آئندہ سے انہیں قسم خاص کا پرچہ بھیجا جایا کرے یہ سلسلہ بہت طول کھینچ گیا ہے اب جس جس کو قسم خاص کا علم ہوتا جاتا ہے وہ اسی پر اصرار کر رہا ہے کہ اسے قسم اول نہ بھیجا جائے بلکہ قسم خاص ہی کا پرچہ بھیجا جائے اس وجہ سے ہم نے یہ فیصلہ کیا ہے کہ آئندہ سے صرف خاص ٹائیٹل اور خاص کاغذ پر قسم خاص ہی کا پرچہ چھپوایا جایا کرے۔ اور جن حضرات نے قسم خاص کے پرچے کی قیمت کے اضافے کے طور پر ہمیں ایک ایک روپے کے ٹکٹ بھیجے ہیں ہم ان سب کو ٹکٹ واپس کر رہے ہیں۔ اب تک جس قدر حضرات قسم اول کے خریدار بن چکے ہیں انہیں بغیر ایک روپیہ اضافہ کے باقی گیارہ ماہ تک قسم خاص ہی کا پرچہ بھیجا جائیگا۔ اس میں اگرچہ دفتر کو بہت نقصان ہوگا لیکن خریداروں سے ہم اضافہ لینا برا سمجھتے ہیں۔

مینیجر ادبی دنیا لاہور

تصاویر

۱- حسن معصوم ۔ یہ تصویر ایجنرا آرٹ گیلری سے لی گئی ہے اور شہرۂ آفاق مغربی مصور جان ایورٹ ملاس کے معصومیت کے تصور کا نتیجہ ہے۔ اسے اس کا شاہکار خیال کیا جاتا ہے اس تصویر میں مصور نے حسن فطرت کے ساتھ ان عمیق انسانی جذبات کو بھی بے نقاب کر دیا ہے جو آغاز شباب میں حسینوں کو احساس رعنائی سے غافل رکھتے ہیں اور حقیقتاً اس خود فراموشی اور تغافل کا نام معصومیت ہے۔

۲- چشمۂ محبت ۔ لافوں تین امور ۔ نوجوان فرانسیسی مصور فراگونار کا شاہکار ہے۔ قدیم یونانی فن پیکر نگاری کی خفیف سی جھلک نے اس کی دلفریبی اور دلآویزی کو دوبالا کر دیا ہے۔ ایک نوجوان مرد اور نوخیز عورت اپنے انتہائی مسرت کے منبع کی طرف دوڑے جا رہے ہیں اُن کے انداز میں ایک وقار ہے اور ایک ثبات۔ ہر طرف تاریکی چھا رہی ہے۔ صرف اُن کے جسم پر روشنی پڑ کر اُن کے حسن کو نمایاں کر رہی ہے۔ چشمہ کے پاس اشجار بھی نظر آتے ہیں لیکن اون کے سے بادلوں نے سراب جیسی کیفیت پیدا کر دی ہے اور خداوندان عشق جوان نوواردوں کے لئے جام الفت لئے کھڑے ہیں اگرچہ آسمانی ہستیاں نظر آتی ہیں لیکن انداز میں ایک انسانی چنچل پن اور شوخی ہے

۳- روت اور نومی ۔ سرزمین شام کے ایک قدیم مذہبی افسانے کی تصویر ہے۔ نومی کا خاوند مرجاتا ہے اور دو جوان بیٹے آنکھوں کے سامنے اُٹھ جاتے ہیں۔ غریب الدیار نومی اپنے آبا کی سرزمین کو واپس لوٹتی ہے۔ اس کی دونوں بیوہ بہوئیں روت اور آرپا کچھ راستے اس کے ساتھ جاتی ہیں جس پر تہ نصیب نومی انہیں اپنی ماؤں کے گھر واپس جانے کیلئے کہتی ہے۔ آرپا اپنی ساس کو بوسہ دیکر رخصت ہو جاتی ہے لیکن روت اس سے لپٹ جاتی ہے اور جدا ہونے سے انکار کر دیتی ہے اور سسک سسک کر کہتی ہے "مجھے جدا ہونے کیلئے نہ کہہ میں تیرے پیچھے آؤں گی۔ جہاں تو جائے گی میں بھی جاؤں گی۔ جہاں تو بسیرا لے گی میں بھی لوں گی تیرے لوگ میرے لوگ ہوں گے اور تیرا خدا میرا خدا ہوگا۔ جہاں تو مرے گی میں بھی مروں گی اور گاڑی جاؤں گی اور موت بھی ہمیں جدا نہ کرے گی"۔

۴- میری لنگھم ۔ ایک مشہور نقش پرداز مس کی زندگی کا ایک ناقابل فراموش ترین خود نوشت واقعہ 'انتظار' کے نام سے شائع ہو رہا ہے۔ ۵- میر ناظر حسین ناظم مرحوم۔ ۶- اطالیہ کی قسمت کا مالک - بینی ٹو میسولینی۔ ۷- گوئٹے' ایوان مغرب کے ایک ورق کا عکس شائع کیا جا رہا ہے۔ ۸- شیخ محمد ضیاء الدین صاحب شمسی۔

(مرکنٹائل پریس ریلوے روڈ لاہور میں طبع ہوکر۔ اور منشی عبد الوحید خاں پرنٹر و پبلشر نے دفتر "ادبی دنیا" کشمیر بلڈنگس میکلوڈ روڈ لاہور سے شائع کیا)

رجسٹرڈ — ایل نمبر ۲۴۸۲

فہرست مضامین

جلد (۱) — بابت ماہ اگست سنہ ۱۹۲۹ء — نمبر (۴)

تصاویر: (۱) کلیوپیٹرا سہ رنگی۔ (۲) کمسن اور خرگوش سہ رنگی (۳) معصوم دوست (۴) ہیلن کیلر (۵) ڈیگبرے (۶) زار اور زارینہ (۷) ڈاکٹر خلیفہ عبد الحکیم صاحب (۸) مولینا شوق قدوائی

کہتی ہے ہم کو خلقِ خدا غائبانہ کیا

شیخ عبدالحق صاحب ریاض سب جج بھیرہ :۔

آپ نے ادبی دنیا" کے اجراء سے اردو زبان کی وہ خدمت کی ہیں کہ اردو جاننے والے کبھی اس بار احسان سے سبکدوش نہیں ہو سکتے ۔جسقدر بھی اردو رسالہ جات و دیگر اخبارات ہیں اُن کی مشکل نویسی کی وجہ سے اُردو خواں اصحاب کی ایک کثیر تعداد اردو سے متنفر ہو رہی تھی ۔ اور یہی وجہ تھی کہ اردو کی بجائے ہندی کو پیش کیا جاتا تھا ۔آپ نے اس اعتراض کو دُور کرنے کی جو کوشش کی ہے اسمیں ہر بہی خواہ زبان اردو کا فرض ہے کہ آپ کا ہاتھ بٹائے ۔ مجھے خود آسان عبارت میں کافی وقت کا سامنا کرنا پڑا اور میں نے آج محسوس کیا ہے کہ آپ کے راستے میں کسقدر تکالیف ہیں۔ بہرکیف خدا آپکی محنت اور ارادہ کو استقامت عطا فرمائے تاکہ آپ اس کام کو سرانجام دے سکیں جس کا بیڑہ آپنے اُٹھایا ہے ۔

خان محمدؐ افضل خاں صاحب سب جج جھنگ :۔

آپ کے رسالہ ادبی دنیا" کے تین نمبر میری نظر سے گذرے ہیں ۔میں نے انکو شوق سے دیکھا اور غور سے مطالعہ کیا ہے ۔ رسالہ کے مقاصد قابل تعریف ہیں ۔خدا اسکو ترقی اور کامیابی نصیب کرے ۔ میں حتے الوسع اس کی ترقی کے واسطے کوشش کرونگا ۔

زبان کی سلاست ۔سادگی اور صحت ایسی چیزیں ہیں جنکو میں عرصہ سے ادب اُردو کے لئے نہایت ضروری سمجھتا رہا ہوں اور جنہیں موجودہ زمانے کے اکثر اہل قلم کے مضامیں میں جو عموماً رسائل میں شایع ہوتے ہیں مفقود پاتا تھا ۔اپنی لیاقت کے اظہار کی فضول کوشش ۔عربی فارسی کے غیر مانوس اور مشکل الفاظ کا استعمال اور اکثر غلط اور بیجا استعمال ۔غیر زبانوں خصوصاً انگریزی کے محاورات کو اپنی زبان میں درست طور پر ادا کرنے کی ناقابلیت کے باعث لفظی ترجمہ یا خود ساختہ ترکیبوں پر انحصار وغیرہ وغیرہ ۔اصلاح کا طریقہ صرف یہی ہوسکتا تھا کہ ایک رسالہ ایسا جاری کیا جائے جس میں (۱) صرف ایسے مضامین کو جگہ دی جائے جو اس قسم کی غلطیوں سے پاک ہوں اور اسطرح سے سلیس اور شستہ اردو لکھنے والوں کی حوصلہ افزائی کی جائے (۲) مضمون نگاروں کو معقول معاوضہ دیا جائے تاکہ وہ جی لگا کر مضمون لکھیں اور اس کام کو محض بیگار نہ سمجھیں اور ایڈیٹر کو بجائے بھرتی کے مضامیں شایع کرنے پر مجبور ہونے کے مضامین کے انتخاب کا موقع مل سکے ۔اور ان ذرائع سے ان ناپسندیدہ اثرات کو جو ادب اردو پر پڑ رہے ہیں دُور کیا جائے بشکر ہے کہ سر عبدالقادر اور آپ کی توجہ اسطرف منعطف ہوئی اور رسالہ ادبی دنیا وجود میں آیا ۔ اس کے مقاصد لعینہ وہی ہیں جو میں چاہتا تھا اور جن کے ادب اُردو میں دلچسپی رکھنے والے تمام حضرات خواہشمند تھے ۔ یہ باتیں اس رسالہ کو تمام دیگر رسائل سے ممتاز اور ممیز بناتی ہیں۔

مولانا نیاز فتحپوری مدیر" نگار" بھوپال :۔

ادبی دنیا" کا اجراء حقیقتاً ایک ایسا برمحل اقدام عمل ہے جسکی ضرورت کو خود اہل ملک و ارباب ذوق تسلیم کریں گے ۔بغیر کسی اجتماعی سرمایہ کے تنہا کسی کا ایسی جرأت کر بیٹھنا ۔اور اسقدر ایثار سے کام لینا، واقعہ یہ ہے کہ میری سمجھ میں کسی طرح نہیں آتا ۔مگر ممکن ہے آپ کسی خاص قوت روحانی سے کام لیتے ہیں آپ نے جن اصول پر کاربند ہو کر رسالہ کا اجراء کیا ہے ۔ وہ نہایت مستحکم و مفید ہیں ۔یقیناً آپ نہایت بیجگری سے کام لے رہے ہیں اور قدرتاً "حریفان کار" کو ادبی دنیا" کی گرانمائیگی مستقبل" سے سراسیمہ ہونا چاہئے ۔ بڑی مسرت کی بات یہ ہے کہ آپ نے تصویروں کا معیار نہایت پاکیزہ قائم کیا ہے ۔جون کے رسالہ میں محروم سلام" اور قیدی دونوں قیامت ہیں ۔

سیّد سجاد حیدر صاحب ۔بی ۔ اے رعلیگ مصنف خیالستان سابق رجسٹرار مسلم یونیورسٹی علیگڈھ :۔

"ادبی دنیا" دنیائے ادب کا نوطلوع چاند، شیدایان اردو کیلئے پیام مسرت لایا ہے جس رسالے کے نگراں سر عبدالقادر اور ایڈیٹر تاجور جیلسے ادیب ہوں، اس سے جس قدر امیدیں وابستہ ہوں کم ہیں ۔امید ہے کہ یہ امیدیں پوری ہونگی

چوہدری ظفراللہ خانصاحب بی ۔اے ۔ ایل ایل ۔بی ۔ (لنڈن یونیورسٹی)، بار ایٹ لا ممبر پنجاب لیجسلیٹو کونسل :۔

میں جہانتک ادبی دنیا کے پہلے تین نمبروں سے اندازہ کر سکا ہوں یقین رکھتا ہوں کہ حسب بیعد بید رسالہ میری ان تمام آرزوؤں کو پورا کرنے والا ہوگا جو مدت سے اردو ادب کے متعلق میرے دل میں اٹھتی رہی ہیں ۔

خانصاحب میر کریم بخش صاحب ایم ۔اے ورنیکلر ایجوکیشن انسپکٹر صوبہ سرحد :۔

"ادبی دنیا" اردو زباندانی کے لئے لبا غنیمت ہے اپنی نوعیت میں لاجواب ہے ۔ اور نہایت سستا ۔ میرے خیال میں یہ نہایت مناسب ہوگا ۔ کہ آپ اس کی قیمت بڑھادیں ، تاکہ رسالہ اپنے قدموں پر گزارہ سکے ۔

عرضِ حال

خوش آمدید

اس ماہ سے آدبی دنیا کے عملۂ ادارۃ میں دو قابل قدر اہلِ قلم کا اضافہ ہؤا ہے۔

(۱) مولینا حامد انصاری ایڈیٹر اخبار مہاجر۔ ایک کامیاب اخبار نویس ہونے کے علاوہ جدید و قدیم عربی و فارسی ادبیات پر بہت وسیع نظر رکھتے ہیں۔ امید ہے کہ ان کی توجہ سے ادبی دنیا کے صفحات مشرقی ادبیات کی درخشانیوں سے چمک اُٹھیں گے۔

(۲) مشہور انشاء پرداز پنڈت میلا رام وفاؔ جو اس صوبے کے بلند پایہ روزانہ اخباروں میں چیف ایڈیٹر کی حیثیت سے ایک مدت سے کام کر رہے ہیں۔

وفاؔ صاحب کی بلند و پاکیزہ اردو نظمیں دیکھ کر اس حقیقت کو تسلیم کرنا پڑتا ہے کہ اردو شاعری مسلمانوں کی کوئی میراث نہیں ہے۔

ان کی سادہ مگر بلند قسم کی ادیبانہ نثر نگاری، ان کا بے مثل ذوقِ تنقید، ان کی جدّت آمیز انشاء پردازی انہیں ملک کے اُن چند در چند قابل قدر اہل قلم میں شمار کرتی ہے جن پر اہل ملک اور ملکی ادب کو فخر ہوسکتا ہے۔

ریلوے بک سٹال ویلر کمپنی کے مینجر نے ہمیں اطلاع دی ہے کہ ہماری کمپنی کسی ایسے پرچے کی ایجنسی لینے پر آمادہ نہیں جو عام و خاص دو قسم اور دو قیمتوں کا چھاپا جاتا ہو۔

دوسرے ہمارے بہت سے خریداروں نے ایجنسیوں پر قسم خاص کے پرچوں کو دیکھ کر ہم سے مطالبہ کیا ہے کہ اُنہیں خاص پرچہ بھیجا جایا کرے اور ایک روپیہ زائد خاص پرچے کی سالانہ قیمت کا وصول کرلیا جائے۔

ان حالات کو پیش نظر رکھکر ہم نے ارادہ کرلیا ہے کہ آئندہ سے قسم عام کی بجائے قسم خاص ہی کا پرچہ چھپوایا جایا کرے۔ اس مرتبہ دونوں قسم کے پرچے چھپوائے گئے ہیں تاکہ سب کو عام و خاص پرچوں میں فرق کرنے کا موقعہ مل جائے۔

رسالے کا پانچواں نمبر صرف قسم خاص کا چھپوایا جائے گا۔ کیونکہ دو قسم کے نمبر جُدا جُدا چھپوانے میں بہت سی پریشانیوں کا سامنا ہوتا ہے۔ اس لئے اس نمبر کے بعد سے عام نمبر کی اشاعت بند کی جاتی ہے۔ آئندہ جو خریدار بنیں گے اُن سے قسم خاص کے پرچے کی سالانہ قیمت چار روپے بارہ آنے وصول کی جائے گی۔ جو حضرات اس سے پہلے قسم عام کے پرچے کے خریدار بن چکے ہیں انہیں بھی آئندہ نمبر قسم خاص کا بھیجا جائے گا۔ اور اُن سے کوئی اضافہ نہیں لیا جائے گا۔

ایجنٹ حضرات!

آدبی دنیا کے ایجنٹوں کو اطلاع دیجاتی ہے کہ بعض ایجنٹوں کی بدنیتی اور بدمعاملگی کے سبب آئندہ سے یہ فیصلہ کرلیا گیا ہے کہ صرف انہیں ایجنٹوں کو پرچہ بھیجا جایا کرے گا جو مطلوبہ پرچوں کی قیمت کمیشن کاٹکر پیشگی بھیج دیا کریں۔

تصاویر

(۱) کلیوپیٹرا - ایک فرانسیسی مصور جوشے داکروز کا شاہکار ہے، یہ اسوقت کی تصویر ہے جب کلیوپٹرا اپنی زرنگار کشتی سے اُتر کر ساحل اسکندریا پر فروکش ہوتی ہے اور بارگاہ حسن سے انٹونی کے نام حاضر ہونے کا فرمان جاری ہوتا ہے تصویر میں ساحل نیل کے مناظر کو اچھی طرح دکھایا گیا ہے۔ کلیوپیٹرا کے سامنے مصر کی شراب کا پیالہ پیش کیا جارہا ہے کہ انٹونی کے آتے تک قاتل نگاہیں اور بھی خونریز ہوجائیں۔

(۲) معصوم دوست
(۳) کمسن اور خرگوش
} دونوں تصویریں انگلستان کے مشہور آرٹسٹ ڈبلیو۔ ہارن فیلڈ کے موقلم کا کارنامہ ہیں۔

(۴) زار روس اپنی بیوی اور بچوں کے حلقے میں

(۵) ہیلن کیلر - دنیا کی ایک مشہور ترین عورت جو اندھی اور بہری ہے۔

(۶) ڈاکٹر خلیفہ عبدالحکیم صاحب ایم - اے - پی - ایچ - ڈی - (برلن) پروفیسر عثمانیہ یونیورسٹی حیدرآباد دکن۔

(۷) مولینا احمد علی صاحب شوق قدوائی۔

تاجور

---

(۸) فن فوٹوگرافی کا موجد ڈیگرے

آئینۂ عالم

جنگِ عظیم کی تصاویر

لنڈن میوزیم کو ایک بلجئین سے میدان جنگ کی سات سو تصاویر کا مجموعہ دستیاب ہوا ہے ۔ یہ تصاویر جرمنی کے جنگی بیڑے کے افسروں کی لی ہوئی ہیں ۔ اور ان میں انگریزی اور غیر جانبدار حکومتوں کے جہازوں کو غرق ہوتا دکھایا گیا ہے ۔

جنگ کے دوران میں کثیر التعداد جرمن افسر اپنے ساتھ فوٹو کے کیمرے رکھتے تھے اور جب وہ سمندر میں کوئی ہنگامہ برپا کرتے تھے تو اس واقعہ کی تصویر لے لیتے تھے اس سے شائد ان کی غرض اپنی کارکردگی کے ثبوت پہونچانا تھا ۔ یا وہ ان واقعات کی یادگار اپنے پاس رکھنا چاہتے تھے ۔ انہوں نے ان تصاویر کو بڑا کرانے کے لئے اس بلجئین کو مامور کر رکھا تھا ۔ اسنے یہ خیال کرتے ہوئے کہ جنگ کے بعد یہ تصاویر تاریخی لحاظ سے بہت اہم ہونگی ۔ ان کی نقول اپنے پاس رکھ لیں لیکن ان ایام میں ان کا پوشیدہ رکھنا نہایت مشکل تھا ۔ جرمنوں کے خلاف پروپگنڈا بڑے زور شور سے جاری تھا ۔ اور جرمن سپاہی غیر متوقع طور پر خانہ تلاشیاں کرتے پھر رہے تھے ۔ فوٹو گرافر جانتا تھا کہ اگر یہ تصاویر میری دوکان سے پکڑی گئیں تو وہ بہت جلد اپنے ان ہم وطنوں سے جا ملیگا جو اس سے پیشتر جرمن سپاہیوں کی خونریزی یا مصلحت اندیشی کا شکار ہو چکے ۔ چنانچہ اس نے ان تصاویر کو دکان کے پیچھے کوڑے کرکٹ میں چھپا دیا ۔ لیکن اس جگہ کو محفوظ نہ دیکھکر ایک گورکن کی منت وسماجت کر کے اپنے خاندان کے مقبرے میں انہیں دفن کر دیا ۔ اختتام جنگ کے بعد اب انہیں اس مقام سے نکالا گیا ہے ۔ اور اب ان تصاویر کو اسقدر اہمیت دی گئی ہے کہ انہیں لنڈن میوزیم میں رکھا گیا ہے ۔

ریڈیم کا اثر موت کے بعد

ریڈیم کے ذرات جسم میں داخل ہوتے ہی اعصاب ، خون اور ہڈیوں پر اشعاع کا تباہ کن اثر طاری ہو جاتا ہے ۔ جسم کے یہ تغیرات اکثر بار مشاہدہ کئے گئے ہیں اور ان میں کا ایک تجربہ بتاتا ہے کہ اس کے اجزاء کو کس احتیاط کے ساتھ استعمال کرنا چاہئے ۔ حال میں ڈاکٹر اے ۔ وی ۔ سینٹ جارج ، الیگزنڈر اوگٹلر اور الف ایچ ملر نے اس کا مزید تجربہ کیا ہے ۔ جس کی بنا پر ان کا خیال ہے کہ ریڈیم کا اثر جسم پر ہمیشہ کے لئے ہوتا ہے اور مرنے کے بعد بھی زائل نہیں ہوتا ۔

چند سال کا عرصہ ہوا ینو انگلینڈ (امریکہ) کی ایک فیکٹری میں چند نوجوان لڑکیاں گھڑیوں کے ڈائل پہ ریڈیم لگانے پر ملازم تھیں ۔ ان میں ایک اطالوی لڑکی بھی تھی جس کی عادت تھی کہ برش کی ڈنڈی کبھی کبھی دانتوں میں پکڑ لیتی تھی ۔ اس لڑکی کی عمر ۲۳ سال تھی ۔ کچھ عرصہ کے بعد اسے درد اعصاب کی شکایت شروع ہوگئی اور ڈاکٹر نے بتایا کہ اسے گٹھیا کی بیماری ہوگئی ہے ۔ ۱۹۲۲ء میں اس کی حالت اور خراب ہوگئی اور کچھ عرصہ بعد معلوم ہوا کہ اسے شرمناک بیماریوں میں سے کسی بیماری کی شکایت ہے ۔ ۱۲ ستمبر ۱۹۲۲ء میں یہ لڑکی مرگئی ۔ اس وقت اس کو منہ سے خون بھی آتا تھا ۔

اس کے بعد دیکھا گیا کہ فیکٹری کی دوسری لڑکیاں بھی ریڈیم کے اثرات سے بیمار ہو رہی ہیں ۔ اور ان میں سے ایک دو مر بھی گئی ہیں ۔ پانچ سال کے بعد اس اطالوی لڑکی کے ورثا کو ہرجانہ دینے کے لئے قبر کھود کر اس کی لاش نکالی گئی اور پوسٹ مارٹم سے معلوم ہوا کہ اس کے جسم میں ابھی تک ریڈیم کے اثرات باقی ہیں یہ ذرات اس کے جسم کے ہر حصے ہاتھ پاؤں ۔ جگر ۔ پھیپھڑوں ۔ تلی اور دماغ میں موجود تھے ۔ الیکٹرسکوپ اور فوٹوگرافی کے مشینوں سے معلوم ہوا ۔ کہ ریڈیم کی وہی مقدار اس کے جسم میں محفوظ ہے ۔ جو اس کی زندگی میں موجود تھی ۔

جذبات کا اثر قوت ہاضمہ پر

یہ حقیقت ایک عرصہ سے مانی ہوئی ہے کہ شدید جذبات طاری ہونے کی حالت میں معدہ اور مثانے کی رطوبت خشک ہو جاتی ہے ۔ اور ان کے ساتھ ہی قوت ہاضمہ بھی کام کرنا چھوڑ دیتی ہے ۔ اب ڈاکٹر ڈبلیو ۔ سی ۔ الوریز نے اپنے ذاتی تجربوں کی روشنی میں اس تمام لٹریچر پر نظر ثانی کی ہے جو اس موضوع پر لکھا گیا ہے ۔ ان کی رائے بھی یہی ہے ۔ کہ جذبات طاری ہونے کے دوران میں بھوک پیاس سب

بند ہو جاتی ہے اور معدہ غذا قبول کرنے سے انکار کر دیتا ہے ۔ اور بھوک کا انحصار جسقدر جسمانی تندرستی پر ہے اسی قدر ذہنی حالت پر ہے ۔

ڈاکٹر الوریز مشورہ دیتا ہے کہ جب تک جذبات کی آندھی اتر نہ جائے ۔ اور طبیعت کی کسل مندی دور ہو کر ایک سکون حاصل نہ ہو جائے کھانا پینا ملتوی رکھنا چاہئے ۔ کیونکہ جب اطمینان ہو معدہ اور آنتیں اس رطوبت کو خارج کرتی ہیں جس پر غذا کے ہضم ہونے کا انحصار ہے ۔ اور امعا میں اوپر کی طرف ایک خاص حرکت شروع ہو جاتی ہے ۔ جس حالت میں یہ حرکت نہ ہو کوشش کرنی چاہیئے کہ خیال کو کسی اور طرف لگا یا جائے اور ایسی غذا پیش کی جائے جو رنگ و بو کے لحاظ سے اپنے اندر ایک کشش رکھتی ہو ۔

اس کے برعکس جب جذبات پیدا ہو رہے ہوں اور آنتوں کی حرکت بند ہو کر معدہ کی رطوبت خشک ہونے والی ہو فوراً کچھ کھا لینا چاہیئے ۔ تاکہ معدہ اور امعا مصروف کار ہو کر جذبات کو طاری نہ ہونے دیں ۔ انگریزی زبان کے اس مقولے کی بنا کہ آرام کا ایک لقمہ بے آرامی کی ضیافت سے بہتر ہے ۔ اسی انسانی تجربے پر ہے ۔ ہماری زبان میں "بھوکے شیر" کی کہاوت اس امر کو دیکھکر بنائی گئی ہے کہ بھوک کی حالت میں غصے کا جذبہ نہایت شدت سے طاری ہوتا ہے ۔

موٹر سے اچانک موت

اخباروں میں موٹر ڈرائیوروں کی اچانک موت کے واقعات اکثر شائع ہوتے رہتے ہیں ۔ ڈرائیور نہایت اچھی جسمانی حالت میں ہوتا ہے ۔ اور سڑک کے کنارے موٹر میں مردہ پایا جاتا ہے ۔ اکثر بار موٹر لڑھکتی ہوئی کسی گھاٹی یا دریا میں جا پڑتی ہے ۔ شکاگو (امریکہ) کے ایک اخبار نے اپنی ایک تازہ اشاعت میں ایسے تین واقعات شائع کئے ہیں ۔ پہلا واقعہ ایک ۴۵ سالہ شخص کا ہے وہ موٹر اڑائے جا رہا تھا ۔ کہ دیکھا گیا موٹر فوراً لڑھکتی ہوئی بستی میں جا گری ۔ پوسٹ مارٹم سے معلوم ہوا کہ موت موٹر روانہ ہونے سے پہلے دل کی حرکت بند ہو جانے کی وجہ سے ہوئی ہے ۔ ہر چند خون کھوپری کے نیچے موجود تھا ۔ لیکن سر کو صدمہ آنے اور ہڈی ٹوٹنے کا کوئی نشان نہ تھا ۔

دوسری مثال ایک ایسے شخص کی ہے ۔ جس کی عمر ۶۷ سال تھی وہ ایک پختہ سڑک پر موٹر لئے چلا جا رہا تھا ۔ جو لوگ موٹر کے پیچھے آرہے تھے انہوں نے دیکھا کہ وہ بل کھا کر جانے لگی ہے اور آخر سڑک سے ایک طرف ہو کر ایک گڑھے میں جا پڑی ہے ۔ پہلی بار معائنہ کرنے پر معلوم ہوا کہ موت کھوپری پھٹنے اور دماغ کو صدمہ پہنچنے کی وجہ سے واقع ہوئی ہے ۔ لیکن پوسٹ مارٹم کے بعد معلوم ہوا ۔ کہ کھوپری پر چوٹ کا کوئی نشان نہیں ۔ دماغ کو بھی کوئی صدمہ نہیں پہنچا ۔ اور خون کے ذرات کی تبدیلی سے یہ بھی ظاہر ہوتا ہے کہ موت دل کی حرکت اچانک بند ہونے کی وجہ سے ہوئی ہے ۔

یہ بھی کہا جاتا ہے کہ وہ لوگ جو دل کی اس بیماری سے جان بحق ہوتے ہیں اکثر کرسی یا گاڑی میں سیدھے بیٹھے مر جاتے ہیں ۔ اور اکثر تو یوں ہوتا ہے کہ پاس بیٹھنے والے کو علم بھی نہیں ہوتا کہ موت کب واقع ہوئی ہے ۔

مچھر اور مویشی

پورٹوریکو (امریکہ) میں ملیریا کے انسداد کے لئے جو محکمہ قائم کیا گیا ہے ۔ اس نے حال میں بہت سے تجربے اس کے اسباب دریافت کرنے کے لئے گئے ہیں ۔ ان میں ایک دلچسپ تجربہ یہ ہے ۔ کہ ملیریا کے مچھر انسانی خون کی نسبت دیگر حیوانوں کا خون بہت پسند کرتے ہیں ۔ چنانچہ دیکھا گیا کہ ایک مکان میں جہاں گھوڑے بھی باندھ رکھے تھے ۔ آدمیوں کو بہت کم مچھروں نے کاٹا ۔ اور ان کا ہجوم گھوڑوں کے گرد ہی رہا ۔ لیکن جب گھوڑوں کو اس مکان سے نکال لیا گیا ۔ وہ فوراً آدمیوں پر ٹوٹ پڑے ۔

ایک اور یورپین ڈاکٹر نے بھی کافی تحقیق اور تجربوں کے بعد محکمہ زراعت کی سالانہ رپورٹ میں لکھا ہے :-

مچھر انسانی ہمسائیگی کی نسبت حیوانوں میں رہنا زیادہ پسند کرتے ہیں ۔ کیونکہ دیکھا گیا ہے کہ جو مچھر حیوانوں کے خون سے پرورش پاتے ہیں ۔ ان کی تلوار زیادہ تیز اور مضبوط ہوتی ہے ۔ اگر مویشیوں کو باہر کھلی ہوا میں باندھا جائے تو وہ مکان کے اندر جا کر جہاں اسقدر ہوا نہیں ہوتی انسانی خون پیتا ہے ۔ اور اگر ان کو مکان کے ساتھ ہی ایسی جگہ باندھا جائے جہاں ہوا نہ ہو تو انسان مچھروں سے محفوظ رہتے ہیں ۔

ایڈیٹر

مَیں اندھی ہُوں
لیکن دیکھتی ہوں

مَیں بہری ہُوں
لیکن سنتی ہوں

"وہ لوگ جو یہ خیال کرتے ہیں کہ مجھ پر فطرت کے دروازے بند ہیں حُسن کی اس شاداب دنیا کا تصور بھی نہیں کر سکتے۔ جو میرے لئے سونگھنے اور چھُونے کی قوتوں نے آباد کر رکھی ہے۔ لیکن میں آفتاب، خنک سایوں ہری ہری گھاس اور جھاڑیوں پر شبنم سحر کے چھینٹوں۔ شام کے سکوت اور فطرت کی دوسری دلفریبیوں، فرن کی دلکش جھاڑیوں اور رنگین چمنستانوں میں دلفریب بارش گل سب کو دیکھتی ہوں"۔

لوگ اس امر پر اکثر اظہار تعجب کرتے ہیں کہ میں ایک اندھی اور بہری عورت ہونے کے باوجود فطری مناظر اور باغ و بہار کی دلچسپیوں کا لطف انتہائی مسرت کے ساتھ اٹھاتی ہوں۔ ان کا خیال یہ معلوم ہوتا ہے کہ کائنات کی بیش تریں دلآویزیاں میرے سر بمہر حواس کے احساس سے قطعاً باہر ہیں لیکن قدرت نے اپنے شاہکار کا کثیر حصہ نہایت نمایاں لکھا ہے۔ اور زمین کے لطیف اور دلکش نغمے قوت سامعہ اور قوت باصرہ کی بجائے دیگر روشوں سے مجھ تک بھیجے جاتے ہیں۔ ڈبلیو۔ ایچ ہڈسن کا قول ہے۔

"جو ہم دیکھتے ہیں ہم محسوس کرتے ہیں"

لیکن میری حالت اس کے برعکس ہے۔ جو میں محسوس کرتی ہوں۔ میں دیکھتی ہوں۔

وہ لوگ جو یہ خیال کرتے ہیں کہ مجھ پر فطرت کے دروازے بند ہیں۔ حُسن کی اس شاداب دنیا کا تصور بھی نہیں کر سکتے۔ جو میرے لئے سونگھنے اور چھُونے کی قوتوں نے آباد کر رکھی ہے۔ لیکن میں آفتاب اور خنک سایوں ہری ہری گھاس اور جھاڑیوں پر شبنم سحر کے چھینٹوں، شام کے سکوت اور فطرت کی دوسری دلفریبیوں فرن کی دلکش جھاڑیوں اور رنگین چمنستانوں میں دلفریب بارش گل سب کو دیکھتی ہوں۔

میرے پینے کے لئے بل کھاتی ہوئی ندیوں کا شفاف اور لذیذ پانی ہے۔ میں سنہری سیب اکھٹے کرتی ہوں اور مجھے شاہ بلوط کی ان لچکتی ہوئی نازک شاخوں کا بھی احساس ہے جو ہوا میں رقص کرتی ہیں۔ میں بھینے بھینے رنگوں کو بھی دیکھتی ہوں۔ میرے نزدیک رنگوں کا علیحدہ معیار ہے۔ میں اُسے بیان کرنے کی کوشش کرونگی۔

ہلکے گلابی رنگ سے میرے دل میں کسی بچے کے رخسار یا نرم جنوبی نسیم کا خیال آتا ہے۔ ہلکا ارغوانی جو میری معلّمہ کا دلپسند رنگ تھا میرے دل میں اِن چہروں کی یاد تازہ کر دیتا ہے۔ جن سے میں نے محبت کی ہے اور انہیں بوسے دیئے ہیں۔

میرے نزدیک سُرخ رنگ کی دو قسمیں ہیں۔ ایک سُرخ تو وہ ہے جو صحت مند جسم کے گرم خون میں نظر آتا ہے اور دوسرا سُرخ آتش دوزخ اور نفرت و حقارت کا رنگ ہے۔ میں پہلے سُرخ رنگ کو اس کی جان پروری کے باعث بہت پسند کرتی ہوں۔ اسی طرح بادامی رنگ کی بھی دو قسمیں ہیں۔ ایک زمین کے رنگ کا زندگی بخش گہرا اور دوستانہ۔ دوسرا پرانے درختوں کے کرم خوردہ تنوں یا سوکھے ہوئے دُبلے ہاتھوں کا سا۔

نارنجی رنگ سے میرے دل میں خوشی اور مسرت کے جذبات پیدا ہوتے ہیں۔ اس کی کچھ وجہ یہ بھی ہے کہ یہ دوسرے دلفریب رنگوں سے بہت مشابہت رکھتا ہے۔ زرد رنگ میرے لئے کثرت و فراوانی کا نشان ہے۔ اور اسے دیکھکر میرے دل میں فوراً آفتاب کی لہریں لیتی ہوئی کرنوں کا تصور آ جاتا ہے۔ یہ نہایت زندگی بخش اور امید افزا ہے اور زمردین رنگ سراپا شادابی ہے۔ سورج کی گرم کرنوں سے مجھے ایسی خوشبو آتی ہے جس سے ذہن فوراً سُرخ رنگ کی طرح چلا جاتا ہے۔ اور ٹھنڈک سے ایسی مہک محسوس ہوتی ہے گویا میں سرسبز روئیدگی کے درمیان کھڑی ہوں۔

اور سیاہ! سیاہ ناکامی اور مایوسی کی علامت ہے لیکن بھُورا کاندھوں کے گرد لپٹے ہوئے شال کی مانند ہے۔ سفید کے معنے اوج اور سرفرازی کے ہیں۔

ہلکے نیلگوں رنگ سے امید اور گہرے نیلگوں سے مستقل ارادہ

مراد ہے بنفشی نازک، گہرا اور نیم اُداس رنگ ہے ۔ ارغوانی ایک
پُراسرار رنگ ہے اور قدرت کا یہ فعل نہایت قابل قدر ہے کہ ہمیں
آسمان پر ہر جگہ ارغوانی رنگ نظر آتا ہے ۔ کیونکہ یہ زندگی کی عمیق مسرت
اور ایک شاندار کارنامے سے دوسرے کی طرف رجوع کرنے کی علامت
ہے اور اس سے ایک نامعلوم محبت کی گہرائی بھی ظاہر ہوتی ہے ۔

میرا خیال ہے میرے ذہن میں چمکدار رنگوں کا بھی تصور ہے ۔
کیونکہ مَیں نے اپنی انگلیوں سے صابن کے ٹوٹتے ہوئے بلبلوں کو محسوس
کیا ہے ۔

ان انگلیوں سے جو میرے کانوں اور آنکھوں کے فرائض انجام دیتی
ہیں میں نے بیشمار حیران کُن تجربات حاصل کئے ہیں ۔ ان میں سے ایک
جنڈول کے گیت سننا بھی ہے ۔ مَیں کالج سے ابھی فارغ ہوئی تھی ہم
ریتھم واقع مانچسٹ کے ایک پُرانے دیہقانی مکان میں رہتے تھے ۔
میری معلمہ مس سیلوین نے جو بعد میں مسز جان اسے ملیسی ہوگئیں میرے
لئے اوپر کی منزل میں ایک برآمدہ بنا رکھا تھا جس میں میری خوابگاہ سے
راستہ جاتا تھا ۔ اور مَیں جب چاہتی تھی وہاں جاسکتی تھی ۔ سدا بہار کی
بیلیں جنگلے کے اسقدر قریب آچکی تھیں کہ مَیں اُس پر جھک کر اس کی سرسراتی
ہوئی پتیوں کی موسیقی محسوس کرسکتی تھی ۔ برآمدے کے جنوبی کنارے
پر مَیں ارغوانی انگوروں کی بیلوں کو چھُو سکتی تھی جو اپنی پیچدار اور طویل
انگلیوں سے جنگلے سے لپٹ رہی تھیں اور برآمدے کے بالمقابل بائیں
باغ اور سیب کے درخت تھے ۔ جن پر بہار جھُول رہی تھی ۔ اور جن کی
خوشبو سے فضا مہک رہی تھی ! میں ارغوانی انگوروں کی بیلوں کے سایہ
میں کھڑی تھی ۔ میرے ہاتھ جنگلے پر رکھے تھے اور خیالات بہت دور تھے
یکایک جنگلہ غیر معمولی طور پر تھرتھرانے لگا لیکن یہ جنبش نہایت موزوں
تھی ۔ اور مجھے اس کا تکرار اس طرح محسوس ہوتا تھا گویا مَیں نے ایک مُغنی
کے گلے پر اُنگلی رکھی ہوئی ہے ۔ یہ تھرتھراہٹ اچانک بند ہوگئی ۔ اور میں نے
اپنے رُخساروں پر انگور کے شگوفوں کو ایک ننھی سی گھڑی کے لنگر کی مانند گدگدی
کرتے ہوئے محسوس کیا ۔ مَیں نے خیال کیا کہ نسیم کے ہلکے ہلکے جھونکے یا
کوئی ننھا سا جانور بیلوں کو حرکت دے رہا ہے ۔ اب جنگلا پھر تھرتھرانے
لگا ۔ لیکن موزوں جنبشوں سے پہلے ایک عجیب طرح کی ضرب محسوس ہوتی
تھی جس کا اس سے پہلے مجھے کبھی احساس نہ ہُوا تھا ۔ میں نہ کسی قسم کی
حرکت کرسکتی تھی اور نہ آواز دے سکتی تھی ۔ لیکن یہ آواز مسز میلسی نے بھی
سُنی تھی ۔ اس نے اپنا ہاتھ کھڑکی سے نکال کر نہایت خاموشی سے مجھے چھُوا ۔
میں جانتی تھی کہ مجھے بولنا نہیں چاہئے ۔

اس نے اپنے مخصوص انداز میں انگلیوں سے مجھے بتایا "یہ جنڈول
ہے وہ جنگلے پر تمہارے اسقدر نزدیک بیٹھا ہے کہ تم اسے چھُو سکتے ہو ۔
لیکن ایسا نہ کرنا چاہئے ـــــــ وہ اڑ جائیگا اور پھر کبھی واپس نہ آئیگا"

اب مجھے معلوم ہُوا کہ وہ بار بار " چن ــــ ٹو ــــ ل ۔ چن ۔
ٹو ــــ ل" کہہ رہا تھا ۔ مَیں اس کے موسیقی آمیز سُروں کو سمجھ سکتی
تھی ۔ یہ نغمے میری قوت لامسہ کو نہایت مسرت بخش معلوم ہوتے تھے ۔
اور مَیں ان کو لحظہ بلحظہ بلند اور تیز ہوتے محسوس کرتی تھی ۔

مسز میلسی نے مجھے پھر چھُوا اور انگلیوں سے حرف بناتے ہوئے
کہا " اس کی محبوبہ سیب کے درختوں پر سے اسے جواب دے رہی ہے ۔
وہ وہاں چھُپی بیٹھی تھی ۔ اب وہ دونوں ملکر گا رہے ہیں" ۔

جب جنگلا تھرتھرانا بند ہوگیا ۔ اس نے کہا اب وہ دونوں سیب
کے درخت پر سفید اور گلابی پھولوں کے لہراتے ہوئے شگوفوں میں
گا رہے ہیں" ۔

" طیور خاموش ہیں فضا میں
ازل سے بہرے ہیں کان میرے

مگر مَیں سُنتی ہوں دل کی گہرائیوں میں بیتاب ان کے نغمے" میرا خیال
ہے ۔ بہت کم لوگ ایسے ہیں جن کو قوت لامسہ کی وسعت کا صحیح اندازہ
ہے ان کا خیال ہے کہ یہ صرف انگلیوں کے سِروں تک محدود ہے ۔
لیکن حقیقت یہ ہے کہ اس کی حکومت تمام جسم پر ہے اور ہر حصہ جسم کی
جلد ضرورت کے وقت غیر معمولی طور پر تمیز کرسکتی ہے ۔ یہ کہنا تقریباً
صحیح ہے ۔ کہ جلد کا ہر نقطہ "فیلر" ہے جو احساس رکھتا محسوس کرتا اور
دماغ کو نتائج مترتب کرنے کے لئے مواد بہم پہنچاتا ہے ۔ میرا تمام جسم
فضا کے تغیرات کو نہایت باریکی کے ساتھ محسوس کرتا ہے ۔ اور میرا
خیال ہے کہ دنوں کا اختلاف میرے لئے بھی ویسا ہی نمایاں ہے جیسا
کسی اور کے لئے ۔

مجھے ان دنوں کا بھی شعور ہے جب ہوا نقری غبار کے ترشح میں
تارِ عنکبوت کے نقاب کی مانند لہریں لیتی ہے ۔ مَیں اُن مسرت بخش
دنوں کو بھی جانتی ہوں جب آفتاب مژدہ بہار لاتا ہے اور مَیں اُن
دنوں سے بھی واقف ہوں ۔ ان شور انگیز دنوں سے جو مجھے چست اور
چالاک بنادیتے ہیں ۔ ہوا آ آکر مجھے تھپیڑے مارتی ہے اور مجھے کودنے
پھاندنے اور کشتی لڑنے پر اُکساتی ہے ۔

میرے لئے فطرت کی دلفریب ترین پُکار اس کی لامتناہی حرکت
ہے جسطرح روح کا اہتزاز چہرے پر زندگی کے آثار پیدا کردیتا ہے

اسی طرح حرکت فطرت کی دیوہیئت قوتوں کو نمایاں کر دیتی ہے اور ہوا زمین کی جان ہے۔ میرے خیال میں یہ درخشاں ترین مناظر کو اور دلکش اور حسرتناک نظاروں کو منور کر دیتی ہے۔ میرا خیال ہے۔ کہ درختوں، لہلہاتے کھیتوں اور سمندروں کا حسن حرکت کی وجہ سے ہی ہے جب میں ہوا کو شاہد فطرت کی سبز گھاس کی کاکلیں پریشان کرتے یا پتوں کی دنیا میں اپنے بازو پھڑپھڑاتے دیکھتی ہوں۔ میری انگلیاں کانپنے لگتی ہیں۔ یہ غیر مرئی متغیر اور لامحدود مخلوق جو دور دور سمندروں اور میدانوں پر بے خانماں پھرتی ہے۔ نشوونما اور ابدیت کا نشان ہے یہ میری حس لامسہ کے لئے وہی رتبہ رکھتی ہے جو افق آنکھوں کے لئے ہے۔ اس سے مجھے لامحدود خلا، سرِ کائنات اور بلندی کا احساس ہوتا ہے۔ ہوا ان مسرتوں، آرزؤں اور امیدوں کا نشان ہے جن سے خدائی رُوح میرے دل کی زندگی کو روشن اور منور رکھتی ہے۔

ذاتی آزادی کا انتہائی طمانینت بخش احساس مجھے اسوقت ہوتا ہے جب میں اپنے تئیں ہوا کا جزو محسوس کرتی ہوں۔ یہ احساس مجھے پہلی بار اس وقت ہوا جب کیلے فورنیا میں (Deliverance) کے فلم میں کام کرتے ہوئے مجھے ہوائی جہاز میں پرواز کرنے کا اتفاق ہوا۔ جب میں اڑتے ہوئے گرد و غبار۔ لہلہاتے ہوئے انگورستانوں تیز خوشبودار یوکلپٹس کے درختوں کے پاس سے ہوتی ہوئی ہوائی کوہساروں کی بلند چوٹیوں پر اُڑ رہی تھی۔ میں نے محسوس کیا کہ زمین اور بالائی فضا میں سب سے نمایاں فرق یہ ہے کہ بلندی کے ساتھ ساتھ مہک کم ہوتی جاتی ہے۔ جب ہم ہوا کے دوش بدوش جا رہے تھے میں ارغنوں کی موسیقی۔ سمندروں کی لہروں کا شور اور دُور کے پہاڑوں اور لامحدود میدانوں میں ہوا کے فراٹے سن رہی تھی۔ جہاز فضا میں گرتا اور اُبھرتا۔ میرے لذت آفریں خیالات میں بھی زیروبم پیدا ہو جاتا اور مجھے ایسا معلوم ہوتا تھا کہ میں دیوتاؤں کے رقص کو محسوس کر رہی ہوں۔

کیا ہم میں سے بے حس ترین لوگ بھی پانی سے محبت نہیں کرتے؟ کیا یہ ہمارے لئے بمنزلہ ایک دوست کی محبت بھری آواز کے نہیں ہے؟ آفتاب ہر صبح اور ہر سال بالائے سر چمکتا ہے لیکن ہم اس سے کبھی نہیں اُکتاتے۔ یہ کہنا "سورج چمک رہا ہے" نہایت مسرّت بخش ہے۔ اسی طرح یہ کہنا بھی جیسا کہ میں کئی بار کہہ چکی ہوں "یہ پانی" بڑا نہایت دلکش ہے۔ یہ خدا کی ان بہترین نعمتوں میں سے ہے جنہیں میں جانتی ہوں آفتاب اور پانی! ——— ان کی دلفریبی اور دلآویزی کبھی ختم نہیں ہوتی۔

بے بصر ہونے کی وجہ سے میں کوئی دنیا سے نرالی نہیں ہوں۔ شائد یہ امر ان عناصر سے میرے محبت کو اور بھی شدید کر دیتا ہے۔ جو نہایت حیران کُن طور پر میری روح کے قریب معلوم ہوتے ہیں۔ پانی جو مختلف پہلو بدلتا۔ زندگی کے دم بھرتا۔ حدود توڑتا اور ایک مضبوط ارادہ لئے ہوئے سمندر کی آزادی سے ہمکنار ہونے جاتا ہے۔ میرے پُر درد احساس کو سکون بخشتا ہے کیونکہ وہ رُوح کی مخفی آرزوؤں کا ہم آہنگ ہوتا ہے

پانی قوت لامسہ کے لئے ہر جگہ ایک قسم کا نہایت گہرا اور سنسنی پیدا کرنے والا احساس مہیا کر دیتا ہے۔ ایک جھیل کے کنارے کنارے چلتے یا ڈھلوان گھاٹی پر چڑھتے ہوئے میں نے سبز کائی سے ڈھپی ہوئی چٹان سے پانی کے ٹپکتے ہوئے قطروں، ستار کے نغمہ ریز تاروں کی مانند لرزتی ہوتی ندیوں۔ شور انگیز آبشاروں۔ دھماکے سے پھٹتی ہوئی دراڑوں اور خاموش پر سکون اور ہمیشہ بہتے ہوئے دریاؤں اور اس کے دیگر مناظر کی بے شمار تصاویر لے کر اپنے دماغ کے تصویر خانے میں رکھی ہیں۔

لیکن یہ محبت آمیز جذبات سمندر سے میرے دل میں پیدا نہیں ہوتے۔ اس کی وُسعت اکثر اوقات بے رحم طور پر یاس افزا ہوتی ہے۔ یہ وسعت آفتاب کی فیاضانہ حرارت یا فضا کی اس غیر محدود لیکن آشنا چھُونے کی سی وسعت نہیں جو میرے گرد اس مسرت آمیز قربت سے حلقہ کئے ہوئے ہے گویا کہ میں ان عناصر کے پہلو میں ایک درخت ہوں۔ ہوسکتا ہے کہ تاریکی اور خاموشی کے سمندر سے مسلسل طور پر مانوس ہونے نے میرے سمندر کے اصلی احساس پر کچھ رنگ چڑھا دیا ہو۔ جس طرح میں متحرک حسن یا آفتاب میں جگمگاتے ہوئے مصفا پانی کے تالاب کے کنارے کھڑی ہو کر سانس لیتی ہوں اسی طرح میں اپنی رُوح کے دل کو بے بصری کی ہیبت ناک فضا کی بجائے انسانی آنکھ کی ظلمت ربا نور سے آباد کرنا چاہتی ہوں میں بحر اطلانٹک کی بیدرد طاقت کا زیادہ دیر تک تصوّر کرتے ہوئے اُکتا جاتی ہوں اور پُرسکون دنوں میں میں اس امر کے احساس کے بغیر نہیں رہ سکتی کہ بے رحم برعکس سکون کے ساتھ بے شمار جہازوں اور انسانوں کو تباہ و ہلاک ہوتے دیکھتا ہوگا۔ اور وہی بات ہے جس سے دم گھونٹنے والی خاموشی کا احساس ہوتا ہے۔

زندہ دلی اور سمندر کے مخاصمانہ مقابلے کے ایسے لمحے بھی ہوتے

ہیں جب میں اس پر تیرتی یا اس کی موجوں میں کود پڑتی ہوں۔ میرے لئے غیر متحرک خشکی سے قدم اٹھا کر سیال دنیا کو اپنے سامنے سے بھاگتے اور شکست کھاتے ہوئے محسوس کرنا نہایت اطمینان بخش ہے۔ موجیں دیکھکر میرا دل اُچھلتا ہے۔ جب میں ان کو غضبناک ہو کر اپنے جسم سے تھپیڑے مارتے اور تیور بدلتے محسوس کرتی ہوں۔ میرے جسم کی تمام سطح کا خون گاتا ہے۔ سمندری بیلوں کو لہراتے اور ابھرتے ہوئے دیکھنا، گھونگھوں، سیپیوں اور کوڑیوں کا پاؤں سے چھونا اور ہر لمحہ یہ خیال کرنا کہ دوسری لہر مجھے اس خوفناک رات سے دُور لیجائیگی۔ ایک عجیب قسم کا احساس پیدا کرتا ہے۔

جب میں پہلے پہل نیاگرا کے آبشار کو دیکھنے گئی۔ بہت کم عمر لڑکی تھی۔ میں ڈاکٹر الیگزنڈر گرہیم بل کے ساتھ چوٹی پر قصر کے کنارے حیران کھڑی تھی اور آبشار کی دنیا کو ہلا دینے والی گونج میرے جسم کے ذرے ذرے میں تھرا رہی تھی۔ اس منظر کی ہزاروں دلفریبیاں ہماری رُوح کو اس پُرخطر دُھنک کی طرف لے جاتی تھیں جہاں سے بادلوں کی مانند موجیں لیتی ہوئی پھوار اٹھ کر ہمیں چھپا لیتی تھی۔ نیاگرا پر قدرت اپنی تمام تر شان و شوکت اور زبردست قوت کا مظاہرہ کرتی ہے یہاں اس میں مختلف متضاد صفات پائے جاتے ہیں۔ وہ ہیبتناک، دغاباز، دلربا، نکھیلوں کی طرح نرم، خونخوار بھیڑیے کی مانند وحشی ہوتی ہے۔ اور اپنی گہرائی کو قوس قزح کی پھوار سے چھپا رکھتی ہے۔ ہم نے چٹانیں معلوم کرنے اور سر کے بل گرتے ہوئے پانی کو مختلف مقامات سے دیکھنے میں کئی گھنٹے صرف کئے۔ ہم ایک عجیب قسم کے جھولے میں سوار ہو کر نیچے اترے۔ میں نے محسوس کیا کہ میں شور کے ایک سمندر میں غرق ہوں۔ گویا میری دنیا کے گرد کروڑوں گھوڑے دوڑ رہے ہیں جن کے نتھنوں سے بڑے زور شور سے جھاگ نکل رہے ہیں۔ میں نے پانی کو برف کے گرتے ہوئے تودوں منجمد ندیوں چشموں کی پھواروں۔ سمندر کی موجوں اور دوسری بہت سی صورتوں میں محسوس کیا ہے لیکن پانی کا یہ طوفان ابھی میرے تصور میں بھی نہ آیا تھا۔

جب میں سوچتی ہوں کہ قدرت کی زبان میرے لئے کسقدر واضح ہے۔ میں اپنی معلمہ مسز میسی کے متعلق ممنونیت اور شکر گذاری کے جذبات محسوس کئے بغیر نہیں رہ سکتی۔ جس نے میری پرورش اور تربیت اس ماحول میں کی جس نے میرے دل میں زمین کے دلکش مناظر، سمندر اور ہوا کی غیر فانی محبت پیدا کر دی۔ یہ صرف اس کی ہی ہستی تھی جس نے زمین کے مکتب اور آسمانوں کی یونیورسٹی میں مجھے وہ حقیقی تعلیم دی جسکو آئین زندگی کی صحیح تفسیر کہا جا سکتا ہے۔ اماں بھی چمنستانوں کے مشاغل کو بہت پسند کرتی تھیں۔ ان کو پھولوں سے زیادہ کسی چیز سے محبت نہ تھی۔ اور پرندوں سے بھی انہیں اسقدر ہی محبت تھی جسقدر کہ خوش رنگ پھولوں سے۔ وہ رینتھم میں اپنے گھر کے نزدیک ایک مختصر سے بن میں کئی لمحے پرندوں کی محفل میں بسر کر دیتی تھیں اور نہایت دلچسپی سے انہیں آشیاں تعمیر کرتے، بچوں کو دانہ کھلاتے اور انہیں اڑنا سکھاتے دیکھتی تھیں۔

میں نے ملک کے طول و عرض میں کافی سفر کیا ہے لیکن میں نے اپنے آپ کو شہروں کی اجنبیت سے کبھی مانوس نہیں پایا۔ ہاں جہاں جنگل کی کھلی ہوا ملتی ہے وہاں میرے دل کو ایک عجیب اطمینان محسوس ہوتا ہے۔ بہار و خزاں، سرسبز چراگاہوں، ندیوں اور لہلہاتے ہوئے کھیتوں کے اس پار سے میرے لئے دلفریب پیام لاتے ہیں۔ میں خدا کی آزادی اور آزاد زندگی کے نغموں کو ہر طرف محسوس کرتی ہوں۔ لیکن ان پُرسکون اور وسیع حسیات کا لطف گاڑیوں اور موٹروں کی بھیڑ یا شہر کے بلند ہوٹلوں اور تنگ و تاریک گلیوں میں اٹھانا ناممکن ہے۔ میں اپنے تئیں ہوٹلوں کی زندگی کا کبھی عادی نہیں بنا سکی۔ وہاں کی تصنع آمیز فضا میرے دل کو بیزار کر دیتی ہے۔ وہاں ایسے باغات نہیں مل سکتے جہاں میں تنہائی میں پُرنور اور شاندار ایام کی مسرت کو محسوس کر سکوں۔ اس وقت میں شخصی آزادی کے فقدان کو نہایت المناک طور پر محسوس کرتی ہوں دل اپنے تئیں اس بیکاری میں گھرا پاتی ہوں جو بے بضاعت تنفس کے لئے نہایت تکلیف دہ ہے تقریباً وہ تمام بے بصر آدمی جنہیں میں جانتی ہوں ـــــ اور ان کی تعداد کچھ کم نہیں ہے ـــــ سیر کا خوب لطف اٹھاتے ہیں۔ میرے لئے بھی یہ ایک دلخوش کن تفریح ہے لیکن شہر کے دل میں میں اس کا کبھی لطف نہیں اٹھا سکتی جہاں پیدل چلنے والوں کا ہجوم۔ گاڑیوں اور موٹر ریل کا شور، ریل کے راستوں کی کھٹا کھٹ میرے حواس کو گھبرا دیتی ہے اور ان پر انتہائی بدحواسی طاری کر دیتی ہے۔ مجھے ہر وقت یوں محسوس ہوتا ہے کہ شورشوں کا ایک عظیم الشان پہاڑ غضبناک ہو کر میری طرف بڑھا چلا آتا ہے گویا وہ میرے جسم کو فنا کر دیگا۔ اگر ایک توپ میں گولہ بھر کر اس کا دہانہ میری طرف کر دیا جائے تو میرا خیال ہے مجھ پر کبھی لرزہ خیز ہیبت طاری نہ ہوگی۔ دیہات میں میرے دل کو گونہ اطمینان ہوتا ہے۔ مجھے ہر اس چیز میں جو میرے پاؤں سے چھوتی ہے ایک زندگی محسوس ہوتی ہے۔ باغ میں خواہ میں کسی وقت جاؤں، خنک اور پاکیزہ صبح ہو جب مشرق کی طرف آفتاب کے سنہری دروازے کھول دئے جاتے

ہیں اور اپنے سر سراتے آشیانوں میں پرندوں کو ان کی زندگی کا احساس کراتے ہیں یا دوپہر کا وقت ہو جب زندگی کے پھریرے اُڑائے جاتے ہیں۔ اور سورج کی روشنی دنیا کی ہر شے پر ایک شاندار ملمع کر دیتی ہے۔ شام کا سحر پاش سکوت ہو جب سائے چپ چاپ میرے راستے پر پھیل جاتے ہیں پرندے پر سمیٹ لیتے ہیں اور گھاس کی تاریکی میں جگنوں اپنی بیشمار شمعیں روشن کرتے ہیں ——— میں ایک لامحدود مسرت سے معمور ہو جاتی ہوں۔ اور میرا دل اُس خالق کی تعریف کے گیت گاتا ہے۔ جس نے مکان اور زماں کی دنیا میں میرے لئے یہ مختصر سی جگہ بنائی۔ اور میرے تاریک لمحوں کی تسلی کے لئے پھولوں کو پیدا کیا ہے۔ میں ہر موسم میں اپنے باغ کی فضا کا لطف اٹھاتی ہوں۔ سردیاں بھی اپنے دلفریب اور دلچسپ مشاغل سے میرے لئے سامان تفریح مہیا کر دیتی ہیں۔ جب میں باغ کی روش پر خوشی سے معمور ہو کر چلتی ہوں ہوا شاخوں کو ہلا کر مجھ پر ہلکی ہلکی برف کی بارش کرتی ہے۔ میں چند چند منٹ کے وقفوں کے بعد دستانے اُتار کر منجمد درختوں اور جھاڑیوں کو چھوتی ہوں کہ خدا کی صنعت گری کے اس شاہکار کو محسوس کروں جس کو اس نے ہوا اور برف کے انوکھے اوزاروں سے تعمیر کیا ہے۔ اس پختہ راستے پر چلتے چلتے تو دائیں طرف کو مڑ جاتا ہے میں عموماً درختوں کے کنج میں جا نکلتی ہوں۔ لیکن جب برف ذرا گہری ہوتی ہے باغ کے تمام راستوں کے نشان مٹ جاتے ہیں۔ میرے پاؤں باغ کے تمام فرش کو ہموار محسوس کرتے ہیں۔ میں راستہ بالکل بھول جاتی ہوں۔ اور اندھا دھند راستے کی تلاش میں چل نکلتی ہوں اور ٹھوکریں کھاتی اپنی بے لبصری پر ہنستی باڑ تک پہنچ جاتی ہوں جہاں سے روش شروع ہوتی ہے . . . . . .

جب وقت کا ہاتھ کتاب قدرت کے اوراق الٹ کر جون کا صفحہ نکالتا ہے۔ میں اپنا ہر کام خواہ وہ کچھ ہی ہو چھوڑ کر خوشی کی مملکت میں داخل ہوتی ہوں۔ اس وقت فطرت کی بارگاہ میں بہار کے پھول نذر چڑھائے جاتے ہیں۔ اور ہر آنے والا دن حسن کی اس نمائش گاہ میں حسن کے اچھوتے نمونوں کا اضافہ کرتا ہے۔ جون کے ایام میں سدا بہار بیلوں کا یہ حلقہ جو میرے باغ کے چاروں طرف کھنچا ہے۔ طبلہ عطار بنا ہوتا ہے۔ سدا بہار اور میدانی گھاس کی خوشبو سوسن اور لالہ کی بھینی بھینی مہک سے ہم آغوش ہوتی ہے۔ چمکدار اور خوش رنگ پھول میرے پہلو بہ پہلو چلتے اور اپنے پیارے پیارے چہرے اٹھا کر مجھے دیکھتے ہیں۔ جہاں گھاس زیادہ نرم ہوتی ہے بنفشہ اپنی نیلگوں آنکھیں کھول کر حیرانی سے میرا مُنہ تکتی ہے۔ میں وادی کے بنفشہ اور سوسن کے پھولوں کو خواب آلود پھول کہتی ہوں کیونکہ وہ ہمیشہ خواب کے چمنستان میں کھلتے ہیں۔ سدا بہار کی باڑ پر شہد کی مکھیوں کے چھتے قطار در قطار لگے ہوتے ہیں اور اس طرف سے آنے والی نسیم انکی دلفریب خوشبو میں بسی ہوتی ہے۔ یاسمین کی بیلیں اپنی پتلی پتلی نازک شاخیں مجھ سے بغلگیر ہونے کے لئے آگے بڑھاتی ہیں۔ لیکن جب میں گذرنے کے لئے انہیں ایک طرف جھٹک دیتی ہوں تو اس کے نازک پھولوں کی بہار لوٹنے والی گستاخ اور بے ادب مکھیاں دھوپ میں چمکتی ہوئی منتشر ہو جاتی ہیں۔ ایک قسم کے حسین اور طویل پھولوں کے پودے جو جاپان اور جرمنی سے لائے گئے ہیں اس روش کی دونوں جانب اپنے قوس قزح کے سے رنگوں کی بہار دکھاتے ہیں جو مالی نے گرمائی مکان کے گرد ایک ریشمی ڈورے کی مانند بنا رکھی ہے۔ باغ کے ایک گوشے میں سفید پھولدار درختوں کا ایک جھاڑ ہے۔ جون میں اس کی شاخیں حسن فطرت اور خوشبو سے لد جاتی ہیں اس حسن فطرت اور خوشبو سے جس کو آج تک کوئی شاعر الفاظ کا جامہ نہیں پہنا سکا۔ اگر روحیں پھولوں میں سما سکتی ہیں تو میری رُوح اس پھول کو زیادہ پسند کرے گی۔

مئی کے سارے مہینے اور جون کے اوّلین ایام میں گل لالہ کا آتشیں طوفان وادی اور سبزہ زار کو ڈھانپ لیتا ہے۔ درمیان میں کہیں کہیں نرگس اور نیلوفر کے ٹکڑے بھی نظر آتے ہیں لیکن میں ہاتھ بڑھا کر سوسن کا پھول بھی توڑ سکتی ہوں۔ آہ! محبت جو اپنی تکمیل اپنے نیازمندوں کو زندگی بخش کر کرتی ہے میرے اس باغ عدن پر اپنا تسلط جما چکی ہے۔

کچھ عرصہ ہُوا دو مہمان آکر ایک سفید پھولوں اور شگوفوں سے لدے ہوئے درخت پر بیٹھ گئے۔ یہ ان درختوں میں سے ہے۔ جو میرے باغ کے ارد گرد لگے ہوتے ہیں۔ صبح شام جب میں اس کے پاس سے بار بار گذرتی ہوں۔ میں اس کی شاخوں کو چھُوتی ہوں۔ دونوں مہمان یعنی چنڈول اب اس درخت پر اقامت گزیں ہیں۔ وہ زندگی کے کاروبار میں نہایت توجہ سے منہمک رہتے ہیں اور میرا خیال ہے اب مجھ سے خائف نہیں ہیں۔

شروع شروع میں جب میں شاخوں کو چھوتی تھی وُہ اُٹھ کر کسی قریب کے درخت پر جا بیٹھتے تھے اور میں محسوس کرتی تھی کہ وہ نہایت توجہ سے مجھے دیکھتے ہیں۔ میں ان کے لئے دانہ لے گئی اور انہیں اپنے ناموزوں انسانی طریقے پر بتانے کی کوشش کی کہ میں اُن کی دوست ہوں معلوم ہوتا ہے وہ بھی اس بات کو سمجھ گئے۔ کیونکہ وہ اپنے آشیانے میں

واپس آگئے ۔ اور پھر اس طرف توجہ نہ کی کہ میں کیا کرتی ہوں ۔ اس کے بعد میں اپنے دونوں ہاتھ شاخوں پر رکھکر بہت عرصہ کھڑی رہتی اور اکثر دفعہ پتوں کو لرزتے اور نازک شاخوں کو اپنے ہاتھوں پر جھکتے محسوس کرتی ۔ ایکبار میں نے اپنے ہاتھوں کے بہت قریب کچھ حرکت سی محسوس کی ۔ اور چند دن بعد ایک ننھے سے پنچے کو اپنی انگلی پر چٹکی لینے دیکھا ۔ اب نر نہایت اطمینان سے میرے ہاتھ پر آکر بیٹھ جاتا اور ہم دونوں یکدوسرے کو اچھی طرح جانتے تھے ۔ کوئی پرندہ کسی کے ہاتھ پر بیٹھ کر خاموش نہیں رہتا ۔ چنانچہ یہ بھی میرے ہاتھ پہ گاتا اور پھر درخت کی ٹہنیوں پر پھدکتا پھرتا ۔ میرا خیال ہے وہ اپنی مادہ کو بھی میرے متعلق بتاتا ہوگا ۔ جب وہ انڈے سے رہی تھی وہ بھی کبھی باہر شاخ پہ آکر بیٹھتی اور مجھے دیکھتی اسے بہ ضرور یقین ہوگیا ہوگا کہ میں انہیں کوئی گزند نہ پہنچاؤں گی کیونکہ وہ اپنے بچوں کو میری حفاظت میں چھوڑ کر دانے کی تلاش میں نکل جاتی تھی ۔

آخیر گرما میں میری ایک نابینا سہیلی مجھ سے ملاقات کرنے آئی ۔ ہم مطالعے کے کمرے میں بیٹھے باتیں کر رہے تھے ۔ یکایک بادل گرج کر آیا اور موسلا دھار مینہ برسنے لگا ۔ میری سہیلی اٹھ کر کھڑکی کے پاس جا کھڑی ہوئی ۔ وہاں اسنے ایک پرندے کی دردناک آواز سُنی اور میرا ہاتھ پکڑ کر وہاں لے گئی ۔ "شائد کوئی پرندہ جالی میں پھنس گیا ہے اور اب وہ پھڑ پھڑا رہا ہے" ۔ اس نے کہا ۔ اس بارش میں کھڑکی کے باہر کی جالی اتارنا سخت مشکل تھا ۔ لیکن ہم اس میں کامیاب ہوگئے ۔ میں نے دیکھا کہ میرا چنڈول انگوروں کی بیلوں کے نیچے جالی میں پھنسا ہوا ہے ۔ چنانچہ جالی اتارتے ہی وہ پھڑ پھڑاتا ہوا میرے ہاتھ پر آگیا ۔ اس کے پر بارش سے بھیگ رہے تھے اور اس سے اڑا نہیں جاتا ہے ۔

جب وہ ذرا خشک ہوئے تو اس نے کمرے میں اُڑنا شروع کیا ۔ میں تصور کر رہی تھی کہ وہ اپنی ننھی ننھی آنکھوں سے میرے کمرے کی ہر چیز کا جائزہ لے رہا ہے ۔ جب مینہ کی بوچھاڑ ذرا کم ہوئی تو ہم اسے کھڑکی کے پاس لے گئے لیکن وہ ہمیں چھوڑ کر جانا نہ چاہتا تھا ۔ وہ اپنے نوکدار پنجوں سے میری انگلی کو مضبوط پکڑے ہوئے تھا ۔ اس کا جسم آگے کو جھکا ہوا تھا ۔ گویا وہ کہنا چاہتا ہے "میں باہر جانا نہیں چاہتا ۔ تم مجھے کیوں نکالتی ہو" ۔ میں نے اسکو دہلیز پر بٹھا دیا لیکن وہ اُڑ کر پھر کمرے میں آگیا ۔ اس بار وہ کوچ کے نیچے چھپ گیا اور ہم اس کو نہ پکڑ سکے ۔ کیونکہ اس کے لئے دیکھنے والے کی ضرورت تھی ۔ لیکن وہ پھر پھدک کر کھڑکی کی دہلیز پر آبیٹھا ۔ میں نے خیال کیا کہ وہ کہہ رہا ہے "آہ انہیں معلوم ہے میرے دل پر کیا گذر رہی ہے ۔ اس تردد میں ہوں کہ باہر جاؤں یا یہاں رہوں" بالآخر اس نے آہستہ سے اپنے بازو پھیلائے اور بادل ناخواستہ تازہ اور دھلی ہوئی فضا میں چلا گیا ۔ اس کے بعد میں نے اسکو پھر کبھی نہیں دیکھا ۔ . . . .

آہ ! جب میری روح دنیا کے تفکرات سے مغموم ہوتی ہے میں سدا بہار کی روش پر ٹہلتی ہوں اور اس سے میری روح کو بہت تسکین ہوتی ہے ۔ میں اس پھول کی مانند محسوس کرتی ہوں جو رات بھر کا بار برداشت کرنے کے بعد صبح کے وقت اپنا سر اٹھاتا اور آسمان کی طرف دیکھتا ہے ۔ اور جب میں سبز پوش دوستوں کے حلقے میں پھرتی ہوں مجھے محسوس ہوتا ہے کہ میں زمین کی تاریکی میں جڑوں کا گیت سُن رہی ہوں ۔ وہ اپنے اس دلفریب شاہکار کو کبھی نہیں دیکھتیں جس کی نشوونما وہ زمین کی سطح کے اوپر کرتی ہیں ۔ وہ زمین کی تاریک گہرائیوں میں مخفی رہتی ہیں ۔ لیکن ان سے نور کے پھول کھلتے ہیں ۔ وہ ذلیل اور حقیر ہیں لیکن پھول اور اشجار پیدا کرنے کی قوت رکھتی ہیں . . . .

میں جنگل میں گھاس پر ہاتھ پھیر کر ننھی ننھی مخلوق کی رفتار محسوس کرتی ہوں ۔ مجھے ان تاریک رستوں سے محبت ہے جن سے سبز اور نمناک گھاس کی بو آتی ہے ۔ مجھے وہ تنگ گھاٹیاں اور وادیاں پسند ہیں جن کے درخت اور جھاڑیاں مجھے راستہ چلتے ہوئے چھوتے ہیں ۔ میں جھوٹے سے پل پر کھڑے ہو کر اس ندی کے گیت سننا پسند کرتی ہوں جس کی سطح پر لہریں بہتے ہیں ساکن اور مبہم جسم کے ساتھ میں لاکھوں اور کروڑوں آوازیں سنتی ہوں جنہیں میں پہچانتی ہوں مثلاً پتوں اور گھاس کا سرسرانا ۔ شاخوں تا اس وقت کا ہلنا جب کوئی پرندہ اُن پر بیٹھتا ہو طویل گھاس کے تنکوں کا کسی ٹڈے کے پھدکنے کے بوجھ سے لہرانا اور سرکنڈوں کے پردوں کا ہوا میں پھڑ پھڑانا ۔ میں ان سب آوازوں کو سنتی ہوں ——— ور میں بہری ہوں ۔

اکثر اوقات جب گھر میں سب سوئے ہوتے ہیں میں خاموشی سے پُرسکون اور دُھندلے باغ میں جہاں سوسن اور گلاب کے پھول پہلو بہ پہلو اُگ رہے ہوتے ہیں آجاتی ہوں ۔ میں صبح صادق کے دلفریب دھندلکے میں پھولوں کے سایوں کے پاس کھڑی ہو کر دن کی پیدائش کا انتظار کرتی ہوں ۔ زمین کا سینہ بنفشہ کے پر برگ پودوں سے ڈھکا ہوتا ہے ۔ آسمان پر اجالا ہوجاتا ہے ——— میں سر اٹھا کر اپنے عاشق آفتاب کو اس کے حسین چہرے کے ساتھ نقرئی اور دُھندلے سمندر پر طلوع ہوتے ہوئے دیکھتی ہوں ——— اور میں اس شے سے ہم آغوش ہوتی ہوں جس کی تمنا اور امید ۵

(ہیلن کیلر) حنیف ہاشمی

۵ میرے دل میں دیر سے موجزن ہوتی ہے یعنی ——— روشنی!

کلیوپیٹرا

[انٹونی مصر سے اپنی بیوی کی بغاوت اور موت کی خبر سنکر روما واپس آتا ہے لیکن سیزر سے خلاف توقع تعلقات اچھے ہو جاتے ہیں۔ اور انٹونی کی شادی اس کی بہن اکٹاویا سے ہو جاتی ہے سیزر کا ایک دوست میاسنا انٹونی کے رفیق اینو [illegible] سے کلیوپیٹرا کے متعلق پوچھتا ہے۔]

میاسنا - اگر میری اطلاع صحیح ہے تو وہ بہت اقبالمند خاتون ہے۔

اینو - اس نے ساحل نیل پر پہلی ملاقات میں ہی انٹونی کا دل اڑا لیا تھا۔

اگریپا - وہاں وہ حسن کا آفتاب بن کر چمکاتی ہوئی نمودار ہوئی۔

اینو - میں بیان کرتا ہوں۔ اسکی زرنگار کشتی شعلہ رنگ تخت کی مانند نیل کی سطح پر چمکا رہی تھی۔ پتوار یکسر سونے کی تھی۔ بادبان اسقدر عطر میں بسے ہوئے تھے کہ سطح دریا کی فضا طبلہ عطار بنی ہوئی تھی۔ چپو چاندی کے تھے وہ بانسری کی آواز کے ساتھ پانی میں گرتے اور ابھرتے تھے۔ پانی کی رفتار ان سے تیز ہو جاتی تھی گویا وہ اس کی محبت میں دیوانہ ہو رہا ہے۔ اور اس کا حسن؟ الفاظ تو اس کے بیان سے قطعاً قاصر ہیں۔ وہ سنہری شامیانہ میں جس پر بادلے کے تار پڑے تھے لیٹی ہوئی تھی۔ اس کا لباس اطلس اور زربفت کا تھا اور وہ فطرت کے دلفریب تخیل حسن کی دیوی کی مانند نظر آتی تھی اسکی دونوں جانب خوبصورت زنخدانوں والے چھوکرے مسکراتے ہوئے کیوپڈوں کی مانند رنگا رنگ کے پنکھے ہاتھوں میں لئے کھڑے تھے جنکی ہوا سے اسکے رخسار اور بھی تمتماتے تھے۔

اگریپا - انٹونی کا اقبال!

اینو - اور اس کی کنیزیں حسن کے انداز میں آسمانی دیویوں کا سا وقار رکھتی تھیں۔ [illegible] کی حسین اور جمیل پریوں کی مانند اس کے گرد حلقہ کئے ہوئے تھیں۔ ایک نازک اندام پری نہایت دلفریب انداز میں پتوار پر بیٹھی کشتی کھے رہی تھی۔ نازک اور پھول کے سے ہاتھ ریشمی بادبانوں کی رسیاں کھینچتے تھے کشتی سے ایک عجیب مست اور دلکش خوشبو اڑ کر ساحل دریا کو مدہوش کئے دیتی تھی۔ اسکندریہ کی تمام آبادی ساحل پر امڈ آئی۔ اور انٹونی میدان شہر میں تخت پر تنہا بیٹھا ہوا کو سیٹیاں بجا کر بلا رہا تھا جو کلیوپیٹرا کے حسن کی بہار لوٹنے چلی گئی تھی۔ اور فطرت میں خلا پیدا ہو گیا تھا۔

اگریپا - اے حسن مصر!

اینو - جب وہ ساحل پر لنگر انداز ہوئی تو انٹونی نے اسے کھانے پر بلا بھیجا۔ اسنے جواب دیا۔ کہ وہ چاہتی ہے وہ انٹونی کی مہمانی کرے۔ چنانچہ وہ انٹونی جس نے کبھی کسی عورت کی درخواست کو رد نہیں کیا۔ ساحل دریا پر گیا اور ضیافت کے عوض اپنا دل نذر کر دیا ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ایکبار وہ شہر کے میدان میں صرف پچاس قدم چلی ہو گی کہ اس کی سانس پھول گئی چہرے پر ایک عجیب سرخی آگئی جس نے اس کے حسن کو اور بھی دلآویز بنا دیا۔

میاسنا - اب انٹونی اسے بھول جائے گا۔

اینو - کبھی نہیں۔ زمانے کی ناخوشگوار ہوا اس پھول کو پژمردہ نہیں کر سکتی۔ ۔ ۔ ۔ ۔ اسکی محبت سے جسقدر سکون حاصل ہوتا ہے اسقدر ہی تشنگی بڑھتی ہے۔

میاسنا - اگر حسن و جمال، فہم و فراست اور حیا پروری سے انٹونی کے دل کو تسکین ہو سکتی ہے تو اکٹاویا میں یہ سب کچھ موجود ہے۔

(سیزر انٹونی سے بدگمان ہو جاتا ہے اور دونوں کے تعلقات پھر کشیدہ ہو جاتے ہیں۔ انٹونی کی بیوی اکٹاویا اپنے بھائی سیزر کے پاس چلی جاتی ہے۔ اور انٹونی مصر چلا جاتا ہے سیزر فوجیں لیکر مصر پہنچتا ہے لیکن اکثر بار میدان انٹونی کے ہاتھ ہی رہتا ہے۔ انٹونی کو شک پیدا ہوتا ہے کہ کلیوپیٹرا اسے دغا سے سیزر کے حوالے کر دیگی۔ وہ کلیوپیٹرا کو برا کہتا ہے اور اپنے کیمپ میں آجاتا ہے اور کلیوپیٹرا اسکی محبت دیکھنے کیلئے مشہور کر دیتی ہے کہ وہ مر گئی ہے اور مرتے دم اس کے لبوں پر انٹونی کا نام تھا۔ انٹونی میدان میں ہزیمت کھانے سے دل شکستہ ہوتا ہے یہ خبر سنتا ہے تو اپنے کئے پر تاسف کرتا ہے خنجر مار کر مر جاتا ہے کلیوپیٹرا یہ سنکر اور سیزر کے ہاتھوں اپنی بے عزتی کا خیال کر کے تہ خانے میں چلی جاتی ہے اور ایک زہریلے سانپ سے کٹوا کر جان دینا چاہتی ہے اسکی کنیز ایراس کہتی ہے

"بیگم وقت آپہنچا۔ روشن دن ہو چکا ہے۔ اب ہمارے لئے تاریکی ہی تاریکی ہے"۔

ایراس تاج اور بیش قیمت پوشاک لے کر آتی ہے۔

کلیوپیٹرا - لا۔ میرا لباس لا۔ میرے سر پر تاج رکھدے۔ میرے دل میں ازل سے تمناؤں کا ایک طوفان ہے مصر کے انگوروں کا عرق اب ان ہونٹوں کو نم آلود نہ کریگا۔ ایراس تیار رہ! شاید میں انٹونی کی پکار سکتی ہوں۔ وہ میرے اس بہادرانہ کارنامے کو دیکھنے آیا ہے میں اسے سیزر کی قسمت پر جو دیوتاؤں کی طرف سے آئندہ قہر و غضب کا عذر ہے ہنستے دیکھتی ہوں۔ میرے آقا۔ میں آتی ہوں۔ میری جرأت مجھے اس خطاب کا مستحق ٹھہراتی ہے۔ میں آتش و باد ہوں۔

چارمین - اے گہرے بادلو برسو! موسلا دھار بارش ہو تاکہ میں کہہ سکوں کہ دیوتا اس المناک واقعہ پر آنسو بہا رہے ہیں۔ ۴۴

---

۴۴ **کلیوپیٹرا** (سانپ کو چھاتی پر ڈسواتی ہے) اپنے تیز دانتوں سے زندگی کی اس الجھی ہوئی گرہ کو کھول۔ اے زہریلے ناگ! احمق! غضبناک ہو اور [illegible]۔

چارمین - اے مشرقی ستارے!

کلیوپیٹرا - صبر۔ صبر۔ دیکھتی ہے تو۔ یہ بچہ میرا دودھ پی رہا ہے کہ میں مدہوش ہو جاؤں۔

چارمین - چھوڑ دے۔ چھوڑ دے۔

کلیوپیٹرا - بھینی بھینی مہک کی طرح دلکش۔ ہوا کی مانند نرم اور انٹونی کی طرح شریف۔

سانپ کو دوبارہ ڈسواتی ہے اور مر جاتی ہے۔

حنیف ہاشمی

قسمت

ایک بلند قامت۔ قدرے سیاہ رنگ شخص جس کے چہرہ پر ایک دُور دراز مقام کے سفر نے وارفتگی کی سی کیفیت پیدا کردی تھی۔ عین اسوقت ایک گاؤں میں داخل ہوتا ہُوا دیکھا گیا جبکہ افق کے سنہرے اور رنگین کنارے دن کو الوداعی پیغام دے رہے تھے۔ وہ عصا جس کی ٹیک پر اپنے جسم کی تکان کو دُور کرنے کے لئے وہ کبھی کبھی ٹھہر جاتا تھا۔ ہندوستان کے جنگلات ہی سے اس کے سفر کا رفیق رہا تھا۔ وہ ٹوپی جو اس کے متین چہرہ پر سایہ کئے ہوئے تھی۔ اسے اسپین کے آفتاب کی تابناک تمازت سے بچانے میں معاون رہی تھی۔ اور اس کا چہرہ صحرائے عرب کی جھلس دینے والی سموم سی سیاہی پکڑنے کے علاوہ منقطۂ باردہ کی منجمد کر دینے والی ہوا کے اثرات بھی قبول کر چکا تھا۔

وحشی اور خونخوار اقوام کے درمیان عرصہ دراز تک رہنے سہنے سے وہ ابھی تک وہی خنجر آبدار زیبِ کمر کئے ہوئے تھا جو اس نے ایک دفعہ ایک ترک ڈاکو کے سینہ میں بھونک دیا تھا۔ اجنبی ممالک کی بُود و باش نے اس سے کوئی نہ کوئی امریکن خصوصیت چھین لی تھی۔ اور مختلف اقوام کے ساتھ میل جول اور ارتباط کے باعث اس نے غیر محسوس طور پر کوئی نہ کوئی خصوصیت اپنے اندر جذب کر لی تھی۔ شاید یہی وجہ تھی کہ جب ایک طول و طویل عرصہ کی جہاں نوردی کے بعد ایکدفعہ پھر اس نے اپنے پیدایشی گاؤں میں قدم رکھا تو کوئی اُسے پہچان نہ سکا۔ اگرچہ سب کے سب ایک ایسے انداز سے جس میں اشتیاق اور استعجاب ملے ہوئے تھے۔ اس کی طرف گھُور گھُور کر دیکھ رہے تھے۔ تاہم جب چلنے میں اتفاقی طور پر اس کا بازو ایک نوجوان عورت کے ساتھ جو شام کا لیکچر سننے کے لئے جا رہی تھی۔ چھُو گیا تو وہ چونک اُٹھی اور ایک ہلکی سی چیخ بے ساختہ اُس کے مُنہ سے نکل گئی۔ "رلیف کرین فیلڈ" اُس نے دبی آواز میں کہا۔

مسافر نے اس نوجوان عورت پر ایک غلط انداز نظر ڈالتے ہوئے کہا "ہو نہ ہو یہ عورت فیتھ ایجرٹن ہے جس کے ساتھ میں لڑکپن میں کھیلا تھا۔"

آغازِ ایامِ جوانی ہی سے رلیف کرین فیلڈ محسوس کرنے لگا تھا کہ خداوند کریم نے اسے ایک نہایت ہی قابلِ فخر زندگی بسر کرنے کے لئے پیدا کیا ہے۔ یہ خیال اس کے رگ و ریشہ میں سرایت کر چکا تھا۔ اگرچہ یقینی طور پر نہیں کہا جا سکتا تھا۔ کہ اس کا خیال پختہ ہونا کسی خواب یا الہام کا نتیجہ تھا یا محض اس کے اپنے والہانہ تخیل ہی نے اس کے دماغ کی فضا کو معمور کر رکھا تھا۔ اور اب وہ اس پر وحی کی طرح یقین رکھتا تھا۔ یہ بات اس کے راسخ ترین عقائد میں شامل ہو چکی تھی۔ کہ تین غیبی اشارات کے ذریعہ اس کو بتایا جائیگا۔ کہ تین نہایت حیرت انگیز واقعات اس کی زندگی میں رونما ہونے والے ہیں۔

ان تین اٹل واقعات میں سے پہلا واقعہ جس پر اس کا خوشگوار تخیل بہت فاقدر شیفتگی کے ساتھ بحث کرنے کا عادی تھا۔ اس کے ساتھ اس دوشیزہ کی ملاقات تھی جو یکتائے روزگار ہونے کی وجہ سے اپنے نغمۂ محبت کے ذریعہ اسے محظوظ و مسرور کر سکے۔ شاہد مقصود سے ہمکنار ہونے کے لئے اُسے تمام دنیا کا چکر کاٹنا تھا جتیٰ کہ وہ ایک ایسی خوبصورت لڑکی سے دوچار ہوا جس کے سینہ پر دل کی شکل کا ایک قیمتی ہیرہ آویزاں ہو۔ اس دلفریب اجنبی سے روبرو ہونے کے بعد اُسے اس سے یوں خطاب کرنا تھا۔ "دوشیزہ! میں تیرے پاس ایک آرزو بھرا دل لایا ہوں۔ مجھے اجازت دے کہ تیرے سامنے اظہارِ تمنا کر کے میں اپنے بوجھ کو قدرے ہلکا کر سکوں" اور اگر حسنِ اتفاق سے وہ دوشیزہ اس کی ہونے والی بیوی ہی ہو۔ اور اگر محبت کی ان دو متوالی رُوحوں کی قسمت میں دنیاوی ملاپ لکھا ہو جو آگے چلکر ابدی زندگی میں اُنہیں "فنا فی العشق" کر دے تو وہ اپنے دل کی شکل والے ہیرے کی طرف اُنگلی سے اشارہ کرتے ہوئے یوں جواب دیگی "محبت کا یہ نشان جو میں عرصۂ دراز سے پہنے ہوئے ہوں اس امر کی تصدیق کرتا ہے کہ تمہیں اظہارِ تمنا کی اجازت ہے۔

دوسری بات جو رلیف کرین فیلڈ کے دل میں جاگزین ہو چکی تھی۔ یہ تھی کہ دنیا کے کسی نامعلوم مقام پر ایک خزانہ دفن ہے جس کی جائے دفن کے متعلق سوائے اس کے کسی اور کو مطلقاً علم نہ ہو سکتا تھا۔ اس خزانے کی تلاش میں جب اس کے قدم اس مقام پر پڑینگے۔ تو اس کے سامنے کی طرف سے ایک ہاتھ نمودار ہو کر نیچے کی طرف اشارہ کریگا۔ یہ بتانا ذرا مشکل امر ہے آیا وہ ہاتھ سنگ مرمر کا ہوگا یا پہاڑ کی بلندی پر سے کوئی مہیب و جسیم چیز ظاہر ہوگی۔ یا فضائے آسمانی میں کوئی شعلہ نظر آئیگا۔ لیکن یہ بات ظاہر ہے کہ وہ ایک ہاتھ ہوگا جس کی شہادت کی انگلی نیچے کی طرف اشارہ کرتی ہوگی۔ اور اس کے نیچے لاطینی حروف میں لکھا ہوگا "کھودو" اس مقام کے قرب و جوار میں زمین کھودنے سے ڈلوں اور سکوں کی صورت میں سونا

یا قیمتی پتھر اور جواہرات برآمد ہوں گے - یہ دفینہ اس کی تمام کدوکاوش کا صلہ ہوگا -

اس خوش قسمت انسان کے حیرت انگیز واقعات زندگی کا تیسرا اور آخری کارنامہ یہ ہوگا - کہ اسے بنی نوع انسان کے درمیان ایک نہایت وسیع اثر و اقتدار حاصل ہوگا قطعی طور پر نہیں کہا جاسکتا آیا اس کی قسمت میں کسی خاندان کا مورث اعلیٰ یا بادشاہ بننا لکھا تھا - یا اس کے لئے کسی ایسی قوم کی کامیاب رہنمائی کرنی تھی جو اسے سرگرمی سے آزادی کی طرف لے جائے یا اس کے ذمہ تمام آلائشوں سے پاک دین متین کی تبلیغ سپرد کی جانیوالی تھی - الغرض یہ ایک ایسا معمہ تھا جسے آنیوالے واقعات کے سوائے اور کوئی چیز حل نہ کرسکتی تھی - اُسے ایسا معلوم ہوتا تھا کہ اس کے سامنے کی طرف سے تین معزز اشخاص رونما ہوکر ایک غیبی اشارہ کے ذریعہ اسے عمل کی دعوت دیں گے - ان کا سردار ایک بالغ النظر اور بارُعب انسان - زمانہ قدیم کے خدارسیدہ بزرگوں کی طرح ڈھیلے ڈھالے کپڑے پہنے اور ہاتھ میں اپنے تقدس اور بزرگی کا نشان ایک موٹا سا عصا لئے ہوگا - اور اس مقدس عصا کی مدد سے فضائے آسمانی میں ایک شکل بناکر اپنا الہامی پیغام اس پر منکشف کردیگا - جس کی حرف بحرف پیروی سے نہایت شاندار نتائج برآمد ہونیکا یقین تھا -

نوجوان کرین فیلڈ شاندار قسمت کے اس دلکش نظریہ کو پیش نظر [illegible] دوسٹے اس دوشیزہ - خزانے - اور خدارسیدہ بزرگ کی تلاش [illegible] س کو دلوں کو فتح کرنے والی وسیع سلطنت کا تحفہ عطا کرنا تھا اور خدا پر بھروسہ کرکے گھر سے نکل کھڑا ہوا تھا - اور کیا وہ اپنے مقصد کو حاصل کرکے کامیاب واپس آیا تھا؟ نہیں - بلکہ کس قدر افسوس کا مقام ہے کہ اپنی ماں کی کٹیا کی طرف وہ اس کامیاب انسان کی حیثیت سے لوٹ کر نہیں آیا تھا جو اپنے دیگر ہمعصروں سے کہیں اعلیٰ و ارفع زندگی بسر کرنے میں کامیاب ہوگیا ہو - بلکہ اس کی بازیافت اُس ذلیل انسان کی سی تھی - جس کے چہرہ پر خاص قسم کے مصائب کا متواتر مقابلہ کرتے رہنے کے باعث یاس و افسردگی چھائی ہوئی ہو - وہ اپنے گاؤں کو اس لئے واپس آگیا تھا - کہ تھوڑی دیر کے لئے مقدس رختِ سفر باندھکر علیحدہ رکھدے - اس امید پر کہ شاید اس مقام پر چندے رہنے سہنے کے باعث جہاں پر پہلی دفعہ سرگانہ قسمت نے اسے اپنی مستقبل افروز جھلک دکھائی تھی - اس کی موجودہ زندگی کی پژمردگی جوانی کی تروتازگی میں تبدیل ہوجائے - اس کے گاؤں میں کوئی خاص تبدیلی واقع نہیں ہوئی تھی - کیونکہ وہ کوئی ترقی یافتہ شہر نہ تھا جہاں پر ایک سال کی خوشحال زندگی کی تروتازگی صدیوں کے تنزل و انحطاط کی پژمردگی کو زائل کردیتی ہے - بلکہ وہ ایک پُرانے طرز کا چھوٹا سا قصبہ تھا جس کے لمبی لمبی گھاس سے ڈھپنے ہوئے مکانات - پُرانے درخت - اور بوڑھی - کنواری - عورتیں تمام دیہاتی دلچسپیوں کا مرکز بنے ہوئے تھے - تبدیلی کے اثرات البتہ ظاہر تھے توپھل دار درختوں کے جن کی نشو و نما میں ایک پُررُعب رعنائیت پیدا ہوگئی تھی - مختلف موسموں کا مقابلہ کئے ہوئے مکانات پر جن کی چھتیں پہلے سے زیادہ گنجان گھاس کی تہوں سے سج گئی تھیں - یا نیادہ سے زیادہ قبرستان میں جہاں کی قبروں کے کتبوں میں اضافہ ہوگیا تھا - اور جن پر ان اشخاص کے نام کندہ تھے جنہیں اُس نے کچھ سال پہلے بازاروں میں چلتے پھرتے دیکھا تھا - تاہم اس دس سال کی دُوری کی تباہیوں کا نتیجہ اس کے سوا اور کچھ نہ تھا کہ کرین فیلڈ اسی صبح کو گاؤں سے باہر گیا تھا - اور کچھ عرصہ تک ایک پریشان سے خواب میں محو رہنے کے بعد شام کو واپس آگیا - لیکن اس کا دل گاؤں والوں کی طرف سے افسردہ ہوچکا تھا - کیونکہ انہوں نے اسے بالکل بھلا دیا تھا حالانکہ خود اُن کی یاد ابھی تک اس کے دل میں تازہ تھی -

"تبدیلی واقع ہوئی ہے تو یہاں" اس نے سسکیاں بھرتے اور اپنے ہاتھوں سے چھاتی پیٹتے ہوئے کہا "کون ہے یہ مایوس تمنا - متفکر - مغموم - جہاں گرد مسافر! - وائے افسوس! - جب یہ نوجوان یہاں سے رخصت ہوا تھا تو کیسا خوش تھا مگر اب اس کی خوشی کیا ہوئی!"

اور اب ریلف کرین فیلڈ اپنی ماں کے چھوٹے سے مکان کے دروازہ کے پاس کھڑا تھا - جہاں وہ عمر رسیدہ خاتون اپنے محدود مگر ضروریات زندگی کے لئے کافی وسائل کی مدد سے اپنے بیٹے کی لمبی غیر حاضری کے زمانہ میں آسائش کے ساتھ اوقات بسر کرتی رہی تھی - اپنے مکان کی حدود کے اندر داخل ہوکر وہ ایک پُرانے درخت کے ساتھ لگ کر کھڑا ہوگیا - اس وقت وہ اپنے بے صبری کے جذبات دبانے کی کوشش کر رہا تھا - جیسا کہ لوگ اکثر توقف کے ان لمحوں میں کرنے کے عادی ہیں جب سالہا سال کے واقعات ایک منٹ کے اندر جمع کردئے جائیں - اس نے اپنے لڑکپن کے دنوں کے اس پُرانے دوست (درخت) کے ساتھ جس کے سہارے وہ اس وقت کھڑا تھا اپنی واقفیت کو از سرِنو تازہ کیا - اس کے تنے کے ساتھ ساتھ اوپر سے نیچے تک نظر ڈوراتے ہوئے اسے کوئی چیز نظر پڑی جسے دیکھکر اس کے لبوں پر ایک مایوسانہ مسکراہٹ نمودار ہوئی - یہ لاطینی حروف کا ایک چھوٹا سا کتبہ تھا جس کے نقوش اب قریب قریب مٹ چکے تھے - "کھودو - کھودو" - اب اُسے یاد آیا کہ یہ الفاظ اس نے درخت کے تنے میں ایک پورے دن کی کدوکاوش کے بعد اس وقت کھودے تھے - جب کہ پہلے پہل اس نے اپنے خوش آئندہ مستقبل

کے متعلق غور کرنا شروع کیا تھا۔ حُسنِ اتفاق دیکھو۔ کہ رات کی تاریکی میں ان الفاظ کے اُوپر کا چھلکہ جو اپنی جگہ بے فائدہ معلوم ہوتا تھا۔ کچھ کچھ ہاتھ کے مشابہ تھا۔ جس کی ایک انگلی لفظ "کھودو" کی طرف اشارہ کر رہی تھی۔

ریلیف کرین فیلڈ نے ایک لا اُبالیانہ انداز میں اپنے آپ سے کہا "اب ایک ضعیف اعتقاد کا سچا انسان فوراً فرض کر لیگا۔ کہ وہ خزانہ جس کی تلاش میں میں نے تمام دُنیا کا چکر لگایا ہے عین اس جگہ میری ماں کے مکان کے دروازے کے پاس دفن ہے۔ یہ ایک نہایت پُر لُطف بات ہوگی"

اس نے اس معاملہ پر کچھ زیادہ سوچ بچار نہیں کی۔ کیونکہ اب مکان کا دروازہ کھُل چکا تھا اور ایک بوڑھی عورت دروازہ پر ظاہر ہو کر شام کی تاریکی میں یہ معلوم کرنے کی کوشش کر رہی تھی کہ وہ کون شخص ہے جس نے سرِ شام اُن کے مکان پر آکر دستک دی ہے۔ اور اب درخت کے نیچے کھڑا دروازہ کے کھلنے کا منتظر ہے۔ یہ ریلیف کرین فیلڈ کی والدہ تھی۔ ہم ان کے ملاقات کے واقعہ پر کچھ زیادہ لکھنا نہیں چاہتے۔ ناظرین خود اندازہ کر لیں کہ دس سال کے طویل عرصہ کے بعد اپنے بیٹے سے ملکر ماں کے دل کی کیفیت کیا ہو سکتی ہے! اور آیا کرین فیلڈ کو جسے دن بھر کی تکان کے بعد سب سے زیادہ آرام کی ضرورت تھی۔ محبت و خوشی کے جذبات کے درمیان . . . . آرام کی کوئی گھڑی نصیب ہوئی!

جب صبح نمودار ہوئی تو وہ اُٹھا مگر اس کا دماغ پریشان تھا کیونکہ سوتے جاگتے اُسنے تمام رات خواب دیکھنے میں کاٹ دی تھی۔ اپنی سہ گانہ قسمت کے معمّہ کو حل کرنے کے اشتیاق کی آگ جو عرصہ سے اس کے سینہ میں بھڑک رہی تھی اس واقعہ کے بعد ایک بار پھر پوری قوت کے ساتھ روشن ہوئی۔ ایسا معلوم ہوتا تھا۔ کہ ایام جوانی کے دل خوشکن خوابوں کا ہجوم اس کی والدہ کے مکان میں اس کے آنے کے انتظار میں تھا۔ اور اب وہ ایک طوفانِ بے تمیزی کی طرح اس کی واپسی پر اسے خوش آمدید کہنے کے لئے امڈا چلا آرہا ہے۔ مکان کے اس مانوس کمرہ میں جہاں وہ امن و عافیت کی نیند سونے کا عادی رہ چکا تھا۔ آج کی رات اُس نے وہاں ایسی۔ بے چینی اور اضطراب کے عالم میں کاٹی کہ شاید کسی بھیانک جنگل کے خوفناک سایۂ تلے یا صحرائے عرب کے اندر کسی خیمہ میں بھی اُسے ایسی خطرناک اور پریشان رات بسر کرنے کا موقع و اتفاق نہ ہُوا ہوگا۔ رات اس نے خواب میں دیکھا کہ ایک خیالی دوشیزہ نے اس کے قریب بستر پر بیٹھکر اس کے سیماب سے تڑپتے ہوئے دل پر اپنی انگلی رکھی۔ ہاتھ کی شکل کا ایک شعلہ تاریکی میں نمودار ہوا۔ اور اس نے زمین کے پُر اسرار دفینہ کی طرف اشارہ کیا۔ ایک معمر و رسیدہ بزرگ نے اپنا مقدس عصا ہلایا اور اس سے عزت کے تخت کی طرف اشارہ کیا وہی غیر متشکل اور نظر نہ آنے والے مناظر دن کے وقت بھی اس کی کٹیا کے گرد چکر کاٹا کئے۔ اگرچہ اس وقت وہ رات کی نسبت کم شوخ تھے اور مانوس چہروں کے ہجوم کے اندر گم ہو گئے۔ جو کرین فیلڈ کی واپسی پر اُسکے خیر مقدم کے لئے وہاں جمع ہو گئے تھے۔ لوگوں نے دیکھا کہ وہ ایک بلند قامت قدرے سیاہ رنگ۔ بارُعب اور اجنبی وضع قطع کا آدمی تھا حلیم و خلیق۔ مگر اس کی آنکھ میں کشش اور حضوری مفقود تھی۔ جس سے پتہ چلتا تھا۔ کہ وہ کبھی کبھی کسی غیر مرئی چیز کی طرف دیکھنے کے لئے اُٹھ جاتی ہے۔

اس اثنا میں کرین فیلڈ کی والدہ مکان کے اندر اُفتاں و خیزاں چلتی پھرتی اور یہ دیکھکر پھولی نہ سمائی تھی کہ ایک لمبے عرصے کے بعد اپنے بیٹے کی واپسی کے باعث ایک دفعہ پھر اس کا دل مادرانہ شفقت اور ہمدردی کے جذبات سے لبریز ہو گیا ہے اور وہ روزانہ زندگی کی معمولی کاوشوں کی پرواہ نہ کرتے ہوئے اس کے آرام کی خاطر ہر طرح کی تکلیف برداشت کرنے کے لئے تیار ہے۔ دوپہر کا وقت تھا کہ اس نے مکان کے دروازہ سے باہر نکل کر دیکھا کہ تین معزز شخص درختوں کی گھنی چھاؤں اور دھوپ میں سے گذر کر بازار سے ہوتے ہوئے اس کے مکان کی طرف چلے آرہے ہیں۔ اس نے اس فخر کے انداز میں جس میں سرتاپا محبت مادری موجیں لے رہی تھی کہا "دیکھو ریلیف نواب ہیبسکوڈ اور ان کے ساتھ دو ہمراہی کسی خاص مقصد کے لئے تمہاری ملاقات کو آرہے ہیں۔ اب اپنی دلچسپ سرگزشت سُنا کر انہیں محظوظ کرو"

ان تین ملاقاتیوں میں سے نواب ہیبسکوڈ سب سے زیادہ ذی عزت معلوم ہوتا تھا۔ وہ ظاہری شان و شوکت کا دلدادہ ہونے کے باوجود ایک نہایت خوش بیان عمر رسیدہ انسان تھا۔ گاؤں کے تمام معاملات میں اس کی رائے اور شخصیت کو ایک خاص اہمیت حاصل تھی۔ اور گاؤں میں اپنی شرافت اور نجابت کے لحاظ سے وہ ایک خاص شہرت کا مالک تھا۔ وہ اس وقت تین کناروں والی ٹوپی پہنے تھا۔ جو ان دنوں رفتہ رفتہ فیشن سے خارج ہو رہی تھی۔ اس کے ہاتھ میں چاندی کے دستے کی ایک چھڑی تھی جس سے چلنے میں مدد لینے کی بجائے محض نمائش فخر کے ساتھ حرکت دینے کا کام لیا جاتا تھا۔ اس کے دو ہمراہی علاقہ کے دو معزز و متموّل زمیندار تھے۔ جو ملک کی انقلابی پارٹی کے شدید مخالف اور نسبی شان و شوکت کے زبردست حامی ہونے کے باعث نواب صاحب کی جلو میں چلنے کو خاص عزت سمجھتے تھے۔

انہیں اپنی طرف آتے دیکھکر کرین فیلڈ ایک آرام کرسی پر لیٹ گیا۔ اور ایک نیم خود فراموشی کے انداز میں ان کے معروف و مانوس چہروں کو

معین کرنے کی کوشش کر رہا تھا۔ اس نے فریب نفس سے سکرا کر کہا تو وہ سامنے تین معزز ہستیاں چلی آرہی ہیں۔ اور ان میں سے پہلا شخص جس کے ہاتھ میں ایک عصا ہے خدا رسیدہ بزرگ معلوم ہوتا ہے۔ کیا یہ ممکن نہیں کہ ان بزرگوں کی آمد میری اس خوش قسمتی کا پیش خیمہ ہو؟ جس کا مجھ سے مدت سے وعدہ کیا گیا ہے؟

بوڑھا نواب اور اس کے ہمراہی مکان کے اندر داخل ہوئے۔ رلیف اپنی جگہ سے اُٹھا اور ان کا استقبال کرنے کے لئے چند قدم آگے بڑھا۔ جب وہ مؤدبانہ طور پر اپنے مہمانوں کی طرف جُھک رہا تھا۔ تو اسکی مرعوب کن شکل وصورت سے ایک فطری ہیبت ظاہر تھی۔ جو نواب کے امیرانہ ٹھاٹھ کے مقابلہ میں اپنے اندر ایک خاص شان رکھتی تھی۔ بوڑھے نواب نے قدیم رسم کے مطابق ایک خاص انداز کے ساتھ اپنی چھڑی کو فضا میں حرکت دی۔ پھر اپنی ملاقات کا مدعا و مطلب بیان کرنے کی طرف متوجہ ہوا۔" میں اور میرے ہمراہی"۔ بوڑھے نواب نے کہنا شروع کیا۔ "گاؤں والوں کے منتخب کردہ اہل الرائے ہونے کی حیثیت سے ایک اہم فرض کی ادائیگی کا بوجھ اٹھائے ہوئے ہیں۔ ہم گذشتہ تین روز سے ایک نہایت اہم عہدہ کے لئے کسی موزوں شخص کے انتخاب کے مسئلہ پر غور وخوض کر رہے ہیں۔ یہ عہدہ اپنی ذمہ داریوں کے اعتبار سے ایسا مہتم بالشان ہے کہ بادشاہوں اور شہنشاہوں کی بلند پایہ شان کے شایاں ہے۔ آپ ہمارے گاؤں کے ایک معزز باشندہ ہیں۔ خدا نے آپکو ذہن رسا عطا فرمایا ہے۔ اور چونکہ اجنبی ممالک کے سفر نے آپ کے عقلی قوئ کی خاص طور پر تربیت کی ہے۔ اس کے علاوہ چونکہ ہمیں اس امر کا پورا پورا یقین ہے کہ جوانی کا جوش وخروش اور بے عنوانیاں اب آپ میں نہیں ہیں۔ اس لئے ہم پورے غور وخوض کے بعد اس نتیجہ پر پہنچے ہیں کہ خدا نے اپنی قدرت سے عین وقت پر آپکو ہماری مطلب براری کے لئے ہمارے پاس بھیجدیا ہے"

بوڑھے نواب کی اس ولولہ انگیز تقریر کے دوران میں رلیف اس پر نظریں گاڑے مبہوت کھڑا رہا۔ اسے اس کی شخصیت میں پُر اسرار اور غیبی طاقت محسوس ہوئی۔ اُسے ایسا معلوم ہوا کہ وہ کوئی پُرشکوہ پوشاک پہننے کی بجائے زمانہ قدیم کے خدا رسیدہ بزرگوں کے سے کھلے کھلے کپڑوں میں ملبوس ہے۔ اس کی یہ حیرانگی بے وجہ نہ تھی کیونکہ فضا میں اُس کی چھڑی کی حرکت بعینہ وہی حرکت کر رہی تھی جس قسم کے اشارہ سے اس خدا رسیدہ بزرگ کا پیغام اس پر ظاہر ہونے والا تھا۔ اور جس کی تلاش میں اس نے دنیا کا چپہ چپہ چھان مارا تھا۔

"ہاں تو مجھے پہلے یہ بتایا جائے۔ کہ آخر وہ کون ایسا عہدہ ہے۔ جس پر میری تقرری مجھے بادشاہوں اور شہنشاہوں کا ہم پلہ وہم مرتبہ بنادیگی" رلیف نے ایک ایسی آواز میں جس میں لرزش پیدا ہوگئی تھی۔ اپنے مہمانوں سے دریافت کیا۔

"عہدہ؟" بوڑھے نواب نے کہا" میری مراد ہمارے دیہاتی اسکول کے مدرس کی اس ذمہ دارانہ آسامی سے ہے جو مرحوم وائیٹکر کی بچاس سالہ رضاکارانہ خدمات کے بعد اس کی وفات کے باعث اس وقت خالی خالی ہے"

رلیف نے جلدی سے کہا" میں آپ کی اس تجویز پر غور کرونگا اور تین دن کے اندر اندر آپکو اپنی رائے سے مطلع کر دونگا" تھوڑی دیر کی مزید گفتگو کے بعد گاؤں کے سرکردہ کارکن تو رخصت ہو گئے۔ لیکن ان کی خیالی تصویر ابھی تک کرین فیلڈ کے دماغ میں محفوظ تھی" اور جوں جوں وہ ان کی پُر رعب صورتوں پر جیسا کہ وہ خواب کی حالت میں اُن کے سامنے نمودار ہوئی تھیں اور جنہوں نے آگے چلکر بیداری کی حالت میں ایک مانوس شکل اختیار کر لی تھی۔ غور کرتا ان کے نقوش زیادہ روشن اور شوخ ہوتے جاتے تھے۔ اس نے بوڑھے نواب کے قدوخال کے متعلق مختلف انداز میں خیال آرائی شروع کی اُسے ایسا محسوس ہوا کہ وہ نواب کوئی معمولی انسان نہیں بلکہ کوئی خدا رسیدہ ہستی ہے اس نے خیال کرنا شروع کیا یہی تو وہ چہرہ ہے جو مصر کے بلند ترین مینار پر جلوہ نگن ہوا تھا۔ یہی تو وہ شکل ہے جس نے غرناطہ کے شاہی محل کے مہیب ستونوں کے درمیان سے اس کی طرف اشارہ کیا تھا! ہاں تو ٹھیک یہی وہ صورتِ زیبا تھی جس نے فراز کوہ پر سے اترتے ہوئے پانی کے .... گرم چشمے کی تاریکی میں رخ نمائی کی تھی! جوں جوں وہ اپنی یادداشت پر زور ڈالتا اُسے معلوم ہوتا تھا کہ گاؤں والوں کی چھوٹی سی دنیا کے اس مشہور و معروف۔ خود پسند۔ خوش پوش اور ظاہری ٹیپ ٹاپ کے دلدادہ انسان میں وہ سب صفات موجود ہیں۔ جو اس نے خواب میں ظاہر ہونے والے "پیغامبر قسمت" کی شخصیت میں دیکھی تھیں۔ کرین فیلڈ ابھی اسی قسم کے خیالات کے ہجوم میں محو سارا دن اپنی کوٹھری میں بیٹھ کر سوچتا رہا۔ اس کی والدہ نے اس کے سفر کے واقعات کے متعلق اس سے بیسیوں سوالات کئے مگر یا تو اس نے انہیں سُنا نہیں اور اگر سنا بھی تو ان کے جوابات بالکل بے ربط و مہمل سے دئے۔ غروب آفتاب کے وقت وہ معاً ہوا خوری کے خیال سے اٹھ کھڑا ہوا ہے۔ اور جب اس پُرانے درخت کے پاس سے ہو کر گذر رہا تھا تو اس کی نظر اس

ہاتھ کی طرف اٹھ گئی۔ جو دھندلے سے کتبے کی طرف اشارہ کر رہا تھا۔
جب ریلف گاؤں کے بازار میں سے گذر رہا تھا تو ڈوبتے ہوئے سورج کی روشنی میں اس کا سایۂ قدم قدم پر پڑتا چلا جا رہا تھا۔ اس نے خیال کیا۔ کہ جس طرح اس کا سایہ دور دراز کی چیزوں پر پڑ رہا ہے۔ اسی طرح اس کی آئندہ زندگی کے واقعات قبل از وقت ہی عکس ڈال رہے ہیں۔ اور جب وہ کسی ایسے مقام کے پاس پہنچا جہاں پر اس کا سایہ پہلے پڑ چکا تھا۔ تو معاً لڑکپن اور جوانی کے مشہور واقعات اس کے ذہن میں تازہ ہو جاتے۔ راستہ کا وہ کونسا موڑ تھا جس سے وہ واقف نہ تھا؟ حتیٰ کہ پیش نظر مناظر کی عارضی کیفیتیں بھی وہی تھیں۔ جو اس نے ایام گذشتہ میں محسوس کی تھیں۔
دو گائیں سر راہ چر رہی تھیں جن کے خوشگوار سانس نے اسکی طبیعت میں فرحت پیدا کر دی۔ معالجہ کے جزائر سے چلتے وقت باد کے وہ جھونکے جو بہار سے جہاز کو وطن مالوف تک پہنچانے میں کامیاب ہوئے ہیں۔ اس قدر خوشگوار نہ تھے جتنا کہ ان خوشدم گایوں کا تنفس ہے۔ اس نے مایوسانہ انداز میں کہا۔ قریب کے ایک مکان کے دروازے میں سے ایک ننھا بچہ لڑھکتا ہوا زمین پر آ رہا۔ اور اس کے پاؤں کے قریب آکر مسکرانے لگا۔ وہ بلند قامت انسان نیچے جھکا۔ اور بچے کو اٹھا کر اس کی والدہ کی گود میں واپس دیدیا۔ اس نے اپنے عہدہ کی تقرری کا خیال کرتے ہوئے کہا "بچے! مالی گاؤں کے بچے! ان کی قسمت اب مجھی سے وابستہ ہونے والی ہے"۔ اس وقت جنس لطیف کی محبت کا فطری احساس اس کے دل کی گہرائیوں میں نمودار ہوا۔ اور وہ ایک ایسے مکان کے قریب پہنچا۔ جس کے اندر داخل ہوتے ہوئے اسے کسی قسم کی جھجک محسوس نہ ہوئی۔ ایک سریلی آواز جو کسی کی روح کی گہرائیوں کا پتہ دیتی تھی۔ مکان کے اندر ایک دلگداز نغمہ پیدا کر رہی تھی۔ وہ سر جھکائے مکان کے چھوٹے سے دروازہ میں سے گذر کر اندر داخل ہو گیا۔ جونہی اس نے دہلیز پر قدم رکھا۔ ایک نوجوان عورت مکان کے اندر سے پہلے قدم بڑھاتی اور پھر ذرا رک رک کر چلتی ہوئی اس کی طرف بڑھی حتیٰ کہ وہ دونوں ایک دوسرے کے سامنے کھڑے ہو گئے۔ ان دونوں کی شکل وصورت میں ایک عجیب فرق نمایاں تھا۔ وہ متین و جاذب توجہ جہاں گرد و جہاں دیدہ۔ یہ صاف ستھری۔ طرحدار۔ خاموش۔ دنیا کے نشیب و فراز دیکھے ہوئے۔ اور پرجوش مسرت میں بھی خاموش! ایسا معلوم ہوتا تھا گویا زندگی کی پُرامن طرز کے ماتحت اس کے تمام جذبات ساکن ہو چکے ہیں۔ تاہم ان کے بظاہر متفاوت چہروں پر ایک خاص قسم کی کیفیت طاری تھی۔ یہ محبت کی دبی ہوئی آگ کی تمازت تھی جو ان کے چہروں کو یکساں طور پر منور کئے ہوئے تھی۔
"تمہیں اپنے وطن مالوف کی طرف بخیر و خوبی لوٹنا مبارک ہو۔ فیتھ ایجرٹن نے کہا لیکن کرین فیلڈ نے اس سوال کا جواب دینے میں جلدی سے کام نہ لیا۔ کیونکہ اس وقت اس کی آنکھ دل کی شکل والے زیور کی طرف جو ایجرٹن اپنے سینہ پر آویزاں کئے ہوئے تھی۔ دیکھنے میں مصروف تھی۔ یہ جگنی معمولی پتھر کی بنی ہوئی تھی۔ اور اب اسے یاد آیا کہ یہ اس نے حبشیوں کے ایک ویران کھنڈر کے ایک پتھر سے تراش کر فیتھ کو دی تھی۔ اور اس پر طرفہ تماشہ یہ کہ اس کی شکل بعینہٖ اس زیور کی سی تھی جو اس نے خواب میں دوشیزہ کے گلے میں دیکھا تھا۔ سفر پر روانہ ہوتے وقت اس نے یہ جگنی فیتھ کو تحفہ کے طور پر دی تھی۔ آخر کار اس نے کہا "ہاں تو یہ دل ابھی تک تمہارے پاس صحیح و سلامت موجود ہے"؟
"ہاں" فیتھ نے جواب دیا۔ اور اس کے چہرہ پر گہری سرخی دوڑ گئی۔ پھر مسرت آمیز لہجہ میں بولی۔ "اور تم میرے لئے سمندر پار سے کیا تحفہ لائے ہو"؟
ایک ناقابل ضبط جذبہ کے ماتحت بے ساختہ وہی الفاظ ریلف کے منہ سے نکل گئے۔ "فیتھ" اس نے کہا۔ "میں ایک حسرت بھرا دل تیرے پاس لایا ہوں مجھے اجازت دے کہ اظہار تمنا کر کے اپنے بوجھ کو قدرے ہلکا کر سکوں۔ محبت کی یہ نشانی جو تم عرصہ دراز سے پہنے ہوئے ہو اس امر کی تصدیق ہے کہ تمہیں اظہار تمنا کی اجازت ہے"۔ فیتھ نے کہا۔
"فیتھ۔ فیتھ۔ کرین نے کہا۔ اور وہ ہم آغوش ہو گئے۔ اس واقعہ کے بعد خواب کا پردہ کرین فیلڈ کی آنکھوں سے اٹھ گیا۔ اور اصلی واقعات حقیقت کی روشنی میں اس پر منکشف ہونے لگے۔ پُراسرار خزانے کو معلوم کرنے کے لئے اُسے اشارتاً بتایا جا چکا تھا۔ کہ وہ اپنی والدہ کے رہائشی مکان کے قریب دیوار میں زمین کھود کر دیکھے کہ اس میں کیا مدفون ہے۔ جنگی احکام جاری کرنے یا شاہی اور مذہبی اقتدار کی بجائے اس کی قسمت میں گاؤں کے بچوں پر روحانی اقتدار و تسلط قائم کرنا لکھا جا چکا تھا۔ اور اس خیالی دوشیزہ کی تصویر اس کے پردۂ تخیل پر سے مٹ کر اس کی جگہ ایام طفولیت کی رفیق ایجرٹن کی تصویر اس کے لوح دل پر نقش ہو چکی تھی!
کتنے لوگ ہیں۔ جو اپنی لاحاصل اور بعید از عقل خواہشات کو پورا کرنے کے لئے فضول سرگرداں و حیران نظر آتے ہیں۔ حالانکہ ذرا سی سوچ بچار کے بعد یہ حقیقت ان پر منکشف ہو سکتی ہے۔ کہ ان کی خوشی۔ فارغ البالی۔ اور فرائض کی ادائیگی کے مواقع خود ان کے اپنے قبضے میں ہیں! خوش

ہیں وہ لوگ جو بے فائدہ جہاں گردی اور وقت ضائع کرنے کی بجائے
خود اپنے اندر زندگی کا مسئلہ حل نہ ہونے کی عقدہ کشائی کے سامان
مشاہدہ کرتے ہیں!۔ (ماخوذ)

غلام مصطفےٰ بی۔اے امرتسری

غزل

درماں سمجھ رہا ہوں جنوں کے اثر کو میں
دشمن بناؤں سر کو نہ توڑوں جو گھر کو میں

ہے ننگ عشق اہلِ ستم گریہ و بکا
نفرت سے دیکھتا ہوں ہر اک نوحہ گر کو میں

دل نذرِ سوزِ عشق ہوا ابھی تو کیا ہوا
میری چلے تو آگ لگا دوں جگر کو میں

سُن اے حریفِ ملّت صبر و رضا ہے یہ
کرتا ہوں پیار خنجرِ بیداد گر کو میں

ہے سجدہ گاہ اہلِ تقدس یہ سرزمین
کیونکر کہوں نہ کعبہ تیری رہگذر کو میں

بھُولا ہوں رہ مناظرِ منزل کو دیکھ کر
بدنام کر رہا ہوں عبث راہبر کو میں

روئے سخن ہے مجھ سے نگاہیں عدو پہ ہیں
پہچانتا ہوں خوب تمہاری نظر کو میں

پھر اتصال طالب و مطلوب ہے محال
بیٹھے رہے اُدھر کو اگر تم اِدھر کو میں

حیراں ہوں کیا کروں کہ ابھی سے ہے بدحواس
دل اپنا دوں کہ اپنی زباں نامہ بر کو میں

جاؤں کہاں بتا تو سہی اس کو چھوڑ کر
کس آسماں سے لاؤں تیرے سنگِ در کو میں

قطرہ بھی خون کا دلِ مایوس میں نہیں
پہنچاؤں اب کہاں سے رسد چشمِ تر کو میں

حیراں ہوں اضطرابِ دلِ دردمند سے
سمجھاؤں کس دلیل سے اس بے خبر کو میں

گوہر تمہیں بتاؤ کہ اسکا ہے کیا علاج
سمجھے ہوئے ہوں دشمنِ جاں چارہ گر کو میں

گوہر

بزمِ تنہائی

بڑے بڑے شہروں کے تنگ مکانوں میں ہماری زندگیوں کا اکثر حصہ اکیلے ہی گذرتا ہے۔ تھورو (ایک مصنف کا نام) نے ایک مرتبہ لکھا تھا کہ "جو آدمی سوچ رہا یا کام کر رہا ہو وہ ہمیشہ اکیلا ہی ہوتا ہے خواہ وہ کہیں ہو" اور ممکن ہے کہ اگر ہم تنہائی کی جانب زیادہ مائل ہوں تو زیادہ سوچ سکیں اور صحیح سوچ سکیں خواہ ہم پسند کریں یا نہ ہمیں اپنی سوسائیٹی کو برداشت کرنا ہی ہوگا اور اس امر کی احتیاط کرنی عقلمندی ہوگی کہ جتنے گھنٹے ہم تنہائی میں گذاریں وہ ہمارے حسبِ منشا خوشگوار ہوں۔ آدمی مل جلکر رہنے والا جانور ہے اور وہ سوسائیٹی کا ممبر رہ کر ہی دنیا کی بہترین چیزوں کو حاصل کرسکتا ہے۔ کسی شخص نے اکیلے رہ کر کامیابی حاصل نہیں کی۔ زندگی کے بڑے بڑے معاملات میں ہم اکیلے ہی رہتے ہیں اور ہماری اصلی تاریخ کا پتہ دوسروں کو نہیں لگ سکتا۔

اپنی شخصیت کی اصلاح

خود علم حاصل کرنا اپنی اصلاح کی ضروری تمہید ہوا کرتا ہے۔ اس سے ہمیں اپنی قدر آپ کرنی بھی آجاتی ہے۔ اگر آدمی کی زندگی خشک اور بے لطف ہو اور وہ ایسی دوستی کی برکت سے محروم ہو جسے بُرائی کا خیال ہی نہ آتا ہو اُسے چاہئے کہ اُس دوستی کے حاصل کرنے کی تکلیف گوارا کرے پہلے تو اُسے اپنی ہی ہستی کا علم ہونا چاہئے۔ پھر اس کی اصلاح ہونی چاہئے اُسے اپنی تربیت اس طرح سے کرنی چاہئے کہ وہ دنیا میں اس یقین کے ساتھ سیر کیلئے نکلے کہ دنیا اُسے خوشگوار اور دلکش پائے دوسرے الفاظ میں اس کا یہ مطلب ہے کہ جب تک حقیقی معنوں میں کوئی شخص اپنا دوست نہ ہو تب تک وہ دوسروں کا دوست نہیں بن سکتا۔ حقیقی دوستی کا انحصار علم پر ہے باریک بین کی مشق کی بدولت قوت حاصل ہوسکتی ہے۔ میں مانتا ہوں کہ تھورو قدرے خود پسند تھا۔ مگر اُس نے لکھا ہے "میں اپنے آپ ہی کو انسانی ہستی سمجھتا ہوں اور یہی جانتا ہوں کہ خیالات اور جذبات کا نظارا میں ہی ہوں اسی دوئی کا احساس ہے جس کے ذریعے میں اپنے آپ سے اتنا ہی دور کھڑا ہوسکتا ہوں جتنا کسی اور شخص سے خواہ میرا تجربہ کتنا ہی سخت ہو مگر مجھے اپنے ایک حصے کی موجودگی اور نکتہ چینی کا احساس ضرور ہوتا ہے گویا کہ وہ میرا حصہ نہیں ہے بلکہ ایک اور مشاہدہ کرنے والا ہوا ہے جو تجربہ میں تو شریک نہیں ہوتا بلکہ اس کو ذہن میں رکھتا جاتا ہے اور وہ میں نہیں بلکہ آپ ہیں۔

اپنی روح کا کپتان

علم کے بعد تکمیل کا درجہ ضرور آتا ہے۔ مونٹین نے لکھا ہے "دنیا میں آدمی کے لئے سب سے بڑی چیز یہ ہے کہ وہ یہ سمجھ لے کہ وہ اپنی ہستی کا مالک آپ ہے ہینلی (شاعر کا نام) اگرچہ قسمت کا مارا ہوا تھا۔ مگر پھر بھی خوش ہوکر چلا اُٹھا۔

کوئی مضائقہ نہیں ہے کہ راستہ خواہ کتنا ہی تنگ ہو
میں تکالیف سے کتنا ہی بدلا ہوا ہوں۔
پھر بھی میں اپنی قسمت کا آپ مالک ہوں۔
میں اپنی روح کا کپتان ہوں۔

مجھے اس بات کا کلی یقین نہیں ہے کہ آدمی اپنی قسمت کا مالک آپ ہوسکتا ہے لیکن ہم میں سے ادنیٰ آدمی بھی اپنی روح کا کپتان تو ہوسکتا ہے موجودہ دنیا نقل کی دنیا ہے ہم ایک دوسرے کی مانند کپڑے پہنتے ہیں ایک دوسرے کی طرح نظر آتے ہیں اور ایک دوسرے کی مانند سوچتے ہیں۔ ہم اپنی بُرائیوں اور نیکیوں میں بھی ایک دوسرے کی نقل کرتے ہیں۔ لیکن اگر آدمی نے اپنے ہی جہاز کو چلانا نہ سیکھا ہو اور اس بات کا فیصلہ نہ کیا ہو کہ اُسے کس بندرگاہ تک پہنچنا ہے تو وہ اپنے ہی جہاز میں سوراخ کرلیگا۔

ہمت اور اولوالعزمی کے ساتھ پوری صاف دلی بھی ہونی چاہئے دوسروں کے سامنے جھوٹ بولنا نہایت ہی مکروہ ہے اور اپنے آپ سے جھوٹ بولنا تو سراسر زبوں ہے۔ یہ ظاہر کرنا کہ کمینے افعال میں بے غرض راستی ہوتی ہے اور یہ کہ فلاں شخص بھاگ گیا ہے۔ کیونکہ وہ نہایت ہی منچلا آدمی ہے کس قدر غلط ہے۔ صاف دلی مسٹر پیپیز کے روزنامچہ کی نہایت ہی دلکش ادا ہے۔ یہ اپنی نوعیت کی ایک کتاب ہے مسٹر پیپیز نے اپنے دل کو کبھی بھی یہ نہیں تبلایا کہ اس کی شرارت میں شرارت نہیں ہے اُس کی نگاہ بڑی صاف ہے گلبرٹ اور سلیون کے ایک ڈرامے کے کیریکٹر کی مانند وہ کبھی یہ خیال نہیں کرتا۔

بُرائی نیکی ہے اور نیکی بُرائی
اچھی چیز خراب ہے اور خراب اچھی

اعتراف

اگرچہ ہم کسی پیر و مرشد کے سامنے اپنے گناہوں کے اقرار کرنے کو پسند نہیں کرتے۔ لیکن اپنے سامنے ان کا اعتراف کرنا صحت بخش ہے کوئی شخص اپنے آپ کو نجات نہیں دلا سکتا۔ لیکن بدمزاجی یا شر انگیزی کا خاموش اعتراف ہماری اپنی سوسائٹی کو ذرا خوشگوار بنا دیتا ہے۔ جو شخص اپنے آپ کو جاننے کی تکلیف گوارا نہیں کرتا وہ بظاہر اس بات سے ڈرتا ہے کہ اُسے کوئی ایسی بات معلوم ہو جائے گی کہ جس کی وجہ سے اس کی اپنی صحت قابل برداشت ہو جائے گی۔

حماقت، رغا، بیوقوفی، ریاکاری، بناوٹ اور ہر قسم کی غنچی کی تمام صورتیں اور ہر ایسی چیز جو بیجا فخر و مباہات کے ساتھ نوع انسان پر اپنا دباؤ ڈالتی ہے یہ تمام باتیں ہجو کرنے والے کا نشانہ بنتی ہیں اس کے تیروں کے لئے استنے نشانے ہیں اور اُس کے حملے کے شکار ہیں اور ہمیں بخوبی معلوم ہے کہ دنیا ایسے شکاروں سے کس قدر معمور ہو رہی ہے۔

ہم جانتے ہیں کہ ہم خود کس قدر جلدی اکڑنے اور ڈینگ مارنے لگتے ہیں اور جب ہمیں اپنا اکڑپن اور ڈینگ معلوم ہو جائے تو پھر ہم اُن کے مضر اثرات سے بچنے کی کوشش کرنے لگ جاتے ہیں۔

"اعترافات" لگاتار اکڑنے والا تھا حالانکہ اس کی یہ کتاب ایک بہت بڑی خود نوشت سوانح عمری ہے اور اگرچہ وہ نہایت ہی خود پسند آدمی تھا اور اپنے بارے میں دلچسپی لیتا تھا مگر پھر بھی وہ اپنے آپ کو جاننے سے قاصر رہا۔ چنانچہ اُس نے لکھا ہے کہ اپنے وطن میں اپنے مذہب اپنے خاندان اور دوستوں کی آغوش میں۔ بکر کسی خوشگوار پیشے کی یکسانیت میں مَیں اپنی زندگی اطمینان اور امن سے گذار دیتا۔ میں ایک نیک مسیحی اچھا شہری نیک دوست اور نیک آدمی ہوتا مجھے اپنی حالت کی چاہت ہوتی اور شاید میں اپنی حالت کیلئے باعث فخر ہوتا اور آسودہ گمنامی میں آسودگی کی زندگی بسر کر کے اپنے ہی خاندان کی آغوش میں بڑے امن سے اس دنیا کو خیرباد کہہ جاتا۔

اگر جین جیکس اپنی ہنسی اُڑانے میں ماہر نہ ہوتا تو وہ کبھی بھی نیک آدمی یا نیک عیسائی نہ ہوتا اور نہ اتنا آسودہ ہو کر امن سے زندگی گذار سکتا۔

سچے خواب

یقین کر لینا سخت حماقت ہے کہ ہم وہ ہیں جو حقیقت میں نہیں ہیں۔ البتہ یہ خیال کرنا کہ ہم وہ ہو جائیں جو کچھ کہ نہیں ہیں فرحت بخش ہے ہم فطرتاً ایک نمونہ کی صورت میں اپنے آپکو ڈھالتے رہتے ہیں اور جس قسم کے خیالات ہمارے دل میں آتے ہیں اُنہیں کے سانچے میں وہ ڈھلتے جاتے ہیں البتہ بعض اوقات ایسا بھی ہوتا ہے کہ حیرت انگیز نتائج کے ساتھ ہمارے خواب سچے ہو جاتے ہیں۔ چنانچہ سٹیلٹسن نے ہمیں ان الفاظ میں آگاہ کیا ہے کہ ممکن ہے کہ آدمی خوابوں ہی میں اپنی زندگی گذار دے۔ اور پھر بھی اُن کے حصول کے لئے تیار نہ ہو۔

مگر بعض طبیعتیں ایسی بھی ہوتی ہیں جو حقیقت میں اپنی تنہائی سے باہر نہیں آتیں یعنی صوفی اور مجذوب لوگ جو دنیا کی شورش سے دور بھاگ گئے ہیں لیکن ہم جیسے لوگوں کے لئے اکیلے رہنا اور غور سے دیکھا جائے تو دوسروں کے ساتھ رہنے کیلئے تیاری ہوتی ہے۔ ہماری اپنی روحیں گویا سنگار کے کمرے ہیں ان میں ہم آراستہ و پیراستہ ہو کر روزانہ زندگی کے ڈرامے میں اپنا پارٹ کھیلنے کے لئے سٹیج پر آتے ہیں "تھوڑی سی کنارہ کشی میٹھا پھل لاتی ہے"۔

زندگی کی تماشہ گاہ

یہ فرض نہیں کر لینا چاہیئے کہ ہر شخص کو اپنی ذات کا علم پورا پورا ہو سکتا ہے۔ لیکن یہ امر یقینی ہے کہ ہم دوسروں کی نسبت اپنے آپ کو بہتر جانتے ہیں اور اس علم کی بدولت خود ضبطی خود اور کسی قدر خود سے کام لیکر اپنا بازو پکڑ لیں اور اس بھروسے کے ساتھ زندگی کے سٹیج پر جائیں کہ جب پردہ گر پڑے تو ہم اُس پارٹ کے ادا کرنے سے قاصر نہ رہیں جو قسمت نے ہمارے لئے تیار کر رکھا ہے۔

سلیمان خاں بی۔ اے۔ پی سی ایس

حقائق

نویں صدی میں کل دنیا کے باشندوں کی تعداد آٹھ سو ملیون تھی لیکن اس وقت کل دنیا کے باشندے ایک ہزار آٹھ سو ملیون ہیں۔

شمالی چین میں بعض ایسے گورے لوگ موجود ہیں جن کا رنگ یورپ کے گوروں سے ملتا جلتا ہے۔

نجد میں اب تک ایسے لوگ موجود ہیں جنہوں نے کبھی سبزی کو پکا کر نہیں کھایا۔

دنیا میں بہت سے شاعر ادیب اور عالم موجود ہیں لیکن ایسا کوئی نہیں جو دس آدمیوں کی بھی رہنمائی کر سکے۔

حکمت قوموں کے تجربات کا نام ہے

سیاسی انسان کا دل اس کے دماغ میں ہوتا ہے۔ (نپولین)

اس دنیا میں دنیا کی اصلاح کا کام کرنا سب سے زیادہ مشکل ہے (بالڈون)

شاعر کا گھر

ندی کا ہے کنارا — موسم ہے پیارا پیارا
پانی جھلک رہا ہے — سبزہ لہک رہا ہے
چھوٹے بڑے ہیں پودے — ہر سو کھڑے ہیں پودے
پھولوں سے کچھ لدے ہیں — باقی ہرے ہرے ہیں
نکہت سے پُر فضا ہے — اور جانفزا ہوا ہے
کرتی ہے جس کی جنبش۔ — پھولوں کی ایک بارش
پودوں کی ڈالیوں پر — چڑیاں ہیں زمزمہ سر
جو گا رہی ہیں گانے — دل کو لبھانے والے
کچھ اُڑ کے جا رہی ہیں — کچھ مُڑ کے آ رہی ہیں
یاں اک شجر کے نیچے — بے فکر سب جہاں سے
شاعر پڑا ہوا ہے — اور گنگنا رہا ہے
یہ حسن کا جہاں ہے — شاعر کا گھر یہاں ہے

کہسار کا ہے دامن — دلچسپیوں کا مامن
چشمے اُبل رہے ہیں — فوارے چل رہے ہیں
جاری ہیں آبشاریں — پیاری ہیں آبشاریں
چلتی ہیں کیا مٹک کر — پتھر سے سر پٹک کر
جھڑتے ہیں یوں ترارے — جوں چرخ سے ستارے
سرو و چنار خود رو — ہیں کو کنار خود رَو
بادل کا خیمہ سر پر — سیمیں ہے جس کی جھالر
چو طرف ہیں چٹانیں — گرتی ہیں جن سے بوندیں
اور بیچ ایک چشمہ — چھوٹی سی جھیل گویا
اس جھیل کے کنارے — اک سنگ کے سہارے
شاعر کھڑا ہوا ہے — کچھ منہ میں گا رہا ہے
یہ حُسن کا جہاں ہے — شاعر کا گھر یہاں ہے

ہے آدھی رات بن ہے — فطرت بنی دلہن ہے
اور اس دلہن کا دولہا — ہے چاند چودھویں کا
اک باغ یاسمیں ہے — جنت کی سرزمیں ہے
راحت برس رہی ہے — رگ رگ میں بس رہی ہے
یہ شاخسار پیارا — فصل بہار گویا
یاں مست ہو گئی ہے — خاموش سو رہی ہے
قمری کی گاہے کوکو — دلدوز اور دلجو
اُڑتی ہوئی ہوا میں — گھل جاتی ہے فضا میں
گاہے کوئی پرندا — رحمت کا یا فرشتہ
جاتا ہے یوں گزر کر — خط اک صدا کا کھینچ کر
رہ جاتا ہے ہوا پر

اک خوشنما ہے ٹیلا　خاموش اس پہ بیٹھا
ہر سو بنظرِ غائر　کچھ ڈھونڈتا ہے شاعر
یہ حسن کا جہاں ہے　شاعر کا گھر یہاں ہے

بستی ہے اک نرالی　اس زندگی سے خالی
جس کے مکین سارے　ہیں خواب اور سپنے
مٹی ہے زعفرانی　پانی ہے ارغوانی
اک ندی دلستاں ہے　اور ندی میں رواں ہے
نکہت کا ایک سفینہ　جسمیں کوئی حسینہ
بیٹھی ہوئی ہے تنہا　اور عشق کا فرشتہ
نغموں کی جنبشوں سے　پلکوں کے چپوؤں سے
نیا چلا رہا ہے　ساحل کو لا رہا ہے
ساحل ہے داستاں کا　فردوس جادواں کا
اس سحر کی فضا میں　اس گنبد نوا میں
تخئیل کے پروں پہ　شاعر سوار ہوکر
اڑتا ہوا ہے جاتا　جادو کے گیت گاتا
یہ حسن کا جہاں ہے　شاعر کا گھر یہاں ہے

روشن الدین وکیل

اخترِ صبح

ستارہ صبح کا روتا تھا اور یہ کہتا تھا　ملی نگاہ مگر فرصتِ نظر نہ ملی
ہوئی ہے زندہ دمِ آفتاب سے ہر شے　اماں مجھی کو تہِ دامنِ سحر نہ ملی
بساط کیا ہے بھلا صبح کے ستارے کی
نفس حباب کا، تابندگی شرارے کی
کہا یہ میں نے کہ اے زیورِ جبینِ سحر　غمِ فنا ہے تجھے، گنبدِ فلک سے اتر
ٹپک بلندی گردوں سے ہمرہِ شبنم　مرے ریاضِ سخن کی فضا ہے جاں پرور
میں باغباں ہوں محبت بہار ہے اس کی
بنا مثالِ ابد پائیدار ہے اس کی

اقبال

پورس

ایکٹ دوم

سین - ۱

کلیوفیلا ہیپ فستیان

ہیپ فستیان - آپ کے راجوں مہاراجوں کی پنچایت تو اُٹھتی نظر نہیں آتی کیوں نہ لگے ہاتھوں وہ راز کہہ ڈالوں جن کی بدولت میں یہاں کھنچا آیا ہوں۔ میں اُس آقا کا محرم راز ہوں جس کے دل میں آپ کی خواب آلود آنکھوں نے جذبات کی ایک دنیا پیدا کر دی ہے۔ پہلے میں انہیں فتنہ خیز آنکھوں سے پوچھتا ہوں۔ چاہتا ہوں کہ میرا پیغام صلح اُن کے خیال میں کس اثر کا مالک ہے اگر وہ لوہا مان گئیں تو ان راجے مہاراجوں کو ڈھب پر لے آنا کوئی بات نہیں۔ آہ! جس کا ایک لفظ دنیا کو تہ و بالا کرنے کا دم رکھے اس کی آتش ریز آہیں اور فلک شگاف نالے ہلکی سی آس تک پیدا نہ کر سکیں۔ کامیابی کی توقع یہاں تک کامران ہو کہ آپ کے بھائی کے مُنہ سے بھی "ہاں" کا گلوگیر لفظ نکل جائے مگر آپ کے شعلہ خو وعدول کو قرار نہ ہوا اور لا اُبالی پن نچلا نہ بیٹھے۔ رانی جو مان جھڑکے اُس کی جان کے لاگو ہونا کہاں کا دستور ہے؟ جو دنیا کی بادشاہت کو لات مار کر آپ کے لئے دھونی رمائے بیٹھا ہو اس کے ولولوں کو ٹھکرانا کہاں کی عشوہ گری ہے؟ یہ صلح و جنگ کا گورکھ دھندا جو کسی کے کھوے کھلنے میں نہیں آتا محض ایک کھلونا ہے جس کی چابی آپ کے ہونٹوں میں نہاں ہے۔ سو کی ایک کہوں دنیا اور اس کی عقیدت اس کے نزدیک بے سود ہیں اگر آپ کی چشم عنایت شامل حال نہ ہو۔

کلیوفیلا - اپنی طرف دیکھتی ہوں تو جی نہیں مانتا کہ سکندر جیسے مشہور جہان کشا کو یہ کم مایہ حسن مسحور کر سکے۔ اُس شان و تمکنت کے مالک کو کیا پڑی ہے کہ مجھ جیسی ناچیز عورت کے لئے اپنی جان ہلکان کرے۔ جناب! لاکھ نادان سہی مگر اتنا جانتی ہوں کہ ایسے گریز پا صید دیر تک پابند نہیں رہتے۔ نئی چراگاہ دیکھتے ہی زنجیریں توڑ کر نکل جاتے ہیں اور ان کی جنگ جو امنگیں محبت سے زیادہ دیر تک نہیں کھیل سکتیں۔ آسمان نے بارہا دیکھا ہے کہ آفتاب نصرت کا کمال جذبات لطیف کے زوال کا پیش خیمہ ہوتا رہا ہے۔ ممکن ہے کہ جب میں آنکھوں کے سامنے تھی انہیں میرا کچھ پاس خاطر ہو لیکن جب میں آزاد ہوئی تو ان کی زنجیریں بھی کٹ گئیں۔

ہیپ فستیان - اگر آپ اسے آتش ہجر میں جلتے اور تارے گن گن کر رات بسر کرتے دیکھ پاتے تو آپ کو یقین آتا کہ اس کی رگ رگ میں آپ کی محبت بس رہی ہے۔ جس موتی کی تلاش میں وہ جنگ کے طوفان میں کود پڑا وہ آپ ہی کی ذات ہے یہ آپ ہی کی محبت ہے جو اس تاجور فاتح کی گردن میں رسن ڈالے ایک صوبے سے دوسرے میں کھینچے لئے جاتی ہے اور اس راہ عشق میں جو چیز آ پڑتی ہے اُس کا آہنی پنجہ اُسے مسل ڈالتا ہے۔ یہ جذب الفت نہیں تو کیا ہے جو ہمارے اور آپ کے جھنڈے ایک ہی میدان میں لہرا رہے ہیں۔ یہ آپ کی ہی کشش ہے جو وہ اپنے مورچوں میں کھڑا آپ کے مورچوں پر نظر ڈال رہا ہے لیکن ان کاموں کے باوجود اس کا محجوب دل اس اندیشہ سے سہم جاتا ہے کہ مبادا یہ سب کچھ بیکار جائے اور آپ سے ملنا منوز دلی دور نکلے۔ یہ یلغار پر یلغار کرتے بڑھے آنا عبث ہے اگر آپ کے دل میں گھر نہ کر سکے اور آپ اپنی تغافل شعاری کو حق بجانب قرار دینے کے لئے ہر روز اس کے عہد وفا میں بیچ نکالتے رہیں۔ آپ کا دل بے اعتمادی . . . .

. . . .

کلیو فیلا۔ افسوس میری بہترین جوابدہی بھی آپ کے شکوک کے آگے ماند پڑ جاتی ہے۔ ہماری طبیعتیں من مانی خواہشات کو مشتبہ قرار دینے کیلئے ناحق دلائل سے پریشان ہونے کی عادی ہیں۔ کاش آپ کے آقا میرے دل کے راز سے آگاہ ہوتے۔ بہرحال ممنون ہوں کہ وہ مجھے اس قدر چاہتے ہیں۔ مجھے اندیشہ تھا۔ کہیں دن گذرنے سے ان کا جوش مدہم نہ ہو گیا ہو۔ میں محبت کی بھوکی ہوں اور کچھ نہیں جب انہوں نے ہماری سرحد میں قدم رکھتے ہی مجھے اسیر کر لیا اور مجھے معلوم ہوا کہ ساری دنیا پر اُن کا قبضہ ہے تو اس قید کو میں نے مہربانی خیال کیا بات تو ایسی تھی کہ میں گھل گھل کر مر جاتی۔ مگر مجھے اس قید میں یہ مزا آیا کہ آزادی ایک پریشان خواب ہو گئی اور اس کے حصول کا امکان موجب پریشانی ہونے لگا۔ آپ ذرا خیال کیجئے کہ اُن کی آمد کی خبر سُن کر میرے دل کی کیا کیفیت ہوئی ہوگی مگر وہ مجھے خونی ہولی دکھانا چاہتے ہیں۔ اور ایک دشمن کے انداز سے جلوہ نما ہوئے ہیں ایسا معلوم ہوتا ہے کہ میری آڑ میں وہ مزید شان وشکوہ کے متلاشی ہیں۔

ہیپ فستیان۔ رانی یہ بھول ہے۔ آپ کے حسن فسوں ساز نے اس کا فاتحانہ جوش مدہم کر دیا ہے۔ اب تو وہ اپنی تیغ آبدار کے جوہروں کو غلاف میں چھپا رہا ہے اور اُن راجوں کو صلح کی دعوت دے رہا ہے جو اس کی قدر و قیمت کا اندازہ نہیں لگا سکتے وہ اس ہاتھ کے اُٹھانے سے پرہیز کر رہا ہے۔ جو ان مغرور راجوں کو روئی کی طرح دھنک کر رکھ دے۔ جانتے ہیں آپ کس لئے؟ محض اس وجہ سے کہ کہیں اس کا نیزہ آپ کے بھائی کے سینے پر نہ پڑے۔ اسکی شجاعت آپ کے دل کو ٹھیس لگانے سے ڈرتی ہے اس کا دل فتحیابی کے اس نشان کو پسند نہیں کرتا جس پر آپ کے آنسوؤں کے موتی ٹکے ہوں۔ رانی! اس کی محبت جو والہانہ تشویش پیدا کر رہی ہے۔ اُسے پروان چڑھائیے۔ اور اُسے رنجیدہ فتح حاصل کرنے کی زحمت سے بچائیے۔ اس وقت اُس کا دریائے کرم جوش پر ہے ان راجوں کو سمجھائیے کہ اس سے اپنے گذشتہ متکبرانہ رویہ کے داغ کو دھوئیں اور اس لطف خسروانہ کو بصد نیاز قبول کریں۔ جو انہیں صرف آپ کے صدقہ میں مل رہا ہے۔

کلیو فیلا۔ آہ! کیا بتاؤں میرا پہلے ہی ماتھا ٹھنک رہا ہے جب بھائی کا دھیان آتا ہے تو میرا تن بدن کانپ اُٹھتا ہے۔ دیوتا نہ کریں کہ ایسے پیارے دشمن کے ہاتھ اس کے خون میں رنگے جائیں۔ مگر میں بھائی کے شعلۂ غضب کو مدہم کرتی ہوں تو پورس اور اکثیانا اُسے اور بھڑکا دیتے ہیں۔ جب میں کچھ کہنا چاہتی ہوں تو ایک راجہ کی شمال اور ایک مہارانی کی چمکدار آنکھیں میرے ہونٹ سی دیتی ہیں۔ ترددات کے اس ہجوم میں میں جس قدر پریشان ہوں تھوڑا ہے۔ میری ایک آنکھ بھائی کے لئے اشکبار ہے تو دوسری سکندر کے فکر میں خون رو رہی ہے۔ میں جانتی ہوں کہ سکندر نے سینکڑوں تاجداروں کو جو اس کے مقابلہ میں آئے تباہ و برباد کر دیا ہے لیکن میں پورس سے بھی ناواقف نہیں جس کے جھنڈے تلے جمع ہو کر ہماری قوم نے بڑے بڑے حملہ آوروں کے دانت کھٹے کر دیئے ہیں۔ گذشتہ کامیابیوں کے نشہ میں سرشار اور فتح اور موت سے بے پروا ہو کر اس کی پیروی کیلئے کمربستہ ہیں۔ مجھے اندیشہ ہے۔

. . . .

ہیپ فستیان۔ آپ ان فضول اندیشوں سے ملول نہ ہوں۔ پورس کو طیش آئے ہندوستان کی سب ریاستیں اس کی حمایت پر کھڑی ہو جائیں۔ مگر ایک آپ کا بھائی اُن سے الگ رہے تو۔ لیجئے وہ آ رہے ہیں۔

کلیو فیلا۔ آپ کے نیک ارادے کامیاب ہوں آپ کی دانائی ان خونخوار بادلوں کو اُڑا دے۔ بہرکیف اگر طوفان روکے نہ رُکے تو آپ کا یہ فرض ہے کہ اسے اوروں پر گرائیں ہم دونوں پر آنچ نہ آنے پائے۔

سین دوسرا

پورس ۔ ٹکسلا ۔ ہیپ فستیان

ہیپ فستیان۔ بیشتر اس کے کہ آپ کی تمام ریاستیں جنگ کے شعلے کی لپک میں آ کر ہمارے ممالک محروسہ میں داخل ہوں میرے شہنشاہ ہنگامہ کارزار گرم کرنے سے احتراز کر کے آپ کو آخری دفعہ دعوتِ صلح دیتے ہیں۔ آپ کی قومیں موہوم اُمیدوں کے بل پر فاتح فوجوں کی پیش قدمی کو روکنے کا دم بھرتی تھیں۔ لیکن گو وہ ریت کے ذروں کی طرح پھیل گئیں۔ جہلم نے ہمارے علم کو اپنے کنارے لہراتے دیکھ ہی لیا۔ یہ علم مدت کے بعد آپ کے مورچوں پر گاڑے جاتے اور کھیت آپ لوگوں کے خون سے سیراب ہو چکے ہوتے مگر ہمارے کو وقار فرمان روا نے بہادروں کے جوش کو تھام لیا آپ کو معلوم رہے وہ اس ملک میں جہانگیر اُمنگ لیکر نہیں آیا اور اس کا ہرگز یہ منشا نہیں کہ آپ کو ہراساں کرے۔ وہ نہیں چاہتا

کہ آپ کے کھنڈروں پر کھڑا ہو کر اپنی فتحمندی کا اعلان کرے اُسے ہرگز پسند نہیں کہ آپ کے راجوں کی سمادھوں پر فتح کے مینار تعمیر کرے۔ مگر یہ آپ کا کام ہے کہ کسی غلط اُمید کے بھروسہ پر آپ اُسے جوش دلا کر اپنی شکست کا سامان نہ پیدا کریں۔ ان حالات کو مدنظر رکھ کر میں آپ کو مشورہ دیتا ہوں کہ تساہل سے کام نہ لیں اور اطاعت پذیری میں جلدی کو رہنما بنائیں۔ پہلے ہی آپ کی غفلت گستاخی کی حد تک پہنچ چکی ہے۔ اس خطا کو طول نہ دو اور اس کی بے پناہ ضرب کے امتحان میں نہ پڑو۔ آپ کے دل اس کی شجاعت کو مانتے ہیں۔ آپ کو زیبا ہے کہ اس کے قوی بازوؤں کی حمایت کا خندہ پیشانی سے استقبال کرو اور اپنے ملک کے محافظ کی راہ میں آنکھیں بچھاؤ یہ پیغام جہاں پناہ نے دیا ہے۔ اب آپ کی مرضی ہے کہ خواہ تلوار پکڑ کر کھڑے ہو جاؤ یا ہتھیار اس کے قدموں پر ڈال دو اس کا منتا آپ پر ظاہر ہو چکا ہے اب جو جی میں آئے کیجئے۔ یا تو اپنے تاج کو ہاتھ سے جانے دیجئے یا انہیں بطور اس کے عطیہ کے قبول فرمائیے۔

ٹکسلا۔ آپ یہ خیال نہ کریں کہ کوئی بیہودہ تکبر ہمیں مانع ہے کہ ہم ایسے بے نظیر انسان کی عزت کریں۔ یا ہماری رعایا جوش غضب سے ایسی اندھی ہو رہی ہے کہ باوجود آپ کی عنایتوں کے آپ کے درپئے آزار ہو۔ حقیقی بزرگی کا اعتراف ہمارا شعار ہے۔ آپ اُن دیوتاؤں کی پوجا کرتے ہیں جن کے استھان ہم نے قائم کئے ہیں وہ ناسور جنہیں آپ فانی انسان خیال کرتے رہے۔ ہمارے ہاں اُن کے مندر بنے ہیں۔ لیکن یہ محض بے فائدہ کوشش ہے کہ ہماری قوموں کی آزادانہ پوجا کو غلامی سے تبدیل کیا جائے۔ یقین مانئے کہ اگرچہ وہ برمحل تحسین سے گریز کرنا وضع کے خلاف خیال کرتے ہیں لیکن اگر کوئی زبردستی سے پیش آئیگا تو وہ مراسم اخلاق کے بھی روادار نہیں ہوں گے۔ آپنے سیکڑوں ریاستیں فتح کیں۔ ذرا بتائیے تو اُن میں سے کسی کے حکمران نے آپ کی اطاعت قبول کی ان تجربات کے بعد کیا مصلحت وقت یہ نہیں چاہتی کہ سکندر کچھ دوست پیدا کرے۔ یہ قیدی جو اس کا نام سُن کر کانپنے لگتے ہیں ایک ایسی نو دولت طاقت کو سہارا نہیں دے سکتے۔ انہیں آزادی حاصل کرنے کے لئے فقط مناسب وقت کا انتظار ہے اس لئے آنکھیں کھول کر دیکھیے آپ کا مسلک خفیہ دشمنوں سے بھرا پڑا ہے۔ یہ لوگ گریبانوں میں منہ ڈال کر اپنے بےتاج بادشاہوں کا ماتم کرتے ہیں۔ اور تمہاری لمبی لمبی زنجیروں کی گرفت ڈھیلی پڑ رہی ہے۔ خبردار ہو جائیے وہی تباہی آپ کے لئے مُنہ کھولے ہے جس میں آپ ہمیں پھنسانا چاہتے ہیں۔ ہمارے وعدے کو بھی آزما دیکھیے شاید یہ اوروں کے حلف وفاداری سے زیادہ پائدار نکلے۔ ان لوگوں کو آزاد رہنے دیجئے۔ جو مانتے ہیں کہ آزاد رہ کر آپ کے کارناموں کے گُن کس طرح گائے جاتے ہیں۔ میں آپ کے مالک کی رفاقت ان شرائط پر قبول کر سکتا ہوں اور میں اس بادشاہ کا شاہانہ انداز سے استقبال کرنے کیلئے تیار ہوں جو میرا دل فتح کرنا چاہے۔ مگر میرے تخت کی طرف ترچھی آنکھ سے نہ دیکھے۔

پورس۔ میرے خیال میں جب جہلم کے گرد و نواح کے علاقہ سے فوج کے دل بادل اُمڈے آرہے تھے تو اُس نے دیکھ لیا تھا کہ ہم اُس کے کناروں کی حفاظت کے لئے اپنے جسموں کی دیوار بنا کر کھڑے ہو سکتے ہیں اس عظیم الشان معرکہ کیلئے میرے ہمراہ صرف وہی راجے آئے تھے جو ظالموں کے خون کے پیاسے تھے۔ لیکن اب ایک ایسا راجہ پیدا ہوا ہے جو سکندر کی دست بوسی کیلئے بیتاب ہے۔ اور اہل مقدونیہ کے ساتھ مل کر خود اپنی رسوائی کے درپے ہے۔ اس لئے میرا فرض ہے کہ اُن کی نمائندگی کروں جن کا اعتماد اسکی غداری سے نالاں ہے اور ہندوستان کی طرف سے آپ کے پیغام کا جواب دوں سب سے پہلے یہ بتائیے کہ جس بادشاہ نے آپ کو یہاں بھیجا ہے وہ یہاں کس لئے آیا۔ جو امداد وہ ہمیں دینا چاہتا ہے فرمائیے کہ ہم نے کب اس کی التجا کی تھی وہ کس منہ سے ان لوگوں کو پناہ دینا چاہتا ہے جن کا سوا اس کے کوئی اور دشمن نہیں پیشتر اس کے کہ اس کا غضب جوش میں آکر دنیا کو برباد کرنے کا تہیہ کرے ہندوستان چین کی نیند سو رہا تھا۔ اور جو کبھی کوئی ہمسایہ اس کے سکون میں خلل انداز ہوتا تو مادر وطن کے سپوت سینہ سپر ہونے میں کوتاہی نہ کرتے تھے۔ آخر اس خونخوار حملہ کے معنے! کوئی بتائے ہم نے کون سے وحشیانہ فعل کا ارتکاب کیا جس سے وہ بگڑ گیا۔ کیا ہماری فوجوں نے کبھی اس کے ملک پر حملہ کیا اور ان ملکوں کو تاراج کیا جن کا ہم نے نام بھی نہ سُنا تھا۔ متعدد ملک۔ صحرا اور دریا ہمارے اور اس کے درمیان حائل ہیں۔ . . . .

. . . اور آمد و رفت کی کوئی راہ نہیں۔ کیا اُسے یہ گوارا نہیں کہ دنیا کا ایک گوشہ تو باقی رہے۔ جو اس کے نام اور طوق اور سلاسل سے آشنا نہ ہو۔ کیسی عجیب شجاعت ہے جسے صرف

ایذا رسانی سے کام ہے۔ اور جہاں تک اس کی پہنچ ہے آگ لگاتے چلی جاتی ہے۔ جو سوائے تکبر آمیز حقارت کے کسی کے سامنے جھکنا نہیں جانتی وہ دنیا کو ایک وسیع قید خانہ بنانا چاہتا ہے جس میں ہمارے جیسے سب انسان اس کے قیدیوں کی طرح آباد رہیں۔ ملک پر ملک فتح ہو اور بادشاہ پر بادشاہ اس کا غلام ہوتا چلا جائے۔ اس کے گنہگار ہاتھ سب کو ایک زنجیر آہنی میں باندھ رہے ہیں۔ اس کی طمع ہمیں پہلے ہی نگل چکی ہے۔ سینکڑوں تاجداروں سے اب ہم چند ایک رہ گئے ہیں۔ کیا کہا میں نے صرف ہم چند ایک؟ نہیں مجھے یہ کہنا چاہیئے صرف میں جس میں سلف کی کچھ شان باقی ہے۔ آہ! اس خیال سے میرا خون کھول اُٹھتا ہے۔ اس وسیع دنیا کو متزلزل دیکھ کر میں اس لئے خوش ہوتا ہوں کہ اگر یہ ممکن ہے تو صرف میرا بازو اس کی آزادی بحال کر سکتا ہے۔ جب امن و امان کا سکہ جاری ہوگا تو سب کہیں گے کہ سکندر اعظم ساری دنیا کو فتح کر لیتا۔ اگر دور دراز سرحد پر وہ مجھ سے دوچار نہ ہوتا۔ جس نے اس کی زنجیروں کو گھاس کے تنکے کی طرح توڑ ڈالا۔ اور دنیا کو آزاد کر دیا۔

ہیپ فستیان۔ کم از کم آپ کے لفظوں سے تو یہی ظاہر ہوتا ہے کہ آپ بڑے شیر دل واقع ہوئے ہیں۔ لیکن اس طوفان کے روکنے کا وقت ہاتھ سے نکل چکا ہے۔ اس ڈگمگاتے ہوئے ملک اور خود آپ کی ذات کو صرف آپ کا سہارا ہے۔ بہر حال میں نہیں کہتا کہ آپ پیش دستی نہ کریں۔ آپ شوق سے میرے بادشاہ پر حملہ آور ہوں۔ مگر میں یہ ضرور کہوں گا کہ کاش آپ اس کے حالات سے زیادہ واقف ہوتے اور شہرت نے اس کے نصف ہی کارنامے بتائے ہوتے تو اس صورت میں آپ دیکھتے ۔۔۔۔۔۔۔۔

پورس۔ میں کیا دیکھتا؟ میں جان لیتا؟ یہی کہ مجھے فوراً سکندر کے پاؤں میں سر رکھ دینا چاہیئے۔ یہی کہ ایران نے ایکدم اسکی اطاعت قبول کر لی۔ یہی کہ تمہارے اسلحہ خون آشامی سے تنگ آ گئے ہیں۔ لیکن میں پوچھتا ہوں کہ عیش پسند آرام طلب بادشاہ کو مطیع کر لینا کون فخر کی بات ہے۔ ایک ایسی بے حس اور بے جان قوم پر غالب آنا کون بڑا کارنامہ ہے جنہیں اپنی سنہری زرہ بکتروں کا اُٹھانا دوبھر ہو رہا تھا۔ جنہوں نے ذرا مقابلہ نہ کیا۔ آپ کو دیکھتے ہی زمین پر جھک گئے اور آپ کے بادشاہ کے سدراہ ہونے کے لئے صرف لاشیں رہ گئیں۔ اس کارنامہ کو دیکھ کر دیگر اقوام کی آنکھیں چندھیا گئیں۔ اور عاجزانہ انداز سے سجدہ ریز ہو کر شرائط صلح کی طالب ہوئیں۔ وہ خوف سے مرعوب ہو کر یہ خیال کرتے تھے کہ دیوتا کا مقابلہ کرنا دھرم کے خلاف ہے۔ لیکن ہم جو فاتحوں کو دوسری نگاہ سے دیکھتے ہیں۔ خوب جانتے ہیں کہ دیوتا ظالم نہیں ہوا کرتے۔ پس اس کے غلام اُسے لاکھ آسمان پر چڑھائیں ہم تو اس پسر مشتری کو محض انسان سمجھتے ہیں۔ ہم اس کی راہ میں پھول بچھانے کے لئے تیار نہیں اور وہ ہمیں ہر جگہ مسلح پائیگا۔ ہر قدم پر اس کی فتوحات کا راستہ روکنے والے کھڑے ہوں گے۔ یہاں ایک چٹان سینکڑوں جانیں لیکر رہیگی ایران کی ٹڈی دل کو پریشان کرنے میں اتنی زحمت، اتنا وقت اتنے حملے صرف نہ کرنے پڑے ہوں گے جو اس چٹان پر قبضہ کرنے کے لئے درکار ہیں۔ جس آرام طلبی نے ایران کو برباد کیا۔ اُسے ہم نفرت کی نگاہ سے دیکھتے ہیں۔ آپ ہمارے ملک کے روپے سے ہماری مردانگی کو رشوت نہیں دے سکتے۔ صرف ایک چیز پر ہمارا دل للچاتا ہے اور وہ ناموری ہے جس کے لئے میں اور سکندر نبرد آزما ہو رہے ہیں۔ صرف یہی بات ۔۔۔۔۔۔۔۔

ہیپ فستیان۔ اسی کی سکندر کو تلاش ہے۔ اس سے کمتر درجہ کی چیزوں کی طرف وہ آنکھ اُٹھا کر بھی نہیں دیکھتے۔ صرف اسی کے لئے وہ اپنے ملک سے چل کر دارا کے تخت تک آئے۔ اور اس عظیم الشان سلطنت کی بنیادیں ہلا دیں۔ اس کے مسلح حملے نے فتح و نصرت کے تاج و تخت اُس کی تحویل میں دے رکھے ہیں۔ آپ کا غرور اس معانی کو رد کرتا ہے۔ مگر آپ کی آنکھوں کو اس کی کامیابی کے نظارے دیکھنے سے نہیں روک سکتا۔ آج کا دن دیکھ لیگا کہ وہ ناموری کے لئے کس طرح جنگ کرتے ہیں اور تیغ بکف سرحد فتح تک یلغار کرتے چلے جاتے ہیں۔

پورس۔ تشریف لے جائیے میں اُن کے مقابلے کو حاضر ہوں

سین (۳)

پورس۔ ٹکسلا۔

ٹکسلا۔ اس قدر جوش۔ ایسی بے صبری۔ کیا آپ کا ارادہ ۔۔

پورس۔ میں آپ کی اطاعت پذیری میں دخل دینا نہیں چاہتا۔ ہیپ فستیان صرف مجھ سے کبیدہ خاطر ہو کر گیا ہے۔ اور اپنے بادشاہ کو آپ کی فرمانبرداری سے ضرور مطلع کرے گا۔ مہارانی اکشیانا کی فوجیں میرے ساتھ ہیں اور میرے جھنڈے کے سایہ میں

آغاز جنگ کا انتظار کر رہی ہیں۔ مہارانی کے تخت کی حفاظت میرا فرض ہے۔ گویا وہ میرا ہی تخت ہے اور آپ میرے اس دعوے کی صداقت میدانِ جنگ میں دیکھیں گے۔ مگر مہاراج اپنے دل کو بچائیے۔ مبادا نئے دوستوں سے گرم جوش وفاداری کے اظہار میں وہ آپ کے لئے کوئی نئی آتشِ جنگ مشتعل کرے۔

سین (۴)

اکشیانا۔ پورس۔ ٹکسلا

اکشیانا۔ مہاراج یہ میں کیا سن رہی ہوں۔ ہمارے دشمن اترا رہے ہیں کہ ٹکسلا نے اطاعت کر لی ہے۔ کم از کم اس کا دل تابع ہو گیا ہے اور وہ اس بادشاہ کے خلاف فوج کشی نہ کرے گا۔ جس کی وہ عزت کرتا ہے۔

ٹکسلا۔ دشمنوں کی باتوں پر کوئی اعتبار نہیں کرتا وقت آپ کے علم میں بہتر اضافہ کرے گا۔

اکشیانا۔ تو مہاراج اس افواہ کی تردید کیجئے اور اُن کی گوشمالی فرمائیے جنہوں نے یہ ہوائی اڑائی ہے۔ پورس کی طرح بڑھئے اور اُن کے منہ بند کر دیجئے۔ انہیں بتائیے آپ کا قہر کس غضب کا ہے تاکہ انہیں معلوم ہو جائے کہ آپ سے بڑھ کر ان کا کوئی دشمن نہیں۔

ٹکسلا۔ مہارانی! میں صاف آ رہا ہوتا ہوں۔ ان افواہوں سے اپنے دل کو پریشان نہ کریں۔ پورس اپنا حق ادا کریگا تو میں بھی اپنے فرض کی بجا آوری میں کوتاہی نہ کروں گا۔

سین (۵)

اکشیانا۔ پورس

اکشیانا۔ اس کی چین جبین کچھ نہیں کہتی۔ اُس کا اُترا ہوا چہرہ اس درجہ کا معلوم نہیں ہوتا۔ جس کے دل میں فتح کی اُمنگ ہو اور جس پر میں اعتماد کر سکوں۔ اب کوئی شبہ نہیں رہا کہ ہمیں دھوکا دیا گیا ہے اور اس نے اپنی بہن پر ننگ و ناموس اور وطن کو قربان کر دیا ہے۔ ضد کے بارے میں وہ ہمارے زوال کا خواہاں ہے اور اس آرزو کے اظہار کیلئے اُسے صرف جنگ کے وقت کا انتظار ہے۔

پورس۔ میں تو یہ سمجھتا ہوں کہ ٹکسلا کے جانے سے ایک کمزور تنکا میرے ہاتھ سے نکل گیا میں اسے ایک مدت سے جانتا ہوں۔ اور اس لئے میں نے اس کی مدد پر کبھی بھروسہ نہیں کیا۔ ان آنکھوں نے اس کا تذبذب دیکھا ہے۔ مجھے ہمیشہ یہی اندیشہ رہا کہ کہیں یہ کمزور بازو ہمیں وقت وقت پر دغا نہ دیں۔ ایک غدار اپنی بہن کو خوش کرنے کے لئے الگ ہو گیا خوب ہوا۔ اس نے ہمیں اس قدر کمزور نہیں کیا جس قدر اس کی بزدلانہ مدافعت سے ممکن تھا

اکشیانا۔ جوش میں نہ آئیے۔ آپ کی بہادری ہزاروں دشمنوں سے عہدہ برا نہیں ہو سکتی۔ اکیلے دم اس کی ضربوں کو روکنا اور بے شمار دشمنوں کا مقابلہ کرنا کھیل نہیں

پورس۔ ہیں! کیا آپ چاہتی ہیں کہ میں بھی غداری کروں اور ڈر کے مارے آپ کو دشمن کے حوالے کر دوں۔ اپنے کیمپ میں چھپ کے بیٹھا رہوں اور اعلان جنگ کے بعد لڑنے سے جی چراؤں مہارانی میں اس بات کو باور نہیں کرتا بلکہ بخوبی جانتا ہوں کہ آپ کے دل میں بھی نام رشک کا شعلہ بھڑک رہا ہے۔ بھلا میں یہ فراموش کر سکتا ہوں۔ کہ یہ صرف آپ کی سحر بازی کے طفیل ہے کہ ہمارے تمام راجے میدان جنگ کی طرف کھنچے چلے آ رہے ہیں جن کی عالی حوصلگی اطاعت سے نفرت کرتی ہے۔ اور صرف اس کو محبت کی آنکھ سے دیکھ سکتی ہے جو سکندر کو زیر کرے۔ یہی میرا فرض ہے جس کے لئے میں دوڑا جا رہا ہوں اس لئے نہیں کہ میں اس کا قیدی نہ ہوں بلکہ اس لئے کہ آپ کی حراست سے باہر نہ ہو جاؤں۔ مہارانی! میں جانتا ہوں تاکہ اس دل پذیر قید کا سلسلہ نہ ٹوٹنے پائے۔ یا تو میدان مار لیا یا میدان میں کام آیا۔ تیسری کوئی صورت مجھے نظر نہیں آتی۔ اور چونکہ میری آہیں اس دلبر کچھ اثر نہیں کر سکتیں۔ جسے ناموری کے سوا کچھ نہیں بھاتا۔ اس لئے میں فتح حاصل کرنے کے لئے نکلتا ہوں جو ناموری کو میرے نام کا طغرا بنائے گی ممکن ہے کہ جوانمردی کی قدر دانی آپ کے دل کو فاتح کی طرف مائل کرے۔

اکشیانا۔ مہاراج! آپ میدان کو سدھاریئے میں ٹکسلا کے کیمپ کا جائزہ لیتی ہوں ممکن ہے کہ کوئی ایسا شخص نکل آئے جو اپنے راجہ سے زیادہ بہادر زیادہ وفادار ہو۔ میں ایسے سورماؤں کو آمادہ پیکار کرنے کی آخری کوشش کروں گی۔ پھر آپ کے کیمپ میں جا کر آپ کی مشکلات میں شریک ہو جاؤں گی۔ میرے دل میں جو راز بند ہیں انہیں سربستہ ہی رہنے دیں۔ اس وقت یہی دعا ہے کہ زندہ رہو اور فتح کے پھریرے اڑاؤ۔

پورس۔ حال دل بتانے میں تاخیر عبث ہے۔ کیوں نہیں کہہ ڈالتے کہ میری منتیں بامراد ہوئیں اور آپ کا دل پسیجا۔ کیا آپ کا دل پسند کرتا ہے کہ ایک بدقسمت راجہ کو اور بدقسمت بنایا جائے۔ جسے شاید گردش تقدیر

اس بت کی یاد سے محروم کرے جو میری روح کی سجدہ گاہ ہے اور میں بے مراد دنیا سے اُٹھ جاؤں۔

اکشیانا۔ اب میں کیا کہوں۔

پورس۔ میرے دل کی مہارانی! اگر آپ کو مجھ پر رحم آتا ہے تو اپنے دل کو سمجھائیے کہ میری محبت کا تھوڑا سا اعتراف کرے۔ مجھے بابار فتح کا یقین دلاتا ہے تو یا علان ہی کیوں نہیں کرتا کہ وہ ان جگر سوز آہوں کا مقابلہ نہیں کرسکتا۔ نہ اس کی طاقت میں ....

اکشیانا۔ مہاراج حملے کو روکنے کے لئے بڑھئے گو آپ کو میرے دل سے بھی زیادہ مضبوط چیز سے کیوں نہ مقابلہ کرنا ہو مگر آپ بہر صورت کامگار رہیں +

(محمد عمر نور الٰہی)

غزل

گھرے تعلقات میں اُس رنگ و بُو کے ساتھ
جنّت رگوں میں دوڑ رہی ہے لہو کے ساتھ

گذریگی جس طرح بھی گذارینگے زندگی
وعدہ نباہ کا ہے ہر اِک آرزو کے ساتھ

یہ جانتی ہے سوختہ سامانیوں کا راز
صحرا نہ جل اُٹھے مری آوازِ ہُو کے ساتھ

ہے اضطراب اور بلا کا ہے اضطراب
بجلی سی دوڑتی ہے رگوں میں لہو کے ساتھ

بے لطفیٔ حیات کی رُوداد کچھ نہ پوچھ
دن کاٹنے پڑے دلِ بے آرزو کے ساتھ

منّت پذیرِ دیدۂ خونبار ہے بہار
میں جنّتیں بکھیر رہا ہوں لہو کے ساتھ

الفاظ کو لباسِ حقیقت میں پیش کر
اشکوں کا سلسلہ بھی رہے گفتگو کے ساتھ

میری طرح فضائیں دو عالم کی مست تھیں
وہ انجمن ہی اُٹھ گئی اِک خوش گلو کے ساتھ

ثاقبؔ امیر ہو کہ گدائے فتادہ پا
انساں ہے وہی جو رہے آبرو کے ساتھ

ثاقبؔ جالندھری

انتظار ناکام

وہ خالی کمروں سے ہوکر ملاقات کے کمرہ کی طرف گئے

"آہ! ملکہ این کی میز یہ رکھی ہے جس کے متعلق میں تم سے باتیں کر رہا تھا۔" بوڑھے نے کہا "کتنی خوبصورت ہے کیوں نہیں!"

"بہت خوب صورت! بہت عمدہ۔" ڈیورا نے اسے دیکھ بھال کر تعریف کے لہجہ میں کہا۔ لیکن درحقیقت اس کا یہ خیال نہ تھا کہ میز اتنی خوبصورت ہے اس میں شک نہیں کہ وہ دلچسپ تھی۔ مگر معمولی درجہ کی۔ وہ حیران تھا کہ بوڑھا اس میز کا گرویدہ کیوں ہے۔ بوڑھا ابھی تک اس کی تعریف کرتا چلا جا رہا تھا۔ اور اپنے اس جذبہ کو نہیں دبا سکتا تھا۔

"عجیب میز ہے" فیلڈ نے کہا "بہت عجیب چیز ہے۔ مجھے اتفاقاً پیر کے دن مور سیز سٹریٹ میں یہ مل گئی۔ اب کی دفعہ میں نے اس کی قیمت اس سے کم دی ہے جتنی کہ میں نے ۱۸۸۰ء میں ادا کی تھی۔"

"تو کیا یہ پہلے بھی آپ کے قبضہ میں رہ چکی ہے؟" ڈیورا کے لہجہ میں اشتیاق پیدا ہو گیا۔

"جی ہاں اور اس کے متعلق ایک عجیب واقعہ بھی ہے۔"

"کیا میں اسے سن سکتا ہوں؟ ..... یا یہ راز ہے۔"

"اس سے تمہیں اذیت ہوگی۔"

"مسٹر فیلڈ رافیل" ڈیورا کی سیاہ آنکھیں جھوٹی تعریف سے چمک رہی تھیں۔

"تھا تو یہ راز ہی لیکن اس کو اتنی مدت ہو چکی ہے کہ اب اسے پردہ راز میں رکھنے کی ضرورت نہیں میں نے اُسی وقت اسے لکھ لیا تھا۔ تمہیں معلوم ہے کہ کبھی مجھے بھی تصنیف و تالیف کا شوق تھا؟"

"تصنیف و تالیف کا شوق مسٹر فیلڈ۔ کیا ابھی جاننے کی ضرورت ہے؟ میری لائبریری میں تمہاری تینوں کی تینوں کتابیں موجود ہیں"

یہ سن کر بوڑھے کا چہرہ اطمینان سے چمک اُٹھا۔ اور پہلے سے زیادہ بچوں کی سادگی اور بھولا پن اس کے منہ پر برسنے لگا۔

"تم چاہتے ہو کہ تمہیں وہ مضمون پڑھ کر سناؤں۔"

"میں اصرار کرتا ہوں مسٹر فیلڈ!"

آہستگی اور بے ڈھنگے پن سے بوڑھے نے چابیاں نکالیں۔ کتابوں کا خانہ کھولا۔ عینک درست کی۔ اور الماری میں سے ایک چرمی کتاب نکالی۔

"یہ اُس رسالے کی پہلی جلد ہے جس میں میں مضامین لکھتا تھا۔" یہ کہا اور لیمپ کے نیچے بیٹھ کر ورق اُلٹنے لگا۔ اس وقت اُس کا سانس کچھ پھولا ہوا سا تھا۔

"تو یہ ہے۔ میں پیر کی شب کو یہی مضمون پڑھ رہا تھا۔ مجھے ڈر ہے کہ یہ مضمون بہت روکھا پھیکا ہے۔ غالباً مجھے واضح کرنے کی ضرورت ہوگی .... نہیں! مضمون اپنا مطلب آپ بیان کرے گا۔ مجھے صرف اتنا کہنا ہے۔ کہ جس وقت میں نے یہ مضمون لکھا تھا اُس وقت میرے ادبی ولولے سرد ہو چکے تھے۔"

اُس نے اپنی گہری اور خوش آیند آواز میں جو کچھ پڑھا وہ حسب ذیل ہے:

"جمعہ کے دن صبح کے وقت میں اپنے قدیم خوبصورت مکان میں اکیلا تھا اور ابھی ابھی میں نے اپنا اسباب ہیری کے پاس جانے کے لئے باندھا تھا۔ مکان میں صفائی کا بھی کوئی اہتمام نہ تھا۔ کیونکہ معماروں کا سامان اور دوسرا کوڑا کرکٹ وہیں ادھر اُدھر بکھرا پڑا تھا۔ ان لوگوں کو ابھی ایک دن اور کام کرنا تھا۔ اتنے میں سامنے کے دروازے کی گھنٹی بجی۔ پہلے تو مجھے خیال آیا کہ شاید مجھی سے بج گئی ہوگی۔ لیکن جب وہ بار بار بجی تو مجھے ایسا ..... محسوس ہونے لگا کہ گھر بہت بڑا اور خالی ہے۔ میں بالکل اکیلا ہوں۔ خادمہ اس وقت اپنے گھر جا چکی تھی۔ میں نہیں چاہتا تھا کہ میرے جانے کے بعد وہ یہاں ٹھیری رہے۔ آخر میں خود ہی نیچے گیا۔ سامنے کے دروازے میں تالا لگا تھا۔ اور چابی میرے پاس نہ تھی۔ کیونکہ کاریگر لوگ حسب انتظام اپنے ساتھ لے گئے تھے اور میرے لئے یہ تجویز کرلی گئی تھی کہ میں ضرورت کے وقت نوکروں کے دروازے سے آیا جایا کروں۔ اس لئے مجھے پہلو کے دروازہ سے نکل کے گرد گھوم کر گلی میں جانا پڑا۔ جب وہاں پہنچا تو میں نے دیکھا کہ جلوخانہ میں ایک لڑکی کھڑی ہے۔ اُس کا لباس سیاہ تھا۔ میں احتراماً اپنی ٹوپی اُتارنا چاہتا تھا لیکن اسی وقت مجھے یاد آیا کہ میرے سر پر ٹوپی ہی نہیں۔ میں نے اُس سے دریافت کیا کہ وہ کیا چاہتی ہے۔ اُس نے کہا کہ میں مسٹر رافیل فیلڈ سے ملنا چاہتی ہوں اور پھر کہا "کیا آپ ہی فیلڈ نہیں ہیں؟" میں نے اپنے اُسے پیش آیند حالات بتلائے۔ اور پھر اسے چکر دیکر برابر کے دروازہ کی طرف سے

سیڑھیوں پر جو دوسرے فرش کو جاتی تھیں لے آیا۔ اُس وقت وہاں کوئی چیز بھی اپنی اصلی حالت میں نہ تھی۔ حتیٰ کہ فرش پر قالین وغیرہ بھی نہ تھا (مضمون پڑھتے پڑھتے فیلڈ نے کہا) "میں اُسے اُس کمرے میں لایا"

کمرے میں دو کمانی کی کرسیاں تھیں۔ اس کے علاوہ میرا ایزل (تصویر بنانے کا تختہ) اور بیٹھنے کی چوکی اور فرش صاف کرنے کا برش۔ اور ملکہ این کی میز جو پندرہ دن پہلے ہی مجھے ملی تھی۔ بس یہی کائنات تھی جو اس کمرہ میں موجود تھی۔ اس کے ماسوا کچھ تختے اور ٹکٹکیاں بھی پڑی تھیں جنہیں مزدور ابھی اُٹھا نہ سکے تھے۔ وہ بے حد پریشان تھی اور میں بھی کسی قدر گھبرایا ہوا تھا۔ اُس نے کہا "میں چاہتی ہوں کہ آپ میری ایک تصویر کھینچ دیں۔ کیونکہ میں کل انگلستان سے جا رہی ہوں۔ زیادہ نہیں صرف ایک خاکہ ہی بنا دیں میں آپ کے پاس اس لئے تصویر کھنچوانے آئی ہوں کہ آپ نے میرے ایک دوست کی تصویر بنائی تھی۔ میں اپنے اس دوست کی ماں کو اپنی تصویر دینا چاہتی ہوں" لیکن وہ دوست کون تھا۔ اس کا نام بھی مجھے اُس نے نہیں بتایا۔ بلکہ بتانے سے معذوری ظاہر کی۔

"میں نے اُسے کہا کہ میں ابھی آدھ گھنٹہ تک اگر گاڑی مل گئی لندن سے جا رہا ہوں۔ ہاں کسی دوسرے دن مجھے آپ کی تصویر بنانے کی مسرت حاصل ہو گی۔ وہ خاموش رہی۔ اور مجھے یقین ہو گیا کہ وہ بول ہی نہیں سکتی آنسوؤں کے قطرے اس کی آنکھوں سے ٹپک رہے تھے۔ اس نظارے سے میں گھبرا سا گیا۔ میرے جسم میں ایک غیر معمولی سنسنی سی پیدا ہو گئی۔ اتنے بڑے گھر میں میں ہی اکیلا اس کے ساتھ تھا۔ اور میں محسوس کر رہا تھا کہ میں بہت متاسف اور دل گرفتہ سا ہو گیا ہوں۔ میں ایک کامیاب آدمی ہوں۔ لیکن مجھے حیرت سی ہوئی کہ میں اتنے بڑے مکان کا سامان اور ملازموں کی تنخواہ اور کرایہ اور باقی تمام چیزیں کیسے مہیا کر سکتا ہوں" میں محسوس کرتا تھا کہ میں ہی دنیا میں اکیلا آدمی ہوں۔ لیکن میں حیران ہوں کہ میں ایسا کیوں محسوس کرتا تھا۔

یکایک بغیر کسی ارادے کے میں نے اسے کہدیا کہ میں باہر جاکر تار دیتا ہوں کہ میں کل تک لندن سے نہیں آسکتا۔ اور میں فوراً تمہاری تصویر کا ایک خاکہ بنا دوں گا۔ اُس نے اس کی مخالفت نہ کی۔ اُس نے خاموشی سے روتے ہوئے مجھے دیکھا۔ میرے لئے یہ انوکھی بات تھی۔ اور میں نے اس کی حامی محض اس وجہ سے بھر لی تھی کہ وہ بہت ہی حسین اور خوب صورت بالوں والی نوجوان لڑکی تھی۔ اُس نے نیم ماتمی لباس پہنا ہوا تھا اور وہ اس کے جسم پر زیب بھی دیتا تھا۔ مجھے اس سے زیادہ اس کے متعلق جاننے کی خواہش بھی میرے دل میں نہ تھی۔ بہرحال میں گھر سے دوڑتا ہوا گیا۔

اور "ایجنٹ سٹریٹ پوسٹ آفس" میں پہنچا جہاں مجھے ہیری کو تار دیتے ہوئے کافی وقت صرف ہو گیا۔

جب میں پوسٹ آفس سے لوٹ کر آیا تو وہ فرش پر جھاڑو دے رہی تھی۔ بلکہ وہ جھاڑو دے چکی تھی۔ اس کی ٹوپی ایک کرسی کی پشت کی طرف لٹک رہی تھی۔ میں لرز گیا اور ایک لفظ تک منہ سے نہ نکال سکا۔ اور میرے تمام جسم میں کانٹے سے چبھتے محسوس ہوتے تھے۔ وہ مسکرائی میں نے اُسے کہا کہ تم اپنی ٹوپی اوڑھ لو۔ میں ٹوپی کے ساتھ ہی تمہاری تصویر بنانا چاہتا ہوں۔ میں نے چبوترے پر کرسی رکھدی اور اُسے کہا کہ وہ ذرا سنور کر بیٹھ جائے۔ جتنا عرصہ میں اپنا تصویر کا تختہ جماتا اور رنگ ملاتا رہا۔ وہ خاموشی کے ساتھ دریچے سے باہر کی طرف دیکھتی تھی۔ دفعتاً اُس نے کہا "اور تصویر کی قیمت کس قدر ہو گی"۔ میں نے کہا یہ کوئی بات نہیں اس کے متعلق ہم بعد میں گفتگو کریں گے یہ باتیں عموماً یونہی کہی جاتی ہیں۔ لیکن اُس نے اصرار کیا کہ میں شروع کرنے سے پہلے قیمت کا فیصلہ کرنا چاہتی ہوں۔ اس لئے میں نے اسے کہا۔ کہ تم ہی قیمت مقرر کرلو۔ اُس نے کہا کہ میں پچاس پونڈ ادا کر سکوں گی۔ میں اس پر راضی ہو گیا اور اگر وہ پانچ پونڈ کہتی تو میں اُن پر بھی راضی ہو جاتا۔ اُس نے اپنے بٹوے میں سے نوٹ نکالے اور بولی چونکہ تم مجھ سے واقف نہیں ہو اس لئے میں پیشگی اجرت دینا چاہتی ہوں میں نے انکار کیا۔ لیکن اس بحثا بحثی کا خاتمہ تب ہوا۔ جب اُس نے چوکی سے اُتر کر نوٹ چمنی کی کارنس پر رکھدیے۔

پون گھنٹہ تک تصویر پر کام کرنے کے بعد میں نے فیصلہ کیا کہ تصویر خاکے سے کچھ زیادہ ہی ہو۔ اور میں اسپر سارا دن کام کرتا رہوں۔ لیکن بارہ اور ایک بجے کے درمیان مجھے بڑے زور کی بھوک لگی۔ ایسی سخت بھوک پہلے مجھے کبھی نہیں لگی تھی۔ اس لئے میں نے تجویز کی کہ ہم ویری کے ہوٹل میں چل کر کھانا کھالیں۔ لیکن اُس نے کہا کہ مجھے تو بھوک نہیں۔ اس لئے میں تو کچھ نہیں کھا سکتی۔ اس پر میں نے کہا کہ بھوک تو مجھے بھی کچھ ایسی نہیں اس لئے میں بھی کھانے کے لئے کہیں باہر نہیں جاتا۔ اس کے ساتھ ہی میں نے کہا کہ میں باورچی خانہ میں جاکر دیکھتا ہوں کہ آیا وہاں کھانے کی بچی کھچی کوئی چیز پڑی ہے۔ چنانچہ میں سیڑھیوں سے ہوکر باورچی خانہ میں گیا۔ چولھے کی آگ بھی اچھی طرح بجھی نہ تھی۔ خادمہ کا اپرن ایک کھونٹی پر لٹکا تھا۔ میں نے ادھر اُدھر ڈھونڈا تو مجھے آدھی روٹی اور تین انڈے مل گئے۔ جب میں نے اپنے پس پشت کچھ کھڑکا سنا تو میں بھونچکا سا رہ گیا مڑ کے دیکھا تو وہ لڑکی کھڑی تھی۔ اُس نے کہا "اگر کوئی چیز موجود ہے تو لائیے میں آپ کے لئے پکا دیتی ہوں"۔ میں نے وہ چیزیں جو مجھے ملی تھیں

اُسے دے دیں۔ اُس نے آپرن باندھ لیا۔ آگ روشن کی اور برتنوں کی الماری کو دیکھا تو کچھ چابھی مل گئی۔ اُس نے دیگچی دھوئی اُس کی حرکات میں سادگی کا البیلا پن پایا جاتا تھا۔ میں خیال کرتا ہوں کہ یہ میری زندگی میں غیر معمولی لمحات تھے۔ وہ نوجوان بھی اور بلا کی حسین و جمیل۔ بال نہایت دلفریب تھے۔ وہ سرتاپا ایک راز تھی۔ میں نے اپنے دل میں خیال کیا کہ اگر میں ہیری کو تار نہ دیتا تو یہ میری کس قدر حماقت ہوتی۔ اور اس خیال نے مجھے کچھ بیمار سا بنا دیا کہ اگر آج میں یہاں نہ ٹھہر جاتا تو کیسی لذت سے محروم رہتا۔

جب کھانا تیار ہو چکا تو اُس نے ہر چیز کو قرینے سے ایک بڑے طشت میں سجایا۔ میں طشت کو اُٹھا کر نیچے لے آیا۔ اور ہم دونوں نے ملکر کمانی کی میز پر ایک دوسرے کے آمنے سامنے بیٹھ کر کھانا کھایا۔

رفیلڈ نے پڑھتے پڑھتے میز کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا۔ "یہ وہی میز ہے۔"

ہم میں ایک قسم کی موانست سی پیدا ہو گئی۔ لیکن ہماری تمام باتیں تصویر ہی کے متعلق تھیں۔ اسے بھی تصویر کشی کے فن میں کچھ شدھ بدھ حاصل تھی وہ اس فن سے اچھی طرح باخبر نہ تھی۔ لیکن اسے اتنا سطحی علم ضرور تھا جتنا کہ عورتیں ہر شے کے متعلق حاصل کر لیتی ہیں۔ اس سے ظاہر تھا کہ مصوروں میں اس کی جان پہچان ضرور ہو گی۔ میں کھانا کھانے کے بعد ایک گھنٹہ تک برش چلاتا رہا۔ یکایک مطلع ابر آلود ہو گیا۔ روشنی کم ہو گئی۔ مدھم روشنی میں کام جاری رکھنا ناممکن سا تھا۔ ہم نے بادلوں کی گرج سنی۔ اور اسی کے ساتھ بارش کا سخت طوفان آ گیا۔ اندھیرا اتنا زیادہ تھا کہ اس میں بجلی کی چمک پوری تابانی سے نمایاں ہو جاتی تھی اس کا رنگ زرد تھا۔ گاڑیوں کی آمد و رفت رُک گئی تھی۔ صرف کبھی کبھی کسی گھوڑے کے ٹاپ چلنے کی آواز سنائی دے جاتی تھی۔ ہم نے دریچوں سے باہر دیکھا۔ پانی کے دھارے سڑکوں پر چل رہے تھے۔ چند راہگیر مکانوں کی ڈیوڑھیوں میں پناہ گزین تھے چارلس جیمس فاکس کا سنگین مجسمہ بھیگنے کی وجہ سے چمکنے لگا تھا۔ اس وقت نوجوان پُر اسرار اور خوبصورت بالوں والی حسینہ اور میں دونوں ایک بڑے اور خالی اور غیر آراستہ مکان کی چھت کے نیچے اطمینان سے بیٹھے تھے۔

ہم خیال کرتے تھے کہ بارش تھوڑی دیر میں تھم جائیگی۔ لیکن مینہ لگاتار برستا گیا اس لئے اب کوئی اُمید نہ رہی تھی کہ تصویر کشی جاری رہیگی گرجے کے گھڑیال نے گھنٹہ بجایا۔ میں تصویر کے تختے کو دریچے کے پاس لے گیا۔ کہ ہم دونوں تصویر کو جانچیں۔ چنانچہ وہ تصویر دیکھ کر بہت خوش ہوئی اور میں بھی اپنی جگہ مطمئن تھا۔ لیکن تصویر کی تکمیل میں ابھی منزلیں باقی تھیں۔ اُس نے کہا "میں کل پھر آ سکوں گی" میں نے اُسے یاد دلایا کہ "تم تو کل انگلستان سے رخصت ہو رہی ہو" اُس نے کہا "ہاں لیکن دوپہر کے بعد میں خیال ہے کہ میں علی الصباح آ سکوں"۔ یوں ہم نے فیصلہ کر لیا کہ کل ایک آخری نشست اور ہو گی۔ اب بارش تھم چکی تھی۔ مگر شام کا اندھیرا چھا چلا تھا جب ہم نے دریچوں میں سے مڑ کر کمرے میں دیکھا کہ کمرے کے کونوں میں سائے اور تاریکیاں جمع ہو رہی ہیں تو اُس نے اپنا لبادہ اور دستانے پہن لئے اور اپنا جالی دار بٹوا اُٹھایا۔ اور چلنے لگی۔ اُس نے مجھے سواری نہ لانے دی اور کہا کہ میں خود ہی کوئی گاڑی رستہ میں لے لوں گی۔ میں سیڑھیوں کے نیچے تک اس کے ساتھ گیا۔ مکان کا پہلا درجہ طے کرنے کے بعد وہ رُک گئی اور میں رُک گیا۔ اُس نے کہا "مسٹر فیلڈ آپ نے مجھ سے بہت ہی اچھا سلوک کیا ہے اور میں نے آپ کا ذرا بھی شکریہ ادا نہیں کیا۔ آپ نے مجھ سے میرے متعلق کچھ بھی دریافت نہیں کیا۔ اس لئے یہ بالکل مناسب ہے کہ آپ کو میرا نام معلوم ہونا چاہیئے" یہ کہکر اُس نے اپنا بٹوا کھولا اور اس کے بعد زار و قطار رونے لگی۔ وہ جیسا تنہا حسین اتنی ہی حلیم المزاج اور اتنی متاثرانہ انداز میں افسردہ۔ اور ایسی فریفتہ کرنے والی اور پُر اسرار تھی کہ میں بیان نہیں کر سکتا۔ میں اس کے اتنا قریب تھا کہ بے اختیار میں نے اسے چوم لیا اور اس نے ایک ہلکی سی سسکی لی۔ اس کا منہ نم آلود اور ٹھنڈا تھا۔ میرے اس وقت کے جذبات الفاظ میں نہیں سما سکتے کاغذ کا ایک ٹکڑا اُس نے میرے ہاتھ میں دیدیا اور آہستہ سے کہا "لو نیچے۔ کل" اتنا کہا اور دوڑ کر سیڑھیوں سے نیچے اُتر گئی"۔ دروازے کے بند ہونے کی آواز میرے کانوں میں آئی۔

بوڑھے آدمی کی دلکش آواز رُک گئی اُس نے کتاب بند کی اور پھر وہیں رکھدی۔ جہاں سے اُٹھائی تھی۔ ابھی اس کی پیٹھ دیوار کی طرف تھی اُس نے گویا آپ میں آتے ہوئے عذر خواہی کے لہجہ میں کہا۔

اس وقت میری عمر تیس سال سے کم تھی۔

"اور پھر کیا ہوا" ڈیورا نے ہمہ تن سے پوچھا۔

"کچھ بھی نہیں"

"کچھ بھی نہیں"

"کچھ بھی نہیں۔ وہ پھر کبھی نہیں آئی۔ دوسرے دن کے ابتدائی لمحے میری زندگی کے پُرجوش و مسرت کے لمحے تھے لیکن اس کو نہ آنا تھا اور نہ آئی۔ اُس دن کی آخری گھڑیاں میرے لئے انتہا کی صبر آزما تھیں"

رافیل فیلڈ رُکتے ہوئے ہنسا۔

"لیکن تمہارے پاس تو اس کا پتہ تھا"

"مجھے وہ کاغذ بھی نہیں ملا۔ نہ اُس رات نہ اُس سے دوسرے دن

میں نے گھر کا کونا کونا چھان مارا۔ مجھے خیال تھا کہ میں نے وہ کاغذ جیب میں ڈال لیا تھا۔ اس لئے میں نے جیب کی سلائی تک اُدھیڑ ڈالی پھر بھی کاغذ کا پتہ نہ لگا۔ خدا جانے کہاں غائب ہو گیا۔"

"لیکن کیا تم نے اس کاغذ پر ایک نظر بھی نہیں ڈالی تھی؟"

"نہیں۔ اُس کے چلے جانے کے بعد میں بیٹھ کر اُس کے متعلق سوچنے لگ گیا۔ کیونکہ پہلے مجھے اس کے نام کے متعلق کوئی پریشانی پیدا نہ ہوئی تھی۔"

"اور کیا کبھی تمہیں یہ خیال بھی نہیں آیا کہ وہ کون تھی؟"

فیلڈ نے جواب دینے سے قبل توقف کیا۔

"تمہیں اولنسن کا واقعہ بھی یاد ہے؟"

"نہیں۔"

"تمہیں کیسے یاد ہوگا۔ یہ تم سے پہلے کا واقعہ ہے۔ اولنسن بھی ایک مصور تھا۔ اپنے وقت میں بڑا ہیبل آدمی تھا۔ میں نے اس کی تصویر بنائی تھی۔ اُس نے اپنے تصویر خانہ میں خودکشی کر لی تھی۔ یہ ۱۹۰۸ء کے موسم خزاں کا واقعہ ہے۔ وہ عجیب طبیعت کا آدمی تھا۔ عموماً عورتوں سے خلا ملا رکھتا یا فواہ تھی کہ وہ شدت سے آزار محبت میں مبتلا ہے۔ یوں تو صرف محبت بلکہ ہر چیز پر اس کی یہی حالت تھی۔ لیکن اس بارہ میں تو اس کا جوش و خروش بالکل غیر معمولی تھا۔ جس لڑکی سے اسے محبت تھی وہ اس کی طرف آنکھ اُٹھا کر بھی نہ دیکھتی تھی۔ میرے خیال میں جو لڑکی اس رات میرے پاس آئی تھی وہ وہی تھی جو اولنسن سے بے التفاتی برتتی تھی۔"

"اچھا" ڈورا نے کہا۔ "اور اس نے کہا تھا کہ تم نے اس کے کسی دوست کی تصویر بنائی ہے اور اب وہ چاہتی تھی کہ تمہیں سے اپنی تصویر بنوا کر اپنے اس دوست کی ماں کو دے۔ شاید اُس مصور کی ماں اُس لڑکی سے پیار کرتی ہو۔ کیونکہ اُس کے بیٹے نے اُس کے لئے خودکشی کر لی تھی۔ یہ اغلب ہے کہ لڑکے کی ماں اور اس کے تعلقات اچھے ہوگئے ہوں گے اُس نے مصیبت کے دنوں کو بھلا دیا ہوگا۔ کیونکہ اولنسن کی خودکشی نے نوجوان عورت کے جذبات کو بری طرح پامال کیا ہوگا اور شاید اولنسن کی خودکشی ہی کی وجہ سے وہ انگلستان سے جارہی تھی۔ لیکن کیا کہا جاسکتا ہے۔ یہ محض خیالات ہیں۔ میں نے اولنسن کی ماں سے ملاقات کرنے کی کوشش کی مگر وہ مرچکی تھی۔ میں نے سبھی جتن کئے۔ مجھے قریباً انیس لڑکیوں کا پتہ چلا جن کے متعلق فرض کیا جاتا تھا کہ اولنسن کو ان سے محبت تھی۔ لیکن وہ جسے میں ڈھونڈ رہا تھا ان میں سے ایک بھی نہ تھی۔ اور میں یہ بھی کہہ سکتا ہوں کہ ان میں سے کوئی بھی اُس کا سا حسن و جمال نہ رکھتی تھی۔"

اس کے بعد کمرے میں بالکل سکوت تھا۔

"لیکن وہ دوسرے دن کیوں نہ آئی؟" ڈورا نے ایسی آواز میں کہا گویا وہ اپنے آپ سے باتیں کر رہا ہے۔ خدا جانے وہ ڈر نہ گئی ہو۔ شاید ادائے فرض کے لئے اُسے کسی جگہ جانا ہوا۔ ممکن ہے وہ کسی گاڑی کے نیچے آگئی ہو۔ ہر روز ایسی وارداتیں ہوتی ہیں۔

"اگر وہ اس وقت زندہ ہے تو اس کی عمر ساٹھ سال سے متجاوز ہوگی۔ میں جانتا ہوں کہ اب اُس کا وہ لڑکپن کا سا حسن و جمال نہ ہوگا۔ وہ پوتے پوتیوں والی ہوگی۔ یہ چالیس برس پہلے کا واقعہ ہے۔ اسے زمانہ ہو گیا ہے۔"

پھر خاموشی طاری ہوگئی۔

"میرا خیال ہے تم نے شادی نہیں کی مسٹر فیلڈ؟"

ڈورا نے کسی قدر ہچکچاتے ہوئے کہا۔ اسے اپنی غلط رویوں کے لمحات یاد تھے۔

"نہیں۔"

"یہ اتنے عرصے کی بات ہے کہ میرے خیال میں تمہیں ایسا معلوم ہوتا ہوگا کہ یہ واقعہ بجائے تمہارے کسی اور کو پیش آیا ہوگا۔"

"جی نہیں ایسا نہیں" فیلڈ نے کسی قدر اختصار کے ساتھ کہا۔ "یہ واقعہ مجھے ہی پیش آیا تھا۔"

تھوڑی دیر کے بعد ڈورا جانے کے لئے اُٹھا۔

"ہم نیچے ساتھ ساتھ چلتے ہیں" فیلڈ نے سیڑھیوں کے لیمپ کا بٹن دباتے ہوئے کہا۔

ڈورا آہستہ آہستہ اس کے پیچھے پیچھے ہولیا۔ وہ سیڑھیوں کی دیواروں پر لٹکی ہوئی تصویروں کو دیکھتا جا رہا تھا۔ کیونکہ فیلڈ نے اسے ابھی وہ تصویر نہ دکھائی تھی۔

"یہ ہے وہ" فیلڈ نے پہلے طبقہ کی چھت پر آتے ہی رُک کر کہا۔

یہاں یہ غیر مکمل تصویر لٹک رہی تھی۔ ڈورا نے اس کو توجہ سے دیکھا شباب کا یہ شاہکار۔ یہ دلفریب مخلوق۔ موزوں لباس اور سائے میں ملبوس۔ آرزو انگیز۔ پراسرار مجسم دوشیزگی۔ مسرت بخش اور نمناک ہونٹ۔ اگر یہ تصویر نمائش میں پیش کی جاتی تو اس کی قیمت کم از کم دو ہزار پونڈ ہوتی۔

"میں نے اسے یہاں لٹکا دیا ہے" فیلڈ نے کہا۔ کیونکہ یہی وہ جگہ تھی بس یہی وہ جگہ تھی۔ جہاں وہ رُک گئی تھی۔ اور اُس نے مجھے کہا تھا کہ میں نے اس سے بہت اچھا سلوک کیا ہے۔ اُس وقت سیڑھیوں پر کوئی قالین یا فرش نہ تھا مکان کے باہر کی طرف ڈورا یونانی طرز تعمیر کے مشہور گرجا کے سایہ کو خاموشی سے کھڑا دیکھ رہا تھا۔ آسمان سے باتیں کر رہا تھا۔ اُس نے سُنا کہ ایفل فیلڈ اندر سے چٹخنیاں بند کر رہا ہے اسے خیال آیا کہ کل رات کو پھر یہ پیر زالی اپنے قابل تعظیم تبسم کے ساتھ جس میں بچپن اور بڑھاپے کی ادائیں ملی جلی ہوں گی پھر اپنی تباہ کن

تنہائی میں اسی کلب میں بیٹھا کھانا کھا رہا ہوگا۔ کیا زندگی ہے۔ کیا مستقبل کی حالت میں ہے۔ کیا کل رات یہ عمر رسیدہ مصور اس مسکراہٹ کے ساتھ جس میں بچوں اور بوڑھوں دونوں کی ادائیں ملی ہوئی ہیں کلب میں تنہا کھانا کھا رہا ہوگا۔ آہ کیا زندگی ہے اور کیا ایام ہیں! کس قدر حسرتناک یاد ہے ایام رفتہ کی! اُس نے کیسے کیسے شاہکار بنائے۔ اور ابھی زندہ ہے۔ ڈیوراچپ چاپ خیالات کے سمندر میں غرق اپنے آراستہ پیراستہ گھر کی طرف جا رہا تھا۔ اس کے دل میں خیال تھا ہر چند دنیا میں اس کے پاس بہت کچھ ہے۔ لیکن وہ ہر چیز حاصل نہیں کر سکا۔ یہ دیکھ کر اس کی طبیعت کا ہیجان اور بھی زیادہ ہو رہا تھا کہ وہ ملیر فیلڈ سے حسد کرتا ہے۔

(مہر محمد خاں شہاب مالیر کوٹلوی)

افکار

تیرے کوچے کی لطافت کا ثناخواں ہوں میں
باغِ فردوس کا اک مرغِ خوش الحاں ہوں میں

بے حجابانہ جھلک تو نے دکھائی جب سے
آتشِ عشق اک شعلۂ عُریاں ہُوں میں

چھیڑتی ہے مجھے قدرت کی فضا رہ رہ کر
کیا کوئی زمزمہ مُرغِ خوش الحاں ہوں میں

لن ترانی مرے شعلوں کی زباں پر ہے مدام
کس کے اسرارِ تجلّی کا زباں داں ہوں میں

چاک سے میرے نکلتے ہیں ہزاروں خورشید
صبحِ رخشندۂ فطرت کا گریباں ہوں میں

ہے مصیبت مری آرائشِ دنیا کا سبب
چہرۂ دہر پہ اک زلفِ پریشاں ہوں میں

رقص کرنا تری موجوں نے ہے سیکھا جس سے
اے امنگوں کے سمندر وہی طوفاں ہوں میں

ڈھونڈتی حُسن کے سورج کی کرن ہے جسکو
شبنمِ عشق کا وہ قطرۂ غلطاں ہوں میں

مَیں ابھی اپنی حقیقت سے ہوں غافل ورنہ
جو ہے مسجودِ فرشتوں کا وہ انساں ہوں میں

کہہ دو تاروں سے کہ آنکھیں نہ ملائیں مجھ سے
وادیٔ عشق کا اک ذرّۂ تاباں ہوں میں

مجھ کو افسردہ نہ دیکھینگے کبھی اہلِ جہاں
بزمِ تصویر کا گلدستۂ خنداں ہوں میں

(وحید الدین سلیم مرحوم)

نظم پنجابی

(۲)

(گذشتہ سے پیوستہ)

ازروئے مضمون نظم پنجابی کی تقسیم ذیل کے نقشہ سے نہایت عمدگی سے واضح ہوگی۔ یوں تو یہ خصوصیات کہ مقررہ موضوعات پر ہر نسل کچھ لکھے۔ ہر ادب میں موجود ہے۔ مگر پنجابی میں یہ حد بعید تک پہنچ چکی ہے۔ متفرق مضامین پر فکر سخن کرنا گذشتہ دس پندرہ برس سے اُدھر کی چیز نہیں۔ اب تک یہ حالت ہے کہ انہیں مقررہ موضوعات میں سے کسی ایک پر خامہ فرسائی کی جاتی ہے۔ اور کمال کے جوہر دکھائے جاتے ہیں۔ ظاہر ہے کہ یہ قید بہت سے عیوب و نقائص کا موجب ہے لیکن یہ بھی ہے کہ اس سے ایک تو ماضی کے افسانوں اور تہذیب اسلاف کی یاد تازہ رہتی ہے اور دوسرے شخصی کمالاتِ سخن کے مقابلہ و موازنہ کا بہت اچھا موقع شاعر اور سُننے والے دونوں کو مل جاتا ہے۔

بلحاظ مضمون نظم پنجابی

(۱) مذہبی

اسلامی (ل) انواع محمدی۔ اسوہ حسنہ۔ فقہ۔ شریعت تصوف۔ مراثی۔ جنگ اسلام۔ تفسیر و حدیث۔

غیر اسلامی (ب) گیتا۔ راماین۔ مہا بھارت وسری کرشن۔ سکھ شہدا۔ سکھ گورو صاحبان۔ بھگتی۔ راج یوگ۔

(۲) غیر مذہبی

راجہ رسالو۔ بھرتری۔ پورن بھگت۔ گوپی چند۔ شیریں فرہاد۔ سلطان محمود۔ لیلیٰ مجنوں۔ حاتم طائی۔ یوسف زلیخا۔ شاہ بہرام۔ روپ بسنت حقیقت رائے۔ کامروپ۔ گلبدن۔ بیتال پچیسی۔ چندر بدن۔ بکرماجیت سنگھاسن بتیسی۔ مرزا صاحباں سوہنی مہینوال سسی پنوں۔ ہیر رانجھا طب

بلحاظ عروض نظم پنجابی

جھوک۔ ٹپے۔ دوہرے۔ کافیاں۔ پینتیس اکھری۔ بارہ ماہ۔ سی حرفی۔

بلحاظ عروض نظم پنجابی کی مزید وضاحت یہ ہے کہ جس طرح ہر ایک مدعی سخن جب تک کہ وہ مقررہ موضوعات سے دو چار پر زور آزمائی نہ کرے دم نہیں لیتا۔ اسی طرح جب تک وہ نصف درجن بارہ ماہے اور سی حرفیاں وغیرہ اور کچھ دوہرے یا کافیاں یا دگار نہ چھوڑے اس پر آرام حرام ہوتا ہے۔ ان میں کا ہر صنف مضمون وہی ہوتا ہے۔ یعنی عشق یا تصوف۔ مگر ہر ایک شاعر اپنی طرز خاص میں مضمون کو ان مقررہ قالبوں میں ڈھال کر دکھاتا ہے۔

انتخاب کلام

انتخاب کلام شعرائے ہندی تک محدود رکھنا چاہتا ہوں کہ بیانِ عشق و معرفت میں اُن ہی کو ید طولےٰ حاصل ہے۔ رہا خود انتخاب یعنی نظر انتخاب کا معاملہ۔ سو بہت ممکن ہے کہ لیلیٰ فرہاد کی معشوق نہ بن سکتی اور ہیر کو دل دینے پر مجنوں ہرگز آمادہ نہ ہوتا۔ جو زید کے لئے حلوا ہے وہ بکر کے لئے سم سے کم نہیں اور جسے احمد دلفریب سمجھتا ہے محمود اُسے دیکھ کر ناک بھوں چڑھاتا ہے۔ انتخاب کلام اس قدر آسان کام نہیں۔ شخصی اور ذاتی سوال کو جانے دیجئے۔ تین طرح کا فرق تو انتخاب شعر لازمی طور پر ہوتا ہے۔ اول انتخاب بلحاظ حسن معنی۔ دوم بلحاظ حسن بندش و لطفِ بیان۔ سوم بلحاظ کمال عروض میرے لئے از حد مشکل ہے کہ میں ایسا کلام پیش کروں جو تینوں مطالبات کو پورا کرتا ہو۔ پس جس رنگ و روش کے پسند خاطر ہونے کی وجہ سے کسی شعر کا انتخاب کیا ہے اُس کو ساتھ ہی درج کر دیا ہے تاکہ لفظ "بہترین" باعث اختلاف نہ ہو۔

ہیر رانجھا

اگر کسی ہیر کے قصہ میں شاعر اپنے مشاہدات کی بنا پر خاک پنجاب اور اہل پنجاب سے متعلق تصاویر بہم نہیں پہنچاتا تو اُسے کامیابی سے کالے کوسوں دور سمجھنا روا ہے۔ دیکھئے پنجابی جٹی (جاٹ عورت) کی روزانہ مصروفیتوں کی۔ اُس کی صحت کی۔ اُس کی بے خوفی۔ ہمت۔ طاقت اور شوہر کی ہمدوشی کی کیا دلکش تصویر ہیر کاہن سنگھ میں ملتی ہے۔ ان بزرگ کو مرے ہوئے کچھ زیادہ مدت نہیں گذری۔ ضلع منٹگمری کے رہنے والے تھے۔ آپ کی زبان میں ایک گورو گرنتھ خوان سکھ ہونے کی حیثیت کے وسطی پنجابی کا بھی خاصہ عنصر موجود ہے۔

"سہتی" جوگی کو دھمکاتی ہے۔ دیکھو جی زبان کو لگام دو۔

لکھا ہے[۵۳] - ہم جاٹ عورتوں کو "شرم کرنے (لجانے) نہیں بنتی ہم خود ہی باہر جاکر گائیں بھینسیں چرالاتی ہیں اور اُن کا دودھ دوہ لیتی ہیں مشکل پڑے تو کمر کس کر خود ہی مرد بن جاتی ہیں۔ رہٹ کے بیل کو ہانک لیتی ہیں۔ بیلوں کو جوت لیتی ہیں۔ گدھوں پر کلر ڈھو کر لے جاتی ہیں۔ چرخہ کات کر تانا تیار کر لیتی ہیں۔ یہاں تک کہ ارنے بھینسے کو نیچے گرا کر اُس کی ناک میں نکیل ڈال لیتی ہیں۔ ہل چلا لیتی ہیں۔ بیج بو لیتی ہیں۔ اگر خدا نخواستہ ہمارے مردوں پر کچھ مصیبت آپڑے اور وہ کام نہ کر سکیں تو ہم خود ہی فصل کاٹ کر جمع کر لیتی ہیں اور ہم حبیبوں کے غرور کو توڑ کر حکمت عملی سے دلوں کو قابو میں کر لیتی ہیں"

فراق[۵۴] ہیر (بارہ ماسہ) بیساکھ کا مہینا آیا۔ شاخیں پھوٹ نکلی ہیں۔ جنبہ۔ چنبیلی۔ ازبیل کھیل اُٹھی۔ سہیلیاں سنگار کر رہی ہیں۔ عطر پھلیل لگا لگا کر بال گوندھ رہی ہیں۔ مگر ہائے میں ہوں کہ اس حویلی میں تنہا بند ہوں کھیڑا مجھ کو جبر سے یہاں لے آیا ہے۔ سوائے اللہ کے کوئی بیلی نہیں۔ نہ کوئی سہیلی ہے نہ ہمراز۔

بھادوں کا مہینہ ہے۔ دل میں طرح طرح کے وہم و گمان اُٹھ رہے ہیں۔ آنکھوں سے آنسوؤں کی ندیاں بہ رہی ہیں۔ کبھی زمین پر لکیریں کھینچ کھینچ کر فال لیتی ہوں کبھی کوے کو آنگن سے اُڑا کر۔ کبھی پنڈت سے جاکر پوچھتی ہوں کہ وہ کب تک آئیں گے۔ ایسا کون ہے جو یہاں سے خود جاکر میرے ماہی (محبوب) کو میرے پاس لائے۔

ماگھ کے مہینے میں سردی نے تو مار ہی ڈالا۔ مگر اس کا چنداں خیال نہیں۔ رونا تو اس بات کا ہے کہ میں تمہاری لونڈی۔ تم سے دور۔ ہجر میں اشک بہا رہی ہوں۔ ساس نندیں طعنے دے دے کر سینہ جلا رہی ہیں کھانا پینا مجھ پر حرام ہے۔ ایسے میں نیند کس کو آسکتی ہے؟ کبھی سرہانے کی طرف بیٹھتی ہوں کبھی پائینتی کی طرف۔ کاش میرا دم نکل جاتا۔ اور میں اس فراق کے جینے سے رہائی پاتی۔

پوس کا مہینہ ہے۔ سردی بڑے زور کی پڑ رہی ہے۔ ٹھوڑی کو گھٹنوں میں رکھ کر بیٹھی بیٹھی رات کاٹ لیتی ہوں۔ آخر کہاں جاؤں، کس سے پوچھوں۔ بدن میں سکت باقی نہیں۔ ادھر فرطِ شوق کا یہ حال ہے کہ یہی جی چاہتا ہے کہ ہر وقت محبوب کے دیدار سے دل کی تپش بجھاؤں کاش کوئی انتظام ہو سکے اور میں اپنے دل کا حال لکھ کر اُس تک بھیج سکوں اور اُسے اچھی طرح سمجھا بجھا سکوں۔

---

[۵۳] دیکھو صفحات ۳۱۶ و ۳۱۸۔ ہیر کاہن سنگھ مطبوعہ مفید عام پریس لاہور ۱۹۰۰ء

[۵۴] صفحات ۲۰۳-۲۰۵-۲۰۶-۲۰۷

سعدیٔ پنجاب

اگرچہ اُستاذی مولانا حسرت موہانی سعدی کے تغزل کو حافظ اور جامی کے تغزل پر بھی ترجیح دیتے ہیں پھر بھی یہ ابتدائی تاثرات کے سبب جو طالب علمی کے زمانہ میں گلستاں اور بوستاں کے مطالعہ سے دل نے قبول کئے۔ سعدی کو ہم ایک بہترین مصلح اخلاق و صاحب پند و وعظ سمجھے چلے جاتے ہیں۔ پنجاب نے بھی سعدی سا معرفت افزا اور اخلاق آموز شاعر پیدا کیا ہے اور وہ کالیداس ساکن گوجرانوالہ ہے جس کے لئے عمرش دراز باد کی دعا ہر پنجابی کی زبان پر ہونی چاہئے۔ آپ کے کلام کے متعدد خصوصیات اس ایک تقریر سے بخوبی ظاہر ہو جائیں گی قصہ[۵۵] روپ بسنت میں چوکیدار بسنت کو نصیحت کرتا ہے۔

"بیٹا! جان بوجھ کر زہر کیوں کھایا جائے۔ رات کے وقت شیر کے نزدیک کیوں جایا جائے۔ جو لوگ مردم آزار ہیں اُن کو دیکھنا تک نہ چاہئے پہلے کسی پر حملہ مت کرو۔ زبردست سے دشمنی فضول ہے اور حاکم سے زور آزمائی کرنا خرابی کا باعث۔ خدا کی رضا پر صابر رہئے۔ دیدہ و دانستہ شیش محل اور مندر کو چھوڑ کر قبر میں اپنی سیج کوئی کیوں بچھائے۔ اپنی نیکی کو کبھی یاد نہ رکھئے اور دوسرے کی نیکی کو کبھی نہ بھلائے۔ وہ جو محبت کے مفہوم سے بے بہرہ ہیں اُن سے آشنائی کا رشتہ باندھنا بے سود ہے۔ اگر چار بھلے مانس کوئی مشورہ دیں تو اُسے ٹھکرانا نہ چاہئے۔ گرو اور پیر کی حکم عدولی نہایت نقصان دہ ہے۔ سچ کو دل سے کبھی دور نہ کیجئے۔ جب تک نین (آنکھیں) اور پیان (دم) باقی ہیں مزدوری یا کام کرتے رہنا چاہئے اور "حرام خوری" نہ کرنی چاہئے بخیل سے کچھ بھی نہ مانگئے اور سخی مرد سے مانگتے کبھی نہ شرمائیے۔ فقط دھرم کی کشتی اُس پار پہنچائیگی۔ اس لئے پاپ کی ناؤ پر کبھی پاؤں نہ رکھئے۔ عاجز پر کبھی ظلم نہ کیجئے۔ اور غریب کا خون کبھی نہ پیجئے۔ عورت کو کبھی کوئی راز نہ بتائیے اور بچے سے کبھی پیار نہ بڑھائیے۔ جو مل جل نہیں سکتا اُس سے میل کی کوشش نہ کرنی چاہئے اور جو آپ سے میل جول کرتا ہے اُس کی رفاقت کو ہاتھ سے نہ دیجئے۔ جب تک خود کسی کام کو نہ کر لیا جائے دوسرے سے اُس کی تکمیل کے لئے اصرار نہ کیجئے۔ جب تک پورا گورو (مرشد) کامل نہ ملے فقر کی راہ نہ اختیار کرنی چاہئے۔ اور جب تک صبر و شکر کے مالک نہ بن جائے کوئی درویشی کا لباس کیوں پہنے؟ دشمن سے

---

[۵۵] دیکھو صفحہ ۹۱۔ ۱۹۲۸ء ایڈیشن۔

ہمیشہ جان بچائیے اور دوست سے کبھی دغا نہ کیجئے۔ جو زندگی سے بیزار ہے اُس سے ہرگز خفا نہ ہوجئے۔ شاعر۔ عاشق اور فقیر تینوں لامذہب ہیں۔ ان کو بڑھ کر بڑھ کر شرع نہ سُنائیے۔ جب تک خود کو کھو نہ لیں گے آپ خود کو نہ پائیں گے نفس کے شیر کا شکار کرنے کے لئے اپنی جان کی قربانی کی ضرورت ہے

مسلمان اور ہندی

سائیں مولا بخش محبیٹھوی جن کے کلام کا انتخاب اب دیا جائیگا باوجودیکہ مضافات امرتسر کے ہیں۔ زبان و بیان ہندی کے بہترین شاعر ہیں حقیقت تو یہ ہے کہ مسلمان جب کبھی پنجاب سے باہر گئے۔ ہندی کے عروضی و لغاتی تاثرات کو لیتے گئے اور جس جگہ بھی پنجاب میں اب موجود ہیں ہندی کو لونڈی بنائے ہوئے ہیں۔ سائیں جی کا خزانہ ختم ہی نہیں ہو سکتا۔ اور اس میں ہر طرح کی شے جواہر سے لیکر سنگریزہ تک موجود ہے۔

۱۔ بیان گذشتن شب و طلوع آفتاب

فرنگیوں کے راج میں ساری رات گھڑیال بجتے رہتے ہیں صبح کاذب کا وقت آیا۔ چار بجے۔ کسانوں نے ہنڈیالیاں اٹھائیں اور کھیتوں کو چلے۔ عابد اور زاہد بھی ہوشیار ہوئے تہجد پڑھتے ہیں تسبیح پھیرتے ہیں اور وظیفے اور مشاہدہ میں محو ہیں۔ بہت سی عورتیں جاگ اُٹھی ہیں چکی پیسنے لگی ہیں۔ مرغوں نے اذان دینی شروع کر دی ہے۔ پرندے بولنے لگے اور مسافر سفر پر کربستہ ہوئے۔ دیوی دواروں اور شودواروں میں سنکھ بجے۔ مسجدوں میں اذان ہونے لگی۔ برہمن اور کھتری عورتیں اشنان کرنے کو باؤلی میں کرتے اور جھانا پہن کر روانہ ہوئیں سپاہیوں کے پہرے بدل گئے اور بہت سے لوگ کاروبار میں لگ گئے۔ رہٹوں میں "دھار دودھ بلونے والی نکوی ڈال دی گئی" سورج کی سرخی آشکار ہوئی" گوجریوں نے اُپلے تھاپنے شروع کئے۔ اور گوجروں نے اپنے بچوں کو کندھوں پر لئے دودھ دوہنا شروع کیا۔ سقّے پانی چھڑکنے لگے۔ خاکروب جھاڑو دینے لگے حکم سرکار سے داروغہ گشت کرنے والا بھی باہر نکلا۔ پھیری والے گھوم رہے ہیں۔ بلوچ اور کمہار جن کو بہت لمبا سفر کرنا ہوتا ہے چلدیئے۔ دوکانداروں نے دوکانیں کھولدیں اور نرخ کے بارے میں گفتار ہونے لگی۔ چڑیاں اور کوے بولنے لگے۔ پرندے اِدھر اُدھر اُڑکر جانے لگے۔ سورج نکل آیا دھوپ پھیل گئی۔ گوالوں نے اپنے ریوڑ گاؤں سے باہر نکالے۔ امیرزادے باغ کی سیر کو چلے اور ہواخوری کرنے لگے۔ درختوں اور گھاس پر شبنم یوں نظر آتی ہے گویا بے شمار موتی چمک رہے ہیں۔ پھول ایک سے ایک دلکش ایک سے ایک دلفریب دلوں کو لبھانے لگے۔ عاشق لوگ رات کے قول و قرار کے پابند کوچے میں کھڑے ہیں۔ مکھن اور دہی کھا کر اور ناشتہ کرکے لڑکیاں لڑکے سکول اور مسجد کو جانے لگے۔ ایسے وقت میں جس جس نے جوگی کی آمد کو سُن رکھا تھا وہ درشن کرنے کے لئے چلا۔ کیونکہ جوگیوں کے درشن سے خدا تعالےٰ گناہ کی سزا میں تخفیف کرتا ہے۔ بہت سے تحفے لیکر بیاہی اور کنواری لڑکیاں جوگی کو دیکھنے آئیں۔

ہیر کی ماں ہیر کو طعن و تشنیع کرتی اور سمجھاتی ہے کہ رانجھے کے عشق سے باز آ۔

چرخہ کاتنے کی طرف تیرا دھیان نہیں جاتا۔ گوڑھے اور پونیوں کے "جُبٹ" یوں ہی پڑے ہیں۔ نہ تو دودھ دوہتی ہے نہ گوبر پاتھتی ہے تجھے تو بس "چاک" (غلام) کا عشق مغلوب کئے ہے۔ تیری آنکھیں چلاہے کی طرح تانا تنتی رہتی ہیں۔ جب "ماہی" (رانجھا) باہر سے واڑے واڑنے" کتا بھینسوں کو چرا کر گھر لاتا ہے تو بے چین ہو جاتی ہے۔ مٹھی ناٹی سے تیرا "سیل پنا" (سہیلی پن) ہے یاد رکھ جو لڑکیاں ماں باپ کا کہا نہیں مانتیں وہ سسرال میں جاکر اپنے کئے پر پچھتاتی ہیں۔ نہ تو گھر میں بیٹھکر کاتتی ہے نہ "کھنڈار"[۱] میں۔ تجھے تو ہر دم بے کلی سی ہے۔ اگر تجھ سے کوئی شے گر جائے یا پھٹ جائے اور اس کی تجھ سے شکایت کی جائے تو تو اُلٹا کوسنا شروع کر دیتی ہے۔ یاد رکھ جو جانور مالک کے کام کے نہیں رہتے اُنہیں قصائی کی چھری کے تلے ہی جگہ ملتی ہے۔ اے بیٹی سمجھ جا پانی کے بغیر کمہار مٹی نہیں گوندھ سکتا۔ نہ رنجیت سنگھ کے سوا کوئی کابل پر حملہ آور ہو سکتا ہے۔ ہمارے بغیر اور کون تجھکو مت (عقل) دینے والا ہے؟ تجھے کل کو سسرال میں جاکر بہتیرا کام کرنا ہوگا۔ کالی اور بھوری بھینسیں دوہنی ہوں گی۔ تو اس بات کا دھیان نہیں کرتی؟ جو مجرم اور گنہگار بنیں گے اُن کو عدالت (دوزخ) میں ڈال دے گی۔ تو جو عشق کر رہی ہے اُس کی پاداش منصور کی طرح دار کے سوا اور کچھ نہیں۔ چوچک سردار کی بیٹی ہو کر تو کمینہ کام کرتی ہے؟ سب لوگ تجھے طعنے دیتے ہیں۔ ذرا ہوش میں آ۔ یہ کیا کرتوت ہیں؟

اے بچّی میں تو تیری برابری ہرگز نہیں کر سکتی۔ تجھے بول کے ساتھ سلام کرتی ہوں۔ تجھ جیسی ہی حوّا نے آدم کو بہشت سے نکلوایا اور الف لام کو ٹیڑھا کیا۔ تجھ جیسی ہی نے اسم اعظم کھو کے ہاروت ماروت دونوں کو الٹا لٹکا دیا۔ تجھ جیسی ہی نے امیر حمزہ کے ساتھ مل کر قتل عام کیا۔ تجھ جیسی ہی نے ابراہیم کو آگ پر بٹھلایا۔ تجھ جیسی نے کوروا اور پانڈو لڑوائے اور راون کو مروایا۔

---

[۱] وہ جگہ جہاں لڑکیاں مل کر رات کو چرخہ کاتتی ہیں۔

اور راجا رام اور محسن کو خوار کیا۔ تجھ ایسی ہی نے اندر کو بد دعا دلوائی۔ تجھ ایسی ہی راجہ بھوج پر سوار ہوئی۔ رسالو اور سرکپ سے مصیبت اٹھوائی۔ شیر افگن کو قتل کروایا۔ تو تو سچ مچ فرنگی کی برق ہے۔ غلام سے عشق لگا کر تو نے سب حلال کام حرام کر دئے۔ تجھ ایسی ہی بادشاہوں کو فقیر اور فقیروں کو شاہ کر دیتی ہیں۔ دین و ایمان دولت و آرام کو چھین لیتی ہیں۔ اب بھی وقت ہے چاک کی محبت سے توبہ کرو ورنہ کھیڑے تیری ناک کاٹ دیں گے۔

موہن سنگھ دیوانہ

دوست کی قبر

یہی مقام تھا ابتک ہے خوب یاد مجھے — یہی اُداس فضا تھی ہر ایک مرقد کی
کہا تھا تو نے یہاں چند قبریں دکھلا کر — نشانیاں ہیں یہ باقی مرے اب و جد کی

یہ ڈھیر خاک کا جس پر اُگی ہوئی ہے گھاس — مَیں جانتا ہُوں مرے باپ کا مزار ہے یہ
شکستہ سی ہے جو یہ قبر اُس کے پہلو میں — یہ امّی ہاں مری امّی کی یادگار ہے یہ"

یکایک آیا یتیمی کا پھر خیال تجھے — غم دروں سے ترا رنگ زرد ہونے لگا
نہ پوچھ کیفیّت اُس دردناک منظر کی — کہ دیکھ کر تری صورت کو میں بھی رونے لگا

اُسی جگہ پہ کھڑا ہوں مَیں آج بھی لیکن — اُداس ہوں کہ تو اِس وقت میرے پاس نہیں
بتائے کون کہ یہ تازہ قبر کس کی ہے — یہ قبر جس پہ کہیں نام کو بھی گھاس نہیں

فاخر ہریانوی بی-اے

نظم پنجابی

(۲)

(گذشتہ سے پیوستہ)

از روئے مضمون نظم پنجابی کی تقسیم ذیل کے نقشہ سے نہایت عمدگی سے واضح ہوگی۔ یوں تو یہ خصوصیات کہ مقررہ موضوعات پر ہر نسل کچھ لکھے۔ ہر ادب میں موجود ہے۔ مگر پنجابی میں یہ حد بعید تک پہنچ چکی ہے۔ متفرق مضامین پر فکر سخن کرنا گذشتہ دس پندرہ برس سے اُدھر کی چیز نہیں۔ اب تک یہ حالت ہے کہ انہیں مقررہ موضوعات میں سے کسی ایک پر خامہ فرسائی کی جاتی ہے۔ اور کمال کے جوہر دکھائے جاتے ہیں۔ ظاہر ہے کہ یہ قید بہت سے عیوب و نقائص کا موجب ہے لیکن یہ بھی ہے کہ اس سے ایک تو ماضی کے افسانوں اور تہذیب اسلاف کی یاد تازہ رہتی ہے اور دوسرے تشخصی کمالات سخن کے مقابلہ و موازنہ کا بہت اچھا موقع شاعر اور سُننے والے دونوں کو مل جاتا ہے۔

بلحاظ مضمون نظم پنجابی

(۱) مذہبی

اسلامی (ل) انواع محمدی۔ اسوہ حسنہ۔ فقہ۔ شریعت تصوف۔ مراثی۔ جنگ ہائے اسلام۔ تفسیر و حدیث۔

غیر اسلامی (ب) گیتا۔ راماین۔ مہا بھارت و سری کرشن۔ سکھ شہدا۔ سکھ گورو صاحبان۔ بھگتی۔ راج یوگ۔

(۲) غیر مذہبی

راجہ رسالو۔ بھرتری۔ پورن بھگت۔ گوپی چند۔ شیریں فرہاد۔ سلطان محمود۔ لیلیٰ مجنوں۔ حاتم طائی۔ یوسف زُلیخا۔ شاہ بہرام۔ روپ بسنت حقیقت رائے۔ کامروپ۔ گلبدن۔ بیتال بچیسی۔ چندر بدن۔ بکرماجیت سنگھاسن بتیسی۔ مرزا صاحبان سوہنی مہینوال۔ سسی پنوں۔ ہیر رانجھا طب

بلحاظ عروض نظم پنجابی

جھوک۔ ٹپے۔ دوہرے۔ کافیاں۔ بینتیں اکھری۔ بارہ ماہ۔ سی حرفی۔

بلحاظ عروض نظم پنجابی کی مزید وضاحت یہ ہے کہ جس طرح ہر ایک مدعی سخن جب تک کہ وہ مقررہ موضوعات سے دو چار پر زور آزمائی نہ کرے دم نہیں لیتا۔ اسی طرح جب تک وہ نصف درجن بارہ ماہہ اور سی حرفیاں وغیرہ اور کچھ دوہرے یا کافیاں یادگار نہ چھوڑے اس پر آرام حرام ہوتا ہے۔ ان میں کا ہر صنف مضمون وہی ہوتا ہے۔ یعنی عشق یا تصوف۔ مگر ہر ایک شاعر اپنی طرز خاص میں مضمون کو ان مقررہ قالبوں میں ڈھال کر دکھاتا ہے۔

انتخاب کلام

انتخاب کلام شعرائے ہندی تک محدود رکھنا چاہتا ہوں کہ بیانِ عشق و معرفت میں اُن ہی کو ید طولے حاصل ہے۔ رہا خود انتخاب یعنی نظر انتخاب کا معاملہ۔ سو بہت ممکن ہے کہ لیلیٰ فرہاد کی معشوق نہ بن سکتی اور ہیر کو دل دینے پر مجنوں ہرگز آمادہ نہ ہوتا۔ جو زید کے لئے حلوا ہے وہ بکر کے لئے سم سے کم نہیں اور جسے احمد دلفریب سمجھتا ہے محمود اُسے دیکھ کر ناک بھوں چڑھاتا ہے۔ انتخاب کلام اس قدر آسان کام نہیں۔ تشخصی اور ذاتی سوال کو جانے دیجئے۔ تین طرح کا فرق تو انتخاب شعر لازمی طور پر ہوتا ہے۔ اول انتخاب بلحاظ حسن معنی۔ دوم بلحاظ حسن بندش و لطفِ بیان۔ سوم بلحاظ کمال عروض میرے لئے ازحد مشکل ہے کہ میں ایسا کلام پیش کردوں جو تینوں مطالبات کو پورا کرتا ہو۔ پس جس رنگ و روش کے پسند خاطر ہونے کی وجہ سے کسی شعر کا انتخاب کیا ہے اُس کو ساتھ ہی درج کردیا ہے تاکہ لفظ "بہترین" باعث اختلاف نہ ہو۔

ہیر رانجھا

اگر کسی ہیر کے قصہ میں شاعر اپنے مشاہدات کی بنا پر خاک پنجاب اور اہل پنجاب سے متعلق تصاویر بہم نہیں پہنچاتا تو اُسے کامیابی سے کالے کوسوں دور سمجھنا روا ہے۔ دیکھئے پنجابی جٹی (جاٹ عورت) کی روزانہ مصروفیتوں کی۔ اُس کی صحت کی۔ اُس کی بے خوفی۔ ہمت۔ طاقت اور شوہر کی ہمدوشی کی کیا دلکش تصویر ہیر کاہن سنگھ میں ملتی ہے۔ ان بزرگ کو مرے ہوئے کچھ زیادہ مدت نہیں گذری۔ ضلع منٹگمری کے رہنے والے تھے۔ آپ کی زبان میں ایک گورو گرنتھ خوان سکھ ہونے کی حیثیت کے دسلی پنجابی کا نجا خاصہ عنصر موجود ہے۔

"سہتی" جوگی کو دھمکاتی ہے۔ دیکھو جی زبان کو لگام دو۔

لکھا؎ ہے۔ ہم جاٹ عورتوں کو "شرم کرتے (لجاتے) نہیں بنتی ہم خود ہی باہر جاکر گائیں بھینسیں چرالاتی ہیں اور اُن کا دودھ دوہ لیتی ہیں مشکل پڑے تو کمر کس کر خود ہی مرد بن جاتی ہیں۔ رہٹ کے بیل کو ہانک لیتی ہیں۔ بیلوں کو جوت لیتی ہیں۔ گدھوں پر کلر ڈھو کر لے جاتی ہیں۔ چرخہ کات کر تانا تیار کر لیتی ہیں۔ یہاں تک کہ ارنے بھینسے کو نیچے گرا کر اُس کی ناک میں نکیل ڈال لیتی ہیں۔ ہل چلا لیتی ہیں۔ بیج بو لیتی ہیں۔ اگر خدانخواستہ ہمارے مردوں پر کچھ مصیبت آپڑے اور وہ کام نہ کرسکیں تو ہم خود ہی فصل کاٹ کر جمع کر لیتی ہیں اور ہم حبیبوں کے غرور کو توڑ کر حکمت عملی سے دلوں کو قابو میں کر لیتی ہیں۔

فراق؎ ہیر (بارہ ماسہ) بیساکھ کا مہینا آیا۔ شاخیں پھوٹ نکلی ہیں۔ جنبہ۔ جنبیلی۔ اربل کھیل اُٹھی۔ سہیلیاں سنگار کر رہی ہیں۔ عطر پھلیل لگا لگا کر بال گوندھ رہی ہیں۔ مگر ہائے میں ہوں کہ اس حویلی میں تنہا بند ہوں کھیڑا مجھ کو جبر سے یہاں لے آیا ہے۔ سوائے اللہ کے کوئی بیلی نہیں۔ نہ کوئی سہیلی ہے نہ ہمراز۔

بھادوں کا مہینہ ہے۔ دل میں طرح طرح کے وہم و گمان اُٹھ رہے ہیں۔ آنکھوں سے آنسوؤں کی ندیاں بہ رہی ہیں۔ کبھی زمین پر لکیریں کھینچ کھینچ کر فال لیتی ہوں کبھی کوے کو آنگن سے اُڑا کر کبھی پنڈت سے جاکر پوچھتی ہوں کہ وہ کب تک آئیں گے۔ ایسا کون ہے جو یہاں سے خود جاکر میرے ماہی (محبوب) کو میرے پاس لائے۔

ماگھ کے مہینے میں سردی نے تو مار ہی ڈالا۔ مگر اس کا چنداں خیال نہیں۔ رونا تو اس بات کا ہے کہ میں تمہاری لونڈی تم سے دور۔ ہجر میں اشک بہا رہی ہوں۔ ساس نندیں طعنے دے دے کر سینہ جلا رہی ہیں کھانا پینا مجھ پر حرام ہے۔ ایسے میں نیند کس کو آسکتی ہے؟ کبھی سرہانے کی طرف بیٹھتی ہوں کبھی پائینتی کی طرف۔ کاش میرا دم نکل جاتا۔ اور میں اس فراق کے جینے سے رہائی پاتی۔

پوس کا مہینہ ہے۔ سردی بڑے زور کی پڑ رہی ہے۔ ٹھوڑی کو گھٹنوں میں رکھ کر بیٹھی بیٹھی رات کاٹ لیتی ہوں۔ آخر کہاں جاؤں، کس سے پوچھوں۔ بدن میں سکت باقی نہیں۔ ادھر فرطِ شوق کا یہ حال ہے کہ یہی جی چاہتا ہے کہ ہر وقت محبوب کے دیدار سے دل کی تپش بجھاؤں کاش کوئی انتظام ہوسکے اور میں اپنے دل کا حال لکھ کر اُس تک بھیج سکوں اور اُسے اچھی طرح سمجھا بجھا سکوں۔

سعدیٔ پنجاب

اگرچہ اُستاذی مولانا حسرت موہانی سعدی کے تغزل کو حافظ اور جامی کے تغزل پر بھی ترجیح دیتے ہیں پھر بھی یہ ابتدائی تاثرات کے سبب جو طالب علمی کے زمانہ میں گلستاں اور بوستاں کے مطالعہ سے دل نے قبول کئے۔ سعدی کو ہم ایک بہترین مصلح اخلاق و صاحب پند و عظا سمجھے چلے جاتے ہیں۔ پنجاب نے بھی سعدی سا معرفت افروز اور اخلاق آموز شاعر پیدا کیا ہے اور وہ کالیداس ساکن گجرانوالہ ہے جس کے لئے عمرش دراز باد کی دعا ہر پنجابی کی زبان پر ہونی چاہئے۔ آپ کے کلام کے سعدی خصوصیات اس ایک تقریر سے بخوبی ظاہر ہو جائیں گی فقرے؎ روپ بسنت میں چوکیدار بسنت کو نصیحت کرتا ہے۔

"بیٹا! جان بوجھ کر زہر کیوں کھایا جائے۔ رات کے وقت شیر کے نزدیک کیوں جایا جائے۔ جو لوگ مردم آزار ہیں اُن کو دیکھنا تک نہ چاہئے پہلے کسی پر حملہ مت کرو۔ زبردست سے دشمنی فضول ہے اور حاکم سے زور آزمائی کرنا خرابی کا باعث۔ خدا کی رضا پر صابر رہئے۔ دیدہ و دانستہ شیش محل اور مندر کو چھوڑ کر قبر میں اپنی سیج کوئی کیوں بچھائے۔ اپنی نیکی کو کبھی یاد نہ رکھئے اور دوسرے کی نیکی کو کبھی نہ بھلائیے۔ وہ جو محبت کے مفہوم سے بے بہرہ ہیں اُن سے آشنائی کا رشتہ باندھنا بے سود ہے۔ اگر چار بھلے مانس کوئی مشورہ دیں تو اُسے ٹھکرانا نہ چاہئے۔ گرو اور پیر کی حکم عدولی نہایت نقصان دہ ہے۔ سچ کو دل سے کبھی دور نہ کیجئے۔ جب تک نین (آنکھیں) اور پران (دم) باقی ہیں مزدوری یا کام کرتے رہنا چاہئے اور "حرام خوری" نہ کرنی چاہئے بخیل سے کچھ بھی نہ مانگئے اور سخی مرد سے مانگتے کبھی نہ شرمائیے۔ فقط دھرم کی کشتی اُس پار پہنچائیگی۔ اس لئے پاپ کی ناؤ پر کبھی پاؤں نہ رکھئے۔ عاجز پر کبھی ظلم نہ کیجئے۔ اور غریب کا خون کبھی نہ پیجئے۔ عورت کو کبھی کوئی راز نہ بتائیے اور بچے سے کبھی پیار نہ بڑھائیے۔ جو مل جل نہیں سکتا اُس سے میل کی کوشش نہ کرنی چاہئے اور جو آپ سے میل جول کرتا ہے اُس کی رفاقت کو ہاتھ سے نہ دیجئے۔ جب تک خود کسی کام کو نہ کر لیا جائے دوسرے سے اُس کی تکمیل کے لئے اصرار نہ کیجئے۔ جب تک پورا گورو (مرشد) کامل نہ ملے فقر کی راہ نہ اختیار کرنی چاہئے۔ اور جب تک صبر و شکر کے مالک نہ بنجائے کوئی درویشی کا لباس کیوں پہنے؟ دشمن سے

؎ دیکھو صفحات ۳۱۶، ۳۱۸۔ ہیر کاہن سنگھ مطبوعہ مفید عام پریس لاہور ۱۹۰۰ء

؎ صفحات ۲۰۴-۲۰۵-۲۰۶-۲۰۷

؎ دیکھو صفحہ ۹۱ - ۱۹۲۸ء ایڈیشن۔

ہمیشہ جان بچائیے اور دوست سے کبھی دغا نہ کیجئے۔ جو زندگی سے بیزار ہے اُس سے ہرگز خفا نہ ہوجیئے۔ شاعر۔ عاشق اور فقیر تینوں لامذہب ہیں۔ ان کو پڑھ کر پڑھ کر شرع نہ سُنائیے۔ جب تک خود کو کھو نہ لیں گے آپ خود کو نہ پائیں گے۔ نفس کے شیر کا شکار کرنے کے لئے اپنی جان کی قربانی کی ضرورت ہے

مسلمان اور ہندی

سائیں مولا بخش محبیٹھوی جن کے کلام کا انتخاب اب دیا جائیگا باوجودیکہ مضافات امرتسر کے ہیں۔ زبان و بیان ہندی کے بہترین شاعر ہیں حقیقت تو یہ ہے کہ مسلمان جب کہیں پنجاب سے باہر گئے۔ ہندی کے عروضی و لغاتی تاثرات کو لیتے گئے اور جس جگہ بھی پنجاب میں اب موجود ہیں ہندی کو لونڈی بنائے ہوئے ہیں۔ سائیں جی کا خزانہ ختم ہی نہیں ہوسکتا۔ اور اس میں ہر طرح کی شے جواہر سے لیکر سنگریزہ تک موجود ہے۔

۱۔ بیان گذشتن شب و طلوع آفتاب

فرنگیوں کے راج میں ساری رات گھڑیال بجتے رہتے ہیں۔ صبح کاذب کا وقت آیا۔ چار بجے۔ کسانوں نے ہنڈالیاں اُٹھائیں اور کھیتوں کو چلے۔ عابد اور زاہد بھی ہوشیار ہوئے تہجد پڑھتے میں تسبیح پھیرتے ہیں اور وظیفے اور مشاہدہ میں محو ہیں۔ بہت سی عورتیں جاگ اُٹھی ہیں۔ چکی پیسنے لگی ہیں۔ مرغوں نے اذان دینی شروع کر دی ہے۔ پرندے بولنے لگے اور مسافر سفر پر کمربستہ ہوئے۔ دیوی دواروں اور شو دواروں میں سنکھ بجے۔ مسجدوں میں اذان ہونے لگی۔ برہمن اور کھتری عورتیں اشنان کرنے کو باؤلی میں گئیں۔ اور جھانجھن کر روانہ ہوئیں۔ سپاہیوں کے پہرے بدل گئے اور بہت سے لوگ کاروبار میں لگ گئے۔ رڑکنیوں میں دودھ دودھ بلونے والی لکڑی ڈال دی گئی۔ "سورج کی سُرخی آشکار ہوئی" گوجریوں نے اُپلے تھاپنے شروع کئے۔ اور گوجروں نے اپنے بچّوں کو کندھوں پر لئے دودھ دوہنا شروع کیا۔ سقّے پانی چھڑکنے لگے۔ خاکروب جھاڑ دینے لگے حکم سرکار سے داروغہ گشت کرنے والا بھی باہر نکلا۔ پھیری والے گھوم رہے ہیں۔ بلوچ اور کمہار جن کو بہت لمبا سفر کرنا ہوتا ہے چل دیئے۔ دکانداروں نے دوکانیں کھولدیں اور نرخ کے بارے میں گفتار ہونے لگی۔ چڑیاں اور کوے بولنے لگے۔ پرندے اِدھر اُدھر اُڑکر جانے لگے۔ سورج نکل آیا دھوپ پھیل گئی۔ گوالوں نے اپنے ریوڑ گاؤں سے باہر نکالے۔ امیر سردار باغ کی سیر کو چلے اور ہواخوری کرنے لگے۔ درختوں اور گھاس پر شبنم یوں نظر آتی ہے گویا بے شمار موتی چمک رہے ہیں۔ پھول ایک سے ایک دلکش ایک سے ایک دلعزیز دلوں کو لبھانے لگے۔ عاشق لوگ رات کے

قول و قرار کے پابند کوچے میں کھڑے ہیں۔ مکھن اور دہی کھا کر اور ناشتہ کرکے لڑکیاں لڑکے سکول اور مسجد کو جانے لگے۔ ایسے وقت میں جس جس نے جوگی کی آمد کو سُن رکھا تھا وہ درشن کرنے کے لئے چلا۔ کیونکہ جوگیوں کے درشن سے خدا تعالے گناہ کی سزا میں تخفیف کرتا ہے۔ بہت سے تحفے لیکر بیاہی اور کنواری لڑکیاں جوگی کو دیکھنے آئیں۔

ہیر کی ماں ہیر کو طعن و تشنیع کرتی اور سمجھاتی ہے کہ رانجھے کے عشق سے باز آ۔

چرخہ کاتنے کی طرف تیرا دھیان نہیں جاتا۔ گوڑھے اور پُونیوں کے "جُبٹ" یوں ہی پڑے ہیں۔ نہ تو دودھ دوہتی ہے نہ گوبر پاتھتی ہے تجھے تو بس "چاک" (غلام) کا عشق مغلوب کئے ہے۔ تیری آنکھیں جلاہے کی طرح تانا تنی رہتی ہیں۔ جب "ماہی" (رانجھا) باہر سے "واڑے واڑنے" کتا بھینسوں کو چرا کر گھر لاتا ہے تو بے چین ہوجاتی ہے۔ مٹھی نائن سے تیرا "سہیل پیا" (سہیلی پن) ہے یاد رکھ جو لڑکیاں ماں باپ کا کہا نہیں مانتیں وہ سُسرال میں جاکر اپنے کئے پر پچھتاتی ہیں۔ نہ تو گھر میں بیٹھکر کاتتی ہے نہ "تھنڈار"[1] میں۔ تجھے تو ہر دم بے کلی سی ہے۔ اگر تجھ سے کوئی شے گر جائے یا پھٹ جائے اور اس کی تجھ سے شکایت کی جائے تو تو اُلٹا کوسنا شروع کر دیتی ہے۔ یاد رکھ جو جانور مالک کے کام کے نہیں رہتے اُنہیں قصائی کی چھُری کے تلے ہی جگہ ملتی ہے۔ اے بیٹی سمجھ جا پانی کے بغیر کمہار مٹی نہیں گوندھ سکتا۔ نہ رنجیت سنگھ کے سوا کوئی کابل پر حملہ آور ہوسکتا ہے۔ ہمارے بغیر اور کون تجھکو مت (عقل) دینے والا ہے؟ تجھے کل کو سُسرال میں جاکر بہتیرا کام کرنا ہوگا۔ کالی اور بھوری بھینسیں دوہنی ہوں گی۔ تو اس بات کا دھیان نہیں کرتی؟ جو مجرم اور گنہگار بنیں گے اُن کو عدالت دوزخ میں ڈال دے گی۔ تو جو عشق کر رہی ہے اُس کی پاداش منصور کی طرح دار کے سوا اور کچھ نہیں۔ چوچک سردار کی بیٹی ہوکر تو کمینہ کام کرتی ہے؟ سب لوگ تجھے طعنے دیتے ہیں۔ ذرا ہوش میں آ۔ یہ کیا کرتوت ہیں؟

اے بچّی میں تو تیری برابری ہرگز نہیں کرسکتی۔ تجھے پول کے ساتھ سلام کرتی ہوں۔ تجھ جیسی ہی حوّا نے آدم کو بہشت سے نکلوایا اور الف لام کو ٹیڑھا کیا۔ تجھ جیسی ہی نے اسم اعظم کھو کے ہاروت ماروت دونوں کو "لا کلام" کیا۔ تجھ جیسی ہی نے امیر حمزہ کے ساتھ مل کر قتل عام کیا۔ تجھ جیسی ہی نے ابراہیم کو آگ پر بٹھلایا۔ تجھ جیسی نے کورو اور پانڈو لڑوائے اور راون کو مروایا۔

[1] وہ جگہ جہاں لڑکیاں مل کر رات کو چرخہ کاتتی ہیں۔

اور راجا رام اور بھیمن کو خوار کیا۔ تجھ ایسی ہی نے اندر کو بد دعا دلوائی۔ تجھ ایسی ہی یاجہ بھوج پر سوار ہوئی۔ رسالو اور سرکپ سے مصیبت اُٹھوائی۔ شیر افگن کو قتل کروایا۔ تو تو بیچ مچ فرنگی کی برق ہے۔ غلام سے عشق لگا کر تو نے سب حلال کام حرام کر دئے۔ تجھ ایسی ہی بادشاہوں کو فقیر اور فقیروں کو شاہ کر دیتی ہیں۔ دین و ایمان دولت و آرام کو چھین لیتی ہیں۔ اب بھی وقت ہے چالک کی محبت سے توبہ کر ورنہ کھیڑے تیری ناک کاٹ دیں گے۔

موہن سنگھ دیوانہ

دوست کی قبر

یہی مقام تھا اب تک ہے خوب یاد مجھے
یہی اُداس فضا تھی ہر ایک مرقد کی
کہا تھا تو نے یہاں چند قبریں دکھلا کر
نشانیاں ہیں یہ باقی مرے اب وجد کی

یہ ڈھیر خاک کا جس پر اُگی ہوئی ہے گھاس
مَیں جانتا ہُوں مرے باپ کا مزار ہے یہ
شِکستہ سی ہے جو یہ قبر اُس کے پہلو میں
یہ امّی ہاں مری امّی کی یادگار ہے یہ"

یکایک آیا یتیمی کا پھر خیال تجھے
غم دروں سے ترا رنگ زرد ہونے لگا
نہ پوچھ کیفیت اُس دردناک منظر کی
کہ دیکھ کر تری صورت کو میں بھی رونے لگا

اسی جگہ پہ کھڑا ہوں مَیں آج بھی لیکن
اُداس ہوں کہ تو اِس وقت میرے پاس نہیں
بتائے کون کہ یہ تازہ قبر کس کی ہے
یہ قبر جس پہ کہیں نام کو بھی گھاس نہیں

فاخر ہریانوی بی۔اے

زار اور زارینہ

ایک بار کا ذکر ہے کہ ایک نوجوان دریائے ٹیمز کی بالائی گذرگاہ کے شاداب اور بہارین کنجوں میں اپنی محبوبہ کے دل پر فتح پانے گیا۔ عشق کے دونوں نیازمندوں نے محبت کے کئی ایک لمحے بسر کئے اور دریا کے شفاف اور آئینہ گوں پانیوں پر کشتی کھیتے اور بید مجنوں کے روح پرور سایوں میں چپو چلاتے رہے۔ اس نوجوان کی تفریح کیلئے بہت کچھ انتظام کیا گیا تھا۔ لیکن اس نے اس شاندار دعوت کی طرف کچھ توجہ نہ کی۔ بلکہ آبادی سے دور تنہائی میں اس حسین و جمیل لڑکی کی رفاقت میں دن بسر کئے جس کو وہ اپنی رفیقۂ حیات بنانا چاہتا تھا۔ یہ لڑکی شہزادی ایلکس انگلستان کی شہزادی الائس کی بیٹی اور ملکہ وکٹوریہ کی نواسی تھی۔

یہ افسانۂ عشق جس کا آغاز انگلستان کے ایک مرغزار میں اس دلاویزی اور دلفریبی کے ساتھ ہوتا ہے "ایکا ٹرن برگ" ۱۹۱۸ء میں روس کے شاہی خاندان کی ہلاکت کے ساتھ ختم ہو جاتا ہے۔

آہ! یہی وہ خوشرو اور خندہ پیشانی لڑکی ہے جس کا باپ اگرچہ ایک جرمن تھا۔ لیکن اس کی تربیت و پرورش انگریزی طرز پر ہوئی اور اس کے متعلق ہی کہا جاتا ہے کہ اس کا اثر اس کے خاوند اور رعایا کی زندگی پر نہایت ہلاکت آفرین تھا۔

زارینہ کے سخت ترین معترضین میں سے کسی ایک نے بھی اس کی خانگی زندگی اور حسن اخلاق پر حرف نہیں لکھا۔ لیکن اس کے بہترین رفقا میں سے کوئی ایسا نہ ہوگا جو یہ کہنے کے لئے تیار ہو کہ پرنسس ایلکس نے جو بعد میں ملکۂ روس بنی۔ کبھی اپنے اختیار کردہ وطن کی ترقی اور خوشحالی کے لئے کوشش کی ہو۔

نکولس سوئم اور اس کی بیوی کی سی تاریخی شخصیتوں کے متعلق اکثر کہا جاتا ہے کہ اگر وہ شاہی خاندان کے بجائے دوسرے غیر مقتدر حالات میں پیدا ہوتے تو وہ خاموش اور پُر مسرت زندگی بسر کر سکتے۔ ممکن ہے ایسا ہو لیکن جہاں طاقت اور کمزوری باہم دست و گریبان ہوں۔ جہاں صنف نازک اقتدار کی زبردست خواہش رکھتی ہو اور صنف مقابل اس کے ہر جا و بیجا مشورے پر سرنگوں ہو وہاں ہلاکت اور تباہی یقینی ہے۔

تاریخ میں اکثر ایسی عورتیں گذری ہیں جنہوں نے اپنے اصراف اور بے احتیاطی سے اپنے خاوندوں کی زندگی کو تباہ کر دیا ہے۔ ان کے دل میں مختار و مقتدر ہونے کی اس قدر زبردست خواہش ہوتی ہے کہ وہ اپنی وقت بے وقت کی بے سلیقہ مداخلت سے خاوند کے احباب اور رشتہ داروں میں پھوٹ ڈلوا دیتی ہیں۔

ابھی چند روز ہی کا ذکر ہے کہ اخباروں میں ایک ایسی خودکشی کا المناک واقعہ شائع ہوا تھا جس کا سبب خاوند کے کاروبار میں بیوی کی بے جا مداخلت تھی۔ ہو سکتا ہے کہ اگر زار اور زارینہ کسی کم مقتدر خاندان میں پیدا ہوتے تو یہ قوت و اقتدار کی حماقت آمیز خواہش ہی اسکے خاوند اور بچوں کے لئے جن سے اسے اس قدر محبت تھی خطرناک ثابت ہوتی۔ اس میں کلام نہیں کہ زارینہ اپنے خاوند کی سچی پرستار اور اپنے بچوں کی عاشق زار اور جان چھڑکنے والی ماں تھی۔ زار کی زندگی پر اس کا نہایت ہی زبردست اقتدار تھا۔

تاریخ کے اس خونین ورق کو مطالعہ کرنے والے کے دل میں اکثر یہ خیال آتا ہے کہ کیا جلا وطنی کے پر درد اور المناک ایام میں زار کو بھی کبھی اس امر کا احساس ہوا ہوگا کہ روس کی معاشرتی اور سیاسی زندگی پر بیوی کو اس قدر اختیار دے کر اس نے ایک شدید غلطی کا ارتکاب کیا ہے۔ لیکن یہ امر یقینی ہے کہ محبت شعار خاوند نے ملامت کا ایک لفظ تک نہیں کہا اور جلا وطن شاہی خاندان کے آخری حسرتناک دن بھی عشق و محبت اور جرأت و وفا شعاری کا افسانہ بن کر گٹ گئے۔ نکولس اور الیگزنڈرا کے درمیان نہایت گہری اور ولولہ انگیز محبت تھی۔ لیکن اس کو خود غرضانہ محبت کہنا چاہیئے۔ وہ اپنی خانگی زندگی میں نہایت خوش تھے۔ انہیں اپنے بچوں اور دہقانی مصروفیتوں سے محبت تھی۔ وہ گھر کے اندر کی پُرسکون تنہائی کو چھوڑ کر باہر کی وسیع دنیا کے کاروبار میں سرگرم کار دلچسپی لینا نہ چاہتے تھے اور یا لے نہ سکتے تھے۔ لیکن ملکہ اور اس کے خاوند کو عروج و اقتدار کی خواہش تھی۔ وہ اسے بغیر کسی کوشش کے حاصل کرنا چاہتے تھے روس کی ہولناک تباہی کے وقت جب سینکڑوں مرد و زن مارے گئے تھے شاہی خاندان کے افراد میں سے صرف ایک سابق زارینہ تھی جو ہسپتال میں جا کر زخمیوں کی تسلی و تشفی کرتی تھی اور یہ بھی کہا جاتا ہے کہ نکولس اور اس کی بیوی سے اس واقعہ کی اہمیت بالکل مخفی رکھی گئی تھی۔ اگر یہ

صحیح ہے تو دربار روس کی حالت کا اندازہ بخوبی ہو سکتا ہے۔ جس کے لئے اس قدر اہم واقعہ کا چھپانا بھی ممکن ہے اگر زار اور زارینہ رعایا کی جان کو اپنی جان اور رعایا کے آرام کو اپنا آرام سمجھتے تو کوئی اس حقیقت اس قومی مصیبت کو خواہ یہ کس قدر ہی تلخ اور ناخوش گوار ہی کیوں نہ ہوتی ان سے پوشیدہ نہ رکھ سکتا۔

اب ہم پھر شادی کے ابتدائی ایام کی طرف جانا چاہتے ہیں۔ اس وقت پرنسس ایلکس اپنے رشتے کے بھائی پرنس لوئی پیٹرز برگ کے پاس مقیم تھی ملکہ وکٹوریہ اس شادی پر رضامند تھیں۔ ان کی بن ماں کی نواسی نہایت نازک تھی اور ہونے والے زار کی صحت بھی اچھی نہ تھی۔ علاوہ ازیں وہ نوخیز شہزادی کو روس کے تخت کے خطروں اور تفکرات کی بھینٹ نہ چڑھانا چاہتی تھیں۔ شاہ ایلگزنڈر کو بھی یہ خیال پسند نہ تھا کہ اس کے بیٹے کی شادی لوتھر کی کسی معتقدہ سے ہو۔ لیکن ان دونوں کی آپس میں اس قدر شدید محبت تھی کہ کوئی روک اُن کی شادی کے راستے میں حائل نہ ہو سکی اور ۲۶۔ نومبر ۱۸۹۴ء کو شہزادی کی شادی اس کے دل کے شہزادے سے ہو گئی۔ زار ایلگزنڈر شادی سے تین ہفتے پیشتر فوت ہو چکا تھا اور نسبت کی رسم بیماری کی حالت میں اسی کے پلنگ کے پاس ادا کی گئی تھی۔ روس کے اس حکمران نے مرتے دم بیٹے کو نصیحت کی تھی کہ اپنی رعایا سے بلا امتیاز مذہب و ملت محبت کرے اُن کے مفاد اور حقوق کی نگہداشت رکھے اور یورپ کے امن و امان کو دنیا کی بہبودی کی خاطر برقرار رہنے دے۔

ان افراد میں سے جنہوں نے اس شادی کی شاندار رسومات میں حصہ لیا تھا صرف ایک کم نصیب شخصیت زندہ ہے۔ یہ حسرت نصیب زار کی ماں ہے جو صرف اس لئے زندہ ہے کہ اس عمر میں روس کی ہولناک تباہی دیکھے اور اپنے بہو بیٹے اور پوتوں کی خونریز داستان غم سنے۔ یہ سابق زارینہ اور ملکہ ایلگزنڈرا کی بہن ہے جو ڈنمارک میں رہتی ہے۔ اور جس کی تمام زندگی اس ملک کے لوگوں کی بہبودی کی کوشش میں گذر گئی جو شادی کے رشتے سے اُس کا ہو گیا تھا۔

لیکن زارینہ تاریخ کے طالب علم کے لئے نفسیات کا ایک معمہ بنکر رہ جاتی ہے۔ وہ اپنے کیرکٹر اور طرز عمل میں یکسر انگریز تھی وہ محبت کے خطوط جو اس نے اپنے خاوند کو لکھے اور جن سے ان دونوں کے حالات پر کافی روشنی پڑتی ہے نہ تو اس کی اپنی ملکی زبان جرمن میں لکھے گئے تھے۔ اور نہ اس کے خاوند کی زبان روسی میں۔ وہ اس زبان میں وجود میں آئے تھے جو ان کی محبت اور نجی زندگی کے اتحاد کا واحد ذریعہ تھی۔ شباب کے ان متوالوں کی شادی کے اولین ایام نسبتاً پرسکون تھے۔ زارینہ کشتی کھینے۔ چپو چلانے اور دیگر مشاغل میں بہت دلچسپی لیتی تھی اور نہایت دلفریب طور پر رقص کر سکتی تھی۔ اگرچہ روس کے شاندار محلات اُن کے لئے موجود تھے۔ لیکن زار اور زارینہ دیہات کی زندگی کو زیادہ پسند کرتے تھے سینٹ پیٹرز برگ کے سرمائی محل کو جو نہایت قیمتی ساز و سامان سے آراستہ ہوتا تھا۔ صرف سرکاری ملاقاتوں کے لئے استعمال کیا جاتا تھا اور وہ ذاتی طور پر ان غیر نمایاں عمارتوں میں رہنا زیادہ پسند کرتے تھے جنہیں وہ انگریزی طرز پر آراستہ رکھتے تھے۔ ملکہ کے دل میں تخت کے وارث کی زبردست تمنا تھی۔ لیکن چار بار اسے حسرت و ناکامی کا منہ دیکھنا پڑا۔ ہر بار لڑکی پیدا ہوتی رہی۔ آخر ۱۹۰۴ء میں جنگ جاپان کے وسط میں اس کی یہ آرزو پوری ہوئی۔ لیکن یہ دیکھ کر کہ بچہ پر ماں کے خاندان کی موروثی بیماری کے آثار طاری ہیں ان کی خوشیوں پر اوس پڑ گئی۔ اس کی بہنیں صحت مند تھیں لیکن تخت کے وارث کی جسمانی حالت اس قدر نازک تھی کہ پیدائش سے لیکر اس کے ساتھ بیماروں کا سا سلوک ہوتا تھا۔

شاہی خاندان کی خانگی زندگی کی دلکش تصویر سر زار د پارے نے ان الفاظ میں کھینچی ہے۔

"خاندان کے بچوں کی پرورش نہایت شدت سے انگریزی طرز پر ہوتی تھی۔ چاروں لڑکیاں ایلگزنڈر کی تقلید میں معمولی چارپائیوں پر سوتی تھیں۔ ملازمیں ہدایات دیتے ہوئے ان کا انداز تحکمانہ نہیں ہوتا تھا اور ملازم بھی دل و جان سے اُن کے وفادار تھے ماں باپ کی طرف سے جو تحفے تحائف انہیں دیے جاتے وہ بھی نہایت معمولی ہوتے تھے۔ گھر کی زندگی بھی بہت سادہ تھی۔ اگرچہ انہیں بے غور و فکر نہیں کہا جا سکتا تاہم وہ کوئی علمی قابلیت بھی نہ رکھتی تھیں۔

اکثر اوقات یوں ہوتا کہ کوئی امیر البحر یا جرنیل اُن کے باپ سے ملنے آتا۔ اور ان میں سے ایک لڑکی میز کے نیچے چھپ کر اس کی ٹانگوں کی چٹکیاں لیتی اور وہ گدگدی کے باعث بات نہ کر سکتا۔ اس وقت زار ہنستا ہوا اس لڑکی کو بالوں سے پکڑ کر کھینچتا۔ چاروں لڑکیاں اپنے باپ سے بہت محبت کرتی اور ہر وقت اس کی صحت کا خیال رکھتی تھیں۔"

سر زار د کے یہ الفاظ بالکل صحیح ہیں کہ اُن کے ... زندگی کو دیکھ کر

یہ اندازہ لگانا بہت مشکل ہے کہ یہ زار روس کا خاندان ہے اس کی وجہ اُن کی سادہ زندگی نہیں بلکہ یہ ان کی انصرامی معاملات سے لاپروائی کا سوال ہے اس امر کی تصدیق روسی معاملات کے مستند مصنف ڈاکٹر ڈلن کے اس بیان سے بھی ہوتی ہے - یہ اُس وقت کا ذکر ہے جب تخت کے وارث کی عمر صرف ایک سال تھی -

اس سے بڑھ کر جگر خراش واقعہ اور کیا ہو سکتا ہے جو مجھے دربار ملا کے ایک فرد نے سُنایا کہ جب ایک انگریزی جہاز پر روسی امیرالبحر کی آتشباری سے روس اور انگلستان کے تعلقات کشیدہ ہو رہے تھے - زار ایک روز صبح اپنے بچے کو نہلا رہا تھا - امیرالبحر ایک دور دراز اور تباہ کن مہم پر روانہ ہونے والا تھا - اُس وقت بھی زار یہ الفاظ کہے بغیر نہ رہ سکا "آپ جانتے ہیں اس کا وزن صرف ۳۰ پونڈ ہے" "کس کا جناب"؟ "تخت کے وارث کا" باپ نے جواب دیا -

یہ الفاظ ایک ماں کے دل کیلئے ہر چند اس کو اس ضرورت احساس ہو کہ باپ کو اسکی بجائے حکومت کے کس اہم امور میں حصہ لینا چاہیئے نہایت مسرت بخش ہو سکتے ہیں

زارینہ نہایت حسین و جمیل عورت تھی - لیکن اس میں ساس کی سی ہمدردی اور نرمی نہ تھی اور ہر وقت کی بجا شرم اُسے اچھی نہ لگتی تھی - دربار میں وہ بہت دبی اور گھبرائی ہوئی نظر آتی تھی اور اپنی مرضی سے نہ صرف علمی اور ادبی حلقوں سے بلکہ شاہی خاندان کے افراد سے بھی دور اپنے بچوں کے ساتھ تنہائی میں رہتی تھی -

لیکن روس میں شاہی خاندان کے افراد سے ابھی تک کچھ مذہبی تقدس وابستہ تھا - شاید زارینہ بھی حکمرانوں کے ان آسمانی حقوق کی معتقد ہو جن کی رو سے اسے اپنے خاوند کی بے شمار رعایا میں سے چند ایک سے رسم و ربط رکھنا ضروری تھا -

میرا خیال ہے اگر زارینہ کچھ زیادہ ایثار کرتی اور اس امر پر رضامند ہو جاتی کہ اس کا خاوند اس کی رفاقت سے چند لمحوں کے لئے غیر حاضر رہ کر اپنی رعایا کی مشکلات اور مصائب سے واقف ہو سکے تو روس کی تاریخ آج بالکل مختلف ہوتی - اگر وہ اس وقت خلوت پسند اور اپنی رعایا کے مرد و زن سے اس قدر بیگانہ نہ ہوتی تو نہایت اغلب ہے کہ اس اوباش طبع راسپوٹین کی نام نہاد روحانیت کی اس قدر پرجوش معتقد نہ بن سکتی - جو ایک غیر معمولی طور پر مضبوط ارادے والی اور ملکہ کی سی عظیم الشان شخصیت پر اپنا سکہ جمانے میں کامیاب ہو گیا تھا -

آہ! یہ ایک ماں کا دل تھا - جس پر اس اوباش نے پہلی بار اپنی روحانیت کا جادو آزمایا!

اس مقام پر یہ بیان کر دینا ضروری ہے کہ راسپوٹین کوئی خطاب یا لقب نہیں - اس کے معنے "اوباش" یا "آوارہ آدمی" کے ہیں اور یہ ریاکار گریگرے کو جو اس نام سے مشہور ہے اس کے دیہاتی ہمراہیوں کی طرف سے دیا گیا تھا - گریگرے کوئی راہب یا کسی خانقاہ کا متولی نہ تھا - بلکہ وہ ایک آوارہ آدمی تھا اور دعویٰ کرتا تھا کہ خدا نے لوگوں کی روحانی تربیت کے لئے مامور کیا ہے - اس مفروضہ روحانیت کا شہرہ زارینہ نے بھی سُن رکھا تھا اُس نے اُسے بارہا دیکھا بھی تھا - ۱۹۱۲ء میں ایک اتفاقی سانحے کی وجہ سے اس کا بیٹا بیمار ہوا - اور اُس نے فوراً راسپوٹین کی طرف رجوع کیا -

راسپوٹین نے نہایت بے اعتنائی سے جواب دیا "یہ بیماری اس قدر خطرناک نہیں جتنی کہ معلوم ہوتی ہے - ڈاکٹروں کے علاج کی ضرورت نہیں"-

اتفاق کی بات ہے بیماری جاتی رہی اور اُسی روز سے راسپوٹین کی روحانیت پر زارینہ کا اعتقاد مضبوط ہوتا گیا اور اسے یقین ہو گیا کہ اسے واقعی الہام ہوتا ہے - چنانچہ اس نے اپنا تمام اثر و اقتدار حکومت کے ان وزرا کو معزول کرنے میں صرف کر دیا جو اس مقدس آدمی کی روز بروز بڑھتی ہوئی طاقت کو خطرناک خیال کرتے ہوئے اس کی جلاوطنی کے در پے تھے اپنے خطوط میں زارینہ راسپوٹین کا تذکرہ ہمیشہ "ہمارے دوست" کے الفاظ میں کرتی تھی -

اس امر کا ذکر کیا جا چکا ہے کہ زارینہ کے وہ خطوط جو اس نے زار کو لکھے اب ایک کتاب کی صورت میں شائع ہو چکے ہیں اور ان سے اُس کے کیریکٹر پر غیر معمولی روشنی پڑتی ہے مثلاً ۴ - اپریل ۱۹۱۵ء کو وہ اپنے خاوند کو "سارکو سیلو" سے لکھتی ہے -

"میرے دل کے خزانے!

ایک بار پھر تم ہمارے پاس سے جا رہے ہو اور میرا خیال ہے خوشی اور مسرت کے ساتھ - کیونکہ یہاں باغ کے چند لمحوں کے سوا باقی تمام کام نہایت صبر آزما اور بیزار کن تھا - اس عرصہ میں بیماری کی وجہ سے میں تمہارے ہمراہ زیادہ عرصہ نہیں رہ سکی - میرے محبوب خدا تیرے ہمراہ ہو اور ہماری فوجوں کو مظفر و منصور واپس لائے - مجھے اُمید ہے تم ہیڈ کوارٹر پہنچنے سے پیشتر اس بات کا خیال رکھو گے کہ اگر نکولا شا ویکوف سے کسی قسم کی شکایت کرے تو فوراً اس کا انسداد کرو گے - اور انہیں بتا دو گے کہ آقا تم ہو - تم بہت نرم مزاج اور رحمدل ہو - لیکن اکثر اوقات کڑی آواز اور تند نگاہی زیادہ مفید رہتی ہے - میرے پیارے اپنے نفس پر ذرا زیادہ اعتماد رکھنا چاہیئے اور جو بات ہو اس کا فوراً فیصلہ کرنا چاہیئے

تم اچھی طرح جانتے ہو کہ صحیح اور سیدھا راستہ کیا ہے اور جب کبھی تم کو اپنے فیصلہ پر اعتماد ہو اور تمہارے دیگر ہمراہی تم سے متفق نہ ہوں تو کسی کی کچھ پرواہ نہ کرو اور اپنے فیصلے پر کاربند رہو۔"

زارینہ کے خطوط میں ایسی بے شمار ہدایات ملتی ہیں لطیف نسوانی جذبات اور محبت کی داستان بیان کرتے کرتے یہ عجیب عورت اچانک اپنے خاوند کو فوجی اور سیاسی امور میں مشورہ دینے لگ جاتی ہے ۔

اگست ۱۹۱۵ء میں لکھتی ہے ۔

"کیا میں اپنی آنکھوں پر یقین کر سکتی ہوں۔ میں وہ کچھ دیکھ رہی ہوں جو مجھے دیکھنے کی کبھی توقع نہ تھی میرے دل میں سوال پیدا ہوتا ہے کہ کیا یہ صحیح ہے اور تم اپنا شاہانہ اقتدار دکھا رہے ہو۔ وہ اقتدار جس کی روس کو اس وقت سخت ضرورت ہے۔ اگر تم اب بھی اپنے گذشتہ طرز عمل کو تبدیل نہ کرتے تو وہ تمہیں اور بھی نقصان پہنچاتا۔ اب صرف ایک راستہ باقی ہے اور وہ اپنے ارادوں میں مضبوط رہنا ہے۔ ۔ ۔ ۔ ۔

میں اپنی اس گہری محبت کا اظہار کرنا چاہتی ہوں ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔

خدا کے مقدس فرشتے تمہارے خواب کے محافظ ہوں۔ میں ہمیشہ تمہارے قریب ہوں اور ہمیں کوئی چیز جدا نہیں کر سکتی۔ "تمہاری بیوی"

کس قدر المناک ہے کہ ایک عورت جو محبت بھری روح کی مالک تھی، وہ اس روح کو اپنی سیاسی آرزوؤں کی تکمیل کے لئے استعمال کرے اور اپنے خاوند کو اپنی مرضی بلکہ اوباش راسپوٹین کی خواہشات کے مطابق مشورہ دے۔

ان خطوط میں سے چار سو سے زیادہ شائع ہو چکے ہیں اور ان کے ایسے اقتباس بے شمار پیش کئے جا سکتے ہیں۔ جن میں زارینہ کسی افسر کی معزولی کسی امر کی طرف اقدام۔ کسی کی تقرری اور کسی شخص کی معافی۔ کی خواہش کرتی ہے۔ ایک خط میں زارینہ لکھتی ہے۔ "راسپوٹین آپ سے التجا کرتا ہے کہ کسی کو "ریگا" کی طرف بڑھنا چاہئے۔" زار کے پردے میں زارینہ کام کر رہی تھی۔ لیکن زارینہ بدمعاش راسپوٹین کے اشاروں پر تھی۔ جس کا نام روس کی تاریخ کے اوراق پر ایک شرمناک دھبہ ہے

زارینہ کی اپنے اختیار کردہ وطن سے وفاداری پر بھی جنگ کے دنوں میں حرف رکھا گیا تھا۔ لیکن جو ثبوت فراہم ہو چکے ہیں ان سے یہ صاف ظاہر ہوتا ہے کہ اس کی حب الوطنی کا جذبہ نہایت مستقل ہے دستوری اصلاحات، اصلاحاتی طرز حکومت کی سخت دشمن تھی۔ وہ چاہتی تھی کہ جب اس کا بیٹا برسر حکومت ہو روس کا تخت صحیح سلامت اس کے حوالے کر دیا جائے۔ اس کی خواہش تھی کہ وہ اور اس کا خاوند روس ایسی روایتی مطلق العنانی سے حکومت کریں جس کے وہ عرصہ دراز سے زیر نگین رہا ہے۔

وہ ایک نیک عورت تھی۔ لیکن اُس نے اپنی طاقتوں کا استعمال برائی کے لئے کیا۔ یہ ہو سکتا ہے کہ ملک کے حالات سے اچھی طرح واقف ہونے سے وہ اپنی طاقتیں بھی زیادہ کامیابی کے ساتھ صرف کر سکتی۔ لیکن اس حالت میں اس کا استعمال بھی جائز ہوتا۔ صرف حالات آ سے یہ بتا سکتے تھے کہ اب لوگوں کے دلوں میں آزادی کی خواہش ہے اور قدیم روایتوں کو برقرار رکھنے کی کوئی خواہش اس روح کو دبا نہیں سکتی۔

تاہم اپنے خاوند کی منہائی کرنے کی کشمکش میں اس نے اس کی محبت حاصل کر لی تھی۔ زار کی ابتدائی عمر میں اس کی ماں اس کی راہنمائی کرتی تھی اور شادی کے بعد اس کی بیوی اس کو راستہ دکھاتی تھی۔ زار نازک طبع اور کمزور شخصیت ہونے کی حیثیت سے وزرا کے مشورے سے مطمئن ہو جاتا۔ لیکن بیوی کی محبت اس کو اس امر کی اجازت نہ دیتی تھی۔ چنانچہ ان دونوں کی محبت نے روس میں ایک اور طاقت پیدا کر دی تھی جس کا یہ دونوں مقابلہ نہ کر سکتے تھے۔

اس المناک افسانے کی تکمیل اس طرح ہوتی ہے۔ غلطی پر غلطی ہوتی ہے۔ تباہی پر تباہی آتی ہے۔ یہاں تک کہ راسپوٹین قتل کر دیا جاتا ہے۔ سینٹ پیٹرز برگ میں انقلاب برپا ہوتا ہے اور آخر کار شاہی خاندان جلاوطن کر دیا جاتا ہے۔

زار اور زارینہ کی ازدواجی زندگی کا آخری باب مردانہ شجاعت کا ایک المناک افسانہ ہے میاں اور بیوی کے خانگی تعلقات نے روس کو ایک ایسی شورش پر آمادہ کر دیا تھا جو بہت حد تک انقلاب فرانس سے مماثلت رکھتی تھی۔ ملک کی اس ہولناک تباہی کی ذمہ داری زیادہ حد تک خاندان اور ایک دوسرے کی اس محبت اور وفاشعاری پر عاید ہوتی ہے جو اس شک نہیں کہ بیرونی ذمہ داریاں نہ ہونگی صورت قابل تعریف پرستش ہوتی ہے۔ لیکن جب ان پر دوسروں کی خوشی کا انحصار بھی ہو تو وہ نہایت قابل مذمت اور خود غرضانہ شمار کی جاتی ہے۔

یہ صفات تھے جنہوں نے اُنہیں اس قابل بنا دیا کہ وہ اپنی زندگی کے اس حسرتناک واقعہ کا مقابلہ ایک وقار اور شان کے ساتھ کر سکیں جلاوطنی کی زندگی کے حالات ایک فرانسیسی اتالیق موسیو شیلارڈ نے لکھے ہیں جو شاہی خاندان کے ہمراہ "ٹوبولاسک" میں مقیم تھا۔ اپنی اسیری کے دردناک مصائب کو فراموش کرنے کے لئے زار اپنے لڑکے کو تاریخ اور علم ادب کا درس دیتا تھا۔ شام کے وقت خاندان کے

تمام افراد پڑھنے اور گفتگو کرنے کیلئے جمع ہو جاتے تھے۔ وہ اکٹھے دعا مانگتے تھے اور جب تک قید خانے کے محافظ انہیں اجازت دیتے رہے وہ کلیسا کی عبادت میں ایک دلفریب لیکن رقت انگیز سادگی کے ساتھ شریک ہوتے تھے اُن کی جلاوطنی کا دوسرا مقام ایکاٹرن برگ جہاں انہیں موت کے گھاٹ یار اُتارا گیا۔ توبولاسک سے کہیں بڑھ کر خوفناک تھا یہاں اُن کے ساتھ نہایت توہین سلوک کیا جاتا تھا۔ اور اُن کی آزادی پر اس قدر پابندیاں عائد تھیں کہ وہ نا ہونے کے برابر تھی انکو تین تنگ کمروں میں رکھا گیا تھا جنمیں سے دستو [illegible] آ سکتے تھا۔ اُنکے دریچوں میں سے باہر جھانک کر دیکھنے کی اجازت نہ تھی اور مجبوراً انہیں اپنے بدتہذ محافظوں کے وحشیانہ اور شرمناک گیت سُننے پڑتے تھے۔ محافظوں کو اُنسے سخت نفرت تھی اور اُنکا افسر جو ایک متعصب اشتمالی تھا اچھی طرح جانتا تھا کہ ان حسرت نصیب اسیروں کو کس طرح عذاب دیا جاسکتا ہے جانکنی کے ان لمحوں میں زارینہ کو صرف اپنے مذہبی عقائد میں اطمینان میسر آسکتا تھا اُس نے اسے ان میں تلاش کیا اور پالیا۔ ممکن ہے اس کو اس امر کا احساس ہو گیا ہو کہ اس کا اس کے خاوند اور رعایا کی زندگی پر بہت بُرا اثر پڑا ہے۔ لیکن وہ شجاعانہ اطمینان کے ساتھ اپنے مذہبی عقاید پر ثابت قدم اور ہر مصیبت کا مقابلہ کرنے کو تیار تھے۔

آہ! جلاوطنی کے ان المناک و تاریک لمحوں میں ان کی روح کی زندگی کا سہارا صرف وہ محبت تھی جس نے ان دونوں کو مدت ہوئی ایک رشتہ میں باندھ دیا تھا۔ اب مصائب برداشت کرنیکے سوا کوئی اور چارہ کار نہ تھا۔ اب روس یا دنیا کی پالیسی کا کوئی مسئلہ اُن کی تاریک زندگی کو زیادہ تاریک نہ بنا سکتا تھا۔ ان کو ایک دوسرے کے سوا مطلقاً کوئی سہارا نہ تھا۔ بیرونی دنیا سے تمام تعلقات قطع ہو چکے تھے۔ صرف دل میں ایک موہوم سی اُمید تھی جو لحہ بلحہ کمزور ہوتی جارہی تھی اور وہ انگلستان میں پناہ لینے کا خیال تھا۔ وہ ایک دوسرے سے اب بھی اسی طرح وابستہ تھے جس طرح وہ شادی سے پیشتر کی ملاقاتوں خانگی زندگی کے غموں اور مسرتوں۔ بچّوں کی پیدائش کی خوشیوں اور بیماری کے ایام کی فکرمندیوں اور ذاتی مصیبتوں کے شریک رہے تھے۔

اگرچہ حسرت نصیب زار اور زارینہ کو رحم و ہمدردی کا مستحق نہ گردانا جاتا تھا لیکن موت کے فتوے کی تعمیل کرتے ہوئے نادانستہ طور پر اس قسم کے انسانی جذبات کا اظہار ہو ہی گیا۔ شاہی خاندان کو اس امر کی اطلاع نہ دی گئی تھی کہ اُن کی زندگی کا خاتمہ کر دیا جائیگا

جولائی ۱۹۱۸ء میں ایک دن انہیں جلدی سے تہ خانہ میں جانے کیلئے کہا گیا۔ زار نے خیال کیا کہ شاید کہیں سفر پر جانیکی تیاری ہو رہی ہے لیکن اسے اور اس کے غم نصیب ہمراہیوں کو کیا معلوم تھا کہ یہ سفر آخرت کی تیاری کی جا رہی ہے۔

آہ! بدنصیب زار کا آخری فعل نہایت دردناک تھا۔ جب اُس کو معلوم ہوا کہ وقت آپہنچا ہے اُس نے زارینہ کو حملے سے بچانے کے لئے اپنے پیچھے کر لیا اور خود سینہ تان کر کھڑا ہو گیا۔ زار زارینہ چاروں حسین لڑکیوں اور لڑکے کو گولی ماردی گئی اور اُن کے جسم آگ سے تلف کر دیے گئے۔ اس طرح تاریخ کی ایک شاندار ازدواجی زندگی کا خاتمہ ہو گیا۔ اس کے ساتھ ہی قدیم روس کے تمام آثار ختم ہو جاتے ہیں۔ نرس کیول کے یہ آخری الفاظ

"صرف حب الوطنی کافی نہیں"

لافانی بن چکے ہیں۔ لیکن آہ زار اور زارینہ کے یہ الفاظ ابدی ہو سکتے ہیں۔

"صرف محبت کافی نہیں"

نازش رضوی

صبح صحرا

وہ صبح اور وہ چھاؤں ستاروں کی اور وہ نور — دیکھے تو غش کرے ارنی گوی اوج طور
پیدا گلوں سے قدرت اللہ کا ظہور — وہ جا بجا درختوں پہ تسبیح خواں طیور

گلشن خجل تھے وادی مینو اساس سے
جنگل تھا سب بسا ہوا پھولوں کی باس سے

ٹھنڈی ہوائیں سبزۂ صحرا کی وہ لہک — شرمائے جس سے اطلس زنگاریٔ فلک
وہ جھومنا درختوں کا پھولوں کی وہ مہک — ہر برگِ گل پہ قطرۂ شبنم کی وہ جھلک

ہیرے خجل تھے گوہر یکتا نثار تھے
پتے بھی ہر شجر کے جواہر نگار تھے

فوٹوگرافی

فوٹوگرافی کی ابتدا

فوٹوگرافی کی ابتدا اور اس کی درجہ بدرجہ ترقی سائنس کے دوسرے شعبوں کی مانند صرف ایک آدمی کی محنت کا نتیجہ نہیں ہے۔ اس کی تعمیر کا کام بے شمار کام کرنے والوں نے کیا ہے۔ اور ہر ایک نے اس علم کی عمارت میں ایک ایک اینٹ کا اضافہ کر کے اتنا رفیع الشان بنا دیا ہے کہ یہ تفریح طبع ہی کا سامان نہیں رہی بلکہ ایک مستقل صنعت اور علم بن گئی ہے۔ جن لوگوں نے اس کی ترقی میں جان توڑ کوششیں کی ہیں اُن کے نام سے لوگ بہت کم واقف ہیں۔ لیکن مہذب دنیا نے اُن کو فراموش نہیں کیا اور اُن کی دماغی محنت کا معاوضہ مختلف یادگاروں کی شکلوں میں دیا ہے۔

قدیم مصریوں کو اس بات کا علم تھا کہ کسی بند کوٹھڑی میں اگر کسی چھوٹے سے سوراخ سے روشنی گذرے۔ تو سوراخ کے سامنے والی دیوار پر باہر کے تمام نظارے کا عکس پڑتا ہے۔ اور یہ عکس اُلٹا ہوتا ہے۔ ارسطو نے آج سے ۲۲۰۰ سال قبل بتایا کہ یہ سوراخ خواہ گول ہو یا تکون یا چوکور۔ جب اس میں سے روشنی گذرے گی تو اس کا عکس ہمیشہ دائرے کی شکل میں ہوگا۔ چنانچہ ایک عرصہ تک اس ترکیب سے مصور باہر کے نظارے کا عکس کاغذ پر لے لیا کرتے تھے۔

مصریوں کو معلوم تھا کہ شورے کے تیزاب میں حل کی ہوئی چاندی کا پانی جب کسی چیز پر لگ جائے اور اُس کو روشنی میں لایا جائے تو اس کی رنگت سیاہ ہو جاتی ہے اس کا ذکر ایک عرب کیمیاگر نے ساتویں یا آٹھویں صدی میں کیا ہے اور اس نے چاندی کے مرکب سے چند ایک رنگ بنانے بھی بتائے ہیں۔

سب سے پہلا کیمیاگر جس نے یقین کے ساتھ بتایا کہ چاندی کو سیاہ کرنے والی چیز روشنی ہے۔ جان ہنریخ شلتسے ایک جرمن سائنسدان ہے۔ اُس نے اپنے تجربات ۱۷۲۷ء میں شائع کئے۔ اس محقق کے بعد انگریز اور اٹلی کے کیمیاگر اس نتیجہ پر پہنچے۔ اگرچہ قیاس یہی ہے کہ اس کا علم بالواسطہ شلتسے کی تحقیقات سے ہوا۔

کارل ولہلم شیلے ایک اور جرمن کیمیاگر نے تحقیقات سے معلوم کیا کہ ارغوانی رنگ کی شعاعیں چاندی کو نہایت تیزی سے سیاہ کرتی ہیں اس قسم کی تحقیقات جاری تھی جس میں یورپ کے کیمیاگروں نے بہت دماغ سوزی کی۔ انگریز کیمیاگر تھامس ویج وڈ اور ہمفری ڈیوی کے نام بھی فراموش نہیں کئے جا سکتے جنہوں نے سلور نائیٹریٹ (شورے کے تیزاب میں حل کی ہوئی چاندی) میں کاغذ تر کر کے طرح طرح سے مختلف چیزوں کے عکس لئے۔

اسی زمانہ میں ایک فرانسیسی لوئیس ڈیگرے بھی تجربات کر رہا تھا۔ بے انتہا محنت کے بعد وہ اصلی تصویر لینے میں کامیاب ہو گیا۔ ڈیگرے پیرس کے قریب ایک گاؤں میں ۱۷۸۷ء میں پیدا ہوا تھا۔ اس کا باپ عدالت میں چپراسی تھا اُس نے ڈیگرے کو سکول میں داخل کر دیا۔ ڈیگرے کو مصوری کا بہت شوق تھا۔ ۱۸۲۵ء میں اُس نے فوٹوگرافی کی طرف توجہ کی اور اسے اس قدر شوق پیدا ہوا۔ کہ دنیا و مافیہا سے بالکل بے خبر ہو گیا۔ چنانچہ اس کی بیوی نے ایک مرتبہ کسی مشہور کیمیاگر سے دریافت کیا۔ اور کہا میں ڈیگرے مصور کی بیوی ہوں۔ کچھ عرصہ سے اُسے خبط ہو گیا ہے۔ کہ وہ کیمرے کے ذریعے تصویر لے سکتا ہے۔ کیا یہ ممکن ہے؟ رات دن وہ اسی خیال میں غرق رہتا ہے۔ دن کو سوتا ہے نہ رات کو۔ مجھے خطرہ ہے کہ اس کا دماغ نہ چل جائے۔ آپ ایک بڑے سائنسدان ہیں۔ کیا بتا سکتے ہیں کہ یہ کبھی ہو سکتا ہے۔ یا وہ دیوانہ ہو گیا ہے۔

ڈوِمس نے جواب دیا "فی الحال میں یقین سے نہیں کہہ سکتا کہ ان تجربات میں کامیابی ہوئی ہے۔ لیکن یہ ہمیشہ ناممکن نہیں رہیگا۔ اس لئے میں اس کو دیوانہ نہیں بتا سکتا"۔

ڈیگرے کی ترکیب یہ تھی چاندی کی پالش کی ہوئی تختی پر آیوڈین کے بخارات جمائے جاتے تھے جس سے سلور آیوڈائڈ بنجاتا تھا۔ سلور آیوڈائڈ پر روشنی اثر کرتی ہے جب کیمرے کے اندر اس تختی کو کھولا جاتا۔ تو اس پر عکس آ جاتا تھا۔ لیکن کچھ دکھائی نہ دیتا۔ لیکن اس تختی کو جب پارے سے بھری ہوئی تھالی پر رکھ دیا جائے اور پارے کو ہلکی سی حرارت پہنچائی جائے تو پارے کے بخارات آیوڈائڈ آف سلور سے مل جاتے تھے۔ جہاں زیادہ روشنی پڑی ہے اُتنا ہی زیادہ پارہ اُس جگہ جم جاتا تھا اور جہاں کم روشنی پڑی تھی وہاں کم اِس طرح تصویر تختی پر آ جاتی تھی۔

دوسرا دور

سر ہمفری ڈیوی نے چاندی کے پانی سے کاغذ تر کر کے تصویر چھاپنے کی ترکیب تو معلوم کر لی تھی لیکن وہ تصویر زیادہ دیر پا نہ ہوتی تھی۔ جب پھر روشنی کا اثر ہوتا تو کاغذ کی تمام سطح سیاہ ہو جاتی۔ اسے سادہ پانی سے دھویا پھر نمک کے پانی سے دھویا مگر کامیابی نہ ہوئی۔

آخر کار سر جان ہرشل منجم اور کیمیا گر نے سوڈیم ہائپو سلفائٹ سے تصویر پختہ کرلی۔ اور تب سے یہ دوا فوٹو گرافی میں بہت کام دے رہی ہے۔

سنہ ۱۸۵۱ء میں موجودہ فوٹو گرافی کی ابتدا ہوئی۔ کلوڈین اسی زمانہ میں ڈاکٹر اپنے کام میں استعمال کر رہے تھے۔ ایک شخص سکاٹ آرچر نے کلوڈین فوٹو گرافی میں استعمال کرنے کے لئے انتخاب کی۔ اسکاٹ آرچر مجسمہ ساز تھا اور اپنے کمال کے نمونے محفوظ رکھنے کے لئے اُس نے فوٹو گرافی سیکھی۔ اس کی ترکیب یہ تھی کہ پائروکسائلین کو ایتھر اور الکحال میں حل کرتا۔ اس میں پوٹاسیم آیوڈائیڈ اور پوٹاسیم برومائیڈ ملاتا اور اس مرکب کو شیشے کی پلیٹ پر پھیلا دیتا۔ بعد میں پلیٹ کو چاندی کے پانی میں تر کر لیتا جسے کیمرے کے اندر رکھ کر عکس لیتا۔ پھر گیلک ایسڈ میں اس پلیٹ کو دھوتا اور فالتو چاندی کو سوڈا ہائپو سلفائٹ میں دھو لیتا جس سے تصویر پختہ ہو جاتی تھی۔ اس عمل سے بہت عمدہ اور خوبصورت تصاویر بنتی تھیں۔ اور موجودہ زمانے میں جتنے عمدہ لائن بلاک بنتے ہیں۔ سب اسی پر بنتے ہیں۔

اگرچہ یہ ترکیب بہت عمدہ تھی۔ لیکن پھر بھی عکس لینے میں وقت بہت صرف ہوتا تھا اور تصویر اُتارنے سے قبل بہت تیاری کرنی پڑتی تھی۔ سامان اس قدر رکھنا پڑتا تھا۔ کہ ہر ایک شخص اس میں کامیاب نہ ہو سکتا تھا۔ آخر کار سنہ ۱۸۷۱ء میں ڈاکٹر میڈاکس نے کامیابی کے ساتھ خشک پلیٹ ایجاد کر کے ایک نئی صنعت اور نئے تجربات و تحقیقات کا دروازہ کھول دیا۔ اور جہاں گھنٹوں پلیٹ کو عکس دینا پڑتا تھا۔ وہاں اب صرف ایک سکنڈ سے بھی کم وقفہ میں عکس دینا ممکن ہو گیا۔

خشک پلیٹ کی ایجاد کے ساتھ ساتھ دستی کیمرے بھی عالم وجود میں آگئے اور اب محقق سیلاح۔ طالب علم کیمرہ اپنے ہمراہ رکھتا ہے۔ کیمرے نے دنیا کے تہذیب و تمدن پر جس تیزی سے اثر کیا ہے وہ ہر شخص جانتا ہے۔ ہم گھر بیٹھے ہر ملک کے رسم و رواج اور واقعات کو فوٹو کی تصاویر کے ذریعے اصل حالت میں دیکھ سکتے ہیں۔ اخبارات۔ رسائل۔ تصاویر سے مزین ہیں۔

بچوں کی کتابوں میں بہت اچھی تصاویر دی جاتی ہیں تاکہ ان کی مدد سے تعلیم میں دلچسپی کا پہلو بھی باقی رہے۔ مشکل سے مشکل سوال اس کے ذریعے حل کئے جاتے ہیں۔ فرانس امریکہ اور انگلستان میں نت نئے فیشن نکلتے ہیں۔ وہ فوٹو کی مدد سے دوسرے ممالک میں اشاعت پا جاتے ہیں۔ ادبی رسائل جو مہذب دنیا میں شائع ہوتے ہیں ان میں سے کوئی بھی ایسا نہیں ہے۔ کہ اعلیٰ سے اعلیٰ تصاویر سے مزین نہ ہو جس سے نہ صرف مضمون نگار کے مضمون کی حیثیت دوبالا ہو جاتی ہے۔ بلکہ ناظرین کی آنکھوں کے سامنے ایک سماں بندھ جاتا ہے۔ اس بات کا تجربہ بچوں پر اچھی طرح سے کیا جا سکتا ہے۔

آپ دیکھیں گے کہ جو تصاویر اکثر بازار میں کھینچی جاتی ہیں وہ رسائل اور اخبارات میں شائع نہیں ہوتیں۔ اس کے کئی وجوہ ہیں اوّل جو تصاویر بازار میں اُتروائی جائیں اگر وہ اخبارات میں لگائی جائیں تو خرچ بے انتہا ہو گا۔ اس لئے ایسی ترکیبیں سوچی گئی ہیں جن سے کم خرچ پر بہترین تصاویر زیادہ تعداد میں چھپائی جا سکتی ہیں۔ یہ تصاویر بلاک پر سے چھاپی جاتی ہیں۔ بلاک دو قسم کے ہوتے ہیں۔ ایک لائن بلاک کہلاتے ہیں اور دوسرے ہاف ٹون لائن بلاک عموماً جست کے پلیٹ پر بنائے جاتے ہیں۔ اور چونکہ ان میں لکیریں ہوتی ہیں۔ اس واسطے پورے طور پر سفیدی۔ سیاہی اور سایہ ظاہر نہیں ہو سکتا۔ دوسرے بلاک ہاف ٹون ہوتے ہیں جن میں سایہ سفیدی اور سیاہی باریک جالی سے بنائے جاتے ہیں اور تیسرے رنگین تصاویر کے بلاک جو اگرچہ ہاف ٹون ہی ہوتے ہیں مگر ایک عجیب ترکیب سے تین رنگوں کے شیشوں میں سے رنگ پھاڑ کر بلاک تیار کئے جاتے ہیں اور جب تینوں رنگ چھاپے جائیں تو تصویر مکمل ہوتی ہے اس سے یہ نہ سمجھا جائے کہ بلاک کی بنوائی چھپائی کا خرچ بہت کم ہوتا ہے ادبی دنیا کا ایک رنگ کا بلاک تیس چالیس روپے سے کم میں تیار ہوتا ہو گا۔ اور رنگی تصویر پر اس سے تگنا خرچ ہوتا ہے چھپائی اور کاغذ الگ رہا۔ اس سے اندازہ لگائیے کہ ملک کے فائدہ کیلئے ادبی دنیا کس قدر اخراجات برداشت کر کے جاری کیا گیا ہے

(سمیع اللہ)

ذمہ داری کا احساس

تمہارے متعلق کچھ فرائض ہیں اُن کا پورا کرنا کچھ تمہارا فرض ہے تمہارے لئے کچھ حدود مقرر ہیں اُن سے تجاوز کرنا ظلم ہے۔ تمہارے لئے کچھ قوانین ہیں اُن کی خلاف ورزی کرنا ناانصافی ہے

(حضرت علیؓ)

ہماری اصلاح

میرے پاس یہ یقین کر لینے کے کافی وجوہ موجود ہیں کہ ہماری اصلاح کا دار و مدار ہمارے ارد گرد کے حالات کی اصلاح پر ہے۔

(جلال الدین دمشقی)

نیکی

میں اس کی کوئی وجہ نہیں پاتا کہ نیک کاموں کے اختیار کرنے میں سستی یا تاخیر کی جائے۔

(جلال الدین دمشقی)

مشرق و مغرب

مشرق اپنے ماضی کے فخریہ تذکروں میں گرفتار رہتا ہے۔ اور مغرب اپنے مستقبل پر غور کر کے ترقی کی راہیں دریافت کرتا ہے۔

(المرشد العزبی)

اوّلین محبّت

اس سے میری ملاقات لڑکپن میں ہوئی تھی لیکن لڑکپن سے بے فکری اور حماقت کا وہ زمانہ مراد نہیں جب نوجوان دل زندگی کی مسرتوں کا لطف اٹھانے پر تلا ہوتا ہے۔ بلکہ آپ لڑکپن کے الفاظ سے سترہ سال کے اس نوجوان لڑکے کا تصوّر کیجئے جو زندگی کا آغاز نہایت متانت اور سنجیدگی کے ساتھ کرتا ہے۔ دورِ حاضرہ کا نوجوان جو ایام رفتہ میں شاید اپنے ہم عمروں کی محفل کا ایک بے ہوش و خرد فرد ہوتا ہمارے زمانے میں اگر اس کا تمام وقت خود آرائی اور خود پسندی میں صرف نہیں ہو جاتا اور وہ ابھی اپنی شخصیت کے احساس سے قطعاً ناآشنا ہے فکرمند اور متین و سنجیدہ ہوتا ہے اور اس کے دل میں افق پر طلوع ہونے والے ہر واقع کے لئے احترام ہوتا ہے۔ اس کی متانت اور سنجیدگی اس کی عمر سے کہیں زیادہ ہوتی ہے۔ اس کی ذہن کی فضائیں۔ اس کے مطالعے اور مستقبل کے خیالات، اور خدا، فطرت اور فلسفہ کے تصورات سے لبریز ہوتی ہیں۔ وہ نوجوان ہوتا ہے لیکن وہ زندگی کے اہم مسائل پر غور کرتا ہے۔ اس کی ہموار پیشانی خیالات سے پُرشکن اور اس کی طفلانہ نگاہوں میں استفسار کی ایک جھلک ہوتی ہے۔ اس کے نوجوان ہونٹ جن پر ابھی روئیں تک نمودار نہیں ہوتی اس مسکراہٹ سے قطعاً ناآشنا ہوتے ہیں۔ جو اس عمر کو فطرت کی طرف سے عطا کی جاتی ہے۔ اور چونکہ وہ زندگی کے اہم مسائل کا فیصلہ نہیں کر سکتا۔ اس لئے وہ ایک ناقابل بیان اضطراب محسوس کرتا ہے۔ وہ پہلی بار اضطراب محسوس کرتا ہے اور اس کی رُوح میں درد و کرب کی ایک تڑپ ہوتی ہے۔

اس کی رُوح ایک بھولے ہوئے شاعر ایک فنافی الذات صوفی ایک خالق جذبات مصوّر، ایک فلسفی، ایک سیاست دان اور ـــــ ان عام نوجوانوں کی بھیڑ میں کھوئے ہوئے شخص کی رُوح ہوتی ہے۔ جو اعتدال پسند ہو کر مفید شہری بنجاتے ہیں۔ لیکن ان تفکرات اور سوچ بچار اور خیالات کے درمیان جو وہ بہت بلند، عمیق اور دقیق نکات کے متعلق رکھتا ہے۔ اور خدا، کائنات اور فطرت کے ان متفکر کُن تصورات کے درمیان ایک خوش رنگ مقدس پھول کھلتا ہے اور وہ اس کی اولین محبت ہوتی ہے۔

ہم دونوں کی عمر سترہ سال کی تھی۔ ہم ایک دوسرے سے بہت کم ملاقات کرتے تھے لیکن جب ہماری نگاہیں ملتی تھیں ہم دل میں محبت اور ہمدردی کی لہر محسوس کرتے تھے۔ ہمیں ایک دوسرے پر اعتماد تھا۔ ہم نوعمری کی تمام تر متانت اور حد سے زیادہ متین نوجوانوں کی تمام تر فکرمندیوں کے ساتھ اپنی ان مشکلات کا تذکرہ کرتے تھے کہ لوگوں کی کیا حالت ہے اور خدا ہے یا نہیں۔ ہم اپنی اولین محبت کے متعلق خاص طور پر باتیں کرتے۔ یہ وہ ایام تھے جن پر لعد میں ہمیں ہنسی آتی ہے۔ اور وہ خیالات، تصوّرات، شکوک اور جھجک جن کا بعد میں ہم مذاق اُڑاتے ہیں۔ اولین محبت جسے ہم لعد میں حماقت کہا کرتے ہیں۔ آہ جب ہماری عمر سترہ سال تھی یہ باتیں کسقدر اہم اور کسقدر شاندار تھیں!

اس نے مجھ سے اپنی اولین محبت کا خاص طور پر ذکر کیا۔ اس نے مجھے بتایا کہ اس کی محبوبہ کی عمر سولہ سال ہے۔ اس کے بال نہایت خوبصورت ہیں۔ اور موٹی لٹیں کمر تک لٹکتی رہتی ہیں۔ وہ گلابی جرابیں اور دلکش نیلگوں رنگ کا سایہ پہنتی ہے۔ اکثر اوقات وہ سفید قمیص اور سفید ساڑھی میں ملبس ہوتی ہے۔ اور اس کی بھوری بھوری سنہری زلفیں رخساروں کو بوسہ دیتی ہوئی اس کے متناسب کاندھوں پر آپڑتی ہیں۔ اس وقت اس کی سادگی اور بھی دلفریب اور دلاویز ہو جاتی ہے۔

لیکن اس کی محبوبہ کی رعنائی اور حسن عالم فریب کے اس بیان نے مجھے چنداں متاثر نہ کیا۔ میرا دل اسکو اپنی اولین محبت کا حال سنانے کے لئے بےتاب تھا۔ میرا خیال تھا میری محبوبہ زیادہ حسین و جمیل اور پُروقار ہے۔ لیکن چونکہ میرا دوست نہایت ذوق و شوق اور گرمجوشی کے ساتھ گفتگو کر رہا تھا میں نے قطع کلام کرنا مناسب نہ سمجھا۔ لیکن میں دل ہی دل میں خیال کرتا رہا کہ وہ کسقدر ظاہر پرست ہے اس نے اپنی محبوبہ کی رُوح کے متعلق مجھے کچھ بھی نہیں بتایا کہ وہ حلیم الطبع ہے یہ شعلہ مزاج اس کے دل میں محبت آگیں جذبات ہیں یہ نفرت آمیز؟ انداز شوخ و شریر ہیں یا شرم آگیں؟ کیا کبھی اس نے اس کے ساتھ رقص کیا ہے اور ٹینس میں اس کا شریک ہوا ہے۔ دیگر ہم عمروں کے ساتھ وہ اسے لیکر مال روڈ کی سیر کر آتا ہوگا لیکن میں جاننا چاہتا تھا کہ باغ کی سایہ دار روشوں کی نا ٹوٹنے والی تنہائی

میں جبکہ سڑک پر موٹروں کی آواز محویت میں سنائی نہیں دیتی۔ گھاس کے زمرّدیں صوفوں پر بیٹھ کر کبھی اس نے اظہار تمنا بھی کیا ہے۔ اس حالت میں کہ اس کی محبوبہ نے شرماتے ہوئے اپنا سر اس کی چھاتی پر رکھ دیا ہو۔ جس کی بے طرح دھڑکن سے اس کے نازک جسم میں ایک برقی رو دوڑ گئی ہو اور اس کے رخسار اور بھی تمتما اٹھے ہوں۔

لیکن وہ اس کے ظاہری حسن و جمال کی تعریف اس فریفتگی اور ذوق و شوق سے کر رہا تھا کہ لارنس گارڈن کی ایک سرد اور سایہ دار روش پر ٹہلتے ہوئے میں قطع کلام کرنا چاہتا تھا۔ لیکن وہ اسکی ہرن کی سی سیاہ آنکھوں۔ بھورے سنہرے بالوں، اس کی مسکراہٹ اور اس کی مستانہ خرامی کی تعریف میں اسقدر محو تھا گویا دنیا میں صرف وہی ایک شانزدہ سالہ دیوی ہے جس کا وہ شباب کی تمام تر اہمیت کے ساتھ عقیدت مند پجاری ہے۔ لیکن لارنس گارڈن کی "وادیٔ کشمیر" کے مغربی پہلو کی روش کے موڑ پر "شیشے کٹے کلک رے" کے قریب جہاں سے ایک اور معطر روش شروع ہوتی ہے اُس نے اچانک میرا بازو پکڑا اور کہا۔

"وہ ہے میری محبوبہ!"

میں نے دیکھا وہ واقعی حسین تھی اس کے ساتھ ایک بوڑھی آتون یا شائد کوئی رشتہ دار اور اس کی چھوٹی بہن تھی۔ بوڑھی عورت کا رنگ قدرے سفید تھا شکل و صورت شائد جوانی میں دلکش ہو لیکن اسوقت چہرہ اسقدر مکروہ اور نفرت سے بھرا تھا کہ اسے دیکھکر میرا دل لرز گیا۔ چھوٹی بہن کے انداز بہت پیارے تھے اس کا رنگ ذرا سیاہی مائل تھا۔ اور آنکھوں میں شرارت آمیز شوخی، انداز میں طفلانہ چلبلاہٹ۔ وہ ہلکے زرد رنگ کا فراک پہنے ہوئے تھی جو اُسے بہت پیارا لگتا تھا۔ چھوٹے سیاہ بال ہندوستانی طرز پر گندھے ہوئے تھے لیکن موجودہ زمانے کی روش کے مطابق اس کی مانگ ترچھی تھی اور ذرا سی چوٹی پشت پر دونوں کندھوں کے درمیان پڑی تھی جسے وہ شوخی سے کبھی کبھی اس طرح پکڑتی کہ اس کی نازک کلائی گول سڈول کندھے کے مقابل ہو کر ایک کمان کی صورت اختیار کر لیتی —— اور بڑی بہن؟ وہ اپنے اسی بوڑھی ہوئی سے سفید اور بے داغ لباس میں ملبوس تھی اور اس کی مستانہ اور متعلق چال میں ایک دلفریبی تھی۔ بالکل مرلیل کی سی چال! بال نہایت خوبصورت اور آنکھیں نہایت سیاہ لیکن میرا خیال ہے اس کے چہرے پر کچھ بے اعتنائی اور غرور و تکبر کے جذبات نمایاں تھے اور میں حیران تھا کہ جب ہم اُسے سلام کریں گے یا دور سے ہوا میں رومال ہلائیں گے تو وہ اس کا جواب بھی دیگی یا نہیں۔

میں جیب سے اپنا رومال نکالکر سر سے بلند کر چکا تھا کہ یکایک یہ دیکھکر میری حیرت کی کوئی انتہا نہ رہی کہ وہ ہماری طرف دیکھنے کی بجائے کسی اور طرف دیکھ رہی ہے۔ میرے دوست کا رنگ زرد تھا وہ ساکت و خاموش کھڑا تھا اور وہ اپنی "محبوبہ" کے حضور میں سر تک نہ جھکا سکتا ہے —— اس کی چھوٹی بہن نے بے خیالی سے ایک شوخ نظر مجھ پر ڈالی اور اس پیاری لڑکی کی محبت کے معصوم جذبات میرے دل میں پیدا ہو گئے —— ہم گذر گئے۔

میرے دوست کا رنگ اب بھی زرد تھا اور وہ صاف گھبرایا ہوا معلوم ہوتا تھا۔ میں نے کہا:-

"تم اپنی محبوبہ کو سلام نہیں کرتے؟"

اُس نے اپنی نگاہوں کی تمام تر معصومیت کے ساتھ مجھے دیکھا' ان نگاہوں کے ساتھ جو دوسرے اوقات میں زندگی کی باریکیوں اور گہرائیوں میں غرق ہو جاتی تھیں اور لرزتی ہوئی آواز میں جو طفلانہ ناتجربہ کاری کی وجہ سے بار بار رک جاتی تھی کہا "لیکن میں تو اس سے واقف نہیں —— .... میں اسے صرف دیکھتا ہوں......... تقریباً ہر روز یہاں ہی .... اسی معطر روش پر ...."

یقین مانئے میں نے قطعاً اس کا تمسخر نہیں اُڑایا۔ یاد رکھئے کہ میں نوجوان تھا اور یہ زندگی کے وہ ایام ہیں جن میں کسی چیز .... خدا ہے اور .... ہماری اولین محبت وغیرہ .... پر تمسخر نہیں اُڑایا جاتا۔ بلکہ انہیں خوفناک متانت کے ساتھ تسلیم کر لیا جاتا ہے۔ اس اولین محبت کو بھی جس سے ہم آشنا نہیں ہوتے .... نہیں میں نے قطعاً تمسخر نہیں اڑایا۔ بلکہ نہایت دلچسپی کے ساتھ اس کے ان تمام جذبات و حسیات کا مطالعہ کرتا رہا جنہوں نے اسے اسقدر مسرور اور مغموم بنا دیا تھا۔ آہ! .... جب میں نے اپنی اولین محبت کا اس سے مقابلہ کر کے دیکھا وہ مجھے بہت حقیر اور غیر دلچسپ نظر آئی۔ اب میں اس کے متعلق اسے کچھ بتاتے ہوئے جھینپتا تھا۔

میں اپنے دوست کا بڑا مداح تھا اور میرے دل میں اس کا احترام تھا ....

اس واقعہ کو کتنا عرصہ ہُوا ہے؟ میں نہیں جانتا۔ شاید تین یا چار —— یا شائد پانچ سال۔ مجھے اچھی طرح یاد نہیں —— لیکن کل شام طویل مفارقت کے بعد ہماری ملاقات پھر اسی روش پر

ہوئی - اب میں ایک نوعمر شاعر اور افسانہ نگار ہوں اور اپنی نظموں کا پہلا مجموعہ شائع کر چکا ہوں - وہ اس عرصہ خاکِ وطن سے دُور اطالیہ، جرمنی، اور روس میں آوارہ پھرتا رہا ہے - وہ خیالات میں اشتراکی ہے اور دُنیا کی اصلاح کرنا چاہتا ہے - وہ بے پروائی سے کپڑے پہنتا ہے - خط نہیں بنواتا - خدا کی ہستی کا منکر ہے - اس کے خیال میں میری نظمیں اچھی نہیں اور میرا خیال ہے وہ صحیح کہتا ہے - وہ کہتا ہے میرے افسانوں میں رنگینی زیادہ ہے - اور میں بہت تکلف کرتا ہوں یعنی انسانی درندوں کی خون آشامیوں کے خلاف جو الفاظ میری زبان سے دورانِ گفتگو میں نکل جاتے ہیں ان کو میں افسانہ میں ظاہر نہیں ہونے دیتا - اور یہ کہ میں دنیا کی حق تلفیوں سرمایہ داروں کے مظالم، تہذیب مغربی کے خوفناک اثرات اور قدیم مذہبی تصورات کے خلاف زبانی آواز تو اٹھاتا ہوں لیکن تحریر میں ان کے اظہار کی جرأت نہیں کر سکتا - × × × × × × یہاں شاید وہ غلطی پر ہے -

اور میرے جدید احباب جانتے ہیں لیکن باتیں کرتے کرتے مجھے اس کی خشک آواز میں وہ نازک لوچ محسوس ہوئی جس نے میرے دل پر اسقدر خوشگوار اور رُوح پرور اثر کیا تھا - اس نے اپنے دونوں ہاتھوں کو مضبوطی سے ملا کر کچھ سوچتے ہوئے سر جُھکا لیا - اور اس انداز میں اسنے پھر مجھے اپنا افسانہ الفت سنایا - اس بار اس کی محبت شدید تھی - جب میں نے اسے اس کی معطر روش والی نوعمر لڑکی کا واقعہ یاد دلایا وہ افسردگی کے ساتھ ہنسا - اس نے مجھے بتایا کہ جب وہ اصلاح کے عالم کے میدان میں قدم رکھتے ہوئے کمزوری محسوس کرتا ہے تو محبت کے یہ جذبات جنکی اب اس کے دل پر حکومت ہے اس کو تھامتے اور اس کے دل مضبوط کرتے ہیں -

اس نے اپنا افسانہ الفت بیان کیا - اور فلسفیانہ الفاظ میں اپنی محبوبہ کے حسن و جمال اس کے ناز و انداز اس کے عمیق ترین خیالات اور اس کی روحانی دلفریبیوں کی مکمل تصویر کھینچی -

میں نہایت صبر و متانت سے اس کی گفتگو سنتا رہا - لیکن اس صبر و متانت سے نہیں جس سے میں نے چند سال پیشتر اس کی حماقت آمیز محبت کی داستان سُنی تھی - میں نے اس مدح سرائی میں مداخلت نہ کی - یہانتک کہ اس نے اپنی جیبوں کو ٹٹولا اور مسکراتے ہوئے کہا:-

"یہ اسکی تصویر ہے جو میں ہر وقت اپنے دل کے ساتھ رکھتا ہوں -

اس نے تصویر میرے ہاتھ میں دی - میں نے اس کی طرف غور سے دیکھا - وہ ٹکٹکی باندھے دیکھ رہا تھا - میں نے دیکھا کہ وہ وحشی صورت نوجوان جو دنیا سے بیزار ہو چکا تھا چند سال پیشتر کا وہی سترہ سالہ لڑکا تھا جو "وادئ کشمیر" کے مغربی پہلو کی معطر اور سایہ دار روش پر سے گذرنے والی لڑکی سے محبت کرتا تھا - وہ اپنے تند لبوں پر مسکراہٹ لئے ہوئے آگے کو جھکا اور اپنی نرم اور گہری آواز میں گویا وہ کسی راز کو بیان کرنا چاہتا ہے یہ الفاظ کہے "چاہے تم مجھے احمق خیال کرو - بات یہ ہے کہ جس طرح میں نے اس سفید لباس والی بوڑھیوں کی سی متین لڑکی سے کبھی بات نہ کی تھی - اسی طرح اس حور پیکر کے حسن کا نظارہ بھی نہیں کیا جس سے مجھے اب محبت ہے - میں نے اس کی صرف تصویر دیکھی ہے اور یہ اس کی ماں کے بیان کے عین مطابق ہے جس کے گھر میں میں کچھ مہینے ایک کرائے دار کی حیثیت سے رہتا رہا ہوں - ان ایام میں یہ لڑکی ——— میں ڈاکٹری کا مطالعہ کر رہی تھی -

× - × - × - × - × - × - × - ×

× - × - × - × - × - × - × - ×

میں خاموش کھڑا تھا - میری کانپتی ہوئی انگلیوں میں تصویر تھی - یہ اسقدر خوبصورت تھی کہ میں زبان سے ایک لفظ تک نہ نکال سکا - اور میرے دل پر وہی رنگین غبار سا طاری ہو گیا جو گرمیوں کی ایک شام "وادئ کشمیر" کے مغربی پہلو پر جب میں نے یہ الفاظ سنے تھے "میں تو اس سے واقف نہیں ہوں" دھنک کے بھینے بھینے رنگوں کی مانند میرے حواس پر چھا گیا تھا -

کیا میں اس کی ہنسی اُڑا سکتا تھا؟ ہر چند میری طبیعت میں اب حقارت کے کچھ جذبات پیدا ہو چکے ہیں - اور میری نظمیں اور افسانے اس کے شاہد ہیں - لیکن وہ نفرت و حقارت ان انسانی جذبات کے لئے نہیں ہے جو ایک طلسم فریب پیدا کر کے "ایگو" کو مصروف کار کر دیتے ہیں - بلکہ وہ ان وحشی اور درندہ خصلت انسانوں کے لئے ہے جن کی زندگی انسانی خون پر ہے اور جو پیٹ کو دنیا کی کمزور ہستیوں سے بھرنا چاہتے ہیں -

آہ! ہم انسانوں کے لئے بعض مضحکہ خیز چیزیں بھی مثالی ہوتی ہیں وہ طفلانہ جذبات جو عالم شباب میں ہم مردوں اور عورتوں کے دلوں میں رہتے ہیں اکثر اوقات فطرت انسانی کے صحیح آئینہ دار ہوتے ہیں - اس شے سے محبت کرنا جو ہم سے بہت دُور ہے اور جس سے ہم اچھی طرح آشنا نہیں - فریب میں مبتلا ہو کر اپنے دل کی تمام تر پاکیزگی اور نزاکت کے ساتھ اس سے محبت کرنا اور پھر انتہائے سادگی کے ساتھ اپنے دوست کے سامنے اس کا اعتراف کرنا آسمانی حماقت کی رقت انگیز سادگی ہے جو اگر ہم سب میں نہیں تو چند کے دلوں میں ضرور ہوتی ہے - اور ان چند کی تعداد اسقدر ہے - کہ اگر وہ سب آپ کے سامنے اعتراف کریں تو آپ حیران رہ جائیں - -

× × × × !

حنیف ہاشمی

بہار اور عشق

گلاب کی شگفتگی سے زینت بہار ہے　　ہوا کی نکہتوں سے کائنات مشکبار ہے
چمن میں ایک سیل رنگ و نور بیقرار ہے　　فروغ ماہتاب سے نگاہ زرنگار ہے
نگاہ زرنگار ہے فروغ ماہتاب سے

ہجوم لالہ و سمن سے باغ جلوہ خیز ہے　　لطافت شمیم سے نسیم عطر بیز ہے
نوائے اہل درد سے فضا سرود ریز ہے　　فسانۂ شباب سے شراب نغمہ تیز ہے
شراب نغمہ تیز ہے فسانۂ شباب سے

لطافتوں کے جوش میں ہے عشق سرنگونِ غم　　بلائے اضطراب دل مصیبت جنونِ غم
نشاط زارِ زندگی پہ چھا گیا فسونِ غم　　بہار کے رباب سے ٹپک رہا ہے خونِ غم
ٹپک رہا ہے خونِ غم بہار کے رباب سے

عابدؔ

چمکا دیا ہے رنگ چمن لالہ زار نے　　شاید خزاں کو آگ لگا دی بہار نے
ہاں ہم نہ تھے فریب تمنا سے بے خبر　　کیا کہئے کیا کیا دل امیدوار نے
اپنی تو ساری عمر ہی فانی گذار دی　　اک مرگ ناگہاں کے غم انتظار نے

فانی

محبت اور اُمید

صبح کی سہانی فضا میں ایک سمندر کے ریتیلے کنارے پر "محبت" اور "اُمید" نسیم سحری کے خوشگوار جھونکوں میں کھیل رہی تھیں۔ آہستہ آہستہ سورج کی کرنیں نمودار ہونے لگیں اور رفتہ رفتہ آفتاب آسمان کی بلندیوں کی طرف جانے لگا۔

"محبت" یہ دیکھ کر وہاں سے متحرک ہوئی۔ سمندر کے بالکل کنارے جا پہنچی اور مسکراتی ہوئی اپنی کشتی میں بیٹھ گئی۔ بیچاری "امید" اکیلی سمندر کے کنارے رہ گئی۔ "محبت" نے مسکراتے ہوئے کہا "میں سمندر کی تفریح کو تھوڑی دیر کے لئے جا رہی ہوں"۔ یہ کہکر محبت نہایت مسحورکن ادا سے ہنس پڑی۔ "امید" اس مسکراہٹ سے بہت متاثر ہوئی اور اُس معصوم فطرت، دوشیزہ نے جس کو دھوکا اور جھوٹ سے دور کا بھی تعلق نہ تھا، یقین کرلیا کہ "محبت" ضرور لوٹ کر آئیگی۔

"اُمید" "محبت" کے انتظار میں سمندر کے کنارے ٹہلتی رہی اور بے چین ہوتی رہی۔

شام ہوگئی۔ آفتاب کی مدہم شعاعیں سمندر کی لہروں کے ساتھ کھیلنے لگیں اُمید ایک خواب جیسی خود فراموشی میں ریت پر کھڑی انتظار کر رہی تھی۔ وہ بار بار "محبت" کا نام ریت پر لکھتی اور بار بار سمندر کی موجیں آکر اُسے اپنی آغوش میں سمیٹ لیجاتیں۔

آخر کار سمندر میں بہت دور ایک سنہرا بادبان نظر آیا اور اُس دوشیزہ کی طرف حرکت کرنے لگا اُس نے آہ سرد بھرتے ہوئے کہا "یہ دولت کی کشتی ہے جس کا بادبان نظر آرہا ہے۔ بادبان کیسا منور ہے۔ اس کا سنہرا سمندر میں کیسا منعکس نظر آرہا ہے۔ لیکن آہ! یہ "محبت" کا بادبان نہیں"۔

"اُمید" بیچاری رنجیدہ ہوگئی —— تھوڑی دیر گذر گئی۔

دوسرا بادبان نظر آیا۔ دوشیزہ نے پھر ٹھنڈی سانس لیکر کہا "آہ! یہ تو دوستی کا بادبان ہے۔ اس کا چراغ سمندر کی لہروں میں جگمگا رہا ہے۔ اور اس چراغ کی روشنیاں بھی پرسکون ہیں۔ لیکن پیاری "محبت" کی شمع کی تنویریں بہت زیادہ پرسرور، روشن اور پرسکون تھیں۔ مگر افسوس وہ کہاں؟"

تھوڑی دیر اور گذر گئی۔

تمام خلا، وملا، سطح سمندر اور ریگستانوں میں رات نے اپنا سیاہ خیمہ تان دیا سنہرے اور سرخ بادبان نظروں سے اُوجھل ہوگئے۔ اُمید کے رنگین اور طربناک خواب بیداری میں تبدیل ہوگئے۔

"محبت" پھر کبھی واپس نہ آئی۔

(ترجمانہ انگریزی)

محشر عابدی

مدیر "پروانہ"

عشق

عاشق، انسان کامل، کمال وجمال کا متلاشی ہے۔ عاشق روحانیت اور معنویت کے اُس بلند مرکز پر ہوتا ہے۔ جہاں دوسرے لوگ نہیں پہنچ سکتے۔ اس عالم سے اوپر ایک اور عالم ہے وہ عالم روحانی ہے اور پاک روحوں کا مسکن ہے وہاں روحانیت معنویت اور عشق کی تجلیاں ہیں اور بس۔

عشق کے لئے تجسس کا سودا اور جستجو کا جنوں لازمی ہے۔ جہاں عشق ہے وہاں جستجو ہے اور جہاں جستجو ہے وہاں عشق ہے۔

عشق مختلف مناظر میں مختلف رنگوں میں ظاہر ہوتا ہے۔ کبھی حقیقت کی تجلی گاہ میں ضیاء افگن ہوتا ہے اور کبھی مجاز کے پردوں سے چھن کر باہر نکلتا ہے۔ اور ایک عالم کی آنکھوں کو خیرہ کر دیتا ہے۔

عشق خواہ کسی رنگ میں ہو اور کسی جگہ ہو اس کا مرکز ایک ہی ہوتا ہے۔ عشق حقیقی ہو یا مجازی۔ مادی ہو یا روحانی۔ دائمی ہو یا وقتی وہ نور ہے جو ایک ہی روشنی کا پرتو ہے۔

(فارسی)

ترقی اُردو

بدقسمتی سے برادران ہنود میں فی زمانہ یہ خیال عام ہے کہ زبان اردو کو مسلمانوں کے ساتھ خصوصیت حاصل ہے اور اسی بنا پر مصنوعی قسم کی ہندی اختراع کرنا چاہتے ہیں جس کے الفاظ اردو سے بالکل علیحدہ ہوں حقیقتاً جس زبان سے اُردو پیدا ہوئی ہے اُس زبان کی ساخت بلحاظ صرف و نحو کے ہندی زبان ہے اور اُس کو مسلمانان زمانہ مغلیہ نے اس ملک میں عام بول چال کے لئے اختیار کر لیا تھا۔ ابتداً اس میں اور معمولی ہندی میں جو ہنود بولتے تھے مشکل سے امتیاز کیا جا سکتا۔ گو اس زبان میں مذہبی اور انتظامی اصطلاحات فارسی اور عربی سے ماخوذ تھیں۔ اگر قدیم مسلمان شعرا مثلاً ملک محمد جائسی کی تصانیف کو بغور دیکھا جائے تو معلوم ہو گا کہ مذہبی اصطلاحات میں بھی ہندی الفاظ شامل کرنے کی کوشش کی گئی تھی۔ لیکن جتنی ترقی ہوتی گئی اُتنا ہی یہ امر ناگزیر ہوتا گیا کہ مذہبی۔ ملکی۔ فوجی اور انتظامی اصطلاحات فارسی۔ عربی۔ اور ترکی زبانوں سے یکسر شامل کی جائیں۔ اس لئے کہ یہ باتیں ان مختلف الاقوام مسلمانوں کی تھیں جن کی حکومت ہندوستان میں تھی۔

زمانہ سابق میں اُردو زبان نسبۃً غیر زبانوں کے الفاظ سے پاک تھی صرف جہاں ناگزیر ضرورت لاحق ہوئی ایسے الفاظ لے لئے گئے۔ اس کی نظیر انگریزی زبان کی ترقی میں بھی ملتی ہے، اس لئے اس زبان میں بھی ایسی ہی ضرورت سے نارمن الفاظ سیکسن الفاظ کے ساتھ شامل کئے گئے جب تک صرف ایسے ہی بیرونی الفاظ شامل کئے گئے جن کی اشد ضرورت پائی گئی اس وقت تک زبان کا نشو و نما صحت کے ساتھ ہوتا رہا، اور اس کے خلاف کوئی خاص اعتراض نہیں ہوا۔ شعرائے ریختہ مثلاً نذیر کا یہ خاص فخر تھا کہ ایسی آسان اصطلاحیں لکھی جائیں جو حتی الامکان عوام الناس کی بول چال سے قریب تر ہوں۔

انیسویں صدی کے شروع میں ہندوستان میں پھر ایک انقلاب پیدا ہوا۔ انگریزی حکومت میں مسلمانوں کے قواعد و ضوابط کی بجائے انگریزی یا ہندی قواعد و ضوابط رفتہ رفتہ داخل ہونے لگے جس کا اثر ہندوستان کی زبانوں پر کافی طور سے پڑا۔ قبل ازیں سرکاری دفاتر و اسناد و بین الاقوامی اور دستاویزوں میں نیز قانونی عدالتوں میں ہر جگہ فارسی زبان مروج تھی۔ اس کو اپنے اعلیٰ درجہ سے رفتہ رفتہ اُتار دیا گیا۔ آخر کار عہد انگلشیہ میں اس کی جگہ انگریزی زبان کو دی گئی۔

ہندوستان کی مروجہ زبانوں میں اُس وقت الفاظ کا ایسا سلسلہ موجود نہ تھا جن کا سلسلہ درباروں، عدالتوں اور سرکاری دفاتر میں آسانی ہو سکتا ہو۔ ہند کی قدیم زبان سنسکرت سے ایسے الفاظ دستیاب ہو سکتے تھے۔ مگر یہ زبان مردہ زبان تھی۔ فارسی کو جب سرکاری زبان کے عہدہ سے معطل کیا گیا تو ہندوستان میں وہ بھی مردہ زبان ہو گئی مستشرقین مثلاً سر ولیم جونس اور اُن کے احباب نے جو اراکین ایشیاٹک سوسائٹی بنگال تھے یہ کوشش کی کہ دیسی زبانوں کی تعلیم کے ذرائع پیدا کئے جائیں اور اس کے ساتھ سنسکرت فارسی اور عربی قدیم زبانوں کی بھی تعلیم دی جائے۔ وارن ہیسٹنگز اور دیگر مدبران ملک نے ان ہر دو اغراض کے لئے بہت سا روپیہ عطا کیا اور ذی علم پنڈتوں اور مولویوں کی حوصلہ افزائی کی کوشش کی مگر ہمیں اس بات کو ماننا پڑے گا کہ جن ذی علم پنڈتوں اور مولویوں کے حوصلے بڑھانے کی کوشش کی گئی دراصل وہ محدود النظر اور کوتاہ بین عالم تھے اور ان کی تصانیف میں یہ نقص ضرور پایا جاتا تھا کہ علم کی گُر بندی نے اُن کو زمین کی پستی تک پہنچا دیا تھا۔

علاوہ بریں یہ بھی خطرہ پیدا ہوا کہ قانونی کتابیں متعلق شرع و دھرم شاستر اور نیز ہندوؤں و مسلمانوں کا قدیم علم الادب دونوں ایسے عالموں کے مردہ علم کے بوجھ سے غرق ہونے لگے۔ مگر حسن اتفاق سے یورپ کے بعض ایسے وسیع النظر ذی علم افراد سے ہمیں بڑی مدد ملی جنہوں نے ہمارے قدیم علوم کو فنا ہونے سے بچا لیا۔ بطور مثال مصنفین اور مدبرین مثلاً سر ولیم جونس و ہملٹن و مین کے نام قابل ذکر ہیں اور دیگر مستشرقین مثلاً سر ولیم جونس ممدوح الصدر و آوسٹلے و میکس مولر کے نام بھی قابل فراموشی نہیں ہیں۔ اُنہوں نے ہند کے عُلوم کو پڑھا اور اُنہیں کی بدولت قدیم آریہ زبان کے علوم حاصل کرنے کا آغاز اور اُس کی ترقی ہوئی اور اہل ہند اور اقوام یورپ کے متحد الاصل ہونے کا ثبوت ملا۔ ہر چند اُن کی تصانیف میں سے بعض ابواب غیر صحیح ثابت ہوئے ہیں مگر تاہم اُنہوں نے جس خوبی و اعلیٰ دماغی قابلیت سے رہنمائی کی ہے اُس کا ہم کو تہ دل سے شکریہ ادا کرنا چاہیے۔

ملکی زبانوں کی ترقی میں ان صاحبوں کی امداد اُس قدر دستیاب نہ ہو سکی جس قدر قدیم زبانوں میں حاصل ہو سکی۔ ہندو اور مسلمان علما جو فورٹ ولیم کالج یا مدرسہ کلکتہ یا بنارس کی درسگاہ سنسکرت میں بلائے گئے تھے، وہ ایسے عالم تھے جو ہند کے قدیم علمی طریقہ میں غرق تھے جن کو وہ قدیم علمی طریقے سمجھتے تھے جب

اُن کو ملازمین ایسٹ انڈیا کمپنی کے مطالعہ کے لئے ہند کی دیسی زبانوں میں کتب درسیہ مرتب کرنے کا حکم ہوا تو اس کام کی انجام دہی میں بدقسمتی سے اُنھوں نے اپنے پرانے خیالات پر عمل کیا جس کا نتیجہ زندہ علمی زبانوں کے حق میں مضر ثابت ہوا۔ ہر چند انگریزوں کا یہ مقصد نہ تھا کہ ملکی زبانوں میں اور زبانوں کی تقلید کی جائے۔ لیکن ان علماء کے نزدیک عوام الناس کی مادری زبانوں کی کوئی عظمت نہ تھی تاہم حسب الحکم اُن کو ایسی ہی ملکی زبانوں میں کتابیں تیار کرنی پڑیں اس لئے اُنھوں نے کتابیں ایسی زبان میں نہیں تیار کیں جو عام لوگوں میں فی الواقع بولی جاتی تھیں، بلکہ اپنے ہی خیالات کے موافق زباندانی کے قواعد پیدا کئے جن سے اپنا علم نمایاں ہو۔ ہندو پنڈتوں نے سنسکرت سے بے انتہا الفاظ دیسی زبانوں میں بھر دیے اور مولویوں نے بھی عربی و فارسی سے ایسا ہی کام لیا۔

اس طریقہ کا خاص اثر بنگالی اور ہندوستانی (یعنی اُردو) ان دو زبانوں پر پڑا۔ بنگالی زبان بالکل سنسکرت کے الفاظ اور محاوروں سے معمور ہو گئی اور اُنہیں کا رواج زمانۂ حال تک رہا۔ حال ہی میں بنگالی ڈراما اور بنگالی اخبار۔ اور بنگالی شاعری اور قصہ نویسی کے جدید اساتذہ نے کوشش کی ہے کہ اس رواج کو مٹایا جائے اور عوام الناس کی اصلی زبان سے علمی زبان بھی قریب تر کر دی جائے ہندوستانی زبان میں ایسے قدیمانہ عمل سے اقوام ہنود و مسلمانوں کے مابین ایک ایسا بُرا اثر پیدا ہوا جو ہنوز اظہر من الشمس ہے۔

سنسکرت کے ماہر پنڈتوں نے ایک ایسی مصنوعی ساخت کی ہندی زبان پیدا کی جس کو صرف ذی علم سنسکرت داں ہی سمجھ سکتے ہیں۔ ادھر مولویوں نے اُردو کی ایسی فارسی آمیز بولی پیدا کی جس کو صرف فارسی کے اچھے جاننے والے ہی سمجھ سکتے ہیں۔ اس طریقہ پر ان ممالک میں دو مختلف قسم کی زبانیں ترقی پانے لگیں، حالانکہ لوگوں کی مادری زبان ایک ہی ہے گو مختلف اضلاع کے خفیف اختلافات ضرور موجود ہیں۔ بہاری لال کے ستّئی جو مشہور ہیں اُن کی پر صنائع ہندی دراصل پنڈو ہندی ہے۔ مگر جو پر تصنع ہندی کی تصانیف انیسویں صدی عیسوی کے آخر میں شائع ہوئی ہیں وہ درحقیقت اکثر ایک قسم کی غیر مانوس سنسکرت کتابیں جو ہندی لباس میں جلوہ گر ہیں اسی طرح سودا کی پر صنائع اردو کم سے کم فصیح اُردو ہے۔ مگر وہ اُردو شاعری جس کے متعلق مولینا حالی نے صدائے مخالفت بلند کی ہے دراصل ایک قسم کی فارسی ہے جو اُردو کے جامہ میں ملبوس ہے۔

اُردو و ہندی کے باہمی امتیاز پر اس قدر قوت صرف کی گئی ہے کہ اب اُن کا سابقہ حالت پر واپس آنا ممکن نہیں میں نے اوپر ثابت کیا ہے کہ اس معاملہ میں قصور صرف ایک قوم کا نہیں ہے، بلکہ دونوں قوموں کا ہے۔ اب ہم صرف اس قدر کر سکتے ہیں کہ حالت موجودہ پر غور کر کے اُن لوگوں کا جو اُردو زبان کے عادی ہیں لحاظ کریں اور زبان اُردو کو ترقی دیں۔ بارے قومی اُردو علم الادب کے مایۂ ناز کئی مشہور اساتذہ قوم ہنود سے گذرے ہیں اور موجود ہیں مشہور ہندو مصنفان اُردو کی طویل فہرستیں شائع ہو چکی ہیں منجملہ اُن کے بڑے لائق و فائق پنڈت رتن ناتھ سرشار لکھنوی کے نام سے ہر شخص واقف ہے۔ اُردو کے تذکروں میں سب سے جامع تذکرہ لالہ سری رام دہلوی کا شائع ہو چکا ہے۔ اردو کا ایک ممتاز علمی رسالہ کانپور سے منشی دیا نرائن نگم ایڈیٹر زمانہ شائع کرتے ہیں ان صاحبوں کے نام لینے سے میرا مقصد یہ ہے کہ بخوبی روشن ہو جائے کہ اُردو زبان اور اُردو علم الادب کی قدر اور ترقی مسلمان صاحبوں کے علاوہ ہندو صاحبان بھی کر رہے ہیں لہٰذا اُردو کا مسئلہ صرف ایک قوم کا مسئلہ نہیں ہے بلکہ اہلِ اسلام اور ہنود دونوں کا مشترک مسئلہ ہے۔ ہمارے اختیار میں ہے کہ ہم اُردو اخبار و اہل علم و شعراء کو ترغیب دیں کہ وہ عام فہم خیالات پر زیادہ رجوع ہوں اور ان ممالک کے عام تعلیم یافتہ اصحاب کی زبان اور خیالات کا صحیح اندازہ کریں۔

بعض اوقات اُردو ہندی کے مسئلہ کو اس پیرایہ میں دکھلایا جاتا ہے کہ گویا یہ حروفِ فارسی و حروفِ ناگری کے درمیان تنازع ہے۔ کہا جاتا ہے کہ ہندوستانی زبان کے لکھنے کے لئے سب سے بہتر حروف ناگری کے ہیں۔ اس لئے کہ اس بولی کا خاکہ ہندی کا ہے۔ مگر اُردو یا ہندوستانی دراصل ایک مخلوط زبان ہے، قدیم سے قدیم ہندی کو دیکھا جائے، مثلاً چند بردائی کے اشعار، تو واضح ہو گا کہ اُن میں بھی فارسی اور عربی الفاظ مخلوط ہیں آجکل اگر ٹھیٹھ ہندی بولنے والے گنواروں کی زبان پر غور کیا جائے کم سے کم پندرہ فی صدی فارسی و عربی الفاظ مخلوط برآمد ہوں گے اور شہروں اور قصبوں میں اس سے زیادہ ایسی زبان کے لئے ناگری حروف ہرگز بے نقص ثابت نہوں گے۔ خالص عربی حروف بھی ہندی کے تلفظ کو ادا کرنے کے لئے کافی نہیں ہیں مگر اردو حروف بعد ترمیم و اضافہ عربی اور فارسی حروف کے برآمد کئے گئے ہیں۔ نتیجہ یہ ہے کہ موجودہ اُردو حروف اُردو زبان کے اغراض کو پورا کرنے کیلئے بہتر خدمت ادا کرتے ہیں۔ عام زبان کے حامی اگر اس امر پر اصرار کریں کہ ناگری حروف ہی مستعمل کئے جائیں اور موجودہ حروف اُردو معدوم کئے جائیں تو اُن کی منطقی اور عملی پہلو سے تقویت نہیں مل سکتی۔ مانا کہ منجملہ اُردو حروف کے دو تین حروف ایسے ہیں جن میں کچھ خفیف ترمیم مفید ہو گی خصوصاً حروف علت اُردو طرز تحریر میں بھی بہت سے امور قابل اصلاح ہیں۔ حروف علت کے جہاں جہاں مختلف تلفظ ہیں وہاں ہر تلفظ کے لئے مختلف شکل ہونا لازمی ہے اور ہجا اور املا میں پابندی قاعدہ اور یکسانیت ہونی چاہئے تحریر بھی صحیح اور غیر مشکوک ہونی چاہئے تحریر یا چھاپے کو جلد پڑھے جانے کیلئے ہر قسم کی امداد ایجاد کرنی چاہئے اور چھپائی کی خوبصورتی مدنظر رکھنی چاہئے تھوڑا ہی عرصہ ہوا کہ میں نے ایک مختصر رسالہ اُردو کی صحت تحریر کی بابت شائع کیا تھا۔ اگر

ایسے مشوروں پر عمل کیا جائے، تو اُردو کے ہر حرف کو، خواہ حرفِ علت ہو یا حرفِ صحیح ٹھیک طور پر لکھنا اور تلفظ کرنا آسان ہو سکتا ہے۔

گو اُردو کا مسئلہ کسی خاص مذہب و ملت کا مسئلہ نہیں ہے۔ تاہم یہ ضرور ہے کہ اہلِ اسلام سے اس کا بہت گہرا تعلق ہے۔ بعض مقامی مستثنیات کو قطع نظر کرکے اُردو تمام سلطنتِ ہند کے مسلمانوں کی اُتر سے لیکر دکن تک اور پورب سے لیکر پچھم تک عام زبان ہے۔ علاوہ اس کے دیگر اسلامی ممالک میں بھی اُردو سے دلچسپی پیدا ہو رہی ہے لہذا ہندوستان کی عام زبان کیلئے اُردو کا حق بہت زیادہ ہے۔ قابل افسوس ہے کہ سر انٹنی میکڈانل کے (جو اَب لارڈ میکڈانل ہیں) زمانے میں اُردو تحریر پر جو حملہ کیا گیا اور جن خیالات کا اظہار ہوا۔ اُن کی وجہ سے اُردو کو بہت کچھ صدمہ پہنچا۔

ہر انجمن اُردو کا فرض ہے کہ اعلیٰ حضرت حضور پُر نور نظام دکن نے اُردو کو جو فوقیت اور عزت بخشی ہے، اُس کا اعتراف کرے۔ اُنھوں نے اُردو کو اپنی عثمانیہ یونیورسٹی میں ایسی جگہ دی ہے جو ہند کی کسی زبان کو کسی دوسری یونیورسٹی میں اب تک میسر نہیں ہوئی۔ عثمانیہ یونیورسٹی میں اردو ذریعہ تعلیم قرار دیا گیا ہے۔ حیدر آباد میں دار الترجمہ کا مقصد اعلیٰ یہ ہے کہ عمدہ چھپائی اور عمدہ تصنیف کی ہوئی کتابیں سائنس اور علم الادب کے متعلق اُردو زبان میں شائع ہوں اور اہلِ ملک کیلئے اس زمانہ کے جدید علوم و فنون بآسانی حاصل کرنے کے اسباب مہیا کئے جائیں۔

ہر انجمن کو جس کا مقصد کام کرنا ہوتا ہے لازم ہے کہ ایک مقرر پروگرام میں سے محدود و منتخب حصص خاص خاص اراکین کے ذریعے سے پورا کرنے کی کوشش کرے۔

اُردو کے علم عروض کی تنقیح تاریخی طور پر ہونی چاہیئے۔ دریافت سے معلوم ہوگا کہ ابتداءً اردو شعرا اکثر ہندی وزنوں کا بھی استعمال کیا کرتے تھے۔ رفتہ رفتہ فارسی اور عربی زبانوں کا رواج ہوتا چلا گیا اور اب وہ صرف چند محدود وزنوں پر اکتفا کرتے ہیں۔ شعر کے اصناف اور مضامین بھی بہت محدود ہو گئے ہیں۔ قافیہ و ردیف کے مروج قوانین سے نظم کا یہ حال ہو گیا ہے کہ گویا ایک جادوگر الفاظ سے کھیلتا ہو۔ بے قافیہ نظم کی آزادی کا اُردو میں کبھی تجربہ نہیں ہوا۔ حالانکہ دنیا میں بلند سے بلند نظمیں خواہ یونانی خواہ لاطینی خواہ انگریزی خواہ سنسکرت زبان کی ہوں۔ بغیر قافیہ کے مختلف وزنوں میں لکھی گئی ہیں۔ کوئی وجہ نہیں ہے کہ ان سب پہلوؤں کی طرف نظر نہ کی جائے میرے نزدیک ہندی کے اوزان اور قافیہ سے ارد و نظمیں ہماری شاعری کو بہت کچھ نشو و نما دے سکتے ہیں ہمارے شعرا یا تو نئے طریقوں سے بھڑکتے ہیں۔ یا مروجہ رستہ کے شیدا ہو گئے ہیں میں نے اس معاملہ کا چند اعلےٰ دماغ اُردو شعرا سے ذکر کیا۔ گو اُن کو ایسی بدعتوں سے نفرت ہے تاہم وہ اس بات کو تسلیم کرنے پر راضی ہیں کہ اگر کوئی جدت پسند اُستاد ہندی وزنوں سے کام لے، تو اُس کے ہاتھ سے اُردو شاعری میں نئی روح کا پھونکا جانا ناممکن نہ ہوگا۔

سب سے اشد ضرورت اس کی ہے کہ ہم اپنے علم الادب کے مضامین اور اصناف زیادہ وسیع کریں۔ موجودہ شاعری قریب قریب قصیدہ اور غزل پر ختم ہے مرثیہ اور مثنوی کے اساتذہ در گور ہیں اور ان اصناف کی موجودہ حالت ابتر ہے۔ فردوسی کے شاہنامہ کے صنف کی ایک بھی مثال اردو میں نہیں ملتی جس کا اور زبانوں کی ایک شاعری سے مقابلہ کیا جا سکے۔ ہمارا ڈراما صرف تقلیدی قسم کا ہے۔ امانت کی اندر سبھا ایک اختراعی تصنیف تھی مگر اُس کے بعد بہت کم ایسے ڈرامے لکھے گئے ہیں کم استعداد شعرا اس بات پر کفتی ہیں کہ عاشقانہ شاعری بطور گلہ و شکوہ لکھیں اور کبھی کبھی ہجو یا لطیفے کے اشعار یا قطعے بھی لکھتے ہیں۔ سنجیدہ مسلسل اشعار جن کی رسائی انسانی تخیل کی بلند تر اقلیموں تک ہو جائے اس کی کہیں فکر نہیں ہے۔ اور اس کی کبھی کوشش تک نہ کی جاتی ہے۔ ہاں طول طویل ہرزہ گوئی کی مثنویوں کا شوق ہے مگر اس کو علم الادب نہیں کہتے کبھی اتفاقیہ شعر یا رباعی کہہ دی۔ یہ تو شاعری کے کھلونے ہیں البتہ پُر مغز تصانیف مثلاً اسرار خودی (از سر محمد اقبال) کو اردو میں لکھنے سے رونق بڑھ سکتی ہے۔

ایک اور امر تحقیق اور توجہ کے قابل ہماری نثر کی نشو و نما ہے، اور اسی ضمن میں یہ بھی دیکھنا مناسب ہے کہ کن کن اثرات اندازیوں سے اُس کی ترقی ہوئی ہے۔ ہمارے ہی زمانہ میں ہم دیکھتے ہیں کہ اُردو کی صرف و نحو اور اصطلاحات و طرز عبارت میں بہت تبدیلیاں ہو گئی ہیں اُن کی تفصیل سے تنقیح ہونی چاہیئے۔ ایسی تنقیح سے ہمارے ادبی خیالات کے قاعدے منکشف ہوں گے۔ جو ہمارے لئے اور نیز دیگر اصحاب کیلئے دلچسپ ہو سکتے ہیں۔ حیدر آباد کے دار الترجمہ کی جدید تصانیف پر نکتہ چینی کی جاتی ہے۔ اس لئے اُن کی عبارت پُرانی اور مروج خیالات کے علماء کے نزدیک غیر مانوس معلوم ہوتی ہے۔ مگر اس بات کو قطع نظر کیا جاتا ہے کہ ہر زبان کی روزانہ ضروریات کے مطابق اُس کا نشو و نما ہوتا ہے۔ اور جن خیالات کا اظہار کرنے کی سعی ہوتی ہے اُنہیں پر عبارت کا طرز منحصر ہے۔ یہ ممکن نہیں کہ ہم کو انگریزی عالم مِل کے خیالات سے واسطہ ہو اور طرز عبارت غالب کی اختیار کریں۔ سیدھی سادی اور غیر آراستہ عبارت اعلےٰ اخبار نویسی قصہ نویسی کے جدید اصناف علم الادب کے لئے بہت موزوں ہے۔ ایسی عبارت کی آرایشی خوبصورتی اس بات پر مبنی ہے کہ آیا وہ اپنے اغراض کے لئے بالکل موزوں ہے یا نہیں، اور کمزوری سے بری و چست ہے یا نہیں۔

اب اُردو قصہ نویسی پر ایک نظر ڈالیں۔ اس لئے کہ موجودہ روزمرہ

تصانیف اسی صنف میں شائع ہوتی ہیں۔ جہاں تک مجھکو مطالعہ کرنے کا موقع ملاہے۔ ہمارے قصہ نویس کسی اصول یا قواعد پر نہیں چلتے۔ اُن کے مضامین اور قصوں کے خاکے (پلاٹ) بیرون از فطرتِ دنیا سے لئے جاتے ہیں، یا خلاف واقع ہوتے ہیں اُن کا طرز ایسا ہوتا ہے گویا وہ طفلانِ آغوش نشیں کو قصہ سُناتے ہیں شخصیت (کیرکٹر) کی تصویر خام رنگوں میں کھینچتے ہیں۔ سوشل معاشرت کے واقعات پر غور کرنا، اور اُن کی ہنرمندی سے تصویر کھینچنا، جو آیندہ نسلوں کے لئے متوارث فخر کا باعث ہو اُس کی تو محض کوشش ہی بہت کم قصہ نسولیسوں نے کی ہے۔ اگر اس صنف پر سنجیدگی سے غور و خوض کیا جائے تو اُس سے چند عام اُصول اخذ ہو سکتے ہیں، جن پر عمل کرنے سے مصنفین اور ناظرین دونوں فائدہ اُٹھا سکتے ہیں۔

ایسے بہت سے امور ہیں جن پر توجہ اور بحث ہونے کے بعد اُردو علم الادب کی مسلسل اور باوقعت تواریخ لکھنا ممکن ہوگا۔ مگر اسی اثنا میں یہ ہو سکتا ہے کہ ایسی تواریخ کا کم سے کم ایک خاکہ تیار کرنے کی کوشش کیجاوے جس سے ہماری بھی علم افزائی ہوگی۔ اور بیرونی اقوام کے نزدیک بھی اُردو علم الادب کی قدر بڑھے گی۔

جب کافی تعداد ایسے اشخاص کی پبلک میں پیدا ہوگی جن کا میلان طبع پاکیزہ۔ صحیح منطقی وغیرہ مبہم عبارت کی طرف ہو، اور جن کی دلچسپی متقابلہ الفاظ کی موشگافی اور مصنوعیت کے زیادہ تر خیالات کی بلندی اور محاورہ کی خوبصورتی سے وابستہ ہو تو پھر سمجھنا چاہئے کہ وہ وقت آگیا کہ ہم کامیابی کے ساتھ ایک اردو جماعت العلم (اکاڈمی) کو قائم کریں، جس کے علمار اپنے جلسوں میں متنازعہ فیہ الفاظ و اصطلاحات کے باب میں بطور قضاۃ فیصلہ کریں گے اور مستند لغات مرتب کرینگے۔ اور حد اعتدال سے متجاوز عبارات کو رد کیں گے۔ اور اُن ہنرمندان کا حوصلہ بڑھا دیں گے جن کا آلۂ ہنرمندی انسانی زبان ہے۔

یہ خاکہ زمانہ مستقبل کے لئے طویل اور مشکل ہے۔ بہتر ہوگا کہ ہم اپنی قوتوں کی یکسوئی کے لئے عزم کرلیں کہ ہر فرد یا انجمن اس کا کوئی معیّن اور محدود حصہ اپنے ذمے لے اور اُس پر موثر طریق سے عمل کرے۔ اگر ایک جامع تجویز مدنظر رہے، اور ہم کو معلوم ہوتا رہے کہ دیگر افراد اُسی میدان کے اور حصوں میں کام کر رہے ہیں۔ تو ہم کو کم سے کم یہ اطمینان ہوگا کہ گو خود ہمارے جمع کردہ خوشے قلیل التعداد ہیں، تاہم تمام فصل کا غلہ کثیر المقدار اور بیش بہا ہوگا۔

(عبداللہ یوسف علی)

رباعیات

مانا کاوش تھی کاوشِ غم تو نہ تھی
گریہ تھا، مگر نوائے ماتم تو نہ تھی
بچپن میں جو بات تھی جوانی میں کہاں
خندہ بھی تھا، یہ فغانِ پیہم تو نہ تھی

اس دائرۂ فنا میں مقصدِ دل کیا ہے
منشائے نمودِ حق و باطل کیا ہے
جب قلب کو ایک دم بھی راحت نہ ملی
آخر اس زندگی کا حاصل کیا ہے

روان ایم اے

دوست بنانے کا فن

رابرٹ لوئی سٹیونسن نے ایک نظم "قلندر" میں لکھا ہے کہ "مجھے دولت کی تمنا نہیں اور نہ آرزو ہے محبوب کسی واقف حال دوست کی خواہش۔ مجھ فقط اس بات کی طلب ہے کہ میں آسمان کے نیچے سڑک پر چلتا رہوں" سٹیونسن نے یہ نظم اس لئے لکھی تھی کہ اسے شوبرٹ کی لے میں گایا جائے۔ مگر ہمیں اس پر سنجیدہ نظر ڈالنے کی ضرورت نہیں۔ ممکن ہے دنیا میں ایسے قلندر یا سیلانی لوگ بھی موجود ہوں جن کو زیر فلک سڑک پر چلنے کے سوا کسی اور بات کی آرزو ہی نہ ہو۔ لیکن عام لوگوں کی بہبودی و خوش حالی کا دارومدار دوستی ہی پر ہے۔ یہ تو مجذوب کی غیر معمولی ہستی ہے جو دن رات اپنے ہی حال میں مگن رہ سکتا ہے ہم درحقیقت ہر ایسے شخص سے متاثر ہوئے بغیر نہیں رہ سکتے جس کے ساتھ ہمیں واسطہ پڑتا رہتا ہے۔ چند مبارک ہستیاں ایسی بھی ہوتی ہیں جن سے ہمکو ناقابل تشریح وجوہات کی بنا پر وہ برکتیں حاصل ہو سکتی ہیں جو ساری دنیا مل کر بھی ہمیں دینا چاہے تو نہیں دے سکتی

پوشیدہ کشش

دوستی سراسر مخفی ہوتی ہے۔ مونٹین کا قول ہے کہ اگر کوئی شخص مجھ سے یہ درخواست کرے کہ اس امر کی وجہ بتلائیے کہ آپ مجھ سے محبت کیوں کرتے ہیں تو میرے نزدیک اس کا جواب بجز اس کے اور کچھ نہیں ہو سکتا کہ آپ ہیں اور میں ہوں۔ دوستی کی تحریک یقیناً کامیابی یا دولت کی بنا پر نہیں ہوا کرتی بلکہ ناکامی میں خواہ اس میں استحقاق موجود ہی کیوں نہ ہو) دوستی پیدا کرنے کا عجیب و غریب جادو موجود ہے اگر یہ قمر (ایک مشہور آدمی کا نام) دنیا کا دوست تھا تو مکابر (ایک مشہور مصلح) کو بھی تمام دنیا مدست رکھتی تھی۔ دوست تو خود ہمارے گلے پڑتے ہیں وہ عجیب مؤانست کے ذریعے ناخواندہ مہمان کی طرح ہماری جانب کھنچے چلے آتے ہیں۔ کسی شخص کے حد سے زیادہ دوست نہیں ہو سکتے۔ ہم اپنے بعض دوستوں کے توشکرگذار ہوتے ہیں اور بعض کے نہ ملنے پر اظہار افسوس کرتے ہیں۔ اکثر ملنسار اصحاب اس دنیا میں ایک دوسرے کو یا تو کھو بیٹھے ہیں یا غیر موزوں حالات میں ایک دوسرے سے ملتے ہیں۔ جب زمانہ موافق ہو تو ہم اپنے دوستوں کے پاس خوشی منانے کے لئے جاتے ہیں اور جب ناموافق ہو تو اُن سے تسلی و تشفی کے خواہاں ہوتے ہیں۔ لیکن جبتک آدمی سرگرمی کے ساتھ اس خوشی کا لطف اُٹھانے کے لئے تیار نہ ہو اُس وقت تک اُسے دوستی کے مناسب حصے کے ملنے کا موقع نہیں مل سکتا۔ سٹیونسن کے اس قول میں اعلیٰ درجہ کی حکمت چھپی ہوئی ہے "اگر لوگوں کو یہ معلوم ہوتا کہ کسی شخص کو اپنی حقیقی ملکیت پر ڈینگ مارتے ہوئے سننا کس قدر روح پرور ہے تو مجھے یقین ہے کہ وہ زیادہ آزادی اور خندہ پیشانی سے سُنتے"۔

کچھ دینا کچھ لینے سے بہتر ہے

دوستی ہماری اچھی صفات کا خراج تحسین صلہ ہے۔ اس کی بدولت ہماری حوصلہ افزائی ہوتی ہے۔ یہ ہم میں خودداری کا مادہ پیدا کرتی ہے اور زندگی کی کشمکش کو ہمارے لئے پرلطف بنا دیتی ہے۔ ممکن ہے محبت کی نسبت یہ کم اشتعال انگیز ہو لیکن وہ اکثر اوقات زیادہ دیرپا ہوتی ہے کولرج نے "شباب اور ضعیفی" کے نام سے جو نظم لکھی ہے اُس میں وہ بیان کرتا ہے "پھول خوبصورت ہوتے ہیں اور محبت بذاتِ خود پھول ہے دوستی پناہ دینے والا درخت ہے۔ چونکہ ہماری زندگی کا دارومدار زیادہ تر دوستی ہی پر ہو سکتا ہے۔ اس لئے دانا آدمی اپنی شخصیت کی تربیت اس طرح کرے گا کہ وہ دوستی جیسی بے بہا نعمت کو اپنی طرف کھینچنے کے لئے مقناطیس بن جائے۔ جبتک آدمی خود دوست بننے پر رضامند نہ ہو تب تک اُس کو دوست نہیں مل سکتے۔ "لینے کی بہ نسبت دینا بہتر ہے"۔ سچ ہی نہیں بلکہ جو شخص دینا پسند نہ کرتا ہو اس کو کچھ مل بھی نہیں سکتا۔

یہ دنیا حقیقت میں بہت سہانی ہے۔ اس میں دوستی کا ذخیرہ کبھی ختم نہیں ہو سکتا۔ اگر بدقسمتی سے ہم کسی کی دوستی سے محروم ہو جائیں تو یہ ہماری ہی کوتاہی کا نتیجہ ہوگا

سخاوت

شرمیلے آدمی اکثر اوقات بلاضرورت دوستوں کی دوستی سے محروم رہتے ہیں۔ حیا اور شرم حقیقت میں دو بُرائیاں ہیں اور وہ روحانی فخر اور اس عقیدے کا بیّن ثبوت ہیں کہ ہمارے پاس کوئی ایسی قیمتی چیز موجود ہے جس کو پوشیدہ رکھنا چاہیئے تاکہ ہمارے اردگرد کی دنیا کو اس کا پتہ نہ

نہ لگ جائے۔ عقلمند آدمی کا دل تو ہاتھ میں ہوتا ہے اور وہ ہمیشہ سخاوت میں مشغول رہتا ہے وہ زندگی میں سخاوت کرتا رہتا ہے اور پھر اس کو اس کا صلہ بھی ملتا رہتا ہے۔

آپس کی عزت

دوستی کا دارومدار باہمی عزت اور ہمدردی پر ہے۔ لیکن کچھ حد تک اس کا انحصار آپس کے ایک جیسے مفاد پر بھی ہے۔ ہومر کی مشہور نظم "الیڈ" میں دو مصرعے یاد رکھنے کے قابل ہیں اور وہ یہ ہیں۔

عالی ظرف دوستی میں تو سرد مہری کا نام تک نہیں ہوتا
محبت ایک جھلک سے جل اُٹھتی ہے
ایک چنگاری سے بھڑک اُٹھتی ہے

دوستی میں بُرائی کا تو خیال ہی نہیں آتا۔ لیکن دوستی کو کبھی اہمیت نہیں دی جاتی۔ دوستی کا دارومدار باہمی عزت پر ہے اور اس احساس پر کہ گہری اور قوت آمیز دوستی کے علاوہ ہی دوستوں کے دلوں میں ایسے اندرونی تہ خانے ہیں جن تک آدمی کی رسائی نہیں ہو سکتی

دوستی کی آزمایش

کسی کے احباب کی بابت حد سے زیادہ پرسش کرنا مضر ہے۔ ان کی اصلاح کی خواہش اور بھی خطرناک ہے۔ ممکن ہے بعض کٹھن گھڑیاں ایسی بھی آجائیں جبکہ دوستی سخت آزمایش میں مبتلا ہو جائے۔ لیکن ہمیں بلا ضرورت اس کی آزمایش نہیں کرنی چاہئے ہمارے لئے تو دن کے دھندے کافی ہیں بقول لارڈ ہوٹن

مجھے اپنی ہنسی کا لطف اُٹھانے دو
اور اپنی خوش طبعی کے سایہ میں بیٹھنے دو
اور وہاں لیٹنے دو جہاں تمہارے مُنہ سے پھول جھڑ رہے ہوں
ہاں مجھے اپنی دوستی کی برکت حاصل کرنے دو

دوسروں کی اصلاح کا خیال

یہ ہمارا کام نہیں ہے کہ ہم دوسروں کی بہتری کیلئے کوشش کریں یہ تو اکثر اوقات پرہیزگاروں کی غلطی ہوتی ہے۔ یہی تو وجہ ہے کہ گھر میں کسی پرہیزگار آدمی کو تکلیف دہ خیال کیا جاتا ہے۔ پرہیزگار لوگوں کے دلوں میں یہ خیال سمایا ہوا ہے کہ ہمیں چاہئے کہ ہم اپنے ہمسایوں کو نیک بنانے کی کوشش کریں۔ اس کے متعلق اسٹیونس لکھتا ہے کہ ایک شخص تو خود میں ہی ہوں جس کو مجھے آپ ہی نیک بنانا ہے۔ لیکن اپنے ہمسائے کے متعلق میرا فرض صرف یہ ہے کہ اگر مجھ سے ہو سکے تو میں اپنے ہمسائے کو خوش کروں۔"

ڈاکٹر احمد اللہ خاں آئی ایم ڈی

جوانانِ قوم

مشہور جرمن شاعر "شلر" کہتا ہے کہ "شباب کی موجیں زندگی کے سمندر کو طوفانی بنا رہی ہیں جوانو! قبل اس کے کہ تمہاری جان گرداب بلا کی نذر ہو جائے اُٹھو اور کوشش کرو۔"

دنیا میں دورِ شباب ہی قوت امنگ اور شجاعت کا زمانہ قرار دیا جا سکتا ہے "جوانی" آزمایش کے میدان میں عزم و استقلال ہمت و شہامت کی نمائش اور ظہور کا باعث ہوتی ہے اور عالم جوانی ہی جسے "جوانی دیوانی" پکارا جاتا ہے عشق و محبت اور جرأت و دلاوری کا دوسرا نام ہے اور یہی مبارک سنے روح بشریت کی ایک دلفریب جھلک ہے

اگر ہمارے نوجوان اس سعادت یعنی قوت شباب کی اہمیت کو جانتے اور اس کا صحیح اندازہ کرتے ہوئے۔ اس کو اپنے لئے کارآمد چیز بناتے تو یقیناً آج ہماری زمین خلد بریں کا نمونہ ہوتی۔

ایک قوم کے نوجوان قوت۔ ثروت اور تمام اہم اور بیش نظر حالات کا مرکز ہوتے ہیں اور اسی مناسبت سے حکماء میں سے کسی نے کہا ہے۔ کہ ایک قوم کے بچوں اور نوجوانوں کو اجتماعی اور سیاسی زندگی یعنی قوم میں انقلابی روح پیدا کرنا اور اس کی حالت کو سراسر بدلنے کے لئے پچیس سال تک آزادانہ تعلیم و تربیت حاصل کرنے کی ضرورت ہوتی ہے۔ ان پچیس سال کے عرصہ میں دوسرے لوگ اُن کے ہم آہنگ اور شریک کار رہوں یا نہ ہوں کیونکہ اس صورت میں ان کی شرکت کی توقع محض لاحاصل ہے۔

انقلابی تحریک اور سیاسی معاملات کی باگ ڈور مکمل طور سے جوانانِ قوم کے ہاتھوں ہی میں ہوتی ہے اور اسی سبب سے قوم کی حالت کے بدلنے اور اس کے سرفراز ہونے کا انحصار اس قوم کے نوجوانوں کی تعلیم و تربیت پر ہے۔

ابوظفر نازش رضوی

مسیح کا اُٹھایا جانا

اشخاص:- یہودی - مصری - شامی - مسیح

اسٹیج:- بیت المقدس کا ایک بالاخانہ۔ بالاخانے کا نقشہ یہ ہے کہ دائیں ہاتھ ایک دروازہ ہے جس سے ایک دوسرے کمرہ میں جو اندر کی طرف واقع ہے راستہ گیا ہے۔ ایک دروازہ بائیں جانب ہے۔ دروازہ میں زینہ ہے جس سے آدمی بازار میں داخل ہوتا ہے بائیں ہاتھ اور عقب میں کھڑکیاں ہیں۔ یہودی کھڑا ہے مصری ہتھیار لگائے بازار سے داخل ہوتا ہے۔

مصری۔ میں نے سُنا تھا کہ تم اکیلے ہو۔ اس لئے چلا آیا۔ ہاں شامی کیا ہُوا؟

یہودی۔ مجھے معلوم ہُوا ہے کہ رومی محافظوں کے باوجود لوگوں نے مسیح کی لاش کو مقبرہ سے نکال کر کہیں چھپا دیا ہے۔

مصری۔ ان کا یہ خیال ہے کہ دراصل یہودا مصلوب ہُوا ہے۔

یہودی۔ یہ تم سے کس نے کہا؟

مصری۔ ایک ربّی نے خود بخود بغیر میرے دریافت کئے۔

یہودی۔ کیا تم اُس سے ڈر نہیں گئے؟

مصری۔ نہیں، اُسے کیا معلوم تھا کہ میں عیسائی ہوں۔ وہ اس قصّے کو بیان کرنیکا اسقدر مشتاق تھا کہ مجھ سے کہے بغیر رہ نہیں سکا۔ وہ ایک آدمی سے جو ایک گدھے پر شراب کے مشکیزے لادے جارہا تھا باتیں کر رہا تھا۔ اس کے بعد وہ سڑک کی دوسری جانب جہاں کچھ عورتیں کپڑے دھو رہی تھیں چلا گیا۔

یہودی۔ کیا اس لئے کہ یہودا اپنے فعل سے پشیمان تھا۔

مصری۔ بیشک، جبھی اس ربی کو غصہ آرہا تھا کہ ایک آدمی محض اس لئے اپنے آپ کو پھانسی پر چڑھا دے کہ عبرانی قانون کی رو سے وہ اسے اپنا فرض سمجھتا ہے۔ وہ تو یہی کہتا تھا کہ اس سے ثابت ہوتا ہے کہ مسیح کی تعلیمات نہ صرف خلاف قانون بلکہ ناممکن بھی ہیں۔

(دُور سے طبل کی آواز آتی ہے)

یہودی۔ میں صبح سے یہ آواز سُن رہا ہوں۔ کبھی قریب سے آتی معلوم ہوتی ہے اور کبھی دُور سے۔

مصری۔ جب میں ربی سے گفتگو کر رہا تھا تو اسوقت بھی میں نے یہ آواز سُنی تھی لیکن میں اس سے پوچھتا ہُوا ڈرتا تھا۔ بازاروں میں لوگوں کا ہجوم ہو رہا ہے۔

یہودی۔ اسے خوش قسمتی سمجھو کہ ہم تم یہاں حفاظت کے لئے موجود ہیں۔ اگر یہاں بھی مجمع ہو گیا تو ہم اس کو روکے رکھیں گے حتےٰ کہ وہ لوگ جو اندر ہیں چھت پر پناہ نہ لے لیں۔

مصری۔ وہ گیارہ آدمی؟ وہ کر کیا رہے ہیں؟

یہودی۔ ابھی تھوڑی دیر ہوئی جیمس نے ایک تھیلہ میں سے کچھ روٹیاں نکالکر میز پر رکھدیں نتھینل کو کہیں سے شراب کا ایک مشکیزہ مل گیا تھا۔ انہوں نے دیر سے کچھ کھایا نہیں تھا۔ کھانے سے فارغ ہو کر انہوں نے آپس میں آہستہ آہستہ باتیں کرنا شروع کر دیں۔ یوحنا اسوقت کا ذکر کر رہا تھا جب انہوں نے آخری بار اسی کمرہ میں کھانا کھایا تھا۔

مصری۔ اسوقت ان کی تعداد تیرہ تھی۔

یہودی۔ یوحنا کہہ رہا تھا کہ یسوع نے ان میں روٹیاں اور شراب تقسیم کیں۔ اس کے بعد سب لوگ خاموش ہو گئے۔ نہ کھانیکی آواز آتی تھی نہ بولنے کی۔ تم یہاں کھڑے ہو کر ان کو دیکھ سکتے ہو۔ ذرا پطرس کو دیکھو اسکا سر اس کے منہ پر جھکا ہے۔ وہ مدت سے بالکل بجھا سا ہے۔

مصری۔ کیا یہ صحیح ہے۔ کہ جب سپاہیوں نے اس سے پوچھا کہ کیا تم یسوع کے پیرو ہو تو اس نے انکار کر دیا؟

یہودی۔ ہاں یہ صحیح ہے جیمس نے مجھ سے کہا تھا کہ پطرس خود بھی یہی کہتا تھا۔

معلوم تو یہ ہوتا تھا کہ وہ سب کچھ بیان کر دیگا لیکن جب وقت آیا تو سب ڈر گئے۔ خیر مجھے یہ نہیں چاہیئے کہ میں دوسروں کو الزام دوں ممکن ہے اس وقت میں بھی ایسا ہی بزدل ہو جاتا۔ آخر ہم سب ہیں کیا؟ کتے جو اپنا مالک کھو چکے ہیں۔

مصری۔ لیکن اگر مجمع سیڑھیوں تک آ گیا تو ہم تم جان دے دینگے لیکن اُن سے اندر نہیں آنے دیں گے۔

یہودی۔ یہ الگ بات ہے۔ میں پردہ ڈالے دیتا ہوں۔ میں نہیں چاہتا کہ وہ میری باتیں سنیں۔

مصری۔ میں جانتا ہوں تمہارے دل میں کیا ہے!

یہودی۔ ان کی سمجھ میں نہیں آتا تھا کہ وہ کس بات کو سچ سمجھیں اس لئے وہ اور بھی ڈر گئے۔ جب یسوع گرفتار ہوا ہے تو انہیں یقین نہیں رہا کہ واقعی مسیح ہے۔

مصری۔ ذرا اسطرف آؤ۔ یہودا کا دل مدت سے شک و ارتیاب کا شکار ہو رہا تھا۔ اس کا ایمان کبھی مضبوط نہیں تھا۔ یہی وجہ ہے کہ اس نے یسوع کے ساتھ غداری کی۔

یہودی۔ لیکن کیا میرا اور تمہارا ایمان بالکل مضبوط ہے کیا ہمارا یقین واقعی پختہ ہونا چاہیئے۔ ان بارہ حواریوں نے بھی جنہیں یسوع نے خود منتخب کیا تھا اسکا انکار کیا اور اس پر شک کیا۔

مصری۔ میں نے کبھی شک نہیں کیا۔ مجھے تو شروع ہی سے یقین تھا کہ وہ سچا ہے۔ اس کے انداز میں کوئی بات تھی ——— کوئی بات جس سے ظاہر ہوتا تھا ——— یا کچھ ایسا ہی۔

یہودی۔ اونہہ۔ میں مصریوں کے خیالات کو خوب سمجھتا ہوں۔ غالباً تم سے کہنے والے تھے کہ وہ اور اسکا وجود محض خیالی یا کچھ ایسا ہی تھا۔ لہذا وہ مرا نہیں بلکہ یہ صرف لوگوں کا خیال ہی خیال ہے۔ غرضیکہ کہ تم کسی نہ کسی طرح اپنی دلبستگی کے سامان پیدا کر لوگے۔ میں اگرچہ یہودی ہوں اور اس لحاظ سے خوب جانتا ہوں کہ یقین کیا چیز ہے۔ لیکن مجھے بھی اطمینان و دلجمعی کیلئے شراب خانوں میں جا کر لڑکیوں سے جی بہلانا پڑتا ہے ——— لیکن ان آدمیوں کی کیفیت اس سے مختلف ہے۔

مصری۔ یہ تم اس لئے کہتے ہو کہ وہ ہم سے عمر میں کہیں زیادہ بڑے ہیں۔

یہودی۔ نہیں یہ بات نہیں بلکہ اس لئے کہ ان کے چہروں سے ظاہر ہوتا تھا کہ وہ سب کے سب اولیائے اللہ سے ہیں۔ ورنہ مجھے کیا ضرورت ہے کہ اپنی جان کو خطرہ میں ڈالکر یہاں انکی حفاظت کیلئے کھڑا رہتا۔

مصری۔ تمہارا خیال ہے کہ یہودا یا تو بہترین آدمی ہے یا بدترین،

یہودی۔ نہیں میرا یہ خیال ہے کہ جب اس کے شکوک پختہ ہو گئے تھے تو اسکی کیا ضرورت تھی کہ اس سونے چاندی کے کچھ سکے دیئے جاتے۔ وہ تو شراب کے ایک جام کیلئے بھی اپنے آقا کے ساتھ غداری کر سکتا تھا۔

مصری۔ میں نے اُسے کئی بار دیکھا ہے۔ اس کے بال سُرخ ہیں۔ آنکھوں سے نرمی کا اظہار ہوتا ہے۔ میرا ہرگز یہ خیال نہیں تھا۔ کہ وہ ایسا آدمی ہے۔

یہودی۔ ذرا اسکی پست ہمتی کا خیال کرو۔ جب وہ حواریوں کے زمرے میں شامل ہوا تو اس کا خیال تھا کہ اس کے آقا کی ذات میں داؤد و سلیمان پھر واپس آ گئے ہیں۔ وہ سمجھتا تھا کہ اب یہودی ساری دنیا کو فتح کر لینگے اور اہل روما کا خاتمہ ہو جائیگا۔

مصری۔ اہل روما کو کوئی شخص نکال نہیں سکتا۔ بات اصل میں یہ ہے کہ یہودا کھاتا بہت ہے۔ اور سوچتا بہت کم ہے یہی وجہ ہے کہ وہ غور و فکر کیلئے یونانیوں جیسی کمزور نسل کا محتاج ہے۔ بہرکیف کسی نہ کسی شخص کی ضرورت ہے کہ اس سلطنت کا انتظام اپنے ہاتھ میں لے۔ میں تو اس کے لئے یہودیوں کو یونانیوں پر ترجیح دونگا سکندریہ میں کافی یونانی موجود ہیں لیکن یہودی کمزور لوگ ہیں۔

یہودی۔ میں تو یسوع کا ہر حکم بجا لانے کو تیار تھا۔ مجھے وہ اپنے ماں باپ دوست اور دنیا کی محبوب سے محبوب چیز سے بھی زیادہ عزیز تھا۔ لیکن اس کا نتیجہ کیا ہوا! جب سپاہیوں نے اس کے کاندھے پر ہاتھ رکھا ہے تو اس نے ذرا بھی مزاحمت نہیں کی۔

مصری۔ زور سے مت بولو۔ میں نہیں چاہتا کہ پطرس ہماری باتیں سنکر دوسروں سے کہے۔

یہودی۔ یسوع نے اپنے آپ کو دھوکا دیا اور ہمیں بھی۔ میرے خیال میں اسکی وجہ یہ ہے کہ اس کے دل میں بھی بنی آدم کی محبت تھی۔ مجھے کوئی شک نہیں کہ کام کاج وغیرہ کی وجہ سے مجھے اسکی باتیں سننے کا کم اتفاق ہوا ہے لیکن ایسا معلوم ہوتا ہے کہ شروع شروع میں اس نے اپنے آپ کو خدا کا بیٹا کہا جیسے ہم سب لوگ خدا کے بیٹے ہیں لیکن جب لوگوں نے اس کے ارد گرد جمع ہونا شروع کیا اس نے اپنا رویہ بدل دیا۔ شائد اسکو ہماری بری حالت پر اسقدر رنج تھا کہ وہ ہمارا خدا بن جانا چاہتا تھا۔ غالباً اسے ہمیشہ یہ خیال رہتا تھا کہ آخر قیامت کے دن وہ ہمارا منصف بنا تو ہم کو

لئے بہت کافی گنجائش رکھ سکیگا - یہی وجہ تھی کہ اس غور و فکر
میں اس کے خیالات منتشر ہو گئے اور بالآخر اس نے یہ دعویٰ کیا
کہ وہ خدا کا اکلوتا بیٹا ہے - بہرکیف اب وہ مر چکا ہے اب ہم کبھی
اس کی صورت نہیں دیکھیں گے -

(طبل کی آواز قریب آتی جاتی ہے)

ایلو پھر وہی شور ہوا - اب تو میں انہیں دیکھ بھی سکتا ہوں -
یہ عورتیں ہیں ان میں سے کچھ اپنے کاندھوں پر ایک تابوت اٹھائے
آرہی ہیں - باقی ڈھول بجا رہی ہیں - مجمع میں کچھ لوگ خفا بھی نظر
آتے ہیں - لیکن رومی سپاہی انہیں آگے نہیں بڑھنے دیتے -

مصری - کیا تمہیں یقین ہے کہ یہ واقعی عورتیں ہیں - میں سمجھتا ہوں یہ در
اصل آدمی ہیں جنہوں نے عورتوں کا بھیس بدل رکھا ہے -

یہودی - اب وہ بازار کے موڑ سے گذر رہی ہیں - اور مجمع کی وجہ سے
نظر نہیں آتے - اب میں انہیں دیکھ سکتا ہوں - تم ٹھیک کہتے ہو
---- ان کی چال بالکل مردوں کی سی ہے - انہوں نے گال اور
ہونٹ سُرخ رنگ لئے ہیں -

مصری - اور وہ تابوت کسی مردے کا نہیں ہے - بلکہ انہوں نے
لکڑی کا ایک آدمی بنا کر اسے مردوں کی طرح رنگ لیا ہے - میں
انہیں اسکندریہ میں دیکھ چکا ہوں ابھی یہاں آئے ہیں - یہ ایک شرابی
دیوتا کی پرستش کرتے ہیں جسکو یونانی ڈایونی سس کہتے ہیں مارچ
کے مہینہ میں چاند کی چودھویں تاریخ کو یہ لوگ شہر کے باہر کسی
میدان میں جمع ہوتے ہیں - ان میں سے ایک بھیڑ یا بکری کا ایک
زندہ بچہ اپنے ہاتھوں میں اٹھا لیتا ہے اور دوسرے اس کے ارد
گرد کھڑے ہو جاتے ہیں - اس کے بعد وہ بچے کو درمیان میں
پھینک دیتا ہے - اس پر وہ لوگ بچے پر جھپٹ پڑتے ہیں - اور
ایک دوسرے کو دھکیلتے ہوئے اُس کا گوشت نوچ نوچ کر کھا
جاتے ہیں - ان کا لباس اور سر خون آلود ہو جاتا ہے لیکن وہ اپنے
دیوتا ڈایونی سس کو پکارتے جاتے ہیں - اور ان کا خیال ہے کہ وہ
دراصل اُسی کا گوشت کھاتے ہیں اور اسی کا خون پیتے ہیں -

یہودی - معاذ اللہ - یونانیوں ہی کے خیالات ایسے ہو سکتے ہیں -

مصری - اس کے بعد وہ شہر میں داخل ہوتے ہیں اور اس کے مختلف
حصوں پر بکھر جاتے ہیں - بعض اپنے کاندھوں پر مردے کی
ایک تصویر اٹھا لیتے ہیں - بعض ناچتے ہیں اور اپنے کپڑے پھاڑ
ڈالتے ہیں - اور زور زور سے اپنے دیوتا کو پکارتے ہیں کہ اس
مردے کو زندہ کر دے -

یہودی - ایک کاہن دوسرے سے علیحدہ ہو گیا ہے اور اب کھڑکی
کے نیچے مجمع میں مل گیا ہے - وہ شراب کے نشے میں چور ہے - لوگ
اسکی ہنسی اڑا رہے ہیں اور اسے ادھر ادھر دھکیل رہے ہیں -

مصری - بعض کاہن ہمیشہ شراب پئے رہتے ہیں - وہ سمجھتے ہیں - کہ
دیوتاؤں کا خون پی کر مست رہنا زہد کی علامت ہے -

یہودی - اچھا اب اس شرابی نے گانا شروع کر دیا ---- وہ اپنے
دیوتاؤں کا خون پیتے ہیں اور اسکا گوشت کھاتے ہیں؟ ابھی تم نے
یہی کہا تھا نہ؟

مصری - بیشک وہ اس کو اپنا مذہبی فرض سمجھتے ہیں - ان کا خیال ہے
کہ اس نے انسان کی نجات کے لئے اپنی جان دیدی - لوگ کہتے
ہیں کہ ٹیٹن دیوتاؤں سے لڑتے تھے - اور الپس میں جنگلوں کی
آڑ میں ہوتے ہوئے بالآخر وہاں پہنچ گئے - جہاں مقدس بچہ کھیل
رہا تھا - وہ اپنے ساتھ کچھ گھنگرو لے آئے تھے - انکو بجا بجا کر
انہوں نے بچے کو اپنے پاس بلا لیا لیکن جب وہ ان کے پاس آیا
تو انہوں نے اسکو ٹکڑے ٹکڑے کر ڈالا -

یہودی - غالباً یہی وجہ ہے کہ کاہن ہمیشہ اپنے پاس گھنگرو رکھتے ہیں -

مصری - کچھ خراب ٹیٹن عورتوں نے جن کی تعداد کے متعلق خیال ہے
بارہ ہیں اس کے بچانے کی کوشش کی، اس کی یاد میں یہ کاہن عورتوں
کا سا لباس پہنتے ہیں اور اپنے ہونٹوں اور چہروں کو سُرخ رنگ
لیتے ہیں اور اپنی کمر کو ہلاتے ہوئے ناچتے ہیں -

یہودی - ان لوگوں کے شور مچانے سے کیا ہو سکتا ہے - یونانی بھی
مردوں کو زندہ نہیں کر سکتے -

مصری - اس کے بعد وہ دفعتہً مردے کو چھپا دیتے ہیں اور بازار
میں گھومتے ہوئے خوش ہو ہو کر شور مچاتے ہیں کہ مردہ دوبارہ
زندہ ہو گیا -

(ایک لحظہ کیلئے کھڑکی میں سے جھانک کر دیکھتا ہے - طبل
اور گھنگرو اب دور ہو جاتے ہیں)

اب ہم اپنے ہتھیار اُتار سکتے ہیں - بازار بالکل خالی ہے - اب
لوگوں کو کاہنوں کا انتظار ہے -

(دونوں بیٹھ جاتے ہیں)

تھوڑی دیر ہوئی تم نے جو یہ کہا تھا کہ میں یسوع کو محض ایک
خیالی سمجھتا ہوں - وہ بالکل ٹھیک ہے - ایک مرتبہ جب میں ابھی

بچہ تھا میں نے اسکندریہ کے بازار میں ایک ہندوستانی شعبدہ باز
کو دیکھا تھا جس کے اردگرد بہت سے لوگ جمع تھے۔اس کے سامنے
ایک میز رکھی تھی جس پر ایک مرغی بیٹھی تھی۔اس مرغی کی چونچ میں
ایک تنکا تھا۔یہ دیکھکر میں نے لوگوں سے کہا تم کیا دیکھ رہے ہو
اس پر ایک عورت کہنے لگی تمہیں یہ مرغی نظر نہیں آتی جس کی چونچ
میں اتنا بڑا شہتیر ہے۔اب میں سمجھ گیا کہ اس ہندوستانی شعبدہ
باز نے ان پر جادو کر رکھا ہے۔شروع ہی میں جب میں نے مسیح کو
بولتے سُنا تو میں سمجھ گیا تھا کہ خدا نے بھی اس شعبدہ باز کی طرح
ایک ایسی شکل پیدا کر دی ہے۔جسے میں مسیح کہتا ہوں ہمارا خیال
ہے کہ سزائے موت دی گئی اس پر مقدمہ چلایا گیا اور اسکو صلیب
دیکر دفن کر دیا لیکن بہت ممکن ہے کہ یہ بھی اسیطرح خیالی شکل
ہو۔

یہودی۔کیا تم سمجھتے ہو کہ اس کے معجزے اس قسم کے ہیں کہ ہم اسے
انسان نہیں کہہ سکتے ؟

مصری۔میرا خیال ہے کہ اگر یہودی ان باتوں کو ذہن میں رکھیں جو
میں نے اور تم نے دیکھی ہیں تو بالکل ممکن تھا کہ تم ان سے دماغ
رومیوں کے حاکم بنجاتے اور یونانیوں کو اپنے ملک سے نکال دیتے۔

یہودی۔ایک مرتبہ مجھے ایک تجارتی جہاز میں طائر کے ارغوانی کپڑے
لیکر گی تھی ام جانیکا اتفاق ہوا تھا لیکن واپس آتے ہوئے
جب ملاح شراب لا رہے تھے کہ میں اسپارٹا کی سیر کے لئے
چلا گیا۔وہاں میں نے ایک بہت بڑا مندر دیکھا جس کے اردگرد
لکڑی اور موم کے بنے ہوئے ہاتھ، پاؤں، آنکھوں، کانوں
اور جسم انسانی کے اندرونی اعضاء کے مختلف نمونے لٹک رہے
تھے۔یہ اس لئے کہ اس دیوی کے ہاتھ سے بہت سے بیماروں
نے شفا پائی تھی اور وہ اسکا شکریہ ادا کرنا چاہتے تھے۔

مصری۔خدا نے اپنے کاہنوں کو بڑی قوتیں عطا کی ہیں۔لیکن مجھے
اس قسم کے معجزوں کا خیال نہیں تھا بلکہ اس کا کہ یسوع ہے کیا؟
میں سمجھتا ہوں کہ وہ خدا کی ناقابل فسق ذات کی تصویر تھا۔اگر ہم
محض ایک تصویر پر ایمان لے آئیں تو آئندہ نسلیں اپنی قربان
گاہوں میں صلیب سا کوئی نہ کوئی ٹکڑا آویزاں کر دیں گے جس پر
اُسے پھانسی دی گئی تھی اور کوئی رومی قیصر یہ سمجھیگا کہ اسکی تمام فتوحات
محض اسی کا نتیجہ ہیں۔

یہودی۔گویا تمہارا یہ خیال ہے کہ اگر ہم محض کسی خیالی وجود یا ظاہری شکل
یا کسی واہمے یا شعبدے پر ایمان لے آئیں تو ہم یونانیوں پر غالب
آ سکتے ہیں ؟

مصری۔کیا یسوع نے یہ نہیں کہا تھا کہ اگر ہم یقین سے کام لیں تو پہاڑ
بھی اپنی جگہ سے ہل جائیں گے۔

یہودی۔لیکن میں نے تم سے یہ بیان نہیں کیا کہ میں نے اس مندر میں
اور کیا دیکھا۔رہبر نے ——— وہاں ایک رہبر ضرور موجود رہتا
ہے ——— مجھے ایک نہایت پرانے چپو کا ایک ٹکڑا دکھایا جسکو
اوڈیسی نے استعمال کیا تھا۔ایسے ہی ایک بہت بڑا انڈا تھا
جو قربانگاہ کی چھت میں ایک طلائی زنجیر میں لٹک رہا تھا۔یہ
لیڈا کا ایک بن سے پاہوا انڈا تھا۔

مصری۔لیڈا کا ایک بن سہا ؟ یہ کیسے ممکن ہے ؟

یہودی۔لیڈا ہی کے ایک دوسرے انڈے سے ھیلن پیدا ہوئی تھی
ھیلن اور اوڈیسی اس کی بدولت یونانی ہمیشہ دنیا پر غالب
رہیں گے۔اس لئے کہ میں نے بھی چپو کے اس ٹکڑے اور انڈے
کو دیکھا تو قربانگاہ کے سامنے سر جھکائے بغیر نہیں رہا۔اسپارٹا
کے اس خزانہ کا کوئی خیالی وجود مقابلہ نہیں کر سکتا۔پیرس نے
ہیلن کے سینے میں ایک دھڑکتا ہوا دل پایا تھا۔

مصری۔لیکن اوڈیسی اور ہیلن مر چکے ہیں مسیح کے متعلق خیال خیال
ہے کہ مر گیا ہے۔

یہودی۔اچھا اب تمہارے ذہن میں کیا بات ہے۔کیا تم سمجھتے ہو
کہ ہم یسوع کو پھر دیکھ سکتے ہیں۔اس لئے کہ اس کی موت محض ظاہری
ہے اور اس کا دوبارہ ظاہر ہونا ناممکن نہیں۔

(دوُر سے طبل کی آواز آتی ہے)

لیکن میں نہیں چاہتا کہ تمہارے دماغ میں اس قسم کے خیالات
بس جائیں۔

مصری۔تم نے ابھی دل کے متعلق کچھ کہا تھا۔ایک دھڑکتے ہوئے
دل کے متعلق، خون کا ایک لوتھڑا جو انسان کو خدا سے جُدا کرتا
ہے۔دل کیا ہے ؟ محض تغیر اور موت ! جہالت، دہ لاعلمی کا مرکز
——— خوفناک دل ———

یہودی۔(جو دروازہ کے پاس کھڑا سن رہا تھا) خاموش، کوئی شخص بازار
سے دروازہ کی چٹخنی کھول رہا ہے۔اس کا خیال رکھنا اگر ہم نے
استقلال سے کام لیا تو ناممکن ہے کہ کوئی اندر آ سکے۔میں کچھ دیر
نیچے جاتا ہوں۔دروازہ کا خیال رکھنا ——— ارے یہ تو شاید

ہو ــــ معلوم ہوتا ہے کچھ سُنکر آیا ہے۔

شامی ۔ (ہانپتے ہوئے) میری کیفیت اس شخص کی سی ہے جو نشہ میں چور ہو ــــ مجھے جُھنجھنی بھی نہ ملتی تھی عجیب واقعہ پیش آیا ہے۔ بالکل بعیداز قیاس۔ میں تمام راستے دوڑتا ہوا آیا ہوں۔

یہودی ۔ بات کیا ہے؟

شامی ۔ مجھے ان گیارہ آدمیوں سے فوراً کہہ دینا چاہیئے۔ کیا وہ ابھی تک اندر ہیں؟ ہر شخص کو جان لینا چاہیئے۔ ہر شخص کو ــــ ہر شخص ــــ

یہودی ۔ دم لے لو اور جو کچھ کہنا چاہتے ہو کہہ ڈالو۔

شامی ۔ میں یسوع کی قبر کیطرف جا رہا تھا۔ کہ مجھے طبریاس کی کچھ عورتیں ملیں۔ مریم یسوع کی ماں، مریم جیمس کی ماں اور کچھ اور عورتیں۔ نوجوان عورتوں کا رنگ مارے تعجب کے زرد ہو رہا تھا۔ وہ ایک ساتھ ملکر کچھ کہنے کو تھیں کہ جیمس کی ماں نے انکو خاموش کر دیا۔ اور مجھ سے کہا کہ دن چڑھے جب وہ قبر کو دیکھنے گئیں ہیں تو وہ خالی پڑی تھی۔ در دازہ پر ایک آدمی کھڑا تھا جسکا سارا بدن چمک رہا تھا۔ وہ ہم سے کہنے لگا "مسیح زندہ ہوگیا"

(طبل اور گھنگروں کی آواز قریب آتی ہے)

جب ہم پہاڑ سے نیچے اتری ہیں تو یکایک ایک آدمی ان کے سامنے آیا وہ خود مسیح تھا۔ اس پر انہوں نے جُھک کر اسکے پاؤں کو بوسہ دیا ــــ اچھا اب مجھے راستہ دو تاکہ میں پطرس، یوحنا اور جیمس سے بھی کہہ دوں ــــ

یہودی ۔ میں تمہیں راستہ نہیں دُونگا۔

شامی ۔ لیکن کیا تمہاری سمجھ میں نہیں آتا کہ ہمارا آقا پھر زندہ ہوگیا ہے؟

یہودی ۔ میں نہیں چاہتا کہ ان گیارہ آدمیوں کو محض عورتوں کے خیالات سے پریشان کروں۔ اصل میں عورتوں کا رنج والم اسقدر شدید تھا۔ کہ وہ جو بھی سمجھ لیں عجب نہیں۔

مصری ۔ مجھے یقین ہے کہ عورتوں نے تم سے جو کچھ کہا ہے ٹھیک ہے لیکن یہودی کا خیال بھی ایک حد تک صحیح ہے۔ پیشتر اس کے کہ ہم یہ بات ان گیارہ آدمیوں سے کہیں ہمیں اس کا یقین ہو جانا چاہیئے۔ اگر ہماری عمر بہت کم ہے لیکن ہم دنیا کو ان سے زیادہ جانتے ہیں۔

شامی ۔ لیکن اگر قبر خالی ہے تو ہم کیسے کہہ سکتے ہیں کہ یہ محض خواب ہے۔ عورتوں نے کہا تھا کہ قبر خالی ہے۔

یہودی ۔ کل رومیوں نے یہ افواہ سُنی تھی کہ ہم میں سے کچھ آدمیوں کا ارادہ ہے۔ کہ لاش کو چرا لے جائیں۔ اور اسی غرض کے لئے یہ قصہ مشہور کر دیا ہے کہ مسیح زندہ ہوگیا ہے۔

شامی ۔ بہرکیف اس بات کو وہ گیارہ آدمی ہم میں سے بہتر سمجھ سکتے ہیں۔

یہودی ۔ میں تو سمجھتا ہوں کہ اس قصے کے متعلق ان کا خیال بھی وہی ہوگا جو میرا ہے۔ البتہ پطرس کی حالت اور بھی خراب ہو جائیگی میں اسکو تم سے بھی بہت پہلے سے جانتا ہوں۔ مجھے معلوم ہے کہ اس کا نتیجہ کیا ہوگا۔ پطرس کو یاد آجائیگا کہ عورتوں میں سے کوئی بھی پیچھے نہ تھی۔ ان میں سے کسی نے بھی اپنے آقا کا انکار نہیں کیا۔ اس خواب سے بھی ان کی محبت اور یقین کا اظہار ہوتا ہے۔ اس سے پطرس یہ سمجھیگا کہ وہ دونوں سے محروم ہو چکا ہے۔ اس کا خیال ہوگا کہ یوحنا اس کی طرف دیکھ رہا ہے۔ اس پر وہ اپنے چہرہ کو ہاتھوں سے چھپا لیگا۔

مصری ۔ تمہارے آنے سے پہلے میں کہنے ہی والا تھا کہ معلوم نہیں مسیح کسوقت ظاہر ہو جائے۔ میں اس کا مقابلہ ہیلن اور اوڈی سی آس سے کر رہا تھا جو اب کبھی زندہ نہیں ہو سکتے۔

شامی ۔ یکایک مجھے خیال آیا ــــ اسوقت جب میں دوڑ رہا تھا اس کے کاہن شور کرتے ہوئے گزر چکے تھے ــــ کہ گو کسی نہ کسی بہانے یونان اور ایشیائے کوچک میں لوگوں نے نسلاً بعد نسل ایڈونیسر یا ڈایونی سی اس کی موت اور بعثت ثانیہ کی یاد منائی ہے لیکن اب خدا نے رقص وسرود کو واقعی پیش گوئی کی صورت دیدی ہے تاکہ ہماری مصیبتوں میں ایک شان تقدس پیدا ہو جائے لوگ جس چیز کے خواب دیکھا کرتے تھے پوری ہوگئی۔ خدا نے خود جسمانی صورت اختیار کر لی۔

مصری ۔ خدا کی صورت ضرور ہے لیکن جسم نہیں۔ نہ اُسے دیکھا جا سکتا ہے۔ نہ چھُوا جا سکتا ہے۔ لیکن خدا انسانوں سے ایک خیالی جسم کے ذریعہ ہمکلام ہو سکتا ہے۔ ہمارے جہاں اسکندریہ میں سنگتراشوں نے اسکندر اعظم کا ایک مجسمہ بنایا ہے جو ہو بہو اُس سے مشابہ ہے لیکن اس کے پہلو میں کوئی دل نہیں مسیح نے جب اپنی تعلیمات کا وعظ کہنا شروع کیا ہے تو اس کی عمر ٹھیک تیس برس کی تھی۔

شامی ۔ اگر مسیح کا وجود محض خیال ہے تو وہ کون عورت تھی جس سے

میں ابھی ملکر آیا ہوں۔ اور جسکو لوگ "مسیح کی ماں" کہتے ہیں۔

مصری ۔ خدا نے اُسے یقین دلا دیا تھا کہ وہ واقعی اس کی ماں ہے تاکہ اصل حقیقت کا پتہ نہ چل سکے۔ کیا تمکو یاد نہیں یہودی نے ابھی کہا تھا کہ عورتوں کو ہر بات کا یقین ہو جاتا ہے۔

شامی ۔ لیکن ــــــ

مصری ۔ میری بات سنو۔ ھرمیز اعظم کا قول ہے کہ فانی اور غیر فانی اختلاط ممکن نہیں۔ لہذا یہ کہنا کہ خدا ایک عورت کے بطن سے پیدا ہوا جو اسے بچوں کی طرح پالتی رہی بے دینی کی انتہا ہے۔

شامی ۔ گویا تمہارا خیال ہے کہ خدا نے ہمارے لئے جان نہیں دی؟

مصری۔ خدا موت سے بالاتر ہے۔

شامی ۔ (یہودی سے) تم میری بات سمجھ سکتے ہو لیکن یہ مصری نہیں سمجھ سکتا۔ اس لئے کہ اس کے خیالات تقریباً یونانیوں کے سے ہیں۔ ہم اپنی زندگی میں طرح طرح کی مصیبتیں اٹھاتے ہیں۔ اور سمجھ لیتے ہیں کہ ہماری کوئی حقیقت نہیں لہذا جس عمل سے فائدہ لیکن خدا نے کہا ہے۔ میں تمہاری مصیبتوں میں حصہ لونگا اور تمہیں بتاؤنگا کہ میں نے جو کچھ کیا ہے تمہاری محبت کے لئے کیا ہے۔ اگر میں ایسا کرونگا تو پھر انسان یہ نہیں سمجھیگا کہ وہ بے حقیقت پیدا ہوا۔ اسی لئے وہ دنیا میں آیا، پیدا ہوا اور مرگیا، ظاہراً نہیں بلکہ واقعتہً۔ مجھے کسی خیالی وجود کی کیا پرواہ ہو سکتی ہے جسکی مصیبتیں محض ظاہری ہوں۔

(طبل کی آواز قریب آتی ہے)

مصری ۔ تم جو کچھ کہتے ہو ناممکن ہے۔ لیکن باہر اسقدر شور ہو رہا ہے کہ میں تمہیں اپنا مطلب نہیں سمجھا سکتا۔

یہودی ۔ دونوں باتیں غیر ممکن ہیں نہ تمہارے خیالی وجود کی کوئی حقیقت ہے نہ تمہارے خدا کی جسے کھانے پینے کی ضرورت رہتی تھی۔ میرے ذہن میں تو صرف ایک ہی بات آتی ہے اور وہ یہ کہ یسوع نے اپنے آپ کو بھی دھوکا دیا اور ہمیں بھی اور یہ محض اپنی محبت کی وجہ سے۔ بہرکیف اب وہ مرچکا ہے۔

(کھڑکی کی طرف جاتا ہے)

ڈایونی سی اس کے کاہن مکان کے دوسری طرف ہیں۔ لیکن اب انہوں نے تابوت کو چھپا دیا ہے۔ اب غالباً وہ دیوانہ وار چلائینگے کہ خدا زندہ ہوگیا۔ شہر کے ہر گلی کوچے میں یہی کہتے پھرینگے اور جب چاہیں گے اپنے خدا کو زندہ کریں گے۔ جب چاہینگے مار ڈالیں گے۔

لیکن وہ اب خاموش کیوں کھڑے ہیں؟ کیا اس لئے کہ وہ خاموش ناچ رہے ہیں یا بھی ان کی خیالی خوشیوں کا کوئی حصہ ہے۔ اب وہ قریب آرہے ہیں۔ اور قدیم شامیوں کی طرح ناچ رہے ہیں۔ ذرا دیکھنا وہ اپنی رنگین آنکھوں کو کسطرح حرکت دیتے ہیں۔ کیا سچے آدمیوں کے جذبات کی یہی صورت ہوتی ہے۔ لیجئے اب وہ کمرے کے نیچے پہنچ گئے۔ سنو وہ شرابی کا گیت گا رہے ہیں۔

یہودی ۔ یہ لوگ یکایک خاموش کیوں ہوگئے؟ وہ اپنے بازوؤں کو سر پر اٹھائے خاموش اس مکان کو کیوں دیکھ رہے ہیں؟

مصری ۔ کمرے میں کون ہے؟

یہودی ۔ کہاں۔

مصری ۔ میں یہ نہیں کہہ سکتا کہ کہاں۔ لیکن میرا خیال ہے کہ میں نے کمرہ میں کسی کو سانس لیتے سنا ہے۔

یہودی ۔ نہیں نہیں۔ کوئی نہیں۔ ہماری اطلاع کے بغیر یہاں کوئی نہیں آسکتا۔ دیکھو دروازہ بدستور بند ہے۔

مصری ۔ وہ دیکھو پردہ ہل رہا ہے۔

یہودی ۔ ہرگز نہیں۔ اس کے پیچھے سوائے خیالی دیوار کے اور کچھ نہیں۔

مصری۔ دیکھو! دیکھو!!

یہودی ۔ بیشک پردہ ہل رہا ہے۔

مصری ۔ آہ مصر کے خدا۔ اسمیں سے یہ کون آرہا ہے۔

(وہ پردہ سے دُور ہٹ جاتے ہیں شامی اندرونی کمرہ کے دروازہ کی طرف چلا جاتا ہے۔ یہودی اسٹیج کے پیچھے پردے میں مسیح کی شکل نمودار ہوتی ہے)

یہ مسیح کی شکل ہے۔ ارے تم ڈر کیوں گئے؟ مسیح کی لعنت کوئی تعجب خیز بات نہیں۔ اسے کسی نے پھانسی نہیں دی تھی نہ کسی نے دفن کیا تھا۔ یہ محض شکل ہے ــــ خیالی وجود ــــ اسمیں نہ گوشت ہے نہ خون میں حقیقت سے واقف ہوں اسلئے مجھے ڈر نہیں لگتا۔ اور دیکھو میں اسکو چھوتا ہوں ممکن ہے میں اسے چھوؤں تو مجھے سخت معلوم ہو یا میرا ہاتھ اس میں گذر جائے۔ بہرکیف میں ان باتوں کو سن چکا ہوں۔

(آہستہ سے مسیح کی شکل کے پاس جاتا ہے اور اُسے ہاتھ سے چھوتا ہے)

ارے اس کا دل دھڑک رہا ہے۔

(مسیح کی شکل کے لئے راستہ چھوڑ دیتا ہے مسیح کی شکل اندرونی

(کمرہ میں داخل ہوتی ہے ۔ شامی پہلے ہی اسمیں چلا جاتا ہے
یہودی اسٹیج کے پیچھے دبک جاتا ہے ۔)

کسقدر خوفناک واقعہ ہے ۔ میرا خیال تھا کہ میرا ہاتھ اس میں سے گذر جائیگا ۔ وہ ان کے درمیان کھڑا ہے ۔ ان میں سے کچھ خوفزدہ معلوم ہوتے ہیں ۔ اب وہ پطرس اور جیمس کو دیکھ رہا ہے ۔ اور مسکرا رہا ہے ۔ طامس اس سے کچھ کہہ رہا ہے اور وہ جواب دے رہا ہے ۔ وہ اس نے اس کے پہلو سے کفن کو ہٹا دیا ۔ اوہ اسمیں تو بہت بڑا زخم ہے ۔ طامس اپنے ہاتھ سے زخم کو دیکھ رہا ہے ۔ اور وہ سب اس کے اردگرد جمع ہیں ۔ غالباً اس نے پھر کچھ کہا ۔ شائد ڈایونی سی اس کے کاہن ابھی تک ہاتھ اٹھائے بازار میں خاموش کھڑے ہیں ۔

(کھڑکی کے پاس جاتے ہوئے)

ہاں وہ اسیطرح کھڑے ہیں اور مبہوت ہو کر اس کی طرف دیکھ رہے ہیں ۔ شرابی بدستور ناچ رہے ہیں لیکن نہیں کچھ معلوم نہیں ——— وہ طبریاس کی عورتیں مریم یسوع کی ماں اور مریم جیمس کی ماں پہاڑ کے نیچے اتر رہی ہیں ۔ تاکہ انہوں نے جو کچھ دیکھا ہے لوگوں سے بیان کر دیں ۔ انہیں معلوم تو ہے لیکن یہ معلوم نہیں کہ یہ واقعہ کیسا تھا ۔ عجیب ہے ۔ آج سے پہلے کسی خیالی شکل کا دل کبھی نہیں دھڑکتا تھا ۔ عجیب بات ہے کسقدر عجیب بات ہے ۔ معلوم ہوتا ہے عقل کا خاتمہ ہو چکا ہے

(بلند آواز میں)

اے اہلِ روما ، اے اہلِ یونان ۔ اے اہلِ مصر ! جس معجزے کا انتظار تھا آگیا ۔ اب تمہارا خاتمہ ہے ۔ تمہاری خلاف عقل قوتوں کا خاتمہ ہے ۔ دیکھو ایک خیالی شکل کا دل دھڑک رہا ہے ۔

سیّد نصیر احمدؐ

یاسمین

تیرہ فامی شام کی اور باغ کا سبزہ اُداس — یاسمیں نے دیکھ کر اک پھول روشن کر دیا
چاندنی میں چاند کی خنکی بھی تھی نرمی بھی تھی — تجھ میں کس گلکار نے رنگِ تبسّم بھر دیا

چشم و دل ظلمات میں اے پھول اک سورج ہے تو — مدّتوں تک تری صورت ان میں غوطے کھائیگی
بانٹ دے اپنا اجالا آج تو بیدار رہے — باغباں کی گود میں کل تجھ کو نیند آجائیگی

شہرت

۱

مشہور و معروف مصنف نے عنبری سگرٹ اپنے دانتوں میں پکڑتے اور ٹانگیں میز پر پھیلاتے ہوئے کہا " ہلاری جونز" یہ کہکر اُس نے بے خیالی سے وزٹنگ کارڈ میز کے ایک کونے پر رکھ دیا اور سامنے کھڑے ہوئے سنجیدہ اور متین صورت شخص کی طرف متوجہ ہو کر کہا " میں آپ کی کس طرح مدد کر سکتا ہوں ؟"

ہلاری جونز نے کہا " نہیں ، مجھے آپ کی مدد کی ضرورت نہیں

مارما ڈیوک موزیلی نے اس شخص کی طرف خاص انداز دیکھنا شروع کیا ہلاری جونز نے کہا " آپ ہی مارما ڈیوک ہیں ۔ جن کے چھوٹے پلاٹوں کے افسانے ، اخباروں اور رسالوں میں شائع ہوتے ہیں ۔

یہ سُنکر مار ڈیوک نے بہت خلق کے ساتھ اپنا برف کا سا سفید ہاتھ ہلایا ۔ گویا وہ اس بات کو تسلیم کرتا ہے ۔ وہ دل ہی دل میں خیال کرتا تھا ۔ ہاں میں ہی تو مارما ڈیوک ہوں جو اپنے تعجب انگیز افسانوں کی وجہ سے مشہور ہو چکا ہوں ۔ اور ادبی حلقوں میں میرے مختصر افسانوں کی دھوم مچی ہوئی ہے ۔ یہ سوچکر وہ اپنی چرمی کرسی پر سنبھل کر بیٹھ گیا اور اپنے سوٹ کی شکنوں کو ہاتھ سے صاف کرنے لگا ۔

ہلاری جونز نے کہا " آپ نے مجھے کرسی پر بیٹھنے کی ابتک اجازت نہ دی ؟ یہ کہکر اُس نے ایک افسانہ اپنی جیب میں سے نکالا اور مار ڈیوک کو دیتے ہوئے کہا " اس افسانے کو ملاحظہ فرمائیے "

مار ڈیوک نے جماہی لی اور ہلاری جونز کے ہاتھ سے چند ٹائپ شدہ اوراق لیکر پڑھنا شروع کیا ۔ یہ ایک مختصر کہانی تھی جسے پڑھ کر اسے سخت حیرت و تعجب ہوا ۔ لیکن اُس نے اس حیرانی کا اظہار نہ کیا اور خاموش رہا ۔

ہلاری جونز نے جب یہ دیکھا کہ پہلا افسانہ ختم ہو گیا ہے تو دوسرا افسانہ دیا اور کہا " یہ بھی دیکھ لیجئے " مارما ڈیوک نے اس افسانے کو بھی پڑھ لیا اور پھر اس شخص کی طرف تیز اور معنی خیز نظروں سے دیکھنا شروع کیا اور کچھ دیر بعد کسی گہرے خیال سے چونک کر پوچھا ۔ آپ کون صاحب ہیں ؟"

پستہ قد شخص نے جواب دیا " ہلاری جونز "

" اچھا اب اس افسانے کو ملاحظہ کیجئے اور جب یہ ختم ہو جائے تو پھر اس کو پڑھئے " اس کے بعد وہ کسی قدر ٹھیر گیا اور کچھ سوچ کر کہا " آپ نے مجھے بیٹھنے کی اجازت نہیں دی " ؟

مارما ڈیوک نے ان سب افسانوں کو پڑھا ۔ اس کی پیشانی پر بل پڑنے لگے ، اور افسانوں کے تمام اوراق میز پر رکھ کر اُس نے نووارد کی طرف دیکھتے ہوئے کہا " خوب !

ہلاری نے کہا کیا ارشاد فرمایا ؟ "

مارما ڈیوک :" افسانے سب ۔ بہت ۔ بہت ، یعنی بہت ہی اچھے ہیں اور میں نہایت زور کے ساتھ کہہ سکتا ہوں کہ وہ سب میری طرز تحریر سے ملتے جلتے ہیں ۔ کیا ـــــــ ؟"

" ہلاری جونز نے قطع کلام کرتے ہوئے کہا " آپ نے مجھے بیٹھنے کی اجازت نہیں دی " پھر کہا " جناب جیسے افسانے آپ لکھتے ہیں ، اسی قسم کے میں بھی لکھ سکتا ہوں ، اور اگر پبلک ان دونوں قسم کے افسانوں کو پڑھ کر ہرگز امتیاز نہیں کر سکتی ۔ مگر میں جب کسی ایڈیٹر کو اپنے افسانے بھیجتا ہوں تو وہ مجھے واپس روانہ کر دیتا ہے ۔ کیوں ؟ ـــــ "

مارما ڈیوک نے سر ہلایا گویا وہ اس سے متفق ہے ۔

پستہ قد شخص نے سلسلہ گفتگو جاری رکھتے ہوئے کہا " کیونکہ ہلاری جونز کسی خاص شہرت کا مالک نہیں ۔ ادبی حلقوں میں وہ بالکل گمنام ہے اور اس کی کچھ وقعت نہیں ۔ مگر ـــ آپ مختصر افسانہ نویسوں میں سب سے زبردست مصنف شمار کئے جاتے ہیں ۔ کیونکہ آپ کے افسانوں میں جس قسم کے پلاٹ نظر آتے ہیں وہ بالکل اپنی طرز کے اور انوکھے ہوتے ہیں ۔ میرے افسانوں کے پلاٹ بھی بالکل آپ کے پلاٹوں کی طرح ہیں مگر پھر بھی میرے ـــــ "

مار ڈیوک نے کہا " خیر مجھے اس سے کیا غرض آپ یہ فرمائیے کہ آپ کو میں کس طرح مدد دے سکتا ہوں "

ہلاری جونز نے کہا " نہیں مجھے آپ کی مدد کی ضرورت نہیں ۔ میں خود آپ کی مدد کرنے کے لئے تیار ہوں ۔ سُنئے "

مار ڈیوک ہمہ تن گوش ہو گیا ۔

" آپ نے ابتک مجھے بیٹھنے کی اجازت نہیں دی " ہلاری جونز نے کہا جناب ! آپ جس قدر افسانے تصنیف کرتے ہیں وہ سب بک جاتے ہیں ۔ لیکن آپ اتنے کافی افسانے نہیں لکھ سکتے کہ ان ایڈیٹروں کے روز افزوں

مطالبے کو پورا کر سکیں جو آپ کے افسانوں کے لئے سینکڑوں روپے دینے کے لئے تیار رہتے ہیں۔ کیوں؟ اس کی وجہ صاف ظاہر ہے۔ آپ کا دن صرف چوبیس گھنٹے کا ہوتا ہے اور اس میں صرف ایک ہی دن کا کام ہو سکتا ہے اس سے زائد کام کرنے کی آپ میں طاقت نہیں۔ اس لئے ضرورت پوری نہیں کی جا سکتی اچھا۔ اب آپ کو یہ معلوم ہے کہ دنیا میں ایک شخص آپ کی طرح کے افسانے لکھ سکتا ہے اس کا طرز تحریر آپ کے طرز تحریر سے بہت حد تک ملتا ہے اور اکثر اوقات بالکل ایسا منطبق ہو جاتا ہے کہ امتیاز نہیں کیا جا سکتا۔ جملوں کی ساخت بھی عجیب ہوتی ہے۔ پلاٹ بالکل اچھوتے اور عبارت ظرافت کی چاشنی لئے ہوئے ہے۔ آپ نے میرے افسانے پڑھے ہیں آپ کو یہ بھی معلوم ہو چکا ہے کہ آپ جیسی ایک اور شخصیت موجود ہے اگر وہ شخص آپ کو افسانے لکھ دے اور آپ انہیں "مارماڈیوک" کے نام سے شائع کر دیں تو اس طرح چوبیس گھنٹوں کو اڑتالیس گھنٹوں میں تبدیل کر کے آپ اپنے افسانوں کی تعداد دگنی کر سکتے ہیں۔ خیال تو فرمائیے میں آپ کیلئے کس قدر آمدنی کا ذریعہ بن سکتا ہوں۔

مارماڈیوک نے کہا "آپ تشریف رکھئے۔

ہلاری جونز ایک کرسی سرکا کر بیٹھ گیا۔

مارماڈیوک: "اب ہمیں تفصیل کے ساتھ گفتگو کرنی چاہیئے! ان باتوں سے کام نہ چلیگا۔"

وہ بہت دیر تک معاملہ کے ہر ہر پہلو پر تفصیل کے ساتھ گفتگو کرتے رہے۔ جب معاملہ کے نشیب و فراز پر اچھی طرح غور کر لیا تو ہلاری جونز نے سگرٹ سگرٹ کا ایک کش لگا کر کہا۔ بس تو آج سے میں آپ کا علمی معاون ہوں اور آپ اب اپنے افسانوں کی تعداد دگنی کر سکتے ہیں۔ میں بیس افسانے ایک ہفتہ میں لکھ دیا کروں گا اور بیس آپ بھی لکھ لیں گے۔ اس طرح چالیس افسانوں کی اوسط ہو جائیگی۔ اور سب افسانے ہر ہفتہ ایڈیٹروں کو بھیجدیے جایا کریں گے جن پر "مارماڈیوک" کا نام تحریر ہو گا۔ ان افسانوں کے معاوضہ میں جو اُجرت ملے گی اس کا نصف نصف بانٹ لیا کریں گے۔

مصنف نے کہا "مارماڈیوک آج سے بیس افسانے ہر ہفتہ لکھا کریگا۔ اور آپ کی خدمات کے صلہ میں آپ کو ہر ہفتہ پانچ گنی کی رقم ملا کرے گی۔"

ہلاری جونز گنیوں کا نام سنکر چونک پڑا۔

"کیا مجھے ہر ——— "

مارماڈیوک نے کرخت لہجے میں کہا "ہر ہفتہ پانچ گنی ملا کریگی۔"

"لیکن ———"

"اگر آپ اس کو قبول کرنا چاہتے ہیں تو کر لیجے ورنہ اپنا راستہ لیجے۔"

"مجھے منظور ہے۔" ہلاری جونز نے دبی زبان سے کہا۔

(۲)

ہلاری جونز نے جو افسانے لکھے تھے۔ وہ مارماڈیوک کے افسانوں سے بالکل منطبق ہوتے تھے۔ لیکن دونوں کے افسانے "مارماڈیوک" کے نام سے ہی شائع ہوتے تھے۔ گو اس کے افسانے مارماڈیوک کے افسانوں سے کسی قدر بہتر ہوتے تھے۔ مگر اتنے نہیں کہ لوگ ان میں کچھ تمیز کر سکیں۔

ایڈیٹروں نے مارماڈیوک کے نام اظہار مسرت و مبارکبادی کے خطوط لکھنے شروع کئے کہ وہ کس طرح اپنی پہلی شہرت کو چار چاند لگا رہا تھا۔ اس عام شہرت سے مارماڈیوک کے افسانوں کے بہت سے خریدار پیدا ہو گئے اور افسانوں کی فروخت دگنی ہو گئی۔ مارماڈیوک کے پڑھنے والوں کی تعداد بڑھ رہی تھی اور ایڈیٹر بھی اس کے افسانے شائع کرنے کی کوشش میں رہتے تھے۔

ہلاری جونز ہفتہ بھر تک ٹائپ رائٹر پر بیٹھا ہوا ٹپ ٹپ کرتا رہتا۔ اور سنیچر کے دن بیس افسانے لکھ کر مارماڈیوک کو دیتا تھا۔ اور اس کے عوض میں پانچ گنیاں جیب میں ڈال کر بے چون و چرا اپنے گھر کا راستہ لیتا پیر کے دن پھر صبح کام پر واپس آتا اور ہفتہ بھر کام کر کے پھر پانچ پونڈ پانچ شلنگ (پانچ گنی) لیجاتا اور مارماڈیوک کے اس کیش بکس کی طرف نظر اٹھا کر بھی نہ دیکھتا جس میں روزانہ سونے کی گنیاں چھناچھن پڑتی رہتیں۔

(۳)

اسی طرح کئی مہینے گذر گئے اور دو ٹائپ رائیٹر برابر دن رات ٹپ ٹپ کرتے رہتے اور دونوں ٹائپ رائٹروں میں سے ایسے افسانے نکلتے جن پر "مارماڈیوک" کا نام لکھا ہوتا۔ پبلک اس کے افسانوں سے بیحد محظوظ ہوتی تھی۔ اور خوش ہو کر ایڈیٹروں کو خطوط لکھے جاتے۔ اور ایڈیٹر بھی مارماڈیوک موزیلی سے مزید افسانوں کے لئے تقاضا کرتے۔ اور اسے یقین دلاتے کہ اُس کے افسانوں کا معیار اب اس قدر بلند ہو چکا ہے کہ آج تک ایسے بلند پایہ افسانوں کی مختصر افسانہ نویسی کی تاریخ میں نظیر نہیں ملتی۔

اس قسم کے تعریفی خطوط لکھنے والے وہ نئے ایڈیٹر ہوتے۔ جو مارماڈیوک کے افسانوں کے نئے نئے خریدار بنتے۔ ان لوگوں کی مانگ کو پورا کرنے کے لئے ہلاری جونز ٹائپ رائٹر پر بیٹھا ہوا "مارماڈیوک کے نام سے افسانے لکھ لکھ کر دیتا تھا۔

چند ہفتے بعد مارماڈیوک کی تیوری پر بل پڑنے لگے کیونکہ اس کے پرانے ایڈیٹروں کی طرف سے شکایتی خطوط آرہے تھے وہ اپنا سا ماعدہ

کام نئے ایڈیٹروں کے حوالے کر دیتا ہے اور پرانے ایڈیٹر جو اس کے پرانے گاہک اور اس سے دیرینہ تعلقات رکھتے ہیں محروم رہ جاتے ہیں۔

اسی طرح بارہ مہینے گذر گئے مارماڈیوک ان شکایتی خطوط کی بھرمار سے تنگ آگیا اور ایک دن ہلاری جونز کے پاس آیا۔ ہلاری بھی خوب جانتا تھا کہ وہ اس کے پاس کس غرض سے آیا ہے اور آئندہ معاملہ کیا صورت اختیار کرنے والا ہے۔

مارماڈیوک نے آکر کہا "ہلاری جونز تمہارے دیگر افسانے پرانے ایڈیٹروں کو دیا کروں گا کیا تم افسانوں کی تعداد نہیں بڑھا سکتے؟"

جس قدر آپ چاہیں لے سکتے ہیں"۔

اب پرانے ایڈیٹروں کو ہلاری جونز کے افسانے بھیجے جاتے اور نئے ایڈیٹروں کو مارماڈیوک ہی افسانے تصنیف کر کے بھیجتا۔ مگر دونوں جگہ مارماڈیوک ہی کے نام سے افسانے شائع ہو رہے تھے۔ لیکن جب ہلاری جونز ہفتہ کے آخر میں تنخواہ کے لفافہ کو اُٹھا کر دیکھتا تھا تو وہاں وہی پانچ پونڈ ۵ شلنگ ہوتے۔

اب مارماڈیوک کے روپے کی طرف ہلاری جونز کی نظریں بھی للچائی ہوئی پڑنے لگیں کیونکہ وہ برابر کی محنت کا شریک تھا۔ لیکن ابھی تک خاموش تھا کہ کوئی مناسب موقع ملے اور شکایت کرے۔

مارماڈیوک کے نام سے دلکش افسانے اب ہلاری جونز کے ٹائپ رائیٹر سے برآمد ہو رہے تھے۔ اور مارماڈیوک کے پرانے ایڈیٹروں کے لئے کافی تھے کیونکہ اب انہیں پورا اطمینان ہو گیا تھا کہ مارما اپنا سارا عمدہ ذخیرہ ان کے حوالے کر دیتا ہے۔ مگر لازمی طور پر اب نئے رسالوں کی سرد بازاری شروع ہو گئی اور مارماڈیوک سے شکایتیں ہونے لگیں کہ اب اس کے افسانے اتنے اچھے نہیں ہوتے۔ جتنے شروع شروع میں ہوا کرتے تھے اور اُن کی مجموعی تعداد بھی بتدریج کم ہو رہی تھی۔

مارماڈیوک نے ایک دن پھر ہلاری جونز سے کہا" آئندہ کے لئے تجویز نہایت مناسب معلوم ہوتی ہے کہ ہم دونوں اپنے افسانوں کو ملا جلا کر بھیجیں۔ یعنی ایک ہفتے تک تمہارے افسانے پرانے ایڈیٹروں کو بھیجے جائیں اور نئے ایڈیٹروں کو میرے۔ دوسرے ہفتے تمہارے افسانے نئے ایڈیٹروں کو جائیں اور پرانے ایڈیٹروں کو میں اپنے افسانے بھیجوں اس کے بعد پھر اس طرح سے پبلک تمیز نہ کر سکے گی کہ کونسے طبقے میں اعلےٰ قسم کے افسانے شائع ہوتے ہیں اور کون سے میں کمتر درجے کے"۔

ہلاری جونز نے کہا" جیسا آپ مناسب خیال فرمائیں میں اس کی تائید کرنے کے لئے تیار ہوں لیکن آج سنیچر کا روز ہے کیا آپ میری تنخواہ کا لفافہ مجھے عنایت کریں گے مارماڈیوک نے یہ سنتے ہی ۵ پونڈ ۵ شلنگ کا لفافہ جونز کے ہاتھ میں دیدیا جسے ہلاری نے دیکھ کر بہت پیچ و تاب کھایا اور منہ سے ایک لفظ نکالے بغیر کرسی پر سے اُٹھا ہیٹ اُٹھائی اور تنخواہ مارماڈیوک کی میز پر پھینکی اور دروازہ کھول کر سیدھا روانہ ہو گیا۔

دوسرے دن پھر صبح کو دروازہ کھلا اور ہلاری جونز کمرہ میں آیا اور مارماڈیوک سے کہا۔

"آداب عرض میرا نام ہلاری جونز ہے"۔

مارماڈیوک نے کبیدہ خاطر ہو کر کہا" ہاں بیشک، آپ کا یہی نام ہے لیکن اس سے کیا غرض ہے اور آخر اس تماشہ کا کیا مطلب ہو سکتا ہے"۔

" میں مختصر افسانے تصنیف کرتا ہوں"۔ ہلاری جونز نے کہا" آپ نے مجھے بیٹھنے کی اجازت نہیں دی۔

مارماڈیوک نے کہا" تشریف رکھیے"۔

ہلاری جونز بیٹھ گیا۔

(۴)

اُس نے نہایت آہستگی کے ساتھ کہنا شروع کیا" آج کل اخباروں اور رسالوں میں ایک ہی قسم کے دو معیاروں کے افسانے شائع ہو رہے ہیں جو طرز تحریر میں بہت کچھ ملتے جلتے ہیں اور دونوں قسم کے افسانے ایک شخص مارماڈیوک کے نام سے شائع ہوتے ہیں۔ ان افسانوں میں ایک قسم بہت اعلیٰ ہوتی ہے اور دوسری کسی قدر کمتر۔ اعلےٰ قسم کے افسانے مارماڈیوک خود تصنیف کرتا ہے ——"

مارماڈیوک نے ایک گہرا سانس لیا۔

مسٹر جونز نے کہنا شروع کیا" افسانہ خواں پبلک مارماڈیوک کے افسانے پڑھنے کی بہت عادی ہو گئی ہے اور اسی طرز کے افسانے بہت پسندیدہ نگاہوں سے دیکھے جاتے ہیں۔ لیکن پچھلے اٹھارہ مہینوں میں ان کا مذاق اچھے اور برے افسانوں میں تمیز کرنے میں بہت بلند ہو گیا ہے اور ایک خاص معیار کے افسانے بہت بلند خیال کئے جاتے ہیں۔ پبلک کی نمایندگی کرنے والی جماعت ایڈیٹروں کی ہوتی ہے اور ایڈیٹر لوگ گنیاں گنواتے ہیں۔ پس اس لئے آپ اچھی طرح اندازہ لگا سکتے ہیں کہ اگر یہ قایم شدہ معیار اپنی بلندی سے گر جائے تو اس کا کیا نتیجہ ہوگا؟"

مارماڈیوک نے خود بخود کچھ کچھ بڑبڑانا شروع کیا۔

ہلاری جونز بولا۔ معیار گر جانے کی ایک نظیر ہمارے پاس پہلے تجربہ کی موجود ہے۔ مثلاً آپ کو یاد ہوگا کہ جب میرے افسانے نئے ایڈیٹروں کو

بھیجے جاتے تھے تو پرانے ایڈیٹروں کو آپ سے شکایت تھی کہ آپ اپنا سارا عمدہ ذخیرہ نئے ایڈیٹروں کو دیتے ہیں اور پرانے پامال شدہ پلاٹوں کے افسانے پرانے ایڈیٹروں کے حصے آتے ہیں۔

آپ کو یقیناً یہ بھی یاد ہوگا کہ کس طرح جب نئے معیار کے افسانے دیگر پرانے ایڈیٹروں کی دلجمعی کر دی گئی تھی اور نئے ایڈیٹروں کو ملے جلے افسانے دیئے گئے تو اس تجربہ کا کیا نتیجہ ہوا۔ غرض آپ معاملہ کے نشیب و فراز سے اچھی طرح واقف ہیں اور مسٹر مارماڈیوک! آپ مطمئن رہئے۔" ہلاری جونز" اور صرف "ہلاری جونز" ہی ایک شخص ہے جو "مارماڈیوک" کے نام سے منسوب شدہ معیار کو قائم رکھ سکتا ہے۔ میرے سوا دنیا میں دوسرا کوئی شخص نہیں۔ اب آپ میرا مطلب خوب اچھی طرح سمجھ گئے ہوں گے۔ فرض کیجیے میں آپ سے کنارہ کشی اختیار کر لوں ایسی صورت میں آپ "مارماڈیوک" کے نام سے بُری قسم کے افسانے پبلک کو دھوکا دیکر زیادہ عرصہ تک نہیں شائع کر سکتے۔ ایک نہ ایک دن پول ضرور کھلیگا۔ بس میرا ایک مشورہ ہے کہ آپ میرے بلند معیار کے افسانوں کو قبول کرنے کے لئے تیار ہو جائیے اور میرے ساتھ ملکر کام کرنے کا وعدہ کیجیے اگر ایسا نہ کیا تو بعد میں پچھتانا پڑیگا۔

مارماڈیوک ہونٹ چاٹ رہا تھا۔

"ہم ـــــــ یا یوں کہنا چاہیے کہ میں آپ کی تنخواہ میں اضافہ کئے دیتا ہوں۔ مسٹر مارماڈیوک موزیلی نے کہا۔

ہلاری جونز اس پر بے اختیار ہو کر ہنس پڑا۔

"کیوں جناب! یہ تنخواہ کیسی ـــــــ آج سے تو میں مارماڈیوک ہوں" اور "مارماڈیوک" کے نام سے جن معیاری افسانوں کی توقع کی جا سکتی ہے انہیں تصنیف کرنے والی میری اور صرف میری ہستی ہے۔ اب تمہیں اپنے افسانوں کی اجرت کے لئے ہر سنیچر کو میرا دست نگر بننا پڑیگا۔"

مارماڈیوک نے دبی آواز سے کہا" اجی حضرت! بس غصہ جانے دیجیے لیجیے میں گنیاں ہر ہفتے لے لیا کیجیے۔"

پستہ قد شخص آگے جھک گیا اور یوں گویا ہوا۔ ہر دن کے چوبیس گھنٹے ہوتے ہیں اور میں چوبیس گھنٹوں میں صرف چوبیس ہی گھنٹے کام کر سکتا ہوں۔ کیونکہ جو کام جتنے عرصہ کا ہوتا ہے وہ اتنی دیر میں ہی ہوتا ہے میں جتنے افسانے فروخت کر سکتا ہوں اتنے کسی صورت میں نہیں لکھ سکتا اور میرے افسانوں کی مانگ برابر بڑھ رہی ہے۔ اب اگر مجھے کوئی ایسا شخص مل جائے جو میری طرح اور میری ہی طرز تحریر کے افسانے تحریر کر سکتا ہو تو میں اُس شخص کو ملازم رکھ لوں گا۔ اور اس طرح میں اپنے ایڈیٹر کو دُگنے افسانے دے سکوں گا۔ وہ شخص آپ ہیں۔

مارماڈیوک موزیلی نے کہا" کیا میں ہوں؟"

آپ بالکل مطمئن رہیئے سب انتظام ابھی ہو جائیگا اور آپ ہی وہ شخص ہیں"

اچھا معاملہ طے کر لیجیے" بس ہمارے اور آپ کے درمیان یہ طے ہو جانا چاہیے کہ ہم دونوں ملکر جو کچھ کمائیں اس کا نصف نصف تقسیم کر لیں۔ اور ـــــــ

ہلاری جونز نے قطع کلام کرتے ہوئے کہا" بس مجھے ہر ہفتے تیس افسانے دیدیا کیجیے گا اور میرا خیال ہے کہ آپ ایسا آسانی کر سکتے ہیں میں آپ کی خدمات کے صلہ میں پانچ گنی فی ہفتہ کی شرح سے اجرت ادا کرتا رہوں گا۔

"لیکن ـــــــ" موزیلی نے ہانپتے ہوئے کہا۔

جونز نے آگاہ کرتے ہوئے پھر کہا" آپ اس پر مزید غور فرمالیں آپکے ذمہ کوئی بڑا کام نہیں ہے اور پانچ گنی کچھ تھوڑی رقم نہیں بس سیدھی طرح سے قبول کر لیجیے۔

"لیکن ـــــــ"

"پانچ گنی فی ہفتہ اس سے زائد نہیں۔ ورنہ اپنا راستہ لیجیے۔

"مجھے منظور ہے۔ مارماڈیوک موزیلی نے جواب دیا۔

ظفر قریشی دہلوی (مختار)

جو شخص چھوٹی کشتی کو نہیں چلا سکتا وہ بڑے جہاز کی ناخدائی کس طرح کر سکتا ہے۔ جو شخص تدبیر منزل میں ناکام رہے وہ کسی مملکت کے انتظام میں کیسے کامیاب ہو سکتا ہے۔ جو شخص اپنے رشتہ داروں کی امداد سے محروم ہو اسکو دوسروں کی امداد کیسے مل سکتی ہے

جس شخص کا بیٹا اُس سے جدا ہے اُس شخص کے گرد اُس کا شہر کیسے جمع ہو سکتا ہے۔

(عربی)

اے سوار! ٹھیر جا اور لگام کو روک لے۔ زندگی کی سواری کسی غلط راستہ پر تیرے ساتھ نہیں چل سکتی۔ تیرے پاس کشتی ہے لیکن اس کا لنگر کہاں ہے؟ تیرے پاس سواری کا گھوڑا ہے۔ لیکن اس کی لگام کہاں ہے؟ تیرے پاس سواری کیلئے اونٹنی ہے لیکن اس کی نکیل کہاں ہے؟

زندگی کی سواری کو سیدھے راستہ پر لے چل اور اپنے ارادہ کو رہبر بنا کر اپنی منزل مقصود کی طرف روانہ ہو جا۔

(عربی)

غارتگرِ عالم

(شرلک ہومز کے شہرہ آفاق کیرکٹر پیدا کرنے والے سر آرتھر کانن ڈائل کا پہلا سائنٹیفک افسانہ)

پروفیسر چیلنجر خودرفتگی کے عالم میں مجنونانہ خودکلامی میں مشغول تھا کہ میں اُس کے دروازے تک پہنچا اور اس کی خشمگین گفتگو سن کر دہیں ٹھٹک گیا لیکن غور کرنے کے بعد معلوم ہوا کہ وہ ٹیلیفون پر بول رہا ہے۔

"میں کہتا ہوں کہ صبح سے یہ دوسری بار الارم ہوا ہے۔ کیا تم خیال کر سکتے ہو کہ ایک سائنس دان کو انہماک میں تار کے دوسرے سرے سے ایک احمق کا متواتر خلل انداز ہونا کس قدر صبر آزما ہے خصوصاً جبکہ وہ کسی فوق العادہ تحقیق میں محو ہو۔ اچھا مہتمم کو بلاؤ۔

"تم مہتمم ہی بول رہے ہو! تم میرے ان خیالات کو پریشان کرنے کے ذمے دار ہو جس کی اہمیت کا اندازہ کرنے سے تمہارا دل و دماغ عاری ہے اچھا تم مہتمم اعلےٰ سپرنٹنڈنٹ کو بلاؤ۔

"وہ باہر گیا ہوا ہے"۔ اگر تم سے ایسی نازیبا حرکت پھر سرزد ہوئی تو مجھے مجبوراً تمہیں قانون کے حوالے کرنا پڑے گا نہیں! میں تحریری معافی چاہتا ہوں اچھا! میں اسی پر غور کروں گا۔ سلام"۔

اُس وقت میں نے اندر داخل ہونے کی جراُت کی۔ یہ نہایت نازک وقت تھا۔ وہ اسی قدر کھکر مڑا اور میرا اور ایک غضبناک مجروح شیر کا سامنا ہوا۔ اس کی لانبی اور سیاہ ڈاڑھی کے بال غضب کی شدت سے کھڑے تھے۔ وہ مجھے دیکھتے ہی بپھر گیا۔ چوڑی چھاتی کا سا سانس بھرنے لگا۔ اور پر غرور کرنجی آنکھوں نے میرا سر سے پاؤں تک جائزہ لیا اور یہ غضبناک الفاظ بارش کی بوچھاڑ کی مانند اس کی زبان سے برسنے لگے "بدنا کار جہنمی۔ حرامخور۔ بدمعاش۔ بے سبب وقت کو تم تباہ کرنے آئے ہو۔ وہ گرج کر بولا" میں ان کو اپنی جائز شکایت پر قہقہے لگاتے سن رہا تھا۔ یقیناً یہ مجھے خواہ مخواہ دق کرنے کی سازش کی جارہی ہے۔ اب بتلا کیا تم اپنی مرضی سے یہاں آئے ہو یا اس سازش میں تمہاری بھی شرکت ہے۔ ایک دوست و مربی کی حیثیت سے میں تمہارا خیر مقدم کر سکتا ہوں۔ لیکن ایک صحیفہ نگار کی حیثیت سے تمہاری جگہ اس احاطے سے باہر ہے۔

میں مسٹر مکارڈل کا مراسلہ اپنی جیب میں ٹٹول ہی رہا تھا کہ اسے ایک اور شکایت کا خیال آگیا اور اس نے میز پر کاغذوں کے پلندے میں سے ایک اخبار کا اقتباس نکالا۔

"تم نے حال ہی میں ایک مضمون لکھا ہے۔ اس میں جو آپ نے میرا ذکر کیا ہوا ہے اس کا میں شکریہ ادا کرتا ہوں" یہ کہکر اُس نے وہ اقتباس مجھے پیش کیا۔ یہ مضمون تم نے جدید سورین کے آثار قدیمہ کے عنوان سے لکھا ہے اور اس سوقیانہ مضمون کی ابتدا تم نے انہیں صبر آزما الفاظ سے کی ہے۔

"پروفیسر چیلنجر جو ہمارے عظیم ترین سائنس دانوں میں سے ہے"۔

ایسے حسد انگیز اوصاف کے بیان کرنے میں آپ کے پاس کیا وجوہ ہیں شاید تم دوسرے سائنسدانوں کا نام بتا سکتے ہو جن کو تم میرے ہمسر یا مجھ سے بہتر خیال کرتے ہو۔ اُس نے کہا۔

میں نے چند لمحے صورت حال پر غور کر کے کہا۔ میں اپنی فروگذاشت پر معافی کا خواستگار ہوں۔ دراصل مجھے یہ الفاظ لکھنے چاہئیں تھے کہ پروفیسر چیلنجر اس وقت بے بدل محقق اور سائنس دان ہیں۔

درحقیقت میرا اپنا بھی یہی عقیدہ تھا۔ میرے ان خوشامدی الفاظ نے اُس کے غصے کی آگ کو ٹھنڈا کر دیا۔ اور اُس نے جواب دیا۔ نہیں۔ یہ تمہاری ذرہ نوازی ہے۔ لیکن تم یہ خیال نہ کرنا کہ میں تمہیں مجبور کر رہا ہوں لیکن چونکہ نامعقول اور جھگڑالو معاصرین مجھے گھیرے ہوئے ہیں۔ اس لئے میں پیش بندی کے لئے مجبور ہوں میں خودستائی سے بے نیاز ہوں لیکن اپنے بچاؤ کے لئے ہر وقت تیار رہنا پڑتا ہے۔

"پھر بربانہ انداز میں کہا۔ آئیے باعثِ تشریف آوری کیا ہے۔

مجھے پھونک پھونک کر قدم رکھنا پڑتا تھا۔ مجھے اس بات کا علم تھا کہ وہ کس قدر جلد غضبناک ہو جاتا ہے۔ میں نے مکارڈل کا مراسلہ کھول کر کہا" یہ میرے ایڈیٹر کا خط ہے"۔

پروفیسر ہاں میں اُنھیں جانتا ہوں واقعی وہ قابل قدر ہستی ہیں اُس کے دل میں آپ کی بہت قدرو منزلت ہے جب وہ کسی دقیق مسئلہ حل کرنے سے عاجز ہو جاتا ہے تو آپ کی خدمت میں درخواست کرنیکو

پس و پیش نہیں کرتا۔ میں نے دبی آواز سے کہا۔ پروفیسر ایک جسیم پرندے کی مانند خوشامد اور چاپلوسی کے اُن الفاظ سے متاثر ہو کر میز پر کہنی ٹیک لی۔ نیز کیسے ہاتھوں کی مٹھیاں بند ہو گئیں۔ لانبی ڈاڑھی آگے کو بڑھ آئی۔ اور نیم وا آنکھوں سے مجھ پر ٹکٹکی باندھ دی۔

"میں آپ کو یہ خط پڑھ کر سناتا ہوں۔ وہ لکھتا ہے۔ آپ میرے معزز و مانتی مربی پروفیسر چیلنجر کی ملاقات سے شرف یاب ہو کر مفصلہ ذیل عقدہ کو حل کرنے کی جدوجہد کریں۔

مسٹر تھیوڈور نیمر جو وائٹ فرائرز مینشن ہیمپسٹڈ میں مسکن پذیر ہے ایک عجیب الخواص ایجاد کا دعویٰ کرتا ہے۔ یہ مشین ہر شے کو جو اس میں رکھی جاء۔ پلک جھپکنے کے عرصہ میں ہوا کے ذرات میں تحلیل کر دیتی ہے اور بعد میں رد عمل سے وہی شے بجنسہ اپنی اصلی شکل و صورت میں نمودار ہو جاتی ہے۔ یہ دعویٰ بظاہر غیر معمولی معلوم ہوتا ہے۔ لیکن اس کے دلائل سے ظاہر ہوتا ہے کہ اس کا یہ دعویٰ بے بنیاد نہیں۔ میں اس اختراع کے تباہ کن اوصاف پر دوران جنگ میں کاری حربہ ہونے کی وجہ سے اس کی ضروریات پر تبصرہ نہیں کرنا چاہتا۔ ایسی قوت جو جنگی جہاز یا لشکر کو آن واحد میں خاکستر کر دے دنیا پر چھا جائیگی۔ سیاسی و معاشرتی نقطۂ نگاہ سے اس دعوے کی چھان بین کرنے میں ایک لمحہ کی سہل انگاری بھی مہلک ثابت ہو گی!

مسٹر نیمر اپنی اختراع کو مشہور کر کے فروخت کرنے کی خواہش رکھتا ہے۔ اس لئے اس کی ملاقات چنداں دشوار نہیں۔ منسلکہ کارڈ آپ کی رہنمائی کریگا۔ میری دلی تمنا ہے کہ آپ پروفیسر صاحب کے ہمراہ اس کا معائنہ کر کے ایک تنقیدی مقالہ سپرد قلم کریں۔ اُمید ہے آج شام تک آپ تمام تفصیلات سے مجھے آگاہ کریں گے۔ (آربکادل)

اس خط کو طے کرتے ہوئے میں نے کہا میں اُمید کرتا ہوں کہ آپ اپنی گراں قدر اور قیمتی امداد سے مجھ ہیچ میرز کو مستفید ہونیکا موقع دینگے۔ میں اپنے محدود علم اور قابلیت سے اس دقیق نکتہ کو حل کرنے سے قاصر ہوں۔

پروفیسر "میلن یہ سچ ہے۔ ہر چند تم قدرتی فہم و فراست اور قابلیت سے تہیدست نہیں ہو لیکن میں یہ باور کرتا ہوں کہ تم ایسے فوق الادراک معاملے کو سلجھا نہیں سکتے۔ ان بے عقل حیوانوں کی حماقت کا رونا کہاں تک روؤں جنہوں نے صبح سے تار برقی کے ذریعے میرا عرصۂ حیات تنگ کر دیا ہے اور صبح کے قیمتی لمحے تباہ کر دیے ہیں۔ اس لئے یہ معاملہ مجھ پر بار نہ ہو گا۔ میں اطالوی سیمزونی کو جس کی خط سرطان کے کیڑے کموڑے کی تحقیق و تفتیش نے میرے دل میں تنفر و نفرت کے جذبات پیدا کر دیے ہیں۔ جواب دینے میں منہمک تھا۔ اب اس مکار کی عیاریوں کا تار و پود دیکھنا شام تک ملتوی کر سکتا ہوں۔ اور میں اس وقت تمہارے ہمراہ چلنے کو تیار ہوں

اب میں اور پروفیسر ایک گہری سرنگ میں سے گذر رہے تھے جو شمال کی طرف پھیلی ہوئی تھی۔

روانہ ہونے سے قبل میں نے ٹیلیفون کے ذریعہ سر نیمر مسٹر محمد عمر کے مکان پر موجودگی کا علم حاصل کر لیا تھا۔ اور اُس کو اپنی ملاقات کی اطلاع بھی دیدی تھی تاکہ وہ مکان پر موجود رہے۔ وہ ہیمپسٹڈ میں ایک فلک بوس عمارت میں رہتا تھا۔ اُس نے ملاقات کے کمرے میں نصف گھنٹہ تک ہمیں انتظار میں رکھا۔ وہ چند ذی رتبہ ملاقاتیوں کے ساتھ تخلیہ میں گفتگو کر رہا تھا۔ میں نے نیم وا دروازے میں سے اُن کی ایک جھلک دیکھی جہاں سے میں ان کی شائستگی و وجاہت کا اندازہ کر سکا۔ جب وہ چلے گئے تو تھیوڈور نیمر ہمارے کمرہ میں داخل ہوا جب میں نے اس کو دیکھا۔ سورج کی تیز اور چمکدار شعاعیں اس پر پڑ رہی تھیں اور وہ اپنے لمبے اور نحیف ہاتھ ملتا ہوا اور مسکراتی ہوئی مکار زرد آنکھوں سے ہمارا جائزہ لے رہا تھا۔

وہ پستہ قد کریہہ المنظر اور بدصورت آدمی تھا۔ لیکن یہ کہنا مشکل تھا کہ کس شے نے اُسے بدشکل بنا دیا ہے۔ اس کی کمر جھکی ہوئی تھی۔ آنکھیں بلی کی طرح چمکدار تھیں۔ مونچھیں اور لمبی۔ ٹھوڑی سے لیکر آنکھوں تک صورت نہایت مکروہ و قابل نفرت۔ لیکن پیشانی پر ایک درخشندہ ہالہ تھا جو میں نے شاذ و نادر ہی کسی انسان کی پیشانی پر دیکھا ہو گا۔ کوئی شخص سرسری نظر سے اس کی صورت دیکھکر اُس کو خوفناک باغی تصور کر سکتا ہے لیکن پیشانی کا ہالہ اس کے دنیا میں لاثانی سائنسدان و صاحب ادراک ہونے کی دلیل تھا۔

حضرات جیسا کہ مجھے ٹیلیفون پر معلوم ہوا ہے آپ میری ایجاد کی تحقیق کے لئے تشریف لائے ہیں۔ کیا یہ درست ہے؟ اُس نے پوچھا

"ہاں جناب" میں نے جواب دیا۔

موجد۔ کیا میں یہ دریافت کر سکتا ہوں کہ آپ سلطنت برطانیہ کے نمائندے ہیں؟"

"ہرگز نہیں۔ میں ایک اخبار کا نمائندہ ہوں اور میرے ساتھی پروفیسر چیلنجر ہیں" میں نے جواب دیا۔

موجد (مربیانہ انداز سے) پروفیسر صاحب اسم بامسمّی ہیں۔ میں یہ عرض کرنا چاہتا تھا کہ سلطنت برطانیہ اس نادر موقع کو ہاتھ سے کھو بیٹھی ہے لیکن شاید وہ بعد میں یہ مقصود حاصل کر لے۔ میں اپنی اختراع اُس سلطنت کے

ہاتھوں فروخت کرنا چاہتا تھا جو سب سے زیادہ اس کی قیمت ادا کرنے کی متحمل ہو سکے اور اگر اب یہ ایجاد کسی ایسی طاقت کے ہاتھ آگئی جس کو شاید آپ ناپسند کریں تو اس کے آپ ہی ذمہ دار ہیں"

....

"تو کیا آپ نے اس کو فروخت کر دیا ہے" میں نے دریافت کیا۔

موجد "ہاں جناب"

میں "آپ خیال کرتے ہیں کہ شاید خریدار کو اس پر کامل قدرت حاصل ہو گی"

موجد "یقیناً"

میں "لیکن اُن کے علاوہ اور ماہرین فن بھی ایسی ایجاد کے اسرار سے آشنا ہیں؟"

موجد "ہرگز نہیں" اُس نے اپنی پیشانی کو چھوا۔ اس کا راز اس صندوق میں ہے جو تمام آہنی صندوقوں سے مضبوط اور ڈاکوؤں کی گزند سے محفوظ ہے۔ ممکن ہے کہ ایک شخص اُس کے ایک پہلو کا راز معلوم کر لے اور دوسرا دوسرے پہلو کا۔ مگر دنیا میں سوائے میرے کوئی نہیں جو اس کے دونوں پہلوؤں سے واقف ہو"

میں "اور وہ جن کے ہاتھوں آپ نے اس کو فروخت کیا ہے"

موجد "ہرگز نہیں۔ میں ہوش و خرد سے اتنا بیگانہ نہیں کہ بغیر حصول زر کے اس کے تمام اسرار بے نقاب کر دوں۔ ادائیگی رقم کے بعد ان کو میری ذات کا خریدنا لازم ہو گا" اُس نے دوبارہ اپنی پیشانی کو چھوا" تاکہ اس صندوق کے قفل کو کھول کر اس کے مقاصد کو وفاداری اور سنگدلی سے سرانجام دے اور اس کے بعد ایک نئی تاریخ مرتب ہو گی۔ اُس نے دونوں ہاتھوں کو ملا۔ اور اس کی مسکراہٹ ایک بلند بانگ قہقہے میں تبدیل ہو گئی تھی۔ کہا "صاحب معاف فرمائیے" پروفیسر نے جس کے ہونٹوں پر ابھی تک خاموشی کی مُہر لگی ہوئی تھی۔ اس کی صورت سے نیمر کے خلاف نفرت ٹپکتی تھی" پیشتر اس کے ہم اس موضوع پر سلسلہ بحث جاری رکھیں ہمیں یقین دلایا جائے کہ یہ امر قابل بحث ہے۔ ہم ابھی ایک اطالوی کا واقعہ فراموش نہیں کر سکے جس نے کانوں کو شگاف دینے کی نئی تجویز پیش کی لیکن تحقیق کرتے ہی اس کی عیاری و مکاری کے سوا کچھ بھی نہ ہوا۔ پروفیسر نے سلسلۂ کلام جاری رکھتے ہوئے کہا "آپ کو معلوم ہو گا کہ میں ایک سائنسدان ہونے کی حیثیت سے کافی شہرت حاصل کر چکا ہوں اگرچہ میرے پاس کافی ثبوت موجود ہیں۔ وہ شہرت جس کو آپ باشندگان یورپ کی ملکیت تصور کرتے ہیں امریکہ میں بھی اس کی قلت نہیں لیکن سائنس کیلئے احتیاط شرط ہے۔ اس لئے پیشتر اس کے کہ ہم غور و فکر کریں آپ کو اپنے دعوے کے ثبوت میں کافی دلائل پیش کرنے چاہئیں۔

موجد "پروفیسر صاحب آپ کو اپنی شہرت پر ناز ہے لیکن یہ عام مقولہ ہے کہ دنیا میں آپ کی ذات آسانی سے دام فریب میں گرفتار ہو سکتی ہے میں اپنے دعوے کا حقیقی ثبوت پیش کر سکتا ہوں۔ لیکن قبل ازیں اس کے عام اُصول چند الفاظ میں عرض کرنا چاہتا ہوں۔ آپ کو معلوم ہو گا کہ یہ آزمائشی آلہ جو میرے محل میں قائم ہے صرف ایک نمونہ ہے۔ اگرچہ اس کے اثر و نتائج بھی اپنی بساط کے مطابق تعجب انگیز ہیں۔ مثلاً یہ آپ کے جسم کو پارہ پارہ کر کے پھر اسی شکل و صورت میں جمع کر سکتا ہے۔ لیکن ایک سلطنت صرف اسی ڈھانچ کیلئے لاکھوں روپے ادا کرنے کے لئے تیار ہے۔ لیکن یہ صرف ایک نمونہ ہے۔ ایک کھلونا اور یہ اپنی تباہ کاری کے جوہر اُس وقت دکھائیگا جب اسے اعلیٰ پیمانے پر بنایا جائے"

پروفیسر "کیا ہم اس نمونہ کو دیکھ سکتے ہیں۔

موجد۔ پروفیسر صاحب آپ صرف ملاحظہ ہی نہیں کر سکتے بلکہ آپکی ذات پر اس کا عملی تجربہ بھی ہو سکتا ہے جس کے بعد کسی ثبوت کی ضرورت نہ ہو گی۔ اگر آپ میں اتنی جسارت ہے"

"اگر"۔ پروفیسر چلایا "تمہارا لفظ "اگر" نہایت توہین کن ہے۔

موجد۔ جناب میرا مقصد آپ کی جسارت و مردانگی کی توہین نہیں۔ میرا مطلب یہ ہے کہ میں آپ کو اس کا عملی تجربہ حاصل کرنیکا موقع دوں۔ لیکن پیشتر اس کے اس امر پر کچھ روشنی ڈالنا چاہتا ہوں

"جب کوئی بوری شے مثلاً نمک یا مصری پانی میں ڈالی جائے تو وہ پگھل کر غائب ہو جاتی ہے اور آپ معلوم بھی نہیں کر سکتے کہ اس پانی میں کوئی شے ملی ہوئی ہے۔ اس کے بعد اگر پانی کی مقدار بھاپ یا دوسرے کسی ذریعہ سے کم کی جائے تو وہ شے دوبارہ نمودار ہو جاتی ہے کیا آپ ایسے ہی عمل کا تصور کر سکتے ہیں جس سے انسان کا وجود ہوا میں تحلیل ہو کر رد عمل سے بجنسہ اس شکل و صورت میں منظر عام پر آ جائے"

پروفیسر۔ یہ مشابہت بالکل غلط ہے۔ اگر میں ایسے میناکی عمل کو تسلیم بھی کر لوں کیونکہ ہمارے اعضا و جوارح بارود وغیرہ سے پارہ پارہ ہو سکتے ہیں لیکن ان کا اجتماع ناممکن ہے"

موجد "آپ کا اعتراض بالکل درست ہے۔ لیکن میں صرف یہی عرض کر سکتا ہوں کہ آپ کا بال بال اسی صورت میں مجتمع ہو جائیگا۔ اس آلہ میں ایک ایسی تعمیری صنعت پوشیدہ ہے جو ہر ذرے کو اس کی اصلی جگہ پر قایم کر دیتی ہے۔ پروفیسر صاحب آپ بیشک میرا مضحکہ اُڑائیں لیکن آپ کی بے اعتمادی

وتسخر بہت جلد یقین و سنجیدگی سے بدل جائیگا۔

پروفیسر چیلینجر نے اپنا شانہ ہلایا اور کہا "میں اپنے جسم کو اس عمل کیلئے پیش کرتا ہوں"۔

موجد "تو آپ میرے ہمراہ تشریف لائیں"۔

ہم نیچے اُتر کر ایک باغ کو طے کر کے ایک مقفل کمرے کے پاس پہنچے جس کو اُس نے کھولا اور ہم اندر داخل ہوئے۔ اس کے اندر ایک اور قلعی شدہ کمرہ تھا جس کی چھت کے ساتھ مکڑی کے جالے کی طرح بیشمار برقی تاریں آویزاں تھیں سامنے ایک مخروطی شکل کا شیشہ تھا جس کی لمبائی تین فٹ اور قطر ایک فٹ ہوگا۔ اس کے دائیں جانب جست کے چبوترہ پر ایک کرسی تھی اور اُس کے اوپر ایک تانبے کی ٹوپی لٹکی ہوئی تھی اور کرسی اور ٹوپی تاروں سے جکڑی ہوئی تھیں۔ کرسی کے ایک طرف پیتل کا دندانہ دار چکر تھا جس میں سوراخ اور چند اعداد و شمار بھی لکھے تھے اس کا ہینڈل درجۂ نفی ہی تھا۔

"نیچر کی ایجاد" موجد نے مشین کی طرف اشارہ کر کے کہا "یہی وہ نمونہ ہے جس کی قسمت میں اقوام عالم کی طاقتوں کو زیر و زبر کرنے کی شہرت لکھی ہے اس کا مالک دنیا پر مسلط ہوگا۔ اب پروفیسر صاحب یہ معاملہ زیر غور ہے۔ آپ کا نازیبا سلوک حد سے بڑھ کر نا قابل برداشت تھا۔ کیا آپ اس کرسی پر بیٹھنے کی جرأت کر سکتے ہیں تاکہ مجھے اس قوت کے نتائج آپ پر آشکارا کرنے کی اجازت حاصل ہو"۔

پروفیسر کرسی کی طرف لپکا۔ لیکن میں نے اُس کے بازو کو پکڑ کر اپنی تمام قوت سے اُس کو روک لیا۔ "آپ نہیں جا سکتے" میں نے کہا "آپ کی زندگی گراں قدر ہے۔ آپ کے پاس اپنی زندگی کی بقا اور حفاظت کی ضمانت کیا ہے؟"

"میری زندگی کی بقا کی ضمانت صرف آپکی شہادت کافی ہے" اُس نے جواب دیا۔ "اور اگر مجھے کسی قسم کا گزند پہنچا تو یہ شخص قتل انسانی کے جرم کا مرتکب ہوگا"۔

"لیکن اگر یہ کام جو صرف آپکی ذات سے وابستہ ہے ادھورا رہجائیگا تو دنیائے حکمت کے لئے تسلی بخش ثابت نہ ہوگا" میں نے کہا "پہلے مجھے جانے دیں اور اگر یہ تجربہ بخیر و عافیت کامیاب ثابت ہو تو پھر آپ جا سکتے ہیں"۔

پروفیسر چیلینجر کبھی کسی ذاتی خطرہ کے وقت خوفزدہ نہیں ہوتا تھا لیکن اس خیال سے کہ اس کی تحقیق و تفتیش ناتمام رہ جائے گی وہ خیالات کے سمندر میں غرق ہوگیا۔ پیشتر اس کے وہ کسی نتیجہ پر پہنچے میں ایک ہی جست میں کرسی پر جا بیٹھا۔

میں نے موجد کو دستہ پکڑتے ہوئے دیکھا اور ٹک ٹک کی آواز سنی چند لمحوں کے بعد مجھے دم گھٹتا محسوس ہوا۔ پھر آنکھوں کے سامنے تاریکی چھاگئی جب فضا صاف ہوئی تو موجد میرے سامنے کھڑا تھا۔ اُس کے لبوں پر حقارت آمیز تبسم رقصاں تھا۔ اور پروفیسر خشمگین انداز سے اس کی طرف گھور رہا تھا میں نے کبھی پروفیسر کو اس قدر پریشان مضطرب نہیں دیکھا تھا۔ اس کی آہنی قوت جواب دے چکی تھی۔ اُس نے حواس باختہ میرے بازو پکڑ کر کہا۔ "میلن" یہ تو بالکل سچ ہے۔ تم واقعی ناپید ہوگئے تھے۔ پہلے ایک دھند سی چھاگئی اور پھر تم غائب ہوگئے۔

"میں کتنا عرصہ غائب رہا" میں نے دریافت کیا۔

"دو یا تین منٹ۔ خوف سے میرے جسم پر لرزہ طاری ہوگیا اور میں تمہاری زندگی سے مایوس ہو چکا تھا۔ پھر اُس نے دستہ کو درجۂ دوئم پر گھمایا تو تم صحیح و سالم اسی شکل و ہیئت میں نمودار ہوگئے گو تم پر پژمردگی چھائی ہوئی ہے۔ لیکن تمہاری تعمیر میں بال بھر فرق نہیں"۔ اُس نے پیشانی کا پسینہ سُرخ رومال سے پونچھتے ہوئے کہا۔

"جناب اب کیا ارادہ ہے" موجد نے طنزاً کہا "شاید آپ کی مردانگی پہلو بدلنے لگی ہے" پروفیسر نے اپنے جسم پر ایک سرسری نظر ڈالی۔ اور میرے ہاتھ کو جو میں نے اسے روکنے کے لئے اُٹھایا تھا ایک طرف اُٹھا کر کرسی پر جا بیٹھا۔ موجد نے فوراً دستہ کو درجہ سوئم تک گھمایا اور وہ آن کی آن میں ناپید ہوگیا"۔

"یہ کیا دلچسپ عمل ہے" موجد نے کہا "جو شخص پروفیسر کی اعلیٰ شخصیت کا معترف اور عقیدتمند ہو اُس کے لئے یہ کس قدر تعجب انگیز ہے کہ وہ اس وقت بادل کا ایک بے مقدار ذرہ ہے۔ جو اس کمرہ کے کسی گوشہ میں لٹکا ہے۔ اس وقت اس کی زندگی کا انحصار میرے جذبۂ رحم پر ہے۔

اگر میں اس کو تاابد اسی حالت میں چھوڑ دینا پسند کروں تو دنیا کی کوئی طاقت اس کو تبدیل کرنے کی قدرت نہیں رکھتی"۔

"لیکن میں آپ کو ایسے روح فرسا ارادہ سے باز رکھنے کا کوئی ذریعہ تلاش کروں گا" میں نے کہا۔ اُس نے ایک قہقہہ لگایا "آپ کا خیال غلط ہے۔ مجھے کوئی اس ارادہ سے باز نہیں رکھ سکتا۔ اب تو چیلینجر کا حرف غلط کی طرح مٹ جانیکا خیال کیجئے۔ یہ واقعہ المناک ہے۔ لیکن اس کا سلوک بھی ناقابل برداشت تھا جس کی پاداش کا وہ مستوجب ہے"۔

"نہیں ہرگز نہیں" میں نے کہا۔

”خیر یہ عمل آپ کے جریدہ کے لئے ایک دلچسپ مقالہ مہیا کریگا۔ آپ کو معلوم ہوگا کہ انسانی بال ریشہ ہائے حیات سے بالکل مختلف ساخت رکھتے ہیں۔ یہ اپنی مرضی کے مطابق رکھے جاتے ہیں اور اڑائے جاتے ہیں۔ میرے لئے اس کی بالشت بھر ڈاڑھی کا صفایا خالی از دلچسپی نہ ہوگا۔

”وہ دیکھیے۔“

اُس نے دستہ گھمایا اور آن واحد میں چیلنجر کرسی پر نمودار ہوگیا لیکن کیا چیلنجر؟ پھر غصے سے میرے تن بدن میں آگ لگ گئی۔ لیکن میں ہنسی کو ضبط نہ کرسکا۔ موجد کی شعبدہ بازی مگر اس کا دیو صورت سر نوزائیدہ بچہ کے سر کی طرح ننگا اور چہرہ ایک لڑکی کے چہرہ کی مانند نرم تھا۔ ڈاڑھی نہ ہونے کی وجہ سے بدصورت نظر آتا تھا۔ لیکن قوی ہیکل جسم پر ایک شکست خوردہ شمشیر باز کی سی مایوسی چھائی ہوئی تھی۔ چیلنجر کا ہاتھ فوراً سر کی طرف لپکا اور اس کو اپنی تبدیل شدہ حالت کا احساس ہوگیا۔ بجلی کی سی تیزی کے ساتھ وہ جھپٹا اور لپک کر موجد کا گلا گھونٹ دیا۔ اور زمین پر گرادیا۔

”خدا کے لئے ہوش کی دوا کرو۔ اگر وہ مرگیا۔ تو بگڑا ہوا کھیل کبھی درست نہ ہوگا۔“ میں چلایا۔ چیلنجر غایت درجہ دیوانگی میں بھی دلیل کے سامنے سر جھکا دیتا تھا۔ اس لئے یہ دلیل کارگر ثابت ہوئی۔ اس نے موجد کو زمین سے کھڑا کیا۔

”میں تمہیں صرف ۵ منٹ کی مہلت دیتا ہوں۔“ چیلنجر نے شدت غضب سے کہا۔ ”اگر ۵ منٹ کے اندر میری حالت درست نہ ہوئی۔ تو تمہاری جان کی خیر نہیں۔“

غیظ و غضب کی حالت میں چیلنجر کے ساتھ بحث و مباحثہ کرنا ذرا ٹیڑھی کھیر تھی۔ ایک قوی ہیکل انسان بھی بید مجنوں کی طرح کانپ جاتا تھا لیکن نیمر تو مردوں سے بدتر تھا۔

”بہت اچھا“، موجد نے اپنا گلا ملتے ہوئے کہا۔ ”یہ تشدد ناگزیر ہے۔ بزم احباب میں عموماً ایک بے ضرر مضحکہ باعث تفریح ہوتا ہے۔ میں اس ایجاد کی قوت کا اندازہ لگانا چاہتا تھا۔ میرا خیال تھا کہ آپ بھی اس کے صحیح عمل سے بہرہ اندوز ہونا چاہتے ہیں۔ میں آپ کو یقین دلاتا ہوں کہ میرا مقصد دنیا میں کسی شخص کو گزند پہنچانے کا نہیں۔“

چیلنجر دوبارہ کرسی پر بیٹھ گیا۔ میلن تم اس کی حرکات پر نگاہ رکھو اور کسی قسم کی چالاکی نہ کرنے دو۔

”بہت اچھا“ میں نے جواب دیا۔

”اب تم اس معاملہ کو سلجھاؤ۔ یا خمیازہ بھگتنے کیلئے تیار ہو جاؤ۔“ پروفیسر نے موجد کو کہا۔ خوفزدہ موجد کانپتا ہوا مشین کے پاس گیا اور اپنی پوری قوت سے ہینڈل کو گھمایا۔ چشم زدن میں چیلنجر کی ڈاڑھی عود کر آئی۔ بالوں کے واپس آنے سے مطمئن ہونے کیلئے وہ اپنی گنجان ڈاڑھی پر شفقت آمیز ہاتھ پھیرتا ہوا سرنک لیگیا۔ پھر کرسی سے نیچے اُترا۔

”تم نے اپنی زندگی دوبارہ حاصل کی ہے۔ میں تمہارے اس بیان سے مطمئن ہوں کہ تمہارا یہ فعل تجربہ پر مبنی تھا۔ کیا میں اس عجیب الخواص ایجاد کی بابت استفسار کرسکتا ہوں“۔ پروفیسر نے کہا۔

موجد ”میں آپ کے تمام سوالات کا جواب دے سکتا ہوں۔“

پروفیسر ”کیا اس اختراع کے راز ہائے نہانی تمہارے ہی دل میں مستور ہیں اور کوئی دوسری ہستی اس سے بہرہ ور نہیں۔

موجد ”ہاں جناب۔“

پروفیسر ”کیا کسی شخص نے اس آلہ کے بنانے میں تمہاری مدد کی تھی

موجد ”ہرگز نہیں میں نے تنہا ہی اس کام کو انجام دیا ہے۔“

پروفیسر ”یہ تو تعجب انگیز ہے۔ میں اس قوت کے نتائج و عواقب سے مطمئن ہوچکا ہوں۔ لیکن میں نے اس کی ساخت کا ملاحظہ نہیں کیا

موجد ”جناب میں قبل ازیں عرض کرچکا ہوں کہ یہ صرف ایک نمونہ ہے لیکن اس کی ساخت بڑے پیمانے پر آسان ہے۔“

پروفیسر ”کیا آپ نے یہ اسرار مسرت ایک یورپین سلطنت کے ہاتھوں فروخت کیا ہے۔

موجد ”ہاں جناب لیکن جب وہ اس کی قیمت ادا کردیں گے تو اُن کے پاس ایک ایسی قوت موجود ہوگی جس کے سامنے دنیا کی تمام سلطنتیں تہی دست ہوں گی اور اُن کو اُس کے سامنے سر جھکانا پڑے گا۔ لندن کے اُس گوشے کا خیال کریں جہاں یہ قائم ہوگی اور پھر اس کی قوت کا۔“ اُس نے زور سے ایک قہقہ لگایا۔ میں خیال کرتا ہوں کہ دریائے ٹیمز کی جگہ ریت اُڑتی ہوگی اور تمام انسان آسمان کی بلندیوں کی سیر کرتے ہوں گے۔“

میرے دل پر ایک کاری ضرب لگی۔ لیکن اس کے پریشان کن الفاظ نے پروفیسر پر مختلف اثر کیا۔ میری حیرت کی کوئی انتہا نہ رہی جب اُس نے فرط مسرت سے اپنا ہاتھ موجد کی طرف بڑھایا۔ اور یوں گویا ہوا۔

”مسٹر نیمر میں آپ کو اس ایجاد کی کامیابی پر ہدیہ تہنیت پیش کرتا ہوں اگر اس کی جہاں سوزی اور ہلاکت آفرینی روح فرسا ہے اور سائنس اس کی فضیلت سے ناآشنا ہے میرا خیال ہے کہ آپ کو اس کی ہیئت ترکیبی کا معائنہ

کرنے میں کوئی اعتراض نہ ہوگا۔"

موجد:" ہرگز نہیں۔ یہ آلہ ایک جسم کی مانند ہے۔ لیکن اس کی روح کی تحقیق لاحاصل ہے۔

پروفیسر:" یہ بالکل درست ہے۔ لیکن اس کی ساخت ہی صنعت کاری کا ایک نمونہ ہے۔" اُس نے اُس کے اردگرد چکر لگائے۔ چند اجزا کو چھوا۔ پھر اپنے بھاری جسم کو کرسی پر گرا دیا۔

"کیا آپ دوبارہ عالمِ خیال کی سیر کرنا چاہتے ہیں؟" موجد نے پوچھا۔

پروفیسر:" شاید کچھ عرصے بعد۔ لیکن یقیناً تمہیں معلوم ہوگا کہ کچھ برقی قوت ضائع ہو رہی ہے۔ میں ایک ہلکی سی رو اپنے اندر دوڑتی ہوئی محسوس کرتا ہوں۔

موجد:" ناممکن۔ کرسی تو بالکل غیر ملحق ہے۔

پروفیسر:" لیکن یقین کیجئے کہ میں اس سنسناہٹ کو محسوس کرتا ہوں۔

پروفیسر کرسی سے نیچے اُتر آیا۔ اور موجد فوراً کرسی پر بیٹھ گیا۔

موجد:" لیکن میں بالکل اس سنسناہٹ کو محسوس نہیں کرتا۔"

پروفیسر:" کیا تمہارے پٹھوں میں جھنجھناہٹ پیدا نہیں ہوتی۔

موجد:" نہیں۔"

ایک کرخت آواز پیدا ہوئی اور موجد غائب ہوگیا۔ میں حیرت زدہ چیمبر کی طرف دیکھنے لگا۔

"کیا آپ نے مشین کو چھوا ہے؟"

اُس نے تعجبانہ انداز میں میری طرف دیکھ کر زہر خند کیا۔

"میلین۔ شاید میں اس ہینڈل کو لاپرواہی سے پکڑتا" اُس نے کہا "اس قسم کے تباہ کن آلہ جات سے بنی نوع انسان کو نہایت درجہ نقصان پہنچ سکتا ہے۔ اس لئے یہ میلین محفوظ رکھنا چاہیئے۔"

"یہ درجہ سوئم ہے اور اس درجہ پر انسان معدوم ہو جاتا ہے۔" میں نے کہا

پروفیسر:" اس لئے میں نے اس کا خیال رکھا جبکہ تجربہ عمل ہو رہا تھا۔"

لیکن جب وہ تمہیں واپس لایا تو میں نہایت متذبذب و پریشان تھا۔ اس لئے اس کے ردعمل کو ملاحظہ نہ کر سکا کیا تمہیں معلوم ہے" میں نے پوچھا۔

پروفیسر:" شاید میں جانتا ہوں لیکن اُن جزوی تفصیلات سے اپنے آپ کو پریشان نہیں کرنا چاہتا۔ یہاں پر بہت سی ایسی چیزیں ہیں جن کا مقصد معلوم نہیں اور جن کی آزمائش ناخوشگوار حادثات کا باعث ہوگی۔ اس لئے ان کو اسی حالت میں چھوڑ دینا سود مند ہے۔ مسٹر نیمر نے اپنے وجود کو عالمِ خیال کے ذروں میں تقسیم کر دیا ہے۔ اب اس کی ایجاد بے سود ہے۔ اور اس سلطنت کے منصوبوں پر پانی پھر گیا ہے جس نے اسے خریدا ہے۔ اور دنیا اس کے ضرر و تباہ کاری سے محفوظ ہوگئی ہے۔ اب تمہارے رسالہ میں موجد کی ناقابلِ بیان اور حیرت انگیز گمشدگی کے عنوان سے ایک دلچسپ مضمون شائع ہوگا۔ جو اس وقت وجود میں آئی جبکہ اس کا خاص نامہ نگار ملاقات کے لئے موجد کے پاس گیا۔"

پروفیسر نے سلسلہ کلام کو جاری رکھتے ہوئے کہا واقعی یہ تجربہ بہت دلچسپ ہے اور خشک مطالعہ غیر دلچسپ لمحوں کو خوشگوار بنانے کا باعث ہوگا لیکن زندگی میں مسرت کے لمحوں کے علاوہ کچھ فرائض بھی ہیں۔ چنانچہ اب میں اطالوی مینزونی کی بیہودہ گوئی کا مسکت جواب دینا چاہتا ہوں۔"

میں نے پیچھے مڑ کر دیکھا تو کرسی کے اردگرد ایک دھندلا سا بادل اُڑ رہا تھا "ہر بنی نوع انسان کا اولیں فرض ہے کہ مخلوق کی ہلاکت و تباہی کے اسباب کو نیست و نابود کرنے کی جدوجہد کرے۔" پروفیسر نے کہا "جس کو میں بہت حد تک ادا کر چکا ہوں۔ میلین اب یہ معاملہ مزید بحث کے قابل نہیں۔"

"علاؤالدین"

احمقوں کا خاندان

کہتے ہیں کہ کھوئے ہوئے وقت نے جہالت سے شادی کی۔ اُنکے ہاں خیال نامی بیٹا پیدا ہوا جس نے شباب سے شادی کی اور مندرجہ ذیل بچے ہوئے۔

مجھے نہیں معلوم۔ میں نہیں خیال کرتا۔ کیسے توقع تھی۔

کیسے توقع تھی نے بے پرواہی سے بیاہ کیا۔ ان کے ہاں یہ بچے ہوئے۔ بالکل ٹھیک میں کل کروں گا۔ کافی وقت ہے۔ اگلی دفعہ

کافی وقت نے میں خیال نہیں کرتا سے شادی کی اور حسبِ ذیل بچے پیدا ہوئے میں بھول گیا۔ میں اس کی بابت سب کچھ جانتا ہوں۔ مجھے کوئی شخص دھوکہ نہیں دے سکتا۔ میں اس کی بابت سب کچھ جانتا ہوں نے غرور سے نکاح کیا اُن کے ہاں خوشی پیدا ہوئی جس نے غالباً یہ نہیں ہوگا سے شادی کی اُن کے ہاں دو بچے پیدا ہوئے آؤ لطف تو اُٹھالیں اور بدقسمتی۔

بدقسمتی نے نفی سمجھ سے بیاہ کیا اور بہت سے بچے پیدا ہوئے۔ ان میں سے چند ایک کے نام یہ ہیں۔ یہی کافی ہوگا۔ اُن کا یہاں کیا کام۔ مجھے تو ایسا نظر آتا ہے۔ یہ ممکن نہیں ہے۔

خوشی بیوہ ہوگئی تو اُس نے حماقت سے شادی کر لی اور اپنی میراث کو صرف کرتے ہوئے ایک دوسرے سے کہنے لگے "صبر کرو آؤ اپنا سرمایہ خرچ کریں اس سال تو نہ سہی اگلے سال خداوند بست کر دیگا۔ لیکن دھوکہ انہیں جیل خانہ لے گیا اور مفلسی نے کارخانہ میں پہنچا دیا۔ جہاں سے پھر وہ ملک عدم کو سدھار گئے اُن کی میت پر عجیب و غریب رسومات ادا کی گئیں۔ اس موقع پر پانچوں احساس فہم۔ حافظہ اور قوت ارادی بحالت ناسور بھی موجود تھیں۔

چونکہ تو بہ دیر سے آئی تھی اسلئے اُسے کوئی جگہ نہ ملی اور تمام وقت کھڑی ہی رہی۔ حالانکہ تسلی اور قناعت کی نمائندگی ویرانی اور کلفت کر رہی تھیں جو حافظہ کی بیٹیاں ہیں۔ متوفیوں کی پوتی مایوسی کئی دن تک بھیک مانگتی رہی اُسے بمشکل چھ پیسے وصول ہوئے۔ جس قسم سے کہ اُس نے ایک رسہ خریدا اور اُس نے اپنے گلے میں ڈالا اور ایک... جھولے کی بجائے گھٹ کر مرگئی۔ اسی طرح اس مضمون کے خاندان کا خاتمہ ہوگیا۔

دنیائے ادب

ہندوستانی ادبیات

(سہ ماہی رسالہ)

اردو ہندی بنگالی پنجابی گجراتی مرہٹی سندھی کشمیری پشتو تلگو سنسکرت

استقلال

ہمیشہ وہ اقوام ترقی پذیر ہوئی ہیں جو دنیا کی اسٹیج پر ثابت قدم رہتی ہیں۔ ہمیشہ اُن افراد خاندان نے عروج حاصل کیا ہے۔ جنہوں نے استقلال کو اپنی شاہراہ عمل قرار دیا ہے۔ ہمیشہ وہ شخص کامیاب ہوا ہے جس نے استقلال سے کوئی کام شروع کیا ہے۔ تجارت صنعت وحرفت علوم وفنون غرض ہر شعبۂ زندگی میں استقلال کی ضرورت ہے۔ جس کام میں اس کا دخل نہ ہوگا وہ ضرور غیر مکمل رہیگا۔ تاریخ زمانہ کے اوراق اُلٹئے تو آپ کو معلوم ہوگا کہ دنیا میں کیسے کیسے پختہ عزم لوگ گذرے ہیں اور وہ اپنے ارادوں میں مستقل نہ ہوتے تو آج دنیا اتنی ترقی نہ کرتی۔ اور اُن کا نام صفحۂ عالم پر روشن نہ ہوتا۔

ہمارے مشاہدہ میں بہت سی ایسی مثالیں ہیں جن کے قیام کی اصل بنا استقلال ہے اُن تمام ہوشربا واقعات کی یادتازہ رکھنے میں جو گذر چکے ہیں استقلال کا دخل نہوتا تو ہم کہہ سکتے ہیں کہ آج ہمیں اُن کا نشان تک نہ ملتا یہ استقلال ہی کی برکات ہیں کہ ہم تمام حالات دنیا سے اس طرح واقف ہیں جیسے ہمارے سامنے کی بات ہو۔ اگر ہمارے متقدمین تاریخی حالات لکھنے میں استقلال سے کام نہ لیتے تو آج ہمارے دلوں پر گذری ہوئی صدیوں کے افسانے منقش نہ ہوتے اور دور رفتہ کی ترقی وتنزل سے ہمارے دماغ کی آنکھیں روشن نہ ہوتیں

ہم جو ارادہ کریں اُسے تکمیل پر پہنچانا ہمارا فرض ہے بشرطیکہ ہم غلطی پر نہ ہوں عزم بالجزم استقلال کی تخم پاشی ہے۔ جب تخم بو دیا جاتا ہے تو پودہ نکلنا بھی ضروری ہے۔ پھر اگر اُس پودے کو مناسب غذا دی جائے تو وہ ضرور سرسبز وشاداب ہوگا

بعض لوگ دنیا کی سرد وگرم ہواؤں سے بہت جلد متاثر ہو جاتے ہیں۔ اور استقلال پر عامل نہیں رہتے لیکن ایسا کرنا استقلال پر صریح ظلم ہے۔ وہ ہرگز ایسی عمارت نہیں جو بدون تکمیل منہدم ہو سکے۔

کام کرتے کرتے چھوڑ دینا اور مستقل مزاجی پر قائم نہ رہنا تمام کوششوں پر پانی پھیر دینا ہے ایسی صورت میں پہلے فوائد بھی نقصان سے تبدیل ہو جاتے ہیں۔ اور انسان کو اُن کے ناکام نتائج پر ہاتھ ملنا پڑتا ہے۔ کسی امر سے بہت جلد مغلوب ہو جانا اور ہتھیار ہاتھ سے ڈال دینا شیوۂ مردانگی نہیں ہے۔ ہمیشہ ہر کوشش پوری طاقت سے اُس وقت تک جاری رکھنا چاہیئے۔ جب تک گرد وپیش کے تمام حالات مخالفانہ صورت اختیار نہ کرلیں

نورجہاں

دورِ اولین کی مسلم خواتین

زینب حضرت جلال الدین سیوطی کی استاد حدیث عبداللہ شنوعی کی بیٹی ایک نہایت عالم فاضل محدثہ تھیں۔ اُن کی کمال علمیت کی ایک دلیل یہ تھی کہ یہ ام الخیر کے لقب سے مشہور ہوگئی تھیں اور حضرت سیوطی نے نہایت فخر کے ساتھ اُن کا نام اپنے اُستادوں کے ساتھ لیا ہے۔

ایک اور زینب جو ام حبیبہ کی کنیت سے مشہور ہیں اپنے زمانے کی نہایت نامور محدثہ گذری ہیں اُن کے باپ کا نام سعد بن محمد ہے اُن کا وطن مکہ معظمہ ہے یہیں پیدا ہوئیں اور فضیلت علمی حاصل کی اور فن حدیث میں وہ کمال حاصل کیا کہ حضرت سیوطی نے ان سے حدیث بیان کرنے کی اجازت لی۔

خدیجہ عبدالرحمٰن بن احمد کی نہایت فاضل و قابل بیٹی ساتویں صدی ہجری میں پیدا ہوئیں اپنی لیاقت و قابلیت کی وجہ سے نہایت مشہور ہوئیں اُنہوں نے ایک بہت بڑا مدرسہ حدیث کا قایم کیا تھا جس میں بڑے بڑے موقر عالم داخل ہوئے جن میں ہمیں حضرت جلال الدین سیوطی کا نام نمایاں نظر آتا ہے۔

مسلم ابن ابراہیم مشہور محدث کی اُستاد حدیث تجیدہ راسبیکی رہنے والی تھیں۔ بڑے بڑے علمائے زمانہ ان کی صحبت کو غنیمت سمجھتے تھے اور مسلم کو تو ان کی شاگردی کا فخر حاصل تھا۔

ام یحیی کی علمی فضیلت دماغی قابلیت کو کوئی مرد کیا پہنچ سکتا ہے ام یحیی نے چالیس سال سے بجز قرآن مجید کی آیات کے دوسری زبان میں بات چیت کرنا چھوڑ دیا۔ ہر بات کا کافی و شافی جواب قرآن پاک کی آیات سے دیتی تھیں۔

ساتویں صدی ہجری میں ایک نامور محدثہ کلثوم نامی گذری ہیں جنکی کنیت ام عمرو ہے انہوں نے تحصیل علم سے فارغ ہونے کے بعد اپنا حلقہ تحدیث الگ قایم کیا۔ بڑے بڑے جلیل القدر عالم اُن کی درسگاہ میں زانوئے ادب تہ کرتے تھے۔ جن میں ابن حجر عسقلانی نے نہایت فخر کے ساتھ اپنی شاگردی کا ذکر کیا ہے۔ ام عمرو حافظ تقی الدین بن رافع اسلامی کی بیٹی تھیں۔ اُن کے باپ کو اپنی بیٹی کی علمیت پر بہت ناز تھا جو بجا تھا۔

رضیہ اندلس کے خلیفہ الحکم ثانی کی نہایت محبوب ملکہ تھی بادشاہ کے رضیہ کو عزیز رکھنے کا سبب صرف اُس کا حسن و جمال ہی نہ تھا۔ بلکہ اُس میں اُس کے فضل و کمال کو بھی کچھ دخل تھا۔ بادشاہ جب کبھی اس کو دیکھتا تو بے حد خوش ہو کر "نجم السرور" کے لقب سے پکارتا تھا۔ الحکم جیسے عالم بادشاہ کے دل میں اس کی علمیت و قابلیت کی بہت قدر اور وقعت تھی۔

اندلس ہی کی ایک دوسری رضیہ کا حال سُنئے۔ جو کنیز تھی۔ اپنی قابلیت علمی کے باعث عبدالرحمٰن ثالث کے دل میں نمایاں جگہ پائی تھی۔ عبدالرحمن نے اُس کو آزاد کر کے اپنے پیارے فرزند الحکم کے سپرد کر دیا تھا۔ اس علم دوست بادشاہ نے رضیہ کی صحبت بہت خوشی سے پسند کی۔ رضیہ جیسی عالمہ فاضلہ تھی ویسی ہی مورخہ بے بدل شاعرہ بے نظیر مانی جاتی تھی۔ اس نے الحکم کے ایما سے سیر و تاریخ میں بہت سی کتابیں تصنیف کیں اور اپنے اشعار کے دیوان بھی مرتب کئے اس کی کتابیں الحکم کے مشہور کتب خانے کی زینت بنتی تھیں۔ اس کی لیاقت کا چرچا اس قدر ہو گیا تھا کہ وہ الحکم کی وفات کے بعد غم غلط کرنے کی خاطر مشرقی اندلس کا سفر کرنے گئی اُسے یہ دیکھ کر سخت تعجب ہوا کہ وہاں کے ہر شہر میں اُس کی علمیت کا شہرہ ہو چکا تھا۔

"عصمت"

دہلی

شیخ فریدالدین عطار

عارف (Mystic) عطار کو ہفت وادی یا منازل روحی کا جنہیں طیور عبور کرتے ہیں موجد بتاتا ہے۔ واقعی دوسرے صوفیوں مثلاً قشیری و ہجویری کی (جو عطار سے مقدم ہیں) اور سہروردی کی (جو اُس کا معاصر ہے) تصانیف میں اس قسم کا نظام نہیں پایا جاتا اور اس وجہ سے کوئی سبب نہیں معلوم ہوتا کہ اسے عطار سے کیوں نہ منسوب کیا جائے۔

یہ خیالات کہ نظام سات کے عدد اور نام دلفریبی کے لحاظ سے سینٹ ترسیں (St. Terese) کے خیالات سے ملتا ہے۔ عطار کے وادیوں کے نام لکھتا ہوں:-

طلب، عشق، علم، بے تعلقی، وحدت، حیرت، عدم اور فنا۔ میں اس جگہ اس روحانی موت یا فنا کی حقیقی نوعیت پر بحث نہیں کرنا چاہتا۔ میں اس کے متعلق اپنے آرا اپنی کتاب "غزالی" میں ظاہر کر چکا ہوں۔ اور ان آرا میں اس وقت تک کوئی اہم تبدیلی نہیں ہوئی ہے۔

میں اخیر میں عطار کے چند لطیف ابیات پر اکتفا کرتا ہوں جس میں اُس نے اس کیفیت کو بیان کرنے کی کوشش کی ہے۔ جہاں روح کی زندگی اور شخصیت کے تمام عوارض و تفصیلات محو ہو کر رہ جاتے ہیں۔ اور صرف وصال خداوندی کا احساس باقی

رہ جاتا ہے۔

وہاں تو ایک روحانی شعاع کے سامنے ہزاروں تاریکیوں کو جو تجھے گھیرے ہوئے ہیں غائب ہوتے دیکھے گا۔ جبکہ بحر ذخار کی موجیں ساکن ہو جاتی ہیں تو وہ نقوش جو پانی پر پڑتے ہیں غائب ہو جاتے ہیں۔ یہ نقوش محض عالمہائے موجودہ و آئندہ ہیں جس شخص کا دل اس سمندر میں گم ہو جاتا ہے۔ وہ ہمیشہ کے لئے معدوم ہو جاتا اور سکون پا لیتا ہے اس بحر ساکن میں بجز فنا کے اور کچھ نہیں ملتا۔ اگر کوئی پاک شے اس سمندر میں گر جاتی ہے تو وہ اپنی مخصوص ہستی کو گم کر دیتی ہے۔ اپنا جداگانہ وجود کھو دینے پر وہ آئینہ کی ہو جاتی ہے۔ وہ موجود ہوتی ہے اور نہیں ہوتی ہے یہ کیسے ممکن ہے؟ ذہن اسے سمجھنے کی طاقت نہیں رکھتا۔

"اردو" اورنگ آباد

مذہب اور خانگی امور کا انتظام

جس طرح مذہب کا اقوام عالم کی زندگی کے انقلابات پر اثر پڑتا ہے۔ اسی طرح وہ قوموں کے رجحانات۔ اُن کی روحانی ترقی اور اُن کی ذہنیت کا اچھا نمونہ ہے۔ اس لئے ہمیں مصری عورت کا مکمل و مفصل حال لکھنے کے لئے مصریوں کے مذاہب کی چھان بین ضروری ہے +

انسان کی اجتماعی تاریخ سے پتہ چلتا ہے کہ اگلی قوموں میں ایک مذہبی طریقہ طوطم سے موسوم تھا۔ طوطم غالباً کوئی جانور ہے جسے قومیں پوجتی تھیں۔ اُن کا گمان تھا کہ اُن کی نسل اُسی جانور سے چلی ہے۔ اسی قاعدہ کے لحاظ سے مصری اُصول عبادت اور اجتماعی نظام پر کاربند تھے۔ لیکن اُن کا نظام اجتماعی رفتہ رفتہ بدل گیا۔ لڑکے صرف ماں کے کہلاتے تھے۔ مصری تمدن کے ہر دور میں یہ طریقہ مروج رہا۔ یہاں تک کہ اہل یونان غالب ہو گئے جن کی حکومت سنہ ۳۲۳ سے سنہ ۳۰ ق م تک تھی۔ اُنہوں نے مصر میں یونانی تمدن کا بیج بویا۔ جس نے مصریوں کے مذہب اور اُن کی خصوصیات میں انقلاب عظیم پیدا کیا۔ باوجود اس رد و بدل کے بھی قبروں پر ہیرو غلیفی خط سے مردوں کے نام لکھنے کا طریقہ اور اُن کو ماؤں کو منسوب کرنے کا رواج اگرچہ اقلیت کے ساتھ یونانی مصر کے زمانہ تک باقی رہا۔

یونانیوں کے تسلط سے مذہب کا رُخ بھی جانوروں سے پھر کر انسانوں کی طرف آگیا۔ مصریوں نے بعض بڑے بڑے آدمیوں کی پرستش شروع کر دی۔ بابیروس انطازی کی کتاب پڑھنے سے معلوم ہوتا ہے کہ ابتدا میں مصریوں کے صرف تین خدا تھے (عمون) پوشیدہ (تباک) غیر فانی (را) خالق موجودات۔ پھر مصریوں نے ان خداؤں کو ایک چوتھے معبود (اُوزیریس) سے جا ملایا۔ اور ان کو اس کا مظہر ٹھیرایا اس قدیم خدا کی طرف اُنہوں نے روشنی اور سورج کو منسوب کیا۔ اس کی بہن (ایزیس) جو اُس کی بیوی بھی تھی۔ شرف خداوندی میں اپنے بھائی یا شوہر کے شریک تھی (۲) اولاد کی آرزو میں مصری (اوزیریس) مجسمہ پر آتے تھے (۳) اُن کے علاوہ مصریوں کی ایک اور بھی معبودہ تھی جس کا مرتبہ بتوں میں (ایزیس) کے برابر تھا۔ نام اس کا نیتہ اور مسکن آفتاب تھا۔ نیچر کی پیدائش کا شرف اسی کو حاصل تھا۔

اس بنا پر کہ مذہب قومی اخلاق کا آئینہ ہے مصریوں کا صنف لطیف کو جنس قوی کی طرح رتبۂ خداوندی تک پہنچا دینا اور انہیں معبودانہ مراسم کی ادائیگی میں شریک کرنا مصری تمدن میں عورتوں کی قدر و منزلت ظاہر کرتا ہے۔

(نیرنگ خیال)

ترقی

کہا جاتا ہے کہ آجکل کا زمانہ نہایت ترقی یافتہ اور تہذیب و تمدن کی معراج کا زمانہ ہے۔ لیکن مجھے اس سے اتفاق نہیں۔ میرے نزدیک ترقی کا مفہوم یہ ہے کہ انسانی رنج و تکلیف میں کمی اور آرام و راحت میں بیشی ہو۔ اور میرے نزدیک اس قوم سے بڑھ کر قابل الزام کوئی قوم نہیں جو تمدنی زندگی کے ایسے اُصول قائم کرے جن سے نحوست۔ نکبت، نفاق، نفرت، تنزل و افلاس اور تعصب و جہالت اُسے چاروں طرف سے گھیریں اور جن کی بدولت اُسے تن ڈھانکنے کو کپڑا اور پیٹ بھرنے کو روٹی میسر نہ آئے۔ لوگوں کو جو افکار و ترددات آج کل دامنگیر ہیں اُن کا عشر عشیر بھی اگلے

زمانے میں نہ تھا ہسپتالوں کو دیکھئے بیماروں سے بھرے پڑے ہیں۔ گلی کوچوں سڑکوں، درگاہوں، مندروں میں گداگروں کا وہ ہجوم ہوتا ہے کہ الاماں، سفید پوش لوگوں کی اندرونی خستہ حالی اور قلبی پریشانی کی جو کیفیت ہے۔ وہ بیان سے باہر ہے، ان مصائب اور دردناک مناظر کے اسباب کیا ہیں اگر زمانے کی تہذیب کو دعویٰ ہے کہ معراج کمال کو پہنچی ہوئی ہے تو ان تکلیف دہ حالات کے ہوتے ہوئے یہ دعوی کیوں کر ثابت ہو سکتا ہے۔ تہذیب کے معنے تو یہ ہیں کہ گوشۂ عالم میں خوشی کی لہریں دوڑتی رہیں اور خلق اللہ کی راحت میں دمبدم اضافہ ہوتا رہے۔ ایسی حالت کو حاصل کرنے کے لئے مختلف ملکوں اور قوموں کے سنجیدہ دلوں اور فہمیدہ دماغوں کو غور کرنا چاہئے کہ جس رستہ پر آجکل دنیا چل رہی ہے وہ کہیں اس کی مصداق تو نہیں ہے کہیں راہ کہ تو میروی بہ ترکستان است۔ اصل یہ ہے کہ تمدن حال کی بنیادیں اس نظریہ پر قائم ہیں کہ قومی ہستی کمزور کو فنا کر دے صفحۂ دنیا سے جبتک یہ نظریہ نہیں مٹے گا اور طاقت کی نمائش کم نہ ہوگی اُس وقت تک صحیح انسانی نشوونما کا وجود میں آنا محال ہوگا۔ مجھے یہ اصول پسند ہے کہ قومی ہستی کمزور کو فنا کرنیکے بجائے اس کی دستگیر اور معاون ہو ایسی دستگیری کیلئے ہم کو اُن تمام اصولوں کے بدلنے کی ضرورت ہوگی جو نظریہ سابق میں مضمر ہیں۔ مزید برآں جبتک اخلاق حسنا ور جذبات خدا ترسی کی تولید اور قوت عمل صالحہ کو مسلسل جنبش نہ ہوگی اُس وقت تک زندگی خوشگوار پرامن اور راحت افزا و کامیاب نہ ہوگی۔ (کامیابی)

باغ و بہار

کنج دلچسپ ان میں کلیوں اور پھولوں کی بہار — سر پہ سایہ اور پاؤں کے تلے ہے سبزہ زار

ہر روش کے دونوں جانب سبزہ مخمل کا ہی فرش — ہے نئی دُوب اس سبب سے رنگ میں ہلکا ہی فرش

کھلتی ہیں شاخوں میں کلیاں جب کھلاتی ہے ہوا — ہلتی ہیں پھولوں کی شاخیں جب ہلاتی ہی ہوا

ایک گیندا پتیاں خوشرنگ جسمیں سینکڑوں — ایک گل پیش نظر ہیں جس کی قسمیں سینکڑوں

پتیاں ہیں لال لال اور ان میں زیرہ زرد زرد — گرد آگ اور بیچ میں سونا ہے لیکن آگ سرد

حوض بھی نہریں بھی فواروں کا جنمیں لطف ہی — بلبلے شفاف سیاروں کا جن میں لطف ہی

لڑکھڑاتی چلتی ہے ہر موج متوالے کی چال — مچھلیاں پھرتی ہیں انمیں پیاری پیاری لال لال

ایں! جو سورج ڈوبتا ہی شوق اٹھو گھر چلو

اس چمن سے کل کے نظارہ کا وعدہ کر چلو

شوق قدوائی

حقیقتِ گناہ

بحرِ دل میں گرچہ طوفاں خیز ہے افسوں ترا
میں حقیقت کو پہنچ کر ہو گیا ممنون ترا

تیری لغزش نے کبھی سجدوں پہ آمادہ کیا
اور بساطِ بزمِ مے کو تو نے سجادہ کیا

علمِ حق کی شمع افروزی جگر سوزی تری
سیلیٔ استاد سی ہے حکمت آموزی تری

خوانِ دِل پر شوربختی کی نمکدانی بھی ہے
حُسن کی کشور میں گیسو کی پریشانی بھی ہے

پستی و اُفتادگی میں بھی نمو کا راز ہے
زور سے گِر کر اُبھرنا بھی پرِ پرواز ہے

رازِ پنہاں دہر کا چشمِ حقیقت پر کھُلا
اِک کٹھن منزل ہے تو بھی بر سرِ راہِ ہُدا

کجروی ہوتی نہیں جب باعثِ تسکینِ دل
جانبِ حق کو پلٹ جاتا ہے پھر آئینِ دل

تو نے روشن سب پہ کارِ نیک کا مضموں کیا
تیری تاریکی نے حسنِ نور کو افزوں کیا

شعلۂ حق رزق پاتا ہے ترے خاشاک سے
گلشنِ عرفاں کے پھول اُگتے ہیں تیری خاک سے

(عبدالحکیم)

انگریزی

عظمتِ برطانیہ

کامیابی کے اُس قلعے کے مقابلہ میں خواہش کی تلوار ٹکڑے ٹکڑے ہو کر رہ جاتی ہے۔ جن قوموں کے جج بے انصاف ہوتے ہیں وہی قومیں ذلت کے گڑھے میں گر جاتی ہیں۔ کیونکہ ان میں کوئی ایسی بات نہیں ہوتی جسے عوام قابلِ حمایت خیال کریں۔ لیکن جن قوموں سے ہم جیسا سلوک ہوتا ہے وہ گرا نہیں کرتیں وہ اس طرح سے بامِ عروج پر پہنچتی ہیں جس طرح سے ہم پہنچے ہیں اور اس طرح سے جھکتی ہیں جس طرح سے ہم جھکتے ہیں اور اس طرح سے مرتی ہیں جس طرح سے ہم مرے ہیں۔ ہم انصاف کے اس قدر عادی ہیں اور آزادی کے اس قدر دلدادہ ہیں کہ اس زندگی کی پروا ہی نہیں کرتے جو منصفانہ اور آزادانہ ہو۔ اگر میں نے اس حقیقت کی تصویر کھینچنے میں مبالغہ سے کام لیا ہے تو شہادت کیلئے میں آپ کو دعوت دیتا ہوں تلوار تو ابھی ابھی نیام میں ڈالی گئی ہے۔ جھنڈا ابھی حال ہی میں لپیٹا گیا ہے طبلِ جنگ کی آخری آواز بھی ابھی مدہم ہوئی ہے۔ آپ کو یاد ہے کہ اس ملک نے کس قسم کے نظارے کا مظاہرہ کیا تھا، ایک ہی دل تھا ایک ہی آواز ایک ہی ہتھیار اور ایک ہی مقصد تھا اور کیوں؟ وجہ یہ ہے کہ یہ ملک قانون کا ملک ہے۔ اس ملک کا جج کسان اور بادشاہ کا یکساں جج ہے۔ ہر آدمی کی خوشحالی کو مقررہ قواعد کے ذریعے ظلم اور وہم سے محفوظ کیا گیا ہے۔ ذرا غور سے تو دیکھو کہ ہم کیا ہیں اور منصفانہ قوانین نے ہمارے لئے کیا کیا ہے۔ اس سرزمین کو سخاوت اور پرہیزگاری کا مرکز بنا دیا ہے۔ گرجے ہسپتال اور قربان گاہیں بکثرت تعمیر ہو گئی ہیں۔ ہم نیک سامریوں اور تمام نوعِ بشر کا درد رکھنے والی قوم بن گئے ہیں۔ تمام ممالک اور سمندر ہماری شجاعت کا لوہا مان چکے ہیں ہم نے حال ہی میں اُس تلوار کو نیام میں ڈالا ہے جو دنیا کی حفاظت کے لئے میان سے نکالی گئی تھی۔ ہم نے ابھی ابھی وہ ڈھال اُتار کر رکھی ہے۔ جو اقوامِ عالم کی حفاظت کیلئے لگائی گئی تھی۔ خدا نے ہماری زمین کو سرسبز بنا رکھا ہے۔ انگریزی مشینیں ہر ملک کے لئے محنت اُٹھا رہی ہیں۔ کرہ ارض کے تمام سمندر انگریزی جہازوں سے ڈھکے پڑے ہیں۔ فنونِ لطیفہ کی بدولت ہم شائستہ ہو گئے ہیں انسانی علم ادب سے ہم مہذب بن چکے ہیں علم سائنس ہمارا رہنما ہے اور ایسی قوم جو غلامی کی زنجیروں کو توڑ پھینکتی ہے وہ ان نظیروں اور نیز اُن اصول کیلئے حامیانِ آزادی کی طرف نظر اُٹھا کر دیکھتی ہے جو اُس قوم میں زندگی کی روح پھونک کر اُسکی رہنمائی کر سکتے ہیں۔

عربی

دوستوں کے آداب

وہ شخص تمہارا دوست نہیں ہو سکتا جو بخل۔ چغلخوری۔ کمینہ پن۔ بڑائی اور غصہ میں مشہور ہے۔

اور نہ تم اُس شخص سے اخلاص کی اُمید کر سکتے ہو جو نہ تمہارے بھیدوں کو چھپا سکتا ہے۔ نہ فضول گوئی سے پرہیز کرتا ہے اور نہ ذلت اور رسوائی کا اس پر کچھ اثر ہے۔

تم سوچو کہ وہ شخص کس طرح دوستی کی ذمہ داری کو پورا کر سکتا ہے جو نہ اخوت کے معنے سے واقف ہے اور نہ اس کی عقل میں یہ بات آتی ہے کہ دوستوں اور بھائیوں کا مرتبہ کس قدر بلند ہوتا ہے؟ اور اخلاص و محبت کے آداب کیا ہیں؟ امام غزالی کا قول ہے کہ جب تم کسی شخص کو اپنی دوستی کیلئے انتخاب کرو تو اس میں ذیل کے پانچ اوصاف کی جانچ ضرور کر لو۔

(۱) سب سے پہلی چیز عقل ہے۔ یاد رکھو کہ کسی احمق کی دوستی کبھی بھلائی کا موجب نہیں ہو سکتی۔ سب سے دلچسپ امر احمق کی دوستی میں یہ ہے کہ وہ تم کو نفع پہنچانا چاہیگا۔ لیکن اس کا ہر وہ کام جو تمہارے نفع کیلئے ہو گا تم کو نقصان پہنچائے گا۔

اس لئے یہ کہنا درست ہو گا کہ ایک سمجھدار اور عقلمند دشمن بیوقوف اور احمق دوست سے بہتر ہے۔

(۲) دوست کے اوصاف میں دوسری چیز اچھے اخلاق کا ہونا ہے۔ کیونکہ بد اخلاق شخص غصہ اور برہمی کے وقت اپنے نفس کو قابو میں نہیں رکھ سکتا اور جو شخص اپنی طبیعت پر قابو نہ پا سکتا ہو اس کی دوستی خطرے سے خالی نہیں۔

(۳) اصلاحِ نفس کیونکہ جو شخص ایسی طبیعت کا مالک ہے۔

جس نے ابھی تک پاکیزہ اوصاف کو قبول نہیں کیا اُس شخص کی دوستی تم کو گمراہیوں اور بُرائیوں میں مبتلا کر دینے کا موجب ہوگی۔

(۴) دوست حریص نہ ہونا چاہئے۔ کیونکہ دنیا میں طبیعتیں ایک دوسرے کے اثرات قبول کرتی ہیں۔ تمہارا حریص دوست ضرور اس کا باعث ہو سکتا ہے کہ تم کو بھی حرص کی لعنت میں گرفتار کر دے۔

(۵) سچائی۔ کیونکہ جھوٹا دوست سراب کی مانند ہے جو تم کو دھوکے میں ڈال رہا ہے۔ اس کی ہر بات میں دھوکہ ہوتا ہے۔ اور اس کا کوئی فعل دھوکہ سے خالی نہیں۔

بعض لوگوں نے کہا ہے کہ تم کو علما۔ حکما، اور عقلمند لوگوں میں سے دوستوں کا انتخاب کرنا چاہئے کیونکہ اُن کی دوستی تمہیں عقل و حکمت اور فہم و ادراک کی دولت سے مالا مال کر دے گی۔

اور تم کو اہل حیثیت سے دوستی کرنی چاہئے اس لئے کہ اُن کی وجاہت سے تم فائدہ حاصل کر سکتے ہو۔

اور تم کو ایسے لوگوں کو دوست بنانا چاہئے جو مال و دولت کے مالک ہیں کیونکہ اُن کی دوستی تم کو مالی پریشانیوں سے نجات دلا سکتی ہے۔

اس میں شک نہیں کہ تم کو بہت سے دوست ایسے ملیں گے کہ اُنکے دل کی گہرائیوں میں تو محبت و اخلاص کے جذبات نہ ہوں گے لیکن وہ بظاہر تم کو اپنی دوستی کا یقین دلائیں گے ایسے لوگوں کے لئے ضروری ہے کہ تم ظاہرداری سے پیش آؤ۔ اُن پر مناسب طور سے احسانات کرو لیکن اپنے رازوں کو چھپاؤ اور اپنی خاص باتوں کا اُن سے ذکر مت کرو۔

ایک فلسفی کہتا ہے کہ اگر تم کسی مخلص دوست کو انتخاب کرنے میں کامیاب ہو جاؤ تو تمہارا فرض ہے کہ اس کے ساتھ انتہائی مراعات سے پیش آؤ۔ کاموں میں اس کی امداد کرو۔ خوش اخلاقی سے پیش آؤ اور اس سے اس طرح ملو کہ تمہارے چہرے پر مسرت و نشاط کے آثار ہوں

(جامع الآداب)

حامد الانصاری
غازی

پنجابی

تنقید نگاری

تنقید نگاری زبان کی صحت یا عدم صحت پر بحث کرنے کو کہتے ہیں اخباری تنقیدوں میں اکثر اوقات پرلے درجے کی بے پروائی اور غیر ذمہ داری کا اظہار کیا جاتا ہے۔ اس سہل انگاری کے باعث ناظرین کے دلوں میں بھی اُن تنقیدوں کی بے وقعتی گھر کر لیتی ہے۔ ایک کتاب ایک شخص کو تو دلچسپ معلوم ہوتی ہے مگر دوسرا اُس کو بے لطف خیال کر سکتا ہے۔ جس کتاب کو ایڈیٹر دلچسپ کہدیں ممکن ہے کہ وہ مجھے بھلی نہ لگے یا معاملہ اس کے برعکس ہو۔ کسی کو حلوا مزہ دیتا ہے اور کسی کو نمکین اگر ہم کہیں سے اتنا سُن پائیں کہ باورچی خانہ میں کوئی چٹپٹی چیز تیار ہوئی ہے تو ہمارے دلوں میں بعض اوقات وہم سا پیدا ہو جاتا ہے۔

اسی طرح جس کتاب پر تنقید لکھنی ہو جبتک اس کی چھان بین اچھی طرح سے نہ کرلی جائے اُس کی خوبیوں اور نقائص کی جانچ نہ کرلیجائے اُس وقت تک وہ ناظرین کی آنکھوں میں جچ نہیں سکتی۔

کسی اخبار یا رسالہ کے ایڈیٹر کے پاس تو طرح طرح کی کتابیں آتی ہیں اُن پر اُن کے مصنفوں نے کافی محنت کی ہوتی ہے کتنی کتابوں کا مطالعہ کر کے مواد جمع کیا ہوتا ہے۔ ایڈیٹر اتنے عالم و فاضل نہیں ہوتے۔ کہ ہر بات کو پرکھ سکیں اور نہ اُن کو اتنی فرصت ہوتی ہے کہ اچھی طرح تحقیق کر کے تنقید لکھیں۔ کیونکہ جو بات خوب تحقیق اور غور و خوض کے بعد لکھی جائے اس کی خوبی اور خرابی خود بخود ہی ظاہر ہو جاتی ہے اسی کے ضمن میں اس کی توصیف اور نکتہ چینی بھی ہو سکتی ہے۔

اسی لئے بہت سے ایڈیٹر تو صرف اسی پر اکتفا کرتے ہیں "ہمیں اس بات سے اتفاق نہیں ہے" یا فلاں بات ٹھیک نہیں ہے" وغیرہ وغیرہ۔ ایسی تنقیدوں کو تو دور ہی سے سلام ہے اس کے سوا اور کیا کہا جا سکتا ہے۔

دیگر زبانوں کی نئی نئی کتابیں دیکھ دیکھ کر ہم آزادی کے ساتھ اُن کی تقلید نہیں کر سکتے۔ مثلاً ہم قدیم المناک ناٹک کو شکسپیر کی ٹریجیڈی ( ) نہیں کہہ سکتے۔ شکسپیر کی ٹریجیڈی میں ہیرو ہمیشہ اپنے کئے کا پھل آپ پاتا ہے۔ اس کے تمام ڈرامے رنج و الم کے زہر سے بھرے ہیں۔ انہیں ہیرو کی حالت زار پر ترس آتا ہے اور وہ ہیرو موت کے منہ میں چلا جاتا ہے۔ مگر باوجود اس کے آخر میں کمیڈی (فرحیہ) کا پارٹ بھی آتا ہے۔

تنقید کرتے ہوئے ہم کہہ سکتے ہیں کہ اس ڈرامے میں نیا رنگ ہے اور المیہ اور فرحیہ کی عجیب و غریب معجون مرکب تیار کی گئی ہے۔
تنقید دو طرح کی ہوتی ہے۔ ایک کو تبصرہ کہتے ہیں اور دوسری کو نکتہ چینی تبصرہ کا رواج تو عام ہو گیا ہے۔ ہر ایک ایڈیٹر اپنی اغراض کو مدنظر رکھ کر چند منٹوں میں تبصرہ لکھ مارتا ہے اور نکتہ چینی کی طرف مطلق دھیان نہیں دیتا۔

میں یہ نہیں کہتا کہ نقائص نہ نکالے جائیں بلکہ ہر ایک مصنف کو زبان کی اصلاح ضرور کرنی چاہئے۔ اس میں کسی قسم کے شکوے اور شکایت کی بات نہیں ہے۔ جن کتابوں میں زبان کے نقائص چلے آتے ہیں اُن کو اوّل تو کتابوں میں شمار ہی نہیں کرنا چاہئے۔ اگر ہوں بھی تو وہ صحت بخش کتابیں نہیں کہلا سکتیں۔

"پھلواڑی" امرتسر

فارسی

ایران کی تربیت و اصلاح

آج میں اس امید اور اس آرزو کو دل میں لیکر قلم اُٹھا رہا ہوں کہ جس طرح حکومت جرمنی اپنے فرزندوں کی تربیت اور ذہنی و فکری نشو و نما کیلئے سرگرمی کا اظہار کر رہی ہے۔ اسی طرح مملکت ایران کے حساس افراد بھی اپنے نونہالوں اور وطن کے فرزندوں کی تہذیب و تربیت کے لئے خلوص دل، نیت خالص اور مضبوط ارادے کے ساتھ کمر باندھ کر میدان میں آجائیں۔

وطن کے بہی خواہ انسانو! میں تحریری طور پر تمہارے اور تمہارے رفقا کے برابر قدم رکھنا چاہتا ہوں اور خیال کرتا ہوں کہ شاید تمہاری رفاقت اور معیت کی برکت ہی سے منزل مقصود پر جلدی پہنچنے میں کامیاب ہو جاؤں۔

کیونکہ راستہ پرخطر اور دشوار گذار ہے جس پر تنہا سفر کرنا پریشانی کا باعث ہے۔

میں اکثر سوچتا ہوں کہ ایران کی خرابیوں کی اصلاح کی ابتدا کہاں سے اور کس طرح سے کی جائے۔

اور اپنی طبیعت کو مجبور کرتا ہوں کہ ایران کی اصلاح کے بارے میں جن رایوں کا اظہار کیا جا رہا ہے وہ کہاں تک ایران کے مرض کا مداوا کر سکتی ہیں۔

یہ تو ہر شخص کہتا ہے کہ ایران کو یکسر مفاسد سے پاک کر دیا جائے لیکن یہ کہ اصلاح کا کام کس طرح شروع کیا جائے اس کے متعلق کوئی کچھ نہیں کہتا۔ یہ تو سب کہتے ہیں کہ نغمہ نوازی کرنی چاہئے۔ لیکن یہ کہ اس نغمہ کے کون سے تار کو پہلے چھیڑنا چاہئے۔ اس کے متعلق ہر شخص خاموش ہے اور اسی جگہ میری ذہنی اور فکری قوتیں جواب دیدیتی ہیں اور میں حیرت و تردد کے جنگل میں پریشان کھڑا رہ جاتا ہوں۔ سوچتا ہوں کہ کیا اصلاح

ایران کے حامی مخلص نہیں ہیں۔ کیونکہ اگر مخلص ہیں تو کیوں اصلاح کا کام شروع نہیں ہو جاتا اور کیوں ہم ابھی تک یہ معلوم نہیں کر سکے کہ اُس طویل راستہ کا سرا کہاں ہے جس پر ہم چلنا چاہتے ہیں۔

میں چاہتا ہوں کہ اس صحبت میں اہم اور خطرناک مفاسد کا ذکر کروں تاکہ اُنہیں کی اصلاح سے کام شروع کر دیا جائے۔

سب سے بڑی خرابی یہ ہے کہ ایرانی باشندوں کے پاس روزانہ معاشرتی امور کے حصول کے لئے ذرائع موجود نہیں ہیں۔ فقر و فاقہ روز بروز ترقی پر ہے۔ غربت زیادہ ہو رہی ہے۔ مفلسی بڑھ رہی ہے۔ ہم دیکھتے ہیں کہ بعض لوگوں کے پاس کچھ سرمایہ موجود ہے۔ بعض لوگوں کو ورثہ کے طور پر کچھ جمع مل گئی ہے اور بعض لوگوں نے بینکوں میں روپیہ جمع کر کے کچھ پونجی پس انداز کرلی ہے۔ لیکن افسوس ہے تو یہ ہے اور حسرت ہے تو اس امر پر کہ ایسے لوگوں میں یہ احساس بالکل نہیں ہے کہ یہ روپیہ کس طرح خرچ کیا جائے تاکہ اس سے روزانہ ضروریات بھی پوری ہوتی رہیں اور اس میں اضافہ بھی ہوتا رہے۔

افراد وطن کی بدبختی اور خستہ حالی کے دوسرے اسباب۔ عدالتی اخراجات۔ داخلی امن و امان کا فقدان۔ اور آفات ارضی و سماوی ہیں ایران ایک ایسی ہیکل ہے جس میں روح نہیں۔ ایک ایسا جسم ہے جس میں دل نہیں۔ ہمارا وطن ایک بغیر گوشت و پوست کا ڈھانچ ہے اور بس۔

یہ ایک غم انگیز حقیقت ہے کہ ایران میں جو لوگ کل آرام سے زندگی بسر کر رہے تھے آج اُن کی اولاد اطمینان و سکون اور راحت و آرام کے اسباب سے محروم ہے۔

شہری باشندے بیشک بظاہر اچھی حالت میں معلوم ہوتے ہیں

لیکن ان میں سے اکثر حکومت کے دفتروں اور کمپنیوں وغیرہ میں ملازم ہیں اور اپنی ماہوار آمدنی پوری خرچ کرنے کے بعد روپیہ قرض لیتے ہیں اور قرض خواہوں کی بندشوں میں گرفتار ہیں

دیہات اور اطراف کے آدمیوں کی حالت بھی اچھی نہیں۔ فقر و فاقہ نے اُن کی راحت و آسایش کو اور اُن کی آرام و طمانیت کو جڑ سے اُکھاڑ کر پھینک دیا ہے۔ ان اطراف کے غریب باشندے ایک دوسرے کے حال سے بے خبر ہیں۔ یہ مسکین اپنی مظلومی کی صدا کو طہران کے ایوان حکومت تک نہیں پہنچا سکتے۔ کیونکہ اُن کے پاس نہ ذرائع ہیں۔ نہ اتنا سرمایہ ہی ہے کہ ایران کے دربار میں رسائی حاصل کر سکیں۔

وطن کے بہی خواہو! یہ وہ مفاسد ہیں جن کا آزالہ ہمیں سب سے پہلے کرنا چاہیئے تاکہ ہم اپنے وطن کی اصلاح کے مقدس فرض میں کامیاب ہو سکیں۔

حامد الانصاری (ایرانشہر)

اطالوی

روما

میں اُن چند اشخاص میں سے ہوں جنہوں نے وہ سارا زمانہ روما ہی میں گذارا جبکہ روما کے سوال کی بنا پر اٹلی میں سخت سنسنی پھیلی ہوئی تھی میں اُس وقت روما میں پہنچا جبکہ اُسے اٹلی والوں کے ہاتھ میں آئے ہوئے ایک زمانہ گذر چکا تھا۔ اور وہ اٹلی کا ملکی دار الحکومت بن چکا تھا۔ درحقیقت مجھے روما جانیکا اتفاق صرف ایک ہی دفعہ ہوا ہے اور وہ بھی صرف ڈیڑھ دن۔ مجھے ذرا شرمناک اقرار کرنا پڑتا ہے کہ میں روما کو دیکھ کر مایوس سا ہو گیا۔ مجھے اس کا پست جائے وقوع پسند نہ آیا۔ مجھے اس کی مختصر سی وسعت بھی پسند نہ آئی میں وہاں اتنا عرصہ قیام نہیں کر سکا کہ اس کی غیر معمولی خوبصورتی اور اس کی دلچسپ چہل پہل کا اندازہ کر سکوں۔

میں نے سینٹ پیٹرز برگ کے گرجے کی زیارت صرف ایک ہی دفعہ کی اور سچ پوچھو تو میں اس کی وضع دیکھ کر حیران سا رہ گیا بیشک وہ خوبصورت تو ہے اور گذشتہ عظمت کی یادگاروں کے باعث اس کا ایک ایک انچ مقدس ہے۔ لیکن وہ اس قسم کا گرجا نہ نکلا جس کی توقع میں نے باندھ رکھی تھی۔ میں نے اس سے تھوڑے ہی دن پہلے شہر کولون کا عجیب و غریب گرجا بھی دیکھا تھا اور اسی لئے میں نے کولون کو روما پر ترجیح دی تھی۔ البتہ یہ دونوں عالی شان عمارتیں ایک دوسرے سے بالکل مختلف ہیں کولون کی طرز تعمیر گوتھک ہے اور روما کی طرز تعمیر دور جدید کی ہے۔ کولون کے بڑے بڑے میناروں کے وسیع گھیرے میں شہر روما کی نزاکت کی نسبت زیادہ متاثر ہوا۔ میرے خیال میں اگر کوئی شخص صرف روما ہی میں رہے تو اُسے دنیا بھر کے لوگوں کی اکثر جماعتوں میں سے ایک نہایت ہی دلچسپ جماعت کا پتہ لگیگا۔ یہ جماعت سراسر اطالوی ہے۔ لیکن اس جماعت میں تمام یورپ کی شریف اور مہذب جماعتوں کے نمایندے موجود ہیں۔ جو یہاں کی مجلسیں اور محفلیں بہت ہی دلچسپ ہوتی ہیں

مجلسی منافرت

اس جماعت کی کامیابی کے رستہ میں بڑی بھاری رکاوٹ یہ تھی کہ پاپائے روما کی سیاہ پوش جماعت اور گورمنٹ اٹلی کے خاص اپنی باہمی سیاسی منافرت کا چرچہ پرائیویٹ طور پر کیے رہتے ہیں۔ اگر آپ اتفاق سے کسی سیاہ پوش محفل میں چلے جائیں تو آپ کو دیگر سیاسی جماعتوں کا کوئی رکن بھی نظر نہ آئیگا۔ اسی طرح سے سفید پوش جماعت کی محفل میں سیاہ پوشوں کو گھسنے نہیں دیا جاتا۔

میرا خیال ہے کہ پاپائے روما اور گورمنٹ اٹلی کی باہمی مصالحت کا سب سے پہلا نتیجہ یہ ہوگا کہ اس تکلیف دہ منافرت کا قلع قمع ہو جائیگا اور روما کی نئی مجلسی زندگی زیادہ خوشگوار ہوگی۔

لاطینی

افلاطون کی روح

عقاب! تو اُس قبر میں کیوں اُڑتا ہے؟ تو کس شاندار اور اُجڑے گھر کی جانب اُڑ رہا ہے۔ میں تو تیز و طرار افلاطون کی روح

عکس ہوں۔ میں آسمان پر پرواز کر رہا ہوں۔ انتھیز کو صرف میری لاش ہی ورثہ میں ملی ہے۔

آیا تو اُسے بٹوے کی بجائے رسی ملی۔ اُس کی اُمید مایوسی میں بدل گئی۔ ایک کو تو ہم بالائے طاق رکھدیتے ہیں اور دوسری کو لے لیتے ہیں۔ آسمان کے بلند گنبد کے نیچے قسمت ہی تو خدا ہے جو کچھ ہم سہتے اور کرتے ہیں۔ اس کا انحصار خود ہم پر اور حالات پر ہوتا ہے۔

اُمید کی جھلک

ایک آدمی گلے میں رسی ڈال کر خودکشی کرنے ہی کو تھا کہ اُس نے ایک بٹوا دیکھ کر رسی کو پھینک دیا۔ مالک جب اپنا مال لینے کے لئے

ترکی

مادہ پرستوں کے اعتراضات

مادہ پرست کہتے ہیں کہ روح جسم انسانی میں قطعاً کوئی خارجی وجود نہیں رکھتی۔ بشر کی خلقت ہمہ تن جسم سے مرکب ہے اور تمام ادراکات و شعور کا مرکز وہ قوائے عقلی ہیں جو مغز میں واقع ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ اگر مغز انسان اُس کے سر سے نکال لیا جائے تو اس کی قوت ادراک کلی طور پر زائل ہو جاتی ہے اور شعور کا فقدان ظاہر ہوتا ہے چنانچہ یہ دلیل اس امر کی ہے کہ عقل و ادراک کا مرکز مغز ہے اور جسم انسانی میں روحی قوتی موجود نہیں۔ مادیین یہ بھی کہتے ہیں کہ اگر روحانیوں کے اس عقیدے کو تسلیم بھی کر لیا جائے کہ جسم انسانی میں قوی روحی موجود ہیں تو یہ کس طرح ممکن ہو سکتا ہے کہ روح جسم کے درمیان قرار پذیر ہوا اور اگر ہو بھی تو وہ جسم کے کس حصے میں ہوگی۔

اُن کا ایک اعتراض یہ بھی ہے کہ اگر یہ بھی فرض کر لیا جائے کہ ترکیبات بدن انسانی کی بنیاد قوائے مردمی ہیں یہ کس طرح ممکن ہو سکتا ہے۔ روح اور جسم کا آپس میں اختلاط ہوا اور اگر اختلاط ہے تو روح اور جسم کے درمیان کیا تعلق ہے۔

ہسپانوی

دعا

آہ! مجھے وہ روشنی دے جس سے میں اُسے دیکھ سکوں۔ وہ حسن دے کہ میں اس میں محو ہو سکوں۔ وہ راستہ بتا جس پر چل کر میں اُسے تلاش کر سکوں۔ اُس محبوبہ کو تلاش کر سکوں جس کا حسن میری نجات کا نشان ہے

جہاں سے وہ گذرتی ہے۔ وہاں ستارے جگمگاتے ہیں۔ عورتیں قہقہے لگاتی ہیں۔ دریا تیز خرامی سے بہتے ہیں۔ پانی چمکتا ہے۔ سائے کانپتے ہیں اور ننھی ننھی ندیاں سرکنڈوں کو حرکت دیتی ہیں اور دنیا کی تمام پاکیزہ اور حسین چیزیں جگمگاتی ہوئی اُس کے دل سے پیدا ہوتی ہیں۔ اور اس کے دل کے بہارستان میں ایک خوش آواز پرندہ گاتا ہے۔

جاوی

خوش آواز پرندہ

گذشتہ رات ایک پرندہ تاریک جھاڑیوں میں چھپا اپنی جذبات انگیز آواز میں گا رہا تھا اور اُن جھاڑیوں پر نیند کی غنودگی طاری تھی ان پہاڑوں کی نیند کی سی غنودگی جو سمندر کے کنارے محو خواب رہتے ہیں اور پانی کی کوہ پیکر موجوں کے تھپیڑوں سے بھی بیدار نہیں ہوتے

لیکن میں سمجھ گیا۔ یہ آواز میرے دل میں میری خوابیدہ روح کو بیدار کر رہی تھی۔ حالانکہ یہ خود نیند کی وادی میں سے آئی تھی۔ میرا دل بے چین ہو کر دھڑکنے لگا۔ پرندے کی خوش آیند آواز مجھے کہہ رہی تھی۔ "تو بے جان ہے۔ تجھ میں زندگی نہیں۔ میرا دل کہتا تھا" تو نے مجھے

زندگی دی ہے" لیکن وہ آواز برابر مجھے جھٹلاتی تھی تنگ آکر میں نے ارادہ کرلیا۔ کہ میں بھی اسی طرح گاؤں اور سوئے ہوئے انسان کو بیدار کر دوں تاکہ ان میں میری زندگی کا نقش ہو جائے

فرانسیسی

شام

وہ آہستہ آہستہ دریا کے کنارے ریت پر پھر رہی ہے اور اس کی پیشانی پر دن کے بوسے کا مدہم سا نشان ہے وہ خاموشی کے ساتھ شفق کی طلعت سے آئی ہے اور اس خیال سے مسکرا رہی ہے کہ ابھی صبح بہت دور ہے دن کی مہک اس کے ارد گرد منڈلا رہی ہے۔ اس کے بالوں میں سوسن کے شگفتہ پھول ہیں جو موت کے ڈر سے کپکپا رہے ہیں اور شام کی بیٹی نیند جو زمانے کے تفکرات اور خیالات کو دامن میں لئے ہوئے ہے نزدیک پہنچ چکی ہے۔ اُن کی خاموشی کی مسلسل لیکن دھیمی دھیمی آوازیں آوارہ و سرگردان اُس تک آتی ہیں۔ لیکن کیا وہ پھول اُس کی آنکھیں ہیں جو شبنم کے قطروں سے شگفتہ ہو جاتے ہیں یا وہ ستارے ہیں جو رات بھر پلک نہیں جھپکتے۔

جرمن

اندھی لڑکی

ایک اندھی لڑکی نے بے تاب ہو کر اپنی ماں سے ہاتھ چھڑایا۔ اور بھاگ کر پائیں باغ میں چلی گئی۔ جب چاروں طرف ہاتھ پھیلا کر تسلی کر لی کہ یہاں کوئی موجود نہیں تو بارگاہِ خداوندی میں یوں دعا مانگنے لگی

میرے اللہ! سنا ہے تو نے سورج پیدا کیا ہے۔ وہ دنیا کو منور کرتا اور ہر شے کو زندگی بخشتا ہے۔ چاند ستارے بنائے ہیں۔ جو اندھیری راتوں کو دن کی مانند روشن کرتے ہیں کہتے ہیں تو نے رنگا رنگ کے پھول اُگائے ہیں جو اپنی رنگینی اور خوشبو سے دیکھنے والوں کی روح کو فرحت دیتے ہیں۔ کہا جاتا ہے تو نے بلند پہاڑ اور دریا پیدا کئے ہیں۔ جن کا نظارہ روح کو ایک طاقت بخشتا اور اہلِ ذوق پر تیری عظمت آشکارا کرتا ہے

اے خدا میں ان سب چیزوں کو دیکھنے سے قاصر ہوں۔ لیکن تیری درگاہ میں کوئی شکایت نہیں کرتی۔ میں یہ بھی نہیں مانگتی کہ مجھے ان نظاروں کے دیکھنے کیلئے بینائی دے۔ میرے اللہ میرا دل صرف اسقدر چاہتا ہے کہ میں اپنی ماں کا چہرہ دیکھ سکوں۔

ملایا

نظارہ

کاش میں اُس محبوب جگہ جا سکتا جہاں سے میں آیا ہوں۔ جہاں مجسم حسن کی حکومت ہے۔ جہاں سمندر کے کنارے میں نے اُس روح کو دیکھا تھا جس نے تمام دنیا کو اپنا مفتون بنا رکھا ہے۔ کاش جب ایک بار پھر سرسبز پتوں کے درمیان کھڑا ہوں۔ گڈریا بھیڑیں چرا رہا ہو اور سمندر کا پانی ساحل سے آ کر ہمکنار ہو رہا ہو وہ ایک بار پھر ہمیں نظر آئے۔

آہ! کاش۔ میں ایک بار پھر اُس حسنِ جہاں سوز کا نظارہ کروں۔ جن سے میرے الفاظ میں الہام کا اثر ہو۔ خوشی کا شعلہ مجھے جلا کر خاک کر دے۔ اور میں کائنات کے بھیدوں سے آشنا ہو جاؤں۔

ہندی

اے بھگوان

اے بھگوان نیا منجھدار میں آن پڑی ہے۔ اب کوئی کھیون ہار نہیں
صرف تو ہے جو اس کو پار لگائے
اے بھگوان ساری دنیا خاموش سو رہی ہے۔ زمین چپ ہے۔ آسمان
چپ ہے۔ صرف تو جاگتا اور میری کشتی کو ہچکولے کھاتے دیکھتا ہے۔

ساحل پر سخت چٹانیں ہیں۔ سمندر پر اندھیرا چھا رہا ہے۔ اب تو ہی میری
کشتی کا رکھوالا ہے۔ اور صرف تو ہے جو اس کو پار لگائے۔ اے بھگوان
رات کا رنگ پھیکا پڑ چکا ہے۔ ستارے زرد ہو گئے۔ پو پھٹنے والی ہے
لیکن منزل ابھی بہت دور ہے تو ہی ہے جو اسے پار لگائے۔

ڈچ

خوابگاہ

جہاں سورج پوری آب و تاب اور درخشانی کے ساتھ چمکتا ہے
شہد کی مکھیاں ہوا میں ہلکا سا ترنم پیدا کر دیتی ہیں۔ زمین کی آغوش میں
خوشبودار پھول کھلتے ہیں۔ جہاں سائے نہایت آہستہ آہستہ بڑھتے
اور پرندے شام کی شفق میں گاتے ہیں۔ وہاں وہ لوگ سو رہے ہیں جن سے

ہمیں محبت تھی۔ ہاں سو رہے ہیں۔ انہیں آرام سے سونے دو۔
ہم انکے نزدیک بیٹھتے ہیں لیکن ہمارے دلمیں کوئی غم نہیں ہم انکے بیدار ہونیکے منتظر ہیں
اس باغ میں جہاں وہ سو رہے ہیں آہ و بکا کا شور نہ ہونا چاہئے۔ کیونکہ
وہ سنہرے دروازوں سے گذر چکے ہیں۔ اور اب صبح صادق کے منتظر ہیں۔

مرہٹی

آخری الفاظ

برہما روح پرماتما کے پاس جاتی ہے۔ میں بزدل نہیں ہوں۔
دنیا کی رنگینیوں کا طوفان میرے دل میں افسوس نہیں پیدا کر سکتا۔
میں ایشور کے جلال کو دیکھتا ہوں۔ میرا دھرم میرے گرد حلقہ کئے ہوئے
ہے۔
اے پرماتما جو میرے سینہ کے اندر ہے! اے قہار! اور ہر وقت
موجود رہنے والے معبود! میری زندگی ختم ہو رہی۔ اور تمام عمر کی تلاش
کے بعد آج میں تجھے دیکھ رہا ہوں۔
دنیا کے ہزاروں عقیدے جن پر لوگ اس قدر جھگڑتے ہیں
بے سود ہیں۔ بالکل بے سود۔ اور حقیقت کے بے پایان سمندر

میں یہ مردہ دھرم صرف ایک خواب ہیں۔
یہ دلوں میں شکوک پیدا کر کے تیرے بھکاری کو تیرے راستے
سے گمراہ کر دیتے ہیں۔ آہ! انسان بے پتوار کی کشتی ہے۔ جو خیالات
کے سمندر میں ہچکولے کھاتی پھرتی ہے۔
لیکن تیری محبت ابدی زندگی دیتی ہے۔
اگر زمین۔ آسمان۔ سورج اور چاند ستارے اور انسان فنا ہو جائیں
تو تیری ہستی پھر بھی موجود رہتی ہے۔ تیرے اکیلے کے دم سے کائنات آباد
رہتی ہے۔ ہر چیز فنا ہو سکتی ہے لیکن تجھے کبھی فنا نہیں۔

شفق شام } شفق پھولی ہے۔ آفتاب نے مغرب کے سمندر میں غوطہ لگایا ہے۔ لڑکے جال لئے دریا کے کنارے کھیل رہے ہیں۔ درختوں پر سبزہ چھایا ہوا ہے۔ سائے دراز ہو رہے ہیں۔ پرندے چہچہا رہے ہیں۔ تازہ گھاس کی خوشبو ہوا میں پھیل رہی ہے اور گھاس کاٹنے والے باتیں کرتے گھر جا رہے ہیں۔ رات کی ہوا جھاڑیوں کو حرکت دے رہی ہے۔ اور مکانوں کی کھڑکیوں میں سے روشنی باہر آ رہی ہے۔ اندھیرا زیادہ ہو رہا ہے۔ وہ چاند نکل آیا۔ شبنم پڑنے لگی۔ میری محبوبہ کیا یہ خوبصورتی ہمارے دلوں کی ہے۔

رجسٹرڈ ایل نمبر ۲۴۸۲

فہرست مضامین

جلد (۱) بابت ماہ ستمبر ۱۹۲۹ء نمبر (۵)

تصاویر:- (۱) ہمجولی۔ سہ رنگی (۲) مونالیزا (۳) مسٹر لطیف الدین احمد اکبرآبادی (۴) نواب مرزا داغ دہلوی (۵) سر والٹر اسکاٹ (۶) مولٰنا رضا وحشت (۷) ڈاکٹر احمد جلال الدین

کہتی ہے ہم کو خلق خدا غائبانہ کیا

ہزایکسیلنسی سر مالکم ہیلی گورنر یوپی

میں دعا کرتا ہوں کہ آپ کا یہ شاندار پرچہ ترقی کرے۔ دوسرے کی مصروفیتیں نہ ہوتیں تو اس کیلئے کوئی آرٹیکل لکھتا۔

جناب ڈاکٹر خلیفہ شجاع الدین صاحب ایم۔ اے ایل ایل ڈی بیرسٹرایٹ لا فیلو پنجاب یونیورسٹی

ادبی دنیا کے تین نمبر میں نے دیکھے اور میں نہایت خوشی سے اس امر کا اظہار کرتا ہوں کہ یہ رسالہ اُردو رسائل میں ایک شاندار اضافہ ہے۔ اردو ادب کا انقلابی پروگرام جو آپ نے پیش نظر رکھا ہے وہ فی الحقیقت قابل قدر ہے آجکل اس امر کی اشد ضرورت ہے کہ تصنیفی اُردو کو عام فہم اور ادب اُردو کو دوسری علمی زبانوں کے خزانوں سے معمور کیا جائے۔ گذشتہ تین نمبر دیکھ کر مسرت حاصل ہوتی ہے کہ جو لائحہ عمل آپ نے اپنے لئے تجویز کیا تھا اس پر آپ کا ادارہ تحریر کاربند بھی ہے۔ یقین واثق ہے کہ بہت تھوڑے عرصہ میں یہ رسالہ دنیائے ادب اُردو میں ایک انقلاب عظیم پیدا کر دیگا

ادبی دنیا کی یہ خصوصیت کہ نہ صرف ہندوستان بلکہ دنیا بھر کی علمی زبانوں کے بلند پایہ مضامین کے اقتباسات وتراجم اس میں شائع کئے جاتے ہیں۔ اس رسالہ کو تمام دوسرے رسائل سے ممتاز کرتی ہے۔

میری دلی دعا ہے کہ اللہ تعالیٰ آپ کو اپنے نیک ارادوں میں کامیاب کرے اور ادب اُردو کی جو خدمت آپ نے اپنے ذمے لی ہے اس کو آپ بوجہ احسن سرانجام دے سکیں۔

جناب سید حسن عسکری صاحب ایم۔ اے پروفیسر پٹنہ کالج

ادبی دنیا کے متعلق صرف مجھے یہی کہنا کافی معلوم ہوتا ہے کہ میری اُمیدوں سے بہت زیادہ مفید ثابت ہوا۔

مسٹر ...الدین احمد اکبرآبادی

...کی رفتار ترقی غیر معمولی ہے۔ یقین ہے کہ کامل ہو جائے گا۔

جناب قاضی نذیر احمد صاحب بی۔ اے (علیگ) ایل ایل۔ بی ایڈوکیٹ راولپنڈی

"ادبی دنیا" تعریف وتوصیف سے بالا وبے نیاز ہے۔ مشرقی رسالوں میں اس کا جواب نہیں۔ اتنے اچھے ارادوں کے ساتھ آپ نے یہ باہمت قدم اُٹھایا ہے کہ اگر آپ پورے نہیں نصف بھی کامیاب ہوگئے تو ہماری مشترکہ زبان کہیں سے کہیں پہنچ جائے گی۔

سید مقبول احمد صاحب الہ آبادی بی۔ اے پی سی ایس ڈپٹی کلکٹر یوپی

"ادبی دنیا" کا رسالہ دیکھنے کے بعد میری سب سے بڑی آرزو یہ ہے کہ خدا کرے یہ اسی آب وتاب کے ساتھ زندہ رہے اور زندہ دلان پنجاب کا بہترین ثبوت ونمونہ پیش کرے۔ دوسری بڑی آرزو یہ ہے کہ وہ جلد تر پندرہ روزہ یا ہفتہ وار ہو جائے تاکہ کم سے کم ہمکو یہ کہتے ہوئے پس وپیش نہ ہو کہ ہم علمی متانت وتہذیب سے بالکل معرا نہیں ہیں اور ہمارے پاس بھی ٹائمس آف انڈیا کا مدمقابل ایک پرچہ موجود ہے۔

مسٹر ریاض قریشی بی۔ اے ایل ایل بی ایم آر اے ایس پی سی ایس سب جج چونیاں

"ادبی دنیا" کے چار نمبر میری نظر سے گذرے۔ بلا شائبۂ تکلف یہ کہنے کی جرأت کرتا ہوں کہ جن ضروریات کو اہل مذاق اُردو کے لئے ضروری سمجھتے تھے وہ اس رسالہ نے پوری کردی ہیں۔ سر عبدالقادر اور علامہ تاجور نے جو لائحہ عمل پیش کیا اُس کے لئے وہ مبارکباد اور شکریہ کے مستحق ہیں۔

ادبی دنیا اپنی قسم کا پہلا رسالہ ہے جو اُردو لٹریچر کو معراج کمال پر پہنچا سکتا ہے۔ واقعی طور پر یہ دونوں حضرات پنجاب میں "بابائے اردو" کہلانے کے مستحق ہیں۔ اس خطے میں جو خدمت علم وادب کی اُنہوں نے کی اور کر رہے ہیں تاریخ علم وادب میں ہمیشہ درخشاں نظر آئے گی۔

منشی مہاراج بہادر برق دہلوی۔ بی۔ اے۔

"ادبی دنیا کا پچھلے سال کی بہ نسبت روز افزوں ترقی کا نشان ہے۔ آپ کے منتخب ہی کا سا

صفحۂ تصاویر

بھولی

بچپن کی بےفکری وہ قدرتی نعمت ہے۔ جس کو انسان مرتے دم تک بڑی حیرت کے ساتھ یاد کرتا ہے۔ اس سہ رنگی تصویر میں اس بے فکری کا عالم بڑے موثر پیرایہ میں دکھایا گیا ہے۔ بلیاں اور کتے بڑی عمر میں بھی انسان کے مصاحب ہوتے ہیں۔ لیکن یہ مصاحبت ایک فریق کی برتری اور دوسرے فریق کی دست نگری پر مبنی اور اس لئے غیر قدرتی ہوتی ہے۔ قدرتی مساوات یا مساواتی مصاحبت جو اس تصویر میں نظر آتی ہے۔ بچپن ہی میں امکان پذیر ہو سکتی ہے۔

مونالیزا

مصروف زندگی کے موجودہ زمانہ میں اگر کوئی شخص اپنا سارا وقت اور اپنی تمام طاقتیں صرف ایک چھوٹا سا کام انجام دینے کے لئے وقف کر دے۔ تو دنیا اس پر ہنسے گی اور اُسے تعجب کی نگاہوں سے دیکھے گی۔ اور اس بات کو تو یقیناً ایک جرم تصور کیا جائے گا۔ کہ ایک شخص ایک چھوٹی سی تصویر تیار کرنے میں چار سال لگا دے اور پھر بھی اُسے نامکمل حالت میں چھوڑ دے۔ لیکن لیونارڈو ڈونسی نے مونالیزا کی تصویر تیار کرنے میں یہی کیا۔ وہ مونالیزا کی تصویر اس حالت میں بنانا چاہتا تھا۔ جب اُس کے چہرے پر مسکراہٹ ہو۔ اِس مقصد کو پیش نظر رکھ کر اس نے کئی سال مونالیزا کی ملازمت میں گذار دئے۔ اُس نے یہ تصویر مونالیزا کے خاوند فرانسسکو ڈیل گیوکانڈو کے لئے تیار کی۔ تصویر تیار ہو چکنے کے تھوڑا عرصہ بعد شاہ فرانسیس اول والئے فرانس نے گراں بہا رقم کے عوض اسے خرید لیا۔ اس طرح سے یہ تصویر پیرس کے مرقع خانہ کی زینت بنگئی۔ وہاں سے ۱۹۱۱ء میں کسی نے اُسے اڑا لیا۔ لیکن کچھ دن بعد یہ پھر مل گئی۔ یہ تصویر اپنی امتیازی خصوصیات کی وجہ سے دنیا کی بہترین تصاویر میں شمار ہوتی ہے اور فن تصویر کشی کے کمال کا نہایت بیش قیمت نمونہ سمجھی جاتی ہے۔

سر والٹر اسکاٹ

انگلستان کے مایۂ ناز شاعر اور ناولسٹ سر والٹر اسکاٹ کی درجنوں تصاویر ناظرین کے دیکھنے میں آئی ہونگی لیکن جو شہرت مسٹر ہنری ریبرن کی تیار کی ہوئی تصویروں کو حاصل ہوئی۔ وہ کسی کے حصے میں نہیں آئی۔ لارنس اور دوسرے باکمال برٹش آرٹسٹوں نے بھی سر والٹر اسکاٹ کی تصاویر بنائیں لیکن سر والٹر نے یہ الفاظ ریبرن ہی سے کہے تھے:۔ "میں چاہتا ہوں کہ آپ کی بنائی ہوئی تصویروں کے سوا میری کوئی تصویر صفحہ ہستی پر موجود نہ رہے"۔ ریبرن نے سر والٹر اسکاٹ کی چھ تصاویر لیں اور جو تصویر اس پرچہ میں دی جا رہی ہے وہ ان تصویروں میں سے آخری ہے۔ ریبرن نے اس کو اپنی زندگی کے آخری سال یعنی ۱۸۲۳ء میں شروع کیا تھا۔ بیرونس برڈٹ کوٹس نے اسکو ریبرن کے وارثوں سے خرید لیا۔ ۱۹۲۲ء میں یہ تصویر لندن میں بذریعہ نیلام عام فروخت کی گئی۔ جہاں نیویارک کی ایک فرم نے اس کو بعوض ۱۰ ہزار پونڈ خرید لیا۔ اس کے بعد یہ نیویارک کے مشہور بینکر مسٹر جے۔ ایچ۔ ہارڈنگ کے قبضہ میں چلی گئی۔ جو سر والٹر اسکاٹ کے بڑے مداح ہیں۔ اور اس فخر روزگار شاعر اور ناولسٹ سے تعلق رکھنے والی اشیاء کو بڑے اشتیاق سے جمع کرتے ہیں۔

داغ

نواب مرزا داغ پر سر عبدالقادر کا ایک سیر حاصل اور بلند پایہ مضمون اس پرچہ کے اوراق کی زینت ہے۔ داغ کا شمار اردو زبان کے ان چند مایۂ ناز شعرا میں ہوتا ہے۔ جو صاحب طرز تسلیم کئے گئے ہیں۔ ان کی غزلیں عام اور خاص پسند ہونے کے باعث اردو شاعری میں بہت ممتاز درجہ رکھتی ہیں وہ اپنے زمانہ کے ایک کامیاب اور خوش قسمت شاعر تھے۔ حضور نظام سے ان کو دو ہزار ماہوار تنخواہ ملتی تھی۔ اتنی تنخواہ بقول سر عبدالقادر ہندوستان کے کسی شاعر کو بحیثیت شاعر آج تک نہیں ملی۔ انکی تصویر یقیناً پرچہ کی دلچسپی میں گرانقدر اضافہ کا موجب ہوگی۔

وحشت

مولینا رضا علی وحشت زمانہ حال کے ایک سحر نگار اردو شاعر ہیں۔ ہندوستان کے تمام بلند پایہ رسائل ان کا کلام بڑے فخر کے ساتھ شائع کرتے ہیں۔

مسٹر ل احمد:۔ اردو زبان کے ایک باکمال ادیب اور بلند رتبہ افسانہ نگار ہیں۔ ان کے مختصر افسانے بڑے دلچسپی کیساتھ پڑھے جاتے ہیں۔

ڈاکٹر ملا احمد جلال الدین:۔ لاہور کے ایک باکمال دندان [illegible] کے عنوان سے ان کا ایک مضمون بھی اس پرچہ میں درج ہے۔ [illegible]

حال وقال

ادبی دُنیا کا یہ پانچواں نمبر شائع ہو رہا ہے - اِس وقت تک خدا کے فضل سے پندرہ سو مستقل خریدار بن چکے ہیں اور ایجنسیوں کے مطالبے تو پہلے ہی پرچے سے اِس قدر بڑھے ہوئے ہیں کہ ہم اُنہیں ابھی تک پورا نہیں کر سکے۔

ادبی دنیا اپنی دوسری خصوصیتوں کے ساتھ یہ عجوبہ شان بھی رکھتا ہے کہ اسکی اشاعتی ترقی اِس کی مالی مشکلات کو کم کرنے سے قطعاً عاجز ہے - اِس کی وجہ یہ ہے - کہ ادبی دنیا کی ہر کاپی پر بارہ آنے لاگت آتی ہے اور اگر دفتری اخراجات بھی لگائے جائیں تو ہر کاپی ایک روپے میں پڑتی ہے - گویا ہر خریدار کے بارہ پرچوں پر بارہ روپے لاگت آتی ہے اور خریدار سے چار روپے بارہ آنے وصول ہوئے تو اِس صورت میں ہر خریدار پر سوا سات روپے نقصان کا اندازہ ہوتا ہے -

اب تک نو ہزار سے اوپر روپیہ صرف ہو چکا ہے جس میں سے پانچ ہزار کی رقم محفوظ فنڈ میں سے لی جا چکی ہے - یہ کمی اشتہارات سے پوری ہو سکتی ہے - مگر اشتہار دینے والوں کی نادھندی اُس جرم کی حد سے بھی بڑھ چکی ہے - جو وہ الفاظ کے جادو سے اپنے خریداروں پر جال ڈالنے میں کرتے ہیں - ہم نے ارادہ کیا ہے کہ آئیندہ ہندوستانی فرموں میں انہیں فرموں کے اشتہارات لئے جائیں - جن پر لین دین کے معاملے میں اعتبار کیا جا سکتا ہے - عام اشتہار دینے والوں کے اشتہارات بہت کم لئے جائیں گے - انگلش فرموں کے اشتہار حاصل کرنے کے لئے ہم نے ایک یورپین کنویسر کو ملازم رکھ لیا ہے -

یہ صورت حال عام ناظرین کو باخبر رکھنے کی خاطر تحریر نہیں کی گئی - بلکہ اُن اہلِ نظر کی درد آشنا نگاہوں کے لئے لکھی گئی ہے جو ہماری ناچیز ادبی خدمات کو قدر کی نظروں سے دیکھتے ہیں اور اپنا رسوخ و اختیار استعمال کر کے ہماری مشکلات کو کم کرنے کی کوشش میں لگے ہوئے ہیں اور اُن کی صرف اُن کی توجہ کے لئے -

"جو حالِ دل لبِ خاموش سے بھی سُنتے ہیں"

[illegible] جو آتا ہے مبارکباد کے انداز میں یہ سناتا ہوا آتا ہے کہ آپ کے [illegible] دنیا نے ادب کو ہلا رکھا ہے - اور ہر ادبی رسالے نے اپنا مرکز ثقل چھوڑ دیا ہے - کچھ رسالے دم توڑ رہے ہیں، کچھ دم توڑ چکے ہیں - کہیں ادبی دُنیا کی وجہ سے سراسیمگی طاری ہے اور کہیں زندگی اور مستقبل سے نا اُمیدی " غرض کہ "ہزار منہ ہیں ہزار باتیں"

اِن افواہوں میں شمہ بھر بھی سچائی ہے تو علم و ادب کے ایک خدمت گذار ہونے کی حیثیت میں سب سے زیادہ رنج ہمیں ہو گا - کیونکہ ہم اپنے لئے اِسے ایک لعنت سمجھتے ہیں - کہ دوسروں کی لاشوں پر اپنی زندگی کے فروغ کی تعمیر کریں - اور دلی خلوص کے ساتھ خدا سے یہ التجا کرتے ہیں کہ وہ ادبی دنیا کو معاصرین کی زندگی اور ترقی کا سبب بنائے نہ کہ اُن کی تباہی اور بربادی کا - اگر مکر کی ملاوٹ کے بغیر ہم اس حقیقت کا اظہار ضروری سمجھتے ہیں کہ اپنے اپنے حدود میں لٹریچر کی ترقی کے لئے ہر ادبی پرچے کی ضرورت ہے - اُسے زندہ رہنا چاہیئے - اور ہر ادب دوست کا فرض ہے کہ اُسے زندہ رکھے - کون سینے پر ہاتھ رکھکر کہہ سکتا ہے کہ "نیرنگ خیال" اردو کے لئے بے ضرورت رسالہ ہے - مخزن کو بند ہو جانا چاہیئے، عالمگیر بے کار ہے، اور ہمایوں زندہ رکھنے کے قابل نہیں - جو ایسا کہتا یا سمجھتا ہے وہ یا تو لٹریچر کی ضرورتوں سے واقف نہیں اور یا پھر اپنے ضمیر کا گنا ہگار ہے - اِن رسالوں نے اپنی اپنی لائن میں اردو ادب کی قابلقدر خدمات انجام دی ہیں - انجام دے رہے ہیں اور خدا نے چاہا تو اِس سے زیادہ انجام دیں گے - ادبی دنیا ان رسالوں کے مقابلے میں کل کا بچہ ہے - اِسے ان معاصرین کی رہنمائی کی اخیر تک ضرورت رہے گی - اور اُنہیں کے، بالکل اُنہیں کے سہارے یہ ترقی کی کٹھن منزلیں طے کرنا چاہتا ہے - ہم اُن تنگ دل اور پست فطرت لوگوں میں شامل ہونے سے خدا کی پناہ چاہتے ہیں جو صرف اُسی کام کو زندگی کا حق دینا چاہتے ہیں جو اُن کے ہاتھوں انجام پا رہا ہو - باقی مخلص سے مخلص کام کرنے والے اور اُن کے مفید سے مفید کام ان کے نزدیک فنا کر دینے کے قابل ہیں -

"توبہ توبہ کہ خطاؤں سے مرکب ہے لبشر"

اس بار عملۂ ادارۃ میں کچھ تبدیلی کرنی پڑی ہے - مولوی صلاح الدین اور حضرت بیدل ادارتی سہ وانیوں سے سبکدوش ہو گئے ہیں - مولوی صاحب کو دفا صاحب کے بدلے روزنامہ ویر بھارت میں بھیج دیا گیا اور حضرت بیدل انتظامی عملے میں آ گئے - یہ دونوں ہمارے عزیز دوست ہیں -

اوران سے ہمیں بڑی مدد ملی ہمان میں ہونہاری کے جوہر دیکھ کر ہم نے انہیں ادبی دنیا کے اسٹاف میں شامل کیا تھا۔ تاکہ یہ ادبی دنیا کے ذریعہ اپنے لئے شہرت اور ترقی کی راہیں پیدا کریں اور اب اسی مقصد کی خاطر ہم انہیں اپنے سے رخصت کر رہے ہیں۔ ہماری رضامندی سے یہ سب کچھ ہوا ہے اور غالباً ہندوستانی کاروباری زندگی کا یہ پہلا واقعہ ہے۔ کہ ہم دوستوں کی حیثیت میں انہیں لائے تھے اور دوستوں کی طرح یہ ہم سے جدا ہو رہے ہیں۔ ادبی دنیا کی جو خدمت جب کبھی ان سے متعلق ہوگی انہیں کے ذریعہ انجام پائے گی۔ مطلب یہ ہے کہ اب دفتری حاضری ان کی ضروری نہیں رہی ہے لیکن دفتر میں اُنکی دلی حضوری ہر وقت لازمی رہے گی۔ اس کے علاوہ ان کے ہمارے تعلقات اُس درجے سے بلند واقع ہوئے ہیں جہاں شکریہ کے رسمی اور بے جان الفاظ کا استعمال ضروری ہوتا ہے۔

خوش قسمتی سے ملک کے مایۂ ناز ادیب پنڈت میلارام وفا نے ادبی دنیا کے ایڈیٹر کی حیثیت سے کام کرنا منظور کر لیا ہے۔ وفا صاحب کے متعلق یہ کہنا کہ یہ ایک بے نظیر اخبار نویس بلند پایہ ادبی نقاد اور غیر معمولی حیثیت کے اردو شاعر ہیں بالکل ایسا ہی ہے کہ کوئی یہ بتانے بیٹھ جائے۔ کہ سورج میں چمک۔ پانی میں روانی، اور آگ میں سوزش ہے۔ اس قسم کی قصیدہ خوانی کی انہیں ضرورت نہیں اور ناظرین اِس کے بغیر بھی وفا صاحب کی ان امتیازی صفات سے واقف ہیں۔

یوپی کے ادیب حضرت عشرت رحمانی اور صوبہ بہار کے فاضل مولینا صدیق بہاری کی خدمات بھی ادبی دنیا کے عملہ ادارۃ کے لئے حاصل کر لی گئی ہیں۔ اب خدا نے چاہا تو ادبی دنیا صحیح معنی میں مشرق و مغرب کی ادبیات جدید و قدیم کا صحیح مرقع بنجائیگا۔ اس نمبر سے اِس کا آغاز ہو چکا ہے۔

اس نمبر کے اکثر مضامین آپکو آسان زبان میں نظر آئیں گے کیونکہ عملہ ادارۃ (ایڈیٹوریل سٹاف) میں سے ایک ادیب کو صرف اِس کام پر مقرر کر دیا گیا ہے کہ وہ مضامین کی زبان درست اور آسان بنا دیا کریں۔ آئندہ سے ہم نے یہ تجویز کیا ہے کہ اُن اہلِ قلم کے مضامین کو بغیر ردوبدل شایع کیا کریں جو شہرت کی بلندیوں کو طے کر چکے ہیں اور اس لئے وہ کسی کو اِس کا مجاز تسلیم نہیں کرتے۔ کہ کوئی کسی مصلحت سے بھی اُن کی عبارتوں میں تبدیلی کر سکے۔ اس درجے کے انشاپردازوں کے مضامیں اسوقت تک بغیر ترمیم شائع کئے جاتے رہیں گے جب تک کہ وقت اور ضرورت خود ہی انہیں اِس یقین تک نہ پہونچا دے کہ اُن کے ملک کو ایک آسان زبان کی ضرورت ہے۔ ہم ایسے مضامین کے لئے رسالے کے صفحات مخصوص کئے دیتے ہیں۔ اس قسم کے مضامین رسالے کی ترتیب کو نظر انداز کر کے ایک ہی جگہ خاص حصے کی سرخی کے ماتحت درج کئے جایا کریں گے۔ اور ان کے لئے فرہنگ کے صفحات ساتھ ہی دیئے جایا کریں گے۔ اِس تجویز سے ہمارا مقصد یہ ہے کہ ادبی دنیا کے ناظرین ادبی طبقوں کے کسی بلند پایہ انشاپرداز کے خیالات سے بھی محروم نہ رہیں۔ اِس کا یہ مطلب ہرگز نہیں ہے کہ آئندہ جو اُٹھے اپنے مضمون کے ساتھ "میرے مضمون میں کسی قسم کی تبدیلی نہ کی جائے" کا فرمان صادر کر دیا کرے۔ نہیں ہرگز نہیں۔ ہم جانتے ہیں کہ کشورِ ادب میں کون سا فرمانروا فرمان صادر کرنے کا مجاز ہے۔

بعض اہلِ نظر ادبی دنیا کے مضامین اور ادارۃ پر ہمدردانہ نکتہ چینی فرما کر ہمیں ہماری بے خبریوں اور لغزشوں سے واقف کرتے رہتے ہیں۔ ہم اُن کی اس قابل قدر رہنمائی کی دل سے قدر کرتے ہیں۔ اِس سے اپنی حیثیت کے مطابق فائدہ اٹھاتے ہیں۔ اور ہمیشہ ایسے مفید مشوروں اور رہنمائیوں کے طلب گار اور منتظر رہتے ہیں۔

مشرق و اہلِ مشرق

آئندہ سے ادبی دنیا میں اس سرخی کے ذیل میں اس قسم کے مخصوص مضامین شائع ہوا کریں گے جن میں مشرقی تاریخ، مشرقی تہذیب و تمدن، مشرقی علوم و فنون، مشرق کے آثار قدیمہ، اور مشرق کے ہر شعبے کے قدیم و جدید اہل کمال اور ان کے کارناموں پر سیر حاصل بحث کی جائیگی۔ اس قسم کے مضامین حتی الامکان باتصویر ہوا کریں گے۔ جو اہل قلم اس سُرخی کو قائم رکھنے میں مدد فرمائیں گے ہم اپنی گنجایش کے مطابق اُن کی خدمت بھی کریں گے۔

خاص نمبر

آئے دن رسالوں کے نئے نئے نمبر دیکھ دیکھ کر ہمارے دوست احباب نے ہمیں بھی اکسانا شروع کر دیا ہے۔ اُن کے خیال میں خاص نمبر نکالنے کے بغیر ادبی دنیا نیم زندہ رسالوں میں شمار رہے گا۔ حالانکہ ہمیں خطرہ ہے کہ خاص نمبر نکال کر کہیں یہ نیم زندگی کی پوزیشن بھی ہاتھ سے نہ کھو بیٹھیں۔ اور ہر عملۂ ادارۃ کی متفقہ رائے ہے کہ خاص نمبر سے ادبی دنیا کا سر افتخار آسمان سے جا ٹکرائے گا۔ وہ یہ نہیں سوچتے کہ آسمان سے سر ٹکرانے کے ساتھ ہی یہ اندیشہ بھی ہے کہ مبادا آسمان کے [illegible] پار ہو کر مریخ والوں کی نظر چڑھ جائے۔ اور پھر حضرت مسیح سے پہلے زمین پر اترنا نصیب نہ ہو۔

ادبی دنیا کی خطرناک اسکیم پنڈت میلارام وفا کے دماغ سے نکلی تھی اور ہماری ناتجربہ کاری سے فائدہ اٹھاتے ہوئے اُنہوں نے اِس جال میں پھنسا کر اب خود تماشائیوں میں کھڑے مسکرانے نظر آتے ہیں۔ خاص نمبر کا سبز باغ بھی اِنہیں کی جولانی خیال کا نتیجہ ہے۔ ہم اپنی دیوانگی کی تکمیل کی خاطر اِس باغ کی بھی سیر کرنے پر آمادہ ہو گئے ہیں۔ یعنی اب خاص نمبر کی تجویز بھی عملی صورت اختیار کر رہی ہے۔ عملہ ادارہ میں مولینا صدیق بہائی مولینا حامد الانصاری اور مولینا غلام ربانی تودھی کو خاص نمبر کی تیاری پر لگا دیا ہے۔ حضرت عشرت رامپوری اہل قسم سے خط و کتابت۔ تصاویر۔ بلاکس وغیرہ کی فراہمی کا کام کریں گے۔ پنڈت میلارام وفا دفتر میں چیف ایڈیٹر کی قائم مقامی کریں گے۔ اور چیف ایڈیٹر مختلف زبانوں کے اہل قلم سے ملاقات اور علمی آداروں کی سیر کے لئے ۲۵ ر اگست سے ملک کا دورہ شروع کردیگا۔

خاص نمبر کے متعلق کوئی ایسا وعدہ نہیں کیا جاسکتا جس کے حدود اربعہ کی تفصیل ہمیں ذمہ داریوں کے ہجوم میں گُم کر دے۔ البتہ صرف اسقدر کہہ سکتے ہیں کہ ہماری خواہش اور ارادہ یہ ہے کہ ادبی دنیا کا خاص نمبر ادبی دنیا کے عام نمبروں کا خاص نمبر ہو۔ اِس نمبر پر وفا صاحب کے حساب سے دس ہزار روپیہ لاگت آئےگی۔ اور کم و بیش ایک سیر اس کا وزن ہوگا۔ اور غالباً چار آنے محصول ڈاک لگیگا۔

ادبی دنیا کے خریداروں کو اگر وہ طلب کریں گے صرف ایک روپیہ میں دیا جائیگا۔ اُس کی عام قیمت کیا ہوگی؟ یہ ابھی ہم نہیں بتا سکتے۔ ادبی دنیا کے جو خریدار خاص نمبر نہیں منگائیں گے اُنہیں اُس ماہ کا عام نمبر بدستور بھیجا جائیگا۔ ایجنٹوں اور خریداروں کی جسقدر فرمائشیں ستمبر کے ختم تک پہونچ جائینگی اُسی قدر پرچہ چھاپا جائیگا۔ اس کے بعد کوئی فرمائش منظور نہیں کی جائیگی۔ جو وقت پر فرمائش بھیجدیں گے پرچہ صرف اُنہیں کو ملیگا اُن کے سوا کسی کو کسی قیمت پر بھی ہم پہونچانے سے عاجز ہونگے۔ جو ایجنٹ اپنی فرمائش کے ساتھ مطلوبہ پرچوں کی تعداد کے ساتھ علی الحساب ایک روپیہ فی پرچے کے حساب سے رقم پیشگی بھیجدیں گے اُنہیں کی درخواست منظور کی جائے گی دوسروں کی بنیں باقی قیمت کا وی پی کیا جائیگا۔

ادبی دنیا کے مئی اور جون کے نمبر بالکل ختم ہو چکے ہیں صرف فائل کی کاپیاں باقی رہ گئی ہیں۔ اس لئے ہم مئی اور جون کے پرچے بھیجنے سے قطعاً عاجز ہیں۔ جو صاحب اپنی خریداری کے ساتھ مئی اور جون کے پرچوں کی شرط لگا دیتے ہیں ہمیں افسوس ہے کہ ہم اُن کی فرمائش کی تعمیل نہیں کر سکتے۔ یہ کیسے ہو سکتا ہے۔ کہ ہم ہزار ہزار کاپیاں اس امید پر چھاپ کر دفتر میں انبار لگا دیں کہ ممکن ہے کوئی خریدار انہیں طلب کر لے جبکہ ایک کاپی پر ایک روپیہ ہماری لاگت آجاتی ہے۔ اسی کے ساتھ اُن ناظرین کی خدمت میں التماس ہے جو ادبی دنیا کے فائل نہیں رکھ رہے ہیں کہ مئی اور جون کے پرچے ہمیں قیمتاً عنایت کر دیں تاکہ ہم اُن خریداروں کو جو ادبی دنیا کا فائل رکھنا چاہتے ہیں بہم پہونچا سکیں۔ مئی اور جون کے جسقدر پرچے ناظرین ہمیں عنایت فرمائیں گے ہم ان پرچوں کے طلب کرنے والوں سے قیمتیں وصول کرکے انہیں بھیجدیں گے۔

چونکہ ادبی دنیا کے اسٹاف میں اچھے انشا پردازوں کا معقول اضافہ ہو چکا ہے۔ اِس لئے اسٹاف کے تیار کئے ہوئے بلند درجے کے مضامین ہر ماہ اتنی تعداد میں تیار ہو جاتے ہیں کہ ہمیں معاوضے والے مضامین لینے کی بہت کم ضرورت پڑتی ہے۔ بنا بریں آئندہ ہم معاوضے کے کسی مضمون کی ضرورت اور گنجایش دیکھیں تو درج کرسکیں گے ورنہ نہیں۔ دوسرے لفظوں میں یہ سمجھ لیجئے کہ آئندہ کسی شائع شدہ مضمون پر ہم معاوضے کی گنجائش پائیں گے تو معاوضہ دیں گے ورنہ نہیں۔ لہذا جو انشا پرداز معاوضے کے بغیر مضمون دینا پسند نہیں کرتے اُنہیں مضمون کے ساتھ اسکی وضاحت کر دینی چاہئے۔ ہمارے پاس اسٹاف کے تیار کردہ نہایت بلند مضامین ذخیرہ کی صورت میں جمع ہو چکے ہیں۔ جو مضامین ہمارے معیار پر پورے اتریں اور اُن کے معاوضے کی شرط نہو اُنہیں ہم ضرور شایع کرتے رہیں گے۔ مطلب یہ ہے کہ اچھا اسٹاف رکھ کر ہم گویا معقول معاوضے پر اپنی پسند اور رسالے کے معیار کے مطابق مضامین حاصل کرنے کا انتظام کر چکے ہیں۔

ڈاکخانے والوں کو ادبی دنیا اسقدر پسند آگیا ہے کہ وہ پرچہ دیکھ کر بیخودی میں قانون کو بھول جاتے ہیں۔ قصبات اور دیہات کے سب پوسٹماسٹر اور عام شہروں کے چٹھی رساں ادبی دنیا پر پہلا حق اپنا سمجھتے ہیں۔ بے تکلف ریپر میں سے نکالا اور اپنی اپنی استعداد کے مطابق پڑھنا شروع کر دیا پھر اگر اُس میں کوئی مضمون دل کو بھایا یا کوئی تصویر زیادہ پسند آگئی تو آخری حق بھی اپنا ہی جما کر اُسے غائب کر دیا۔ اور اگر پڑھ لینے کے بعد خریدار کی خوش قسمتی سے دیا جی کا ہیضہ ہونے لگا تو غریب مکتوب الیہ تک پہونچا دیا۔

لاہور سے پرچہ صحیح وسالم روانہ ہو جاتا ہے مگر اپنی اپنی منزلوں پر پہونچنے سے پہلے مقامی ڈاکخانوں میں لُٹنا شروع ہو جاتا ہے۔ حقیقتِ حال سے بیخبر ناظرین کو جب وقت پر رسالہ نہیں پہونچتا۔ تو ہر نئے سے نیا طعنہ، بد انتظامی اور کبھی کبھی بے ایمانی کی تہمتیں جتنی طبیعت ان کی مدد کرتی ہے تراش کے ہمارے پاس بھیجدیتے ہیں اور ہم بقول حالی "مانی پڑتی ہیں ناکردہ خطائیں اکثر" م

م اُن تہمتوں کو سنتے ہیں اور دوبارہ پرچہ بھیجکر بد انتظامی کے الزام کو اپنے لئے یقینی بنا لیتے ہیں۔ تاجور

آئینۂ عالم

فرانس کالج میں پروفیسری کی شرط

فرانس کے "فرانس ڈو کالج" میں پروفیسر بننے کے لئے یونیورسٹی کی لمبی چوڑی ڈگریوں کی قطعاً ضرورت نہیں ہے۔ وہاں پروفیسر صرف وہی شخص بنایا جاتا ہے جو اپنی علمی تحقیق و تلاش سے کوئی نئی ایجاد کرنے میں کامیاب ہُوا ہو، یا اُس نے کسی نئی بات کا پتہ لگایا ہو۔ پروفیسر کے لئے کالج کی حاضری ضروری نہیں ہے۔ وہ اپنے طور پر کسی لیبوریٹری (معمل) میں تجربات میں مشغول یا کسی لائبریری (کتبخانے) میں مطالعے میں مصروف رہتا ہے جب کسی تجربے یا کسی تحقیقات یا کسی ایجاد میں کامیاب ہوجاتا ہے تو کالج میں آکر اُس تجربے یا اُس تحقیق' ایجاد کے متعلق طلبہ کو لیکچر دے دیتا ہے۔ اور پھر کالج سے رخصت ہوجاتا ہے

ہمارے ہندوستان میں پروفیسر بننے کے لئے عام طور پر ڈگریوں کی ضرورت ہے۔ دماغ کی ضرورت نہیں۔ کوئی اچھے سے اچھا غیر معمولی قابلیت کا ہندوستانی جو بدقسمتی سے یونیورسٹی کی ڈگری حاصل نہ کرسکا ہو۔ خواہ اپنے مضمون میں کتنا ہی قابل اور بےنظیر ہو۔ اُسے کالج اور یونیورسٹی کے حدود میں قدم رکھنے کی اجازت نہ دی جائے گی۔ دوسرے مضامین کو چھوڑ دیجئے ہندوستان میں ایسے لوگوں کی کمی نہیں جو عربی، فارسی سنسکرت وغیرہ میں نہایت اعلیٰ قابلیت کے مالک ہیں۔ اتنی انگریزی بھی جانتے ہیں کہ اُس کے ذریعہ یورپ کے اورینٹلسٹوں (مستشرقین) کی علمی تحقیقات سے پوری واقفیت حاصل کئے ہوئے ہیں، اپنے مضمون پر محققانہ تصانیف بھی کرچکے ہیں لیکن چونکہ یونیورسٹی کی ڈگری سے محروم ہیں۔ اِس لئے یونیورسٹی کی طرف سے وہ رکھشا کھینچیں یا تانگہ جوتیں۔ یونیورسٹی کی بلا سے۔ یونیورسٹی انہیں پناہ دینے کے لئے تیار نہ ہوگی۔

یہ ہے غلامانہ ذہنیت ہمارے غلام ملک کی۔ اور یہ ہے وہ یونیورسٹی کی تعلیم جس کے متعلق سرسید کا قول ہے کہ "یونیورسٹی کی تعلیم خچر تیار کرتی ہے"

شہری اور دیہاتی بچوں کی تندرستی

کلارک یونیورسٹی کے پروفیسر مسٹر برنام فرماتے ہیں کہ دیہاتی باشندوں کی اولاد صاف ہوا اور کھُلی دھوپ میں رہ کر فطرت کی گود میں پرورش پانے کے باوجود تندرستی میں شہریوں کی اولاد سے بہت پیچھے ہے۔

یہ ایک ایسی بات ہے جسے ماننے کے لئے ہر شخص تیار نہیں ہوگا۔ لیکن پروفیسر برنام اُن اعداد و شمار کی بنا پر اِس نتیجے پر پہونچے ہیں۔ جو دیہاتی اور شہری اسکولوں کے طلبہ کی تندرستی کے باقاعدہ امتحان کے بعد حاصل ہوئے ہیں۔ پروفیسر موصوف اس کی وجہ یہ بتاتے ہیں کہ دیہاتی بچے ایسی ورزشوں کی مشق نہیں کرتے جن سے اُن کا قد سیدھا، رگ پٹھے گٹھیلے۔ بدن چھریرا اور لچکدار ہو جیسا کہ شہری بچوں میں عام طور پر پایا جاتا ہے۔ اور دیہاتی لڑکے اِس قسم کی ورزشیں اس لئے نہیں کرتے کہ اُن کے ماں باپ کھیتی باڑی کے کاموں ہی کو خاص قسم کی ورزش کے بدلے کافی سمجھتے ہیں۔ لیکن واقعہ یہ ہے کہ دیہاتی کام ورزش کے قائم مقام نہیں بن سکتے۔ یہی وجہ ہے کہ شہری لڑکوں کے مقابلے میں دیہاتی لڑکے بھدّے بھونڈے اور سُست نظر آتے ہیں۔ باقاعدہ ورزش نہ کرنے کی وجہ سے دیہاتیوں کی تندرستی شہریوں کے مقابلے میں خراب ہے۔

اپنی اصلیت اپنے خوابوں سے معلوم کیجئے!

نفسیات (علم نفس) کے علماء کی باتیں اگر سچ مان لیجائیں تو ہم میں سے ہر شخص کو قدرت نے جتنی چیزیں عطا کی ہیں اُن میں ہمارا نفس سب سے زیادہ عجیب و غریب ہے۔ کیونکہ اس میں ہمارے باپ دادا اور ہمارے اگلے بزرگوں کے تمام تجربے اور تمام واقعات ہُوبہو محفوظ ہیں۔ اور ہر شخص اپنے خوابوں کے ذریعے سے اِس مدفون خزانے کا پتہ پاسکتا ہے۔ اگرچہ یہ کام ہر شخص کے لئے آسان نہیں ہے۔ کیونکہ خواب ہر شخص دیکھتا ہے مگر بھول جاتا ہے لیکن یاد رکھنے کی عادت ڈالی جائے تو بہت کچھ معلوم کیا جاسکتا ہے۔ نفسیات کا سب سے بڑا ماہر انگریز پروفیسر میکڈونل جو آجکل امریکہ کی یونیورسٹیوں میں تعلیم دیتا ہے۔ کہتا ہے کہ بہتیرے لوگوں

نے اپنے خوابوں سے اپنی اصل نسل اور اپنے حسب و نسب کا پتہ چلا لیا ہے کیونکہ اُن کو نیند میں ایسے واقعات نظر آتے ہیں جنہیں اپنی ساری زندگی میں انہوں نے کبھی نہیں دیکھا تھا۔ بلکہ وہ کئی پشت پہلے اُن کے دادا، پردادا کے وقت کے واقعات تھے۔ یورپ کے بہت سے عیسائیوں کو اپنے خواب ہی سے معلوم ہو گیا ہے کہ وہ کسی زمانے میں یہودی تھے۔ اسی طرح چند لوگوں کو خواب میں اپنے سامنے برف سے ڈھکے ہوئے بڑے بڑے پہاڑ نظر آیا کرتے تھے۔ اُن کی نسل کی چھان بین سے ظاہر ہوا ہے کہ اُنکے اگلے بزرگ برف سے ڈھکے ہوئے شمالی ملکوں کے رہنے والے تھے۔
اگر یہ صحیح ہے تو عنقریب ہمارے خواب ہی ہماری سب سے بڑی دلچسپی کا ذریعہ بننے والے ہیں۔

بچوں کی علمی پرورش کا نیا سامان

انگلینڈ کے بعض اخباروں میں ایک اشتہار شائع ہوا ہے جس کو پڑھ کر اس امر کا اندازہ ہو سکتا ہے کہ آجکل یورپ کی ہر چیز میں علمی روح کس قدر سرایت کر گئی ہے۔ یہ اشتہار بعض پرچوں کے چار صفحوں میں آیا ہے اس کا خلاصہ یہ ہے کہ ایک انگریزی یونیورسٹی کو ایک ایسے معلم کی ضرورت ہے جو علمی تحقیق کے اصول سے باخبر اور اُن کو جاری کرانے کے طریقوں سے ماہر ہو۔ چار چار سال کی عمر کے چند بچے سپرد کئے جائیں گے اور وہ اُس وقت تک اُس کے سپرد رہیں گے جب تک کہ بڑے ہو جائیں۔ اتنی چھوٹی عمر سے اُنہیں علمی تحقیق کے ایسے طریقے پر پرورش کرنا ہوگا کہ بڑے ہو کر اُنہیں دوسروں کے خیالات کی پیروی کا ذرا بھی اثر نہ ہو۔ یہ ایک نیا کام ہے اور کسی اہل علم نے اسکو قبول کرنے کی ابھی تک ہمت نہیں کی۔ یونیورسٹی ایسے شخص کو منہ مانگی تنخواہ دینے کو تیار ہے۔

موت کی آواز

آہستہ یا بلند جو بھی آواز ہم سنتے ہیں وہ درحقیقت ہوا کی موج اور جنبش ہے جو کانوں کے پردے تک پہونچتی ہے اور اس کے اثر کو پردے دماغ تک پہونچا دیتے ہیں اور اسطرح ہم کسی آواز کو محسوس کرتے یا سنتے ہیں لیکن جب آواز بہت زیادہ بلند یا بہت پست ہو تو کچھ بھی سنائی نہیں دیتا۔
پروفیسر وڈ نے تحقیق کے بعد اعلان کیا ہے کہ جب کوئی آواز اتنی بلند ہو جس کی وجہ سے ہوا میں موج اور لرزش حد سے زیادہ ہو جائے تو اگرچہ ہم اُسے محسوس نہیں کرتے مگر وہ چھوٹے چھوٹے جانوروں کو مار ڈالتی ہے اور اسی وجہ سے پروفیسر نے اس درجے کی آواز کو "موت کی آواز" کہا ہے۔
آئندہ اس آواز سے صنعت و حرفت کو خاص فائدہ پہونچنے کی امید کیجاتی ہے۔ ابتدائی تجربہ یہ ہے کہ اگر ہم تیل کو پانی میں ملائیں تو ہرگز نہیں ملتا مگر پروفیسر دونوں چیزوں پر موت کی آواز کو مسلط کر دیا ہے۔ تو تیل پانی ملکر دودھ کی طرح بنجاتا ہے۔ اسی طرح پارہ پانی میں نہیں ملا کرتا۔ مگر پروفیسر نے تھوڑا سا پارہ پانی کی بوتل میں ڈالکر اسمیں موت کی آواز کی رو چھوڑی۔ تو پارہ اور پانی سیاہ روشنائی کی طرح بنگیا۔ خیال کیا جاتا ہے کہ "موت کی آواز" کے جدید تجربوں سے دنیا کی صنعت و حرفت میں ایک انقلاب آجائیگا۔

یورپ میں شادی بیاہ کی سرد بازاری

یورپ کے ہر حصے میں روز بروز شادی کا بازار سرد پڑتا جا رہا ہے۔ اور اس صورت حال نے وہاں کے بہی خواہوں کو تشویش میں ڈال دیا ہے۔ اٹلی کے ایک اخبار نے اس اہم مسئلے کے بارے میں اپنے ناظرین کی رائے دریافت کی تھی۔ اُس کے پاس بہت سے جوابات آئے۔ جن میں سے مثال کے طور پر ہم چند جوابات درج کرتے ہیں:۔
ایک نوجوان لکھتا ہے کہ ریشمی جرابوں، نئے نئے فیشن کی ٹوپیوں اور رنگ برنگ کے کپڑوں کی گرانی کی وجہ سے شادی کرنے کی ہمت نہیں پڑتی۔
دوسرا لکھتا ہے۔ کہ مجھ میں اتنی جرأت نہیں ہے کہ شادی کرنے کے بعد اپنی بیوی کو گھٹنے سے اُونچی فراک پہننے اور سینہ، شانے اور بازوؤں کو ننگا رکھنے سے روک سکوں۔
ایک اور نے اپنی شادی نہ کرنے کے بہت سے اسباب لکھے ہیں جن میں سے یہ بھی ہے کہ "والدین زندگی بھر سارے خاندان کی پرورش کرنے کے باوجود اپنی عمر کے آخری دنوں میں عام طور پر اپنے آپ کو تنہا اور تنگ حالی میں پاتے ہیں۔
ایک عورت نے لکھا ہے کہ اس نے رقص گاہوں اور تفریح گاہوں میں نوجوانوں کی جو لغو افعال دیکھے ہیں اور جو مہمل باتیں سُنی ہیں اُنہوں نے اس کے دل میں ان کی طرف سے نفرت پیدا کر دی ہے۔ ایک دوسری لڑکی لکھتی ہے کہ شادی سے لڑکیاں اس لئے نفرت کرنے لگی ہیں کہ وہ جس کارخانے میں کام کرتی ہیں وہاں کے اہلکار مرد یا تو بدخلق اور سخت ہوتے ہیں جو ان سے اچھا برتاؤ نہیں کرتے یا نرم دل اور بدکار ہوتے ہیں۔ جو ہمیشہ ان کو جھانسے دینے کی فکر میں لگے رہتے ہیں۔ اسلئے ان لڑکیوں کو مردوں ہی سے نفرت ہو جاتی ہے۔

تاجور

مطالعہ

(کیا پڑھنا چاہئے اور کیسے پڑھنا چاہئے)

دُنیا میں چاروں طرف کتابوں کی بھرمار ہے لیکن ان میں سے زیادہ تر اس قسم کی ہیں کہ ان کا پڑھنا نہ پڑھنا برابر ہے۔ ہزاروں کتابیں اس قسم کی بھی ہیں جو کسی خاص سبب سے مطالعہ کے قابل مانی جاسکتی ہیں۔ مگر زمانہ کی ضرورتوں کو دیکھتے ہوئے وہ بالکل بیکار معلوم ہوتی ہیں اور ان کے پڑھنے والے لکیر کے فقیر کہلائے جاتے ہیں۔ یہ کتابیں جس زمانہ میں بھی تصنیف ہوئیں مفید تھیں لیکن آج ان سے دنیا کو کوئی نفع نہیں پہونچ سکتا۔ اس میں شک نہیں کہ بعض کتابیں کسی خاص مقصد یا کسی خاص علم وفن کے لحاظ سے ضرور قابل قدر ہوتی ہیں مگر افسوس کہ وہ صرف اُنہیں حضرات کے مطالعہ کے قابل ہوسکتی ہیں جو ان علوم سے دلچسپی رکھتے ہیں یا اُن کی زندگی کا خاص شغل اس کے سوا اور کچھ نہیں۔ غرض دنیا میں اس قسم کی اعلیٰ کتابیں بہت کم ہیں جن میں ہر شخص کی دلچسپی کا سامان موجود ہو۔ اس لئے علمی میدان میں ترقی کے لئے یا اپنے عزیز وقت کو صحیح طور پر صرف کرنے کے لئے اسبات کی سخت ضرورت ہے کہ انسان کا مشیر کوئی ایسا عقلمند دوست ہو جو اس کے ساتھ ساتھ رہے۔ اور مناسب و مفید کتابیں اُس کے مطالعہ کے لئے تجویز کرتا رہے۔ کالج یا اسکول کے کتب خانوں میں کتابیں تجویز کرنے کے لئے ایسے فاضل اور واقفکار پروفیسر کی ضرورت ہے جو الماریوں کو ایسی دلچسپ اور کارآمد کتابوں سے بھر دے جس سے شائقین علوم کے دماغ جگمگا اُٹھیں۔ عام طور پر کتبخانوں میں کتابوں کے ڈھیر نظر آتے ہیں۔ لیکن وہ بالکل اُس گچ اور مسالے کی طرح ہیں جو دیواروں سے گر کر خراب حالت میں پڑا ہو۔ گو اس سے ایک عالیشان محل تیار ہوسکتا ہے۔ لیکن کارآمد ہرگز نہ ہوگا۔

دنیا کی مشہور و معروف کتابوں کے متعلق تنقید کا یہ موقع نہیں ہاں یہ ضرور کہا جاسکتا ہے کہ ان سب کا پڑھنا فائدہ مند ہے لیکن ان کتابوں کی تعداد زیادہ نہیں۔

امرسن۔ امریکہ کا فاضل انشاپرداز کتبخانہ میں مطالعہ کیلئے بہت کم جایا کرتا تھا وہ اس کا سبب یہ بیان کرتا تھا کہ میں جب کبھی کتبخانہ میں داخل ہوتا ہوں تو ہمیشہ یہ خیال میرے ذہن میں پیدا ہوجاتا ہے کہ مناسب کتابوں سے زیادہ بہتر اور مفید علوم کا خزانہ میرے گھر کی چار دیواری یا میرے خاص مطالعہ کے کمرے میں موجود ہے۔" یعنی کتبخانہ میں جانے کا مدعا حاصل نہیں ہوسکتا۔ کیونکہ کتابوں کے انتخاب کرنیوالے ایسے قابل نہیں ہوتے کہ بہترین اور کارآمد تصانیف تجویز کریں جس سے انسانی دماغ روشن ہوں اور لطف حاصل کریں۔ اُس کا مقولہ ہے کہ "بڑی بڑی فہرستوں اور تذکروں کا مطالعہ صرف چند انشاپردازوں کی یاد کو تازہ کرتا ہے۔ اور بس۔ اُن کی زندہ رفیقین اُن کی تصانیف کی صورت میں ہر علم دوست انسان کے ذاتی کتبخانہ میں ہمیشہ جلوہ افروز رہتی ہیں۔ یہ کتابیں حقیقت میں صدیوں کی جمع کی ہوئی دولت ہوتی ہیں۔ اور دماغوں کے لئے ایک خاص قوت اور دلچسپی کا سامان"۔

اس مصنف نے اپنے ایک مضمون انگریزی ادب پر تبصرہ کیا ہے اور مشہور مصنفوں کا حوالہ دینے کے بعد ہر علمدوست کے لئے ایک شاہراہ بتائی ہے۔ اصولی حیثیت سے وہ جس نتیجہ پر پہنچا ہے۔ یہ ہے کہ جن کتابوں کے بہترین خیالات اور صحیح واقعات پائے جاتے ہیں وہی مطالعہ کے قابل ہیں۔ ادب قدیم میں ہومر۔ ہروڈوٹس۔ ایس چیلس۔ افلاطون اور پلوٹارک کی کتابوں کا مطالعہ مفید پاتا ہے۔ اس نے تاریخ۔ سوانح اور شاعری کو جس میں فسانہ۔ ڈرامہ۔ علم العقائد ناول اور علم مجلسی وغیرہ بھی شامل ہیں۔ علیحدہ علیحدہ قابل مطالعہ خیال کیا ہے اور اس کا قول ہے۔ کہ "قوت متخیلہ کی بلند پروازی موجودہ زمانہ میں تعلیم کے لئے نہایت ضروری ہے۔ اگلے زمانہ میں اس مذاق کی کمی کے سبب خشک مزاجی زیادہ پیدا ہو جایا کرتی تھی اس زمانہ میں روح کو انہیں کتابوں سے تازگی حاصل کرنا چاہئے جن میں گہرے خیالات ہوں اور علمی و ادبی خوبیوں کے ساتھ ساتھ رنگینی بھی پائی جائے"۔ ہر عمدہ افسانہ یا کسی قسم کے عقاید کے بیان کی کتاب۔ کوئی سوانحعمری جس کا آغاز مذہبیت کے زمانہ سے ہو یا حسن و محبت کا کوئی باب یا سائنس و فلسفہ خیالی قوتوں کو آراستہ کرتے ہیں۔ مگر شرط یہی ہے کہ ان کتابوں کی کوئی نقصان یا کمی نہ رہے۔ ہر حیثیت سے مکمل ہوں۔

قریب قریب ہر زمانہ کے مشہور مصنفوں نے بھی اپنی تصانیف میں

انہیں باتوں کا لحاظ لکھا ہے۔ فردوسی کا شاہنامہ اور عمر خیام کی رباعیاں آجتک پرستش کے قابل سمجھی جاتی ہیں۔ ڈینٹے کی نظمیں شیکسپیر کے ڈرامے۔ بیکن اور ملٹن کی نثر۔ تلسی داس اور کبیر کے دوہے وغیرہ صحیح اصول پر کامل ہونے کے سبب سے آجتک بیشمار انسانوں کو ترقی کا سبق سکھاتے رہے ہیں اور آئندہ سکھائیں گے۔ اس زمانہ میں افسانہ، ڈرامہ اور ناول وغیرہ کو خاص مقبولیت حاصل ہے۔ مگر ہندوستان میں ان کی کثرت نے ایشیائی دماغ کو زیادہ نقصان پہنچایا ہے۔ اور ان کے صحیح اصول کو نہ سمجھنے کے سبب فائدہ بہت کم۔

اس جگہ اس مسئلہ پر اختلاف آراء کا بیان بھی شاید کارآمد ثابت ہوگا۔ ایک نفسیات کا ماہر اپنی رائے ان الفاظ میں ظاہر کرتا ہے کہ "افسانہ وغیرہ کے زیادہ پڑھنے سے دو خرابیاں ہوتی ہیں —— پہلی یہ کہ انسان کی طبیعت خیالات کی بے تکی آزادی سے فطرتاً مانوس ہوجاتی ہے۔ اور اس سبب سے مطالعہ کرنیوالے کے خیالات اور اخلاق کو سخت نقصان پہنچتا ہے۔ دوسری خرابی یہ ہوتی ہے کہ انسان بے ڈھنگے پن کو پسند کرکے تہذیب وشائستگی کی کوئی قدر نہیں کرتا۔"

اگر افسانے ایسے مناظر کو پیش کریں جن میں اخلاقی۔ علمی۔ تمدنی یا سیاسی عیوب موجود ہوں۔ تو یہ مرض پیدا ہوجاتا ہے کہ اچھائی اور برائی میں امتیاز نہیں رہتا۔ ان افسانوں کے انجام کا اثر زیادہ ہوتا ہے اگر کسی شخص کی سیرت ابتدا و وسط میں اچھی دکھائی گئی ہو لیکن آخر میں کچھ اس قسم کے حالات ظاہر ہوجاتے ہیں۔ کہ انجام دماغوں کو برائی کیطرف مائل کر دیتا ہے۔ یہ صورت نوجوانوں کے لئے سخت مضر ہوتی ہے۔ اور اس نقصان کی تلافی اخلاقی تعلیم سے بہت کم ہوا کرتی ہے۔ مطالعہ کے لئے کتابوں کا انتخاب کرتے وقت ہمیں الہامی کتابوں پر بھی ایک نظر ضرور ڈالنا چاہئے۔ عبرانی۔ اور یونانی زبان میں عیسائی مذہب کی کتابیں پائی جاتی ہیں۔ عربی زبان میں قرآن مجید کا اعلیٰ مرتبہ ہے۔ فارسی میں ژند و پاژند اوستا اور دساتیر اسی نظر سے دیکھنے کے قابل ہیں۔ وید۔ اپنشد منوسمرتی اور بھگوت گیتا وغیرہ سنسکرت میں ہندوؤں کی الہامی کتابیں مانی جاتی ہیں۔ چینیوں کے قدیم علم ادب میں بدھ مذہب کی کتابیں قابل دید ہیں۔ واقعہ یہ ہے کہ یہ سب کتابیں مطالعہ کے لئے مفید ہیں۔ اور ان کتابوں میں اصولی حیثیت سے ہر طبقہ اور ہر مذہب کے آدمی کو نصیحت کے قیمتی نگینے ملتے ہیں۔ یہی باعث ہے کہ دنیا کی اکثر فاضل ہستیوں نے صرف اس خیال سے نہیں کہ یہ خدائی کلام ہے بلکہ عام طور پر ان کے متعلق یہی رائے قائم کی کہ ان کتابوں میں۔ عجز و انکسار۔ تہذیب و اخلاق۔ تاریخی نکتے۔ شعر وسخن۔ فصاحت وبلاغت۔ اور حسن بیان یہ سب خوبیاں پائی جاتی ہیں اور اس قسم کی مکمل کتابیں آجتک زمانہ نے بہت کم پیدا کی ہیں۔

مطالعہ کی حیثیت سے ترجموں کو ایک خاص مرتبہ حاصل ہے۔ اور مختلف زبانوں کا علمی سرمایہ اس ذریعہ انسانی دماغوں میں محفوظ ہوتا ہے۔ عام طور پر ترجمہ کے قابل وہی باتیں سمجھی جاتی ہیں۔ جو حقیقت میں قدر کے لائق ہوں اور انسان کی معلومات میں مفید اضافہ کرسکیں۔

ترجموں کے مطالعہ سے تحقیق کا مادہ روز بروز ترقی کرتا ہے۔ میرا خیال ہے کہ مذہب اور اخلاق کی اعلیٰ کتابیں ترجمہ کے بعد بھی اپنی ذاتی خصوصیات اور معنوی خوبیوں سے لبریز رہتی ہیں۔ امرسن کا قول ہے کہ۔

"اطالیہ والے ترجموں سے خاص رغبت رکھتے ہیں میں بھی لاطینی یونانی۔ جرمن۔ اطالوی اور فرانسیسی زبان کی کتابوں کو ترجموں پر ترجیح نہیں دیتا۔ بلکہ ان سب کو اپنی مادری زبان میں پڑھنا پسند کرتا ہوں"۔

اس مقولے کو پڑھنے کے بعد ہندوستان کی تعلیمی حالت پر اور زیادہ افسوس ہوتا ہے۔ کہ یہاں کے مطالعہ کرنے والوں کو ترجمے بھی اپنی مادری زبان میں دیکھنے کا موقعہ نہیں ملتا۔ اور نہ اس قسم کا سرمایہ ان کے دماغ کے لئے مفید ہوسکتا ہے۔ سرسری معلومات کی کتابوں سے بچنے کی سخت ضرورت ہے۔ اور ایسی باتوں کا مطالعہ ہی بیکار ہے جو معمولی طور پر بیان کیگئی ہوں۔ مشہور انگریزی ادیب ڈاکٹر جانسن بڑی بڑی شاندار دکانوں اور ہوٹلوں میں روزانہ جایا کرتا تھا۔ اور وہاں روشن خیال طبقہ سے ملنے کا موقعہ پاکے مفید معلومات کے سرمایہ سے اپنے دماغ کو روشن کیا کرتا۔

مشہور ومعروف اور کارآمد کتابیں پڑھنے کے دو فائدے ہیں اول تو وقت ضائع نہیں ہوتا۔ دوسرے خرچ کم ہوتا ہے۔ اس زمانہ میں حصول علم کا یہ طریقہ دلچسپ ہونیکے علاوہ بیحد مفید ہے۔ واقعہ یہ ہے کہ بعض موقعوں پر جو باتیں سینکڑوں کتابوں کے مطالعہ سے حاصل نہیں ہوسکتی۔ موجودہ زمانہ کے قہوہ خانوں میں آسانی سے معلوم ہوسکتی ہے۔ مطالعہ کتب کا عجیب و غریب طریقہ ایک اور بھی ہے جس سے ہندوستان کے لوگ عام طور پر واقف نہیں۔ اس طریقہ کا تعلق زیادہ تر علمی مجلسیں بہت کم ہیں۔ مطالعہ کے اس نئے اصول پر امرسن اس طرح تبصرہ کرتا ہے۔

"مفید کتابوں کی تعداد بیشمار ہے۔ ان سب کا پڑھنا اور ان سے صحیح طور پر فائدہ اٹھانا انسان کی مختصر زندگی کو دیکھتے ہوئے بہت دشوار ہے اگر ہمارے علم دوست حضرات "امداد باہمی" کے اصول کو مد نظر رکھتے ہوئے ہمارے لئے علم کے کسی خاص حصہ کا مطالعہ کریں۔ اور پھر اس کی معلومات کا خلاصہ کرکے ہمارے ذہن نشین کردیں تو علم وادب کی اشاعت بہت

آسان ہوجائیگی۔ فرض کیجئے کہ چند علم دوست نوجوان اس بات پر متحد ہیں کہ کوئی شخص فرانس کی ادبی خصوصیات حاصل کرکے اپنے دوستوں کے سامنے پیش کرے۔ اور اس کے دوسرے ساتھی برطانیہ اور دوسرے ممالک کے علمی خزانوں سے اپنی سوسائٹی کو مالا مال کرنے پر کمر باندھ لیں۔ اور ہر شخص اپنے فرائض ایمانداری کے ساتھ ادا کرتا رہے تو ظاہر ہے کہ اس تجویز کا انجام کسقدر مفید ہوگا۔ یہ ترکیب قابل عمل ہو یا نہو ہمارے لئے تبصرہ کرنے والے نے ایک شاہراہ ضرور بنائی ہے اور ہر طالب علم کا فرض ہے کہ وہ اس پر غور کرکے کم از کم اپنی ہم نشینی کے لئے ایسے ہی ماہر علم وفن کا انتخاب کرے۔ جو اپنے علمی ذوق کے لحاظ سے فضیلت رکھتا ہو اور دنیائے ادب میں ممتاز ہو۔ یا یوں سمجھئے کہ منطق وفلسفہ کی بیشمار کتابیں بہت کچھ فائدہ مند ہیں۔ لیکن ہر شخص کے پاس اتنا وقت کہاں کہ وہ اُن کے ساتھ سر مارے۔ اور پھر زبردست منطقی ہونے کی سند حاصل کرے۔ اس تضیع اوقات سے بچنے کیلئے یہی طریقہ بہتر ہے کہ ہمارے علمی مجلسوں کا ایک ممبر منطقی مسئلوں کی حقیقت بیان کرنے کے لئے تیار ہوجائے۔ اور منطق وفلسفہ کا مطالعہ شروع کر دے۔ اس میدان کا زبردست شہسوار بنے۔ پھر جو کچھ حقیقت حال ہو اس کو اپنے تجربات کی صورت میں ہمارے سامنے پیش کرے۔ اور ہم کو اس کے حالات سے اسیطرح آگاہ کردے جسطرح کہ خود اُس کا دماغ اس کی پستی وبلندی سے واقف ہے۔ اسی درمیان میں ہم میں کا دوسرا فرد کسی طبقہ کے علم عقائد کا ایمانداری سے مطالعہ کرکے وہ باتیں بتلائے جو مذہبیات کا بہترین ماہر بتا سکتا ہے۔ غرض یہ کہ اس طریقہ سے ایک ہی وقت میں مختلف علوم وفنون کے زبردست ماہر پیدا ہوسکتے ہیں۔ اور ان کے وسیع معلومات سے فائدہ اٹھانیکا موقع مل سکتا ہے۔ اس تجویز میں جو بات سب سے زیادہ اہم ہے۔ وہ اپنے مذاق کے مطابق کتابوں کا انتخاب کرنا ہے۔ اور اس کا صحیح فیصلہ وہی شخص کرسکتا ہے۔ جو اپنے ذوق کا صحیح اندازہ کرنے کی کوشش کرے۔

مطالعہ کا بہترین طریقہ یہی ہے۔ کہ کتابوں کا انتخاب اپنے ذوق اور طبیعت کے میلان کے مطابق کیا جائے۔ وقت مقرر کرکے صفحوں کی مقررہ تعداد کا مطالعہ بھی بیکار سی بات ہے۔ یہ قواعد تمام بناوٹی اور فضول ہیں۔ اس قسم کی آزادی سے ہر علم دوست کو دلچسپی پیدا ہوتی ہے۔ اور وہ صرف انہیں امور کو ضروری خیال کرتا ہے جو اُس کے ملکی مقاصد اور ذاتی ضرورتوں کے لحاظ سے مفید اور کارآمد ہوں۔ اور .... اِدھر اُدھر کی بیکار پابندیاں اُس کے دماغ کو پریشان نہیں کیا کرتیں۔ ہر شخص کو وہی کتاب پڑھنا چاہئے جو اُس کے لئے خاص طور پر موزوں ہو۔ اور اپنی ذہنی قوت کو بیشمار اور فضول باتوں کے یاد رکھنے میں ضایع نہ کرنا چاہئے۔

یورپ میں صرف انجیل مقدس ہی ایک کتاب ہے جو ادبی اور مذہبی ہر حیثیت سے عام مذاق کی اصلاح کر رہی ہے۔ اسطرح حافظ یا مولینا روم کی تصانیف نے خاص مرتبہ حاصل کیا ہے۔ کنفوشس نے چینیوں کے خیالات میں بلندی پیدا کی۔ اور اسپین میں سروینٹس نے سب کچھ کر دکھایا۔ خاص طور پر عرب بلکہ کل اسلامی دنیا کو قرآن کریم نے عزت وعروج کے مرتبے بخشے۔ اسی طرح ہندوستان میں بھگوت گیتا نے ہندوستانی دماغوں کی روحانیت کی اعلیٰ تعلیم دی ہے۔ غرض انسان کے خیالات ایک ہی کتاب سے بہت کچھ روشن ہوسکتے ہیں۔ اور اسی لحاظ سے یہ کہنا بیجا نہ ہوگا۔ کہ اگر معمولی اور ادنیٰ درجہ کے انشا پرداز دنیا سے مٹ جائیں تو ہم لوگوں کو غیر معمولی فائدے حاصل ہوں۔ بقول آمرسن "اسی یورپ میں شکسپیئر ملٹن یا بیکن میں سے ایک ہی مصنف کی تصانیف کا مطالعہ ہمارے دماغ کو معلومات کا خزانہ بنا سکتا ہے"۔ بہرحال طالب علم کو اپنے مذاق کی درستی کے لئے اوپر بیان کئے ہوئے اصولوں کے اعتبار سے ایک یا بہت سی کتابیں ضرور پڑھنا چاہئے۔ اور یقیناً یہ طریقہ ضرور مفید ثابت ہوگا۔

ڈاکٹر جانسن کہا کرتا تھا "تم اسی سوچ بچار میں رہ جاؤگے کہ تمہارا لڑکا کونسی کتاب پہلے شروع کرے اور دوسرا لڑکا اسی درمیان میں پہلی اور دوسری دونوں کتابیں ختم کرلیگا۔ پانچ گھنٹے روزانہ کچھ پڑھ لیا کرو۔ تمہارا عالم بن جانا یقینی ہے"۔

ایک زبردست ماہر علم ایک کتاب کے دیباچے میں لکھتا ہے۔ "مطالعہ دماغ کے لئے روحانی غذا ہے۔ جس سے عقل کو بڑی قوت پہنچتی ہے۔ اسی مطالعہ کی مدد سے ہم خدا کو پہچانتے ہیں۔ الہامی کتابوں سے سبق لیتے ہیں۔ خود اپنی حقیقت سے واقف ہوتے ہیں اور جانتے ہیں کہ انسان کی اصلیت کیا ہے۔ اسی سے تمام دنیا کی خبریں ہمکو پہنچتی ہیں۔ اور ہمیں تمام حالات وواقعات معلوم ہوجاتے ہیں۔ اس میں شک نہیں کہ وہ لوگ نہایت بدنصیب ہیں جو پڑھ نہیں سکتے۔ اور علم کی نعمت سے محروم ہیں۔

ایسا بھی ہوتا ہے کہ جو شخص اس روحانی غذا کو غلط طریقے پر استعمال کرتا ہے۔ تو یہی زہر بن جاتی ہے۔ یعنی ایک ہی کتاب کا

مطالعہ ایک شخص کو روشن خیال فلسفی بنا دیتا ہے۔ اور اُسی کتاب کے مطالعہ سے دوسرا شخص جاہل بنا رہتا ہے۔ اس کا سبب صرف یہ ہے کہ پہلا شخص صحیح اصول سے مطالعہ کرتا ہے اور دوسرا ایک بیکار کام سمجھ کر کتاب پڑھتا ہے۔ اس لئے اُس کو کوئی فائدہ نہیں پہونچتا۔ مگر یہ شخص اپنی قابلیت کے متعلق اس غلط خیال میں مبتلا ہو جاتا ہے کہ اُس سے زیادہ قابل کوئی نہیں۔ پھر بھی ضروری ہے کہ ہم اپنے مطالعہ کا ایک خاص مقصد مقرر کرلیں اور ایک خاص اصول کو سامنے رکھ کر کتابیں پڑھیں۔ جو لوگ ایسا نہیں کرتے ان سے اکثر ایسی غلطیاں ہوتی ہیں جو ان کی ذلت کا باعث ہوتی ہیں۔ چونکہ ایسے لوگوں کو معلومات حاصل نہیں ہوتیں۔ وہ اپنے خیالات صحیح طور پر ظاہر نہیں کر سکتے۔ اس طرح انسان کے دماغ کو بھی کافی نقصان پہونچتا ہے۔ غرض یہ ہے کہ صحیح طور پر مطالعہ کی کوشش کرنی چاہئیں۔ محض قواعد کی پابندی بھی زیادہ کارآمد نہیں کیونکہ طبیعتیں ان کی غلام بن کر رہ جاتی ہیں اور آزادی سے کوئی کام نہیں کیا جا سکتا۔ مطالعہ کے وقت جو مقصد ہم نے اپنے سامنے رکھا ہو وہ ہمارے خیال کے مطابق ہونا چاہئے جب یہ مقصد پورا ہو جائے تو پھر ہم دوسری باتوں کی طرف توجہ دے سکتے ہیں۔ دماغ میں مختلف خیال پیدا ہونے سے بھی عقل کمزور ہوتی ہے۔ اور کوئی صحیح رائے قائم نہیں ہو سکتی۔ طبیعت میں جس قسم کی کتابوں کے مطالعہ کی رغبت پیدا ہوتی وہی دلچسپی سے پڑھی جا سکتی ہیں۔ ان تمام باتوں کے علاوہ اسباب کی خاص طور پر احتیاط رکھنا چاہئے۔ کہ مطالعہ کا مُدعا صرف یہی ہے کہ خیالات کو کچھ نہ کچھ مدد پہونچتی رہے۔

ہم جب کسی تصنیف کو پڑھتے ہیں تو اس کے مطالعہ سے ذہن میں کچھ خیالات اس قسم کے بھی پیدا ہو جاتے ہیں کہ جن کا اصل مطلب سے کوئی تعلق نہیں ہوتا ہم ان بیکار خیالات کی بھی پیروی کرتے ہیں۔ اور مطالعہ کے اصل مقصد سے ہٹ کر ایک نئے راستے پر پڑتے ہیں اور پھر رفتہ رفتہ مختلف راہیں کھلتی چلی جاتی ہیں حتیٰ کہ ہمیں خود یہ بات معلوم ہوتی ہے کہ ہماری تحقیقات کہاں سے کہاں پہونچ گئیں۔ برخلاف اسکے اگر ہم مطالعہ ان تمام اصولوں سے ہٹ کر ابتدا ہی سے کسی بڑی کتابوں کو پڑھنا شروع کردیں تو یقیناً ہمیں کامیابی نہیں ہو سکتی بلکہ مشکلات کا سامنا کرنا پڑیگا۔ اور ہم کوئی ترقی نہیں کر سکیں گے۔ اس لئے ابتدا سے ہمیں چاہئے کہ ابتدائی علوم کا مطالعہ کریں اور رفتہ رفتہ ترقی کرتے جائیں تاکہ صحیح طور پر معلومات حاصل ہو سکیں۔ اور آسانی پیدا ہوتی چلی جائے۔ انشاپردازوں اور مضمون نگاروں کو بھی اپنے مطالعہ میں اس امر کا لحاظ رکھنا چاہئے کہ اُن کیلئے بھی یہ طریقہ مناسب اور کارآمد نہیں ہو سکتا کہ ابتدائی اور درمیانی سیڑھیاں چھوڑ کر آخری درجہ پر پہونچنے کی کوشش کریں۔ اُنہیں اپنے ذوق کی رفتار سے ابتدائی درجے پہلے طے کرنا چاہئے۔ اور آہستہ آہستہ اسی طرح ترقی کرتے رہیں۔ تاکہ ہر پستی اور بلندی سے کافی طور پر واقف ہو جائیں بہرحال یہ خیالات خاص ہر شخص کے لئے یکساں مفید نہیں۔ ہاں جس کو ان کی صحت کا یقین ہو اُس کے لئے ان سے فائدہ اٹھانا ممکن ہے۔

اس بات کا لحاظ بھی ضروری ہے کہ انسان کے دماغ کی بناوٹ میں بھی ایسا ہی فرق ہوتا ہے۔ جس طرح جسموں کی بناوٹ میں ہر شخص کا مذاق ایک دوسرے سے مختلف ہوتا ہے۔ اس لئے کوئی خاص تجویز جس کا مقصد مطالعہ ہو دنیا بھر کے لئے قابل عمل نہیں ہو سکتی۔ مطالعہ کرنے والے کو پہلے اپنی طبیعت کا مطالعہ کرکے اپنے لئے خود ایک شاہراہ بنانا چاہئے۔

بہرحال یہ ظاہر باتیں بھی نظر انداز کرنے کے قابل نہیں ہیں جو کچھ مطالعہ کیا جائے اس کے اندر اتنی توجہ ضرور کیجائے کہ مصنف کی خاص خاص اصطلاحات کو دوسروں کے سامنے ٹھیک ٹھیک پیش کیا جا سکے۔ جب تک دلائل اچھی طرح نہ سمجھ لی جائیں کسی نتیجہ کو تسلیم نہ کیا جائے بلکہ اس پر برابر غور کیا جائے اور مختلف سوالات کی بھرمار مختلف پہلوؤں سے کی جائے تاکہ نتیجہ کے صحیح ہونے کا اندازہ اچھے طور پر ہو جائے۔ یہ چند نصیحتیں جو بظاہر بہت آسان معلوم ہوتی ہیں مگر حقیقتاً ان پر عمل کرنا بہت دشوار ہے یہی حال اور چند اصولوں کا ہے جو ظاہر میں بہت آسان ہیں اور حقیقت میں بہت دشوار سچے دوستوں کی قراموشی۔ ملک کی محبت مذہب کی عقیدت جوہر شناسی اور بھائی لفظی حیثیت سے بہت آسان ہیں مگر ان پر عمل بیحد دشوار ہوتا ہے۔ اب سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ پڑھنا کیا چاہئے۔ ہر شخص کی طبیعت اس سوال کے جواب میں آخری فیصلہ دے سکتی ہے۔ صرف اس بات کی ضرورت ہے کہ اپنے مذاق مطالعہ کے مطابق کتابوں کا انتخاب کیا جائے مسٹر پلینی نے ایک علم اصول اچھا بیان کیا ہے۔ بہت زیادہ پڑھنا بے شمار مضامین کے پڑھنے سے مفید ہے یا یوں سمجھو کہ بہترین منتخب تصانیف انتہائی غور کے ساتھ اسقدر پڑھنا چاہئے کہ ان کی معنویت سے دماغ روشن ہو جائے انہیں کی آواز بار بار دماغ میں گونجنے لگے۔ اصول پر مزید تبصرہ کی ضرورت نہیں معلوم ہوتی ہاں یہ ضرور عرض کرونگا کہ میری رائے میں عقلی امور میں وہی لوگ ہوشمند کہے جا سکتے ہیں جو مفید باتوں کو تعداد و شمار کے لحاظ سے حل کرتے رہتے ہیں۔ رہے وہ لوگ جو دائرہ عقل کے اندر بھی اپنے خیال کے گھوڑے کو ہر جگہ مہمیز دیتے ہیں ان کی غلطیاں بھی جو لگاتار ہوتی ہیں بے حد مفید ثابت ہوتی ہیں۔ ان کے اثرات مٹ جانے پر بھی نشان ہدایت کی طرح

سبب سے راستے کی طرف رہنمائی کرتے ہیں پروفیسر لاک کا مقولہ ہے کہ ۔ "میری رائے میں وہ ارباب علم بھی خاص عزت کے مستحق ہیں جو غلطیوں کے مٹانے کی سعی کرتے ہیں اور ان کے بجائے کوئی صحیح خیال نہ قائم کرتے ہیں اور نہ اس کی ضرورت سمجھتے ہیں۔"

انٹلیکچویل لائف (روحانی زندگی) کا مصنف اسی زیر تجویز مسئلہ پر اک نیا خیال ظاہر کرتا ہے اس کے قول کے مطابق پڑھنے کا فن لطیف صرف اسی پر منحصر ہے کہ مطالعہ جستہ جستہ کیا جائے اس کی رائے ہے کہ تمام لائبریریوں کا بہت آسانی کے ساتھ مطالعہ کیا جاسکتا ہے اور ہم کو ان خاص مقامات پر پہونچنے کی ضرورت نہیں ہے جو کتابی معلومات کا سرچشمہ ہیں یعنی مطالعہ کا صحیح اور جدید طریقہ یہی ہے کہ غیر متعلق امور کو قطعاً نظر انداز کر دیا جائے اور جن باتوں کی واقعی ہم کو ضرورت ہو ان کو جستہ جستہ انتخاب کر لیا جائے ۔ گو یہ طریقہ کار خارجی اسباب پر منحصر نہیں ہے اور نہ خارجی اسباب کی رہنمائی سے آسکتا ہے لیکن یہ تو ظاہر ہے کہ اپنی ذہنی ضروریات کو جسقدر ہم خود اچھا سمجھ سکتے ہیں کوئی دوسرا شخص کبھی نہیں سمجھ سکتا ۔ ہر اخبار میں جو ہمارے ہاتھ میں آتا ہے پڑھنے کے قابل دو ہی چار باتیں ہوتی ہیں اب یہ کام فن مطالعہ جاننے والا کا ہے کہ وہ ان دو چار باتوں کو ڈھونڈ کر پڑھ لے اور دوسری باتوں میں اپنا کار آمد وقت نہ ضائع کرے ۔

لارڈ بیکن نے بھی مطالعہ کے متعلق بڑا مفید مشورہ دیا ہے اس کا قول ہے کہ "بعض کتابیں صرف چاشنی کے طور پر ذائقہ کیلئے ہیں بعض بالکل نگل جانے کے قابل ہیں اور بعض اس لائق ہیں کہ پہلے ان کی جگالی کی جائے اور پھر ان کو ہضم کیا جائے" اس کی تشریح یوں سمجھنا چاہیئے ۔ کہ بہت سی کتابوں کو تھوڑا تھوڑا کہیں کہیں سے پڑھنا چاہیئے ۔ بہت سی کتابوں پر یونہیں سرسری نگاہ ڈالنا چاہیئے ۔ اور چند کو نہایت غور و توجہ کے ساتھ مطالعہ کرنا چاہیئے ۔

بعض کتابیں ایسی بھی ہیں جو کسی دوسرے کی زبانی سنی جاسکتی ہیں ان کے انتخابات ہم کو غیر معمولی فائدہ پہنچا سکتے ہیں لیکن یہ صورت جب ہی مناسب ہے کہ کتابیں نیچے درجہ کی ہوں اور دلیلیں کچھ زیادہ اہم نہوں یہی انتخاب مضامین کا مجموعہ روشن آئینہ کی طرح ہوتا ہے جس کی علمی شعاعیں دل و دماغ کو چمکا دیتی ہیں ۔ انسانی مطالعہ کی تکمیل کرتا ہے ۔ تربیت و مشورہ ضروریات زندگی کے لئے انسان کو چست بناتا ہے ۔ لکھنا ۔ انسان کو ٹھیک ٹھیک آدمیت کے دائرہ میں رکھتا ہے اس لئے اگر کوئی شخص کم لکھے تو اس کو زبردست حافظہ کی ضرورت ہوتی ہے ۔ تربیت و مشورہ سے محروم ہو تو دماغ کسی کام کا نہیں رہتا وغیرہ وغیرہ ۔ علم تاریخ انسان کو دانشمند بناتا ہے ۔ شعر و شاعری خوش مذاقی پیدا کرتی ہے ۔ ریاضی سوچ بچار کا مادہ پیدا کرتی ہے فلسفہ اور طبعیات خیالات کو گہرا بناتے ہیں علم اخلاق سنجیدگی پیدا کرتا ہے منطق اور علم الکلام بحث و مباحثہ کی قابلیت میں اضافہ کرتے ہیں حقیقت یہ ہے کہ انسانی مذاق کے اندر کوئی رکاوٹ اور جماؤ نہیں ہے اور اگر ہو تو صحیح مطالعہ کی مدد سے بہت جلد دور کیا جاسکتا ہے ۔

ایک اور ماہر تعلیم کی رائے ہے کہ دنیا میں کوئی کتاب شروع سے آخر تک بدترین نہیں ہے ۔ اسمیں کچھ نہ کچھ مفید باتیں ضرور ہوتی ہیں ۔ ڈاکٹر واٹس نے اسی مطالعہ کے مسئلہ پر یہ مشورہ دیا ہے کہ "دیباچہ اور فہرست کتاب کا مطالعہ ضرور کرنا چاہیئے ۔ یہ دونوں چیزیں اصل کتاب کے حاصل پر بہت کچھ روشنی ڈالتی ہیں" یہی ڈاکٹر ایک اور جگہ لکھتا ہے کہ "مطالعہ کتب سے ہماری معلومات اور واقفیت میں بڑی وسعت ہو جاتی ہے ۔ ماضی و حال کے معاملات و خیالات اور زندہ و مردہ لوگوں کے اعمال اور عادات اسی مطالعہ کتب کی روشنی میں ہم تک پہونچتے ہیں ۔ کتابوں ہی کے مطالعہ سے ہم کو تمام انسانوں کے حالات دریافت ہوتے ہیں ۔ مشاہدہ ہمکو صرف وہ باتیں بتاتا ہے جو ہم خود اپنی تحقیق سے معلوم کرتے ہیں اور اکثر اس کا دائرہ اسقدر محدود ہوتا ہے کہ جن اشیاء کو ہم صحیح طور پر نہ جانتے ہوں وہ دیکھنے میں نہیں آتیں ہمیں مطالعہ سے نہ صرف مختلف اقوام اور مختلف زمانوں کے کارناموں اور جذبات کا علم ہوتا ہے بلکہ سب سے زیادہ دانشمند بنی نوع انسان کی ممتاز جماعت یعنی علماء و حکماء کی خصوصیات اور تجربات ہماری طبیعت کے اندر منتقل ہوتے ہیں پھر لطف یہ ہوتا ہے کہ ان لوگوں کے وطن اور مسکن سے ہم کو کوئی واسطہ نہیں ہوتا ۔ یوں تو بے شمار کتابیں ناقابل اور غیر منصف مزاج لوگوں نے بھی تصنیف کی ہیں لیکن اسقدر یقینی ہے کہ جو کتابیں دنیا میں زبردست شہرت حاصل کر چکیں ہیں وہ مختلف زمانوں اور مختلف اقوام کے بہترین اور برتر دانشمندوں کے دل و دماغ کا نتیجہ ہیں ۔

جب ہم بہترین تصنیفات کا مطالعہ کرتے ہیں تو ہمارے جذبات اور خیالات بھی صرف اس وجہ سے روشن اور اعلیٰ ہو جاتے ہیں کہ علمائے فن اُن میں اپنی بہترین معلومات جمع کرتے ہیں ۔ یہ لوگ اوّل تو مطالعہ ہی نہایت محنت سے کرتے ہیں اور پھر نہایت کوشش سے اپنے خیالات لکھتے ہیں ۔ ایسے سرمائے بالعموم نہایت وسیع مطالعہ اور کافی تجربہ کا نتیجہ ہوتے ہیں اور یہ خصوصیات گفتگو یا کسی کے تقریر سے نصیب نہیں ہو سکتیں تقریر اور گفتگو سے ہم اپنے دوستوں یا تالیفوں کے خیالات کا اندازہ لگا لیتے ہیں اور مانا کہ یہ طریقہ عمل مفید ہی کیوں نہ ہو مگر ناگہانی خیالات جو اچھی طرح پختہ نہیں ہوتے ہمارے لئے یقینی طور پر فائدہ مند نہیں ہو سکتے ۔

مطالعہ کا دوسرا فائدہ یہ ہے کہ ہم اپنے پڑھے ہوئے کو بار بار دہرا سکتے ہیں۔ کتاب سے مشورہ ہر وقت ممکن ہوتا ہے اور اطمینان وسکون کے وقت غور و فکر کا موقع ملتا ہے۔ اس کے خلاف تقریر یا گفتگو اکثر ذہن میں قائم نہیں رہتی اور یہ تو اکثر ہوتا ہے کہ جہاں مجلس اُٹھی یا دو ایک دن گذر گئے تو یہ سُنے ہوئے خیالات بھی منتشر ہو جاتے ہیں۔ ان سے فائدہ اٹھانے کے لئے یا تو زبردست حافظہ ہونا چاہئے یا سُنی سنائی باتوں کو جو یاد رکھنے کے قابل ہوں نوٹ کر لینا چاہئے۔ انہیں طویل وجوہ کی بنا پر یا یُوں سمجھو کہ وقت کی کمی اور معلومات کو نوٹ نہ کرنے کے باعث بہت سے تعلیم یافتہ مفید باتوں کو حل کرنے سے مجبور رہتے ہیں اور پھر ان باتوں کو یاد کر کے دوسروں کو فیض پہونچانے کے بھی قابل نہیں رہتے ہیں۔

خاص کتابیں خواہ وہ کسی قسم کی ہوں بالخصوص کسی مستقل مضمون پہ کوئی مکمل رسالہ پہلے پہلے سرسری اور معمولی طور پر پڑھنا چاہئے۔ اس مطالعہ کا مقصد خاص صرف یہی ہوگا کہ ہم کو انشا پرداز کی ذہانت اور طرز ادا کا کچھ نہ کچھ پتہ چل جائے۔ اور ساتھ ہی ساتھ یہ بھی یقین ہو جائے کہ اس سے ہم کس حد تک فائدہ حاصل کر سکیں گے۔ میری رائے میں اس قسم کی معلومات حاصل کرنے کا بہترین طریقہ یہ ہے کہ دیباچہ پڑھا جائے پھر فہرست مضامین پر ایک نظر ڈالی جائے اور کتاب کے مطالعہ سے پہلے مضامین کتاب کو اوپر بیان کئے ہوئے طریقہ کے مطابق جانچ لیا جائے۔ اس طرح نہ صرف کتاب کے مطالعہ کرنے میں مدد ملیگی بلکہ دوسری بار اس اصول پر عمل کرنے سے مضامین کے یاد رکھنے میں بے حد مدد پہونچے گی اور مصنف کا مقصد آسانی سے سمجھ میں آجائیگا اور فضول محنت سے نجات مل جائے گی۔ مطالعہ کے وقت جو باتیں نئی ہوں اور پہلے سے معلوم نہوں اُن پر نشان لگانا چاہئے اور پھر کتاب کے بابوں اور فصلوں کو دُہرانا چاہئے جس وقت تک کوئی مطالعہ کرنے والا غیر معمولی حافظہ کا انسان نہ ہو میں اس قسم کے مطالعہ کا مشورہ دُوں گا۔ اس کی دلیل صرف یہی ہے کہ کوئی کتاب یا کوئی باب جو ایک بار مطالعہ کے قابل خیال کیا جائے گا اس کے متعلق یہ نہیں کہا جا سکتا کہ اس کا دوبارہ مطالعہ غیر ضروری ہے۔ بہر صورت نشان کی ہوئی سطروں یا ٹکڑوں کو دوبارہ ضرور دیکھنا چاہئے اور ان نشانات کے اندر جو چیزیں حقیقتاً قابل قدر ہوں ان کو ضرور یاد رکھنا چاہئے۔

میری رائے میں کسی کتاب کو بغور پڑھنے سے پہلے اس کو سرسری طور پر دیکھنا اس لئے بھی ضروری ہے کہ بہت سی دشواریاں جو پہلی بار مطالعہ کرنے میں بآسانی سمجھ میں نہیں آتیں دوسری بار مطالعہ کرتے وقت خود بخود حل ہو جاتی ہیں۔ اس کمزوری کا سبب خاص یہی ہوتا ہے کہ مصنف کی پوری تجویز سمجھ میں نہیں آتی۔

غرضیکہ رسائل اور کتب کا مطالعہ اسی اصول پر کرنا چاہئے اور معمولی دشواری کو بلا پس و پیش پہلے ہی مطالعہ میں حل کر لینا چاہئے۔ جب ہم کتاب پر دوبارہ نگاہ دوڑائیں گے تو یقینی ہے کہ پچھلی حل کی ہوئی دشواریاں یا تو آنے والی دقتوں کو بالکل غائب کر دیں گی یا کم از کم دوسرے مطالعہ میں کافی سہولت بہم پہنچائیں گی۔ مطالعہ میں پہلی بار جو باتیں دماغ میں نہ آسکیں یا نہ سمجھی جا سکیں۔ ان پر مزید تحقیقات اور تلاش کے لئے نشان کر کے چھوڑ دینا چاہئے۔ اور اُن کے بعد جو صفحے سامنے ہوں اُن پر پُورا غور کر کے یہ معلوم کر لینا چاہئے کہ پچھلے صفحات پر ان کے مضامین سے کافی روشنی پڑ سکتی ہے یا نہیں۔

بہت سے لوگ اس قسم کے بھی ہیں جو بڑی محنت اور مسلسل مطالعہ کو اپنی زندگی کا اصول خاص بنا لیتے ہیں مگر علم حقیقی کے راستے میں ایک قدم بھی ترقی نہیں کرتے۔ ایسے لوگ جی ہی جی میں اُن خیالات سے مسرت حاصل کرتے ہیں جو اُن کی نگاہوں کے سامنے سے گزرتے رہیں یا جنہیں وہ اپنے کانوں سے سنتے رہیں گویا کہ اُن کا پڑھنا یا سُننا ایک قسم کی دلچسپ کہانیاں ہوتی ہیں جو اُن کے دماغوں میں محض دلچسپی کی خاطر سما سکتی ہیں۔ یہ لوگ نہ تو ان کو خاص طور پر پڑھتے ہیں اور نہ اُن سے مفید نتیجے نکالتے ہیں۔ ایسے لوگوں کی نگاہیں صفحوں کو چرتی رہتی ہیں یا یُوں کہنا چاہئے کہ الفاظ ان کے کانوں پر جو چکنے گھڑے کی حیثیت رکھتے ہیں پھسلتے رہتے ہیں۔ ایسے خیالات جو اس قسم کے بیکار مطالعہ کے ذریعہ سے پیدا ہوتے ہیں۔ رات کی کہانیوں کی طرح یا کسی سبزہ زار پر بادل کے ٹکڑے کی مانند آکر آناً فاناً میں رفو چکر ہو جاتے ہیں۔

سید یعقوب حسن شاہجہانپوری

لبوں پہ بچپن کی کیا نہ آئے گی اب وہ معصوم مُسکراہٹ — ادھورے الفاظ اے جوانی! وہ کیا نہ نکلیں گے اب زباں سے
نہ تھی گرانباری مشاغل ۔ نہ تھی یہ پابندی علائق — اسیر زنجیر غم نہ تھا میں، نجات تھی شورش جہاں سے
مرا ہنڈولا تھا عرش اعظم ۔ مرے کھلونے تھے چاند سورج — اتار لاتا تھا جا کے تارے زمیں پہ راتوں کو آسماں سے
مرا گھروندا تھا گھر کا آنگن ۔ اسی میں جہاں تھا میرا بچپن — تجھے بلایا تھا کس نے ظالم؟ شباب! تو آگیا کہاں سے

ڈبلیوٹی ہنلے

ڈبلیوٹی ہنلے ۱۸۱۴ء میں قصبہ مڈہرسٹ علاقہ سسکس انگلستان میں پیدا ہوا تھا۔ اس کا باپ ہرن کی کھال کی برجس بناتا تھا۔ ہنلے کی عمر صرف چھ سال کی تھی۔ کہ باپ کا سایہ سر سے اُٹھ گیا۔ دادا نے پرورش کا بار لیا۔ لیکن وہ بھی زندہ نہ رہا۔ اور دادا کی وفات کے بعد اُس کے چچا نے اپنی نگرانی میں لیا۔ ہنلے گیارہ سال کی عمر میں سکول چھوڑ کر اپنے چچا کے کام میں مدد دینے لگا۔ لیکن اُسے چمڑے اور دستانے بنانے کے کام میں کچھ زیادہ دلچسپی نہ تھی۔ چنانچہ سولہ سال کی عمر میں اپنے خاندانی پیشہ کو چھوڑ کر قسمت آزمانے کے لئے لندن میں آیا۔ کچھ عرصہ تک تو وہ قلیوں کا کام کرتا رہا۔ اور قریباً سات برس تک سینٹ کیتھرائن میں مزدوری کی۔ یہاں اس کی آمدنی ۲ شلنگ روزانہ تھی۔ اس رقم میں سے وہ ڈیڑھ شلنگ کرایہ، کھانا اور کپڑوں پر صرف کرتا۔ باقی کے چھ پنس بچا کرتا ہیں۔ اوزار اور تجربہ کیلئے سامان خریدا کرتا۔ تین سال کے عرصہ میں بجلی۔ مقناطیس۔ روشنی۔ علم کیمیا۔ علم حرفت اور قوانین حرکات میں کافی مہارت پیدا کر لی۔ اپنے ہاتھ سے اس نے بہت سے اوزار تیار کئے۔ جن میں سے مشہور لیڈن جار بھی تھا۔ لیڈن جار اس نے کبھی نہ دیکھا تھا۔ جب یہ تیار ہو گیا تو اس کا تجربہ کرنے لگا۔ لیکن بجلی کا ایسا زبردست صدمہ اُسے پہونچا۔ کہ لیڈن جار اس کے ہاتھ سے نکل گیا اور ٹوٹ گیا۔ لیکن اُسے تجربہ ہو گیا۔ اس لئے اس نے ایک نیا لیڈن جار تیار کر لیا۔ اس کے بعد اس نے گیسوں کے تجربے شروع کئے اور ایک بہت بڑا آکسی ہائیڈروجن[1] آلہ تیار کیا۔ لیکن جس مکان میں رہتا تھا اس میں اس گیس سے کئی مرتبہ زبردست دھماکے ہوئے اور ایک مرتبہ تو مکان میں آگ لگ گئی۔ مالک مکان بھلا کب برداشت کر سکتا تھا۔ اس لئے ہنلے نے یہ مشغلہ چھوڑ کر دوسرے خاموش مضامین کی طرف توجہ کی۔ اس عرصہ میں اس نے لوہا خرادنا اور بڑھئی کا کام بھی سیکھ لیا تھا۔ اس واسطے اس نے ارادہ کر لیا کہ سائنس کے آلات بنایا کرے اور اپنے ہاتھ سے ہی لکڑی اور دھات کا تمام کام تیار کرے۔ اس تمام عرصے میں ہفتہ ہفتہ بھر روٹی اور مکھن پر ہی گذارہ کرتا تھا۔ کبھی کبھی تھوڑی بہت کافی بھی پی لیتا تھا۔ یکشنبہ کے روز کوئی کام نہ کرتا تھا۔ البتہ اس روز کیک بسکٹ اور مٹھائیاں تیار کرتا جس میں اسے کافی مہارت ہو گئی۔

سائنس کے اوزاروں کا کارخانہ قائم کرنے سے پہلے اس نے کچھ جادو کی لالٹینیں تیار کی تھیں۔ اس کا ہر ایک حصہ اس نے اپنے ہاتھ سے تیار کیا تھا۔ اور ساری عمر اس کی یہی عادت رہی کہ جو چیز بناتا۔ اوّل سے آخر تک اپنے ہی ہاتھ سے تیار کرتا۔ یہاں تک کہ جب وہ بڑے بھاری کارخانے کا مالک بن گیا۔ تو کچی دھاتیں لیکر انہیں صاف کرتا۔ پھر اُن سے اپنے اوزار بناتا اور سٹیڈ کی بجلی مقناطیسی دریافت نے اس کی توجہ بجلی کی طرف پھیر دی۔ اس نے کئی اوزار بنائے۔ جنہیں لندن اور ویسٹ منسٹر بنک کے صدر مسٹر گیسیاٹ نے دیکھا۔ اور اس سے بہت سے بجلی مقناطیس اور روشنی کے اوزار بنوائے۔ مسٹر گیسیاٹ نے پروفیسر ویٹسٹون سے اسکی ملاقات کرائی۔ اپنے تمام ابتدائی تجربے اس نے پروفیسر ویٹسٹون کے ساتھ کئے۔ جس کے نتیجہ میں اس نے اپنی تمام رجسٹریاں فروخت کر دیں۔ اور ۱۸۴۶ء میں بجلی اور تار کی کمپنی کی بنیاد رکھی۔ ہنلے نے بہت سے مقناطیسی تار رجسٹری کرائے۔ اس کے بعد میرین کیبل[2] بنانے کی طرف توجہ کی۔ اس زمانے میں یورپ اور امریکہ کے بڑے بڑے ماہر انجنیر۔ سائنسدان۔ سوداگر اس میں دلچسپی لے رہے تھے۔ سب سے پہلی اور کامیاب لمبے فاصلے والی میرین کیبل تیار کی۔ جسے سر چارلس برائٹ نے ۱۸۶۳ء میں خلیج ایران میں لگایا۔ اس کی لمبائی ۱۶۱۵ میل ہے۔ اس کی کیبل کے بنانے میں اس نے عجیب عجیب ترکیبوں سے کام لیا ہے۔ جو آج تک کام میں آتی ہیں۔ بحر اطلانٹک میں ایک کیبل ۱۸۵۸ء میں بچھائی گئی تھی۔ لیکن پندرہ یوم کے عرصہ میں یہ بالکل بیکار ہو گئی۔ ہنلے کو اس کے امتحان کے لئے مقرر کیا گیا۔ اور اس کے بعد اس کی رپورٹ طلب کی گئی۔ کہ کیوں ناکامی ہوئی۔

۱۸۶۵ء میں ایک دفعہ پھر کوشش کی گئی۔ کہ بحر اطلانٹک میں کیبل بچھائی جائے لیکن کیبل ٹوٹ گئی۔ لیکن اس کی تلافی ہو گئی۔ اور ۱۸۶۶ء میں اس نے کامیابی کے ساتھ کیبل بچھا دی۔ جس سے انگلستان اور امریکہ میں تعلقات ہو گئے۔ اور دونوں ملکوں کی تجارت پر بہت عمدہ اثر پڑا۔

اس کے بعد ہنلے نے اور بھی بہت سی سب میرین کیبل سمندروں میں بچھائیں۔ اور ایک عجیب طریقہ ایجاد کیا جس سے اگر کیبل ایک میل کی گہرائی تک پہونچ جائے تو اسے اٹھا لیا جائے۔ م

---

[1] ہائیڈروجن گیس کے جلنے سے کافی گرمی پیدا ہوتی ہے لیکن جب اسکے شعلے پر آکسیجن گیس پہونچائی جائے تو گرمی بہت زیادہ بڑھ جاتی ہے۔ آجکل اس کے ذریعہ سے مختلف دھاتوں کو جوڑنے یا ٹانکے لگانے کا کام لیا جاتا ہے۔

[2] سب میرین کیبل۔ وہ تار جو سمندر میں ڈالا جاتا ہے اور جس پر بجلی کے ذریعے تار برقی کے پیغامات بھیجے جاتے ہیں۔

ہمجولی

بہت ہے صحبتِ باہمد گر مرغوب دونوں کو
اسیرِ رشتۂ جذباتِ نامعلوم ہیں دونوں
بہم مل بیٹھنے کا شغل ہے محبوب دونوں کو
گرفتارِ طلسمِ حیرتِ معصوم ہیں دونوں

محبّت ان کی قیدِ جنس سے آزاد ہے یکسر
مفادِ باہمی سے ہے تعلّق بے نیازِ ان کا
خوشی سے ان کی دُنیائے خیال آباد ہے یکسر
نہیں ہے دشمنِ عیش آسمانِ فتنہ بازِ ان کا

ابھی یہ بے خبر ہیں چرخِ دُوں کی دُوں شعاری سے
ابھی ناآشنائے گردشِ ایّام ہیں دونوں
نہیں پالا پڑا ان کو پریشاں روزگاری سے
غرض بیگانۂ اندیشۂ انجام ہیں دونوں

کبھی ناآشنائے گردشِ ایّام تھا میں بھی
نہ غم دیکھا تھا میں نے بھی پریشاں روزگاری کا
کبھی بیگانۂ اندیشۂ انجام تھا میں بھی
یقیں تھا مجھ کو بھی دورِ طرب کی پائیداری کا

یونہی بیگانۂ افکارِ جہاں سے آہ میں بھی تھا
کہ بچّے بلیّوں کے آہ میرے بھی تھے ہمجولی
یونہی آزادِ قیدِ این وآں سے آہ میں بھی تھا
مرا بھی شغل تھا بلّیوں سے مل کر کھیلنا ہولی

مجھے اے کاش پھر بےفکریاں حاصل ہوں بچپن کی
میسّر پھر مجھے بچپن کی کامل شادمانی ہو
مرے شغلوں میں معصومیتیں شامل ہوں بچپن کی
اُسی صورت سے پھر بے لوث میری زندگانی ہو

میلا رام وفا

عرب کی عورتیں اور بدیہہ[1] گوئی

قدرت نے اہلِ عرب کو فصاحت و بلاغت اور قدرت بیان کا جو فطری ملکہ اور ساتھ ہی ذہانت و طباعی اور غیر معمولی ذکاوت و موزونیٔ طبع کا جو جوہر لطیف مرحمت فرمایا تھا اُس کا اثر یہ تھا کہ مرد تو مرد عورتیں تک بعض اوقات باتوں باتوں میں ایسے برجستہ اور موزوں اشعار پڑھ دیتی تھیں جنہیں سُن کر انسانی عقل حیرت میں غرق ہو جاتی ہے۔ بدیہہ گوئی ایک ایسا حیرت انگیز اور دلچسپ کمال ہے کہ مردوں کی زبانی سے جو کلام بدیہہ گوئی کے انداز میں ادا ہو جاتا ہے۔ عموماً ادبی مجلسوں کی گرمی کا سرمایہ سمجھا جاتا ہے۔ پھر آپ خیال فرما سکتے ہیں کہ جو کلام عورتوں کی زبان سے بیساختہ ادا ہو گا وہ کس حد تک سُننے والوں کے لئے دلچسپی کا سامان بہم پہنچا سکیگا محض اسی خیال کی بنا پر میں عرب کی شاعرہ عورتوں کی بدیہہ گوئی کی چند دلچسپ مثالیں پیش کرنا چاہتا ہوں۔ ان اشعار سے جہاں آپ کو یہ معلوم ہو گا کہ مردوں کی طرح عرب کی عورتیں بھی کس درجہ قادر الکلام اور موزونی طبع ہوتی تھیں۔ یہ حقیقت بھی واضح ہو جائیگی کہ عموماً دیہاتی زندگی بسر کرنے کے باوجود اُن کے جذبات کس درجہ گہرے۔ اُن کے احساس کس درجہ پرکیف۔ اور اُن کا مطالعہ فطرت کس حد تک وسیع تھا۔

ابوحسان عباسی اور ایک دوشیزہ

ابوحسان کہتے ہیں کہ ایک دفعہ میں چند ساتھیوں کے ساتھ ایک مقام پر بیٹھا ہوا تھا کہ اتنے میں ایک نقاب پوش دوشیزہ آئی اور ہمارے سامنے کھڑے ہو کر کہنے لگی کہ۔

اے لوگو تمہیں کچھ خبر بھی ہے میں قبیلۂ عکل کی ایک لڑکی ہوں جس کی آسائش و راحت کو مصیبتوں کا سیلاب بہا کر لے گیا۔ زمانہ کے مصائب نے اُن کو بالکل مفلس اور کنگال کر ڈالا یہاں تک کہ اب اُن کے پاس بیٹھنے کے لئے ایک چارپائی اور دودھ پینے کے لئے ایک بکری بھی نہیں ہے۔ تو کیا خدا کا کوئی نیک بندہ ہے جو ان کی اعانت و امداد کے لئے سخاوت کا ہاتھ بڑھائے اور اُن کی مصیبتوں میں اُن کا مددگار ہو کر آخرت کا ثواب حاصل کرنے کی کوشش کرے۔

دوشیزہ نے یہ تقریر کچھ ایسے جادو بھرے لب و لہجہ کے ساتھ کی کہ ہم سب کے دل اُسے سُنکر رحم کے جذبات سے لبریز ہو گئے۔ میں نے کہا کہ کیا تم نے اپنی بدحالی کے متعلق کوئی شعر بھی کہا ہے۔ اُس نے جواب دیا کہ ہاں اور پھر یہ دو شعر پڑھے

کفا لزمان علیھا الصّبر والصّاب   شُلّت انا ملھا عن الاعراب
قومٌ اذا الجاءَ العفاۃُ الیھم   اعطوا النوافلھم بغیر حساب

ترجمہ۔ زمانہ کے ہاتھ میں ایلوا اور صاب (ایک قسم کا تلخ درخت) بھرا ہوا ہے خدا کرے کہ اس ہاتھ کی انگلیاں ہم دیہاتی لوگوں تک پہنچنے پہنچتے شل ہو جائیں (ہماری) قوم ایک ایسی قوم تھی کہ جب بھکاری اُن کے پاس آتے تھے تو وہ اپنی بخششیں اُنہیں بے حساب دیدیا کرتے تھے۔

پھر میں نے کہا کہ کیا تم اپنے چہرے کو ایک لمحے کے لئے بے نقاب کر کے مجھکو اجازت دو گی کہ اُسے ایک نظر دیکھ لوں۔ اس پر دوشیزہ نے فوراً نقاب الٹ دی۔ اُس وقت میں کیا کہوں کہ دل پر کیا کیفیت طاری ہو گئی بس یہ معلوم ہوتا تھا کہ چاند کا کوئی ٹکڑا ہے جو آسمان سے ٹوٹ کر زمین پر آگیا ہے۔ یا فردوس بریں کی کوئی حور ہے جو چند دنوں کیلئے اس دنیا کی سیر کرنے کو اُتر آئی ہے۔ حسن و جمال کی ایک مجسم دیوی تھی جو میرے سامنے کھڑی تھی۔ یا قدرتِ صانع کا ایک بہترین نمونہ تھی جسے دیکھ کر معلوم ہوتا تھا کہ قدرت کے قلم کار نے اپنی صناعی کی ایک ایک خوبی اُس کے اندر بھر دی ہے۔ یہ کہنا بالکل مبالغہ سے خالی ہے کہ انسان کے محدود پیرائۂ بیان اُس کے جمال کی تعریف و توصیف کرنے کے حق سے عہدہ برآ نہیں ہو سکتے۔ چہرے سے نقاب اُلٹتے ہی اُس نے یہ شعر پڑھے۔

اللھم ابدیٔ صفحۃً قد صانھا   ابوای قبل تغیر الایام
فتمتعوا بعیونکم فی حسنھا   واھوا جوار حکمۃ عن الایام

ترجمہ۔ آہ! افسوس زمانہ نے اُس چہرہ کو بے نقاب کر دیا جس کو گردش ایام سے پہلے میرے ماں باپ نے چھپا چھپا کے رکھا تھا۔

[1] بدیہہ گوئی۔ پہلے سے سوچے بغیر فوراً شعر کہہ دینا اسے عربی میں ارتجال کہتے ہیں۔ عرب میں بہت سے شعرا بدیہہ گوئی میں کمال رکھتے تھے۔ (ایڈیٹر)

لو! اے تماشائیو اُس کے حسن سے اب اپنی آنکھوں کو ٹھنڈک پہنچاؤ
لیکن اپنے اعضا کو گناہوں سے دور رکھو

ان دو شعروں میں خدا جانے کس بلا کا درد تھا کہ سُنتے ہی بیتاب ہو گیا اُن کا ایک ایک حرف معلوم ہوتا تھا کہ بجلی کی طرح نشتر بن کر میری رگ رگ میں اُترتا جا رہا ہے میں اُس وقت محسوس کر رہا تھا کہ کوئی غیر محسوس و غیرمرئی[1] کشش ہے جو مقناطیسی اثر کے ساتھ نہایت سُرعت سے میرے دل و دماغ کو اپنی طرف کھینچ رہی ہے یا میں خود بخود بلا کسی سبب کے اُس میں جذب ہو جانا چاہتا ہوں۔

میں نے کانپتی ہوئی زبان سے کہا۔

میں۔ کیوں؟ تم اُس شخص کے متعلق کیا رائے رکھتی ہو جو تمہیں اور تمہارے قبیلے کو فقر و فاقہ کی مصیبت سے نجات دیدے؟۔

دوشیزہ! ہم پانچ نفر ہیں ایک میں۔ میری ماں۔ میری دو بہنیں۔ اور ایک بھائی۔ بھائی کمسن ہونے کی وجہ سے اگرچہ کمائی کرنے کے قابل نہیں ہے۔ لیکن اللہ کا رزق بہت وسیع ہے اور اُس میں تمام مخلوقات کا برابر حصہ ہے تو پھر ہمیں کیا ضرورت ہے کہ اپنے نفس کو محض رزق حاصل کرنے کی وجہ سے دوسروں کے ہاتھ فروخت کر ڈالیں +

میں۔ شاید تم نہیں سمجھیں میں جس کی طرف اشارہ کر رہا ہوں وہ نکاح ہے جس کو اللہ تعالیٰ نے حلال کر دیا ہے۔ میں قبیلًا رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کا چچازاد بھائی ہوں اور مال میرے پاس اتنا ہے کہ شمار میں نہیں آسکتا۔

دوشیزہ مجھکو اگر نکاح کرنا ہی ہوتا تو مجھے تمہارے مال کی چنداں ضرورت نہ تھی۔ کیونکہ صرف تمہارا حسن و جمال ہی ایسا ہے جو دنیا کی تمام ترغیب دلانے والی چیزوں سے بے نیاز کر دیتا ہے۔ لیکن میں کیا کروں۔ میں تو اُن عورتوں میں سے ہوں۔ جن کو کسی شخص کا حسن و جمال یا اُس کا مال اُس کی طرف مائل و راغب کر دینے کا ذریعہ نہیں بن سکتا"

میں! تو پھر اچھا یوں کہو کہ تمہاری قسمت تمہیں اور تمہارے قبیلہ کو افلاس کی آفتوں سے نجات دلانا نہیں چاہتی ہے۔

دوشیزہ۔ نہیں۔ بخدا نہیں۔ ہانڈی کے ٹوٹے ہوئے ٹکڑوں کو کھا لینا بہت آسان ہے بہ نسبت اس کے کہ میں ہمیشہ کیلئے اپنے آپ کو کسی کی ملک میں دیدوں اور اُس کی اطاعت و فرمانبرداری کا عہد کر کے پابند ہو بیٹھوں۔ اور وہ بھی محض اتنی سی بات پر کہ وہ مجھپر اور میرے قبیلے پر مال کے ذریعہ ایک احسان کرنا چاہتا ہے۔

[1] غیر مرئی جو دیکھنے میں نہ آئے۔

مجھے تو زرقا بنت عمیر بن المورق کی بات بار بار یاد آتی ہے جب اُن سے کہا گیا کہ اگر تم اپنی جوانی و شباب کے دنوں میں اور حسن و جمال کے ایام میں کسی سے نکاح کر لو تو تمہیں زندگی کا حقیقی عیش و آرام میسر آجائے۔ اور جب تم جانوگی کہ درحقیقت "جوانی" کا زمانہ کیسا پُرکیف اور پُرمسرت ہوتا ہے۔ اس پر زرقا نے جواب دیا قسم خدا کی میں ایک آزادانہ زندگی اس طرح بسر کرنے کو کہ کوئی میرا مالک نہ ہو اور کسی کی اطاعت گذاری پر مجھے مجبور نہ کیا جائے زیادہ پسند کرتی ہوں بہ نسبت اس کے کہ زمین کے ان گنت خزانوں کی کنجیاں میرے ہاتھوں میں دیدی جائیں اور مجھکو تمام زمین کا مالک بنا دیا جائے۔ اس کے بعد اُس نے یہ تین شعر پڑھے۔

أمن بعد أن أمسی وأصبح حرة — ولیس علیَّ للرجال یدان
أصیر لزوجٍ مثل مملوکةٍ لهُ — لبئس إذا ما یکتب الملکان
لعیش بضنکٍ أو بضنکٍ وحاجةٍ — مع العزِّ خیر من صفوِ لسانِ

ترجمہ۔ کیا اس کے بعد کہ میں آزاد ہوں اور ایسی آزاد کہ مردوں کو میرے اوپر کسی طرح کا اقتدار نہیں ہے میں خاوند کے لئے مثل اُس کی مملوکہ کے ہو جاؤں؟ یقیناً یہ فیصلہ بہت بُرا ہے جبکہ فرشتے میرے اعمال لکھیں فقر و فاقہ کی زندگی گذارنا۔ مگر عزت کے ساتھ یہ زیادہ اچھا ہے بہ نسبت اس کے کہ زمانہ کے حوادث سے دوچار ہونا پڑے۔

خدا کرے میں مر ہی جاؤں اگر زرقا کی طرح میں بھی نسوانی خودداری کو باقی رکھنے کی کوشش نہ کروں۔

میں! "میں تو یہ سمجھتا ہوں کہ دنیا میں ایسی ایک عورت کا ملنا ناممکن ہے جو سچ مچ مردوں کی طرف رغبت نہ رکھتی ہو۔

دوشیزہ! اگر آپ کا یہی خیال ہے تو یاد رکھئے کہ میں آپ کے "ناممکن" کو "ممکن" کر کے دکھلاؤں گی لو آج تم سے کہتی ہوں کہ جب سے میں جوان ہوئی ہوں قریب قریب دس نوجوان اور نوجوان بھی کیسے حسب و نسب مال و دولت حسن و جمال ہر اعتبار سے ایک دوسرے سے بڑھ چڑھکر مجھ سے نکاح کرنے کی درخواست کر چکے ہیں۔ لیکن میں سچ کہتی ہوں کہ میرا دل اُن میں سے کسی ایک کی طرف بھی مائل نہیں ہوا۔ کیوں؟ محض مردوں کے ظلم و ستم کے ڈر سے۔

اس گفتگو کے بعد دوشیزہ چلی گئی اور میں دل مسوس کر رہ گیا۔

ایس۔ اے

اکبرآبادی



معمہ

احمد الجمالی الخراتژی سے میری ملاقات بلا واسطہ ہوئی۔ میں اپنے قیام پیرس کے زمانہ میں ایک روز مسجد دیکھنے گیا۔ مسجد سے ملا ہوا جو ایک مختصر سا قہوہ خانہ ہے۔ وہاں وہ بھی تھا وہیں ہم ایک دوسرے کے شناسا ہو گئے

الجمالی نے پیرس میں طب کی سب سے اعلےٰ ڈگری حاصل کی اور وہیں ایک ہسپتال کا انچارج مقرر ہو گیا چند مہینوں میں اس سے میرا ربط بڑھ گیا اور جس روز میں ہندوستان کو روانہ ہو رہا تھا اُس نے مجھے لنچ پر مدعو کیا۔ وقت کی تنگی کے باعث قرار یہ پایا۔ کہ میں ٹھیک ۱۲ بجے اُس سے ہسپتال ہی میں جا ملوں۔ چنانچہ میں دس پانچ منٹ وقت سے پہلے پہنچ گیا اور ملاقات کے کمرہ میں اُس کا انتظار کرنے لگا۔ وہ اپنے آخری مریض کے معائنہ میں مصروف تھا۔ ہنوز میں پورے طور سے بیٹھنے بھی نہ پایا تھا۔ کہ دربان نے دروازہ کھولتے ہوئے حاضری کی آگاہی کیلئے "ایک خاتون بغرض ملاقات، جناب!" کہا اور میری نگاہیں ایک کشیدہ قامت نازنین پر جم گئیں اُس کے حسن و جمال کی دلکشی اور انداز لباس آرائی کی دلربائیاں نظرانداز کر سکنا میرے لئے تو کیا کسی کے لئے بھی آسان تھا۔

ڈاکٹر کو خلاف توقع زیادہ دیر ہوئی اور ہم دونوں ملاقات کے کمرے میں زیادہ دیر تک خاموش بیٹھ نہ سکتے تھے۔ چنانچہ میں نے ہمت کی اور گفتگو شروع کرنے کے خیال سے اس کی جانب دیکھا۔ اُس نے ایک دلنشین مسکراہٹ کے ساتھ میرے ارادے کی ہمت افزائی کی۔

موسم کے متعلق گفتگو رہی۔ مختلف تماشا گاہوں اور اُوپیرا کے متعلق تبادلہ خیالات ہوا۔ گفتگو کے دوران میں مجھے برابر یہ یقین ہوتا گیا کہ وہ سوسائٹی کے معمولی طبقہ سے متعلق نہ تھی۔ اس کا انداز تکلم دلاویز ہی نہ تھا بلکہ اس کے ہر ہر جملے اور ہر ہر لفظ سے شائستگی اور وسعت معلومات کا ثبوت مل رہا تھا۔ لباس کا طرحدار و گراں قیمت ہونا اس کی وضعداری اور تمول کی دلیل اور سلامت ذوق کا آئینہ تھا۔

وہ کافی سے زیادہ سیاحت کر چکی تھی اور وسیع مطالعہ رکھتی تھی۔ یورپ کی مشہور سیرگاہیں اس کے جانے پہچانے مقامات تھے۔ مونٹی کارلو کے میزیں اب اس کے اندر ہیجان پیدا نہ کرتی تھیں، سوئٹزرلینڈ کے برفستان کوئی نئی چیز نہ تھے۔ اٹلی کی جھیلیں اپنی دلکشی ختم کر چکی تھیں اور ناروے کے آدھی رات کے چاند کی رونقیں بھی اس کے لئے پرانی پڑ چکی تھیں اپنی ذاتی اسپینو سوٹزا میں یورپ کے بڑے حصے میں سیاحت کر چکی تھی۔ لیکن با ایں ہمہ اس کا خیال تھا کہ اپنے وطن سے بہتر کوئی جگہ نہیں۔

ان تمام اطلاعات کے ساتھ مجھے محسوس ہوا کہ اس کے یہ بیانات فخریا تعلّی پر مبنی نہ تھے، اور یہ کہ یہ تمام باتیں حقیقتاً اس کی زندگی کا جزو بن چکی ہیں لیکن یقین کے ساتھ میں متحیر بھی تھا کہ اگر یہ سب کچھ صحیح ہے تو اس کا ہسپتال میں آنا کیا معنی رکھتا ہے۔!

"میڈم کو ڈاکٹر سے کوئی طبی مشورہ لینا ہے؟" میں نے سوال کیا۔

"جی ہاں، رقص کے بعد میرے ٹخنے میں کسک ہونے لگی ہے"۔

یہ تحقیق ہو جانے کے بعد کہ باوجود اس شان و شوکت کے وہ ہسپتال میں معالجے کی غرض سے آئی ہے۔ مجھے حیرت ہوئی اور شوق جستجو پیدا ہو گیا۔ میں نے دبے الفاظ میں اپنی حیرت کی وجہ ظاہر کر ہی دی اور ساتھ ہی معذرت آمیز لہجہ میں دریافت کیا کہ آیا وہ کسی تھیٹر سے منسلک تھی۔

مغربی آداب و تہذیب کے دائرے میں میرا اظہار خیال اور بے ہنگامی سوال بے شک بیہودگی پر مبنی ہے لیکن انگریزی شائستگی اور ظاہرداری میں کسی طرح قابل عفو نہیں۔ اور حقیقت یہ ہے کہ بعد میں میں خود ہی نادم تھا۔ لیکن چونکہ وہ فرانسیسی خاتون تھی اور بات بھی کچھ لگتی ہوئی سی تھی۔ اس لئے میں اس سزا سے بچ گیا جو ایسے موقع پر صرف نگاہوں اور چہرہ کے اُتار چڑھاؤ سے دی جاتی ہے۔

اُس نے ایک ٹھنڈا سانس بھرا اور فوراً اس کمزوری کو چھپانے کیلئے تبسم کی رونق سے کام لینا چاہا جو ایک وہم سے زیادہ ثابت نہ ہوا۔ نفسیات کا یہ نکتہ جس قدر دلچسپ ہے اُتنا ہی دلخراش بھی ہے کہ کوئی پھوٹ پڑنے کے لئے ذرا سی ٹھیس کا منتظر ہو۔ اور اس تشریح پر انسان اپنے تئیں مجبور پائے اور کہہ گزرے ....

.... چاہے بعد میں اپنے تئیں افسوس و ندامت میں غرق بھی کیوں نہ محسوس کرے۔ کیونکہ یہ وہ لمحہ ہوتا ہے جب کسی کو رازدار بنا لینے کی آرزو نہایت قوی ہوتی ہے۔

"آپ مجھے اس نسوانی جماعت کے متعلق سمجھئے جو سوسائٹی کی کسی تقسیم میں نہیں آتی۔ طبقہ نسوان کا وہ فرقہ جو قانون کی اصطلاح میں بلا کسی مستقل سکونت کے سمجھا جاتا ہے"۔

پھر اُس نے رُک رُک کر اپنا افسانۂ حیات بیان کرنا شروع کیا۔ اس وقت اُس کی عمر ۲۶ سال کی تھی اور ۱۹ سال کی عمر میں اس کی شادی ہوگئی تھی۔ فطرت کی ستم ظریفیاں بھی عجیب ہیں۔ شادی کے تھوڑے ہی عرصہ بعد اس کا شوہر موٹر کے حادثہ سے جاں بحق ہوگیا۔ ایسی حالت میں پیرس کی زندگی اُسے دوزخ معلوم ہوئی اور بعض دوستوں کے اصرار پر وہ دیہات میں چلی گئی۔ وہاں ایک صحبت میں ایک عمر رسیدہ مارکوئیس سے اس کی ملاقات ہوگئی۔ اور مارکوئیس کو جب اس کی سوانح حیات معلوم ہوئے تو زیادہ عنایات و ہمدردی کا برتاؤ کرنے لگا۔ اور ہر چند وہ اپنے خیال میں لذاتِ حیات ختم کرچکا تھا۔ لیکن اس لڑکی سے ملنے کے بعد اُس نے عمر رفتہ کو واپس آتے محسوس کیا۔ نتیجہ یہ ہوا کہ وہ اسے اپنے ساتھ محل میں لیگیا۔ اور وہ وہاں رہنے لگی۔

وہ نہایت دولتمند تھا۔ اور فراوانی دولت جراحت محسوسات کے لئے جس حد تک تریاق کا کام دے سکتی ہے۔ اُس کے لئے بھی وجہ سکون ثابت ہوئی۔ چھ سال کامل یہ نوواردِ حیات واقعی زندگی کے لطف اُٹھاتی رہی۔ ہر وہ چیز جو روپیہ سے خریدی جاسکتی تھی۔ اس کو میسر تھی۔ اور مارکوئنس یہ جان کر کہ ایک نوشباب نازنین، دولت و تنعم کے علاوہ بھی کچھ چاہتی ہے جو وہ نہیں دے سکتا۔ دولت کے صرف سے ہی اس کی تلافی کرنا چاہتا تھا۔ مگر آرام حیات و آفات دنیا کبھی ہمیشہ کے لئے ختم نہیں ہوجاتے چنانچہ اس کا ضعیف العمر سرپرست مارکوئیس بھی اسے دنیا میں یکہ و تنہا چھوڑ کر رخصت ہوگیا۔ اور اس کے قانونی مشیر نے جائیداد پر قبضہ لیکر اُسے بیدخل کردیا۔ وصیت میں اس کا کہیں ذکر نہ تھا۔

اس واقعہ کو ابھی صرف تین ہفتے گذرے تھے اور جب یہ مارکوئیس کے مکان سے رخصت ہوئی تو علاوہ ملبوسات کے اس کے بٹوے میں ایک ہزار فرانک سے زیادہ نہ تھے۔ یہاں پہنچکر ایک ایسے لہجہ میں جو نصف آرزو اور نصف سوال تھا کہنے لگی "میں نے مستقبل کا کبھی خیال نہ کیا۔ میں اس حالت کی متوقع نہ تھی میں کیا کروں؟ میرے پاس صرف سو فرانک بچے ہیں اور یہ سموری کوٹ پہلی چیز ہے جسے رخصت کرنے پر میں مجبور ہوں گی۔ لیکن یہ سوال پھر بھی قایم رہیگا۔ میرا کوئی نہیں۔ میں کوئی کام بھی نہیں جانتی۔ عجیب مشکل معمہ ہے"

یہ داستان حزین اور افسانۂ شوق آموز سُنکر میں بھی کچھ سوچ میں پڑ گیا: ایک نوجوان عورت جو تعلیم یافتہ ہے اور ذہین بھی، شائستہ ہے اور مہذب بھی اور پھر دلکش ہے اور حسین بھی۔ اس معمہ کا حل چاہتی ہے! کمرے سے باہر پیرس کی زندگی۔ ہنگامہ آرائی حیات کی عجیب نمایشوں کا مرکز بنی ہوئی تھی!

"آہ، میں اس نتیجے پر پہنچتی ہوں کہ ایک جوان عورت کی زندگی میں جب یہ معمہ پیش ہوجائے تو پھر اس کی تباہی میں شک نہیں رہجاتا اس کی ناتجربہ کاری حل معمہ کی اہل نہیں اور اگر کسی دوسری طرف سے حل پیش نہیں ہوتا تو اس کے پاس اس کا کیا علاج ہے؟"

ابھی وہ اپنا فقرہ ختم نہ کرنے پائی تھی کہ الجمالی کمرے میں داخل ہوا۔

"میڈم، علاج تو ہر خرابی کا ممکن ہے" اُس نے کچھ تبسم اور کچھ سنجیدگی کے ساتھ کہا اور وہ ڈاکٹر کا یہ جملہ سُنکر کچھ ایسی حالت میں مبتلا نظر آئی جس میں نصف انتشار اور نصف توقع ہوتی ہے۔

میں نے الجمالی کو مخاطب کرکے کہا کہ میڈم کے تھٹنے میں کسک ہے۔ مگر اب دیر اتنی ہوگئی ہے کہ میرے اور کام رہ جائیں گے۔ اس لئے وہ میری بے تکلفی کو نظر انداز کرکے میڈم کو بھی لنچ پر مدعو کرے اور لنچ کے بعد اپنے مطب میں جاکر میڈم کی شکایات پر توجہ کرے۔

"اگر میڈم ہم دونوں کو لنچ پر اپنی معیت سے مسرور کریں۔ تو مجھے ازحد مسرت ہوگی" یہ کہکر الجمالی اُس کی طرف دیکھنے لگا۔ اور میں نے دیکھا کہ تہذیب و اخلاق کا یہ معمولی اظہار حقیقت بنکر اس کی آنکھوں میں چمکنے لگا۔

وہ صرف مسکرادی۔

آرمانو ویل (پیرس کا مشہور ایسٹورانٹ) میں نہایت پرلطف اور لذیذ لنچ کھانے کے بعد میں اُن سے رخصت ہوا۔ کیونکہ اسی شام کو میری روانگی تھی۔

اسٹیشن پر دونوں مجھے خدا حافظ کہنے کے لئے آئے۔ حالانکہ میں صرف الجمالی کا متوقع تھا۔ جہاز پر سے میں نے اُسے ایک خط لکھا اور دریافت کیا کہ کیا وہ اس کی شکایت رفع کرسکا۔

اُس کے جواب میں اُس نے مجھے اطلاع دی کہ وہ اُس کے معمے کے حل کرنے میں مصروف ہے۔

ل۔ احمد

سیر یورپ

(طبقات شمالی کا ایک افسانہ)

(۱)

انیس کے والد بھاگلپور میں ایک کامیاب وکیل تھے۔ دیوانی مقدمات کی پیروی میں انہیں خاص ملکہ حاصل تھا۔ اپنے فرائض کے سرانجام دینے میں وہ اپنے ذاتی آرام کی کبھی پروا نہ کرتے تھے۔ اُن کے موکل اُن پر پورا اعتماد رکھتے تھے۔ افسرانِ عدالت کو بھی ان کی دیانت پر کامل طور پر یقین تھا۔ فریق مخالف کے وکیلوں کو ان سے کبھی شکایت پیدا نہیں ہوئی تھی۔ وکالت پیشہ ہونے کے باوجود طبیعت نہایت متین اور سنجیدہ تھی۔ لیکن اس سے یہ مراد نہیں کہ ماتھے پر ہر وقت تیوڑی چڑھی رہے۔ نہیں۔ بالکل نہیں بلکہ اُن کے چہرے سے ہر وقت بشاشت ٹپکتی تھی۔ تمام شہر اور ایک شہر ہی پر کیا منحصر ہے ضلع بھر میں نہایت عزت کی نگاہ سے دیکھے جاتے تھے۔ کئی سال سے شہر کی میونسپلٹی کے وائس پریذیڈنٹ چلے آرہے تھے۔

انیس اپنے والدین کا سب سے بڑا لڑکا تھا۔ ماں باپ نے اُسکی تربیت بڑی احتیاط سے کی تھی۔ اس کے باپ کی خواہش تھی کہ انیس بیرسٹری پاس کر کے ان کی نگرانی میں وکالت کا کام سیکھے اور رفتہ رفتہ اُنکی ذمہ داریوں سے سبکدوش کردے۔ انٹرینس کا امتحان پاس کرنے کے بعد اس کے والد نے اُسے بانکی پور کے کسی کالج میں داخل کرانے کی بجائے بھاگلپور ہی میں تیج نرائن کالج میں داخل کرا دیا۔ تاکہ کچھ دنوں اور وہ اُن کی زیرنگرانی تربیت پا سکے۔ لیکن ایف اے کا امتحان پاس کرنے بعد اُنکی یہ رائے ہوئی کہ اسے پٹنہ کالج بانکی پور میں داخل کرا دیا جائے تاکہ انگلستان جانے سے پہلے دو سال میں اسے اپنے عزیزوں سے الگ رہنے کی عادت ہو جائے اور اپنی زندگی کے متعلق مختلف مرحلوں پر آزادی اور ذمہ داری سے فیصلہ کرنے کی قابلیت پیدا کرلے۔ چنانچہ انیس نے اپریل ۱۹۱۰ء میں پٹنہ کالج سے کلکتہ یونیورسٹی کا بی۔ اے کا امتحان اوّل درجہ میں پاس کرلیا۔

انیس کی عمر اُس وقت ۱۹ سال کی تھی۔ اپنی عادات و اخلاق میں وہ اپنے باپ کا عکس تھا۔ البتہ اپنی ماں کی تربیت کے اثر سے اُس کا دل رقت آمیز احساسات سے بہت جلد متاثر ہو جاتا تھا اور کسی کے دُکھ اور تکلیف کا ذکر اُسے فوراً بے چین کر دیتا تھا۔ انسان کے دل کا وہ جذبہ جو ہر وقت اسے اپنے تئیں قربان کر دینے پر اُبھارتا رہتا ہے انیس کے دل میں انسانی ہمدردی کی صورت میں تسلی پاتا تھا۔ محبت کا مفہوم اُس کے دل میں ابھی ماں باپ اور بھائی بہنوں کے ساتھ پیار اور شفقت کے احساسات تک محدود تھا۔

اگست ۱۹۱۰ء میں انیس نے انگلستان کا سفر اختیار کیا۔ گھر کے تمام لوگ اسے رخصت کرنے کے لئے بانکی پور تک ساتھ گئے۔ اس کے باپ نے بمبئی تک اُس کی رفاقت کی۔ جہاز روانہ ہونے پر اُنہوں نے دعائیں دیکر اُسے رخصت کیا۔ باپ نے بیٹے کو رخصت کرتے وقت تک ایک بھی کلمہ نصیحت کا نہیں کہا نہ کوئی لفظ پیار کا منہ سے نکالا۔ لیکن بیٹے نے بھی اس کمی کو محسوس نہ کیا کیونکہ اسوقت باپ بیٹوں کے جذبات و احساسات میں اس درجہ یکسانیت اور ہم آہنگی تھی الفاظ کے استعمال کئے بغیر دونوں ایک دوسرے کی دلی کیفیات کو پورے طور پر محسوس کر رہے تھے۔ صحبت کے ان آخری لمحوں میں اگرچہ انیس کے کانوں میں بیرونی آواز نہیں پڑتی تھی۔ لیکن ایک غیر مرئی (ان دیکھے) طریق پر اُسکے دل سے ایک آواز اٹھ رہی تھی جس کا مفہوم الفاظ کی زبان میں یہ تھا۔

"لو بیٹا! اب ہم تم سے رخصت ہوتے ہیں۔ جب تک تم ہماری آنکھوں کے سامنے تھے ہم نے تمہیں اللہ تعالیٰ کی ایک امانت سمجھ کر اس امانت کا حق ادا کرنے کی بساط بھر کوشش کی اور اسوقت بھی کہ تم ہماری نظروں سے کچھ مدت کے لئے اوجھل ہونیوالے ہو ہم تمہیں اُس کے سپرد کرتے ہیں جو ہر ملک اور ہر حالت میں تمہارا رفیق اور نگہبان ہے۔ جس ملک میں اب تم چند سال کے لئے رہائش[1] اختیار کرنے والے ہو اس کے باشندے ہمارے حاکم ہونے کی وجہ سے تمہارے وطن اور تمہارے دین کو حقیر جانتے ہیں۔ اگرچہ اپنی اخلاقی تربیت کی وجہ سے وہ اس امر کا اظہار بہت کم کرتے ہیں۔ لیکن تم اپنی قوم اپنے وطن اور اپنے مذہب کی طرف سے اس ملک میں بطور سفیر کے جا رہے ہو۔ تمہارا برتاؤ اُس ملک میں ایسا ہونا چاہئے جو تمہاری قوم تمہارے وطن اور تمہارے دین کی عزت ان لوگوں

---

[1] اقامت اور قیام کے معنی میں رہائش کا لفظ گریمر اور لغت کے اعتبار سے غلط سہی لیکن ہماری رائے میں اردو میں اسکا استعمال بالکل درست ہے۔ تاجور

کے دلوں میں قائم کرے۔ اگر تم اس سفارت کو ذمہ داری کے ساتھ سرانجام دوگے تو یہ چند سال کی جدائی ہمارے لئے ہمیشہ کی راحت کے سامان پیدا کر دیگی۔ مغرب کا سفر تمہارے لئے مبارک ہو۔ جس ملک اور جس حالت میں بھی رہو شریفوں کی صحبت اختیار کرو۔ اپنے علم میں اضافہ کرو۔ اپنے اخلاق کو وسیع کرتے چلے جاؤ۔ ہر قوم اور ہر طبقہ میں بعض امتیازی خوبیاں ہوتی ہیں اُن کے حاصل کرنے کی کوشش کرو۔ خطرہ کے ہر مقام سے بچتے رہو۔ ہر حالت میں اللہ تعالیٰ پر بھروسہ رکھو اور اُسی سے مدد طلب کرو۔ وہ تمہارا حافظ و ناصر ہو"

انیس کا دل خاموشی سے جواب دے رہا تھا "پیارے ابا جان میں ہر لحظہ اس کوشش میں رہونگا کہ آپکی ہر توقع کو پورا کروں۔ آپ اللہ تعالیٰ کے حضور میں میرے لئے دعا کرتے رہیں۔ قیام یورپ میں میری زندگی کا مقصد یہی ہوگا۔ کہ واپسی پر آپ مجھے ویسا ہی پائیں جیسا مجھے دیکھنے کی آپ کی خواہش ہے۔ آپ سب کا خدا حافظ ہو اور اپنے فضل سے ہم سب کو پھر اکٹھا کرے"۔

گھنٹی بجی۔ باپ بیٹے نے خاموشی سے مصافحہ کیا لیکن ایکدوسرے کے چہرے کی طرف آنکھ اٹھا کر دیکھنے کی تاب نہ لاسکے۔ دونوں کی آنکھیں ڈبڈبائی ہوئی تھیں تختہ کھینچ لیا گیا اور جہاز حرکت کرنے لگا۔ باپ میں صبر کی اتنی طاقت نہیں تھی کہ بندرگاہ سے جہاز نکل جانے کا انتظار کرتے۔ ایک نظر مڑ کر دیکھا اور رومال سے آنسو پونچھتے بندرگاہ سے باہر نکل گئے۔

انیس کچھ دیر تک تو دوسرے مسافروں سے الگ کھڑا اپنے خیالات میں غرق رہا۔ جب جہاز بندرگاہ سے چل نکلا تو ایک طرف آرام کرسی بچھا کر بیٹھ گیا اور بمبئی کا آخری نظارہ جو آنکھوں کے سامنے سے گذر رہا تھا دیکھنے میں محو ہوگیا۔ ابھی بندرگاہ سے نکلے ایک گھنٹہ بھی نہ گذرا تھا کہ جہاز تلاطم کے ہچکولے لینے لگا اور انیس کی طبیعت بے چین ہونی شروع ہوئی۔ اُٹھا اور جوں توں کرکے اپنے کمرے میں پہنچا۔ کپڑے بدل کر بستر پر لیٹ گیا۔ جہاز کی بے اختیاری حرکت بڑھتی گئی لیکن بستر پر لیٹے رہنے کی وجہ سے انیس کی طبیعت زیادہ خراب نہ ہوئی۔ تین دن کمرے ہی میں گذارے۔ کھانے کے اوقات پر وہیں کچھ منگوا لیتا اور لیٹے لیٹے کھا لیتا۔ چوتھے روز سمندر میں پہلے کی نسبت سے کچھ سکون ہوا۔ اور انیس کی طبیعت قدرے صاف ہوئی۔ اٹھا غسل کیا۔ کپڑے بدلے۔ اور عرشے پر جا کر کھلی ہوا میں چند گھنٹے گذارے۔ اس سے طبیعت کو کچھ قرار آیا۔ شام کا کھانا۔ کھانے کے کمرے میں جا کر اور مسافروں کے ساتھ کھایا۔ اُن پر بھی کم و بیش یہی کیفیت گذری تھی۔ پانچویں دن سمندر بھی صاف ہوگیا اور انیس کی طبیعت بالکل ٹھہر گئی۔ بعض دوسرے ہندوستانی طالبعلموں کے ساتھ جو مزید مطالعہ کے لئے یورپ جارہے تھے واقفیت ہوئی۔ ایک دو یورپین مسافروں کے ساتھ بھی گفتگو کا سلسلہ چلا۔ طبیعت کی پریشانی کم ہوئی۔ اور جہاز کی زندگی پُرلطف ہونے لگی۔ دوسرے دن جہاز عدن پہنچنے والا تھا۔ اکثر حصہ وقت عزیزوں اور دوستوں کو خط لکھنے میں صرف ہوا۔ سیاسی اور جنگی لحاظ سے عدن کو ایک خاص اہمیت حاصل ہے۔ لیکن آب و ہوا اور قدرتی مناظر کے لحاظ سے اسے کسی وقعت کی نگاہ سے نہیں دیکھا جاتا۔ جہاں تک نظر کام کر سکتی ہے خشک چٹانوں اور جلتی ہوئی ریت کے ٹیلوں کا سلسلہ چلا جاتا ہے۔ بندرگاہ کے قریب چند تجارتی کوٹھیاں اور گودام ہیں۔ ذرا فاصلے پر ریذیڈنسی کے دفتر اور بنگلے ہیں۔ دوسری طرف ڈاکخانہ، تارگھر۔ بحری تار برقی کی کمپنی کا دفتر اور سمندر کے پانی سے پینے کا پانی بنانے کا کارخانہ وغیرہ۔ یہ سب عمارتیں جہاز سے نظر آتی ہیں ان کے پیچھے دیسی بازار ہے۔ چند میل کے فاصلے پر پہاڑی کے اوپر پینے کا پانی جمع کرنے کے تالاب ہیں۔ عدن میں پانی بکتا ہے۔ سبزے کا نام و نشان نہیں۔ دوربین لگا کر بھی دیکھو تو کہیں گھاس کا ایک تنکا یا کوئی سبز پتہ نظر نہ آئیگا۔

چونکہ انیس کا یہ پہلا دریائی سفر تھا اور پانچ دن پانی ہی پانی کا نظارہ کرتے طبیعت کچھ اکتا سی گئی تھی اس لئے وہ بھی چند دوسرے طلبا۱؎ کے ساتھ شہر کی سیر کو گیا۔ ساحل پر جہاز کی نسبت گرمی بہت زیادہ تھی۔ کہیں کہیں خاک بھی اڑتی تھی۔ بندرگاہ کا نظارہ جو جہاز کے عرشے سے بہت بھلا معلوم ہوتا تھا پاس پہونچکر بہت مایوس کُن نکلا۔ ایک ہی گھنٹہ کی سیر میں طبیعت گھبرا گئی۔ ڈاکخانہ پہنچ کر بخیریت عدن پہنچنے کا باپ کو تار دیا۔ ڈاک لیٹر بکس میں ڈالی اور اپنے ہمراہیوں سمیت واپس جہاز پر چلا آیا۔ جہاز چھ سات گھنٹے یہاں ٹھہرا۔ شام کے وقت بندرگاہ کا نظارہ زیادہ پُرلطف تھا۔ آٹھ بجے شام کے لنگر اٹھایا گیا اور جہاز سوئیز کی طرف روانہ ہوا۔ بحیرہ قلزم میں گرمی کی وہ شدت تھی کہ الامان۔ بجلی کے پنکھوں سے بھی گرم لو نکل رہی تھی۔ خالص برف کا پانی بھی حلق کو تر نہیں رکھ سکتا تھا۔ البتہ اتنا اطمینان تھا کہ سمندر میں تلاطم نہیں تھا اور جہاز بالکل امن اور سکون کی حالت میں چلا جا رہا تھا لت کو انیس اور اس کے دو تین ساتھی سب سے اوپر کے عرشے پر بستر بچھا لیتے تھے اور رات کے چند گھنٹے کچھ آرام میں کٹ جاتے تھے۔ عدن سے روانہ ہونے کے چوتھے دن بعد بھاری

۱؎ طلبا عربی گرامر کے لحاظ سے درست نہیں اسکی بجائے طلبہ ہونا چاہئے لیکن اردو میں عربی املا پر اصرار کرنا مناسب نہیں ہماری رائے اردو میں طلبہ اور طلبا دونوں صحیح ہیں۔ تاجور

سامان پرسر (Purser) کے سپرد کیا کہ پورٹ سعید سے سمندر ہی کے رستہ لندن بھیج دیا جائے۔ پانچویں صبح کو جو اٹھے تو دیکھا کہ جہاز سوئیز کے سامنے لنگر ڈالے ہوئے ہے۔ بمبئی سے رخصت ہونے کے بعد پہلی دفعہ کچھ ہریاول نظر آئی۔ ہوا میں بھی کچھ خنکی تھی۔ جان میں جان آئی چند گھنٹوں کے بعد جہاز نہر سوئیز میں داخل ہُوا۔ نہر سوئیز کا مشرقی کنارہ تو بالکل ریگستانی ہے۔ البتہ مغربی کنارہ پر کہیں کہیں درخت نظر آتے ہیں۔ خاص کر نہر کی چوکیوں کے گرد کچھ نہ کچھ درخت ضرور موجود ہیں۔ جسقدر جہاز پورٹ سعید کی طرف بڑھتا ہے مغربی کنارہ پر سرسبزی کے آثار نظر آنے لگتے ہیں۔ نہر کی نصف لمبائی طے کرنے کے بعد جہاز ایک جھیل میں داخل ہو جاتا ہے جس کے مقابل کے کنارے پر اسماعیلیہ کی سرسبز اور شاداب بندرگاہ نظر آتی ہے۔ جھیل کو طے کر کے پھر نہر کا سلسلہ جاری ہو جاتا ہے یہانتک کہ جہاز پورٹ سعید کی بندرگاہ میں داخل ہو جاتا ہے۔ بندرگاہ کا منظر بہت دلفریب ہے۔ یہاں یورپ کی تھوڑی سی جھلک نظر آنے لگتی ہے۔ لیکن عدن کی مانند پورٹ سعید کا بہترین منظر بھی جہاز ہی سے نظر آتا ہے یہاں بھی جہاز سے اُتر کر انیس کو مایوسی ہی ہوئی۔ اور وہ جلد واپس جہاز پر چلا آیا۔ چند گھنٹے ٹھہرنے کے بعد رات کے گیارہ بجے کے قریب جہاز یہاں سے بھی رخصت ہُوا اور بحیرہ روم میں داخل ہوگیا۔ پورٹ سعید کی بندرگاہ سے لے کر بحیرہ روم کی طرف ایک لمبی بحری فصیل چلی جاتی ہے۔ اس فصیل کے ختم پر فرانسیسی انجنیر لیسپز (Lesseps) کا بُت نصب ہے۔ نہر سوئیز اسی انجنیر کے دماغ کا کرشمہ ہے۔ اس مجسمے کا دایاں ہاتھ نہر سوئیز کیطرف اشارہ کرتے ہوئے ہر گذرنے والے کو لیسپز کے اس شاندار کارنامے کی طرف متوجہ کرتا ہے۔

انیس کے لئے جہاز کے سفر کا یہ آخری حصہ بہت ہی پُر لطف تھا۔ موسم نہایت خوشگوار تھا۔ جہاز ایک بالکل غیر محسوس حرکت کے ساتھ چل رہا تھا۔ پورٹ سعید سے رخصت ہونے کے تیسرے دن بعد یونان کے جزیرے نظر آنے لگے اور سفر کے باقی حصے میں قریب قریب لگاتار یا تو دائیں طرف یونان۔ مانٹی نیگرو یا سرویا کا ساحل پیش نظر رہتا تھا اور یا بائیں طرف اطالیہ کا ساحل۔ اتنے عرصے میں انیس کسی حد تک یورپین زندگی اور مغربی معاشرت سے مانوس ہو چکا تھا۔ اپنے ساتھیوں کے ساتھ ایک طرح کی بے تکلفی سی پیدا ہو گئی تھی۔ دن کا اکثر حصہ ادبی مطالعہ میں اور باقی حصہ کھیل میں مصروف ہوتا تھا۔ چنانچہ پورٹ سعید سے رخصت ہونے کے چار دن بعد جب جہاز نے آسٹریلیا کی واحد اور مشہور بندرگاہ ٹرلیسٹ میں لنگر ڈالدیا اور سفر کا یہ حصہ ختم ہُوا تو انیس کے دل میں کچھ افسردگی ضرور پیدا ہوئی۔ جہاز سے اترنے کی تیاری۔ اجنبی ملکوں میں سے ریل کے سفر کی مشکلات کا اندازہ۔ جہاز کی زندگی کے لطف کی یاد۔ یہ سب باتیں انیس کو پریشان کر رہی تھیں۔ اس کے تین چار ساتھیوں کا ارادہ بھی اسی کی طرح بے توقف لندن پہنچنے کا تھا چنانچہ جہاز کے لنگر ڈالتے ہی یہ سب لوگ جہاز سے اتر کر ریلوے سٹیشن پر پہنچے۔ جہاں سے ایک گھنٹے کے اندر اندر میونک (Munich) کی جانب گاڑی روانہ ہونے والی تھی۔ ریل کے ٹکٹ بمبئی میں ہی خریدے جا چکے تھے۔ اور انیس کو رستے کے بڑے بڑے اسٹیشنوں کے نام زبانی یاد تھے۔ اُسے یہ بھی یاد تھا کہ ٹرلیسٹ سے چلکر صرف میونک گاڑی بدلنی ہوگی اور وہاں سے چلکر فرانکورٹ (Frankfort)۔ کولون (COLOGNE) برسلز (Brussels) ہوتے ہوئے اوسٹنڈ (Ostend) پہنچ جائیں گے۔ جہاں سے جہاز پر سوار ہو کر ڈوور (Dover) اور وہاں سے ریل میں لندن پہنچنا ہوگا۔ چنانچہ ٹرلیسٹ ہی کے اسٹیشن سے انیس اور اس کے ساتھی میونک کی گاڑی میں سوار ہو گئے اور ۵ بجے شام ریل میونک کی جانب روانہ ہوئی۔ ٹرلیسٹ کی سیر کرنے کا تو انیس کو موقعہ ہی نہیں ملا تھا۔ جہاز سے صرف اتنا دیکھا جا سکا تھا کہ سمندر کے کنارے پہاڑ کی تلہٹی میں ایک نہایت خوبصورت شہر واقع ہے جس کی خوشنما عمارتیں اور خوبصورت باغیچے پہاڑ کے ساتھ ساتھ بہت بلندی تک چلے گئے ہیں۔ ریل نے بھی اس پہاڑ کی چڑھائی شروع کی اور دو گھنٹے کے سفر کے بعد ٹرول (Tyrol) کے نہایت خوشنما میدان میں فراٹے بھرنے لگی۔ انیس کا داخلہ ہی یورپ کے اُس حصے میں ہوا جہاں کے دلکش منظر اور دلفریب حسن باقی یورپ کے لئے مقناطیس ہیں۔ جیسے جیسے ریل نہایت تیزی کے ساتھ اس علاقے کو طے کرتی ہوئی خوشنما سے خوشنما سین اُس کی آنکھوں کے سامنے پیش کرتی تھی اور رستے کے چھوٹے چھوٹے خوبصورت اسٹیشنوں پر آسٹریلیا کے حسین ترین چہرے پر اسکی نظر سے گذرتے تھے اُسکا دل رقت سے پگھلتا جاتا تھا اور صانع حقیقی کی خوبیٔ صنعت کی داد اُسکی آنکھوں سے آنسو بن کر ٹپکی نکل رہی تھی۔ انیس کھڑکی کے پاس خاموش بیٹھا اس ہر لحظہ بدلتے ہوئے منظر کا لطف اٹھانے میں محو تھا۔ اس کے ساتھیوں میں سے کوئی برآمدے (Corridor) میں کھڑا تھا۔ کوئی دوسرے مسافروں کے ساتھ اشاروں کی مدد سے سوال و جواب میں مشغول تھا۔ انیس کو حیرت ہو رہی تھی کہ اسقدر خوبصورتی کا نظارہ کرتے ہوئے بھی اسکا دل شگفتہ ہونے کی بجائے ایک قسم کی افسردگی محسوس کر رہا تھا۔ بیشک اس کے دل میں مسرت کی لہریں دوڑ رہی تھیں۔

ؔ جہاز کا وہ افسر جس کی نگرانی میں کھانے پینے کا سامان اور کپڑے و دیگر سامان وغیرہ رہتا ہے۔

اور بعض دفعہ کسی خاص منظر کے یکایک سامنے آجانے سے اس کا دل خوشی سے اُچھل پڑتا تھا لیکن اس تمام مسرت اور خوشی کے ساتھ افسردگی کی بھی ایک ہلکی سی ملاوٹ ضرور تھی۔ کچھ تو اسے یہ خیال تھا کہ اگر یہی منظر میں اپنے عزیزوں کی رفاقت میں دیکھ سکتا تو وہ میری خوشی میں حصہ لیتے اور میں اُن کی خوشی میں شریک ہوتا۔ اور یہ لطف دوبالا ہو جاتا۔ برخلاف اس کے ہر نیا منظر اُسے اپنے عزیزوں کی یاد دلاتا اور جُدائی کے احساس کو تازہ کر رہا تھا۔ کبھی اُسے یہ حسرت ہوتی کہ کاش میرا وطن بھی قدرت کی سحر کاریوں سے اسی طرح مزیّن ہوتا جس طرح یہ ملک ہے اور میرے ہموطنوں کو بھی اسقدر آرام اور بشاشت کی زندگی نصیب ہوتی جیسی اس ملک کے لوگوں کی ہے قدرتی مناظر[1] کی دلفریبی اور حسن انسانی کی بہتات یوں بھی اُس کے دل کو بےچین کر رہی تھی۔ غرض انہی خیالات میں رات ہو گئی۔ انیس اور اس کے ساتھیوں نے کھانے کی گاڑی میں جا کر کھانا کھایا۔ اور پھر تجویزیں ہونے لگیں کہ رات آرام سے گذارنے کی کیا سبیل نکالی جائے۔ یورپ میں اوّل۔ دوئم درجہ کی گاڑیوں میں بھی لیٹنے کی جگہ نہیں ہوتی۔ گاڑیوں کے خانے چھوٹے چھوٹے ہوتے ہیں اور نشستوں کی تقسیم اس طور پر ہوتی ہے کہ مسافر لیٹ نہیں سکتا۔ سونے کی گاڑیاں الگ ہوتی ہیں۔ جن میں بستر۔ منہ ہاتھ دھونے کے سامان وغیرہ کا انتظام ہوتا ہے۔ لیکن اُن کا کرایہ اوّل درجہ کے ٹکٹ کے علاوہ ادا کرنا پڑتا ہے۔ انیس اور اُس کے ساتھی تو سفر ہی دوئم درجہ میں کر رہے تھے۔ جس کمرہ میں اُنہیں جگہ ملی تھی اُس میں جوں توں کر کے رات گذار دی۔ لیکن تمام وقت بدمزگی اور تکلیف میں کٹا۔ رات بھر میں کئی دفعہ ٹکٹوں کا معائنہ ہوا۔ اور چونکہ انیس اور اس کے ہمراہیوں میں سے کسی کو بھی جرمن زبان سے واقفیت نہ تھی۔ اس لئے اُنہیں ہر معائنے کے بعد تشویش اور پریشانی ہونے لگتی کہ کہیں ٹکٹ کا غلط جزو کاٹ کر نہ لے گیا ہو۔ خدا خدا کر کے صبح ہوئی اور گاڑی میونک پہونچی۔ یہ شہر۔ لویریا (Bavaria) کی حکومت کا دارالسلطنت تھا اور اپنی یونیورسٹی فنون لطیفہ کے عجائبات کے مجموعوں اور جَو کی شراب (Beer) کی وجہ سے مشہور تھا لیکن انیس کو چلتی گاڑی میں سے صرف بڑی بڑی عمارتوں کی کھڑکیاں ہی نظر آتی تھیں۔ کہیں کہیں ایک لحظے کے لئے کسی بازار کا نظارہ بھی سامنے آجاتا تھا۔ اگرچہ چھ بجے صبح کا وقت ایک یورپین شہر میں رات کا ہی حصہ سمجھا جاتا ہے لیکن اُسوقت بھی بازاروں میں بجلی کی ٹریم گاڑیاں چل رہی تھیں۔ دکانیں ابھی بند تھیں۔ بازاروں اور عمارتوں کی ظاہری حالت سے معلوم ہوتا تھا کہ شہر بہت صاف ستھرا ہے۔ میونک کے ریلوے اسٹیشن کی عمارت نہایت عالیشان تھی۔ لیکن انیس کو یہ دیکھ کر بہت حیرت ہوئی کہ اتنے بڑے اسٹیشن پر بھی پلیٹ فارم بالکل سطح زمین کے برابر ہیں اور گاڑی میں سے اُترنے چڑھنے کے لئے کوئی سہولت نہیں پہونچائی گئی۔ لبعد میں اُسے معلوم ہُوا کہ انگلستان سے باہر برّاعظم کے اکثر ملکوں میں یہی حالت ہے۔

میونک پہونچ کر انیس اور اس کے ساتھیوں نے گاڑی بدلی اور اوسٹنڈ جانے والی گاڑی میں بیٹھ گئے۔ آدھ گھنٹے کے بعد گاڑی روانہ ہوئی اور تمام دن جرمنی کے زرخیز اور شاداب و سرسبز علاقوں میں سے گذرتی ہوئی شام کے ۸ بجے بلجیم کے دارالسلطنت برسلز میں پہنچی۔ آدھ گھنٹے کے وقفے کے بعد یہاں سے چلکر آدھی رات کے قریب اوسٹنڈ کی بندرگاہ پر عین جہاز کے سامنے جا کھڑی ہوئی۔ اس دن کا سفر نہایت پُرلطف رہا۔ خاص کر تیسرے پہر کا حصہ جب گاڑی کئی میل تک دریائی رائین (Rhine) کے کنارے کنارے چلتی گئی۔ یہ دریا جرمنی کا سب سے مشہور دریا ہے۔ سوئٹزرلینڈ کے پہاڑوں سے نکل کر جرمنی کے میدانوں کو سیراب کرتا ہُوا ہالینڈ میں جا پہنچتا ہے۔ یہاں اسکی کئی شاخیں ہو جاتی ہیں اور تمام شاخیں مختلف مقامات پر بحیرہ شمال میں جا گرتی ہیں۔ دریا کا وہ حصہ جو مائنز (Mainz) اور کولون (Cologne) کے درمیان ہے جہاں سے انیس کی گاڑی گذری نہایت خوبصورت اور پُررونق ہے۔ مائنز۔ کوبلینٹز (Coblentz) بون (Bonn) اور کولون جیسے مشہور اور پُررونق شہر اُس کے کنارے پر آباد ہیں۔ اس کے کناروں کی چھوٹی چھوٹی پہاڑیاں انگور کے باغوں سے لدی ہوئی ہیں۔ ہر چند میل کے فاصلے پر پُرانے زمانے کے جرمن سرداروں کے قلعے اور محلات نظر آتے ہیں۔ جن میں سے سب سے خوبصورت شٹولزینفیلس (Stolzenfels.) کا محل ہے۔ کوبلینٹز کے قریب جہاں دریائے ——— رائین میں آکر گرتا ہے دونوں کے مقام اتصال (جہاں دونوں آکر ملتے ہیں) پر قیصر جرمنی کی ایک بہت عالیشان یادگار بنی ہوئی ہے۔ کوبلینٹز سے آگے جرمنی کی مشہور یونیورسٹی بون (Bonn) بھی عین لبِ دریا واقع ہے اور اس کے خوشنما باغیچے ریل سے نظر آتے ہیں۔ بون سے گذر کر چند منٹ کے اندر کولون کی عالیشان عمارتوں کے برج اور کلس نظر آنے لگتے ہیں جن میں سے کولون کے مشہور عالم گرجے کے بہت بلند کلس نہایت غرور کے ساتھ آسماں سے سرگوشیاں کرتے نظر آتے ہیں۔ شہر کے قریب پہنچ کر دریائے رائین پر قیصر ولیم پل کی حیرت میں ڈال دینے والی محرابیں نظر آنے لگتی ہیں۔ اس پُل کی چوڑائی کم سے کم اسّی فیٹ ہوگی۔

[1] مناظر کی جمع۔ سین اور سینریاں۔

دنیا کی اسٹیج پر حضرت انسان کا ایکٹ

ذیل کا مضمون ان نظریات کا لب لباب ہے جو میں نے طبیعات کی مختلف کتابوں میں پڑھے۔ اس کے علاوہ میں نے مشہور سائنسدانوں کے اُن مضامین میں سے بھی فائدہ اُٹھایا ہے جو وقتاً فوقتاً امریکہ اور انگلستان کے رسالوں میں شائع ہوتے رہتے ہیں۔ چنانچہ کائنات عالم کے متعلق میں نے جو خیالات ظاہر کئے ہیں اُن کی بنیاد کیمبرج یونیورسٹی کے پروفیسر آرتھر ایس اڈنگٹن کے ایک مضمون پر ہے۔ جو اوبزرور نیویارک میں شائع ہوا۔ اسی طرح ڈاکٹر جے۔ ایچ جینز سیکرٹری رائل سوسائٹی آف آرٹس لندن کی وہ دلچسپ اور پُر مغز تقریر بھی میرے پیش نظر ہے جو اُنہوں نے سوسائٹی مذکور کے ایک اجلاس میں کی اور جس میں اُنہوں نے ظاہر کیا کہ نوع انسان کا مستقبل ماضی سے زیادہ شاندار ہے۔

دنیا کی پیدائش سے پہلے کا ذکر ہے کہ سورج کے ساتھ ایک بڑا سیارہ ٹکرا گیا۔ نتیجہ یہ ہوا کہ زہرہ۔ مریخ اور چند دوسرے سیارے سورج سے جُدا ہو گئے۔ مگر یہ سب سیارے زمین سمیت سورج پر ایسے قربان ہوئے کہ آجتک اُس کے حسن و جمال کے اشتیاق میں اس کے اردگرد گھوم رہے ہیں اور خدا جانتا ہے کہ کب تک اسی طرح یہ گھومتے رہیں گے۔

زمین جس وقت سورج سے جدا ہوئی تو یہ لاوا گندھک اور دوسری جلتی ہوئی اور گرم چیزوں کا ایک گولا تھی۔ اُس وقت اُس میں ایک جاندار ہستی بھی موجود نہ تھی۔ اُس کے ہوتے ہوتے کروڑوں برس گذر گئے۔ اس کے سرد ہونے سے پانی کی بھاپ جو پُرانے زمانے سے سطح زمین پر موجود تھی اب بارش بن بنکر برس پڑی اور سطح زمین کے بیرونی لاوے اور گندھک کو جا کر چٹانوں پہاڑوں اور پہاڑیوں میں تبدیل کر دیا بعد ازاں یہ پانی بحر الکاہل میں یا زمین کے اُن نچلے مقامات میں جو زمین کے سرد ہو کر سکڑنے کی وجہ سے پیدا ہو گئے تھے جمع ہو گیا اور اس طرح سے سمندر دریا اور جھیلیں وغیرہ بن گئیں۔

رفتہ رفتہ زمین پر درخت اُگ آئے۔ گھاس پیدا ہوئی۔ دریا اور چشمے بہ نکلے بلند پہاڑوں کی چوٹیاں برف سے ڈھکی گئیں۔ ٹھنڈی اور پُر لطف ہوائیں چلنے لگیں۔ مدتوں زمین کی یہی حالت رہی کہ بہار آتی غنچے چٹکتے درخت جھومتے سبزہ لہلہاتا میوے پکتے۔ ڈالیاں اُن کے بوجھ سے جھک جاتیں مگر اُن سے لطف اُٹھانے والا کوئی نہ تھا۔ میوے پک کر گر جاتے۔ بہار آتی اور چلی جاتی۔ پھول کھلتے اور مرجھا جاتے۔ لیکن زمین انسان سے خالی تھی۔ مدتوں بعد میں جانور پیدا ہوئے۔ وہ موجودہ جانوروں سے تقریباً مختلف تھے۔ اُن کی حرکتیں عجیب تھیں۔ اور عادتیں نرالی۔ آج سے تقریباً سات ہزار برس پیشتر کا ذکر ہے کہ انسان دنیا میں پیدا ہوا۔ یہ بالکل ننگا پھرا کرتا تھا۔ پتھر اس کے ہتھیار تھے غار اس کے سونے کے کمرے تھے۔ سبزہ اس کا بستر تھا۔ درختوں کے پھل پتے اس کی خوراک تھے۔ جانوروں کا گوشت اس کی غذا تھی۔ یہ قبیلوں میں رہتا اور جدھر چاہتا چلا جاتا۔ یہ پتھر کا زمانہ تھا۔ زمین کے دوسرے رہنے والوں کی طرح سے یہ ہمیشہ ایک ہی حالت پر نہیں رہا۔ اُس نے اپنے دل و دماغ سے کام لیکر ترقی کرنی شروع کی اُس نے دھات کو پتھروں سے بہتر اور مضبوط سمجھ کر اس کو استعمال کرنا شروع کیا۔ درختوں کے میوے کھانے لگا۔ درختوں کے ریشوں اور ان کی چھال سے اپنا بدن ڈھانپنے لگا۔ اُس نے دھات کے ہتھیار اور برتن بنائے۔ پتھروں سے آگ پیدا کی۔ چھوٹی چھوٹی جھونپڑیاں بنا لیں۔ یہ زمانہ کب شروع ہوا کب ختم ہوا یہ بتانا آسان نہیں۔ اس کو دھات کا زمانہ کہتے ہیں۔

حضرت مسیح کی پیدائش سے چار ہزار برس پیشتر انسان خانہ بدوشی کو چھوڑ کر چھوٹی چھوٹی بستیوں میں آباد ہو گیا۔ اور زراعت کرنے لگا۔ اسکو زمانہ قدیم کہتے ہیں اور یہیں سے تہذیب کی ابتدا ہوئی۔

آہستہ آہستہ ترقی ہوتی رہی چھوٹے چھوٹے گاؤں بڑھ کر شہر بن گئے۔ اور ان پر راجہ حکومت کرنے لگے۔ اُن کی نگرانی میں ایجادیں ہوتی رہیں اس زمانہ میں چونکہ آنے جانے کے راستے مشکل تھے۔ اس لئے قوموں کو ایک دوسرے سے سیکھنے کا موقع کم ملتا تھا۔ چنانچہ اگر دنیا کے ایک حصہ میں انسان مہذب تھا آرام سے زندگی بسر کرتا تھا' دولتمند تھا اونچی اونچی عمارتوں میں رہتا تھا۔ عجیب و غریب ایجادیں کرتا تھا۔ تو دوسری طرف یہ جاہل تھا۔ وحشی تھا۔ نا قابل تھا۔ جھونپڑیوں میں رہتا تھا۔ علم سے واقف نہ تھا اور ایجاد سے نا آشنا۔ اس لئے کوئی ترقی یافتہ قوم کسی وجہ سے تباہ ہو جاتی تھی تو اُس کے ساتھ اس کی تہذیب بھی فنا ہو جاتی تھی

چنانچہ جب مصر و ہندوستان اور چین کے میدانوں میں انسان متمدن اور مہذب تھا۔ اُس وقت یورپ اور امریکہ میں یہ جاہل اور وحشی تھا۔ اور مصر، چین، ہندوستان کی یہ قومیں تباہ ہوئیں تو ان کی تہذیب بھی فنا ہوگئی۔ اس زمانہ کے موجدوں کے خیالات بھی عجیب تھے۔ وہ اپنی ایجادیں کو لوگوں سے پوشیدہ رکھتے۔ اس لئے موجد کے مرنے پر اُس کی ایجاد بھی دنیا سے مٹ جاتی۔ اس زمانہ میں سیاسیات مذہب کے ماتحت تھیں۔ یہ وسطی زمانہ تھا۔

اُنیسویں صدی کے آغاز کے ساتھ زمانہ موجودہ یا زمانہ ایجاد کی ابتدا ہوئی۔ اس زمانہ میں مذہب سیاسیات کے ماتحت ہوگیا۔ اب دنیا کی سٹیج پر انسان کے کمالات کا تماشا دیکھنے والے اُس کے کارناموں پر حیرت کرنے لگے۔ اُس نے اب قدرت کے بیشمار راز بے نقاب کر دیئے ہیں۔ اور جو باتیں زمانہ قدیم میں ناممکن اور محال سمجھی جاتی تھیں۔ وہ اب اُس نے ممکن کر دکھائیں۔ یہ ہوا میں اُڑتا ہے۔ یہ سمندر کے نیچے سفر کرتا ہے۔ اس کے بحری جہاز دن رات سمندر کے پانیوں کو گنگھولتے رہتے ہیں۔ ہوا کو اس کے بے تار کے آلے حرکت میں رکھتے ہیں۔ اونچے اونچے پہاڑوں میں اس نے اپنی ریلوں کے لئے سرنگیں کھود ڈالی ہیں۔ تباہ کن دریاؤں کے نیچے سے اس نے اپنے لئے راستہ بنایا ہے۔ اپنے مقاصد کے لئے اس نے دریاؤں کے راستے بند کر دیئے ہیں اور اُن کے رُخ بدل دیئے ہیں اس کے برقی لیمپ آناً فاناً میلوں تک رات کی تاریکیوں کو دور کر دیتے ہیں اس کی موٹریں چار چار سو میل فی گھنٹہ کی رفتار سے دوڑتی ہیں۔ اُس نے ایسی زہریلی گیسیں ایجاد کی ہیں جو اس کے ہمجنسوں کو دیکھتے دیکھتے ابدی نیند سُلا دیتی ہیں۔ اُس نے اُس بجلی کا جو برسات کی تاریک اور ڈراؤنی راتوں میں آسمان پر چمک کر آن واحد میں غائب ہو جایا کرتی تھی جواب پیدا کیا ہے اور اب وہ غلاموں کی طرح اس کے کام کرتی ہے۔ اس کی موٹروں کو دوڑاتی ہے۔ اُس کے طیاروں کو اُڑاتی ہے۔ اُس کا کھانا پکاتی ہے اُس کے کمروں کا فرش صاف کرتی ہے۔ اُس کے کمروں کو روشن کرتی ہے اور گرمی کے موسم میں اس کے پنکھے چلاتی ہے۔

استوائی خطوں کے جنگلات۔ شمال اور جنوب کے برف سے ڈھکے ہوئے سمندر۔ آتش فشاں پہاڑوں کے دہانے۔ ٹنڈرا کے سرد علاقے افریقہ کے تپتے ہوئے گرم ریگستان۔ بلند پہاڑوں کی چوٹیاں۔ سمندر کی بے تھاہ گہرائیاں بھی اس کی پہنچ سے نہیں بچیں۔

مگر ابھی تک اس کی طبیعت سیر نہیں ہوئی۔ یہ سمجھتا ہے کہ ابھی اُسے دنیا میں بہت کچھ کرنا ہے۔ ابھی قدرت کے بہت سے رازوں کو حل کرنا ہے۔ دنیا کی حالت کو اور زیادہ بہتر بنانا ہے۔ اور اپنی زندگی کو اور بھی زیادہ آرام دہ بنانا ہے۔ ابھی بہت سی باتیں ہیں جو یہ نہیں جانتا۔ اور خدا کی بہت سی دنیائیں ہیں جہاں یہ پہنچ نہیں سکا۔ یہ اپنی آئندہ زندگی کا ایک دلخوش کن خواب دیکھ رہا ہے۔ جبکہ قدرت کے سب پوشیدہ خزانے اس کے ہاتھ میں ہونگے۔ سورج کی وہ طاقت جو آجکل بیفائدہ ضائع ہو رہی ہے اس کے قبضہ میں ہوگی۔ آسمانی بجلی اس کی غلام ہوگی۔ یہ چاند کی کشش سے فائدہ اُٹھائیگا۔ سمندر کی لہروں پر حکومت کریگا۔ چاند کی سیر کریگا۔ مریخ میں فصلیں بوئیگا صبح کو زمین کے طواف کیلئے گھر سے نکلے گا۔ اور شام کو واپس آجائیگا اس کے غبارے ونٹ آیوسٹ سے بھی اونچے اُڑیں گے۔ اس میں زمین کی حرارت استعمال ہوگی۔ دنیا کے بڑے بڑے آبشاروں پر اس کے کارخانے قائم ہو جائیں گے۔ افریقہ کا صحرائے اعظم ایک پرفضا جھیل میں تبدیل کیا جا سکیگا۔ ہوا پر اس کے مکان ہونگے۔ یہ شیشے کے مکانوں میں رہا کریگا۔ اور جنگ و جدل سے اس کو نفرت ہو جائے گی۔ اُس زمانے میں مریخ سے تازہ انگور اور دوسرے میوے کرۂ ارض پر لائے جائیں گے۔ اس زمانہ میں ریلوں۔ جہازوں۔ راکٹوں اور کارخانوں کے شور و غل جذب کرنے والے آلات بنائے جائیں گے۔ اس کے بعد ایک زمانہ آئیگا جب مریخ بھی نسل انسانی سے کرۂ ارض کی طرح آباد ہو جائیگا۔ وہاں بھی نسل انسانی کے لئے جگہ تنگ ہو جائیگی۔ وہاں بھی ہوا میں لٹکنے والے شہر بنائے جائیں گے۔ وہاں بھی یونیورسٹیاں قائم کی جائیں گی۔ وہاں بھی بیشمار کارخانے کھل جائیں گے۔ وہاں بھی انسان نہایت خوشی و خرمی سے دن گذاریگا۔ وہاں کے مضر صحت مقامات کو بھی پُرفضا بنایا جا سکیگا۔ اور اس طرح سے قدرت کے آبادی کے قابل دو کرّے نسل انسانی سے غیر معمولی طور پر بڑھنے لگے گی۔ اور حکومتوں کو مجبور ہو کر ایسے قوانین بنانے پڑیں گے جن کی رو سے کوئی شخص اپنی سو برس کی عمر میں ایک بچے سے زیادہ پیدا نہ کر سکیگا۔ اور وہ بھی اٹھارہ سے تیس برس تک کی عمر میں۔ اس طرح سے زمین اور کرۂ مریخ کی انسانی آبادی کی اوسط ایک سی رہے گی اور لوگ سو سو برس زندہ رہکر نسل انسانی کی فلاح و بہبود میں کوشاں رہیں گے۔ اس زمانہ کے لوگ سوا سو برس کی عمر میں بھی نہایت طاقتور ہوں گے۔ نہ اُن کے چہروں پر جھریاں پڑیں گی۔ نہ اُن کے دانت ٹوٹیں گے اور نہ اُن کے بال سفید ہوں گے۔ اس طرح سے یہ تجربہ کار اور طاقتور بوڑھے اُس زمانہ کی نئی پود کے جوانوں سے نسل انسانی کیلئے

زیادہ کارآمد ثابت ہوں گے۔ اُس زمانہ میں مریخ اور زمین کے درمیان جو خالی جگہ ہے اُس میں ہوا بھر دی جائے گی۔ تاکہ مریخ کا سفر کرنے والوں کو بنائی ہوئی ہوا ساتھ نہ لیجانی پڑے۔ نیز ایسے آلے بھی بنائے جائیں گے جن کے ذریعے سے وہاں کی آواز یہاں پہنچ سکے۔ اس کے بعد ایک اور زمانہ آئیگا جب لاسلکی ہوائی جہاز ریل راکٹ وغیرہ پرانے زمانہ کی دقیانوسی چیزیں سمجھی جائیں گی اور اُن کی اُس زمانہ کی ایجادوں کے سامنے یہی حقیقت ہوگی جو ایک ٹوٹے ہوئے چھکڑے کی زمانہ حاضرہ کے بہترین ہوائی جہاز کے سامنے ہے۔

بعض مذہب پرست انسانوں کا عقیدہ ہے کہ دنیا فنا ہونے کو ہے اور عنقریب قیامت آنے والی ہے۔ مگر سائنس دان کہتے ہیں کہ نہیں ابھی تو دنیا تین دن کا بچہ ہے۔ ابھی اس کو بچپن، لڑکپن، شباب اور بڑھاپا دیکھنا ہے۔ جب تک سورج باقی ہے ہماری دنیا قایم ہے جب سورج فنا ہو جائیگا۔ اُس وقت اگر ہم بناوٹی سورج بنانے میں کامیاب نہ ہوئے تو البتہ دنیا فنا ہو جائیگی اور سورج آج سے دس کھرب برس بعد بھی اسی طرح زمین پر روشن ہوگا جس طرح یہ آج کل ہے۔ اگرچہ اس وقت دن نسبتاً لمبے ہوں گے اور خدا جانے کیا کیا ہوگا۔

اختر سبحانی بیتاب پٹیالوی۔

میراکام

میرا کام یہ ہے کہ میں اپنی زندگی کے اخلاقی۔ مذہبی۔ معاشرتی۔ غرض ہر پہلو سے نہایت عمدہ طور پر بسر کروں۔

میری کوشش یہ ہے کہ اپنا سب سے قیمتی وقت اس طرح بسر کروں کہ اُس کی یاد ہمیشہ باقی رہے۔

میرا کام یہ ہے کہ زندگی کی کشمکش میں جو شخص بھی مجھے زیادہ بوجھ کے تلے دبا ہوا نظر آئے اُسے سہارا دے دوں۔

زندگی کے ہر منٹ اور ہر سیکنڈ مجھے یہ خیال رکھنا چاہئے کہ وہ بڑی قیمتی چیز ہے اور بیکار نہ ہونے پائے۔ میری یہ کوشش ہونی چاہئے کہ میں اپنی تمام طاقت سے دنیا اور دنیا کے لوگوں کو کچھ بن کے دکھاؤں۔

مجھے چاہئے کہ میں فیاض بنوں متحمل مزاج بنوں۔ دور اندیش بنوں۔ مہربان بنوں۔ صابر اور جواں مرد بنوں۔

میری خواہش یہ ہے کہ میرا دل اور دماغ ہمیشہ سچائی قبول کرنے کیلئے تیار رہے اور دنیا کے اچھے اچھے خیالات ہر وقت قبول کروں۔ مجھ سے جہاں تک ہوسکے سچا بنوں

میری نگاہ آنے والے کی طرف ہونی چاہئے۔ نہ کہ گذرے ہوئے کی جانب۔ میری آنکھیں آسمان کی طرف اُٹھنی چاہئیں نہ کہ زمین میں گڑیں۔ مجھے موقعوں سے پورا فائدہ اُٹھانا چاہئے۔ اور ان کی کمی پر ہرگز افسوس نہ کرنا چاہئے۔

میں انسان بنوں گا۔ اس سے پہلے کہ میں وکیل۔ ڈاکٹر یا سوداگر بنوں میرا پیشہ کیسا بھی ہو۔ مجھے کوئی نہ کوئی ایسا کام کرنا ہے۔ جو محض روپیہ جمع کرنے سے زیادہ دنیا کے لئے بہتر اور مفید ہو۔

مجھے اس حقیقت کو اچھی طرح سمجھنا چاہئے۔ کہ انسان اپنے خیالات کو بنانے والا۔ اپنے اخلاق اور عادات کو سانچے میں ڈھالنے والا۔ اپنے حالات اور قسمت کو درست کرنے والا ہے۔ سوچ سمجھ کر اپنی جسمانی قوتوں کا استعمال کرنا میرا کام ہے۔

زندگی کی مصیبتوں کا ہنسی خوشی مقابلہ کرنا میرا کام ہے۔ حالات کیسے ہی مایوس کرنے والے ہوں میں ہمت نہیں ہاروں گا۔ مجھے پورا یقین ہے کہ میں تمام مشکلات پر جو میرے مقصد کے راستہ میں رکاوٹیں پیدا کرتی ہیں پورے طور پر فتح پاؤں گا۔ میرا یہ خیال ہونا چاہئے کہ اپنے فرائض کو وفاداری اور محنت سے انجام دوں۔ زندگی کے لمحوں سے اس طرح جہاں تک ہوسکے اعلےٰ اور عمدہ خدمت لوں۔ جو کام بھی میں ہاتھ میں لوں اُس کو ختم کر کے دم لوں۔ روپے کے ہر معاملے میں پوری دیانتداری سے کام لوں۔ دوستوں کا سچا دوست بنوں۔ اپنے ساتھیوں سے ہمدردی کا برتاؤ کروں۔ جہانتک ہوسکے اُن کی مدد کروں۔ جہاں تک طاقت ہے اس مقصد اعلےٰ کو حاصل کروں کہ میں شریفانہ زندگی بسر کروں۔ اور اپنے شاندار مقاصد زندگی کو وفاداری سے حاصل کرنے کی کوشش کروں گا۔

یہی کام ہے جو مجھے ہر صبح کرنے کو ملتا ہے کہ میں دن بھر اپنی روح کا وفادار رہوں۔ یہ کام کرنے کیلئے میری تمام بہادری اور تمام قوت کی ضرورت ہے۔

"یہی میرا کام ہے اور آج کا دن ہی میرا کام کرنے کا دن ہے۔ کسی کام کو کل کے لئے چھوڑنا غلطی ہے۔

(از۔ او۔ ایس۔ مارڈن)

شادمان نظامی

سزائے موت

مسئلہ ارتقاء نے جہاں قوموں کے خیالات میں اسقدر تبدیلی پیدا کی ہے وہاں (انفرادی حیثیت سے) ہر سوچنے والے انسان کے لئے ایک وسیع میدان عمل استوار کر رکھا ہے۔ ہر وہ انسان جو ترقی کی ایک منزل طے کر لیتا ہے تو بلا لحاظ اس امر کے کہ اُس کا نصب العین کیا ہے اپنی نگاہ دوسری منزل پر گڑی پاتا ہے۔ اور جس مُدعا کے حصُول کو کل اپنی زندگی کا معراج سمجھنا تھا آج اُسے اگر حقارت نہیں تو کم از کم لاپروائی کی نگاہ سے ضرور دیکھتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ ہر شخص کو حریص کہا جا سکتا ہے۔ اس کا لازمی نتیجہ یہ ہے کہ جو اصول آج درست تسلیم کئے جاتے ہیں۔ ممکن ہے کل اُن کو غلط سمجھکر خارج کر دیا جائے اور یہ محض قیاس ہی نہیں بلکہ روزمرّہ کا تجربہ ہے کہ بعض اصول جن کو چند سال پہلے صحیح طور پر بہترین کیا جاتا تھا آج بیکار سمجھکر رو کے گئے ہیں۔ اس سلسلہ میں سزائے موت کے جائز یا ناجائز ہونیکا مسئلہ بھی آجکل متمدن دنیا کے ایک حصّہ کو حیرت میں ڈالے ہوئے ہیں۔

تاریخ عالم اس بات کی شاہد ہیں کہ ابتدائے آفرینش سے لیکر آجتک قتل کی سزا موت ہی تجویز ہوتی رہی ہے ایک وقت تو وہ تھا کہ ایک شخص کے قتل کے عوض بعض اوقات سینکڑوں اشخاص کو موت کے گھاٹ اتارنا مقتول کے وارث صرف جائز ہی نہیں سمجھتے بلکہ اپنی دنیاوی وجاہت کو قائم رکھنے کے لئے بیحد ضروری جانتے ہیں۔ اب چند سال سے بعض لوگ اس خیال کو دنیا کے سامنے پیش کر رہے ہیں کہ سزائے موت جو زمانہ جہالت سے ہم کو وارثتاً پہنچی ہے ناجائز قرار دیکر خارج کر دی جاوے اس خیال کی تائید میں ذیل کی دلیلیں پیش کیجاتی ہیں۔

(۱) یہ کہ سزائے موت جہالت اور بدتہذیبی کے زمانہ کی رسم تھی۔ اس لئے اقوام کو اس سے کنارہ کرنا چاہئے۔

(۲) یہ کہ جب ایک ذی رُوح کو پیدا کرنا انسانی طاقت سے باہر ہے۔ تو انسان کو کسی ذی رُوح کے مارنے کا حق حاصل نہیں ہے۔

(۳) یہ کہ ہر سزا کا منشا اخلاق کی درستی ہے۔ مگر سزائے موت اس منشاء کو پورا نہیں کر سکتی۔ کیونکہ سزا پانیوالا شخص اسی قید سے آزاد ہو جاتا ہے۔

(۴) یہ کہ باوجودیکہ سزائے موت کا قانون جاری ہے مگر دنیا سے قتل ناپید نہیں ہُوا۔

(۵) یہ کہ بعض اوقات قتل ایسے واقعات کے سلسلہ میں ہوتا ہے۔ کہ سزائے موت میں اور جُرم میں کوئی خاص مناسبت نہیں ہوتی۔

(۶) یہ کہ سزائے موت سے مقتول یا اس کے وارثوں کو کوئی فائدہ نہیں پہونچتا۔

یہ سبھی دلائل محض معمولی ہیں اور نیچے لکھی ہوئی سطروں میں ان پر غور کیا گیا ہے۔

(۱) محض اس خیال سے سزائے موت کو بُرا سمجھنا کہ یہ اس وقت کی یادگار ہے جسے ہم زمانۂ جہالت کے نام سے یاد کرتے ہیں۔ کوئی دانائی نہیں ہے ہر ایک اصول کو اس کی اچھائی اور برائی کے لحاظ سے دیکھنا چاہیئے کہ اس اصول کے پیش کرنے والے کی شخصیت کے لحاظ سے فارسی میں اس خیال کی تردید یوں کی گئی ہے

گاہ باشد کہ کودکے ناداں از غلط بر ہدف زند تیرے
گاہ باشد کہ پیر دانشمند بر نیاید درست تدبیرے

اگر محض اسی دلیل پر سزائے موت کی مخالفت منظور ہے کہ یہ جہالت کی یادگار ہے تو باقی وہ تمام عادات جنکا تعلق کھانے پینے اور دوسری اُن ضرورتوں سے ہے جو زمانہ جہالت سے لیکر آج تک برابر انسانی زندگی کے لئے لازمی سمجھی گئی ہیں۔ ان سبکو ایکدم خارج کیوں نہیں کیا جاتا۔ اور کیوں انسان کے لئے ایک بالکل نیا نظام زندگی نہیں بنا لیا جاتا۔

(۲) اس امر سے انکار نہیں کہ ان تمام انسانی کوششوں کے باوجود یہ ناممکن ہے کہ کبھی انسان ان قوانین قدرت کے خلاف جن سے ہر ادنےٰ اور اعلیٰ واقف ہے۔ اپنے جیسے دوسرے انسان کو پیدا کر سکے۔ مگر یہ ناقابلیت اس امر کی کوئی دلیل نہیں ہو سکتی۔ کہ سزائے موت کو ناجائز قرار دیا جاوے۔ قاتل خود ایک ایسی ہستی کو دنیا سے مٹانیکا سبب بنتا ہے جسکو وہ پیدا نہیں کر سکتا۔ اس لئے قاتل اس بات کا حقدار نہیں کہ اس کے حق میں ایک ایسی دلیل پیش کی جاوے جسکی مخالفت خود اُس کے فعل سے ہو رہی ہے۔ دراصل سزائے کے جائز ہونیکی بڑی دلیل یہ بھی کہ جو شخص کسی دوسرے انسان کی زندگی کو وقت سے پہلے ختم کرتا ہے وہ

خود بھی مستحق نہیں کہ اس کے بعد اس دنیا کی دلچسپیوں میں تنہا حصہ لے۔

(۳) یہ درست ہے کہ سزا دینے کا مطلب ملزم کے اخلاق کی درستی بھی ہوتا ہے۔ اس سے زیادہ ہر سزا دینے والے کا خاص مقصد یہ بھی ہوتا ہے کہ دوسروں لوگوں کے اخلاق کو سنوارے اور وہ عبرت حاصل کریں۔ ایک مدرس ایک طالبعلم کو کسی قصور کی بناء پر سزا دیتا ہے تو خواہ وہ طالبعلم اپنی طبیعت کی خامیوں کے سبب اس سزا سے کوئی فائدہ نہ اٹھائے مگر باقی اہل مکتب اس سے ضرور عبرت حاصل کرتے ہیں۔ اور اس جرم کے ارتکاب سے بچتے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ بعض جرائم کے متعلق قانون بنانیوالے اصحاب سزا کو مشتہر کرنا درست اور ضروری قرار دیتے ہیں۔ چنانچہ قرآن کریم میں زناء کی سزا مجمع عام میں بید لگانا تجویز کی گئی ہے۔ اس سے انکار نہیں ہوسکتا کہ ایک شخص کو سزا ملنے سے دوسرے بیشمار اشخاص کا اخلاق سنورتا ہے۔ اور جن لوگوں کو انسانی ذہنیت سے واقفیت ہے وہ اس کی تائید کریں گے۔

(۴) اس بات سے انکار نہیں کیا جاسکتا کہ سزائے موت کے کے باوجود قتل کا جرم دنیا سے ناپید نہیں ہوا۔ اس کی وجہ یہ نہیں کہ سزائے موت سے کچھ اچھے نتیجے نہیں نکلتے بلکہ اس کی وجہ یہ ہے کہ بعض طبیعتیں ایسی ہیں جو اس قسم کی سنگین سزاء ہوتے بھی خوف نہیں کھاتیں یہ بات بالکل ظاہر ہے کہ اگر سزائے موت آج منسوخ کردیجاوے تو قتل کی واردات بڑھ جاویگی۔ آئے دن ہم دیکھتے ہیں کہ جب کبھی قانونی گرفت ڈھیلی ہوجاتی ہے تو جرائم کم ہوجاتے ہیں۔ عدالتوں کے برتاؤ کا اثر جرائم کی کمی یا بیشی پر ایسا نمایاں ہوتا ہے کہ بے شک وشبہ سزا کا اثر عوام کے اخلاق پر نہایت گہرا ہوتا ہے۔ اگر سزائے موت منسوخ کردینے سے انسانی زندگی کی قیمت قاتلوں کی نگاہ میں گاجر مولی سے بھی کم ہوجاویگی اور معمولی سے معمولی بہانہ پر ایک انسان دوسرے انسان کا خون بہانا جائز اور مفید کام تصور کرے گا۔

ان حالتوں میں اگر اس دلیل کو درست تصور کیا جائے تو سزا کا مسئلہ طے ہوجاتا ہے۔ کیونکہ باقی مختلف اقسام کی سزاؤں کے باوجود جو مختلف جرائم کے لئے تجویز کی جاتی ہیں، جرائم دنیا میں بدستور ہورہے ہیں۔ تو اس دلیل کے ماتحت کل سزائیں نادرست اور ناجائز ہونگی۔

(۵) یہ درست ہے کہ بعض اوقات قاتل کا جرم اسقدر سنگین نہیں ہوتا کہ اس کو سزائے موت کا مستوجب قرار دیا جائے۔ مگر اس کے لئے قانون نے گنجائش رکھی ہے اور ہم روزانہ دیکھتے ہیں کہ واقعات وحالات کو مدنظر رکھتے ہوئے بعض اوقات سزائے موت کی بجائے قاتل کو کوئی اور سزا دیجاتی ہے۔

(۶) اگر سزائے موت سے مقتول یا اُس کے وارثوں کو کوئی فائدہ نہیں پہنچتا۔ تو ملزم قید کرنے سے یا کوڑے لگانے سے مشقت کو کس فائدہ کی توقع ہوتی ہے۔ مقتول کے وارثوں سے پوچھو کہ جب وہ قاتل کو زندہ دیکھتے ہیں تو اُن کے دل کی کیفیت کیا ہوتی ہے اور قاتل کو سزائے موت ملتی دیکھکر اُن کے دل کو کیسی تسکین ہوتی ہے۔

ضروری ہے کہ وہ شخص جو سزائے موت کے ناجائز قرار دئے جانے پر متفق ہے اوّل خود کو کسی مقتول کے وارثوں کی حالت میں رکھ کر اُن کے خیالات کا اندازہ لگائے اور پھر اپنی آخری رائے قایم کرے کہ آیا سزائے موت درست ہے یا نہیں۔ دوسروں سے صبر اور معافی کی توقع کرنا آسان ہے مگر حقیقی معنوں میں وہی شخص صبر اور رحم کی تلقین کا مستحق ہے جو خود اس پر عمل کرنے کی ہمت اور طاقت رکھتا ہو۔

واقعات ثابت کرتے ہیں کہ سزائے قتل دنیا میں امن قائم رکھنے کے لئے نہایت ضروری ہے اور کوئی دُور اندیش شخص اس کی مخالفت نہیں کرسکتا۔

عبدالحق ریاض

کنول کا پھول

تجلیاں ہیں تیری زیرِ آب شعلہ فروش کہ آفتاب ہے زیرِ سحاب شعلہ فروش
فروغ نے سے ہے حسنِ شباب شعلہ فروش گہر ہے آب میں رنگِ شراب شعلہ فروش
ہوا میں یا ہے کوئی تو ترانۂ خاموش
فسونِ ماز کا ہے یا فسانۂ خموش
لبِ نسیمِ سحر پر ہے گفتگو تیری کشاں کشاں لیئے پھرتی ہے جستجو تیری
ہزار دل سے ہے بھونرے کو آرزو تیری کہ مست رکھتی ہے صہبائے مشکبو تیری
فضائے آب میں سرمست جام ہے تیرا
شہیدِ لذت شرب مدام ہے تیرا
ترے چراغ پہ پروانہ وار گرتا ہے وفورِ شوق سے بے اختیار گرتا ہے
بلائیں لیتا ہے ہو کر نثار گرتا ہے قریب آکے ترے بار بار گرتا ہے
یہ بیخودی۔ یہ بدنگو تپش یہ حسرتِ شوق
فدا ہے کرنے میں ہر کس بلا کی ہے عشاق

(شاکر میرٹھی)

نسوانی حسد

"روزمیری" بڑی شوقین اور فیشن پر مٹنے والی عورت تھی۔ اُس کے بال خوب سنورے ہوئے۔ لباس نہایت خوبصورت اور ستھرا، حرکتیں نہایت شائستہ، وضع قطع بالکل زمانے کے رسم کے موافق اور عمر کوئی اٹھارہ برس کی تھی گود میں ایک پیارا پیارا، بھولا بھولا، ننھا سا لڑکا۔ شادی کو مشکل سے ابھی دو سال ہونے ہوں گے!

"روزمیری" یوں تو کچھ ایسی خوبصورت نہ تھی لیکن اس میں شک نہیں کہ اپنے شوہر کی بڑی چہیتی بیوی تھی، اور اُس کی طبیعت پر پوری طرح قابو رکھتی تھی شوہر اُس کی مرضی کے خلاف کوئی کام نہیں کرتا تھا۔

روزمیری کو مطالعہ کا بڑا شوق تھا، جدید ادبی کتابوں کا ڈھیر اُس کی میز پر لگا رہتا۔ جس طرح اُس کو مختصر افسانوں سے دلچسپی تھی۔ اُسی طرح اُس کے دماغ میں بھی بہت سی انوکھی باتیں جمع تھیں۔ اس مطالعہ کا اثر یہاں تک ترقی کر گیا تھا کہ وہ ہر وقت خاص طور پر عشق و محبت کے خیالات میں محو رہا کرتی تھی۔

روزمیری کے ہاں مال و دولت کی کمی نہ تھی۔ خدا کا دیا سب کچھ تھا وہ اپنی ضروریات کا سامان پیرس سے خریدا کرتی۔ پھولوں کی بڑی شوقین تھی گلدستے پر گلدستہ خرید خرید کر لاتی اور اپنے گلدان سجاتی۔ کسی قدر فضول خرچ ضرور تھی کبھی بازار میں جیب خالی ہو جاتی اور ضرورت باقی رہتی تو وہ غمگین چہرہ، رنگ اُڑا ہوا اور اُداس واپس ہوتی۔

گلابی جاڑے کی ایک خوشگوار شام کو روزمیری کی موٹر کار پیرس کے صدر بازار میں صبح کی ٹھنڈی ہوا کی طرح آہستہ آہستہ جا رہی تھی، تھوڑی دیر کے بعد پُرانی یادگار چیزوں کی ایک دوکان کے سامنے آکر ٹھیر گئی۔ روزمیری اس دوکان کو بہت پسند کرتی تھی۔ دوکان بھی کچھ یونہی سی تھی۔ سنسان پڑی رہتی۔ کبھی کبھار کوئی گاہک آجاتا۔ دوکاندار کے خاص خریدار صرف روزمیری ہی تھی۔ جس روز وہ دوکان پر آتی دوکاندار خوشی سے پھولا نہ سماتا۔ لوگوں کا خیال تھا کہ وہ روزمیری سے کچھ دلچسپی بھی رکھتا ہے۔ روزمیری آتی تو وہ ہونٹوں میں مسکرا کر اُس کا استقبال کرتا۔ اور ختنی ہرن کی طرح گردن ہلا ہلا کر بیقرار نگاہوں سے اُس کی طرف دیکھ کر اور نظریں چُرا چُرا کر اس طرح کہتا "میڈم! آپ کو معلوم ہے کہ میں اپنی چیزوں سے کس قدر محبت رکھتا ہوں کسی نا قدردان کے ہاتھوں اپنی چیزوں کو بیچنے کی بجائے میں اس بات کو بہتر سمجھتا ہوں کہ وہ ہمیشہ یوں ہی پڑی رہیں!"

روزمیری یہ بات سُن کر فخریہ انداز سے مسکرائی۔ اتنے میں دوکاندار نے ایک خوبصورت، چھوٹی سی صندوقچی پیش کی۔ اس صندوقچی کے ڈھکن پر کسی مشہور نقاش کی بنائی ہوئی ایک خوبصورت تصویر تھی جس میں پھولوں سے لدی ہوئی بوجھی کے سایہ میں مدت کے بچھڑے ہوئے دو عاشق و معشوق گلے ملتے ہوئے دکھائے گئے تھے!

روزمیری تو اس قسم کی خوشنما چیزوں کی شوقین تھی۔ صندوقچی دیکھتے ہی اُس کا ننھا سا دل مچل گیا۔ جب عورت کی صدری پھولوں پر اُس کی نظر پڑی تو بے ساختہ اُس کے منہ سے "آہ! غضب؟!" نکل گیا اور وہ دوکاندار کو ہونٹوں میں مسکراتے ہوئے دیکھ کر بہت شرمائی! ساتھ ہی شوق اور گھبراہٹ کے لہجہ میں اُس کے منہ سے یہ لفظ نکلے "قی... قیمت؟ اس ــ کی قیمت؟"
ایک بڑے نرم لہجہ میں جواب ملا کہ "صرف سو پونڈ!"

اس غیر معمولی قیمت نے تو روزمیری جیسی خرچ کرنے والی عورت کو بھی ایک لمحے کے لئے ٹھٹکے اور سستے کی طرف متوجہ کر لیا۔ اتفاق سے اس وقت اُس کی جیب میں اتنی رقم نہ تھی دوکاندار کو حکم دیا کہ یہ صندوقچی ہمارے لئے محفوظ رکھو۔ دوکاندار نے خوشی سے تعمیل کی۔ بلکہ اُس کے چہرے سے ثابت ہوتا تھا کہ وہ روزمیری کی خاطر عمر بھر کے لئے صندوقچی محفوظ رکھ سکتا ہے۔

روزمیری دوکان سے باہر نکل آئی اور زینے پر کھڑی ہو کر آسمان کی طرف ٹکٹکی باندھ کر کچھ دیکھنے لگی۔ شام کا وقت سردی کا یہ عالم کہ ہوا سینے کے پار ہوئی جاتی تھی۔ مینہ کی جھڑیاں لگی ہوئی تھیں۔ چاروں طرف اندھیرا چھایا ہوا تھا۔ قریب ہی روزمیری کی موٹر کھڑی تھی۔ لیکن وہ موٹر تک نہ گئی۔ کسی خیال میں جوں کی توں حیران کھڑی رہی۔ شاید اُسے نفیس صندوقچی کے شوق نے بے چین کر دیا تھا۔ اور وہ اپنی مایوسی پر افسوس کر رہی تھی۔ تھوڑی دیر میں اُسے اپنے دل میں ایک درد سا معلوم ہوا اور اُس کے چہرے پر اُداسی سی چھا گئی۔ اُس نے ارادہ کیا کہ مکان پر چل کر چاہے بیٹھے

اوران پریشان خیالات سے بچنے کی کوشش کرے۔ لیکن اس ارادے نے اُس کے جسم میں ذرا بھی حرکت پیدا نہ کی!

یکایک اُس کی نگاہ ایک دوشیزہ پر پڑی۔ جو خدا جانے کب سے اُس کے پاس کھڑی تھی! یہ لڑکی بے حد حسین تھی۔ اُس کی بڑی بڑی آنکھوں سے حسرت اور بیکسی ظاہر ہو رہی تھی۔ وہ اپنے ٹھٹھرے ہوئے سُرخ سُرخ نرم نرم ہاتھوں سے کوٹ کا کالر پکڑ کر زور زور سے بھینچ لیتی تھی اور سردی کی وجہ سے اُس کا دانت سے دانت بج رہا تھا۔ جونہی اُس کی آنکھیں روزمیری سے چار ہوئیں نیچے سر کرکے شرمیلے انداز میں کہنے لگی۔

دوشیزہ: "میڈم! کیا آپ مجھے ایک پیالی چائے کی قیمت عنایت کرکے شکریے کا موقع دیں گی؟"

روزمیری (چونک کر) ایک پیالی چائے کی قیمت! تو کیا تمہارے پاس اتنا بھی؟

دوشیزہ۔ نہیں جناب کچھ نہیں

روزمیری سکتے میں آگئی۔ دل میں کہتی اے خدا دنیا میں ایسے انسان بھی ہیں جن کے پاس اتنا بھی نہیں کہ چائے کی ایک پیالی خرید سکیں!

اب وہ اپنی ساری پریشانی بھول گئی۔ اور اس لڑکی کی مدد کے لئے تیار ہو گئی۔ پھر آپ ہی آپ سوچنے لگی کہ یہ تو ایک عجیب کرشمہ ہوگا جب میں یہ باتیں ناولوں میں دیکھا کرتی تھی تو مجھے کچھ یوں ہی سا یقین آتا تھا۔ خیر۔ اچھی بات ہے اب میں اس لڑکی کو اپنی کوٹھی پر لیجاؤں گی۔ اور اس کی پرورش کرونگی۔ جب تو میرا نام کہ اس لڑکی کو یہ ثابت کر دکھاؤں کہ دنیا واقعی ایک عجیب مقام ہے۔ یہاں انوکھی سے باتیں ہوتی رہتی ہیں۔ اور ہو سکتی ہے حقیقت میں دیو مالا کے قصے نہیں بلکہ واقعات ہیں۔ یہ سوچ کر روزمیری بھکارن لڑکی سے بولی۔

روزمیری: "چلو کوٹھی پر میرے ساتھ چائے پینا۔

بھکارن یہ الفاظ سُن چونک پڑی اور ٹھٹک کر پیچھے ہٹ گئی!۔

روزمیری (بھکارن کی طرف قدم بڑھا کر) گھبراؤ نہیں۔ میں مذاق نہیں کرتی۔ آؤ میری موٹر میں بیٹھ جاؤ۔ مکان پر چل کر چائے پئیں گے۔

بھکارن دوشیزہ ابھی سوچ بچار ہی میں تھی کہ روزمیری نے اُس کا ہاتھ پکڑ کر موٹر میں بٹھایا اور اپنی کوٹھی میں لے آئی۔ لباس کے کمرے میں لے گئی اور اُس کا بھیگا کوٹ اور ٹوپی اُتارنے میں خود ہاتھ لگایا۔ پھر گول کمرے میں لاکر آرام کرسی پر بٹھا دیا۔ اور چائے مانگی۔

چائے آئی۔ روزمیری نے بڑی محبت سے لڑکی کو کیک۔ خطائی، ڈبل اٹھا اٹھا کر دی اور خود بے پروائی سے سگرٹ کا کش لے لیکر ادھر اُدھر دیکھنے لگی تاکہ لڑکی شرم نہ کرے اور اچھی طرح چائے پی لے۔ اس تھوڑے سے ناشتے سے لڑکی کا چہرہ بہت کچھ بدل گیا۔ اُداسی دُور ہو گئی۔ اور وہ نہایت خوش خوش نظر آنے لگی۔

روزمیری اپنی مایوسی کو بالکل بھول چکی تھی۔ اور اب وہ معمول کے مطابق ہنسی خوشی بیٹھی تھی۔ ابھی وہ لڑکی کی پوری حالت سُننے نہ پائی تھی کہ اُس کا شوہر کمرہ میں داخل ہوا۔ اور اس خوبصورت بھکارن کو دیکھ کر روزمیری سے کہنے لگا۔

شوہر "روزمیری! یہ اجنبی لڑکی کون ہے؟ یہ کیا معاملہ ہے؟؟

روزمیری (قہقہہ لگا کر) میں نے اسے سڑک پر پایا ہے۔ یہ مجھے رستے میں ملی میں اسے موٹر پر سوار کرکے گھر لے آئی۔ میں اسے پالوں گی۔

شوہر۔ یہ۔ یہ۔ اتنی حسین دوشیزہ! ہرگز نہیں۔ کبھی نہیں۔ ایسا نہیں ہو سکتا۔

روزمیری (کچھ شرمائی ہوئی سی) حسین! کیا واقعی تمہارا یہی خیال ہے۔

شوہر۔ ہاں حسین، بلا کی حسین ہے! میں تو تمہارے کمرہ میں داخل ہوتے ہی اُس کے حُسن سے ——— روزمیری! یہ تمہارے لئے۔ یہ غیر معمولی نعمت ایک خطرہ ہے! تم بلاشبہ ایک آستین کا سانپ پال رہی ہو۔

یہ سُن کر روزمیری کی آنکھیں کھلی کی کھلی رہ گئیں۔ اور اُس کے سینے میں نسوانی حسد کا ایک طوفان برپا ہو گیا۔ مگر اُس نے یہ بات گوارا نہ کی کہ ایک نیم عاشقانہ جذبے کی خاطر اپنے شوہر کی محبت چھوڑ دے اُٹھی، جیب سے چند نوٹ نکالے۔ اور لڑکی کی نذر کئے۔ پھر آہستہ سے اُس کے کان میں کچھ کہکر رخصت کر دیا۔

جب ذرا دم میں دم آیا تو ایک نفیس اور جدید وضع کے لباس میں شوہر سے ملاقات کی تاکہ اُس کے دل سے لڑکی کے حُسن کا اثر مٹ جائے۔ شوہر تو اُس کا عاشق تھا ہی صورت دیکھتے ہی اجنبی حسین لڑکی کو بالکل بھول گیا۔

جونہی روزمیری کو یقین ہوا کہ وہ پھر اپنے شوہر کی محبت کی واحد مالک بن گئی ہے اُسے اپنی نقشین صندوقچی یاد آئی اور شوہر سے کہنے لگی۔

روزمیری: "آہ! میری نقشین صندوقچی! چلو سیر کو چلیں۔ واپسی پر بازار بھی جانا ہے۔ میں سو پونڈ کی ایک صندوقچی کیلئے فرمائش کر آئی ہوں سچ کہتی ہوں اُس پر ایک بڑی خوبصورت تصویر ہے۔" !!

(سکین رام پوری۔ لاہور)

عورت اور جوگی

دور ہر شہر اور بستی سے   دور ہنگامہ زارِ ہستی سے
عیشِ فانی کی دسترس سے دور   زندگانی کی ہر ہوس سے دور
غم کے پیچیدہ دام سے آزاد   کاہشِ صبح و شام سے آزاد
جام سے اور جم سے بے پروا   معنیٔ بیش و کم سے بے پروا
شورشِ این و آں سے بیگانہ   منعماتِ جہاں سے بیگانہ

کوہ کی اک اُداس وادی میں   آبشاروں کے پاس وادی میں
رہتا تھا ایک تارکُ الدنیا   پارسا نیک تارکُ الدنیا
رازِ عرفانِ عشق کا جویا   رختِ و سامانِ عشق کا جویا
رات دن بندگی و ذکر میں محو
آخرت اور اُس کی فکر میں محو

ایک دن ایک نوجواں عورت   دلربا شوخیوں کی جاں عورت
زندگانی کی آگ دل میں لئے   نوجوانی کی آگ دل میں لئے
مرغزاروں کی سیر کرتی ہوئی   آبشاروں کی سیر کرتی ہوئی
تنگ وادی کے پاس جا پہنچی
یعنی لے کر اسے قضا پہنچی

کون عورت! وہ پاسبانِ بہار   پیکرِ آب و گِل میں جانِ بہار
متحرک شراب خانۂ حُسن   یعنی اِک مستقل فسانۂ حُسن
گُل بدن گُل عذار کہیئے جسے   شانِ پروردگار کہیئے جسے
کلکِ قدرت کی خوشنما تصویر   حُسن کے آسماں کا مہرِ منیر
عشق کے سوز و التہاب کی روح   موت کی زندگی شباب کی روح
حُسن بالذات کی جھلک عورت
عورت اور سر سے پاؤں تک عورت

کوہ کی دیدہ زیب وادی میں   خوشنما دلفریب وادی میں
وہ جہاں آبشار گاتے ہیں   چشمے مِل کر ملہار گاتے ہیں
ہے چٹانوں پہ جال پھولوں کا   قرمزی۔ زرد۔ لال پھولوں کا
زیبِ ہر شاہراہ پھول ہی پھول   تا بہ حدِّ نگاہ پھول ہی پھول
ہیں جہاں سبز جھاڑیاں گل پوش   پیش و پس سب پہاڑیاں گل پوش
صنعتِ کردگار پھولوں میں   بس گئی ہے بہار پھولوں میں
اب وہاں پردہ مستِ ذات کہاں   محوِ حسنِ تجلّیات کہاں
ہاں مگر ایک مرد رہتا ہے   کوہ پر ایک مرد رہتا ہے
مرد کی دل نواز ہے عورت   مونس و چارہ ساز ہے عورت
اور وہ پرہیزگار غائب ہے
شیخِ شب زندہ دار غائب ہے

(فاخر ہریانوی بی۔اے)

ادیب آقا ہے یا غلام؟

(استاذ سلامہ موسیٰ مصری کے گراں مایہ خیالات)

جب یونانیوں کی آزادی چھین گئی اور رومی ان پر حکمران ہو گئے تو ادب آقائی کے درجہ سے گر کر غلامی کے درجے میں آگیا۔ یونانی ادبا فلسفہ کے مالک اور ڈرامے کے بانی ہونے کی وجہ سے اپنی قوم کو اس نظر سے دیکھتے تھے جس نظر سے بادشاہ اپنی رعایا کو دیکھتا ہے۔ وہ ہمیشہ قوم کی اصلاح کے طریقے نکالنے، اسکی حکومتوں کو منظم کرنے، اس کے اخلاق کی سطح کو بلند کرنے اور اُسے ترقی کیطرف لیجانے کی فکر میں لگے رہتے تھے۔ تم ارسطو یا افلاطون کا مطالعہ کرو تو ان میں سے ہر ایک کو ایک بادشاہ کی طرح اپنی رعیت کی دشواریوں کو دُور کرنے کی فکر میں مبتلا پاؤگے جو دل سے چاہتا ہے کہ ان کے اخلاق وسیع اور ان کی حکومتیں بانظم ہو جائیں۔ تم ان میں سے کسی کو بھی ایک غلام کی طرح نہیں پاؤگے جو عوام سے چاپلوسی کرے۔ قوم کو دہوکے میں رکھے اور ان کی برائیوں کو بھی اچھا بتائے

بہرحال جب رومی یونانیوں پر غالب آگئے اور انہیں یونانی زبان سیکھنے اور اس میں مہارت حاصل کرنے کی ضرورت محسوس ہوئی اور بچوں کو اس کی تعلیم دینے کی خواہشات بڑھنے لگیں تو رومی اس مقصد کے لئے کثرت سے یونانی غلام خرید لے اور اپنی اولاد کو ان کے سپرد کرنے لگے۔ اور اس طرح یونانی اہل ادب غلام ہو کر رومی بچوں کے استاد بن گئے۔ یہ شاگرد اپنے معلم کی باتیں ضرور مانتے اور اس کی نصیحتیں بھی قبول کرتے لیکن اسی طرح جس طرح ہم اپنے ڈرائیور کی بات مان لیتے ہیں۔ جب وہ ہم کو قریب ترین راستہ بتاتا ہے یا جسطرح ہم اس قلی کی رائے پر چلتے ہیں جو ہمارا اسباب اٹھائے ہمکو ریل پر سوار کرانے جاتا ہے۔ ظاہر ہے کہ ہم دونوں کی وقتی اطاعت اور ایک قسم کی تابعداری کرتے ہیں۔ لیکن ہمارا ضمیر کہتا رہتا ہے کہ ہم ان دونوں سے بالا اور برتر ہیں۔ اس حالت کا اثر لازمی طور پر معلم پر بھی ہوا اور اس نے محسوس کیا کہ اپنے آقاؤں کے مقابلہ میں تعلیم دینے اور بات بات پر ٹوکنے والا استاد ہونیکے بجائے ایک خوش باش مصاحب ہونا زیادہ ضروری ہے۔

پھر از منہ وسطی کا دور آیا جس میں عرب اور اہل فرنگ مذہبی پیشوا خلیفہ یا پوپ کی خود مختار نظام حکومت کے لحاظ سے اور ادب کی یکرنگی کے اعتبار سے تقریباً برابر ہو گئے۔ اور دونوں کا ادب مذہبی اور دنیاوی آقاؤں کی خوشامد میں آقائی رتبے سے گر کر غلامی کے درجے میں آگیا۔ علاوہ بریں اس دور میں ادب اور دو بڑی قسموں میں تقسیم ہو گیا۔ ایک قسم دینی ضروریات کو پورا کرتا۔ دوسری ضروریات زندگی۔

ادب کا جو حصہ ضروریات زندگی کے لئے وقف تھا وہ آقائی کے اس بلند مرتبہ تک نہیں پہونچ سکا۔ جو قدیم یونانی اہل قلم کا مرکز تھا بلکہ غلامی کے اس درجہ میں اُتر آیا جس میں یونانی ادیب غلام ہو کر اُتر آتے تھے۔

بنی عباس کے زمانے میں جسطرح بغداد میں تمکو غلاموں کی ایک بڑی جماعت ملیگی جس نے ادب حاصل کر کے اپنی ساری عمر اپنے آقاؤں کی مدح گوئی میں صرف کر دی۔ اسی طرح انہیں ایام میں اٹلی میں بھی تم ہر امیر کے پاس ایک شاعر کو اس کی مدح سرائی میں رطب اللسان پاؤگے۔ غرضکہ از منہ وسطی میں مشرق اور مغرب کے تمام اہل ادب اسی رنگ پر جا رہے تھے اور اس خیال نے اعتقاد کی جگہ لے لی تھی کہ ان کی سب سے بڑی مہم اور ان کا سب سے اہم فرض دولتمندوں اور اپنے آقاؤں کو خوش کرنے تک محدود ہے۔ یہاں تک کہ وہ وقت آگیا کہ ادب امرا کے اثر سے ایک حد تک آزاد ہو گیا اور اہل ادب کو امرا کی مدح سرائی سے نجات ملی۔ لیکن اب انہوں نے اپنے ناظرین کو محظوظ اور مسرور کرنا اپنا فرض قرار دے لیا اور اس طرح حریری اور ہمدانی جیسے خوش گویوں اور نقالوں کی خاصی تعداد پیدا ہو گئی۔ جس نے الفاظ کے ذریعے سے وہی کر دکھایا جو جلسوں میں لوگوں کا دل بہلانے اور ہنسانے کے لئے بہروپئے اور بھانڈ اپنے حرکات کے ذریعہ سے کرتے ہیں۔

بعد ازاں یورپ کی بیداری اور ترقی کا دور آیا اور اس نے قدیم ادب کے ناخداؤں کو زندہ کرنا اور دامانِ ادب کو غلامی کے گرد و غبار سے پاک کرنا شروع کیا۔ آخر میں یورپ کے جدید ادب میں آقائی کا رنگ جھلکنے لگا۔ اس دور کا انشا پرداز تمکو ہنسانے کے لئے تمہارے

سامنے نہ چوپائے کا روپ بھر کر آسکتا ہے اور نہ تمکو خوش کرنے کیواسطے بھانڈپن دکھا سکتا ہے۔ بلکہ وہ تمکو اس حقیقی دنیا کے ایسے سبقوں سے آشنا کرتا ہے جن سے تمکو لبا اوقات دردمند بنا دیتا ہے اور تم اسی دردمندی میں لذت اور مزا محسوس کرتے ہو کیونکہ تمکو اس طرح دردمند بنانے سے انشاپرداز کا مقصد محض تمہیں صاحب بصیرت اور روشن ضمیر بنانا ہے جس سے تمہارے لئے اس دنیا میں احتیاط کے ساتھ ترقی کرنیکا دائرہ وسیع ہوجائے۔

مگر ہم میں ابتک اہل قلم کا ایک ایسا طبقہ موجود ہے جو بہ نسبت آقاؤں کے غلاموں کے مرکز سے زیادہ قریب ہے جس کی ساری ہمت شوخی نقالی اور گرانڈیل الفاظ تک محدود ہے۔ میں بعض خاص حالات میں لفظی آرائش اور مرغوب کر دینے والی صنعت ترصیع کے فائدوں سے انکار نہیں کرتا۔ اگرچہ میں خوب جانتا ہوں کہ سونے کا کٹورا سادہ ہی بھلا معلوم ہوتا ہے۔ ایک حسین وجمیل ہستی لباس سے عریاں اور برہنہ ہو کر ہی زیادہ جاذب نظر اور فتنہ انگیز دکھائی پڑتی ہے۔ اور ریشمی کپڑا نقش ونگار کے بغیر ہی زیادہ خوبصورت نظر آتا ہے۔ لیکن سونا اور ریشم ہر شخص کو دستیاب نہیں ہوسکتا اور سینکڑوں عورتوں میں شاید ہی ایک دو کے جسم کی بناوٹ ایسی ہو جو عریانی میں زیادہ حسین وجمیل معلوم ہوتی ہوں۔ چونکہ کوئی سادہ چیز اسوقت تک بھلی نہیں معلوم ہوتی جبتک کہ وہ کسی مادہ سے اعلیٰ طرز کی نہ بنی ہو۔ اور لغت ہماری ہر ضرورت کو سادہ اور حسین مادہ سے اعلیٰ طرز پر پورا نہیں کرسکتا اس لئے ہمکو کبھی لفظی نقش ونگار اور اچھوتا اسلوب بیان اختیار کرنے کی ضرورت ہوتی ہے۔ لیکن میں اس کا بالکل مخالف ہوں کہ انشاپرداز کی ساری ہمت صرف الفاظ کی ندرت، عبارت کی شگفتگی اور طرز بیان کی شوخی پر صرف ہوجائے۔ اور وہ اپنے ناظرین کے سامنے ایک غلام کے رتبے میں رہجائے جو صرف ان کو مسرور کرنے اور راضی رکھنے پر قناعت کرلے۔ میری تمنا ہے کہ ہر ادیب اپنے کو آقائی کے درجہ میں رکھے اور اپنے ناظرین کا فائدہ، اُن کی تعلیم اور اُن کی رہنمائی اسکو مدنظر رہے۔ مگر یہ رتبہ وہی ادیب حاصل کرسکتا ہے جو عالم موجودات میں اپنی بصیرت اور بصارت کو کافی وسعت دے۔ اور وسعت نظر اسی انشاپرداز کو نصیب ہوسکتی ہے جو انسان اور اس کی تاریخ، اس کی اصلیت، اس کے حاضر و مستقبل، اس کے رسم ورواج، اس کی جہالتوں، اس کے قصے کہانیوں، اس کے علوم و ادب اور اس کی تہذیب و تمدن کا مسلسل اور گہرا مطالعہ کرے۔

یہی چیزیں ایک ادیب کا موضوع ہیں اور ہر ادیب پر لازم ہے کہ خود ان کی تعلیم حاصل کرے اور اپنے ناظرین کے سامنے انہی کو پیش کرے۔ تاکہ اُس کا ادب غلاموں کے ادب سے ممتاز ہو کر آقاؤں کا لیٹریچر ہو جائے۔

ضیاء درانی
ایچ۔اے

غزل

پا کے تقدیر نے تدبیر کا قائل مجھکو — سو بلاؤں کی بلا سونپ دیا دل مجھکو
حسن خود عشق کی سرکار سے پاتا ہی فروغ — کون کہتا ہے درِ حسن کا سائل مجھکو
حسن کی پہلی نظر ہوتی ہے کیا ہوشربا — کر دیا عشق کے انجام سے غافل مجھکو
ہو نہ جائے کہیں بے لطف یہ ہنگامۂ یاس — آہ کس وقت نظر آئی ہے منزل مجھکو
آج شمشیر ہے شمشیر خوشا لذتِ قتل — آج قاتل بھی نظر آتا ہے قاتل مجھکو
داغ حسرت کو رسا دل سے مٹاؤں کیونکر
ہے یہی گلشن امید کا حاصل مجھکو

رسا جالندھری

امریکہ کے اسکول اور یونیورسٹیاں

بچوں کے لئے جدید اسلوبِ تربیت اور ان کی تعلیم کے نئے نئے طریقے نکالنے میں ان دنوں امریکہ دنیا کی تمام قوموں سے آگے ہے۔ آجکل کوئی قوم اپنی تعلیم پر اتنا خرچ نہیں کر رہی ہے جتنا امریکہ اپنی تعلیم پر صرف کرتا ہے۔ وہاں شاذ ہی کوئی دولتمند ہوگا جو مرتے وقت اپنی دولت کا بڑا حصہ کسی یونیورسٹی کو وقف نہ کر جاتا ہو۔ جس طرح ہمارے ہاں کے بعض دولتمند اپنی کچھ جائیداد کسی مسجد یا مندر میں وقف کر جاتے ہیں۔

اسوقت ریاستہائے متحدہ امریکہ میں ۳۰۰۰۰۰ لاکھ مدرسے ہیں۔ جن میں ۳۳ ۸۰۵۹ معلم کام کرتے ہیں اور معلموں کی اس بڑی تعداد میں سے ۷، ۴۱ ۲۸ ۶ عورتیں ہیں اور باقی صرف ۱۷۷ ۵۱۶ مرد ہیں۔ تعلیم پیشہ عورتوں کی اس عظیم الشان تعداد ہی سے ناظرین اپنے ملک کی علمی پستی اور امریکہ کی عظمت اور ترقی کی اصلی وجہ معلوم کر سکتے ہیں۔ یہ ظاہر ہے کہ تمام ملکوں میں طلبا کی سب سے بڑی تعداد ابتدائی مدرسوں ہی میں ہوتی ہے جو عموماً کم عمر بچے یا لڑکے ہی ہوتے ہیں۔ اور عورت فطری طور پر مائل ہونے کی وجہ سے بچوں سے محبت کرتی ہے، ان کے ساتھ نرمی کے ساتھ پیش آتی ہے اور ان کے بچپن کی شرارتوں اور شوخیوں سے درگذر کرتی ہے۔ لیکن افسوس کہ ہمارے بچے موجودہ پردے کی وجہ سے عورتوں کی شفقت آمیز تعلیم سے محروم ہیں۔

یوں تو ریاستہائے متحدہ امریکہ کے تمام ممالک اپنی تعلیم اور اس کے انتظام میں بذاتِ خود مستقل اور آزاد ہیں لیکن چند قانون ریاستہائے متحدہ امریکہ کی ہر ریاست میں یکساں طور پر جاری ہے۔ مثلاً گورنمنٹ کے کسی مدرسہ میں دینی تعلیم نہیں دیجاتی۔ ہر ریاست میں پانچ سال کی عمر سے اٹھارہ سال کی عمر تک جبری اور مفت تعلیم رائج ہے۔ اور ہر ریاست میں تعلیم کے تین درجے مقرر ہیں۔ ابتدائی، ثانوی (سکنڈری)، اور اعلیٰ۔ ابتدائی تعلیم آٹھ سال کی ہے اور ثانوی یا سکنڈری چار سال کی۔ باقی اعلیٰ تعلیم صرف یونیورسٹیوں میں ہوتی ہے۔

امریکہ کی ہر یونیورسٹی اپنے تعلیمی اور انتظامی معاملات میں ایک تجارتی کمپنی کی طرح خود مختار اور آزاد ہے۔ کسی یونیورسٹی میں وہاں کی گورنمنٹ کوئی دخل نہیں دیتی۔ ہر یونیورسٹی کے ماتحت کئی کالج ہیں۔ اور ہر یونیورسٹی کی ایک انتظامی کمیٹی ہے جو رجسٹرار اور پرنسپلوں سے مشورہ کے بعد کوئی کام کرتی ہے۔ ریاستہائے متحدہ امریکہ میں اس قسم کی آزاد یونیورسٹیاں پانچ سو سے بھی زیادہ ہیں اور اس عظیم الشان تعداد ہی سے ناظرین امریکہ والوں کی علم دوستی اور ان کی تعلیمی ترقی کا اندازہ کر سکتے ہیں۔ مگر سب سے زیادہ قابل غور اور ہمارے عبرت حاصل کرنے کی چیز ان پروفیسروں کی آزادروی ہے جو ہمارے ہاں سرے سے مفقود ہے۔

کولمبیا یونیورسٹی کے تاریخ کا ایک پروفیسر اپنے تجربات کی بنا پر اس نتیجہ پر پہنچا کہ تاریخ کے لیکچر میں اوپر سے نیچے آنے کی بجائے نیچے سے اوپر جانا طلبا کی دلچسپی، ان کی روشنیٔ طبع اور فن تاریخ پر ان کے قادر ہونے کے لئے زیادہ مفید ہے۔ لہذا اب وہ اپنا لیکچر روس کی موجودہ اشتراکیت اور بالشوازم سے شروع کرتا ہے۔ پھر اوپر کی جانب بڑھکر انیسویں صدی کے حالات سے بحث کرتا ہے۔ اس کے بعد اٹھارہویں صدی کو لیتا ہے۔ اور اسی طرح درجہ بدرجہ اگلوں کی تہذیب و تمدن کی تحقیق کرتا ہوا مصر اور بابل کی ابتدائی شائستگی اور تمدن تک جا پہنچتا ہے۔ اور ساتھ ہی ساتھ ہر تاریخی نتیجے کے اسباب اور واقعات بھی بتاتا جاتا ہے۔ ہمارا خیال ہے کہ مستقبل میں یہ تاریخی بدعت یقیناً شاندار نتائج پیدا کریگی۔

امریکن یونیورسٹیاں اپنے تین اہم مقاصد اور بڑے کاموں کے لحاظ سے بھی دنیا کی تمام یونیورسٹیوں میں ممتاز ہیں۔

(۱) علوم و فنون کا ذخیرہ کرنا۔ اور اس کے دو طریقے اختیار کئے گئے ہیں۔ ایک تو ہر یونیورسٹی کے واسطے ایک بہت بڑا اور تمام علوم و فنون پر حاوی کتبخانہ مہیا کرنا اور دوسرے ان علوم و فنون کو علمی سبقوں اور لیکچروں کے ذریعہ سے طلبہ کے لئے آسان اور مفید بنانا۔

(۲) قوم کی تہذیب اور شائستگی کی ترقی کے لئے علمی مذکرات اور بحث مباحثے کرنا۔ اس مقصد کیواسطے ہر یونیورسٹی نے ایک اکاڈمی قائم کر رکھی ہے جسمیں پروفیسروں کے ضرورت کی تمام چیزیں بہم پہنچائی جاتی ہیں۔ ان اکاڈمیوں میں پروفیسر تبادلہ خیالات اور اپنی تحقیقات ہمیشہ جاری رکھتے ہیں۔ اور بسا اوقات ان کی تحقیق علمی دنیا کے علاوہ ملک کی صنعت و

حرفت کے لئے بھی بیحد مفید ثابت ہوتی ہے - اکثر یونیورسٹیاں اپنے پروفیسروں کو ہر چھٹے سال میں ایک سال پوری تنخواہ کے ساتھ پورے سال کی فرصت دیتی ہیں - اور اکثر اساتذہ وہ سال غیر ممالک میں علوم و فنون کی تحقیق میں گزارتے ہیں -

(۳) امریکن یونیورسٹیوں کی تیسری مہم پروفیسروں کے بحث مباحثے کو عام پبلک کے لئے شائع کرنا ہے -

لیکن مذکورہ بالا تمام خوبیوں کے علاوہ امریکہ کی تعلیم کو تمام دنیا کی تعلیم پر سب سے بڑا شرف اور خاص امتیاز یہ حاصل ہے کہ وہاں کی تعلیم میں شروع سے آخر تک، جونیر، سینیر اور اعلیٰ ہر ایک درجہ میں تجربہ اور تحقیق کی رُوح شامل ہوگئی ہے - وہاں علم صرف کتابوں کے ذریعہ سے رٹایا نہیں جاتا اور اساتذہ طلبہ کے سامنے صرف لیکچر دیکر اپنی ذمہ داری سے سبکدوش نہیں ہو جاتے - بلکہ ہر استاد اپنے طرز عمل سے شاگردوں کو یہ ذہن نشین کرادیتا ہے کہ استاد اور شاگرد دونوں ہی علم کے پیاسے ہیں اور تحقیق اور چھان بین دونوں ہی پر لازم ہے - کوئی امریکن پروفیسر طلبہ کے معلومات بڑھانے پر اتنی توجہ نہیں کرتا جتنی اپنے علوم وفنون اور اپنی استعداد بڑھانے پر کرتا ہے - پروفیسر کا فرض صرف طلبہ کی رہنمائی ہوتا ہے - یہ طلبہ کا کام ہے کہ اپنے استاد کے بتائے ہوئے طریقوں سے اپنی علمی لیاقت بڑھانے کی کوشش کریں -

مثلاً کسی ابتدائی مدرسے کا مدرس اپنے شاگردوں کو اصولِ صحت سے باخبر کرنا چاہتا ہے - تو صرف یہی نہیں کرتا کہ انکو حفظِ صحت کے قواعد یاد کراکے انہیں اُن کا امتحان لے لے - بلکہ پہلے ان کے سامنے کسی مرض کی مفصل کیفیت بیان کرتا ہے - اُن سے بچنے کے طریقے سکھاتا ہے - پھر ان کو کسی ایسی جگہ پہنچاتا ہے جہاں یہ مرض کثرت سے پایا جاتا ہو - وہاں پہونچکر طلبہ وہاں کے باشندوں کی رہائش اور مریضوں کے رکھ رکھاؤ کے طریقے کا مطالعہ کرتے ہیں اور اپنے استاد کی ہدایت کے مطابق اُس بیماری پر کوئی خاص کتاب دیکھنے کے بعد صحیح نتیجہ پر پہنچنے اور اس مرض کے متعلق درست معلومات حاصل کرنے کے واسطے اپنے معلم سے کافی بحث و مباحثہ کرتے ہیں - اور اس طرح ایک طالب علم میں ابتدائی کلاسوں ہی میں علمی ذوق و شوق، اپنے مطالعہ اور اپنے تجربہ و تحقیق پر بھروسہ کرنے کی ایک خاص شان اور دنیا کی ہر چیز اور کائنات کے ہر واقع کو ایک چھان بین کرنیوالے محقق کی نظر سے دیکھنے اور اُن سے کارآمد نتیجے نکالنے کا خاص ملکہ پیدا ہو جاتا ہے - یونیورسٹیوں میں بھی یہی حالت ہے - مثلاً تمدن و شائستگی کا ایک پروفیسر طلبا کے سامنے اس فن کے صرف ابتدائی اصول بیان کر دینے پر بس نہیں کرتا - بلکہ امیری و فقیری، جوانمردی و بزدلی، صحت و مرض اور دیہاتی اور شہری زندگی وغیرہ، تمدن کے متعلق تمام جزئیات طلبا کے سامنے کھولکر رکھدیتا ہے - اور ایسی کتابوں اور جگہوں کا بھی انتخاب کردیتا ہے جن کا مطالعہ اس فن کے پڑھنے اور اسمیں کمال حاصل کرنے کے لئے ضروری ہو - پھر استاد اور شاگرد دونوں ہی تحقیق میں لگجاتے ہیں اور دونوں ہی ایک دوسرے کی امداد کرتے ہیں - ناظرین یہ سُنکر بالکل تعجب نہ کریں - کہ بسا اوقات استاد شاگرد کی تحقیق اور رائے سے بھی نفع اٹھاتا ہے -

ہمارے مضمون کا خلاصہ یہ ہے کہ امریکہ تعلیم پر دنیا کی تمام حکومتوں سے بہت زیادہ خرچ کر رہا ہے - اور ابتدائی تعلیم تقریباً تمام کی تمام عورتوں کے ہاتھ میں ہے - اور تحقیق و تجربہ کی رُوح تعلیم کے تمام درجوں میں یکساں طور پر شامل ہے - اور اسیوجہ سے امریکہ عظمت اور ترقی کے میدان میں تمام ملکوں سے پیش پیش ہے -

(الہلال - قاہرہ)　　صدیق طبیب بہاری

منظرِ صبح

ٹھنڈی ٹھنڈی وہ ہوائیں وہ بیاباں وہ سحر　　دمبدم جھومتے تھے وجد کے عالم میں شجر
اس لئے فرشِ زمرد پہ بچھائے تھے گہر　　لوٹ جاتی تھی مہکتے ہوئے سبزے پہ نظر
دشت سے جھوم کے جب بادِ صبا آتی تھی
صاف غنچوں کے چٹکنے کی صدا آتی تھی

انیس مرحوم

عرب کا ایک تاریخی افسانہ

وادیِ عقیق کی سرگذشت

وادیِ عقیق مدینہ منورہ والوں کے لئے ایک پارک یا سیرگاہ کا کام دیتی تھی۔ خصوصاً موسم برسات میں جب سیلاب آتا اور اس کا جوبن نکھرتا تو صبح و شام اس کی بہاریں دیکھنے کو سارا مدینہ ٹوٹ پڑتا۔ اس میں نہ بڑھوں کی خصوصیت تھی نہ بچوں کی نہ مردوں کا امتیاز تھا نہ عورتوں کا۔ کہیں نوجوانوں کی جماعت شعر پڑھنے میں مشغول نظر آتی تو اس کے قریب ہی کہیں کنواریوں کی ٹولی تعریف کرتی دکھائی پڑتی۔ لیکن ہر جگہ عربوں کی شائستگی عصمت و عفت اور پاکدامنی کے خیال اور بے لاگ میل جول کا جلوہ نظر آتا ہمارا افسانہ اس تفریح گاہ کی انہی صحبتوں کے اس زمانہ سے تعلق رکھتا ہے جب عربوں کے تمدن اور شائستگی نے دوپہر کے سورج کی طرح اپنی پوری روشنی سے بغداد سے مدینے تک کی سرزمین کو منور کر رکھا تھا۔ اور ہارون الرشید کی معارف نوازی۔ علم دوستی اور فنون لطیفہ (آرٹ) کی قدر افزائی نے سارے عرب کو علوم و فنون کا خزانہ بنا دیا تھا۔ اس مختصر مگر سچے اور تاریخی افسانے سے تم پر دوسری صدی ہجری کے شہری عربوں کی خانگی زندگی اور سوسائیٹیوں کی حالت بخوبی معلوم ہوجائیگی۔ اس سے تمہیں پتہ چل جائیگا کہ مرد اور عورت آپس میں کتنی آزادی سے ملتے تھے مگر پھر بھی ان کو اپنی پاکدامنی اور عزت و آبرو کا کتنا پاس ہوتا تھا۔ اس سے تم پر یہ بھی ظاہر ہو جائیگا کہ اُن کا علمی اور ادبی مذاق کس قدر شگفتہ تھا۔ سخن سنجی اور سخن فہمی کی کس غضب کی قابلیت رکھتے تھے۔ راگ۔ راگنیوں سے کہاں تک دلچسپی لیتے تھے اور ان کے بڑے بڑے درباروں میں گوئیوں اور راگیوں کی کتنی رسائی ہوتی تھی اور کتنی قدر کی جاتی تھی۔

لیکن اس کے ساتھ ہی تمہیں یہ بھی معلوم ہوجائیگا کہ عرب اپنی انتہائی تہذیب اور شائستگی کے زمانہ میں بھی اپنی خاندانی روایات اور باپ دادا کی ریت پر کس سختی سے قائم تھے اور خاص کر شرافت اور عزت و آبرو کے معاملہ میں تو اگلوں کے نقش قدم سے بال برابر بھی نہیں ہٹتے تھے کہ وہاں کی سوسائیٹیوں اور تفریح گاہوں میں نوجوان لڑکوں اور لڑکیوں کے کھلم کھلا میل جول اور گھنٹوں ایک ساتھ بیٹھنے اُٹھنے اور بات چیت کرنے کے باوجود ان کا میل ملاپ نہ کسی کو کھٹکتا تھا اور نہ کوئی اُن کے چال چلن کے متعلق کسی قسم کا شک و شبہ کرتا تھا۔ مگر جب یہ ملنا جُلنا اہلِ عرب کے نقطۂ نظر سے اور اُن کے اندازے سے بہت زیادہ ہو جاتا اور ملنے والوں کی آنکھوں میں عشق و محبت کا رنگ جھلکنے لگتا تو دوسروں کی نگاہیں بھی اُٹھنے لگتیں اور سارے شہر میں اسی کے چرچے ہونے لگتے اور اس کے بعد لڑکی کے رشتہ دار اپنی غیرت خودداری اور اپنی بے عزتی کے خیال سے اس کی شادی اُس شخص سے ہرگز نہ کرتے جس کی محبت کا راز عام طور پر فاش ہوچکا ہو۔ کیونکہ اُن کا گمان تھا کہ اس سے شادی کر دینا گویا خود ہی لوگوں کی بدظنی کی تصدیق اور اُن کے شک کو خود ہی سچا کر دینا ہے۔ یہ عربوں کا ایک ایسا رواج تھا جس نے ہزاروں نوجوانوں کو اُٹھتی جوانیوں ہی میں قبر کے گھاٹ اُتار دیا اور ہزاروں حسین کنواریوں کو عشق کی آگ میں جلا جلا کر بھسم کر دیا۔ لیکن اس رواج کی پاسداری کے سامنے اُن کو نوجوانوں کے اس بدنصیب گروہ پر کبھی بھی رحم نہ آیا۔ شاید ہی کبھی کسی عاشق کا نصیبا جاگتا اور بادشاہ یا کسی دوسرے بااثر شخص کو اس کی پاک محبت اور آپے سے گذر جانے کی خبر لگ جاتی اور اُسے اسکی جوانی پر رحم آجاتا۔ تو وہ اپنے اثر سے کام لیکر اس کی محبوبہ کے رشتہ داروں کو اُس سے شادی کرنے پر تیار کر دیتا۔ عام طور پر عربوں کی اس عجیب و غریب خصلت اور بے عزتی کے ڈر۔ اور اُن کی اس سنگدلی نے مدتوں اپنے نوجوانوں کا خون بہاتے رہنے کے بعد انتہائی شائستگی کے زمانے میں اس بارے میں انہیں نرم نہیں ہونے دیا۔

بہرحال یہ افسانہ اُس زمانے کے عربوں کی شائستگی۔ اُن کی شریفانہ محبت اُن کی خودداری اُن کی عصمت اور آبرو کی نگہداشت اُن کے جذبات کی رقت اور اُن کی طبیعت کی نرمی اُن کی مروت اُن کی داد و دہش اور راگ راگنیوں سے اُن کے دلچسپی لینے کی بہترین مثال ہے۔ عربی ادب کے بڑے بڑے محققوں نے اپنی کتابوں میں اس حکایت کا تذکرہ کیا ہے لیکن من و

سب سے بڑا ماخذ کتاب "الاغانی" اور "نہایت الادب" ہے۔ اس کا راوی معبد یقطینی ہے جو ہارون الرشید کا خاص مغنی اور اپنے فن کا بہت بڑا ماہر تھا

معبد یقطینی بیان کرتا ہے کہ:-

بغداد میں برمکیوں کے محلہ میں میرا خوبصورت اور پاکیزہ مکان برمکیوں کی بڑی بڑی اونچی کوٹھیوں سے بھی زیادہ شاندار معلوم ہوتا تھا۔ اور میری گھریلو پھلواری اُن کے بڑے بڑے خانہ باغوں سے بھی زیادہ دلکش نظر آتی تھی میں ایک دن صبح کو اپنے مکان کے ایک جھروکے میں بیٹھا ہوا اپنی پھلواری کے انگاروں جیسے سُرخ سُرخ پھولوں سے آنکھیں سینک رہا تھا کہ کسی نے دروازے پر دستک دی میرا غلام گیا اور اُس نے آکر بتایا کہ ایک شریف سا نوجوان آپ سے ملنا چاہتا ہے میں نے اجازت دیدی اور اپنے سامنے مردانہ حسن کا ایسا نمونہ کھڑا دیکھا جس سے زیادہ خوبصورت۔ زیادہ پاکیزہ زیادہ خوش پوش اور جس سے زیادہ فیشن ایبل اس قدر دبلا پتلا اور بیمار سا ہونیکی صورت میں میں نے کبھی نہیں دیکھا تھا۔ سلام کے بعد اُس نے کہا کہ مدت سے آپ سے ملنے کی تمنا تھی مگر اس کی کوئی راہ نہیں نکلتی تھی۔ مجھے آپ سے ایک بہت بڑا کام ہے۔ میں نے پوچھا وہ کیا؟

اُس نے سر اُٹھایا اور مجھے گھور کر دیکھنے لگا۔ گویا وہ میرے بشرے سے یہ معلوم کرنا چاہتا تھا کہ میں اس کی بات مانوں گا یا نہیں۔ پھر اپنے بیگ سے تین سو اشرفیاں نکال کر میرے آگے ڈالدیں اور کہا کہ آپ کی عنایت ہوگی اگر اسے قبول فرمائیں اور میرے ان دو شعروں کو اپنے راگ میں گا کر مجھے سنادیں

واللہ یا طرفی الجانی علی بدنی　　لتطفئن بدمعی لوعة الحزنی
او لا بوحن حتی یحجبوا سکنی　　فلا اراہ وقد ادرجت فی کفنی

اے میری ظالم آنکھ تو نے ہی میری جان پر ستم ڈھائے اب خدا کیواسطے تو اس عشق کی آگ کو میرے آنسوؤں سے بجھاتی رہ ورنہ میں اپنی اندرونی کیفیت کو ظاہر کردوں گا تو لوگ اس کو پردے میں چھپالیں گے جو میرے لئے باعث تسکین ہے اور پھر اُسے مرتے دم تک نہ دیکھ سکونگا۔

میں نے کہا کہ بہتر لیکن اس کا سُر اور دھن نکالنے کیلئے مجھے تھوڑی دیر تنہائی کی ضرورت ہے اس پر وہ بڑا خوش ہوا اور بہت شکرادا کیا۔

تھوڑی سی کوشش میں میں نے دھن بنالیا اور اُس کے پاس آکر گانے لگا۔ میں ابھی گا ہی رہا تھا کہ وہ گر کر ایسا بیہوش ہوا کہ میں نے سمجھا وہ مرگیا۔ پھر تو میں بڑا گھبرایا کہ بیٹھے بٹھائے یہ کیا مصیبت آئی۔ اور اس کو ہوش میں لانیکی تدبیریں کرنے لگا۔ خدا خدا کرکے اُسے ہوش آیا اور وہ ذرا سنبھلا۔ تو پھر گانے کی فرمایش کی۔ میں نے کہا کہ خدا کی پناہ اب مجھ سے یہ نہیں ہوسکتا۔ تمہاری خوفناک چیخ ابتک میرے کانوں میں گونج رہی ہے اور تمہاری ہیبتناک غشی سے اب تک میرا دل لرز رہا ہے۔ خدا کیلئے اپنی حالت پر رحم کرو اور مجھے معاف رکھو۔ کیونکہ مجھے خوف ہو رہا ہے کہ کہیں تمہاری روح نہ پرواز کرجائے۔ اُس نے کہا کہ افسوس! میں اتنا خوش قسمت کہاں ہوں اور میری عاجزی اور خوشامد اس قدر کی کہ آخر مجھے رحم آگیا اور میں نے پھر گانا شروع کیا۔ وہ پہلی بار سے بھی زیادہ تڑپنے لگا اور اتنے زور سے چیخ مار کر بیہوش ہوگیا۔ کہ میں نے سمجھ لیا کہ بس اب کے اس کی جان نکل گئی۔ مجھے بڑی فکر ہوئی۔ میرے خدمت گار بھی تھرا اُٹھے کہ یہ کیا ہوا؟ لخلخہ سنگھایا گیا۔ مُنہ پر پانی کے چھینٹے مارے گئے اور بیسیوں تدبیریں کی گئیں تو اُسے کچھ کچھ ہوش آنے لگا اور بڑی دیر کے بعد وہ اپنے آپے میں آیا تو اُس کی دی ہوئی تمام نقدی میں نے اُس کے آگے ڈالدی اور کہا کہ صاحبزادے اپنی جان پر نہیں تو خدارا مجھ پر رحم کھاؤ۔ اور اپنے خون سے میرے ہاتھ رنگین نہ کرو۔ میں نے تمہاری بات رد نہیں کی۔ اور تمہاری تمنا پوری کردی۔ اب میری جان چھوڑو۔ اپنی یہ اشرفیاں سنبھالو۔ اور اپنا راستہ لو۔ اُس نے کہا کہ آہ مجھے اشرفیوں کی پروا نہیں ہے۔ لیجئے اتنی ہی اور حاضر ہیں۔ پھر اُس نے تین سو اشرفیاں اور نکالیں اور میرے سامنے رکھکر کہا کہ بس ایک بار اور سنا دیجئے۔ اگر میری جان بھی نکل جائے تو آپ کیلئے میرا خون معاف ہے۔

اس عجیب شخص کی حالت پر مجھے بڑی حیرت ہوئی۔ اور اشرفیوں پر کچھ لالچ بھی آگیا۔ میں نے کہا کہ خدا کی قسم یہ کیا اس کا دس گنا بھی نہیں لے سکتا اور نہ پھر گا سکتا ہوں۔ مگر تین شرطوں پر۔ پہلی شرط یہ ہے کہ آج دن بھر یہیں رہو اور آج کی میری دعوت قبول کرو۔ دوسری یہ ہے کہ تھوڑی سی نبیذ پی لو کہ تمہارا غم غلط ہو اور طبیعت میں فرحت اور دل میں قوت آئے اور تمہارا چیخنا بند ہو۔ اور تیسری شرط یہ ہے کہ اپنا راز اور اپنا قصہ مجھ سے بیان کردو۔ وہ تھوڑی دیر سوچتا رہا پھر بولا کہ خیر آپ جو فرمائیں وہ منظور ہے۔ میں نے اشرفیاں رکھ لیں اور کھانا منگایا۔ برائے نام اُس نے بھی کھایا۔ پھر نبیذ منگائی اور چند پیالے اُس نے پی لئے تو میں نے اُس کے شعر کے ہم معنے دوسروں کے اشعار گانے شروع کئے۔ وہ نبیذ پیتا جاتا تھا اور روتا جاتا تھا آخر اُس نے کہا کہ شرط پوری کیجئے۔ میں نے اُس کا شعر گانا شروع کیا۔ پھر تو وہ بہت ہی رویا بہت ہی بلبلایا۔ مگر بیہوش نہیں ہوا اور نہ وہ خوفناک چیخ سننے میں آئی۔ اس کا اندازہ کرکے مجھے بڑی مسرت ہوئی کہ نبیذ نے اس کو کچھ تسکین دیدی ہے اور اس کا دل قوی کردیا ہے

اور میں نے اس کے شعر کئی بار گانے کے بعد اُس سے کہا کہ تم اپنا راز نہیں بیان کرو گے؟ میں سُننے کا بیحد مشتاق ہوں۔

اُس نے کہا اچھا سُنئیے! میں مدینے منورہ کا رہنے والا ہوں۔ میری بدبختی آئی کہ موسم بہار میں ایک دن اپنے ہم سن دوستوں کے ساتھ سیر و تفریح کے لئے وادی عقیق میں جانے کی صلاح ٹھیری اور مشورہ ہوا کہ آج ہر شخص اپنے اچھے سے اچھے کپڑے زیب تن کرے اور اپنے سب سے اچھے گھوڑے پر سوار ہو کر چلے۔ یہ صلاح کر کے ہماری پارٹی بڑی شان و شوکت اور بڑے ٹھاٹھ باٹھ سے وادی عقیق میں پہنچی۔ وادی میں سیلاب آیا ہوا تھا اور وہ دریائے فرات کی طرح ٹھاٹھیں مار رہی تھی اور جھاگ پر جھاگ پھینک رہی تھی۔ ہم اُس کے کنارے بیٹھ گئے۔ ہماری آنکھیں اپنی دلچسپیوں کی تلاش میں مشغول ہو گئیں۔ ساری کی ساری وادی اُس کی بہاریں لوٹنے والوں سے کھچا کھچ بھری ہوئی تھی۔ اس میں شرفا، غلام، لونڈیاں، نقاب ڈالے ہوئے اور بے نقاب عورتیں اور لڑکیاں سب یکساں طور پر شریک تھیں۔ ہم بیٹھے آنکھیں ٹھنڈی کر رہے تھے کہ ناگاہ میری نظر چند نوجوان لڑکیوں کی ایک ٹولی پر جا پڑی جو سیر کرتی ہوئی آکر ہمارے قریب ہی بیٹھ گئی تھی۔ اور ان میں سے ایک لڑکی کو جو چشمے کے کنارے کے نرکل کی طرح شاداب و تر و تازہ و سیدھے قد کی تھی ایسی جادو بھری آنکھوں سے میں نے اپنی طرف دیکھتے دیکھا کہ ناممکن تھا اُن کو کوئی دیکھے اور پلک جھپکانے سے پہلے گھائل نہ ہو جائے۔

ہم بہت دیر تک بیٹھے رہے اور وہ بھی بیٹھی رہیں۔ یہاں تک کہ سارے لوگ چلے گئے تو وہ بھی چلی گئیں اور ہم بھی لوٹ آئے میں اپنے گھر پہنچا مگر کھویا ہوا اور پہلو میں ایسا کاری زخم لیکر جو آجتک بھر نہیں سکا۔ دوسرے دن میں پھر "عقیق" جا پہنچا۔ مگر نہ وہ نظر آئی نہ اُس کی سہیلیاں ہی کہیں دکھائی پڑیں۔ اب مدینے کا چکر کاٹنا شروع کیا۔ ہر ہر بازار میں مارا مارا پھرا۔ گلی گلی پھرتا رہا وادی عقیق کا چپہ چپہ چھان مارا۔ نہ معلوم اُسے زمین کھا گئی یا آسمان نے اُچک لیا کہ کہیں بھی اُس کی صورت نظر نہ آئی۔ میری ساری تدبیریں بیکار گئیں اور اس کا سراغ نہ ملنا تھا۔ نہ ملا۔ میری ہمت ٹوٹ گئی اور اندرونی آگ کی تپش نے مجھے ایسا جلایا کہ میں بستر سے لگ گیا اور ہر ایک میری زندگی سے مایوس ہو گیا۔ ایسی حالت میں تقریباً ایک سال گذر چکا تھا کہ ایک عورت میری انا جو مجھ سے بیحد محبت کرتی تھی، میرے ہاں آئی اور میری حالت دیکھ کر بےچین ہو گئی۔ وہ تنہائی میں میرے پاس آئی اور اس بدحالت کی اصلی وجہ پوچھنے لگی۔ مجھے پہلے تو گھر والوں پر اور اہل قبیلہ پر اپنے راز کے کھل جانے اور اپنی رسوائی کے خوف سے کہنے کی ہمت نہیں پڑی۔ مگر جب اس نے بہت دباؤ ڈالا، رازداری کا وعدہ کیا اور میرے معاملہ میں کوشش کرنے کا یقین دلایا تو میں نے اپنا پورا قصہ اُس کو سُنا دیا۔ اُس نے کہا کہ گھبرانے کی کوئی بات نہیں ہے موسم بہار پہنچ ہی گیا ہے اور یہ سال بھی سرسبزی اور اچھے نچھتروں کا ہے پھر بارش ہونا کوئی بعید نہیں ہے وادی عقیق اپنی جگہ پر جوں کی توں موجود ہی ہے۔ ذرا بارش ہو جائے تو وہاں چلنا میں بھی تمہارے ساتھ چلوں گی۔ اُمید ہے کہ وہ لڑکیاں بھی آئیں گی۔ اگر وہ آگئیں اور میں نے اُسکو دیکھ لیا تو میں اس کا پیچھا کر کے مکان معلوم کروں گی۔ اور پھر تم کو اُس سے ملانے اور شادی کرانے کی کوشش کروں گی۔ اپنی مہربان انا کی باتوں میں کچھ ایسا اثر پایا کہ میں واقعی مطمئن ہو گیا اور اس پر مجھے اس قدر بھروسہ ہو گیا کہ میری گھبراہٹ میں بالکل سکون ہو گیا۔ میں روز بروز اچھا ہونے لگا اور چند ہی دنوں میں بالکل اپنی اصلی حالت پر آ گیا۔ ادھر میں نے غسل صحت کیا اُدھر بارش ہوئی اور وادی عقیق میں سیلاب آ گیا۔

پھر کیا تھا۔ عقیق کی طرف لوگوں کا تانتا بندھ گیا۔ میں بھی اپنے دوستوں کے ساتھ وہاں پہنچا اور ٹھیک وہیں جاکر بیٹھا جہاں گذشتہ سال بیٹھا تھا حسن اتفاق دیکھئیے کہ وہ لڑکیاں بھی اپنی پرانی جگہ پر بیٹھی ہوئی تھیں۔ میرا دل دھڑکنے لگا اور میں نے اپنی انا کو اشارے سے بتا دیا وہ سمجھ گئی اور ہم سے کچھ دور بیٹھ گئی۔ میں نے بلند آواز میں اپنے دوستوں سے کہا کہ کسی نے کتنا اچھا کہا ہے ؎

رمتنی بسهم اقصد القلب و انثنت وقد غادرت جرحاً به و ندوباً

میرے دل کو نشانہ بنا کر اُس نے تیر چلایا اور اس میں گہرا اور کاری زخم چھوڑ کر چل دی۔

اُس نے اپنی لونڈی سے کچھ کہا اور وہ اپنی ساتھ والیوں سے کہنے لگی کہ بیشک کہنے والے نے اچھا کہا مگر کسی نے اس کا جواب کتنا اچھا دیا ہے

فبا مثل ما تشکو فصبر لعلنا نری فرجاً یشفی السقام قریباً

جو بیماری تمہیں ستا رہی ہے اُس مرض میں میں بھی گرفتار رہوں۔ ہم کو وقت کا انتظار کرنا چاہئیے۔ ہوسکتا ہے کہ اس آزار سے نجات پانیکی جلدی کوئی راہ نکل آئے۔

میں نے اس ڈر کے مارے اس کا کوئی جواب نہیں دیا کہ کہیں مجھ سے کوئی ایسی بات نہو جائے جس سے میری اس کی دونوں کی رسوائی ہو۔

پھر جب سب لوگ چلنے لگے تو وہ بھی چلی اور ہم بھی چلے۔ میری انا نے اُس کا پیچھا کر کے اُس کا گھر دیکھ لیا۔ اور برابر کوشش میں لگی رہی آخر ایک دن مجھے بھی لے گئی۔ مگر مجھے پتہ نہیں چلتا تھا۔ یہ سب کچھ خواب میں ہو رہا ہے یا بیداری میں۔ اس کے بعد میں کسی نہ کسی طرح اکثر اس کو دیکھ آتا

کبھی ملاقات بھی ہو جاتی مگر ہم برابر نہایت ہی احتیاط کے ساتھ اخلاقی دائرے کے اندر رہے اُس کے علم و فضل کی وجہ سے میری محبت اور بھی بڑھ گئی اور میں نے اس سے محبت اور شادی کا وعدہ کرالیا مگر نہ معلوم ہماری محبت کا راز کیسے ظاہر ہو گیا اور نہ جانے لوگوں کو ہماری باتیں کیسے معلوم ہو گئیں کہ ہماری کیفیت مدینے کی گلی گلی میں مشہور ہو گئی۔ اور اُس کے رشتہ دار اُس کی نگرانی کرنے لگے اس کے والدین نے اس پر سختی کرنی شروع کر دی اور میں ہزار کوششوں کے باوجود اس سے نہ مل سکا۔

میں نے عاجز آکر اپنی ساری کیفیت اپنے والد سے بیان کر دی اور خواہش کی کہ اس کے ہاں میری شادی کا پیغام لیکر چلیں۔ میری امید کے خلاف وہ سُن کر بہت خوش ہوئے اور اپنے قبیلے کے معززین کے ساتھ منگنی کیواسطے اس کے ہاں گئے اور اُس کے والد کو پیغام دیا اُس نے کہا کہ اگر یہی خواہش تم نے دونوں کے تعلقات کے مشہور ہونے سے پہلے کی ہوتی تو میں شوق سے شادی کر دیتا۔ لیکن اب تو یہ میری لڑکی کو رسوا کر چکا۔ اب میں اس سے شادی کر کے لوگوں کی افواہ کو سچا نہیں بنا سکتا تم خود ہی اندازہ لگا سکتے ہو کہ تمہارے لڑکے کی اس حرکت سے میری شرافت کو کتنا بٹہ لگا ہے اور میری عزت و آبرو کو کس قدر نقصان پہنچا ہے۔ میرے ساتھیوں نے جواب دیا کہ ہم اس میں نہ تمہاری عزت پر کسی قسم کی آنچ آتی دیکھتے ہیں اور نہ تمہاری شرافت پر ہم کو کوئی داغ نظر آتا ہے۔ ہماری لڑکیاں کھلے بندوں لڑکوں سے بات چیت کرتی ہی ہیں اور ہم اس میں کوئی ہرج نہیں سمجھتے۔ اس کا یقین رکھو کہ ہم کو نہ تمہاری لڑکی کی پاکدامنی میں کوئی شبہ ہے اور نہ اپنے لڑکے پر کسی قسم کا شک ہے۔ تم خواہ مخواہ وہم میں کیوں پڑتے ہو۔ خود سوچو۔ عوام کی ہوائیوں کا کیا اعتبار ہے۔ اگر تم راضی ہو جاؤ تو ساری افواہ دب جائے گی۔ وہ سر نیچا کئے ہوئے سوچتے سوچتے بولا کہ میں نے بہت غور کیا۔ لیکن اس شہرت اور تمام لوگوں کو اس کا علم ہو جانے کے بعد اس سے شادی کرنا مجھے اچھا نہیں معلوم ہوتا۔ اور اگر میں منظور بھی کر لوں تو اس پردے کے پیچھے والی اس کو نہیں مانے گی۔ اس نے اُس پردے کی طرف اشارہ کیا جس کے پیچھے اُس کی بیوی بیٹھی تھی۔ میں نے اپنے خاندان والوں کو بتایا کہ اس کی بیوی سے سفارش کریں۔ مگر اُس نے اُن کی پوری بات سننے سے پہلے ہی اپنے شوہر سے بھی زیادہ سخت جواب دیا اور صاف انکار کر دیا۔ آخر ہم نا اُمید ہو کر چلے آئے۔

اس کے بعد میری حالت پھر بگڑنے لگی اور چند ہی دنوں میں بُری سے بُری ہو گئی میرے والد چاہتے تھے کہ میری شادی کسی دوسری جگہ کر دیں کہ میرا دل بہل جائے اور اس کا خیال چھوٹ جائے۔ مگر مجھ کو اس سے سخت نفرت تھی۔ اس لئے میرے دل میں آیا کہ والد کی خفگی اور لوگوں کی چہ میگوئیوں سے بچنے کے لئے اس وقت کہیں اور چلا جانا چاہئے۔ لیکن مشتاق تھا کہ اس سے ایکبار آخری ملاقات ہو جائے اور اس کی بہتیری تدبیریں کیں۔ مگر کامیاب نہیں ہو سکا۔ میری طرح اس کی بھی صحت خراب ہو گئی اور اس کے والدین نے اسے مدینے سے باہر کسی بدوی (عرب کے دیہاتی) رشتہ دار کے ہاں بھیجدیا۔ میں نے کسی نہ کسی طرح وہاں اپنے سفر اور اپنے عہد پر قائم رہنے اور اس کے دیکھنے کا مشتاق ہونے کی خبر اُسے پہنچا دی وہ اس کو سُنکر کانپ گئی اپنے سفر کی صبح کو مدینے کے باہر اُن خیموں کے قریب جہاں وہ مقیم تھی میں نے آخری بار اُسے دیکھا ..... معبد کہتا ہے کہ نوجوان یہاں پہنچکر رونے لگا۔ پھر کہا۔

تبدت لنا مذعورة من خبائها وناظرها باللؤلؤ الرطب دامع
اشارت باطراف البنان وودعت واومت بعينيها متى انت راجع

"وہ ڈرتی ڈرتی اپنے خیمے سے نکل کر ایسی حالت میں میرے سامنے آئی
کہ اس کی آنکھوں سے موتیوں جیسے آنسو ٹپک رہے تھے۔
اُس نے اپنی انگلیوں کے اشارے سے مجھے رخصت کیا اور آنکھوں
کے اشارے سے پوچھا کہ واپس کب آؤ گے؟"

یہاں پہنچکر نوجوان کا چہرہ زرد پڑ گیا۔ اور اس قدر رویا کہ مجھے بھی رونا آگیا۔ میں نے اُس کو سمجھایا۔ دلاسا دیا اور مشورہ دیا کہ میرے پڑوس میں رہو اُس نے منظور کر لیا اور میرے پاس ہی ایک مکان میں رہنے لگا جس میں مالدار ہی رہ سکتے تھے۔ میں برابر اس کے بارے میں سوچتا رہا آخر مجھے ایک ترکیب سوجھی اور اُمید بندھی کہ اب اس کا کام ہو جائیگا۔

ہارون رشید وزیر جعفر برمکی کے ہاں کھانے پینے کی مجلس جمی ہوئی تھی۔ مجھ سے گانے کی فرمائش ہوئی اور میں نے اپنے نوجوان کا وہی شعر اُسی دھن میں گانا شروع کیا۔ جعفر سُن کر مست ہو گیا اور بول اُٹھا کہ بھئی یہ بیت تو کسی خاص واقعے سے تعلق رکھتا ہے۔ وہ واقعہ سُناؤ۔ مجھے اپنا تیر نشانہ پہ لگنے کی بڑی خوشی ہوئی۔ اور میں نے نوجوان کا سارا ماجرا کہہ سُنایا۔ جعفر بہت متاثر ہوا اور اُسی وقت نوجوان کو بُلایا گیا۔ وہ آگیا۔ تو اُس کی زبانی سارا قصہ پھر سُنا اور کہا کہ اب تمہاری محبوبہ سے تمہاری شادی کرا دینے کا ذمہ میں لیتا ہوں۔ یہ سُنکر

نوجوان کی باچھیں کھل گئیں اور مارے خوشی کے اُس کو اس کا یقین آنا مشکل ہو گیا۔

دوسرے دن جعفر خلیفہ ہارون الرشید کے ہاں گیا۔ تو اُس نوجوان کی پوری سرگذشت اُسے سُنائی خلیفہ نے ہم کو فوراً حاضر کرنیکا حکم دیا اور ہم دونوں پیش کئے گئے۔ مجھے وہی شعر گانے کا فرمان ملا میں نے گانا شروع کیا۔ خلیفہ جھومنے لگا۔ پھر نوجوان سے اس کی داستان دہروائی اور اس کی دلجوئی کی۔ اس کی محبوبہ کو اُس کے تمام رشتہ داروں کے ساتھ دار الخلافتہ میں حاضر کرنے کے واسطے اُسی وقت حجاز کے گورنر کے نام پروانہ جاری کر دیا۔ ہم دربار سے واپس ہوئے تو معلوم ہوتا تھا کہ نوجوان مارے خوشی کے آسمان پر اُڑ جائیگا۔ بار بار مجھ سے پوچھتا کہ کیا واقعی میری محبوبہ مجھکو مل جائے گی؟ اور کیا اس کا باپ اس کو قبول کریگا؟۔

نوجوان کے شعر میری دھن کے ساتھ بغداد کی گلی گلی میں مشہور ہو گئے اور ہر جگہ اس قصے کے چرچے ہونے لگے۔ اور آخر صرف اُتنے ہی دنوں میں جتنے میں بغداد سے مدینے منورہ اور وہاں سے بغداد جانے آنے میں صرف ہو سکتے ہیں وہ سب کے سب دار الخلافتہ میں لائے گئے۔ دربار میں لڑکی کے باپ کی طلبی ہوئی۔ وہ خلیفہ کے سامنے حاضر کیا گیا۔ مگر ڈر کے مارے اس غریب کی جان نکلی جا رہی تھی خلیفہ نے اس کی لڑکی کے لئے نوجوان کا پیغام دیا۔ اور اُس کو قسم دلائی کہ اُسے خوشی سے قبول کرے۔ اُس نے قبول کر لیا اور اُسی وقت اُن کا نکاح ہو گیا۔ خلیفہ نے اس کو ایک ہزار اشرفیاں جہیز دینے کے لئے بخشیں۔ اور ایک ہزار راہ خرچ کے واسطے عطا کیں۔ میرے اور نوجوان کے لئے بھی ہزار ہزار اشرفیوں کا حکم صادر فرمایا۔ پھر ہم پر جعفر کی طرف سے بھی اُتنی ہی بخشش ہوئی۔

دونوں میں سے کسی کو بھی اُمید نہ تھی۔ مگر مدتوں کی جدائی کے صدمے سہنے اور فراق کی مصیبتیں برداشت کرنے کے بعد دونوں بچھڑے ہوئے مل گئے۔ اور پھر ہمارے مدنی جوان نے بغداد سے جانا پسند نہ کیا۔ اور جعفر کے مصاحبوں میں شامل ہو گیا۔

اس افسانے کو پڑھ کر عربوں کی اخلاقی بڑائی۔ اُن کے ترقی یافتہ میلانِ طبع، پاکیزہ طبیعت، اُن کے نرم جذبات۔ وفاداری اور پاکدامنی کا مجموعہ اُن کی شریفانہ اور سچی محبت اور اُن کی خودداری اور عزت و آبرو کی ضرورت سے زیادہ پاسداری پر اگر تمہیں تعجب ہو رہا ہے تو ہو۔ اور ایک عاشق کی مصیبت دُور کرنے میں ایک راگی ایک وزیر ایک بادشاہ کو یکساں حصہ لینے پر تمہیں حیرت ہو رہی ہو تو ہو۔ لیکن اس پر بالکل تعجب نہ کرو کہ ہارون رشید نے خلیفہ ہو کر اس معمولی سی بات پر کس قدر توجہ کی کیونکہ خلفاء کی عنایت۔ رعایا پر ان کی توجہ اور ہمیشہ رعیت کی حالت معلوم کرتے رہنے اور ان کی بھلائی اور بہتری کی فکر میں لگے رہنے کی یہ کیفیت تھی اپنے دربار کے خواص کو اکثر یوں مخاطب کرتے تھے کہ ہم نے تم کو اپنے دربار میں اس لئے جگہ دی ہے کہ تم اپنے سے کم رتبہ والوں کو اپنی مجلسوں میں جگہ دو۔ تم کو چاہیئے کہ اُن لوگوں کی ضرورتوں کو ہم تک پہنچاؤ جو ہم تک نہیں پہنچ سکتے۔ یہ ہے حکومت کا وہ اعلےٰ نمونہ اور بہترین مثال جس پر اپنی اعلےٰ شائستگی کے زمانہ میں عربوں کی حکومت چل رہی ہے۔

محمد صدیق بہاری

خیالِ یار

کیونکر رکھوں نہ دلمیں تجھ اے خیالِ یار — میرے لیئے ہے موجب صبر و قرار تو
میں تیرا غمگسار رہوں تو میرا غمگسار — میں تیرا یار میرا یار غار تو
بن بن کے اضطرابِ تمنائے بازدید — صد بار ے گیا ہے سر رہگذار تو
پھونکی ہے تو نے آتشِ گل لالہ زار میں — ہے نالۂ ہزار سرِ شاخسار تو
دشتِ جنوں میں ہم قدمِ قیس تھا اگر — تھا دل میں کوہ کن کے سر کوہسار تو
بے درد سنگدل جنھیں کہتا ہے اک جہاں — پنہاں ہے اُن کے دلمیں بہ رنگ شرار تو
شوقِ تلاش میں لیئے پھرتا ہے جا بجا — ہے رہبرِ وفائے غریب الدیار تو

(میلا رام وفا)

ولایات متحدہ امریکہ کی بنیادی سیاست

جیمس منرو کا قانون

جنگ عظیم کے زمانہ میں آئین منرو کے متعلق اخباروں اور سوسائٹیوں میں جو کچھ بحث ہوتی رہی ہے اسکو مدّ نظر رکھتے ہوئے ہم اس مسئلہ کی اہمیت کو تسلیم کر سکتے ہیں۔

آج امریکہ کی خارجی سیاست کی بنیاد جس قانون پر ہے اسکو ایک صدی ہوئی ہے کہ جاری ہوا ہے۔ یہ قانون امریکہ کا بنیادی قانون ہے۔ اس کا بنانے والا ولایات متحدہ کا پانچواں صدر جیمس منرو ہے۔ اسی کے نام کی مناسبت سے یہ قانون "آئین منرو" کے نام سے مشہور ہے۔

جیمس منرو (Monroe) اگرچہ ایک بڑھئی کا لڑکا تھا، لیکن بچپن ہی سے اس میں لیاقت کے آثار پائے جاتے تھے۔

جس زمانہ میں فرانس کے مشہور انقلابی روبسپیر ( ) کو ۱۲۰۹ھ میں قتل کیا گیا تو اسوقت آزادی امریکہ کا حقیقی بانی واشنگٹن ولایات متحدہ امریکہ کی جمہوریت کا پریذیڈنٹ تھا۔

واشنگٹن کا خیال تھا کہ ایسے وقت میں جبکہ فرانس میں سیاسی پیچیدگیاں پیدا ہو رہی ہیں کسی ایسے شخص کو وہاں کا سفیر مقرر کیا جائے جو اعلیٰ پایہ کی سیاسی قابلیت کا مالک ہو۔

چنانچہ اس اہم خدمت کے لئے جیمس منرو کا انتخاب کیا گیا اور اسکو پیرس میں سفیر مقرر کر دیا گیا۔ اسوقت منرو کی عمر چھتیس سال کی تھی اور وہ امریکہ کی پارلیمنٹ کا ممبر کا تھا۔

چونکہ منرو انقلاب فرانس کا حامی تھا اور جو نئے اصول دنیا میں پیدا ہو رہے تھے اُن کا فریفتہ تھا اسلئے انگریزی حکومت نے دولت امریکہ سے مطالبہ کیا کہ منرو کو واپس بلا لیا جائے۔ چنانچہ وہ وہاں سے واپس بلا لیا گیا

اس کے بعد منرو یورپ اور امریکہ میں مختلف معزز عہدوں پر کام کرتا رہا۔

۱۲۲۲ھ میں نائب وزیر خارجہ مقرر ہوا۔ اس کے تین سال بعد وزیر جنگ بنا دیا گیا۔ بالآخر ۴ ربیع الاول ۱۲۳۲ھ میں امریکہ کا صدر جمہوریہ منتخب ہوگیا ہے۔

جب منرو اپنے عہدہ کی مدت چار سال ختم کر چکا تو ۱۲۳۵ھ میں صرف ایک رائے کی مخالفت سے دوبارہ صدر جمہوریہ منتخب ہوگیا۔ اسکا دوبارہ انتخاب اس کی سیاسی قابلیت اور جمہوری امور میں اس کی بےنظیر لیاقت کیوجہ سے عمل میں آیا۔

اس نے اپنے زمانۂ صدارت میں عام پبلک کے کاموں میں بہت حصہ لیا اور ملکی ترقیات کے لئے اس نے جس سرگرمی سے کام کیا اس نے اسکو ملک میں بہت مقبول بنا دیا۔

جیمس منرو کا یہ ایک زبردست کارنامہ تھا کہ اس نے ملک کی مختلف پارٹیوں میں جو شدید اختلاف تھا اسکو تقریباً ختم کر دیا چنانچہ جب منرو ولایات شمال مشرقی کی سیاحت کے لئے گیا تو وہاں جمہوریت پسندوں نے اس کا زبردست استقبال کیا۔ حالانکہ منرو کا تعلق ڈیموکریٹ پارٹی سے تھا۔ اور جمہوریت پسندوں اور ڈیموکریٹ پارٹی میں اس سے پہلے شدید اختلاف رہ چکا تھا۔

اسی زمانہ میں جنوبی امریکہ جو اسپین کے مقبوضات میں سے تھا۔ ایک سخت کشمکش کے بعد اس کے قبضہ سے آزاد ہوگیا۔ اور اس نے اپنی ایک مستقل جمہوری سلطنت کی بنیاد رکھکر اپنے حقوق کی حفاظت کے لئے ہر ممکن قوت کو تیار کر لیا۔

اگرچہ جمہوریت ممالک متحدہ امریکہ ممالک جنوبی کی کامیابی سے بہت ہی خوش تھی لیکن وہ ایک عرصہ تک ان کی آزادی کو تسلیم کرنے میں پس و پیش کرتی رہی۔

لیکن ایک عرصہ کے تردد کے بعد ۱۲۳۷ھ میں ان کی آزادی اور استقلال کو تسلیم کر لیا گیا اور جانبین سے دونوں دارالحکومتوں میں سفراء مقرر کر دئے گئے۔

ایک سال بعد دولت متحدہ شمالی امریکہ کو معلوم ہوا کہ یورپ کی

مختلف حکومتوں نے جن میں اٹلی ۔ جرمنی ۔ فرانس اور روس وغیرہ شامل تھے ۔ "اتحاد مقدس" کے نام سے ایک اہم معاہدہ کیا ۔ جس کا منشا یہ تھا کہ ممالک جنوبی کو دوبارہ آزادی کی آب و ہوا سے محروم کر دیا جائے ۔

مسٹر رش (RUTH) نے جو انگلینڈ میں امریکن سفیر تھا اپنی حکومت کو ان حالات کے متعلق ایک مفصل رپورٹ ارسال کی جس میں اس نے ان ممالک پر طعنہ زنی کرتے ہوئے لکھا ۔

"کہ یورپ کی مہذب حکومتیں انصاف و انتظام کی جو شدید پیاس رکھتی ہیں اسکو تسکین دینے کے لئے وہ مجبور ہو گئی ہیں کہ نوخیز اور بے تجربہ امریکہ کو طوفان خطرات سے نجات دینے کے لئے سرگرمی سے میدان میں آجائیں ۔"

جب امریکہ میں یہ خبر پہونچی تو وہاں کے عوام میں ایک زبردست ہیجان پیدا ہو گیا ۔ اور ہر طرف اس مسئلہ کے متعلق ایک زبردست ایجیٹیشن شروع ہو گیا ۔

جیمس منرو نے مسٹر جفرسن (Jefferson) سے جو امریکہ کا تیسرا صدر تھا اور بہت مشہور مدبر تھا ۔ اس اہم مسئلہ کے متعلق مشورہ کیا اور اس سے دریافت کیا کہ اسوقت متحدہ امریکہ کی روش کیسی ہونی چاہیئے ۔

جفرسن نے اس کا جواب دیا اور نہایت دانشمندی سے حسب ذیل امور کا اظہار کیا ۔

اس نے کہا کہ ہمیں سب سے زیادہ جس چیز کا خیال رکھنا چاہئے وہ ہمارا باہمی اتحاد و اتفاق ہے ۔ ممالک امریکہ کے تمام حصوں کو اسطرح وابستہ رہنا چاہئے کہ ان کو کوئی نہ جدا کر سکے کیونکہ اگر امریکہ میں یورپ کی طرح اختلاف پیدا ہوا تو یہ ہمارے لئے درست نہ ہوگا ۔

دوسرے یہ کہ ہم کو کسیطرح بھی امریکہ کے معاملات میں یورپ کی مداخلت کو گوارا نہ کرنا چاہئے ۔

چنانچہ جیمس منرو نے ۲ ربیع الاول ۱۲۳۹ھ میں اپنی سالانہ تقریر میں ممالک متحدہ کی پارلیمنٹ کے سامنے نہایت زور دار الفاظ میں اعلان کیا ۔

"کہ جو حکومتیں آزادی کی دولت سے مالا مال ہو چکی ہیں ہم ان کے معاملات میں یورپ کی مداخلت کو کسی طرح برداشت نہیں کر سکتے ۔"

اگر یورپ کی کسی حکومت نے یہ قصد کیا کہ کسی آزاد حکومت کو اپنے قبضۂ تصرف میں لا کر اسکو آزادی کی نعمت سے محروم کر دیا جائے تو اسکو سمجھنا چاہیئے کہ یہ طرز عمل ہمارے لئے کھلم کھلا دشمنی کا اعلان ہوگا ۔"

یہ قانون جو نہایت اہمیت رکھتا تھا اور جو توجہ کا محتاج تھا بہت عرصہ تک بے نیازی کا مرکز بنا رہا ۔ یہانتک کہ امریکہ کی پارلیمنٹ نے بھی بحیثیت قانون اس کو پاس نہیں کیا ۔

لیکن ایک مدت کے بعد پارلیمنٹ نے اسکو ولایات متحدہ امریکہ کے بنیادی قانون کے طور پر منظور کر لیا ۔

پارلیمنٹ کی منظوری کے بعد آہستہ آہستہ مختلف ملکوں نے بھی سرکاری طور پر اس کی تصدیق کر دی ۔

چنانچہ جب فرانس نے ۱۲۶۴ھ میں شمالی امریکہ کے ایک حصہ پر قبضہ کر کے اسکو اپنے ماتحت کرنا چاہا تو ولایات متحدہ کی حکومت نے منرو کے اسی قانون کے مطابق حکومت فرانس کو سخت تنبیہ کی اور حکومت فرانس کو مجبور کر دیا کہ وہ مقبوضہ علاقہ سے علیحدگی اختیار کرے ۔

اسی طرح جب ۱۳۱۳ھ میں حکومت انگریزی اور ولایت ونزولا جو جنوبی امریکہ کا ایک حصہ ہے ان میں تقرر سرحد کے متعلق اختلاف پیدا ہوا تو حکومت متحدہ نے دولت انگریزی کو اسکا بالکل موقع نہیں دیا کہ وہ اس معاملہ میں خودسرانہ روش اختیار کرے اور یہ کہا گیا کہ اس قضیہ کا فیصلہ کیلئے ممالک متحدہ کی حکومت ایک خاص ہیئت مقرر کریگی جو تحقیق کے بعد سرحد کے تعین کا فیصلہ کریگی ۔

انگریزی حکومت نے ابتداً اس امر کو تسلیم کرنے میں بہت پس و پیش کیا لیکن دولت متحدہ برابر اس پر زور دیتی رہی کہ حکومت انگریزی آئین منرو کو دولت امریکہ کے بنیادی قانون کی حیثیت سے تسلیم کرے اور اس امر کی تصدیق کرے کہ امریکہ کے معاملات کے تصفیہ کا حق خود امریکہ کو حاصل ہے ۔

چنانچہ انگریزی حکومت مجبور ہوئی کہ سر تسلیم خم کرے ۔ ۱۰ جمادی الاول ۱۳۱۳ھ میں حکومت انگریزی اور ولایات متحدہ امریکہ میں ایک معاہدہ ہوا جسمیں آئین منرو کو قبول کر لیا گیا اور اس امر کی تصدیق کر دی گئی کہ امریکہ کی مختلف ولایات کی آزادی کی حفاظت ممالک متحدہ کی حکومت کا حق ہے ۔

جنگ عظیم کے موقعہ پر یہی بنیادی قانون تھا جس نے ممالک متحدہ کو جنگ میں شرکت کرنے سے حتی الامکان روکے رکھا ۔ لیکن جرمنی کی دریائی لڑائی نے اسکو مجبوراً کر دیا کہ جنگ میں دخل دے ۔

لیکن اسوقت تک آئین منرو مختلف حیثیت سے دنیا پر اثر انداز ہے ۔ یہی قانون ہے جسکی بنا پر دولت متحدہ امریکہ یورپ کے معاملات میں دخل اندازی کرنے سے مجبور ہے ۔

اگرچہ حکومت متحدہ نے دنیا میں جو عظیم الشان مالی اور جنگی پوزیشن حاصل کرلی ہے۔ اس پر اعتماد کرتے ہوئے اگر امریکہ چاہے تو یورپ کے معاملات میں بے خوف خطر کود سکتا ہے۔ یہ بھی ممکن ہے کہ اگر کبھی امریکہ کی نیت خراب ہو تو وہ اپنے منافع کی خاطر یورپ سے جنگ وپیکار کے لئے تیار ہو جائے۔

لیکن ابھی تک امریکہ میں آئین منرو کے طرفدار بہت زیادہ ہیں۔ اسلئے مخالفین آئین منرو جو تعداد میں بہت کم ہیں یہ جرأت نہیں کرسکتے کہ اسکی خلاف ورزی کریں۔

آخر میں جبکہ آئین منرو کے متعلق پورے طور پر ہم بحث کر چکے ہیں۔ ایک خاص واقعہ کا ذکر کر دینا بہت مناسب ہوگا۔ جو منرو کی زندگی میں بہت حیرت انگیز ہے اور اسکی اخلاقی حالت پر خاص روشنی ڈالتا ہے۔

کہتے ہیں کہ جب منرو ۱۸۲۴ء میں اپنے دوسرے انتخاب کی مدت ختم کرکے امور حکومت سے کنارہ کش ہوا تو وہ بہت غریب حالت میں تھا اور اس پر بہت لوگوں کا قرض تھا۔

حقیقتاً یہ امر نہایت حیرت انگیز ہے کہ منرو اگرچہ بہت سے ممتاز عہدوں پر رہا اور اس کے بعد چار سال تک جمہوریت کی صدارت کے فرائض بھی اس نے انجام دئے۔ لیکن آخر میں اس نے یہی نہیں کہ کوئی سرمایہ چھوڑا ہو بلکہ وہ تہیدست۔ محتاج۔ ضرورتمند اور مقروض تھا۔

(کاوہ برلن)

حامد الانصاری غازی
(فاضل دیوبند)

امام حسینؑ کی تلوار کی روانی

یاں گوشۂ عزلت غم شمشیر نے چھوڑا — واں سہم کے چلّے کو ہراک تیر نے چھوڑا
کس قہر سے گھر موت کی تصویر نے چھوڑا — ساحل کو صفِ لشکرِ بے پیر نے چھوڑا
عنقائے ظفر فتح کا در کھول کے نکلا
شہبازِ اجل صید کو پر تول کے نکلا

بے پاؤں جدھر ہاتھ سے چلتی ہوئی آئی — ندی اِدھر اِک خون کی اُبلتی ہوئی آئی
دم بھر میں وہ سو رنگ بدلتی ہوئی آئی — پی پی کے لہو لعل اُگلتی ہوئی آئی
ہیرا تھا بدن رنگ زمرد سے ہرا تھا
جوہر نہ کہو پیٹ جواہر سے بھرا تھا

سر پٹکے تو موج اس کی روانی کو نہ پہنچے — قلزم کا بھی دھارا ہو تو پانی کو نہ پہنچے
بجلی کی تڑپ شعلہ فشانی کو نہ پہنچے — خنجر کی زباں تیز زبانی کو نہ پہنچے
دوزخ کی زبانوں سے بھی آنچ اسکی بڑی تھی
برچھی تھی۔ کٹاری تھی۔ سروہی تھی۔ چھری تھی

میر انیس مرحوم

بہادر حریف

صلیبی لڑائیوں کا ایک واقعہ

افراد ڈراما

سلطان صلاح الدین - مسلمانوں کا خلیفہ۔
کنگ رچرڈ - انگلستان کا بادشاہ
کونٹ ڈیواک - ارل آف کلرلینڈ۔ کنگ رچرڈ کا خاص مصاحب
پاپائے کنٹربری - صلیبی لڑائیوں میں پاپائے اعظم کا قائم مقام۔
حکیم عبدالاحد - سلطان صلاح الدینؒ کا خاص حکیم۔

پہلا منظر

انگلستان کا شاہی خیمہ، جس میں کنگ رچرڈ بخار کی حالت میں نیم بے ہوش پڑا ہے۔ کونٹ ڈیواک تیمارداری کے لئے قریب بیٹھا ہے۔

رچرڈ (کراہتے ہوئے) معلوم ہوتا ہے کہ یہ نامراد بخار اب مجھے لئے بغیر نہیں رہیگا۔ کیا میری فوجیں لاوارث رہجائیں گی اور فتح یروشلم کا سہرا کسی اور بادشاہ کے سر ہوگا۔

ڈیواک کونٹ - خدارا ایسی باتیں نہ کہئے۔ اس لڑائی کا انجام آپ ہی کی ذات سے وابستہ ہے۔ ارض مقدس کی آزادی کا نشان انگلستانی پھریرا ہی ہوگا۔ اور وہ دلاور رچرڈ کی ماتحتی میں گاڑا جائیگا۔

رچرڈ - کیا فلپ (فرانس کا بادشاہ) آزادی کے شادیانے بجاتا ہوا مجھ سے پہلے مقدس صلیب تک پہنچ جائیگا۔ اور میں یوں ہی بیکار پڑا رہوں گا

کونٹ - پیارے آقا! شاہ برطانیہ کے بغیر کس کی ہمت ....

(باہر سے) "اللہ اکبر"

رچرڈ - یہ کیا؟ ہمارے کیمپ میں مسلمان؟ ......

کونٹ - اٹھئے نہیں، اس کمزوری کی حالت میں حرکت نقصان دہ ہے میں ابھی باہر خبر لے کے آتا ہوں۔

(کونٹ چند لمحے کے بعد واپس آجاتا ہے)

کونٹ - عجیب قصہ ہے!

رچرڈ - کیا؟

کونٹ - سلطان کی فوج کا ایک دستہ ہمارے خیموں کے قریب کھڑا ہے اس کے ہمراہ صلاح الدین نے اپنا شاہی طبیب آپکے علاج کیلئے بھیجا ہے۔ ایک صلیبی نائٹ بھی ہمراہ ہے۔

رچرڈ - کیا خوب؟ یہ بھی کہیں میری جان لینے کے لئے کوئی سازش تو نہیں؟

کونٹ - ہوسکتا ہے۔ ان پر فوراً اعتبار کرنا تو بیوقوفی سے خالی نہیں۔

رچرڈ - اور وہ مسیحی نائٹ.....

کونٹ - ویز کا سر ایتھم۔ اپنی جرأت کے سبب مشہور ہے۔ اس کی تلوار صلیب کی حفاظت میں کئی بے دینوں کو مٹا چکی ہے۔

رچرڈ - وہ سلطان تک کیونکر پہنچا؟

کونٹ - اسے مجلس عالیہ نے اینگڈی کے سینٹ کے پاس بھیجا تھا۔ وہاں امیر کے آدمیوں نے اس سے حکیم کی رہبری کی درخواست کی وہ انہیں یہاں لے آیا ہے۔

رچرڈ - حکیم کو میرے پاس لے آؤ، میں اس سے مفصل حالات دریافت کرونگا۔

کونٹ - عالی جاہ! آپ کیا بھولی باتیں کرتے ہیں۔ ان کا خیمہ میں داخل ہونا بھی خطرے سے خالی۔ یہ محمد (صلے اللہ علیہ وسلم) کے پیرو بہت چالاک ہوتے ہیں۔ ایسی ایسی چالیں بنانے میں مہارت رکھتے ہیں کہ ان کے قریب جانا بھی موت کو پاس بلانا ہے۔ میں اسے اچھی طرح آزمانے سے پہلے یہاں آنے کی اجازت نہیں دونگا

(۵۰۰ پر)

دوسرا منظر

(ایک ایشیائی خیمہ جس میں ایک مسلمان بوڑھا ایک طرف بیٹھا مطالعہ میں مصروف ہے۔ دروازے پر ہلال احمر کا نشان لہرا رہا ہے۔ کونٹ پاپائے کنٹربری سمیت داخل ہوتا ہے)

کونٹ (ملی جلی زبان میں) خوش آمدید۔ آپ ہی سلطان کے بھیجے ہوئے حکیم ہیں۔

عبدالاحد۔ آپ پر سلامتی ہو میں ہی امیرالمؤمنین کے ارشاد کے موافق شاہِ برطانیہ کے علاج کے لئے حاضر ہوا ہوں۔

پوپ۔ آپ کے پاس اس بات کا کوئی ثبوت ہے؟

عبدالاحد۔ ہاں! فخرِ اسلام، جہاں پناہ کے دستِ مبارک کا لکھا ہوا ایک خط مریض بادشاہ کے نام .....

(کونٹ اس سے وہ رقعہ لے لیتا ہے)

پوپ۔ اچھا ہم شاہی شفاخانہ سے اپنے حکیموں کو بلاتے ہیں۔ آپ اپنے علاج کے طریقے سے انہیں آگاہ کر دیں۔ پھر اُن کی رائے کے مطابق آپ کو بادشاہ کے علاج کے لئے مقرر کیا جائیگا۔

عبدالاحد۔ اس سے آپ کا مطلب؟ میں یہاں بحث مباحثوں کیلئے نہیں آیا۔

کونٹ۔ تو پھر حکمت کے کمال کی کوئی مثال پیش کیجئے۔

عبدالاحد۔ نہایت شوق سے۔ جس مرض میں آپ کے بادشاہ بیمار رہیں اُن بیماروں سے تمام نصرانی خیمے بھرے پڑے ہیں۔ آپ کسی بیمار کو میرے پاس بھیجدیں اور اس علم کو جو اللہ پاک نے اس ناچیز بندہ کو بخشا ہے اپنی آنکھوں سے ملاحظہ کر لیں۔

کونٹ اور پوپ (ایک زبان) بہت بہتر۔ (پردہ)

تیسرا منظر

(شاہ رچرڈ کا خیمہ۔ کونٹ کی واپسی۔

رچرڈ۔ کہو بھئی! کیا کر کے آئے؟

کونٹ۔ ایک بخار کے بیمار کو حکیم کے سپرد کر آیا ہوں۔ اس نامراد وبا کے باعث مرنے کے قریب تھا۔ اب دیکھیں حکیم کی حکمت۔

رچرڈ۔ سلطان نے کچھ پیغام بھی بھیجا ہے؟

کونٹ۔ ہاں ہاں! یہ ہے اُس کا رقعہ میں ترجمہ کروا کے لے آیا ہوں۔

رچرڈ۔ سناؤ تو کیا لکھا ہے؟

کونٹ (رقعہ پڑھتے ہوئے) خلیفۃ المسلمین امیرالمؤمنین سلطان صلاح الدین اعظم کی طرف سے سلطان رچرڈ شاہ برطانیہ کو اگر وہ ہدایت کی پیروی کرے اور دین حق کی [illegible] رخنے سے نگاہ اٹھا کر (خدا اس مسلمان کا غرور غارت کرے۔ مقدس باپ اس کو خاک میں ملا دے) (پھر خط پڑھتے ہوئے) دربارِ عالی میں اُس شیردل جوانمرد کی بیماری کی خبر پہنچی۔ ہماری طبیعت نے یہ گوارا نہ کیا کہ ایسا بہادر انسان بخار کی نذر ہو جائے۔ لہذا طبیب خاص علاج کے لئے بھیجا جاتا ہے۔ خدا کی رحمت اور اس کے رسول کی برکت سے عبدالواحد کا دستِ شفا مریض کے لئے .....

رچرڈ۔ کون رسول؟ محمد (صلے اللہ علیہ وسلم) مجھے اس کی برکت درکار نہیں، موت بہتر ہے۔ پھاڑ دو اس کاغذ کو۔

(ایک نائٹ داخل ہوتا ہے)

کونٹ۔ مسیح کی برکت شامل حال ہو، سرہنری کیا خبر لائے؟

سرہنری۔ سلطانی دستہ کا کمان افسر دو سپاہیوں کے ساتھ آیا ہے۔ اور خیمہ میں داخلہ کی درخواست کرتا ہے۔

کونٹ (ذرا تامل سے) کتنے آدمی ہیں۔ تین؟

سرہنری۔ ہاں، بہادر کونٹ کل تین بے ہتھیاروں کے شخص ہیں۔ وہ بڑے بڑے طشت اُٹھائے ہوئے ہیں۔ جن میں کچھ پھل معلوم ہوتے ہیں۔

کونٹ۔ اچھا (سوچ کر) چھ ہتھیار بند نائیٹوں کی حفاظت میں انہیں اندر لے آؤ۔

(تین بلند قامت، خوبصورت مسلم نوجوان برہنہ تلواروں کے نیچے سر رکھے خیمہ میں داخل ہوتے ہیں)

مسلمان کمان افسر۔ بہادر شاہِ برطانیہ کو امیرالمؤمنین کا سلام پہنچے (رفقا سے مخاطب ہو کر) کیا نہتے سفیروں پر ننگی تلواروں کا پہرہ فرنگی قانون جنگ میں جائز ہے؟

کونٹ (سختی سے) تم بات کرو۔ کیا پیغام لائے ہو؟

مسلمان۔ خلیفۃ المسلمین نے خدا اُن کا حافظ ہو بیمار شاہِ فرنگ کے لئے۔ تازہ میوے ارسال کئے ہیں۔ تاکہ کمزور جسم کو طاقت بخشیں اور خشک حلق کو تر کرنے میں کام آویں۔

کونٹ۔ وہاں میز پر رکھ دو ـــ اور کچھ؟

مسلمان۔ بس اے نوجوان۔

(مسلمان چلے جاتے ہیں)

رچرڈ۔ کیا خوشنما رومال ہیں، ذرا اُٹھاؤ تو دیکھیں در پردہ کیا ہے۔

(کونٹ رومال اُٹھا دیتا ہے)

رچرڈ۔ صلیب کی رحمت ہے۔ اس سے پہلے میں نے ایسے خوشنما پھل

کہیں نہیں دیکھے، یہ طلائی طشت ـــــ ان میں میرے جواہرات ـــــ آہ سلطان کے پاس کس قدر دولت ہے ـــــ کس قیمت کے ہوں گے ـــــ انگور کا ایک دانہ تو چکھاؤ۔

کونٹ۔ ایک رکاب کی لاگت ـــــ دس ہزار ـــــ لیکن جواہرات چالیس ہزار اشرفی سے کسی صورت کم نہ ہوں گی۔

(انگور کھٹی طاقتور عرق سے تر ہیں، حلق سے اترتے ہی بادشاہ کے جسم میں ایک نئی روح پھونک دیتے ہیں)

رچرڈ۔ چند دانے اور لاؤ۔ (پردہ)

چوتھا منظر

(دو روز بعد رچرڈ کا وہی خیمہ۔)

رچرڈ۔ یہ پھل کھانے سے میرے بخار کی شدت جاتی رہی ہے۔ آہ کیا لطیف ہیں۔

کونٹ۔ ایشیائی لوگ علاج کے فن میں اپنا جواب نہیں رکھتے۔ سلطان کے حکیم کے علاج سے وہ مرنے کے قریب سپاہی اچھا ہو گیا۔ کاش، ایسی مہذب اور عالم قوم کو ہم عیسائی بنا سکتے۔

رچرڈ۔ خدا کے لئے اس حکیم کو جلد بلاؤ۔ میرا دل میدان میں جانے کے لئے بیقرار ہو رہا ہے۔

کونٹ۔ لیجئے، ابھی حاضر کرتا ہوں۔

(ایک خادم کو بھیج کر حکیم کو بلواتا ہے۔)

عبدالاحد۔ نصرانیوں کے عالی وقار بادشاہ خدا آپ کی روح اور جسم دونوں پر فضل کرے۔

رچرڈ۔ آؤ شیخ حکیم، صلیب کی برکت سے تمہارا آنا ہمارے لئے مبارک ہو۔

عبدالاحد۔ کیا بادشاہ کا علاج اب سے شروع کر دیا جائے؟

رچرڈ۔ ہاں جلد سے جلد۔

کونٹ۔ دیکھو مسلمان حکیم! اگر آپ کے علاج سے بادشاہ کو کسی قسم کا نقصان پہنچ گیا تو اسی خیمہ میں آپ کی بوٹی بوٹی نوچ ڈالی جائیگی۔

عبدالاحد۔ خدا بادشاہ کو صحت دے (نبض دیکھ کر) انشاء اللہ جلد صحت ہو جائے گی۔

(دوائیں گھول کر بادشاہ کو پلاتا ہے)

(کونٹ سے) دیکھئے اب آئندہ چوبیس گھڑی کیلئے خاموشی ضروری ہے۔ بادشاہ اب نیند میں رہیں گے۔

کونٹ۔ بہت بہتر۔ سر[1] حکیم ایسا ہی ہوگا۔

عبدالاحد۔ لیکن خیمہ کے باہر شور ہو رہا ہے۔

کونٹ۔ میں سپاہی مقرر کئے دیتا ہوں۔ چڑیا تک بھی پھٹکنے نہیں پائے گی۔

(تمام کیمپ خاموش ہو جاتا ہے) (پردہ)

پانچواں منظر

(چار روز کے علاج کے بعد وہی خیمہ اور شام کا وقت)

(رچرڈ سو رہا ہے)

عبدالاحد۔ آج بادشاہ خدا کے فضل سے بالکل تندرست ہیں۔ ذرا جسم کو ہاتھ لگائیے۔ حرارت بالکل جاتی رہی ہے۔

کونٹ۔ واقعی! آپ کا علاج ہے یا طلسم۔

عبدالاحد۔ یہ سب کچھ اس دو جہان کے رب کا بخشا ہوا ہے۔

کونٹ (خود کو) اللہ رے مسلمانوں کا ایمان۔ ہر بات کو خدا سے ملا دیتے ہیں اور اپنی محنت اور ہمت کو کوئی وقعت نہیں دیتے۔

عبدالاحد۔ ذرا اس مرکب اکسیر حیات کا اثر دیکھئے۔ میں بادشاہ کے ماتھے پر اس کا لیپ کرتا ہوں۔

(کونٹ خاموش ہو کر دیکھتا ہے۔ دوا کا لیپ ہوتے ہی بادشاہ آنکھیں کھول دیتا ہے)

عبدالاحد۔ بادشاہِ یورپ مزاج کیسا ہے؟

رچرڈ۔ جسم بالکل درست ہے۔ معمولی سی تکان، جیسی لڑائی میں بھی ہو جایا کرتی ہے، موجود ہے۔

عبدالاحد۔ بس اب تین دن اور لیٹے رہئے۔ پھر آہستہ آہستہ ورزش شروع کر دیجئے (کونٹ سے) اس ہفتہ ان کی غذا کا خاص خیال رہے۔ کوئی ثقیل خوراک ان کے حلق سے اترنے نہ پائے۔ میوے جس قدر استعمال کریں بہتر ہے۔ یہ عرق سے بھرا شیشہ میں آپ کو دے جاتا ہوں ہر دو گھڑی کے بعد ایک ایک گھونٹ پلواتے جائیے۔ اس سے گئی ہوئی قوت پھر لوٹ آئے گی۔

عبدالاحد (کچھ دیر بعد رچرڈ سے) عالی جاہ! آپ بفضل حکیم مطلق (خدا) بالکل تندرست ہیں، میرا علاج ختم ہو چکا۔ اب میں اجازت چاہتا ہوں۔

رچرڈ۔ سر حکیم۔ میں آپ کا بہت شکر گذار ہوں۔ کیا چیز آپ کی نذر کی جا سکتی ہے؟

(کونٹ سے) خزانہ سے بیس ہزار اشرفیاں اس عالم کو بخشش دی جائیں۔

[1] عادت کے مطابق ہر بڑے شخص کو لفظ سر سے خطاب کیا جاتا ہے۔

عبدالاحد۔ اے بادشاہ ذی جاہ! مسلمان احسان کو بیچا نہیں کرتے۔ میں اپنے سلطان (خدا اُن کا حامی ہو) کا احسان فروخت نہیں کروں گا۔

رچرڈ (گلے سے سنہری صلیب اُتار کر) اچھا تو یہ صلیب میں تمہیں اپنی یادگار بخشتا ہوں۔ اس کے مالک کے لئے رچرڈ جان اور مال فدا کرنے سے کبھی عذر نہیں کرے گا۔

عبدالاحد۔ اے بادشاہ آپ بھول گئے کہ میں مسلمان ہوں، میں یہ صلیب نہیں لے سکتا۔

کونٹ۔ صلیب کی ہتک۔ منہ بندکر۔ ورنہ ابھی سر قلم کئے دیتا ہوں۔

رچرڈ۔ تلوار کو نیام میں کرو۔ وہ خدا کا گنہگار ہے۔ لیکن میرا محسن ہے

باہر سے "اللہ اکبر، اللہ اکبر... اشہد ان محمد الرسول اللہ...... حی علی الصلوٰۃ...... لا الٰہ الا اللہ"

عبدالاحد (اذان کے ختم پر) اب میں جاتا ہوں۔ میرے لشکر میں شام کی اذان ہو گئی ہے۔ نماز کے بعد ہمارا قافلہ دارالعدل (سلطان کے رہنے کی جگہ) کی طرف واپس ہو جائیگا۔ خدا حافظ

(باہر چلا جاتا ہے)

(پردہ)

نذیر رضوی

غزل

یہ لُٹی ہوئی سی بہار کیوں ہے کہاں وہ جان بہار ہے؟ ۔۔۔ یہ چمن سے کون چلا گیا؟ کہ کلی کلی کو فشار ہے

تجھے مرحبا کہ دلِ نزار بحال زار و نزار ہے؟ ۔۔۔ ترے دردِ عشق کو آفریں مری زندگی مجھے بار ہے

یہ انیسِ غمکدۂ قفس، ہے عزیزِ جاں مجھے ہم نفس! ۔۔۔ دلِ داغ دار غمِ بہار میں یادگارِ بہار ہے

تمھیں جاں فروز بنا کے جس نے جہاں فروز بنا دیا ۔۔۔ وہ فروغ بزم جمال کون ہے؟ عشق نادرہ کار ہے

ترے باغ میں ہے بہار، تجکو مبارک اے مرے باغباں ۔۔۔ جو کھُبا ہے میری نظر میں پھول۔ وہ انتخاب بہار ہے

میں بہارِ عمر کو سوگوارِ بہار بن کے گزار دوں؟ ۔۔۔ تری یہ رضا ہے تو اس رضا پہ بہارِ عمر نثار ہے

غمِ آشیاں مرے بال و پر کے قفس کو پھونک نہ دے کہیں ۔۔۔ یہ نوید مرگ ہے ہم قفس! کہ چمن میں جوش بہار ہے

نہیں اس میں شک کوئی تاجور کہ تڑپ ہے تیرے کلام میں
مگر اس میں تیرا کمال کیا؟ غم دوست درد نگار ہے

تاجور

چھوت چھات

جب جندرمہ عراق کے لفٹنٹ محمود جودت آفندی کورٹ مارشل کے روبرو خود اپنے ہی سواروں کی حراست میں پیش ہوئے تو انہوں نے میجر ——— کو جو کورٹ مارشل کے صدر تھے ایک عجیب و غریب طریقے سے سلام کیا۔ بجائے اس کے کہ انگریزی فوجی طریقے سے سلام کریں۔ اُنہوں نے اپنے ہاتھ کی انگلیوں کو ہتھیلی کی طرف جھکایا اور پھر اس کو پیشانی پر لیجا کر ایک زاویہ قائمہ بنا لیا۔ میجر نے میری طرف مخاطب ہو کر کہا کہ میں محمود جودت سے دریافت کروں کہ یہ طریقہ سلام اُنہوں نے کہاں سے سیکھا ہے۔ اور اس حرکت سے اُن کا کیا مطلب ہے۔ محمود جودت نے اپنی ترکی میں بگڑ کر کہا کہ کس سنجرے نے صدر کو سلام کیا ہے۔ اُنہوں نے تو صرف اپنی بدبختی کی لوح کو اپنی انگلیوں سے محسوس کیا تھا کہ وہ اپنی جگہ پر قایم ہے یا نہیں۔ صدر عدالت کو میں نے سمجھایا کہ محمود جودت کا سلام ترکی سلام ہے۔ اور محض عادتاً فراموشی کی حالت میں کیا ہے جس کے لئے وہ معذرت مانگتے ہیں۔ میجر نے کہا کہ ترک اس طرح کا فوجی سلام نہیں کرتے۔ میں نے جواب دیا کہ بدقسمتی سے ترک بلغاری۔ ہنگاری اور جرمنی کے ساتھ مخلوط ہو گئے۔ اور غالباً یہ طریقہ سلام بھی مخلوط سا ہے۔ صدر اور اُن کے ساتھی مسکرائے۔ پھر محمود جودت کو فردِ جرم سمجھانے کو کہا گیا۔ فردِ جرم یہ تھا۔

(۱) فلاں تاریخ کو جب شیخ محمود قرا داغی کی بغاوت شروع ہو گئی۔ اور ملیجہ کو کردی عشائر نے گھیر کر نشانہ تفنگ بنا رکھا تھا۔ وہ رات کے وقت اپنے افسرِ اعلےٰ کے پاس آئے اور اُن کو بغل میں دبا کر اُن کا بوسہ لینا چاہا۔

(۲) قرا داغی کی جنگ میں اُنہوں نے بعض ہندوستانی سپاہیوں کو گالیاں دیں اور ان کو تمنچے سے دھمکایا

(۳) وہ کئی بار اپنے رسالے سے مشتبہ طور سے غائب ہو جاتے تھے۔ اور دشمنوں سے سازباز رکھتے ہوئے پائے گئے۔

محمود جودت نے اس کا جواب ترکی میں کچھ اس طرح دیا کہ میں نے اُس کے زیادہ سمجھنے کی کوشش نہ کی اور اُن کی طرف سے عدالت کو جواب دیا کہ محمود بک کا پہلا فعل حالت اضطراری میں تھا۔ اور افسرِ اعلےٰ کو غلط فہمی ہو گئی۔ درحقیقت یہ بوس و کنار محض اس لئے تھا کہ خطرے کی صورت میں وہ ہراساں نہ ہوں دوسرے جرم سے نیک نیتی و جائز اشتعال طبع کی بنا پر انکار ہے۔ تیسرے جرم سے قطعی انکار ہے۔ مقدمہ شروع ہوا۔ اور محمود جودت کو دوسرے جرم کے اثبات پر تین مہینے کی سزا بھگتنے کے لئے مقامی حوالات میں بھیج دیا گیا۔

محمود جودت کا کورٹ مارشل ملیجہ ہی میں ہوا تھا۔ اور وہیں کے حوالات میں بند کئے گئے۔ ترکی قوانین جیل کے مطابق جس کی پیروی انگریزی حکومت بھی کر رہی تھی۔ قیدیوں کو سرکاری طور سے کھانا نہیں دیا جاتا تھا۔ بلکہ اس کا انتظام خود قیدیوں کے اعزہ و اقربا کرتے تھے۔ چونکہ محمود غریب الوطن تھے۔ اور ان کا کوئی پرسان حال ملیجہ میں نہ تھا۔ میں نے ان کی ہمرسانی خوراک کا انتظام خود اپنی جیب سے کر دیا۔ دوسرے روز میں نے ان کو حسب معمول اپنے گھر سے کھانا بھیجدیا۔ مگر محمود جودت نے کھانا یہ کہکر واپس کر دیا کہ وہ ہندی کا کھانا ایسا ہی حرام سمجھتے ہیں جیسا مردار کا کھانا۔ میرے دل کو اُن کے اِن خیالات سے بہت صدمہ ہوا۔ اور میں خود اُن کے پاس صلیت سمجھنے کے لئے گیا۔ بیچارے ایک بدبودار مکان کے سائبان میں اپنے بہت سے بدقسمت ساتھیوں کی طرح کاٹھ کے کندے میں پیر کے ساتھ بندھے ہوئے بیٹھے تھے۔ محمود جودت سے میں نے کہا کہ میں اس بات کو محسوس کرتا ہوں کہ وہ درحقیقت بالکل بے گناہ ہیں اور اُنکا سوائے اس کے کوئی قصور نہ تھا کہ رات کو شراب کے نشے سے بدمست ہو کر انگریزی کپتان کو گلے لگانے کی کوشش کی اور اس سلسلہ میں میں چاہتا تھا کہ شراب کی مذمت پر جو بدقسمتی سے ترکی افسران کی لازمہ زندگی سمجھی جانے لگی ہے ایک وعظ بھی کہہ ڈالوں۔ مگر محمود جودت کو یہ وعظ بے محل معلوم ہوا۔ میں نے پھر اپنی بریّت کے طور پر اُن سے کہا کہ اگر تم ہندیوں کا یہ قصور ہے کہ وہ انگریزوں کے ساتھ ہیں۔ تو یہ ہماری سیاسی مجبوری ہے اور اس سے وہ خود بھی پرسند نہیں۔ اگر ذاتی سوال ہے تو میری سمجھ میں نہیں آتا کہ اس کورٹ مارشل سے میرا کیا تعلق تھا اور اگر کچھ تھا بھی تو اس کی کوئی وجہ نہیں معلوم ہوتی کہ اس سے پہلے مجھ سے بے رخی و بے اعتنائی کیوں کی گئی۔ محمود جودت نے کہا کہ ذاتیات کا سوال نہیں۔ مجھے ہندی قوم سے سخت نفرت ہو گئی اور اس کی وجہ میں بیان کئے دیتا ہوں۔

آفندم! میری نفرت کی یہ وجہ نہیں کہ ہندی بالعموم دُبلے۔ پتلے

کالے بدصورت ہوتے ہیں اور اُن کی مظلوم و مقہور صورت دیکھ کر اُن پر بجائے رحم کے غصہ آتا ہے - محمود نے اتنی بات کہی تھی کہ میں نے انہیں روک کر کہا - قرنداشی - یکاباقی - بن دسن ہندی م - اس کے آگے میں یہ کہنا چاہتا تھا کہ میں بھی ہندی ہوں خود اپنی شکل و چہرے و قد کو مجھ سے موازنہ کرلو - قابل نفرت تم ہوگے یا میں - اس واسطے کہ محمود جودت یورپ کے تمدن کا نمونہ تھے جو قسطنطنیہ کے محلوں میں اناطول کے دیہات سے زیادہ نظر آتا ہے - چھوٹا قد - نحیف ولاغر اندام - سیاہی مائل - گندم گوں رنگ جو تہذیب جدید کی بدعنوانیوں - لامذہبیت اور کثرت شراب سے مسخ ہو چکا تھا - مگر میں نے ترکی میں اتنا ہی جملہ کہا تھا کہ محمود نے میری بات کو کاٹ کر کہا - ہاں مگر میں یہ نہ جانتا تھا کہ ہندی اپنی ظاہری صورت سے زیادہ باطنی صفات میں تاریک و مکروہ ہوتے ہیں - میرے چہرے پر غصے کے آثار نمایاں ہوگئے - مگر محمود نے اس کا مطلق خیال نہ کرتے ہوئے اپنے سلسلہ گفتگو کو جاری رکھا - میں نے اُن کے باطن کو قراداغ کے میدان جنگ میں دیکھا - ایک کُرد قیدی پیاس سے جاں بلب ہو رہا تھا - اُس نے شدت تشنگی میں اپنے ہندی محافظ سے کئی بار پانی مانگا - مگر غالباً وہ سمجھا نہیں - کُرد نے اس کی پانی کی کپی کو لیکر مُنہ لگاکر پانی پی لیا - معلوم نہیں اُس ہندی کی نظر میں وہ کیا جرم تھا کہ اس نے پانی کی کپی کو اس کُرد کے مُنہ سے چھین کر زمین پر پٹک دیا اور اپنی بربری زبان میں ذات دھرم ' خدا جانے کیا کیا بڑبڑاتا رہا - تھوڑے اور ہندی سپاہی وہاں جمع ہوگئے - میں دور کھڑا یہ ماجرا دیکھ رہا تھا - مجھے یہ توقع تھی کہ شاید دوسرے ہندی سپاہی اپنے ساتھی کی حرکت کو بُرا کہیں گے مگر اُنہوں نے اس سے زیادہ شور وغوغا مچایا - بلکہ ان میں سے ایک آدمی اس قدر آپے سے باہر ہوا کہ اُس نے اُس پیاسے کُرد کے مُنہ پر پیشاب کردیا - ہندیوں کے شور میں - ذات دھرم خراب - ذات خراب کے الفاظ سُنائی دیتے تھے - جب میں نے یہ دیکھا تو مجھ سے رہا نہ گیا - میں ان ہندی سپاہیوں کے پاس آیا اور غصے میں اُس مردود پر جس نے پیشاب کیا تھا اپنے طمنچے سے فیر کرنے کا ارادہ کیا - سارے ہندی مجھ سے لپٹ گئے اور مجھے مارتے پیٹتے خوماندان کے پاس لائے - اگرچہ میں انگریزی فوج کے ساتھ خود اپنی قوم کے خلاف لڑ رہا تھا - مجھ پر ذرا رحم نہ کیا گیا - اور نہ میری معذرت کی شنوائی ہوئی اور آج میں یہاں حبس خانہ میں ہوں -

میں نے کہا محمود جودت تمہارا بیان بالکل صحیح ہے میں نے خود بہت سے کردوں کی زبانی ان واقعات کو سُنا ہے - پھر میں نے ان کو سمجھایا کہ ہندوستان کے ترم مذہب والے عجیب و غریب رسم رکھتے ہیں وہ اپنے مذہبی خیال کے مطابق اپنے برتن کا پانی کسی غیر مذہب والے کو چھونے نہیں دیتے - لیکن میں ہندوستان کے قدیم مذہب کا پابند نہیں ہوں میں خدا کے فضل سے مسلمان ہوں - اور ہندیوں کا برتاؤ خود اپنے ہم قوم غیر مذہب سے بھی ایسا ہی ہے - چنانچہ میں نے خود ان کو اپنا ذاتی واقعہ سُنایا جو مجھ پر سامرا کے مارچ پر گذر چکا تھا جبکہ میں تشنگی سے جاں بلب ہو رہا تھا - مگر ایک بنگالی کمسریٹ کے بابو نے اپنی چھاگل کے پاس بھی مجھے آنے نہ دیا اور اگر ایک پنجابی مسلمان ڈرائیور نہ مل جاتا تو میں وہیں ختم ہو جاتا اور اس کے بعد میں کمسریٹ کے بابو اور میرا ساتھ دجلہ کے ایک اسٹیمر پر ہوا - اُس کے پاس کچھ کھانے کو نہ تھا - مگر جب میں نے اپنے کھانے میں سے کچھ نوالے اُس کو بھی بھیک دیئے تو وہ غرا کر کھا گیا - محمود جودت کا قصہ سُننے کے بعد پھر میں نے کوئی اصرار اپنی مہمانداری کا نہ کیا - بلکہ میں نے ایک کُرد نانبائی کو لگا دیا کہ ان کو دو وقتہ روٹی پہنچا دیا کرے -

اس ماجرے کو ساتھ آٹھ مہینے گذر چکے تھے - اور اس وقت میں چم چمال میں کام کر رہا تھا - دسمبر کے سخت جاڑے میں جبکہ کوہ قراداغ کی پہاڑیوں پر برف کی سفید چادر بچھ چکی تھی مجھے سلیمانیہ کے سفر کا اتفاق ہوا - ایک سرکاری فورڈ موٹر میں میرا کُردی ملازم ایک ہندوستانی ڈاکٹر جو ذات کا برہمن تھا - اور دو مرہٹے سپاہی کہرو برف میں روانہ ہوئے - ڈاکٹر سلیمانیہ کے ہسپتال میں سب اسسٹنٹ سرجن ہوکر جا رہا تھا - مرہٹے سپاہی اپنی رجمنٹ میں شامل ہونے کے لئے جا رہے تھے اور میں ترکی زبان کا امتحان دینے کے لئے - ہمارا موٹر درۂ بازیان سے نکل کر تھوڑی ہی دور گیا ہوگا کہ پانی تیزی سے برسنا شروع ہوا - تھوڑی دور تک تو موٹر کیچڑ میں گھسٹتا رہا مگر آخر میں اُس نے بالکل دم توڑ دیا - سنسان خشک پہاڑیوں میں ہم سب تنہا نہ جائے ماندن نہ پائے رفتن کے مصداق تھے پانی ختم گیا - مگر اس کے ساتھ برف گرنے لگا تھا - اور جوں جوں رات گذرتی جاتی تھی سردی بڑھتی جاتی تھی - ہم لوگوں نے کسی طرح گھس بیٹھ کر کسی طرح موٹر میں رات کاٹی - صبح کو جب بدن میں گرمی محسوس ہوئی تو بھوک لگی - کسی کے پاس ایک ٹکڑا روٹی کا بھی نہ تھی - اور سلیمانیہ وہاں سے اتنا ہی دور تھا جتنا چم چمال - سوائے اس کے کہ وہاں سے ہم پیدل روانہ ہو جائیں اور راستہ میں پہلا جھونپڑا یا خیمہ کسی کردی کا مل جائے - وہیں سستا کر روٹی مانگیں اور پیٹ بھر لیں کوئی دوسری صورت نظر نہ آئی - ہم لوگ روانہ ہوئے گو آفتاب نکل آیا تھا مگر ہوا اس قدر سرد و تند چل رہی تھی کہ باہر قدم رکھنا محال تھا - اُفتاں و خیزاں ہم لوگ چلے - کئی میل کے سفر کے بعد دُور ایک پہاڑی کے نیچے ایک کردی دیہات

نظر آیا۔ اور ہم لوگوں کو اس بات کا قطعی یقین تھا کہ اگر دیہات میں ایک گڑ بھی مل جائیگا تو ہماری روٹی کی فکر ہو جائے گی۔ ایسا ممکن نہیں کہ ہم لوگ دیہات سے بھوکے پھریں۔ دیہات میں گئے تو سب سے پہلے کتوں کا مقابلہ ہوا۔ اور اس منزل کو طے کرنے کے بعد جب دیہات کی عورتوں۔ بچوں کے تماشائی بننے کی دوسری منزل طے کی تو کدخدا[1] (کرد لوگ کوخہ کہتے ہیں) کی تلاش ہوئی۔ وہ بیٹھے اپنے مکان کے آگے ایک شکار کو چھری سے بنا رہے تھے میں نے سلام کیا۔ اُنہوں نے سر اُٹھا کر ہم کو دیکھا اور پھر ہماری جماعت کو۔ میں نے اپنا ماجرا سُنایا مگر وہ ذرا اس سے مس نہ ہوئے۔ میں نے پھر ایک مرتبہ صدا دی۔ مگر پھر بھی فقیر کی آواز خالی ہی گئی۔ اور وہ اپنا سر جھکائے کام میں مشغول رہے۔ ایک بار میں نے کرخت لہجہ میں پھر ان کو بیدار کرنا چاہا۔ اب کی بار اُس نے گالی دیکر کہا کہ اگر تم یہاں سے فوراً دور نہ ہو گئے تو میں اپنا شکاری کتا تم پر چھوڑ دوں گا۔ مجھے سخت حیرت تھی کہ آخر ماجرا کیا ہے۔ میں نے کوخہ سے لجاجت کی کہ میں مسلمان ہوں اور حیف ہے کہ ایک مجھ کا مسلمان ایسا برتاؤ اپنے بھائی مسلمان سے دیکھے۔ کوخہ نے کہا کہ میں ہرگز باور نہیں کرتا کہ تم مسلمان ہو۔ تم ناپاک ہندی ہو۔ اور قبل اس کے کہ تم ناپاک ہندی ہمارے دیہات کو اپنے وجود سے ناپاک کرو یہاں سے نکل جاؤ۔ کوخہ کو سمجھانا اب میرے بس سے باہر ہو گیا میں نے اپنے کردی ملازم حمہ گرمیانی کو مدد کے لئے بُلایا سا اور اس نے کوخہ کو اس قدر نرم کیا کہ وہ صرف مجھکو روٹی اور مٹھا کھلانے پر راضی ہوا۔ مگر ہمارے دوسرے ساتھیوں کے متعلق قطعی انکار کر دیا۔ میں نے کہا بہتر ہے۔ تم روٹی لاؤ۔ میں ہی کھاؤں گا اور میرے ساتھی اپنا بندوبست اور کہیں کر لیں گے۔ اتنا سُننا تھا کہ ہمارے بقیہ ساتھی ایک دم سے چلا پڑے کہ ہم لوگ بھی سب مسلمان ہیں اور یہ کہکر کلمے کے جُدا جُدا الفاظ بھی دہرائے۔ کوخہ نے کہا ٹھیرو اندر گیا سا اور اپنی پُرانی بندوق اُٹھا کر لایا اور ایک مرہٹہ سپاہی کو اپنی طرف کھینچ کر زمین پر گرا دیا۔ اور بندوق کی نالی اُس کی طرف کرکے کہنے لگا ذات خراب۔ دھرم خراب۔ اور اس کے بعد عجیب عجیب قسم کے کردی الفاظ کا ورد کرتا رہا جس سے میں نے یہ نتیجہ نکالا کہ وہ غالباً خاص اس موقعے و محل کے لئے وضع کئے گئے ہیں۔ اور عام کردی لغت میں وہ نہیں پائے جاتے۔

مرہٹہ سپاہی کا مارے ڈر کے پیشاب خطا ہو گیا جس پر ہم سب نے مل کر کوخہ کے پنجے سے اس بیچارے مرہٹے کو نجات دلائی جو ایسا معلوم ہوتا تھا جیسے کسی شیرِ ببر کے ہاتھ میں ایک لومڑی پھنس گئی ہے۔ جب کوخہ کا مزاج کچھ ٹھنڈا ہوا تو اُس نے مجھ سے مخاطب ہو کر کہا کہ اس کتے سے پوچھو کہ اس نے مجھ کو پہچانا بھی یا نہیں۔ میں نے تو اس کو پہچان لیا۔ وہ قرا داغ کے میدان جنگ کا قصہ شاید اس کو یاد نہیں رہا۔ مگر جب میں مڑا کا مرہٹے سے دریافت کروں کہ کیا ماجرا ہے معلوم نہیں اس کمبخت کو زمین کھا گئی یا آسمان۔ اسکے ساتھ دوسرے سپاہی کا بھی پتہ نہ تھا۔ ہم اور ہمارے ساتھی سب اسسٹنٹ سرجن کوخہ کے مہمان ہوئے جب اسسٹنٹ سرجن نے روٹی پر ہاتھ مارا تو میں نے کہا پنڈت جی ٹھہریئے۔ یہ روٹی ایک ناپاک کے ہاتھ کی کھا کر اپنا دھرم نشٹ نہ کیجئے میں آپ کو آٹے کا کچا سیدھا اور لکڑی دیئے دیتا ہوں خود آپ اپنی روٹی پکا لیجئے۔ مگر پنڈت جی نے اس کا وہی جواب دیا کہ میں تو ہندو دائی مچھوت چھات کو ہندوستان کے سمندر ہی میں غرق کر آیا۔ میں نے کہا معاف کیجئے گا۔ صرف یک طرفہ غرق ہوا ہے۔ یعنی لینے کے لئے غرق ہوا ہے۔ دینے کے لئے نہیں۔

ابن اسبیل

تارے

ویدنی شام کے نظارے ہیں　　زینت افزائے چرخ تارے ہیں
آتشیں پھول پیارے پیارے ہیں　　ضوفشاں نور کے شرارے ہیں
تابشِ انجم فروزاں ہے　　کہ شب تار جلوہ ساماں ہے
چرخ پر عالم چراغاں ہے　　گنبدِ نیلگوں درخشاں ہے
ان کی کچھ شان ہی نرالی ہے
تیرگی میں ہے نور کا عالم
نہ ہوں تارے تو رات کالی ہے
جلوۂ برقِ طور کا عالم
کہکشاں ہے کہ جادۂ زریں　　یا فلک پر ہے جادۂ سیمیں
تابش افزائے جلوۂ رنگیں　　بہرِ گردوں ہے مایۂ تزئیں
اس کی صنعت کے نقش سارے ہیں
مہر و مہ کہکشاں کہ تارے ہیں

(برق دہلوی)

---

[1] گاؤں کا مکھیا۔

شبابِ کشمیر

مولوی محمد الدین فوقؔ تعارف کے محتاج نہیں اُنکو تاریخ سے خاص دلچسپی ہے جو کچھ اُن کے قلم سے نکلتا ہے بے شبہ افسانہ نہیں بلکہ تحقیقات پر مبنی ہوتا ہے۔

"شبابِ کشمیر" میں سلطان زین العابدین معروف بڈشاہ یا بادشاہ کشمیر کے بادشاہ کے حالات بیان کئے گئے ہیں۔ مؤرخ موصوف نے مطبوعہ اور قلمی تاریخوں کا بغور مطالعہ کیا ہے بعض مقامات پر انہوں نے بعض مؤرخوں کی رائے سے اتفاق نہیں کیا ہے۔

اس کتاب کا مطالعہ ہمارے نوابوں راجوں، مہاراجوں کے لئے ضروری ہے اسمیں انتظامی لیاقت۔ علمی ذوق، رعایا کی بہبودی۔ مذہبی قیود کی پابندی اور مذہبی رواداری۔ نیک ضمیری، نیک چلنی، بے تعصبی ملکی فلاح عزبا کی پرورش، دینی بزرگوں کا احترام، صنعت حرفت اور زراعت کی ترقی میں سرگرمی۔ علم دوستی۔ فنونِ لطیفہ وقدردانی وغیرہ۔ بڈشاہ میں جو صفات موجود تھیں شرح وبسط سے بیان کی گئی ہیں۔ بعض روایتوں کے سوا جنکی تاریخی بنیاد نہیں جملہ واقعات مستند تاریخوں سے لئے گئے ہیں۔ مؤرخ خود کشمیری ہیں کشمیر اور کشمیریوں سے اُنکو اُنس اور اخلاص ہے۔ اکبر کا مقابلہ بڈشاہ سے کرتے ہوئے انھوں نے بڈشاہ کا مرتبہ بڑھا دیا ہے۔

اس کی نسبت ہم صرف اتنا کہینگے کہ دونوں کے زمانے ایک نہ تھے۔ حالات بھی مختلف تھے۔ ممکن ہے کہ جو کچھ بڈشاہ نے کیا اکبر نہ کرسکتا ہو۔ مشکل ہے کہ ... سے کبھی پسندیدہ نہیں ہوتے"۔ ہم ... تبصرہ میں تشنزا بالیں کا خلاصہ نہیں ... سکتے اوپر کی سطروں ... ان بالیں کا لب لباب الکھدیا ہے۔

مؤرخ موصوف کا دل تعصب سے قطعی پاک ہے۔ اسلام کے پھیلنے اور ... بان کے کشمیر ... کرنے اور اُن کی واپسی کے متعلق ... ہے اُن کی تحقیقات ... رواداری کی دلیل ہے۔ ہم یہاں چند فقرے نقل کئے بغیر نہیں رہ سکتے:۔

علیشاہ نے (جو بڈشاہ کا بھائی اس سے پہلے بادشاہ تھا) منصب وزارت پر اپنے چھوٹے بھائی شاہی خان کو سرفراز کیا اُسوقت ملک کی یہ حالت تھی کہ چاروں طرف ملک سیف الدین کے خوف اور تشدد سے سناٹا چھایا ہوا تھا۔ ہندو تو بالخصوص سہمے ہوئے تھے اور کھلے بندوں پوجا پاٹ بھی نہ کرسکتے تھے .... شاہی خان نے تھوڑی مدت میں عدل و انصاف کا وہ سکہ بٹھایا کہ ہندو جو ہمیشہ مضطرب الحال رہتے تھے امن و امان سے زندگی بسر کرنے لگے"۔ (صفحہ ۱۱۸)

زین العابدین کے تخت نشینی سے پیشتر ہی اس کے باپ اور بھائی کے زمانہ میں کشمیر کے کئی ہندو بعض جدید قوانین کی تاب نہ لاکر یا تو اسلام قبول کر چکے تھے یا ترک وطن کرکے ملک سے باہر چلے گئے تھے۔ (صفحہ ۲۶)

ایک اور مقام پر مؤرخ موصوف رنچن کے شاہ کشمیر کے اسلام قبول کرنے کے بعد ذکر یہ فرماتے ہیں:۔

بہت سے ہندو مشایخ کبار کے حسن خلق اور تعلیم اسلام کے تاثرات سے مسلمان ہو گئے۔ کئی ایسے تھے جن کو مصالح ملکی نے تبدیل مذہب پر مجبور کیا۔ ایک کافی تعداد ایسی بھی تھی جو سلطان بت شکن اور اس کے وزیر سیف الدین کے جوش مذہبی کی بدولت دائرہ اسلام میں داخل ہو گئی۔ بہت سے ایسے بھی تھے جو تشدد سکندری کی تاب نہ لا سکے اور ہجرت و ترک وطن پر مجبور ہوکر کشمیر سے باہر چلے گئے"۔ (صفحہ ۱۶۴ - ۱۶۷)

مؤرخ موصوف لکھتے ہیں کہ بڈشاہ کے زمانہ میں یہ تارکان وطن واپس آگئے۔ اور اپنے دہرم میں واپس لے لئے گئے۔ (صفحہ ۱۶۹ - ۱۷۱)

ایک اور امر قابل ذکر ہے:۔

ہندوؤں اور مؤرخوں نے بڈشاہ کی اس انصاف پروری کی سنہری لفظوں میں داد دی ہے کہ اس نے ہندوؤں کے مذہبی مقدمات کے تصفیہ کے لئے ہندو جج اور مسلمانوں کے لئے قاضی مقرر کر رکھے تھے اور جب مدعی اور مدعا علیہ ہندو اور مسلمان ہوتے تھے تو ان کے مقدمات کا تصفیہ دو جج ملکر کرتے تھے جن میں ایک ہندو ہوتا تھا اور ایک مسلمان۔ یہ وہ انصاف اور وہ عدل ہے کہ آج بھی ہندوستان کو کامل طور پر نصیب نہیں ہو سکا۔ (صفحہ ۱۹۱)

جہانتک ہم نے ہندوستان کے مطبوعہ تاریخوں کا مطالعہ کیا ہمیں کہیں اس بات کا پتہ نہیں چلتا کہ ہندوستان میں مسلمان بادشاہوں نے کبھی ادھر خیال بھی کیا ہو کہ ہندوؤں کے مقدمات کے لئے ہندو جج مقرر

کریں یا ہندو مسلمان ججوں کے پنچ بنجائیں۔ یہ فخر زین العابدین بڈشاہ ہی کو حاصل تھا۔ جو باب بڈشاہ کے ہندوؤں کے دلجوئی کے متعلق مؤرخ موصوف نے لکھا ہے وہ ساری کتاب میں زریں باب ہے ہم تفصیل میں جانا نہیں چاہتے صرف ایک فقرہ نقل کرتے ہیں:۔

"کوئی پنڈت سلطان بُت شکن اور سلطان علیشاہ کے زمانہ میں نہ اپنے آپ کو علانیہ ہندو کہہ سکتا تھا اور نہ اپنی پیشانی پر قشقہ لگا سکتا تھا...... بادشاہ نے پنڈتوں سے اس مصیبت کو بھی دُور کیا" (صفحہ ۱۹۵)

گیارہویں باب میں موسیقی کا ذکر ہے اسمیں چند غلطیاں واقع ہوئیں ہیں۔

(۱) شمیم نے کشمیری موسیقی پر پنجاب ہسٹاریکل سوسائٹی میں کبھی کوئی مضمون نہیں پڑھا۔ اس نے ایک مضمون کشمیری موسیقی پر زمانہ میں شائع کیا تھا۔

(۲) شرر کے مضمون میں ایرانی راگنیوں کا تو ذکر ہے مگر جہانتک ہمکو یاد ہے کشمیری موسیقی کا ذکر نہیں۔

(۳) حضرت فوقؔ یہ نہیں بتلاتے کہ کون ساز بڈشاہ نے ایجاد کیا تھا انہوں نے ایک ساز کا ذکر طبقات سے بدیں الفاظ نقل کیا ہے:۔

"کہ یک نقش را بہ دوازدہ مقام ادا می نمود" کم از کم ایسا کوئی ساز کشمیر میں موجود نہیں بلکہ دنیا بھر میں کہیں موجود نہیں۔

(۴) ایک اور مقام پر بھی مؤرخ موصوف مغالطہ میں پڑ گئے ہیں وہ فرماتے ہیں کہ کشمیری پنڈتوں نے موسیقی کو خود کبھی حاصل نہیں کیا۔ (صفحہ ۲۰۲)

صفحہ ۲۰۳ پر لودی بٹ مصنف رسالہ "زین" (موسیقی) کا ذکر فرماتے ہیں۔ صفحہ ۲۰۲ میں سوم پنڈت موسیقار اور مصنف رسالہ موسیقی مانک نام کا ذکر فرماتے ہیں۔ انکی آگاہی کے لئے عرض کیا جاتا ہے کہ سارنگ دیو کشمیری پنڈت بڑا نامی موسیقار گزرا ہے۔ جس نے شمالی ہند کی موسیقی کو ترتیب دیا۔ بیلسور کی لائبریری سے یہ کتاب ملی ہے اور مسٹر کلمنٹ نے کتاب ہند و میوزک میں اس کا اعتراف کیا ہے۔ یہ صحیح ہے کہ کشمیری ہندوستان میں موسیقی رفتہ رفتہ شرفا کے مشاغل سے نکل گئی۔

(۵) مسٹر غلام محی الدین صوفی کی کتاب اسلامک کلچر ان کشمیر میں سے مؤرخ موصوف عبارت ذیل نقل کرتے ہیں:۔

"وہ فتح پنجاب کے دوران میں اس مقام پر بھی ٹھہرا جسکو آپ امرتسر لکھتے ہیں وہاں اُس نے اپنی قومی ضروریات کی وجہ کو کنواں کھُدوایا تھا وہ ابتک بڈہ کھوہ کے نام سے مشہور ہے"

اس کے سن وسال سے مؤرخ موصوف اختلاف کرتے ہیں مگر صوفی صاحب کے بیان کی تردید نہیں کرتے۔ جہاں وہ "بڈہ کھوہ" زین العابدین (بڈشاہ) کا بنوایا ہوا بیان کرتے ہیں۔ دراصل یہ کنواں بڈہ کھوہ نہیں کہلاتا بلکہ بٹ کھوہ ہے جو کشمیری پنڈتوں کے قبضہ میں ہے۔ یہ کنواں مہاراجہ رنجیت سنگھ کے زمانہ میں نووارد کشمیری پنڈتوں نے بنوایا تھا اور بٹ کھوہ کہلاتا ہے۔ بٹ کشمیری پنڈت سے مراد ہے۔

مجموعی طور پر ہم حضرت فوقؔ کو مبارکباد دیتے ہیں کہ اُنہوں نے شباب کشمیر لکھکر درحقیقت علم تاریخ پر بہت احسان کیا ہے ارباب علم سے ہم اسکے مطالعہ کی پُرزور سفارش کرتے ہیں۔

شیونرائن شمیم

کیفِ برشگال

ہوائیں ٹھنڈی ٹھنڈی ہیں گھٹائیں کالی کالی ہیں — عجب کیف آفریں ایام فصل برشگالی ہیں
جدھر دیکھو ادھر سبزہ ہی سبزہ لہلہاتا ہے — نگاہیں ہوگئیں شاداب جس جانب بھی ڈالی ہیں
نکل آئی ہیں سینوں سے امنگیں تتلیاں بن کر — دلوں کی آرزوئیں خوفِ ناکامی سے خالی ہیں
پپیہے کی فغانِ درد ہے یا کوئی نشتر ہے — دلِ غمگیں کی جس نے آہ چوٹیں چھیل ڈالی ہیں
ڈھلا سورج تو پانی پھر گیا سونے کا سبزے پر — سنہرے بیل بوٹے پرتوِ شان جلالی ہیں
شفق آلودہ ٹکڑے بادلوں کے ہیں کہ اے ساقی — شراب ارغواں کی کشتیاں تو نے نکالی ہیں

یہ دو قوسِ قزح ہیں جلوہ فرما بامِ گردوں پر
فلک نے مام چھمن کی کمانیں یا نکالی ہیں

(جگر بریلوی)

مزارِ دوست

پردۂ ظلمت میں پنہاں ہو گیا ہے آفتاب
کُلفتِ منزل سے تھک کر سو گیا ہے آفتاب

دہر پہ رنگِ سکوتِ شام طاری ہو گیا
آسماں سے چشمۂ ظلمات جاری ہو گیا

مضطرب جذبات کا طوفان ہے دل میں موجزن
رنج و غم کا بحرِ بے پایاں ہے دل میں موجزن

آ گیا ہوں شورشِ ہستی کے ہنگاموں سے دُور
زندگی کے شور و شرِ بستی کے ہنگاموں سے دُور

منظرِ ناکامئے انسان ہے میرے سامنے
وادیٔ خاموشِ گورستان ہے میرے سامنے

موت کی گودی میں رند و پارسا خوابیدہ ہیں
اس سکوں آباد میں شاہ و گدا خوابیدہ ہیں

گونجتا تھا نام جن کا گنبدِ افلاک میں
دفن ہیں اُن سرفرازوں کی اُمنگیں خاک میں

یاس کی عبرت فزا تصویر یہ ویرانہ ہے
صحنِ گورستاں سراسر ایک حسرت خانہ ہے

گور کے آغوش میں اے دوست تو بھی ہے یہاں
میری قسمت کی طرح آسودۂ خوابِ گراں

کر دیا ہے ناوکِ فرقت نے میرا سینہ چاک
اور مرے ارمان تیرے ساتھ ہیں پیوندِ خاک

تُو نہیں تو نغمۂ بُلبل صدائے آہ ہے
وسعتِ گلزارِ عالم ایک وحشت گاہ ہے

میرا کاشانہ ہے اِس دنیا میں بس تیرا دیار
تو ہے جانِ زندگی۔ تربت تری میرا مزار

شب کی خاموشی میں بھی جاری ہے دورِ آسماں
قافلے ہیں چرخ پہ لرزاں ستاروں کے رواں

چھا گیا ہے سارے ویرانے پہ افسونِ سکوت
شمعِ مرقد کی طرح میں بھی ہوں مرہونِ سکوت

شمع اور میں دونوں نذرِ سوزِ غم ہو جائینگے
تیرے پیچھے راہئے ملکِ عدم ہو جائینگے

سیّد عبدالمجید اختر

نقائصِ شعری

"نقائصِ شعری" کے عنوان سے ایک تحقیقاتی مضمون پنڈت میلارام صاحب وفا مدیر روزانہ ویربھارت لاہور کا ادبی دنیا ماہ جولائی ۲۹ء میں چھپا ہے - جس اعلیٰ مقصد کو سامنے رکھکر یہ عمدہ مضمون لکھا گیا وہ قابلِ قدر اور تعریف کے قابل ہے - مگر کسی شعر کا نقص دکھلاتے ہوئے شاعر کی شخصیت کو اسکی، یا اس کے مداحوں کی ناخوشی کے خیال سے پوشیدہ رکھنا نہ کچھ مفید ہے نہ زیادہ نتیجہ خیز جسقدر زیادہ باکمال شاعر کے کلام پر تنقید ہوگی اور اس کے نقائص سامنے لائے جائیں گے اتنا ہی زیادہ اچھا ہے۔ کہ ایسے نقائص سے یا تو آئندہ پرہیز کیا جائے گا یا زبان کی ترقی کے لئے ان کو قبولِ عام کی سند مل جائے گی مثلاً :-

(ا) صفِ ماتم قاعدہ کے اعتبار سے غلط ہے مگر انیس مرحوم فرماتے ہیں ؎

بیٹی کو خبر اسکی نہ تھی یا شہِ عالم
بچھے گی زچہ خانہ کے اندر صفِ ماتم

(ب) شرابِ طہورا نہ فارسی و اردو میں صحیح ہے نہ عربی میں مسکین مونس مغفور لکھتے ہیں ؎

ہاں ساقیا شرابِ طہورا پلا مجھے
مرتا ہوں اے مسیحِ دوعالم جلا مجھے

غالباً جناب مغفور نے وَسَقٰهُمْ رَبُّهُمْ شَرَابًا طَهُورًا کو سامنے رکھکر یہ تصرف کیا ہے۔

کسی شاعر کی شخصیت کا اظہار کئے بغیر اگر ہم نے اس کے کلام پر تنقید کی اور کسی دوسرے بزرگ نے اس تنقید کو غلط سمجھ کر اعتراض کیا، اور ہم نے اپنی قابلیت کے موافق اس تنقید کا جواب لکھا، تب بھی تو دو شخص ایک دوسرے کے مخاطب ہوں گے -

دُور جانے کی ضرورت نہیں - وفا صاحب نے جو نقائص بعض اشعار میں دکھلائے ہیں اور منجملہ ان کے چند میرے نزدیک صحیح نہیں تو بیں جناب ممدوح کی تحریر کا حوالہ دیکر ہی کچھ لکھ سکتا ہوں - اور اس طرح تجویز کئے ہوئے اصول یقیناً چھوڑنا پڑیں گے . یا اسی شعر پر کہ .

؎ عشرتِ قطرہ ہے دریا میں فنا ہوجانا
درد کا حد سے گزرنا ہے دوا ہوجانا

شاعر کا نام اور تخلص ظاہر کئے بغیر میں یہ اعتراض کرونگا کہ "عشرت" کی جگہ "ہستی" ہونا چاہئے - تو کوئی عالم اور ماہرِ فن بزرگ "عشرت" کی خوبی اور لطف دکھلاتے ہوئے ضرور مجھے مخاطب بنائیں گے -

اسی مطلب کو دوسری طرح یوں سمجھئے کہ ایک نقاد جب دو شاعروں کے کلام کا مقابلہ کرے گا تو وہ ان شاعروں کی شخصیت کو چھپانا پسند نہ کریگا - مثلاً :-

(۱) یہ تری چشمِ فسوں گر میں کمال اچھا ہے
ایک کا حال بُرا ایک کا حال اچھا ہے

(۲) دل مرا، آنکھ تری، دونوں ہیں بیمار مگر
ایک کا حال بُرا ایک کا حال اچھا ہے

(۳) وہ عیادت کو مری آتے ہیں لو اور سنو
آج ہی خوبیٔ تقدیر سے حال اچھا ہے

(۴) موت کیوں پوچھیگی پھر آنکھ کے بیماروں کو
جب تمہیں دیکھ کے کہتے ہو کہ حال اچھا ہے

جب تک میں یہ نہ بتاؤنگا کہ اشعار ۱و۳ حضرت داغ اور ۲و۴ جناب جلال کے ہیں - بہت سے پڑھنے والے پورا لطف نہ اٹھائینگے - اسی کے ساتھ میرے یہ عرض کرنے پر کہ دوسرا شعر پہلے سے بڑھا ہوا اور چوتھا تیسرے سے گھٹا ہوا ہے داغ اور جلال مرحوم کے تعریف کرنے والوں کو برا ماننے کی ضرورت نہیں وہ خاکسار کی رائے کو غلط قرار دیسکتے اور اس کے مناسب دلیلیں پیش فرما سکتے ہیں - مگر مجھ سے الجھ کر، اور مجھے بُرا کہکر ادب اردو میں کچھ اضافہ نہیں کر سکتے - اوپر لکھے ہوئے چاروں شعروں کے مقابلہ میں مرزا غالب نے سیدھے سادھے الفاظ میں جس اصلی کیفیت کا نقشہ کھینچا ہے - اسکو دیکھکر مرحوم کے خیال کی بلندی کی تعریف کرنے اور اُن کا کمال قبول کرنے کو جی چاہتا ہے -

؎ اُن کے دیکھے سے جو آجاتی ہے منہ پر رونق
وہ سمجھتے ہیں کہ بیمار کا حال اچھا ہے

خیراس بحث کو خاکسار دوسرے قابل حضرات کے لئے چھوڑ کر وفا صاحب کے اعلیٰ خیالات کی نسبت کچھ عرض کرنا چاہتا ہے:۔

ے
حملہ غضب ہے بازوئے شاہِ حجاز کا
لنگر نہ ٹوٹ جائے زمین کے جہاز کا

جناب وفاؔ نے اس شعر کے زورِ بیان اور زبان کی صفائی کی تعریف کرتے ہوئے لفظ "بازو" پر اعتراض کیا ہے یہ بیت غالباً میر انیس مرحوم کی ہے کیونکہ دوسرے مرثیہ میں میر صاحب ایک دردناک حالت کا نقشہ دکھلاتے ہوئے ان قافیوں کو اس طرح لکھ گئے ہیں :۔

ے
یوں گھر اُلٹ پلٹ تھا امامِ حجاز کا
جس طرح ٹوٹ جاتا ہے لنگر جہاز کا

پنڈت صاحب نے "بازو" کو بے ضرورت سمجھا، یا "بضرورت شعری" خیال کیا، حالانکہ اس میں سے ایک بات بھی نہیں۔ شاعر "بازو" کو بدن کے حصے کے بدلے "بھائی" کے معنی میں لکھ رہا ہے اس لئے "فوج کے قدموں کا حملہ"۔ "امان اللہ خاں کے ہاتھ کا حملہ" جس طرح "ذوقِ سلیم کو بُرا معلوم ہے"۔ بازو کا حملہ کیوں ناگوار گزرے گا۔

پہلے ہمیں اس مرثیہ کو دیکھنا چاہئے جس کے شعر پر بحث ہو رہی ہے اس میں اگر علی اکبرؑ کی لڑائی کا ذکر ہوتا تو بازو کی جگہ "دلبر" لکھا جاتا اور عام لڑائی کی صورت میں "لشکرِ شاہِ حجاز" تحریر ہوتا مگر مرثیہ گو نے چونکہ حضرت عباس علمدار کی لڑائی کا نقشہ کھینچا ہے لہذا "بازو" بھائی کے معنوں میں استعمال کیا ہے جسکو دوسرے حضرات بھی بلا تکلف استعمال کر چکے ہیں :۔

(صفدر) سقائے اہلبیت ہے بازوئے شاہ ہے
(وحید) کٹ گئے بازوئے شبیر کے بازو ہے ہے
(دلگیر) اُکھاڑا جب درِ خیبر علی نے بولے پیغمبر
مرا سا بازو اور یہ زور بازو ہو نہیں سکتا
(مونس) فتح تب ہاتھ آئی جب احمدؐ نے حیدرؑ کو کہا
ہاں مرے بازو جھپٹ کر بابِ خیبر کھولدے
(لاعلم) پڑھتا ہے آج رن میں رجز بازوئے حسینؑ
آنکھیں سوئے حریف ہیں دل ہے سوئے حسینؑ
جرأت کا جوش ہے یہ علی کے نشان کو
بھائی حسینؑ اگر کہیں تو الٹ دوں جہان کو

اردو شاعروں ہی پر منحصر نہیں، فارسی کے استادوں نے بھی بھائی کے معنوں میں "بازو" استعمال کیا ہے۔ چنانچہ مرزا رفیع باذل حملہ میں "اسد اللہ الغالب علی ابن ابی طالب" کا رجز یوں تحریر کرتے ہیں:

ے
منم آنکہ پروردگار مجید
مرا بہر دفع شما آفرید
منم شیر یزدان و شمشیر دین
منم بازوئے سید المرسلین

شعر زیر بحث میں بازو کی جگہ تاجر۔ یاور۔ عاشق۔ خادم۔ حامی وغیرہ الفاظ آسکتے تھے مگر جو خاص شان اب موجود ہے وہ باقی نہ تھی۔

عربی میں بازو کو عَضُد کہتے ہیں یہ تو مجھے معلوم نہیں کہ عَضُد کس جگہ بھائی کے معنوں میں استعمال ہوا یا نہیں مگر مددگار کے معنی میں ضرور آیا ہے :۔

(ا) وَمَا كُنْتُ مُتَّخِذَ الْمُضِلِّيْنَ عَضُدًا ۝ اور میں نہیں پکڑنے والا گمراہ کرنے والوں کے بازو یعنی مددگار (سورۃ الکہف ترجمۂ مولانا شاہ رفیع الدین صاحب دہلوی رحمۃ اللہ علیہ)

(ب) اَللّٰهُمَّ اَنْتَ عَضُدِيْ وَنَصِيْرِيْ۔ الٰہی تو میرا مددگار ہے (دعا کا ابتدائی حصہ)

ایک اور شعر جس کے عیب ظاہر کرنے میں پونا کالم صرف کیا گیا ہے :۔

ے
کون سی راہ چلوں کفر و محبت سچ کہہ
کام آئے گا وہاں مذہب اسلام کہ تو

وفا صاحب کے نزدیک۔ "اس شعر کا شمار ان شعروں میں بھی نہیں ہو سکتا جس کے معنی شاعر کے دماغ میں چھپے رہتے ہیں یا زیادہ سے زیادہ عقیدت مندوں کی آئندہ نسلیں اُنکو سمجھتی رہتی ہیں۔"

شعر جس کا بھی ہو ایسا نہیں جسکو بے معنی سمجھا جائے مگر وہ پنڈت صاحب کے سامنے غلط لکھا ہوا آیا۔ اور صحیح سمجھ لیا گیا۔ اس لئے اس میں بہت سے عیوب پیدا ہو گئے اور اُنہیں عیوب کو سامنے رکھکر تنقید ضرورت سمجھی گئی۔ اگر جناب وفاؔ کفر اور محبت کے بدلے "کفرِ محبت" پڑھیں تو پھر "سچ کہہ" اور "تو" کوئی معمہ نہ رہے۔ اور کفرِ محبت جو عاشق کے لئے عین ایمان ہے اس کا مقابلہ اسلام سے درست ہو جائے۔

یہ کفر تو وہ خاص انعام ہے جسکو سرمدؔ نے غمِ عشق بتا کر اس طرح لکھا ہے :۔

ے
سرمد غمِ عشق بوالہوس را ندہند
سوزِ دلِ پروانہ مگس را ندہند
عمرے باید کہ یار آید بکنار ✤ ایں دولت سرمد ہمہ کس را ندہند

اور اسی کفر کی ایک معمولی صفت یہ ہے کہ ایک وفادار شخص کو غالب مرحوم گور میں دفن کرنے کی سفارش کرتا ہے۔ ؎

وفاداری بشرط استواری عین ایمان ہے
مرے بُت خانے میں تو کعبے میں گاڑو برہمن کو

غرض کفرِ محبت کی خاص شان تو محتاجِ بیان نہیں ہاں اگر اس کے ساتھ کافریٔ حسن کے کرشمے بھی دیکھ لئے جائیں تو پھر اسی قسم کے اشعار پر تنقید کرتے ہوئے فلسفیانہ منطق کی ضرورت نہ رہے ؎

یہ بھی تو سنگ کافریٔ حسن دیکھ لے ÷ واعظ بھی اُس صنم پہ فدا ہو خدا کرے

(احسان شاہجہانپوری) ؎ وہ کافریٔ حسن وہ لٹنا دل و دین کا
ہم ہو گئے محتاج یہ صدقہ ہے انہیں کا

محمد حسین شوق زیدی سہارنپوری

شیطان کی بستی

جہاں سونے سے تُلتی ہے محبت | جہاں ہے حسن اک مالِ تجارت
جہاں معصومیت، دانش، شرافت | ہر اک شے مول لے سکتی ہے دَولت

وہی ہے بس، وہی شیطان کی بستی
وہاں خطرے میں ہے انسان کی ہستی

جہاں ہر کام کا مطلب ہے مطلب | گناہوں کا جہاں پردہ ہے مذہب
شوالے، خانقاہیں اور مکتب | جہاں سب پیٹ پوجا کے ہیں کرتب

وہی ہے بس وہی شیطان کی بستی
وہاں خطرے میں ہے انساں کی ہستی

(روشن دین بی۔اے۔ ایل۔ ایل۔ بی وکیل سیالکوٹ)

پورس

ایکٹ سوئم

سین اوّل

اکشیانہ - کلوفلا

اکشیانہ - رانی! یہ کیا ہو رہا ہے - میں یہاں قید ہوں؟ - اور مجھے اپنی فوج کی پیش قدمی کرتے دیکھنا بھی منع ہے؟ یوں قید رکھکر ٹکسلا مجھی سے اپنی غداری کا افتتاح[1] تو نہیں کرنا چاہتا؟ گویا اُسکی محبت کا یہی ثمر ہے کہ میرا غلام میرا والی بن بیٹھے - اور میرے تغافل سے اُکتا کر جب دل پر زور نہ چلے - تو پاؤں باندھنے کے درپے ہو جائے۔

کلوفلا - آپ اس کے اندیشہ کی غلط تعبیر کر رہے ہیں - ٹکسلا اب تک آپکی نگاہوں کے سوا کسی کے سامنے نہیں جُھکا - ذرا چشمِ لطف سے دیکھئے - کہ وہ کس سرگرمی سے آپ کی حفاظت کا اہتمام کر رہا ہے - ہمارے اردگرد جنگجو فوجیں لڑائی میں مصروف ہیں - اور خون بہانے پہ تُلی ہیں - کشت و خون کی آگ روشن ہے - اس حالت میں بتائیے آپ کونسی جگہ کس طرح جا سکتی ہیں - جہاں اس طوفان سے پناہ ملے۔ مہارانی صرف یہی ایک مقام ہے - جہاں جان سلامت رہ سکتی ہے۔ اس پُرسکون گھاٹ کو ——

اکشیانہ - ایسی ذلیل سکون سے تو مجھے بیر ہے - میری رعایا اپنی مہارانی کے لئے جان لڑائے - پورس کی بغاوت میں کھیت رہے۔ اُنکے دمِ واپسیں کی فریاد میرے کانوں میں پڑے - اور مجھے صلح کی گفت و شنید سے مسرور کرنے کی ناروا کوشش کی جائے - ابھی پرلیں نہیں - مجھے دعوت دی جائے - کہ میں آپ کے بھائی کے کیمپ میں راحت و آرام سے زندگی بسر کروں - رانی! میں خوب سمجھتی ہوں - کہ میری افسردہ خاطر آنکھوں کو عیش و نشاط کے نظارے دکھانے سے فقط یہ مقصد ہے - کہ میرے رنج و غم کا مذاق اُڑایا جائے۔

کلوفلا - تو مہارانی! آپ یہ چاہتی ہیں - کہ میرے بھائی کی محبت ایسی عزیز ہستی کو خطرے میں چھوڑ کر الگ ہو جائے نہیں مہارانی! وہ اپنے فرض کو خوب سمجھتا ہے۔

اکشیانہ - اور مجھے اس خطرہ سے بچانے کیلئے اس فیاض دل عاشق نے اپنے کیمپ کو میرا قید خانہ بنا رکھا ہے - اِدھر اس کا رقیب میرے لئے جان جوکھوں میں پڑے - ادھر وہ صرف اسی پر بس کرے - کہ اس قید خانے کے پاسبان کی خدمت بجا لاتا رہے۔

کلوفلا - بلند اقبال پورس! جسکی تھوڑی سی جدائی آپکو خون کے آنسو رُلا رہی ہے - اور آپ اسقدر بے چین ہیں کہ اُس کی تلاش میں میدان جنگ کی خاک چھاننے پر تیار ہیں۔

اکشیانہ - بلکہ اس سے بھی زیادہ کوشش کروں - تو کم ہے - میں تو اُس کی لاش کے ساتھ ستی ہونے کو باعث فخر سمجھتی ہوں - میری سلطنت جاتی رہے بلا سے مگر میں دیکھنا چاہتی ہوں کہ فاتح کلوفلا کے دل میں بسنے کیلئے کیا قربانی کرتا ہے۔

کلوفلا - تو پورس کے لئے آپ کو زحمت اُٹھانے کی ضرورت نہیں۔ وہ ابھی پا بہ زنجیر یہاں آیا چاہتا ہے - ہم تو صرف اس مال غنیمت کی حفاظت کر رہے ہیں - جو فاتحانہ عشق نے حاصل کیا ہے۔

اکشیانہ - ابھی تو آپ کا دل سکندر کی فتح کے ترانے گا رہا ہے لیکن عشق وقت سے پہلے جو اُمیدوں کا لہلہاتا چمن آپکو دکھا رہا ہے

---

[1] کسی بڑے کام کو شروع کرنے کی رسم۔

اُس سبز باغ کے پھیر میں اپنی آرزوؤں کے دامن کو زیادہ پھیلا دیا ہے۔ اور آپ آرزو بر آنے کے جھوٹے خواب دیکھ رہے ہیں۔ ہاں ....

کلوفلا۔ بھائی جان آرہے ہیں اور اب ظاہر ہو جائیگا۔ کہ کون غلطی پر ہے۔

اکشیانہ۔ شک و شبہ کی بہت کم گنجائش ہے۔ اس کی مطمئن پیشانی پورس کی شکست کی دستاویز ہے۔

سین - ۲

ٹکسلا - اکسیانہ - کلوفلا

مہارانی۔ اگر پورس ذرا کم جوشیلا ہوتا۔ ایک دوست کی معقول رائے مان لیتا۔ تو مجھے اس کے انجام کی منحوس خبر سنانے کا افسوس نہ کرنا پڑتا۔

اکشیانہ۔ کیا پورس؟ ....

ٹکسلا۔ اس کا قصہ ختم ہوگیا۔ اور جنگ جوئی کی ترنگ میں اس حال میں جا پھنسا۔ جس سے میں نے بارہا اُسے خبردار کیا۔ گو وہ میرا رقیب تھا۔ مگر میں یہ کہنے سے دریغ نہیں کرونگا۔ کہ اس کی قوتِ بازو نے حریف کے مقابلے میں ہمت نہیں ہاری۔ اور دشمنوں کا خون بہانے میں تسمہ نہیں لگا رکھا۔ اقبال نے پورس اور سکندر میں سے ایک کو منتخب کرنے کے لئے بُہت سر دُھنا۔ اور ابھی وہ کسی نتیجے پر نہ پہونچا تھا کہ پورس کی نگاہ مجھ پر پڑی۔ بھڑک اُٹھا۔ اور قوتِ فیصلہ کا توازن قائم نہ رہا۔ اندھا دھند حملے کرنے لگا۔ فوج کا شیرازہ بکھر گیا۔ اور اُن کے قدم اکھڑ گئے۔ آپ کی سپاہ برباد ہوگئی۔ اور اس کے سپاہی بھاگ گئے۔ آخر پورس بھی اس بھاگڑ میں شامل ہوگیا اور جان بچانے کیلئے ہاتھ پاؤں مارنے لگا۔ اس زود پشیمانی کی حالت میں اُس نے اُس مدد کی التجائیں کیں۔ جسے وہ رد کرچکا تھا۔

اکشیانہ۔ رد کرچکا تھا؟ تو پھر؟ کیا آپ کی حب الوطنی کا جذبہ صرف منت و خوشامد سے بیدار ہوسکتا ہے۔ جب تک آپ کو جنگ پر مجبور نہ کیا جائے۔ آپ اپنے ملک کی حفاظت کیلئے اُٹھ نہیں سکتے۔ ہاں ہم پورس کی باتیں کررہے تھے۔ کہ اس نے اپنے قول و فعل سے آپ نے امدادوں کا اظہار نہ کیا تھا۔ تعجب ہے۔ کہ اس کے دلیرانہ ارادے نے آپکے دل میں ہمت اور استقلال پیدا نہ کئے۔ آپکو یہ بھی خیال نہ آیا۔ کہ اُس کی محبوبہ اور سلطنت معرض خطر میں ہے۔ خیر جو ہوا سو ہوا۔ اب تشریف لے جائیے۔ اور اُس دیوتا کی بندگی کیجئے۔ جو آپکی بہن نے آپ کے لئے چھانٹا ہے۔ اس کے کینہ ور احکام کی تعمیل کیجئے۔ سب کو ایک لاٹھی سے ہانکئے۔ اپنے دلدار کو انہیں زنجیروں سے باندھئے۔ جن سے آپ کا رقیب جکڑا ہوا ہے۔ بہرحال آپ نے جو کچھ کیا اچھا کیا۔ خوب کیا۔ آپ کے جُرم اور اُسکی شکست نے پورس کو میرے لئے ایک دیوتا بنا دیا ہے۔ جسکی پوجا میرے دل کے مندر میں ہوتی ہے۔ میرا ارادہ ہے۔ کہ غروب آفتاب کے پہلے میں یہ ظاہر کردوں۔ کہ میں کسے چاہتی ہوں۔ اور کس سے بیزار ہوں آپ کے روبرو پورس سے عہد وفا باندھوں۔ اور اُس کے سامنے آپ سے ہمیشہ کی نفرت کی قسم کھاؤں۔ اور اگر اب بھی آپ میری محبت کا دعوےٰ کریں تو آپ کی مرضی۔

ٹکسلا۔ مہارانی! مجھے بے وفا اور بدعہد خیال نہ کریں۔ سچ عرض کرتا ہوں۔ کہ سکندر مہارانیوں کو قید و تعزیر سے ہراساں نہیں کرنا چاہتا۔ بلکہ خوب سمجھتا ہے۔ کہ ایسے حسین و جمیل قیدی کس سلوک کے مستحق ہوتے ہیں۔ اس کے دریائے کرم کو جوش پر آنے دیجئے۔ اور اس تخت و تاج کو قائم رکھئے۔ جنہیں پورس کی خودپسندی نے زوال کے بھنور میں ڈال دیا تھا۔ پھر میری تلوار ذمہ وار ہے۔ جو کوئی اس مقدس چیز کو ہاتھ لگانے کی بھی جرأت کرے۔

اکشیانہ۔ یعنی دشمن سے سلطنت بھیک مانگ کروں۔ اور اُسے برقرار رکھنے کے لئے آپ کے آگے ہاتھ جوڑتی پھروں۔ مرتی مرجاؤں پر یہ مجھے گوارا نہیں۔ کہ جس خونخوار نے مجھ سے تخت چھینا۔ وہ اب ہاتھ سے پکڑ کر مجھے اس پر بٹھائے۔

ٹکسلا۔ آجتک جو راجہ اور مہارانیاں اُسکی بے پناہ تلوار کی تاب نہ لاسکیں۔ اُن کے زخموں پر اُس کے دستِ شفقت سے مرہم لگایا۔ دارا کی ماں کے ساتھ ایک سعادتمند بیٹے کے ایسا سلوک کیا۔ اور اُس کی ملکہ کو ایک جانثار بھائی کا جلوہ دکھایا۔

اکشیانہ۔ بہرحال مجھ سے یہ نہیں ہوسکتا۔ کہ رفاقت کی عزیز پونجی فروخت کرڈالوں۔ ظالموں کی خوشامد کروں۔ اور سلطنت کیلئے کاسۂ گدائی لئے پھروں۔ رہیں ایرانی عورتیں تو وہ میرے لئے قابل تقلید نہیں۔ کیا آپ کو توقع ہے کہ میں سکندر کے دربار میں حاضر ہوں

لہ کوئی فیصلہ نہ کرسکا۔

کی طرح حاضر رہونگی ؟ اُس کی جہاں گردی ہیں اُس کے ساتھ ساتھ لگی پھرونگی - اور اس بات پر ناز کرونگی - کہ اس نے کیسی خوبصورت ہلکی پھلکی بیڑیاں میرے لئے تیار کی ہیں بہاراج ! اگر سکندر کو تاج بخشی کی خواہش ہے - تو کیوں نہیں ہمارے تاج اُٹھاکر آپکو دیدیتا - اور کیوں آپ کے سر کو مانگی تاج کی بجائے سے مرصع کرتا - کیا پورس کو کوئی بھی اس حاسدانہ نگاہ سے دیکھیگا - اور آپ ہم سے زیادہ اُسکی غلامی کے سزاوار ہوجائیں گے - ہاں یہ ضرور ہے - کہ جب سکندر کو پتہ لگیگا - کہ آپ کے ناروا جُرم نے اُس کی فتح کو دھبہ لگا دیا ہے - تو وہ اُسے آپ کے خُون سے دھونے کی کوشش کریگا - ابھی وقت ہے - کہ آپ اُس سے ٹوٹ کر کسی اَور سے ملجائیں - آپ جیسے زمانہ ساز - صرف ایکدفعہ غداری کرنے پر بس نہیں کرتے - بلکہ جب تک یہ شراب دو آتشہ نہ ہوجائے - اُن کا سامان سرور ہی نہیں کھوتا - اسلئے اس کی عنایات سے سرشار نہ ہوجائیے - اور بیوفا ثابت ہونے پر یہی آتش جس انجام کو پہونچا - اُسے ہمیشہ زیر نظر رکھئے - اب الوداع -

سین - ۳

کلوفلا - ٹکسلا

کلوفلا - اُس کے غضب کی آگ کو چاپلوسی کی اوس سے بجھائیے اِس عرصے میں وقت اور فاتح کی عنایات آپ کی کامیابی کو یقینی کردینگی - وہ اس وقت غم و غصہ سے دیوانی ہورہی ہے - اور جو منہ میں آتا ہے کہہ بیٹھتی ہے لیکن وہ وقت دُور نہیں جب وہ تخت نشین ہونے سے انکار نہ کریگی - انجام کار آپ نہ صرف اس کی دولت و حشمت بلکہ اُس کے دل کے بھی مالک ہوجائیں گے - ہاں یہ تو کہئے - کہ آپ فاتح سے ملے تو اُسے کیسا پایا - آپ سے ملا - تو کیا کہا ؟ - اور ہمیں اُس سے کس سلوک کی امید رکھنی چاہیئے -

ٹکسلا - بہن ! میں آپ کے سکندر سے ملا - اُس کی اُٹھتی جوانی کی بہار دیکھکر یقین نہیں آتا - کہ اسقدر کارنامے اس سے ظہور میں آئے ہیں سچ تو یہ ہے - کہ میرا دل نہیں مانتا تھا - کہ یہ عمر اسقدر ناموری حاصل کرچکی ہے لیکن اُن کی پیشانی پر شجاعت اور اقبال کا ستارہ ضرور چمک رہا تھا - اس کی آگ برسانے والی آنکھیں اور شاہانہ انداز چغلی کھارہے ہیں - کہ وہی سکندر ہے - اور اس کا رُعب چہرہ بتاتا ہے - کہ وہ کسقدر عالی حوصلہ انسان ہے - اُس کی طبیعت کا استقلال اُس کے دعووں کی تائید کرتا ہے - اور ایسا معلوم ہوتا ہے کہ حکمرانی کیلئے اس کی آنکھ اُسکے بازو سے زیادہ بل رکھتی ہے - وہ میدان جنگ سے واپس آرہا تھا - تو میں اس کا جاہ و جلال دیکھکر کچھ ششدر سا ہوگیا - مجھے دیکھ کر مسکرایا - اور اس تبسم کی اوٹ میں فتح و نصرت کھیلتے نظر آئے - وہ اپنے مرتبہ کو بھول گیا - اور اپنے احسان و کرم کے کرشمے دکھانے لگا - آخر کار محبت کی پھانس فتح کی خوشی پر غالب آئیں - اور مجھ سے کہا واپس جائیے - اور اپنی بہن سے کہئے کہ اپنی من موہنی آنکھوں کو اس فاتح کے دیکھنے کو تیار کرے - جو اپنی فتوحات کے پھل کے ساتھ اپنا دل بھی اس کے قدموں پر ڈالنے کے لئے آرہا ہے - بہن اسے بس آیا ہی سمجھئے - باقی باتیں پھر - آپ اپنی قسمت کی مالک ہیں - اور میں اپنی قسمت کو آپ کے حوالے کئے جاتا ہوں -

کلوفلا - اطمینان رکھئے - خدا نے چاہا تو آپکی قسمت کا بال بیکا نہ ہوگا - اگر فتح مند میرے جال میں پھنس گیا - تو ساری دنیا آپ کے اشارہ پر چلیگی -

سین - ۴

سکندر - ٹکسلا - کلوفلا - ہیپ فیچن

سکندر - ہیپ فیچن ! یہاں کھڑے کیا کررہے ہو - جاؤ - اور پورس کو تلاش کرو - جبتک وہ نہ ملیگا - مجھے چین نہ آئیگا - خواہ اس کی خاطر کئی اور گنہگار کیوں نہ بچ جائیں - مگر وہ زندہ گرفتار ہو -

سین - ۵

سکندر - ٹکسلا - کلوفلا -

سکندر - مہاراج ! تو یہ خبر درست ہے ؟ کہ ایک گمراہ مہارانی ایک تند مزاج اور ناعاقبت اندیش راجہ کی بہادری کو آپ سے زیادہ عزیز رکھتی ہے - آپ اس راجہ کی ذرا پروا نہ کریں - اور اُس کی مملکت کو اپنا خیال کریں - اب آپ کے ہاتھ میں ایک ایسی چیز ہے - جسے دیکھکر اس مہارانی کے غرور و تکبر کے بل نکل جائیں گے - میں اس کا ملک بھی آپ کے حوالے کرتا ہوں - جائیے - اور اپنی محبت کے ہدیہ میں تین تاج اُس کے سامنے پیش کیجئے -

ٹکسلا - فیاضی کی حد ہوگئی - جو سُنا تھا - وہ کیا کم تھا - مگر آپ اس سے بھی زیادہ نکلے -

سکندر - فرصت کے وقت شکر بجا لائیگا - اسوقت جائیے - محبت آپ کے انتظار میں ہے - اُسے اُٹھاکر کامیابی حاصل کیجئے -

سین - ۶

سکندر - کلوفلا

سکندر - رانی! میں اس عشق کی جنگ میں دل وجان سے اسکی مدد کرونگا - لیکن جو کچھ میں اس کی محبت کو پروان چڑھانے کے لئے کر رہا ہوں - کیا اس کا انعام میری شہرت کے سوا مجھے کچھ نہ ملیگا - اتنی بڑی فتح کا سارا ماحصل ٹکسلا کے حوالہ کر چکا - اور اب ایک ہارے ہوئے کی طرح آپ کے ہاتھ کی طرف دیکھ رہا ہوں - میں نے کہا تھا - کہ مشکلات کے پہاڑ چیر کر آپ سے ملونگا - تو آپ کو یاد ہے - کہان گلاب کی پنکھڑیوں سے کیا آواز پیدا ہوتی تھی - یہی کہ آپ اس ناچیز کو اپنے خانۂ دل میں مہمان بنائیں گے - قوتِ عشق نے میری مدد کی - اور فتح نے میری بات کی لاج رکھ لی - اس طرح رانی! مجھے شرفِ باریابی ملا - دیکھئے جب چاروں طرف سے تابعداری کی آوازیں بلند ہو رہی ہیں تو آپ کو یہی زیبا ہے - کہ آپ کی ہاں میں ہاں ملائیں - یا یہ کہدیجئے - کہ آپ اپنے اقرار سے پھرنا چاہتی ہیں - مگر کیا یہ وعدہ بھی فاتح وقت سے انکار کا حوصلہ کر سکتا ہے -

کلوفلا - میرا دل اسقدر مضبوط نہیں - کہ جب کوئی مقابلہ نہ کر سکے - تو یہ آزادی کے راگ گاتا رہے - میں آپ کی طاقت کے آگے سر جھکاتی ہوں - کیونکہ آپ کی طاقت نے سینکڑوں بادشاہوں کو آپکے قدموں میں ڈال دیا ہے - ہندوستان کو فتح کرنا تو آپکے لئے ایک کھیل تھا - آپ بڑے بڑے بہادروں کو شکست دے سکتے ہیں - اور آپ کی محبت وبخشش پتھر دلوں کو بھی موم کر دیتی ہے - مگر جہاں پناہ! میرے لئے یہ مردانگی اور یہ انعام تکلیف اور پریشانی کا سامان ہے - مجھے یہ ڈر کھائے جاتا ہے - کہ کہیں آپ میرے دل پر قابض ہونے کے بعد سیر نہ ہو جائیں - اور مجھے جدائی کی آگ میں جلنے کے لئے چھوڑ جائیں - ان جذبات سے بے پروا ہو کر جو آپ ہی نے بیدار کئے ہیں - آپ کا دل اس تسخیر سے بھر جائے - جو اتنی آسانی سے ہو گئی - حضور جیسے بڑے انسانوں کی محبت بے ثبات ہوتی ہے - اور وہ ہمیشہ ناموری کی دُھن میں لگے رہتے ہیں - ممکن ہے - کہ جب آپ محبت کی پینگیں بڑھا رہے ہیں - آپ کا دل مزید فتوحات کی تدبیروں میں اٹکا ہو -

سکندر - بھولی رانی! محبت کی رمزوں سے آپ کتنی ناآشنا ہیں کیا میری آہیں جو ہوا کے دوش پر سوار ہو کر آپ کے پاس پہونچتی ہیں - آپ کے کان میں کچھ نہیں کہتی - مجھے تسلیم کہ معرکۂ جنگ اور فوج کی ترک و تاز کے درمیان میرے دل میں صرف ناموری کی تمنّا ہوتی ہے - اور میں صرف یہ چاہتا ہوں - کہ شاہ سے لیکر گدا تک میرے مطیع و طابع ہو جائیں - مہوشان ایران نے اپنے بادشاہوں سے بڑھکر سخت حملے میرے دل پر کئے - لیکن میرے دل نے اُن کے تیر نگاہ نہ تولے اور اُن کے حُسن و جمال کو آنکھ بھر کر نہ دیکھا - اور صرف ناموری کا متوالا بنا رہا - وہ اسوقت تک دادِ محبت سے ناآشنا رہا - جب تک کہ آپ کی ظالم آنکھوں نے اس پہ بیا چرکا نہ لگایا - اب اسے فتح کی آرزو نہیں رہی - بلکہ اپنی شکست پہ ناز کرنے کا خواہاں ہے - وہ اپنی قسمت پر اترائیگا - اگر آپ کی آنکھیں رحم سے اس کامیابی کو شرفِ قبول عطا کریں گی - بھلا یہ کہاں کا انصاف ہے - کہ ان آنکھوں کی جہاں کشایانہ الوالعزمی کی تو کوئی بازپُرس نہ ہو - اور میرا نعرۂ جنگ سمع خراشی کا مجرم قرار پائے تو کیا آپ کی محبت کی دل آویز زنجیریں بڑے آدمیوں کے لئے وضع نہیں ہوئیں - یہ محض عاجزی ہے - اب میرا ارادہ عجیب ترکارنامہ دکھانے کا ہے - اور دنیا کو اب یہ دیکھنا ہے - کہ سکندر کا دل حضرت عشق کا استقبال کس شان سے کرتا ہے - اب میرا یہ بازو آپ کے تابع فرمان ہے - اور اسے آپکا پاس ابرو ویسا ہی ہے - جیسا میری شان کا حورِ نصرت سے اب ہمارے نام کی پُرہیبت صدائیں بلند ہونگی - اور ایسے مقامات تک پہونچینگی - جن کا کسی نے نام تک نہ سُنا ہوگا - وہاں ہمارے نام پر ہیکلیں تعمیر ہونگی - جہاں آجتک دیوتاؤں کا مندر نہیں بنا -

کلوفلا - ہاں ہاں فتح آپ کی باندی بنکر آپ کے ہمراہ جائیگی - لیکن مجھے شک ہے - کہ آیا عشق اس کی پیروی پر آمادہ ہوگا - جب سمندر آپ کو اپنی موجوں پر سوار کر کے لے جائیگا - تو اُس کا بے انتہا پانی میرے دھیان کو آپ کے دل سے دھو کر رکھدیگا - جب تمام دنیا فتح ہو جائیگی - جب تمام فرمانروا آپ کے قدموں پہ گرینگے - جب کرۂ ارض کا امن آپ کی ہیبت سے لرزاں ہوگا - تو اسوقت کیا آپکو اس بات کا دھیان آئیگا - کہ ایک کمسن رانی کالے کوسوں پڑی آپ کی یاد سے دل بہلا رہی ہے - اور آپ کے پیمانِ محبت پہ اُسکی زندگی کا مدار ہے -

سکندر - تو کیا آپ کا یہ خیال ہے - کہ اس نعمت کو جو مجھے بعد ہزار خرابی بصد مشکل میسر آئی ہے - میں یہاں چھوڑ جاؤنگا - یا آپ پسند نہیں کرتیں کہ میرے

ہاتھ سے ایشیا کا تخت آپ کے سامنے پیش ہو۔

کلوفلا - مہاراج! آپ جانتے ہیں۔ کہ میری رضا بھائی کی مرضی کی پابند ہے۔

سکندر - اگر میری خوشی اس کے ساتھ ہے۔ تو سارے ہندوستان کو اس کے قدموں پر گر کر میری سفارش کرنا ہو گی۔

کلوفلا - مجھے بھائی سے بے غرض محبت ہے۔ مجھے امید ہے۔ کہ آپ اس کے رقیب کو جس نے آج آپ کے قہر کا مقابلہ کرنے کا ارادہ کیا۔ اس سے زیادہ خوش نصیب نہ بنائیں گے۔

سکندر - بیشک پورس ایک بہادر رقیب ہے۔ بہادری اس سے زیادہ میری تحسین کی کبھی مستحق نہیں ہوئی۔ میں نے اُسے لڑائی کے گھمسان میں دیکھا۔ ہم آمنے سامنے ہوئے۔ مگر اُس نے مقابلہ سے منہ نہیں پھیرا۔ اور ہم ایک دوسرے پر وار کرنے کے لئے مناسب موقع تلاش کرنے لگے۔ قریب تھا۔ کہ ہم میں سے ایک تلوار کے گھاٹ اُترتا۔ کہ فوج کا ایک ریلا آیا۔ اور وہ میری نظر سے اوجھل ہو گیا۔

سین - ۷

سکندر - کلوفلا - ہیپ فیچن

سکندر - ہاں تو کیا وہ گمراہ اور وحشی راجہ گرفتار ہو گیا۔

ہیپ فیچن - ہر جگہ تلاش کی۔ مگر کچھ پتہ نہ ملا۔ مارا گیا یا بھاگ نکلا۔ کوئی نہیں بتا سکتا۔ اس کی فوج کا کچھ حصہ بھاگتا ہوا اکھڑا ہو گیا۔ اور مزید تعاقب کا راستہ اٹ گیا۔ ان سے لڑائی جاری ہے۔ مگر اُن کا زندہ گرفتار ہونا مشکل نظر آتا ہے۔

سکندر - ہتھیار چھین لو۔ مگر انہیں زندگی سے مایوس نہ ہونے دو۔ ہمارا مقصد صرف اس ضدی مہارانی کو عاجز کرنا ہے۔ اندرانی! اسطرح مجھے آپ کے بھائی کا دل ہاتھ میں لینا ہے۔ کہ جبتک اس کے دل کو چین نہ آئیگا۔ میرا دل بھی بیقرار رہیگا۔ (باقی باقی)

نور الٰہی محمد عمر۔

غزل

اعتبارِ منزل کیا۔ ذوقِ جستجو ہی ہے　　کامیابیِ دل کیا۔ کیفِ آرزو ہی ہے
ترکِ جستجو کر کے دل کا مدعا پایا　　ترکِ جستجو لیکن فیضِ جستجو ہی ہے
ے بقیدِ ساغر ہے ہم بقیدِ آزادی　　جس سے جا کے ل مٹیں ساغر و سبو ہی ہے
آبرو جسے کہیئے کچھ نہیں بجز پندار　　یاں شکست ہر پندار اپنی آبرو ہی ہے
تو حقیقتِ عالم وہمِ غیریت باطل　　بلکہ وہمِ باطل بھی حق تو یہ ہے تو ہی ہے
زلفِ مشک بو کا غم دل کو وقف کیوں کر لے　　دل کو جو کرے برہم زلفِ مشکبو ہی ہے
جس جگہ نظر ٹھیرے وہ حجاب ہے اُس کا　　دے نظر کو آزادی پھر وہ روبرو ہی ہے

یہ فریبِ تسکیں ہے ترکِ آرزو معلوم
ترکِ آرزو میکش یہ بھی آرزو ہی ہے

میکش

ہندوستان کی زبانیں اور مسلمان

ہندوستان کی دونوں بڑی قوموں یعنی ہندوؤں اور مسلمانوں کا باہمی عناد ہماری آزادی کی راہ میں دیوارِ چین کی طرح حائل ہے۔ اس عناد کی ایک بڑی وجہ یہ ہے کہ تاریخ کی جو کتابیں پہلے پہل ہندوستانیوں کو پڑھائی گئیں اُن میں مسلمان بادشاہوں کے خلاف نہایت بے بنیاد الزامات لگائے گئے تھے۔ لیکن یہ کہے بغیر بھی نہیں رہا جاتا کہ ان کتابوں کی بدولت اہلِ ہنود کے دلوں میں یہ خیال بیٹھ گیا کہ مسلمان بادشاہوں نے ہندوؤں پر طرح طرح کے ظلم توڑے۔ اور اُن کی تہذیب اُن کے لٹریچر اور آرٹ اور اُن کی مذہبی زبان سنسکرت کو نیست و نابود کرنے کی کوشش کی لیکن جب ہم تاریخ کے ورق الٹ کر دیکھتے ہیں تو معلوم ہوتا ہے تیرھویں صدی عیسوی میں بھی بہت سے مسلمان بادشاہ نہ صرف سنسکرت اور ہندی کو فروغ دینے میں کوئی دقیقہ نہ اٹھا رکھتے تھے بلکہ خود بھی ان دونوں زبانوں میں کتابیں لکھتے تھے۔ میں یہاں اُن ہزاروں مسلمان ادیبوں اور مصنفوں میں سے چند کے نام بیان کرونگا۔ جنہوں نے سنسکرت اور بھاشا کی خدمت اُس زمانے میں کی جب اہلِ ہنود ان زبانوں کو چھوڑ کر فارسی اور عربی کی طرف راغب ہو رہے تھے۔

سلطان زین العابدین جو اکبر سے کئی سو سال پہلے زعفران زارِ کشمیر پر حکومت کرتا تھا سنسکرت کا بہت بڑا عالم تھا۔ اُس نے فارسی سے سنسکرت اور سنسکرت سے فارسی میں ترجمہ کرانے کے لئے ایک دار الترجمہ قائم کیا چنانچہ اسی بامذاق سلطان کے عہد میں مہابھارت پہلی مرتبہ فارسی میں ترجمہ ہوئی اور اکبر کے زمانہ میں اسی ترجمہ کی ترمیم کی گئی۔ والیانِ کشمیر کی ایک بسیط تاریخ راج ترنگینی بھی سلطان... زین العابدین کے زیرِ نگرانی لکھی گئی۔

سلطان فیروز شاہ تغلق جس کے عدل و انصاف اور جود و سخا کے قصے زبانِ زدِ خاص و عام ہیں سنسکرت کے ساتھ خاص اُنس رکھتا تھا چنانچہ جب اُس نے کانگڑہ فتح کیا تو جوالا مکھی مندر کی عالیشان لائبریری سے بہت سی کتابیں نکلوا کر فارسی میں ترجمہ کرائیں۔ انہیں سے فیروز شاہی علم نجوم کی ایک کتاب کا ترجمہ اب تک مشہور ہے۔ یہ ترجمہ مولینا عز الدین نے کیا۔

امیر خسرو کو بھاشا کا پہلا مسلمان شاعر کہتے ہیں لیکن امیر سے ۲۰۰ برس پہلے سلطان محمود غزنوی کے درباری شاعر مسعود مسلمان نے اپنا ایک دیوان بھاشا زبان میں مرتب کیا۔ اب اس دیوان کا نام ہی نام رہ گیا ہے اشعار کا پتہ نہیں چلتا۔

امیر خسرو نے اپنی ایک کتاب میں ایک پورا باب ہندوستان کی تعریف میں ہندو مذہب کی خوبیوں پر لکھا ہے۔

سلطان فیروز شاہ کے بعد جب خاندان تغلق کی سلطنتِ تغلق کا شیرازہ بکھیرا تو شوریدہ سر صوبہ داروں نے ملک کے مختلف حصوں میں اپنی اپنی حکومتیں قائم کرلیں چنانچہ بنگال۔ مالوہ۔ گجرات اور دکن وغیرہ سلطنت دہلی سے الگ ہوگئے۔ ان حکومتوں نے بھی اپنی اپنی ہمت کے مطابق سنسکرت اور ہندی کو ترقی دینے کے وسائل اختیار کئے۔

سلطان نصرت شاہ کے حکم سے ایک مسلم ادیب نے ۱۴۰۰ عیسوی میں بھگوت گیتا کا ترجمہ کیا اور کاوندری پرمیشور نے پرگل خاں کے حکم سے جو سلطان حسین شاہ کا منہ چڑھا سپہ سالار تھا۔ مہابھارت کا ترجمہ کیا۔ گجرات میں محمود بگارہ کے عہدِ سلطنت میں گجراتی زبان میں متعدد کتابیں لکھی گئیں۔ اور پہلے پہل یہیں اردو زبان کی داغ بیل پڑی۔

دکن میں ابراہیم عادل شاہ نے مرہٹی کو اپنی درباری زبان بنا کر غربی ہند میں فارسی کا اقتدار توڑا۔ اسی زمانے میں دکن میں دکنی یا قدیم اردو میں تصانیف کا سلسلہ شروع ہوا۔

شیر شاہ کے عہد میں محمدؒ جائسی اودھ ایک چھوٹے سے موضع میں پیدا ہوا اور پدماوت لکھ کر تمام ہندوستان میں مشہور ہو گیا۔ پدماوت پاکیزگی زبان اور خوبیٔ بیان کے لحاظ سے بھاشا کی بہترین نظموں میں شمار کی جاتی ہے۔ محمدؒ جائسی نے پدماوت کے علاوہ اور بھی بہت سی نظمیں بھاشا میں لکھیں۔

شیر شاہ کی موت کے بعد اس کے جانشینوں کے باہمی تنازعات نے اُس کی عمر بھر کی کوششوں پہ پانی پھیر دیا۔ ہمایوں شاہ طہماسپ سے ۱۲۰۰۰ سپاہی لے کر ہندوستان میں آیا اور پھر دہلی پر قابض ہوگیا۔ ہمایوں کی موت کے بعد بیرم خاں نے مغلوں کی مٹی ہوئی سلطنت کو از سرِ نو زندہ

کیا اور اکبر نے خاندانِ مغلیہ کا کھویا ہوا اقتدار نئے سرے سے قائم کیا ۔

اکبر کا عہد مغلیہ سلطنت کا عہدِ شباب تھا جس میں ہندوستان کے دولت و ثروت کا شہرہ ایشیا سے نکل کر یورپ تک پھیل گیا ۔ اکبر کے زمانے میں سنسکرت اور ہندی کو جو فروغ حاصل ہوا بکرماجیت کے بعد کسی بادشاہ کے عہد میں حاصل نہ ہوا تھا ۔ اکبر نے سنسکرت کی سینکڑوں کتابیں فارسی میں ترجمہ کرائیں ۔ چنانچہ فیضی ۔ غلام علی آزاد اور عبدالجلیل بلگرامی اکبری عہد کے مشہور سنسکرت مصنف ہیں ۔

جہانگیر کے عہد میں ملا مسیح پانی پتی نے رامائن کو فارسی میں نظم کیا ۔ جہانگیر خود سنسکرت کا بہت دلدادہ تھا اور ہندو سادھوؤں اور پنڈتوں سے خاص عقیدت رکھتا تھا چنانچہ اس نے جودھروپ کو ملنے کے لئے ایک کٹھن سفر کی کلفتیں اٹھائیں جس میں کئی بار پاپیادہ چلنے کی تکالیف بھی شامل ہیں ۔

شہزادہ دانیال جہانگیر کا چھوٹا بھائی ہند میں بھاشا کا بہت بڑا شاعر گنا جاتا ہے ۔

عوآصی اور ملا نوری دربار جہانگیر کے شاعر تھے ۔ بھاشا اور سنسکرت میں کافی استعداد رکھتے تھے ۔ لیکن اس عہد کا سب سے بڑا سنسکرت شاعر شیخ شاہ بلگرامی تھا جو حصار کی صوبہ داری پر معین تھا ۔

مغلوں کو ہندوستانی زبانوں سے ایسا ہی اُنس تھا جیسا فارسی سے ۔ وہ سنسکرت اور بھاشا کے شاعروں سے ایسی ہی دریا دلی اور فراخ حوصلگی کے ساتھ پیش آتے جیسے فارسی یا عربی شاعروں سے ۔ چنانچہ ایک دفعہ کا ذکر ہے ۔ کہ راج سورج سنگھ جہانگیر کے دربار میں ایک ہندی شاعر کو لایا ۔ جہانگیر کو اُس کی نظم ایسی پسند آئی کہ فوراً ایک ہاتھی انعام اور خلعت فاخرہ سے سرفراز کیا ۔

اسی زمانہ میں میر ہاشم محترم ایک عربی شاعر نے تمام مہابھارت حفظ کر رکھی تھی ۔

عالمگیر جسے عام مؤرخین نے ہندوؤں اور ہندو ادب کا جانی دشمن بتایا ہے ۔ بھاشا سے بہت محبت رکھتا تھا ۔

ضمیر عالمگیری دربار کا مشہور ہندی شاعر ہوا ہے ۔ اُس نے اپنا ہندی تخلص بھی رکھا اور علم موسیقی کی ایک مشہور کتاب کا فارسی میں ترجمہ کیا ۔

دانا بھی اسی عہد کا بھاشا شاعر تھا ۔

بھاشا اورنگ زیب کے عہد میں اسقدر مقبول ہو چکی تھی کہ عربی اور فارسی کے مشہور فاضل اور مذہب و فقہ کے جید عالم اسے پڑھتے اور اسمیں مضامین لکھتے تھے ۔ چنانچہ شیخ غلام مصطفےٰ نے عالمگیری عہد کے ایک بڑے پرہیزگار اور پارسا ولی گزرے ہیں ۔ انہوں نے سنسکرت اور بھاشا میں اتنی استعداد بہم پہنچائی تھی کہ بڑے بڑے فاضل پنڈت بھی ان کا لوہا مانتے اور اُن کے زمرۂ تلامذہ میں داخل ہونا باعثِ فخر سمجھتے تھے ۔

محمد شاہ رنگیلے کے عہد میں جب راجہ جے سنگھ والئی جے پور نے اپنا مشہور رسدخانہ قائم کیا تو مشہور عربی فاضلوں نے شرح چغمنی علم ہیئت کی کتابوں کا ہندی میں ترجمہ کیا ۔ شرح چغمنی علم ہیئت کی ادق ترین کتابوں میں سے ہے اور اس کا ترجمہ کرنے کے لئے ہندی زبان پر پورا اقتدار لازمی تھا ۔

سید نظام الدین بلگرامی نے سنسکرت اور بھاشا کی تعلیم کو مکمل کرنے کے لئے بنارس کا سفر کیا ۔ انہوں نے چندریکا اور درھمیک سنگھ دو کتابیں علم موسیقی پر بھاشا میں لکھیں ۔

رحمت اللہ جو خیرالدین بلگرامی کے فرزند رشید تھے بھاشا کے مشہور شاعر تھے ۔

سید غلام نبی فرزند سید محمد باقر بلگرامی جو ۱۱۱۱ ہجری میں فوت ہوئے ۔ بھاشا کے مشہور شاعر تھے ۔ انہوں نے بھاشا میں ۱۷۷ اشعار کی ایک نظم لکھی اور اس کا نام مٹی درپن رکھا ۔

یہ بات قابل ذکر ہے کہ بلگرام جو اودھ میں ایک چھوٹا سا شہر ہے ۔ ہمیشہ سے سنسکرت دانی کے لئے مشہور ہو چکا ہے ۔ بھاشا کے مسلمان شاعر جتنے بلگرام نے پیدا کئے اتنے شاید ہی کسی اور مقام میں پیدا ہوئے ہونگے ۔ ہمارے اپنے زمانہ میں مولوی سید علی بلگرامی مرحوم جن کی فارسی اور اردو شاعری کی دھاک تمام ہندوستان میں بیٹھی ہوئی ہے سنسکرت کے ایم ۔ اے تھے ۔

ہمارے زمانہ میں پروفیسر معین الدین میرٹھی جنہوں نے اپنی عمر کے ۴۰ سال سنسکرت کی تعلیم میں گذارے ہیں خلفائے عباسیہ کے کئی مشہور قصے عربی سے سنسکرت میں ترجمہ کر چکے ہیں ۔ اس کے علاوہ وقتاً فوقتاً سنسکرت کی مذہبی کتابوں سے مفید حصوں کے ترجمے بھی اخباروں اور رسالوں میں بھیجتے رہتے ہیں ۔

مندرجہ بالا نام ان ہزاروں مسلمان مصنفین میں سے چند کے ہیں ۔ جنہوں نے سنسکرت اور بھاشا کے وقار کو اسلامی عہد حکومت میں قائم رکھا اور ہمیشہ اس بات میں کوشاں رہے کہ جہاں ان کی مادری زبان فروغ پائے وہاں ملک کی زبانیں بھی ساتھ ہی ساتھ ترقی کرتی رہیں ۔

میرے خیال میں تو یہ مغلیہ بادشاہوں اور ان کے درباری شاعروں ہی کی ان تھک کوششوں کا نتیجہ ہے کہ جہاں آج پچاس سال سے انگریزی کے سامنے فارسی اور عربی کا چراغ مدھم پڑ چکا ہے اردو۔ ہندی۔ بنگالی۔ مرہٹی اور دوسری ملکی زبانیں دن دونی اور رات چوگنی ترقی کر رہی ہیں۔

محمد جمیل ایم۔ اے

کلامِ وحشت

حزیں اگرچہ ہے دل، ذوقِ انتظار بھی ہے
یہ نا اُمید کسی کا اُمیدوار بھی ہے

ہر ایک بات پہ مشکل ہے عذرِ مجبوری
کہ آدمی کو بظاہر کچھ اختیار بھی ہے

فنا کے بعد بھی دو چار دن نمود رہی
اُگا ہے سبزہ بھی۔ شمعِ سرِ مزار بھی ہے

فریب کھاؤں نہ کیونکر طلسمِ ہستی کا
خزاں کا دور بھی ہے مدتِ بہار بھی ہے

اگرچہ خستۂ جورِ فلک ہوں۔ پر صد شکر
دلِ ستم زدہ مجروحِ تیرِ یار بھی ہے

جہانِ عشق ہے اک لازوال مے خانہ
سرورِ نشہ بھی ہے تلخیٔ خمار بھی ہے

رُکے تو کیسے رُکے کارِ عشق دنیا میں
کہ ہجرِ یار میں امیدِ وصلِ یار بھی ہے

نگاہِ ناز کے نیرنگ کا ہلاک ہوں میں
[illegible]ت اس کی نہاں بھی ہے آشکار بھی ہے

وہ بزمِ عیش میں بیٹھے ہیں، اُن کو یاد کہاں
کہ مجھ سے دور کوئی میرا بے قرار بھی ہے

فریبِ غمزہ سے تیرے عجب ہے دل کا حال
کہ نا امید بھی ہے اور امیدوار بھی ہے

ڈرو نہ دینے سے الزام تم مرے دل کو
گناہ اگر ہے وفا تو گناہ گار بھی ہے

یہی نہیں ہے کہ دل ہے بلا کشِ ہجراں
فریب خوردۂ اُمیدِ وصلِ یار بھی ہے

نجات ہو گی نہ ایسے کے دام سے وحشتؔ
کہ بے وفا بھی ہے اور وفا شعار بھی ہے

طلسمی دروازہ

ابھی حال ہی کی بات ہے کہ میں لندن میں کچھ خفیہ تحقیقات کر رہا تھا۔ حالات کے لحاظ سے مجھے مدرسی کا پیشہ اختیار کرنا پڑا۔ ایک روسی خاندان میں انگریزی پڑھانے کی نوکری مل گئی۔

یہ لوگ اپر اویرن میں رہتے تھے۔ جو لڑکا مجھ سے پڑھتا تھا اس کا سن انیس بیس سال سے زائد نہ تھا۔ ابھی تک مسیں بھی نہ بھیگی تھیں۔ نیلی مگر بشاش آنکھوں کی بدولت وہ جرمنی معلوم ہوتا تھا۔ مجھے ابتدا ہی سے اُسکے ساتھ دلچسپی پیدا ہو گئی۔ وہ بہت ٹوٹی پھوٹی انگریزی جانتا تھا۔ میں اُس کی زبان درست کرنے کے لئے مقرر ہوا تھا اور وہ تحصیل علم کے لئے فطرتاً نہایت موزوں طبع تھا۔

مسٹر ورجیف بہت بڑے سوداگر تھے جن کا اصلی کارخانہ پیٹرس برگ میں تھا۔ اور شاخیں تمام یورپ میں پھیلی ہوئی تھیں۔ اُن کی آرزو صرف اس قدر تھی کہ اُن کا اکلوتا اور چہیتا بیٹا پال انگریزی زبان سے اچھی طرح واقف ہو جائے اور کاروبار میں باپ کا ہاتھ بٹا سکے۔

ہم ابھی باتیں ہی کر رہے تھے کہ دروازہ دوبارہ کھلا۔ ایک [illegible] بالوں والی نو دس برس کی ہنس مکھ لڑکی اندر آئی۔ اس کے نازک [illegible] چہرہ کی وضع قطع بدیسیوں کی سی ضرور تھی مگر غیر معمولی حسن کی اُمیدیں رخساروں سے نمایاں تھیں۔

وہ حیران اُچھلتی کودتی کمرہ میں آئی اور اُس نے خالص روسی زبان میں کچھ فقرے کہے جس کے معنے میری سمجھ میں بالکل نہیں آئے۔ اس کے بعد وہ کودتی ہوئی اپنے باپ کے پاس گئی اپنے ہاتھ کی مومی گڑیا اُن کے زانو پر رکھدی۔ مُڑی اور مجھے دیکھ کر کچھ وحشیانہ انداز سے شرما کر مسکرا دی "پال کے نئے ماسٹر یہی ہیں" پھر میری طرف دیکھ کر ہنستے "میری لڑکی اُلگا بڑی شرمیلی ہے۔"

بوڑھے تاجر کی بیوی مر چکی تھی مگر وہ اپنے بچوں پر دل و جان سے فدا تھا۔ مجھے سبق پڑھانے کے لئے روزانہ جانا پڑتا تھا۔ لہذا خاندان والوں سے ایک خاص اُنس پیدا ہو گیا تھا۔ مکان پُرانی وضع کا نہایت مضبوط و عالیشان تھا۔ دروازے دوہرے تھے اور دستے چمکدار پیتل کے لگے ہوئے تھے۔ مگر پھاٹک میں کوئی ایسی بات ضرور تھی جس نے اول دن ہی مجھے متوجہ کر لیا تھا۔

اس پر سفید رنگ تھا اور براق قلعی کے چاروں طرف سرخ رنگ کا گہرا حاشیہ تھا۔ دونوں رنگ مل جُل کر عجیب و غریب خوبصورتی پیدا کرتے تھے۔

مگر ایک ہی ہفتہ کے اندر جب میں اپنے وقت پر حسب معمول آیا تو کیا دیکھتا ہوں کہ صدر دروازہ پر گہرے ماتمی رنگ کی قلعی کی ہوئی ہے۔ میں نے انگریزی قواعد پڑھاتے ہوئے اپنے نازک شاگرد سے رنگ بدل جانے کی وجہ پوچھی۔ مگر اُس نے یہ کہکر میری تسلی کردی کہ والد نے یہ مکان سجا سجایا لے لیا تھا۔ سُرخ اور سفید رنگ اُن کو پسند نہیں آیا۔

ہم میں خلوص و محبت کی پینگیں دن دونی رات چوگنی بڑھتی گئیں۔ اور جاڑوں کے آتے آتے میں بھی خاندان کا ایک رکن ہو گیا۔ بوڑھا تاجر نہایت خلیق تھا۔ وہ اکثر اصرار کر کے مجھے شام کے کھانے کے لئے روک لیا کرتا تھا اور اس کے بعد قہوہ اور تمباکو نوشی میں بھی ساتھ رہا کرتا تھا۔ سگرٹ پینے کا کمرہ عمارت کی پشت پر تھا۔ وہ تعلیم یافتہ تھا۔ ہر چیز کیلئے منطقی دلائل پیش کرتا تھا۔ اور نہایت صحیح رائے رکھتا تھا۔ مگر اس رئیسی شان کے باوجود ایک قسم کی جھلک چہرے مہرے میں موجود تھی جس سے ظاہر ہوتا تھا کہ اس نے مصیبتیں بھی اُٹھائی ہیں۔ سفید چہرے کی جھُریوں سے اُداسی ٹپکتی تھی بعض وقت مجھے ایسا معلوم ہوتا تھا کہ وہ حقیقتاً جتنا بوڑھا نظر آتا تھا۔ اُس سے زیادہ بوڑھا تھا۔ جب کبھی وہ اپنی غریب بیوی کا ذکر کرتا تھا تو اُس کے لبوں سے بیساختہ آہ نکل جاتی تھی اور انگلیاں بے اختیار ابرو پر دوڑ جاتی تھیں۔ گویا غم و الم کو دور کرتا تھا۔ اگرچہ میں چند ہی دنوں میں اُن لوگوں کا گہرا دوست ہو چکا تھا۔ مگر نہ جانے کیوں مجھے اس شبہ نے گھیر رکھا تھا کہ ہو نہ ہو یہ دروازہ طلسمی ہے۔ اور یہ مکان کرامات کا خزانہ ہے۔ میرے علاوہ صرف ایک آدمی اور وہاں آیا کرتا تھا۔ وہ ایک ادھیڑ عمر اور تندرست روسی تھا۔ لانبا قد۔ فوجی وضع قطع اور بال کا گہرا دوست تھا۔ لوگ اس کو نکولس زرناف کہا کرتے تھے۔ بوڑھا تاجر مسٹر ورجیف اس جوان کی بڑی قدر کرتا تھا اور اکثر رات کے کھانے پر روک لیا کرتا تھا۔ بوڑھے تاجر کا رکھ رکھاؤ اور اخلاق اچھا تھا۔ وہ زرناف کی ایسی عزت کرتا تھا کہ دیکھنے والے صاف سمجھ لیتے تھے کہ زرناف دولت و عزت میں ورجیف سے کہیں زیادہ ہے۔

نکولس نہایت دلچسپ اور سادہ مزاج جوان تھا۔ روسی۔ جرمنی اور انگریزی زبان میں بلاتکلف گفتگو کرتا تھا۔ وہ جمیس اسٹریٹ میں ایک عالی شان محل میں رہتا تھا۔ جہاں اُس نے ایک بار مجھے بُلایا تھا۔ وہ ہمیشہ میرے ساتھ دوستی اور برابری کا برتاؤ کیا کرتا تھا۔ محض پال درجیف کا غریب معلم نہیں سمجھا جاتا تھا۔

ایک روز میں بوڑھے تاجر کے ساتھ بیٹھا ہوا قیمتی روسی سگرٹ پی رہا تھا کہ گفتگو کے درمیان میں نکولس کا ذکر آگیا۔

بوڑھے تاجر نے کہا "وہ امیر ہے۔ اور نہایت امیر ہے۔ تم کو شاید یقین نہ آئے کہ وہ دنیا کی سب سے رئیس ہستیوں میں سے ایک ہے۔"

"نہیں" میں نے شوق وحیرت سے کہا "کیا وہ غیر معمولی امیر ہے؟"

"اُس کی دولت کا کوئی شمار ہی نہیں ہو سکتا۔"

"اور شریف بھی ہے؟"

اُس نے گھبرا کر کسی قدر مشتبہ نگاہوں سے میری طرف دیکھا اور پوچھا۔ "تمہیں کیسے معلوم ہوا؟"

"اُس کے عادات واطوار شریفانہ ہیں۔"

"یہ محض آپ کا خیال ہے یا آپ ذاتی واقفیت رکھتے ہیں مجھسے صاف صاف بتا دیجئے۔ سچ سچ بتا دیجئے۔"

"نہیں مجھ سے کبھی پہلے کی ملاقات نہیں ہے۔"

میں نے اس کے چہرے میں ایک اچانک تبدیلی دیکھی۔ ایسی تبدیلی جو مجھے بےحد ناپسند ہوئی۔

کچھ بھی ہو وہ مکان یقیناً طلسمی تھا۔ وہاں کی بہت سی کرامات میں سے ایک یہ بھی تھی کہ صدر دروازہ کا رنگ برابر بدلتا رہتا تھا۔ سفید سے ماشی ماشی سے زعفرانی اور آخر میں گہرے سیاہ رنگ کی قلعی کر دی گئی تھی۔

ایک روز شام کو نکولس اور ایک دُبلے پتلے یہودی کی دعوت تھی۔ کھانے کے ختم پر مسٹر درجیف بار بار گھڑی کی طرف نگاہیں دوڑانے لگے۔ مگر رات جیسے جیسے زیادہ بھیگتی جاتی تھی بوڑھے تاجر کو اطمینان ہوتا جاتا تھا۔ اور دس بجے کے بعد تو وہ بالکل بشاش اور مسرور ہو گئے۔ جب نکولس اور یہودی چلے گئے تو ہم لوگ بیٹھ کر سگرٹ پینے لگے۔ پال اور انگا بھی وہیں تھے۔

ہم سب لوگ ہنس بول رہے تھے کہ یکایک چند غیر ملکیوں کی گفتگو کی آواز سُنائی دی۔ خفیف سے دھکم دھکا کے بعد دروازہ تڑاق سے کھُلا۔ اور تین آدمی روسی پولیس کی وردی میں ہاتھوں میں بھرے ہوئے پستول لئے اندر آئے۔ اور آتے ہی ہم تینوں کو ایک ایک پستول کی زد میں رکھ لیا۔

درجیف کو دکر اُٹھے اور حیرت و دہشت سے چیخ کر اپنا پستول نکالا پال بدحواس بت بنا بیٹھا رہ گیا۔ اور انگا میرے پاس چھپنے کے لئے دوڑ آئی بوڑھے تاجر نے افسرانہ لہجہ میں پوچھا "اس مداخلت بیجا کے کیا معنی ہیں؟"

"اُس کے معنی یہ ہیں کہ ہم تم کو 'ابون آسٹرن برگ' کو پا گئے ہیں۔ اُن کے اعلا افسر نے جواب دیا اور پستول کی نال زیادہ قریب کر دی" تم سمجھے تھے کہ اب بچ گئے۔ مگر کیا تم نہیں جانتے کہ مجھ سے چھٹکارا مل جانا ناممکن ہے وہ کاغذات ابھی حوالہ کرو جو تمہاری بیوی کی گرفتاری کے وقت غائب ہو گئے تھے، بتاؤ کہاں ہیں؟

بوڑھے تاجر نے کڑک کر کہا "لندن میں روسی پولیس کا کوئی اختیار نہیں ہے۔"

"ہمارا لندن میں بھی ویسا ہی اختیار ہے جیسا پیٹرس برگ میں ہے ہم ان کاغذات کی جستجو میں ہیں اور ڈھونڈھ کر رہیں گے۔"

خاموشی چھا گئی۔

میں نے بوڑھے تاجر کے چہرہ پر وہی خوفناک جھلک دیکھی جس نے دو ایک بار مجھے پریشان کر رکھا تھا۔ یکایک اس کا پستول والا ہاتھ شل ہو کر زانو سے آلگا اور وہ طیش میں چلا اُٹھا۔

"پیٹرسبرگ نشر ڈلین تمہاری ہی ذات سے مجھ پر تمام مصیبتیں آئیں۔ بیوی گرفتار ہو کر شہر بدر ہوئی۔ میں برباد ہو گیا اور ساری جائداد ضبط ہو گئی۔ تم میرے جانی دشمن ہو سبب تم کو خوب معلوم ہے۔ وہ راز مرتے دم تک راز رہے گا۔ آج تم حرام زادے کی رسی کی طرح یہاں تک کاغذات کی تلاش میں آئے ہو شوق سے ڈھونڈھ لو۔ آج پانسہ تمہارے ہاتھ میں ہے میں نہیں روکتا جی بھر کے تلاشی لو۔ کل یہ گاڑی ناؤ پر ہوگی۔ جاؤ ڈھونڈھو اُس نے ایک سوکھا سا ٹھٹھا اُڑایا" اللہ تمہارے جیسے خبیث پر حشر تک لعنتیں برسائے جس نے اپنے ہزارہا بیگناہ بھائیوں کو تباہ و برباد کر دیا ہے"

مخاطب مسکرانے لگا مگر خاموش رہا۔ اور تینوں نے بلاتکلف تلاشی لینی شروع کر دی ایک تین درازوں والی میز نے سب سے پہلے اُن کی توجہ اپنی طرف مبذول کی اور دم بھر میں تمام کاغذات فرش پر تتر بتر پڑے ہوئے تھے۔

"اخّاہ! میں بھول گیا تھا" بوڑھے تاجر نے ہنس کر کہا "تم کو میرے بکسوں کی کنجیاں مطلوب ہوں گی" کچھا پھینک کر "یہ لو" پولیس والے سرگرمی سے تلاشی لے رہے تھے۔ پال حیران کھڑا تھا اور کمسن انگا اپنی پیاری موی گڑیا لئے باپ کے پہلو میں تھی۔ ننھی ننھی مٹھیاں ہر بار تیزی سے گڑیا کو جکڑ لیتی تھیں۔

ان آدمیوں میں سے ایک شخص ذرا تو ہوکر دوران تلاش میں قالین کا ایک حصہ چاقو سے پھاڑ رہا تھا کہ ننھی سی جان اُلگا نے پوچھا "تم میری گڑیا تو نہ چھینو گے؟"

وہ آدمی بچی کی گھبراہٹ پر ہنس کر کہنے لگا۔ "ہم لوگ کاغذات ڈھونڈ رہے ہیں۔ گڑیا گڈے کی تلاش میں نہیں ہیں"۔ ان کو تلاشی لینے میں بڑی مہارت تھی تھوڑی ہی دیر میں اُنہوں نے چھت سے زمین تک سب کچھ چھان ڈالا ہر مشکوک جگہ کی جانچ کرلی گرنا کام رہے۔

بوڑھے تاجر نے جھلا کر کہا "لو میرا کوٹ بھی دیکھ لو"۔ اور جھٹ اُتار کر پھینک دیا۔ افسر نے فوراً جیب و دامن دیکھے اور واپس کر دیا۔

اب وہ سرکرے کی تلاش کرنے لگے۔ ہم لوگ بھی ساتھ ساتھ تھے۔ اور اُلگا بھی اپنی چہیتی گڑیا لئے ہوئے ہمارے ساتھ تھی۔

جب آخرکار وہ اپنی ناکام تلاشی ختم کرکے جھلائے ہوئے لوٹے تو بوڑھے تاجر نے کہا "جب میں یہاں کے تھانہ میں رپٹ لکھواؤں گا تب روسی پولیس کو اس ناجائز اور غیر قانونی تلاشی کا خمیازہ بھگتنا پڑیگا۔ مخاطب اس دھمکی پر ہنس پڑا اور "دیکھا جائیگا" کہتا ہوا طلسمی پھاٹک کھول کر اپنے ساتھیوں سمیت چلا گیا۔

بوڑھا تاجر طوفان جذبات سے زرد ہو گیا تھا وہ مجھے بھی روز والے کھانے کے کمرہ میں لیگیا۔ خود بھی شراب پی۔ مجھے بھی پلائی اور گھبرائے ہوئے نوکروں کو چند لفظوں میں تسلی دیکر رخصت کر دیا۔ اُلگا ابتک اپنی مومی گڑیا کو اپنے کلیجے سے چمٹائے ہوئے تھی۔

اُس نے اُلگا کو قریب بُلا کر پیار کیا "پیاری بنّو تم نے اپنا سبق خوب یاد رکھا۔ تم نے ہم کو بھی بچالیا۔ ان کو بھی بچالیا۔

اُس نے کہا "آپ نے جو کہا تھا میں نے وہی کیا" اور اپنی گڑیا باپ کے حوالے کر دی۔

باپ نے گڑیا کے کپڑے کو دامن مجنون بنا دیا اور قلمتراش کی نوک سے موم کی تہیں پھاڑ ڈالیں آخر بیچ میں سے زرد رنگ کا ایک تعویذ نکلا۔ نہایت مہین کاغذ پر پوری ایک دستاویز لکھی ہوئی جو اتنی ہوشیاری اور چالاکی سے چھپائی گئی تھی کہ کسی کو شبہ نہیں ہوسکتا تھا۔

بوڑھے تاجر نے میری طرف مخاطب ہوکر نہایت نرمی سے کہا "آج آپ میرے خاندانی راز سے واقف ہو گئے ہیں۔ اور اب آپ کو میری کشمکش کا صحیح اندازہ ہو گیا ہوگا۔ میری غریب بیوی ناحق قیدی بنا کر دنیا کے سب سے خراب قید خانے میں بند کر دی گئی ہے۔ کیا آپ مجھ پر ایک احسان فرمائیں گے آپ روسی نہیں ہیں لہٰذا آپ پر کسی کو کوئی شبہ نہیں ہوسکتا۔ آپ اس دستاویز کو امانت رکھئے ان کو پوشیدہ رکھئے اور جان سے زیادہ عزیز رکھئے۔

"بسر و چشم" میں نے فوراً جواب دیا۔ حالانکہ سچ پوچھئے تو مجھے ایسی بڑی ذمہ داری لینے کی کوئی خواہش نہ تھی۔ بوڑھے تاجر نے گرمجوشی سے میرا ہاتھ پکڑ کر کہا "سارے انگلستان میں صرف آپ ہی کی ایک ذات ایسی ہے جس پر میں اعتبار کرنے کی جرأت کرسکتا ہوں۔ دیکھئے میں اس پر مُہر کئے دیتا ہوں۔ خطرے کے دور کرنے کے بعد آپ ان کاغذات کو مجھے اسی طرح واپس کر دیجئے گا۔ مُہر ٹوٹنے نہ پائے"۔

اب اُس نے فرش پر بکھرے ہوئے کاغذات میں سے ایک دبیز لفافہ اُٹھا لیا۔ دستاویز کو اندر رکھ کر بڑی بڑی کالی مہریں لگا دیں جب لاکھ سوکھ کر جم گئی تو مجھے دیدیا اور آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر گویا ہوا۔

"یاد رکھئے اس رازداری سے بہتوں کی جانیں وابستہ ہیں۔ اسے ہمیشہ اپنے قابو میں رکھئے۔ اپنے پاس سے کسی وقت جدا نہ ہونے دیجئے اگر آپ کے قدم ذرا بھی سیدھی راہ سے ڈگے۔ تو میری یال کی، کمسن اُلگا کی موت ہے اور ساتھ ہی ساتھ آپ کی بھی"۔

میں نے قیمتی لفافہ کو لیکر مہروں پر نظر کی اور اپنے کوٹ کی اندرونی جیب میں محفوظ کر لیا۔ اس کے بعد کوئی ہفتہ تک میں اپنے انمول لفافہ کو سینہ سے لگائے لگائے پھرا کیا۔ میں نے کئی بار روسی پولیس کا ذکر چھیڑا۔ مگر بوڑھے تاجر نے ہمیشہ بغلیں جھانک کر بات کاٹ دی۔ یا گفتگو کا رُخ بدل دیا۔ اس کو اپنے پہچان لئے جانے سے تھوڑی سی تشویش ضرور ہو گئی تھی اور میرے خوش خصلت شاگرد کو بھی باپ کی پریشانی سے پریشانی تھی۔ اب اُسے انگریزی سیکھنے کا کوئی ذوق باقی نہ تھا اور دو ہی ہفتہ میں میں نے دیکھا کہ طلسمی دروازہ کی قلعی دو رنگوں میں پے درپے بدل دی گئی۔

پھاٹک کا رنگ مسلسل طور پر کیوں بدلا جاتا تھا؟ کوئی خاص بات ضرور تھی مگر مجھے اس کا کوئی پتہ نہیں چل سکا۔ نوکر چاکر بھی عجیب سے تھے خصوصاً ان کی زبان نہایت نرالا تھا۔ مگر وہ سب ایسی ویسی بولتے تھے جو میری سمجھ سے کوسوں دور تھی۔

ایک روز شام کو بڑی سخت سردی تھی۔ جب میں اپنے ایک دوست کے یہاں سے لوٹ کر ۹ بجے گھر پہنچا تو درچیف صاحب کی ایک تحریر ملی جس میں لکھا تھا کہ لفافہ جو شامل ہے فوراً مکتوب الیہ کے پاس جانا چاہئے۔

لفافہ پر مہر لگی ہوئی تھی اور اس پر لکھا ہوا تھا "میڈم ہیلرٹ ۱۰۶ گرانس ویلز گارڈن"۔ میں نے کھانا کھایا۔ اور فوراً ہی خط لیکر روانہ ہو گیا۔

میڈم کا محل قریب قریب کے محلوں میں بہترین تھا۔ میں ایک آراستہ کمرہ میں بیٹھ کر جواب خط کا انتظار کر رہا تھا۔ کہ ادھیڑ عمر کی ایک لانبی اور

حسین عورت نہایت عمدہ لباس پہنے۔ اندر آئی۔ اس کے ہاتھ میں دفتی کا ایک ڈبہ تھا جس پر مہین مگر مضبوط تاگا لپٹا ہوا تھا۔

میں تعظیم کے لئے اُٹھا ہی تھا کہ اُس نے نازک اُنگلیوں سے بیٹھے رہنے کا اشارہ کیا اور کہنے لگی۔

"میں ہی مکتوب الیہ ہوں۔ میں آپ سے مل کر بہت خوش ہوئی۔ مسٹر چیف اکثر آپ کا ذکر کیا کرتے ہیں۔ میں سرِشام سے آپ کی منتظر تھی" طلسمی دروازہ سے آپ خوب سمجھتے ہیں کہ موقع نہایت نازک ہے۔ کوئی جاننے نہ پائے ورنہ میری گئی سی آبرو خاک میں مل جائے گی۔ یہ ڈبہ لیجئے ابھی در چیف صاحب کے پاس لیجائیے اور اُنکے سپرد کرکے یاد دلا دیجئے کہ کل چھ بجے شام کو میں بے چینی سے منتظر رہوں گی۔ کہیں آپ اپنا وعدہ بھول نہ جائیں"

میں نے ڈبہ لیا گو وزن پر بڑی حیرت ہوئی۔ اندر جو کچھ بھی ہو ڈبہ بہت بھاری تھا۔ میں نے رخصت کا سلام کیا اور فوراً ایک گاڑی میں بیٹھ کر در چیف صاحب کے پاس پہنچا۔

وہ اور پال دونوں میرے منتظر تھے۔ بوڑھا تاجر بے اختیار دوڑا اور ڈبہ کو میرے ہاتھ سے لیکر میرا شکریہ ادا کرنے لگا۔ میں سمجھا تھا کہ وہ ڈبے کو کھولیگا اور میں اندر کی چیز دیکھ کر گرانی کا سبب پا جاؤں گا۔ مگر اُس نے نہایت بے پروائی سے ڈبہ کو ایک طرف رکھدیا اور میرے لئے سوڈے کی ایک بوتل کھولی۔ برانڈی ملائی اور گلاس میری طرف بڑھا دیا۔

اس کے بعد ہی اُس نے سگرٹ پیش کیا" آپ کو ایک گھنٹہ اور ٹھیرنا ہو گا۔ مجھے کچھ باتیں کرنی ہیں"

میں رُک گیا۔ اور خیال کرنے لگا کہ کم سے کم ڈبہ کا راز تو مجھے معلوم ہی ہو جائیگا۔ مگر اُس نے ڈبہ کا کوئی ذکر ہی نہ آنے دیا۔

آدھ گھنٹہ کے بعد پال بھی سونے چلا گیا۔ اُنکا پہلے ہی سے سو رہی تھی بوڑھا تاجر بے چینی سے کئی بار اُٹھکر ادھر اُدھر ٹہلا۔ یکایک مجھے گلاس کا خیال آیا اور میں نے رخصت ہونے سے پہلے اس کو خالی کر دیا۔

جیسے ہی میں نے گلاس رکھا مجھے معلوم ہونے لگا کہ اس میں کوئی خرابی ضرور تھی۔ میرا گلا آگ کی طرح جل اُٹھا۔ میرے جسم سے شعلے نکلنے لگے اور پھر فوراً ہی سارا بدن برف کی طرح ٹھنڈا ہو گیا۔ جب اصلی بات سمجھ میں آئی تو میرا دل خوف سے ڈوب گیا۔

"یہ برانڈی ——— مجھے ——— رُک رُک کر یقین ہے کہ زہر آلود تھی"

میں نے اُٹھنے کی کوشش کی مگر تمام جسم پر فالج گر چکا تھا۔ میں گر پڑا۔ مگر میں نے دیکھا کہ بوڑھے تاجر کے چہرہ پر خوشی کی سُرخی دوڑ گئی۔

اُس نے جان بوجھکر مجھے زہر دیا تھا۔ اس کو کس طرح خبر ہو گئی تھی کہ میں خفیہ پولیس لندن سے تعلق رکھتا ہوں۔

میں نے چلّانا چاہا مگر کوئی لفظ میرے ہونٹوں سے نہیں نکل سکا۔ میری زبان نے حرکت کرنے سے صاف انکار کردیا۔ میں نے پھر کوشش کی کہ اُٹھ کھڑا ہوں اور موت کی اس سردی سے جو بجلی کی طرح میرے جسم میں پھیلتی جارہی تھی مردانہ وار مقابلہ کروں۔ مگر سب بیکار تھا۔ میں بالکل بے بس ہو چکا تھا۔ ہر حصہ جسم شل ہو چکا تھا۔

آخری بات جو مجھے یاد ہے وہ یہ کہ بوڑھے تاجر کا شیطانی چہرہ اور خونی آنکھیں میرے قریب تھیں اُس کے ہونٹ ہل رہے تھے مگر میری سماعت جواب دے چکی تھی۔ بس اس کے بعد نزع کی تکلیف بھی ختم ہو گئی اور موت کی کالی چادر نے مجھے سر سے پاؤں تک لپیٹ لیا۔

مجھے اس کا اندازہ نام کو بھی نہیں ہے کہ میں زہریلی شراب کے نشے میں کب تک رہا یا بے ہوشی کے عالم میں مجھ پر کیا گذری۔ جب میری آنکھ کھلی تو دن اچھی طرح نکل آیا اور میں کسی ایسی سخت چیز پر پڑا ہوا تھا جو نہایت ٹھنڈی تھی۔ سر پر ایک ڈھالو چھت تھی۔ کھڑکی بہت اونچی لگی ہوئی تھی جس میں سے سرخ اینٹوں کی صرف ایک دیوار نظر آتی تھی۔ میں بڑی مشکل سے اُٹھا اس واسطے کہ میرے ہاتھ پاؤں ابتک بیکار سے ہو رہے تھے۔ مجھے یہ دیکھ کر خاص حیرت ہوئی کہ میرے بستر کی جگہ پتھر کا ایک چوکا تھا اور میرے قریب اسی قسم کا دوسرا چوکا پڑا ہوا تھا۔

حقیقت ایکدم ہی نگاہ میں معلوم ہو گئی۔ لوگ مجھے مردہ سمجھ کر وہاں ڈاکٹری معائینہ کے لئے اُٹھا لائے۔ مجھے معلوم ہوا کہ میرے کپڑے سوکھے ہوئے تو تھے مگر مٹی میں بھرے ہوئے تھے اور ان کی شکنیں گواہی دے رہی تھیں کہ میرا جسم کچھ دیر پانی کے اندر ضرور رہا ہے۔ میرے بال بھی گیلی مٹی سے اٹے ہوئے تھے۔

آپ خود ہی سمجھ سکتے ہیں کہ اب میں وہاں ایک منٹ بھی نہیں رہ سکتا تھا۔ بلکہ کھڑکی سے باہر کود گیا اور سڑک پر پہنچکر پتہ چلا کہ میں شہر کے دور بارنس پل کے پاس ہوں۔ اس لئے میں نے سمجھ لیا اور ٹھیک سمجھ لیا کہ لوگ مجھے دریا سے مُردہ سمجھ کر نکال لائے ہوں گے۔

میری جیب میں چند روپے میری ناچیز ملکیت ابتک پڑے ہوئے تھے میں فوراً ایک سواری پر بیٹھ کر اسکاٹ لینڈ یارڈ پہنچا۔ میں نہیں چاہتا تھا کہ جس آدمی نے مجھ کو اس بُری طرح زہر دیا تھا وہ قانون کے پنجے سے بلا داغ بچ جائے۔

تھانے پر میں سردی میں اکڑا ہوا آدھ گھنٹہ تک انتظار میں بیٹھا رہا انسپکٹر سے معلوم ہوا کہ بیہوشی میں چالیس گھنٹے سے زیادہ گذر گئے۔ دو آدمیوں نے میری داستان سُنی خوش تو ہوئے مگر خاموش رہے۔ میری طبیعت ابھی نہ تھی

اوران لوگوں کی سرد مہری مجھے اور بھی تکلیف دے رہی تھی۔ اس کے بعد دس منٹ کی تنہائی ہوئی اور یکایک دروازہ دوبارہ کھلا اور ایک ایسی ہستی داخل ہوئی جسے دیکھ کر میری اوپر کی سانس اوپر اور نیچے کی سانس نیچے رہ گئی۔

یہ کون تھا۔ پال کا گہرا دوست نکولس زرناف تھا۔

اُس نے میری حیرت تاڑ لی۔ مسکرا کر میری طرف بڑھا اور کہنے لگا۔

آج اتفاق سے یہاں ملاقات ہوگئی ہے تو میں اپنا باقاعدہ تعارف کراتا ہوں میرا نام ہنری گورلٹ ہے میں محکمہ تحقیقات جرائم کا انسپکٹر ہوں"

آپ! میں نے چلا کر کہا" آپ۔ جاسوس"

"ہاں" اُس نے سادگی سے جواب دیا اور میں یہاں آپ سے مل کر نہایت خوش ہوا۔ مجھے تو یہ اندیشہ تھا کہ آپ اب تک ختم ہو چکے ہوں گے۔ آپ کو اپنی قسمت پر ناز ہونا چاہئے کہ ایسے زبردست ٹھگوں کے جتھے سے بال بال بچ گئے

میں "کیا وہ جیف ٹھگ تھا؟

وہ پھر مسکرایا اور نہایت بے پروائی سے میز کے ایک گوشہ پر بیٹھ گیا۔

اب اُس نے ایک عجیب وغریب داستان سنائی تب مجھے اندازہ ہوا کہ میں کیسی مصیبت میں گرفتار تھا۔ معلوم ہوا کہ لندن کی پولیس بوڑھے تاجر سے اور اس کے جتھے سے سالہا سال پہلے سے واقف تھی۔ جو جوہری بن کر بہتوں کو لوٹ چکے تھے

بوڑھا تاجر روسی یہودی اور جتھے کا سردار تھا۔ لندن میں جواہرات کی اکثر چوریاں اسی کے کرتب کا نتیجہ تھیں۔ مگر کچھ اتنا ثبوت نہیں مل سکا جو گرفتاری کے لئے کافی ہو سکتا۔ میرے دوست نے ایک رئیس کا بھیس بدل کر اس خاندان میں اپنی ساکھ بٹھا لی تھی۔ پھر بھی پھاٹک کی قلعی کی سلسلہ وار تبدیلی سے قطع نظر اس کو اور کوئی راز معلوم نہیں ہو سکا۔ آخر میں اُس نے مسکرا کر کہا" معلوم ہوا ہے کہ بوڑھے تاجر نے آپ کو ایک لفافہ مہر لگا ہوا دیا تھا۔ ذرا دیجئے دیکھیں تو اس میں کیا ہے؟"

میں نے اپنی جیب ٹٹولی۔ لفافہ ابتک محفوظ تھا۔ میں نے چاقو کی نوک سے سیون کھول کر لفافہ نکالا اور پھر میں لوٹ کر دستاویز حوالہ کر دیں۔ مگر آپ خود ہماری حیرت کا اندازہ کر سکتے ہیں اس لئے کہ جب کاغذ پھیلائے گئے تو وہ بالکل سادہ تھے۔ ان پر کسی حرف کا نشان بھی نہ تھا۔

"خوب" جاسوس نے ہنس کر کہا" کیا اچھی تدبیر تھی" اُس نے تم کو محض اعتبار قائم کرنے کے لئے کیسا عمدہ دھوکا دیا ہے۔ وہ جانتا تھا کہ اگر وہ تم پر بھروسہ کریگا تو تم بھی اُس پر بھروسہ کرو گے۔ وہ تمہیں اپنے کام کا ذریعہ بنا کر اپنی زبردست تجویز پر عمل کرے گا۔ مگر افسوس شکار کے انتخاب میں غلطی ہوگئی۔

میڈم نے جو ڈبہ تم کو دیا تھا اُسے لے کر بوڑھا تاجر دوسرے دن ایسٹرڈیم جانے والا تھا۔ لہذا اُس نے چاہا کہ تم کو ہمیشہ کے لئے غائب کر دے۔ اسی لئے زہر دینے کے بعد بارش کے تیز چشمہ میں تمہاری لاش پھینک دی گئی۔ تمہیں کس نے نکالا اور کیسے نکالا یہ بعد کی باتیں ہیں پھر بھی تم پر جو گذری وہ ورجیف سے بہت کم تھی۔

میں نے گھبرا کر پوچھا وہ کیسے؟

بات یہ ہے کہ میڈم صاحبہ جسے بوڑھے تاجر نے پھانس کر جواہر لینے چاہے تھے انقلاب پسند جماعت کی تھیں۔ تاجر بھی ایک زمانے میں اس جماعت کا ایک رُکن تھا۔ پھر باغی ہوگیا تھا۔ لہذا اُس نے ڈبہ میں آتشگیر اور پھٹنے والے مادے بھر کر بھیجے تھے اور جیسے ہی بوڑھے تاجر نے جواہر کے لالچ میں وہ ڈبیہ کھولی۔ بم پھٹ گئے۔ اور تاجر مع اپنے کمرے کے پُرزے پُرزے ہوگیا۔

"کیا وہ مر گیا؟

اُس نے مسکرا کر کہا "جی ہاں اور طرہ یہ ہے کہ اُس کی لڑکی جو ہر بات میں اُس کی معاون تھی غضب کی ہوشیار تھی۔

میں "اُس کی لڑکی کس اُنگا"؟

نہیں پال اُس کی لڑکی تھی۔ جسے آپ سبق دیا کرتے تھے۔ اور جو آپ کی نگاہ میں لڑکا تھا۔ وہ بھی ڈبہ کھلتے وقت وہیں تھی۔ اور بُری طرح زخمی ہوکر آج صبح اسپتال میں مرگئی۔ ہم نے اُنگا کو حراست میں لے لیا ہے۔ اور ایک نوکر کو گرفتار کر لیا ہے جو جلدی میں بھاگ نہیں سکا۔

اس نوکر نے بہت سی باتیں بتائی ہیں۔ طلسمی دروازہ کی قلعی بار بار اس لئے بدلتی رہتی تھی کہ جتھے کے اور لوگ خبردار ہوتے رہیں جن سے بڈھا تاجر ہوشیاری کی وجہ سے بظاہر کوئی معاملہ نہیں کرتا تھا۔

میں "اور میڈم ہیلرین؟

میں خود اُن کے محل پر گیا تھا۔ مگر وہ لندن سے غائب ہوچکی ہیں بیگم کا انتظام تاجر کی حرکت سے زیادہ دلچسپ تھا۔ اور گو قانون کی نگاہ میں مجرم ہو مگر اُس کی وجہ سے یورپ کو دو زبردست نڈر اور بھیانک مجرموں سے چھٹکارا مل گیا۔

"سچ ہے کنواں کھودنے والا خود ہی کنوئیں میں گرتا ہے"

(ماخوذ از ولیم لے کوئے) "طالب الہ آبادی"

"دانت اور انکی بیماری"

قدرت نے جتنے اعضاء انسان کے جسم میں بنائے ہیں۔ ان میں سب سے زیادہ ضروری دانت ہیں۔ بچپن کے ختم ہونے پر انکی ضرورت ہوتی ہے۔ اور مرتے دم تک خواہ سو سال کی عمر ہو۔ تمام اعضاء کی نسبت دانتونکی درستی مقدم خیال کیجاتی ہے۔ عمر کے کسی حصہ میں اگر ان میں کچھ خرابی پیدا ہو جائے۔ تو جسم انسانی کی ساری مشین خراب اور رفتہ رفتہ بیکار ہو جاتی ہے۔ اس لئے لازم ہے۔ کہ دیگر اعضا کی نسبت دانتونکی حفاظت کا زیادہ خیال رکھا جائے۔ کھانے پینے میں دانتونکے متعلق جب کچھ شکایت پیدا ہو۔ تو اس کو معمولی نہ سمجھتے ہوئے فوراً دانتوں کے مخصوص ڈاکٹر (ڈنٹیل سرجن) سے مشورہ کرکے علاج کیطرف متوجہ ہو جانا چاہیئے۔ کچھ دن ہوے۔ لندن میں پرنس آف ویلز نے ذندالنسانی کے ایک بڑے ہسپتال کا بنیادی پتھر رکھتے ہوئے اثنائے تقریر میں پبلک کو مخاطب کرکے کہا۔ کہ اگر آپ اپنی نسلوں کو تندرست رکھنا اور اپنی قوم کو مضبوط بنانا چاہتے ہیں۔ تو دانتوں کی نگرانی کیطرف کامل توجہ کریں۔ نہ صرف دانتوں کی بیماریاں بیشمار ہیں۔ بلکہ موجودہ دَور ترقی میں جبکہ طبی تحقیقات کمال کے بہت سے منازل طے کرچکی ہیں۔ یہ ثابت ہوچکا ہے۔ کہ جسم انسانی کے متعدد امراض صرف دانتوں کے ذریعہ پیدا ہوتے ہیں۔ جو انسان کی غفلت کا نتیجہ ہیں۔ مثلاً دانتوں کو باقاعدہ صاف نہ رکھنے سے میل جم کر رفتہ رفتہ کریڑی کیصورت اختیار کرلیتا ہے جسکی وجہ سے مسوڑھوں پر ورم آجاتا ہے۔ اور پیپ پڑ جاتی ہے۔ جسے انگریزی میں پایوریا کہتے ہیں۔ جب یہ خطرناک بیماری شروع ہوتی ہے۔ تو ابتدا میں اس کی پرواہ نہیں کیجاتی۔ پیپ اور بودار مادہ مسوڑھوں سے نکل کر آہستہ آہستہ معدہ میں داخل ہوتا رہتا ہے۔ جس کا اثر معلوم نہیں ہوتا۔ مگر قوت ہاضمہ کو خراب کرتا رہتا ہے۔ اور اسکی وجہ سے متعدد تکالیف خفیف دائمی بخار۔ جوڑوں کے درد۔ بدہضمی وغیرہ امراض کی درد انگیز صورت میں رونما ہو جاتے ہیں۔ ہر وقت منہ سے بدبو آتی رہتی ہے۔ بعض مرتبہ گلے کانوں اور جسم کے بعض دیگر اعضا میں درد شروع ہو جاتا ہے۔ مسوڑھے اسفنج یا خمیری آٹے کیطرح پھولے ہوئے رہتے ہیں۔ ذرا سا دبانے سے خون نکل آتا ہے۔ اور دانت ہلنے شروع ہو جاتے ہیں۔ جو جسم کے عزیز ترین حصہ ہونیکے باوجود بیکار سمجھ کر قبل از وقت نکلوا دینے پڑتے ہیں ہندوستان کے بدقسمت لوگ جو اپنی صحت کو ایک حقیر ذرہ کے برابر بھی نہیں سمجھتے۔ ان تمام تکالیف کے اسباب پر غور نہیں کرتے۔ اور انہیں یہ خیال نہیں ہوتا کہ یہ تکالیف دانتوں کی خرابی سے ہیں۔ اور یہ سب ہماری اپنی بے توجہی کے باعث ہے

چنانچہ ان حالات میں مریض عام امراض کے حکیموں اور ڈاکٹروں کیطرف متوجہ ہوتا ہے۔ اگر اسکی خوش قسمتی سے کوئی نئے طرز کا ڈاکٹر اس کا معالج ہوتا ہے۔ تو چند روز کے تلخ تجربے کے بعد مریض کو کسی ماہر ڈنٹیل سرجن (امراض دندان کے مخصوص ڈاکٹر) کیطرف رجوع کرنیکا مشورہ دیکر مریض کے ساتھ اپنی انتہائی ہمدردی کا ثبوت دیتا ہے۔ اور اگر کہیں بدقسمتی سے ابتدا ہی میں کسی پرانے طرز کے طبیب کے قبضہ میں آجاتا ہے۔ تو وہ اسکو مدت دراز تک دق کرتا ہے۔ یہاں تک کہ مرض روز بروز ترقی پذیر ہوتے ہوے اپنے آخری درجہ میں پہنچکر ہولناک صورت اختیار کرلیتا ہے۔ اور مریض طرح طرح کے امراض کا شکار بن جاتا ہے۔

علاوہ ازیں دانتوں کو میلا رکھنے سے دانتونکو کیڑا لگ جاتا ہے۔ اور یہی حالت ہوتی ہے۔ جو لکڑی کے گھن لگ جانے سے۔ شروع میں اس موذی مرض سے دانتوں میں کوئی خاص تکلیف نہیں معلوم ہوتی۔ البتہ دانتوں پر مسوڑھوں کے قریب کسی کسی جگہ سیاہ دھبے سے پڑجاتے ہیں۔ لیکن رفتہ رفتہ جب یہ بیماری دانتوں کی جڑونکی طرف پہنچتی ہے۔ تو بے انتہا تکلیف ہوتی ہے۔ اور مریض کا کھانا پینا سونا تک حرام ہو جاتا ہے۔ اور اگر اسکا باقاعدہ علاج نہ کرایا جاے۔ تو سب دانت ایک ایک کرکے خراب ہو جاتے ہیں۔ مجبور ہو کر نکلوا ڈالنے تک نوبت پہنچ جاتی ہے۔ لیکن اگر ابتداء سے تھوڑی سی احتیاط کیجاے۔ تو تمام امراض سے دانت محفوظ ہو جاتے ہیں۔ دانتونکو صرف صاف رکھنے کی ضرورت ہے۔ اور یہ نہایت آسان کام ہے۔ اس کیلئے آپکو ایک دانتوں کے برش اور کسی اچھے سے دانتوں کے سفوف کی ضرورت ہے۔ صبح اٹھتے ہی سب سے پہلے دانتوں کے بیرونی اور اندرونی حصہ کو برش اور سفوف سے صاف کرلینا چاہئے اور اسی طرح رات کو سونے سے پہلے دانتونکی صفائی لازمی خیال کرنی چاہئے۔ کیونکہ دانتونپر بیماریوں کا اثر زیادہ تر رات کو ہوتا ہے۔ سال میں کم از کم دو ایک مرتبہ ضرور کسی ڈنٹیل سرجن کو دانت دکھانے چاہئیں۔ اور اگر کوئی شکایت ہو تو اس کا مناسب علاج کرانا چاہئے۔ اگر دانت زیادہ میلے ہوں تو پہلے کسی ڈینٹسٹ سے صاف کراکے پھر برش اور سفوف کا استعمال کرنا چاہئے۔ کیونکہ زیادہ میل ہونیکی صورت میں بغیر صاف کرائے پورا فائدہ نہیں ہوسکتا۔

نوٹ - دانتونکو برش کرتے وقت برش کا رخ اوپر سے نیچے اور نیچے سے اوپر کو ہونا چاہئے

تاکہ ہر ممکن صفائی ہو سکے اور برش کو ہر ماہ تبدیل کر دینا ہی مفید اور ایک حد تک ضروری خیال کرنا چاہیئے ۔

ہمیں اُمید ہے کہ مندرجہ بالا ہدایات پر ایک معمولی توجہ سے عمل کرنا بھی ہندوستان کی اس روز بروز گرتی ہوئی صحت کو سنبھالنے کیلئے بیحد مفید ثابت ہوگا ۔

ولایت کے ہسپتالوں میں میں نے پائیوریا (گوشت خورہ) کے مریض بہت کم دیکھے ۔ اسکی وجہ یہ ہے ۔ کہ وہ پابندی کے ساتھ سونے سے پہلے اور سونے کے بعد دانتوں کو برش سے صاف کرنیکے عادی ہیں ۔ پھر تیسرے یا چھٹے مہینے دانتوں کے ڈاکٹر سے اپنے دانتوں کا معائنہ کرا تے ہیں ۔ ولایت میں اکثر ایسے مریض دیکھے جاتے ہیں ۔ جن کے دانت کرم خوردہ ہوتے ہیں ۔ یا اس قسم کے لوگ جن کے دانت آگے پیچھے یا باہر نکلے ہوتے ہیں ۔ یہ لوگ دانتوں کی خوبصورتی کیلئے بدنما دانتوں کو نکلوا کر انکی جگہ بناوٹی دانت لگواتے ہیں ۔ ہندوستان میں ایک یونانی حکیم کو تمام مرضوں کا ماہر سمجھا جاتا ہے ۔ چیر پھاڑ کے قابل مرض میں بھی حکیموں سے مشورہ کیا جاتا ہے ۔

اسی طرح دانتوں کے مرض کا علاج عام حکیموں یا ڈاکٹروں سے کرایا جاتا ہے حالانکہ یہ ایسا غلط فعل ہے ۔ جیسے ایک بیمار دوا لینے کسی وکیل کے پاس جائے اور شفا کی امید رکھے ۔ ولایت میں ہر مرض کا ڈاکٹر علیحدہ ہوتا ہے ۔ جو اپنے خاص فن میں مہارت کامل رکھتا ہے ۔ اور عام طور پر مریض اپنی اپنی شکایتیں مخصوص ماہرین کے سامنے ہی لیجاتے ہیں ۔ اس کا نتیجہ یہ ہوتا ہے ۔ کہ انہیں کوئی بیماری زیادہ دن تک الجھائے نہیں رکھتی ۔ بیماری کا حملہ ہؤا ۔ اور اس بیماری کے ماہر ڈاکٹر نے اسکی روک تھام کر دی ۔

ڈاکٹر احمد جلال الدین ڈینٹل سرجن لاہور

برسات

برسات آئی برسات آئی
مینہ سے بیاباں رنگ گلستاں

پھولوں کی برکھا دونوں میں یکساں
کوئل کی کوُ کوُ باغوں میں رقصاں
جگنو کی جگ مگ بَن میں چراغاں
برسات آئی برسات آئی

رُت ہے سہانی نیچر ہے دھانی
بارش کی چھم چھم آکاش پانی
سرسبز کھیتی کھیتوں کی رانی
جس سمت دیکھو پانی ہی پانی
برسات آئی برسات آئی

لالے کی لالی بن میں دِوالی
کالی گھٹائیں گھنگھور کالی
جائے سے باہر باغوں میں مالی
مالن کے گجرے پھولوں کی ڈالی
برسات آئی برسات آئی

شب رنگ بادل مینہ کے ہراول
تپتی زمینیں پانی سے جل تھل
فرشِ زمرد سبزے کی مخمل
برسات سے ہے جنگل میں منگل
برسات آئی برسات آئی

دلکش سماں ہے دل شادماں ہے
خوشیوں کا ہر سو دریا رواں ہے
دِل شاد اِک اِک پیر و جواں ہے
برسات کی رُت جانِ جہاں ہے
برسات آئی برسات آئی

(تاجور)

دنیائے ادب

صبح — راوی کے کنارے

یہ صبح کا وقت اور یہ راوی کا کنارا — وجد آور و صد کیف بداماں ہے نظارا
فطرت نے ہے کس ذوق سے دریا کو سنوارا

بکھرا ہوا ہے چار طرف حسنِ فراواں! — میدان میں سارے! راوی کے کنارے!
بکھرے ہوئے موتی ہیں کسی نہرِ حبیں کے — کھوئے ہوئے منظر ہیں کسی خوابِ حسین کے
ٹکڑے ہیں مگر کیف گہہ خلدِ بریں کے

یا رندہیں مستانہ افلاک میں لرزاں! — یہ ڈوبتے تارے! راوی کے کنارے!
راوی کے کنارے کی یہ خاموش فضائیں! — بیتاب کناں ہجر در آغوش فضائیں!
رنگینیٔ فطرت سے ضیا پوش فضائیں!

یہ صبح طرب ریز، لب رود خراماں — یہ مست نظارے! راوی کے کنارے!
فردوس کی موسیقی سے لبریز ہے دریا — یا خلد کے نغموں سے جنوں خیز ہے دریا
یا رقص سے حوروں کے طرب ریز ہے دریا

حوریں! جو ہیں آغوش میں راوی کے خراماں — دلکش ہیں نظارے! راوی کے کنارے
لیکن ہے غم آلود یہ موسیقی رنگین — نغمات میں راوی کے ہے امداد غم آگین
موجوں کے تبسم میں ہے اک گریۂ خونین!

اور "عہد گزشتہ" کی طرف لہروں کا ہیجان — کرتا ہے اشارے! راوی کے کنارے
رنگ "مئے پارینہ" سے شاداب ہے راوی — اُس "عشرتِ برباد" کا اک خواب ہے راوی
اُن "محفلوں" کی یاد میں بے تاب ہے راوی

ہاں، یادِ جہانگیر میں راوی بھی ہے گریاں — لرزاں ہیں ستارے! راوی کے کنارے

(نگار)

پرستیدۂ خیال

میری آنکھوں میں نہاں اک پیکرِ تنویر ہے
میرے دل میں جگر اک حسن کی تصویر ہے
میرے خوابِ شعر کی اک دل نشیں تعبیر ہے

رات دن میری فضائے روح میں رہتی ہے وہ
دل کی ہم آغوشیوں کی آفتیں سہتی ہے وہ
اور مجھ سے داستانیں عشق کی کہتی ہے وہ

میری نیندوں کی فضاؤں میں وہی ہے جلوہ گر!
میری راتوں کی دعاؤں میں وہی ہے جلوہ گر
میرے شعروں کی اداؤں میں وہی ہے جلوہ گر!

میرے اشکِ شبنمیں میں یہ اُسی کا نور ہے!
میری وارفتہ نگاہوں میں وہی مستور ہے!
اُس کے جلووں سے مری دنیائے دل معمور ہے!

جب کبھی راتوں کو مل جاتی ہے تنہائی مجھے
پاس لیجاتا ہے ذوقِ سجدہ فرسائی مجھے!
اور تصور میں وہ کرجاتی ہے سودائی مجھے!

اُس کی اُلفت کی خلش سینے میں جب پاتا ہوں میں
جھوم کر پُر درد نغمے عشق کے گاتا ہوں میں!
سازِ حسرت کے فضا میں سوز برساتا ہوں میں

جی میں آتی ہے کہ اُس کی یاد میں کھو جاؤں میں
اس تصور میں ہمیشہ کے لئے سو جاؤں میں!
یعنی مٹ کر اُس کے جلووں میں فنا ہو جاؤں میں!

(ہمایون)

ہندی

پھولوں کے ساتھ بیدردیاں

دنیا میں رنگ رنگ کے پھول اور طرح طرح کے پھل وغیرہ پیدا ہوتے ہیں کوئی پھول تو اتنا خوشبودار اور خوشنما ہوتا ہے کہ اُس پر نظر پڑتے ہی بے اختیار جی چاہتا ہے کہ کچھ دیر اس کو ضرور دیکھیں۔ اسی طرح بعض لوگ یہ بھی سوچتے ہیں کہ اسے توڑ کر گلدستہ کیوں نہ بنایا جائے۔ اور میز پر رکھ کر کمرے کی خوبصورتی کے ساتھ ساتھ اس کے رنگ اور خوشبو کا مزا لیا جائے۔

جس طرح مختلف رنگ و بو کے پھول پیدا ہوتے ہیں۔ اسی طرح آدمیوں کی طبیعتیں بھی جُدا جُدا ہوتی ہیں۔ بعض لوگ اپنی دلچسپی کیلئے بے چارے پھولوں کی ساری حسرتوں کا خون کر دیتے ہیں۔ باغ میں بلبل کا چہکنا سُنکر کلیاں مارے خوشی کے چٹک اُٹھتی ہیں۔ پھول خوشی سے پھولے نہیں سماتے اور اپنی چند دنوں کی زندگی پر ناز کرتے ہوئے جیسے ہی بہار کے موسم کا خوشنما سماں دیکھنے کیلئے سر اُٹھاتے ہیں کہ بیدرد مالی ناگہانی بلا کی طرح اُن پر ٹوٹ پڑتے ہیں اور آناً فاناً میں اُن کی آرزوئیں مٹا دیتے ہیں۔ اور دیکھنے والے افسوس کرتے رہجاتے ہیں۔

غرض یہ لوگ ایسے بیرحم ہوتے ہیں کہ خوبصورت پھول کی نازک نازک پنکھڑیوں کو چٹکیوں سے مسل کر دور پھینک دینے میں ہی سچی خوشی اور دلی آرام محسوس کرتے ہیں۔ اُن کی خود غرضی۔ بیدردی اور وحشی پن پر کف افسوس ملنا پڑتا ہے۔

اُن کا دل اس قدر سخت ہو جاتا ہے کہ ہر نازک اور خوشنما چیز پر اُن کی نظر پڑتے ہی اسے مل ڈالنے کے لئے بوکھلا جاتے ہیں۔ کسی کو پھولا پھلا اور خوشنما دیکھ کر اُن کا دل دشمنی اور حسد کی آگ میں جلنے لگتا ہے اور اس کا نام و نشان مٹانے میں یہ اپنی تمام قوت صرف کر دیتے ہیں۔ اگر کوشش کارگر نہ ہوئی تو اپنی لگائی ہوئی آگ میں خود ہی جلتے ہوئے ایک دن خاک میں ملجاتے ہیں

گورمکھی

ذات پرست ہندو

"ماڈرن ریویو" کے ایڈیٹر مسٹر راماننند چیٹرجی نے سورت میں ہندو مہا سبھا کی صدارت کرتے ہوئے ہندوؤں کی ذات پرستی کی خدمت کرتے ہوئے فرمایا "جبتک ہندو سوسائٹی میں پوری پوری سمائی نہیں ہوتی اُس وقت تک ہندوؤں کے سنگٹھن کی تکمیل ایک امر محال ہے۔ ہمیں ہندو سوسائٹی میں اسلام جیسی سمائی اور برادرانہ برتاؤ پیدا کرنا پڑیگا۔ جو شخص اپنے آپ کو ہندو کہتا ہے اُسے چاہئے کہ وہ ہندو برادری کا حق ادا کرے۔ بعض لوگ کہتے ہیں کہ ذات پات کے بغیر ہندو سوسائٹی کی عمارت گر پڑے گی۔ مجھے اس بات سے اتفاق نہیں ہے۔ اگر دوسرے مذہب ذات پات کے بغیر زندہ رہ سکتے ہیں تو پھر ہندو زندہ کیوں نہ رہیں گے؟

(پھلواڑی امرتسر) مترجمہ **ایم معراج الدین**

بنگالی

جوگی

اے ندیم شاہ میں اُن عورتوں میں سے ہوں جن کو تو نے جنگل میں اس لئے بھیجا تھا کہ جوان جوگی کو گنہگار بنائیں۔

جب نوجوان جوگی دریا پر اشنان کرنے جا رہا تھا۔ تو پو پھٹ رہی تھی اُس کے لمبے لمبے بال اُس کے شانوں پر صبح کی گہری گھٹا کی طرح بکھرے ہوئے تھے۔ اور اُس کا جسم سورج کی کرنوں کی طرح چمک رہا تھا۔

ہم ایک کشتی میں بیٹھے ہنستے اور گاتے ہوئے وہاں سے گذرے۔ سورج نکلا اور پانی کے کناروں پر سے ہمیں غصے کی نگاہوں سے دیکھنے لگا۔ جوش کے ساتھ ہم دریا میں کود پڑے اور اُس کے چاروں طرف گھومنے لگے۔

ایک ننھے دیوتا کی طرح اُس لڑکے نے اپنی آنکھیں کھول کر بغور ہماری حرکتوں کو دیکھا۔ وہ حیران ہوتا گیا۔ یہاں تک کہ اُس کی آنکھیں ستاروں کی

مانند چمکنے لگیں۔ اُس نے اپنے جوڑے ہوئے ہاتھ آسمان کی طرف اُٹھائے۔ اور قمری کی سی دلکش آواز میں تعریف کا گیت گایا۔ جنگل کا پتہ پتہ اُس کی آواز سے لرز گیا۔ کیونکہ آج تک اس قسم کے الفاظ دنیا کی کسی عورت کی تعریف میں نہیں پیش کئے گئے۔ وہ ایک ایسا گیت تھا۔ جو ویران پہاڑیوں سے نمودار ہونے والی صبح کی سپیدی کے لئے گایا گیا۔

عورتوں نے اپنے مُنہ ہاتھوں سے ڈھانک لئے۔ اور اُن کے جسم ہنسی سے ہلنے لگے۔ نوجوان جوگی کے چہرہ پر شبہ کی وجہ سے چندیل پڑ گئے میں جلدی سے اُس کے پاس آئی۔ میرا دل دردمند تھا۔ میں نے اُس کے پاؤں پر اپنا سر رکھدیا۔ "میرے مالک! میری خدمتیں قبول کر!"

میں اُسے چھوٹے پھلے کنارے پر لائی اور اُس جسم کو میں نے اپنے ریشمی دوپٹے کے آنچل سے صاف کیا۔ میں نے زمین پر دونوں گھٹنے ٹیک دیئے اور اُس کے پیروں کو اپنے بالوں سے خشک کیا ـــــــ اور جب اُس نے مجھ سے کہا "تو کون سا نا معلوم دیوتا ہے؟ تیرا لمس کسی غیر فانی جسم کا لمس معلوم ہوتا ہے۔ تیری آنکھیں آدھی رات کے بھیدسے معمور ہیں!"

اے بادشاہ کے بوڑھے مصاحب دنیا کی عقل کی ریگ نے تیری آنکھوں پر پردہ ڈال رکھا ہے۔ مگر اُس لڑکے کی معصومیت نے کُہر کے دُھندلکے کو چیر کر آسمانی عورت کو دیکھ لیا۔

آہ! کس نئے انداز سے میری روحانی قوتیں اُس پہلی پوجا کے تیز نور سے بیدار ہوگئیں۔ سورج کی کرن ایک بہن کی محبت کے ساتھ بادلوں سے چھو گئی اور ہوا نے آہستگی سے میری پیشانی کو چوما۔

عورتوں نے تالیاں بجائیں اور بُرے انداز سے ہنسیں۔ پھر اُنھوں نے اُس پر پھولوں کی بارش کی، اس حال میں کہ اُن کی نقابیں زمین پر پڑی تھیں اور اُن کے بال بکھرے ہوئے تھے۔

آہ اے میرے بے داغ سورج کیا میری شرم کہر بن کر تجھے اپنے دامن میں نہیں چھپا سکتی؟ ـــــ میں نے اُس کے قدموں پر گر کر کہا " مجھے معاف کردے!" میں ایک زخمی ہرن کی طرح اندھیرے اور روشنی میں سے گذرتی ہوئی بھاگی اور کہتی رہی " مجھے معاف کردے!" عورتوں کے بجا ٹھٹے میرے پاس سے بھڑکتی ہوئی آگ کے شعلوں کی طرح گذرے مگر اُس کی آواز میرے کانوں میں گونجتی رہی " تو کون سا نا معلوم دیوتا ہے"

(رستیندر ناتھ دت)

حقی دہلوی

سنسکرت

شکنتلا ناٹک کے چار شلوک

سنسکرت ادبیات میں ڈرامے کو ایک خاص اہمیت حاصل ہے کیونکہ پُرانے زمانے سے سنسکرت کے شاعر ڈرامے لکھتے رہے۔ اور صدیوں کی محنت سے اسے اس کمال پر پہنچایا کہ شکنتلا ناٹک مصنفہ کالی داس (پانچویں صدی مسیحی) اس وقت دنیا کے اعلےٰ ناٹکوں میں شمار کیا جاتا ہے سنسکرت کے نکتہ چین پنڈت شکنتلا کے چوتھے ایکٹ کو سب سے اچھا خیال کرتے ہیں جس میں کہ شکنتلا اپنے دھرم پتا[1] کنو رشی کے یہاں سے اپنے شوہر راجہ دُشینت کے یہاں رخصت ہوتی ہے۔ اس ایکٹ میں بھی چار سلوک نہایت اعلیٰ مانے جاتے ہیں جو آگے لکھے جاتے ہیں۔

(۱) جس روز شکنتلا رخصت ہو رہی تھی اُس روز اُس کا دھرم پتا کہتا ہے:" جب میں یہ خیال کرتا ہوں کہ آج شکنتلا چلی جائیگی تو میرا دل اُمنڈا آتا ہے محبت کے آنسو روکنے سے گلا گھٹا جاتا ہے اور آنکھوں سامنے اندھیرا سا چھا جاتا ہے۔ اگر مجھ کو بھی جو جنگل میں رہنے والا ایک سنیاسی ہوں محبت کی وجہ سے اتنی گھبراہٹ ہے تو گرہستی لوگوں کی بے چینی کا کیا حال ہوتا ہوگا۔ جب اُن کی لڑکیاں اُن سے پہلی بار جُدا ہوتی ہیں (غور فرمائیے۔ اس میں کتنا قدرتی جذبہ ہے جو ہر انسان ایسی حالت میں محسوس کرتا ہے اور جو کسی خاص ملک قوم یا زمانہ تک محدود نہیں)

(۲) شکنتلا نے پتوبن میں پرورش پائی۔ اس لئے ضروری ہے وہاں کے درختوں اور جانوروں سے اس کی ایسی ہی محبت ہو جیسی کہ دوسرے بچوں سے چنانچہ جب وہ رخصت ہوتی ہے تو اس کا دھرم پتا درختوں سے کہتا ہے۔

اے درختو! یہ وہ شکنتلا ہے جو تمہیں پانی دینے سے پہلے خود بھی پانی نہ پیتی تھی۔ جسے اگرچہ زیور درختوں یا پھولوں کے بنے ہوئے کیونکہ وہ پتوبن میں رہتی تھی) پیارے تھے لیکن مارے محبت کے تمہارے نئے پتے نہ توڑتی تھی۔ جب تمہارے نئے پھول نکلتے تھے تب تو اس کے لئے بڑا اچھا موقعہ ہوتا تھا۔ وہی شکنتلا آج اپنے شوہر کے گھر جاتی ہے۔ تم سب اسے الوداع کہو" سادہ

[1] سلہ شکنتلا کی پیدائش کے بعد اس کی پرورش کنو رشی نے کی تھی۔ اس لئے اس کو شکنتلا کا دھرم پتا یعنی دھرم کا باپ کہتے ہیں۔

میکن پریم کی زندگی کا نمونہ ہے)

شکنتلا کا دھرم پتا اُس کے شوہر یعنی اپنے داماد راجہ دشنیت کے نام پیغام دیتا ہے۔

اے راجہ! اس بات کو اچھی طرح مدنظر رکھ کر کہ ہم تپستی ہیں جن کی دولت صرف تپسیا ہی ہے۔ یہ آپ بہت ہی اعلےٰ خاندان میں پیدا ہوئے ہیں اور شکنتلا کی یہ محبت آپ میں بغیر وسیلے کسی رشتہ دار کے ہوئی ہے۔ ان باتوں کا خیال کرکے آپ شکنتلا کو اپنے حرم کی دوسری رانیوں کی طرح دیکھنا۔ اس کے علاوہ اور جو کچھ ہے وہ سب قسمت پر منحصر ہے اور بیٹی والوں کو اپنی زبان پر لانا لازم نہیں۔

(۴) اسی طرح شکنتلا کا دھرم پتا اسے بھی نصیحت کرتا ہے۔

"اے بیٹی تو اپنے سسر اور ساس کی خدمت کرنا۔ اور اپنی سوتوں کے ساتھ بہنوں کی سی محبت رکھنا۔ اگر تیرا خاوند تجھے کسی قسم کا رنج پہنچاوے تو غصہ میں آکر تو اُس کے خلاف کوئی کام نہ کرنا۔ اپنے نوکر چاکروں کے ساتھ مہربانی سے پیش آنا اور عروج میں آکر کبھی غرور نہ کرنا۔ یہی باتیں ہیں جن سے اچھے گھرانے کی لڑکیاں اپنی سسرال میں عزت پاتی ہیں۔ اور جو اس کے خلاف چلتی ہیں وہ دونوں خاندانوں کیلئے کلنگ ہوجاتی ہیں۔ (بنارسیداس ایم۔اے

گجراتی

غلطی

صبح کا وقت تھا میں باغ میں پہنچا وہاں ایک آدمی پھول توڑ رہا تھا۔ میری آنکھوں کو غصے نے سرخ بنا دیا۔ میں نے آگے بڑھ کر اُس کی گردن پر ہاتھ رکھا اور کانپتی ہوئی آواز میں کہا۔ تو کون ہے؟ جو اس باغ میں آنے کی جرأت کرسکا۔

وہ مجرم کی طرح کھڑا ہوگیا۔ اور ہوا میں ہلتے ہوئے کیلے کے پتے کی مانند سر سے پاؤں تک لرز کر بولا۔ مجھ سے غلطی ہوگئی۔ اب دوبارہ یہ خطا نہ ہوگی یہ کہکر اُس نے اپنی محنت سے جمع کئے ہوئے پھول میرے قدموں پر رکھدیے۔ اور اُس کی نگاہوں نے مجھ سے معافی مانگی۔

میں نے پھول دامن میں رکھ لئے اور اُسے دھکے دے کر باہر نکال دیا۔

تھوڑی دیر کے بعد میں محل کے اندر مہاراج کے پاس پہنچا اور میری حیرت کا ٹھکانا نہ تھا۔ کہ وہ اجنبی گلچین خود مہاراج تھے میں خوف سے کانپ رہا تھا۔ مگر مہاراج میری "اپنی" اور اُن پھولوں کی طرف دیکھ دیکھ کر مسکرا رہے تھے۔

یکایک مجھے اُنہیں اور اپنے آپ میں فرق دکھائی دیا۔ میں غلطی دیکھ کر آگ بھبوکا ہوجاتا ہوں مگر وہ صرف مسکرا دیتے ہیں۔

کشمیری

گیت

تیری تلاش میں میرے محبوب صرف تیری تلاش میں

میں پہاڑوں میں ٹھوکریں کھاتی پھری۔ اُن پہاڑوں میں جن کی فلک بوس چوٹیاں سفید برف سے ڈھکی رہتی ہیں۔ ہاں انہیں پہاڑوں کی وادیوں میں جہاں ہری ہری گھاس۔ خوشنما پھولوں والی سرسبز جھاڑیاں ہر آنے والے کے دل کو اپنی جانب کھینچ لیتی ہیں۔ میں سمجھتی تھی کہ تم بھی انہیں وادیوں میں کہیں میری طرح سرگرداں ملوگے۔ مگر اُف تم نہ ملے۔

تیری جستجو میں میرے دوست صرف تیری جستجو میں

میں گنجان جنگلوں ماری ماری پھری اُن جنگلوں میں جہاں بڑے بڑے رشی منی تیری تلاش میں محو رہے۔ اور صدہا برس تک بھٹکتے رہے۔ مگر تجھے نہ ملنا تھا نہ ملا۔

تیری ملاقات کو ہاں اے میرے غمگسار صرف تیری ملاقات کو

میں نے دریاؤں کے شور کرتے ہوئے پانیوں سے تیری جگہ پوچھی۔ جو اونچے پہاڑوں کی گود سے نکل کر چٹانوں اور درختوں سے لپٹتے ہوئے میدانوں میں جاکر اپنی ہستی کو مٹا دیتے ہیں۔ مگر تیرا نشان اور مکان اب بھی نہ ملا۔

تیری تلاش سے میرے پیارے صرف تیری تلاش سے

میں مایوس ہوکر اپنی ٹوٹی پھوٹی جھونپڑی میں آگئی اور اپنا غم غلط کرنے کو خدا کی یاد میں اور نیک دلوں کی خدمت میں زندگی بسر کرنے لگی۔

تجھے پالیا ہاں اے میرے مطلوب میں نے تجھے پالیا

میرے دل نے میرے کان میں یہ بھید کہہ دیا کہ تو اُس میں موجود ہے جس کو پہاڑوں اور جنگلوں کی تنہائی نہ بتلاسکی جس کی خبر دریا کے رواں پانی نہ دے سکے

فارسی

ملامت کے چوگان سے

جب کوئی سالک راہِ خدا میں ثابت قدم اور مستقل ہو جاتا ہے تو پھر اللہ کے سوا دوسری چیزوں کا وجود اُس کی چشم توحید میں معدوم ہو جاتا ہے۔ بس اُسکو اللہ ہی اللہ دکھائی دیتا ہے۔

وہ قلم کی طرح ہر وقت کمر باندھے آمادہ اور سر جھکائے رہتا ہے۔ جو بات پیش آتی ہے سر کے بل قلم کی طرح جھک جاتا ہے۔

اس پر نظر نہ کر کہ کسی ظالم جابر کے ہاتھ سے کسی شریف اور کم آزار پر ظلم ہو رہا ہے۔

بلکہ یہ دیکھ کر کہ ایک دن ظالم بھی شمشیر ظلم وستم کے گھاٹ اُترے گا۔ اور اپنے کئے کی سزا پائیگا۔ اسی گرداب بے پایان (دنیا) میں شکم کا بوجھ دل پر نہ رکھو۔ کیونکہ جہاز طوفان کے دن بوجھل ہو جانے سے ہی ڈوب جاتا ہے۔ اس لئے دنیا میں سبکسار اور ہلکا پھلکا رہنا بہتر ہے

اے دیر ایک عرصہ تک سعی وتگ ودو کی تکلیف اُٹھاتا رہ کیونکہ لوہا بھی سعی پیہم سے ایک دن جامِ جم اور آئینۂ گیتی نما بن جاتا ہے۔ کوشش سے تمام کدورتیں اور دل کے غبار دور ہو جاتے ہیں۔

ایسا آدمی بہت کم منہ موڑتا ہے (یعنی ملامت کی پرواہ نہیں کرتا) جو راہِ خدا میں گیند کی طرح سر سے پاؤں تک قدم بن جائے تسلیم اور رضا کے میدان میں بادشاہ (خدا) کے گھوڑے کے سم کو وہ شخص دیکھ سکتا ہے۔ جو اپنی پیشانی کو کیل اور نعل کی طرح بنا دے۔ یعنی پیشانی پر سجدہ ریزی سے گٹا ڈال دے اور کمر کو خم کر لے غافل خانہ کعبہ کی جستجو کب تک اس خیال کو چھوڑ جب تو محرمِ خدا ہو گیا تو پھر تیری ذات خود حقائق ومعارف کا قبلہ بن جائیگی۔

کبیرہ گناہ انسان کے راستہ میں بڑے اٹل اور گرانبار پتھر ہیں۔ ایسے پتھر ندامت اور پشیمانی کے سیلاب ہی سے اپنی جگہ سے ٹل سکتے ہیں۔

ایسا غم کھانا چاہئے جس کے انجام میں مسرتیں اور خوشیاں حاصل ہوں۔

احمقوں کی طرح ایسی خوشی کے پیچھے نہ پڑو جن کا انجام رنج وملال ہو۔ تیرے دل میں حرص سمائی ہوئی ہے۔ اس لئے تو دستوں پر اپنا مال نہیں خرچ کرتا۔

اپنے پیٹ کو نرگس کی طرح خالی کر تاکہ تو ہمہ تن سونا ہو جائے۔

ترجمہ
(قصائد سعدی)

ضیاء درانی

عربی

عرب کے ایک غیرتمند شاعر کے خیالات

جبتک کسی نے اپنی آبرو کو کنجوسی اور لالچ سے میلا نہ کیا ہو اُس وقت تک وہ جیسا بھی لباس پہن لے بُرا نہ معلوم ہو گا۔ انسان اُس وقت تک نیک اور تعریف کے قابل نہیں ہوتا جبتک وہ طبیعت پر جبر کر کے بُری عادتوں سے منہ نہ موڑے

میری بیوی میرے خاندان پر یہ عیب لگاتی ہے کہ تیرے خاندان کا جتھا تو بہت تھوڑا ہے۔ میں نے جواب دیا کہ ہاں ہاں۔ یہ کوئی عیب کی بات نہیں۔ بلکہ شریف اور بہادر لوگ تو تھوڑے ہی ہوتے ہیں۔

اُن لوگوں کو کبھی تھوڑا نہ سمجھنا چاہئے۔ جن کے ہم جیسے بہادر نوجوان خونریز لڑائیوں کی آگ سے نکل کر تھوڑے رہ جائیں۔

ہمارے خاندان میں مردوں کی کمی ایسی حالت میں کیا باعث شرم ہو سکتی ہے۔ جب ہمارے ہمسایہ تک ہمارے رعب سے باعزت مانے جاتے ہیں

قوم میں مردوں کی وہ کثرت کس کام کی جب وہ خود بھی ذلیل اور پڑوسی بھی۔

ہم ایسے ایسے بلند پہاڑوں پر قابض ہیں جن کی طرف نظر اُٹھا کر دیکھیں تو نگاہیں تھک کر واپس آ جائیں۔

ان رفیع اور پرامن پہاڑوں میں صرف وہی لوگ قیام کر سکتے ہیں جن کو ہم پناہ دیں۔

ہم اُس قوم کے بہادر سپوت ہیں جو خوفناک جنگ میں گھس جانے کو اور بہادری سے جان دینے کو اپنی بے عزتی نہیں سمجھتے جس طرح دوسری قومیں۔

موت کو اتنا پیارا سمجھنا ہی تو زندگی کے آخری لمحوں کو ہم سے قریب کر دیتا ہے۔

ہمارے مخالفوں کا موت سے نفرت کرنا اور اُس کے ڈر سے لڑائی کے میدان سے منہ موڑنا اُن کی زیادتی اور کثرت کا باعث ہے

ایک تو ہمارا کوئی سردار بستر پہ پڑ کر ذلت کی موت نہیں مرتا۔

دوسرے ہمارا کوئی آدمی ایسا نہ ہوگا جس کا قصاص اور بدلہ نہ لیا گیا ہو۔ کیوں کہ یہ دونوں عیب ہماری قوم کے جوانوں کے لئے بڑی ہتک و ذلت کا سبب ہیں۔

ہمارے پاکیزہ خون صرف تیز آبدار تلواروں پر بہتے ہیں۔

شرافت خاندان اور صحیح نسب ہونے میں ہم بارش کے اُس پاک و صاف قطرہ کی طرح ہیں جسکو بلند ترین بادلوں نے برسایا ہو۔

ہمارے خاندان میں سُستی اور کنجوسی نام کو نہیں۔

ہم ہر ایک کی بات کو رد کر سکتے ہیں لیکن ہماری بات کو کاٹنے کی کسی میں ہمت نہیں۔

رات کو آنے والے مہمان کے لئے ہماری آگ اور ہمارے چولھے کبھی ٹھنڈے نہیں کئے جاتے۔ آجتک ہمارے مہمان نے پیٹھ پیچھے ہماری بُرائی اور بدخلقی کا اظہار نہیں کیا۔

ہماری اُن جوہر دار فولادی تلواروں نے ہماری شہرت اور بہادری کا نقارہ مشرق اور مغرب میں بجا دیا۔ جن پر دشمنی کی زرہوں کی مار سے دندانے پڑ گئے ہیں۔

ہماری قوم کا سردار دوسری قوموں کے لئے چکّی کی کیلی کی طرح ہے جسکے چاروں طرف وہ پاٹ کی طرح گھوم رہی ہیں۔

ضیاء درّانی

انگریزی

آفرینش شعر

دنیا کی ابتدا تھی اور رات کا وقت۔ ہر طرف خاموشی چھائی ہوئی تھی۔ کبھی کبھی آسمان میں بجلی کوند جاتی اور دریا کے اُس پار ایک ٹوٹا سا جھونپڑا دکھائی دے جاتا جس میں ایک بوڑھا مگر ہمت کا جوان بیٹھا ہوا تھا۔

اُس وقت کے لوگ اُس کو شاعر کہتے تھے۔ مگر اُنہیں خود بھی معلوم نہ تھا کہ وہ اسے شاعر کیوں کہتے ہیں۔

بادل گرجا اور تھوڑی دیر میں موسلا دھار بارش شروع ہوگئی۔ یوں معلوم ہوتا تھا کہ کسی دیوتا کا انعام کبھی ختم ہونیوالا نہیں جس سے دنیا بہ جائیگی۔

بوڑھے شاعر کو زیادہ سردی معلوم ہوئی۔ وہ اُٹھا۔ انگیٹھی میں آگ جلائی اور کرسی کی قسم کی چوکی کھینچ کر آگ کے قریب ہو بیٹھا۔

اتنے میں کسی بچے کے رونے کی غمگین آواز سُنائی دی۔ شاعر نے جھونپڑے کا دروازہ کھولا۔ اور دیکھا کہ ایک بچہ جس کے ریشم کے سے بال ہیں۔ تیر کمان لئے ہوئے پٹ سے لگا ہوا رو رہا ہے۔

شاعر اُسے اندر لے آیا۔ اور آگ کے قریب بٹھا دیا۔

بچے کے بالوں سے پانی کی بوندیں یوں گر رہی تھیں۔ جیسے صبح کا فرشتہ آسمانِ رحمت سے محبت کی برکتیں برسا رہا ہو۔

بچہ شاعر کے سامنے بیٹھا تھا۔ اُس نے اپنے معصوم ہاتھوں سے محبت کا تیر کمان میں جوڑا۔ اور شاعر کی طرف نشانہ کیا جو ٹھیک اُس کے دل میں جا اُترا۔

شاعر کے دل میں شاعری کی قوت پیدا ہوئی۔ دل میں اک ہُوک اُٹھی سینہ درد سے بھر گیا۔ موتیوں سے بھری آنکھوں سے آنسو ٹپکے۔ جو دنیا کو درد میں شعر کی صورت میں ظاہر ہوئے۔ اور اپنے قریب اور دور کے مقام کو مست کرنے لگے۔

اُس وقت شاعر کو معلوم ہوا کہ اُس نے شعر کہا ہے۔

غلام حبیب

ولندیزی

کسی پرندے کا گھونسلہ بھی اس قدر بلند نہیں ہوتا تھا جو وہ اپنے دوست کیلئے پیدا نہیں کرتا تھا۔ بادلوں میں سے عقاب کا گھونسلہ بھی اُتار لاتا تھا اور اس کے انڈے اور بچوں کو برباد کر دیتا تھا۔

کوئی ندی خواہ کیسی ہی تیز بہنے والی ہو۔ ایسی نہ تھی جس پر کہ وہ اپنے محبوب کو لے جاتا ہو۔ اور جبکہ پانی شور کرتا ہوا بہہ رہا ہو۔ تو اس کو اپنے دوست کی باہیں گلے میں ڈالنا کیسا پیارا معلوم ہوتا ہے۔

وہ موسم بہار کے تازہ کھلے ہوئے پھول اور تازہ پکے ہوئے پھل اور خزاں کا سب سے پہلا سنہری خزانہ اس کی نذر کرتا تھا۔

اطالوی

یہ بڑے شرم کی بات ہے اُس نے مجھے بیحد تکلیف دی ہے۔ ایک بدمعاش لڑکا ناقابل برداشت بوجھ ہے۔ میں آج ہی اس کو ٹھیک کروں گا کیونکہ میں نے کچھ ایسے آدمیوں کا پتہ نکالا ہے جو پولیس کے واسطے گندے کام کرتے ہیں۔ اور میں نے ان کو اس کام کے لئے اُجرت دی ہے کہ وہ اس کو کافی طور پر دھمکا دیں۔ اگر اُس نے پھر بھی اپنی بُری عادتوں کو نہ چھوڑا تو دوسری دفعہ سچ مچ اس کو سزا دلاؤں گا۔ لڑکی کے متعلق میرا خیال ہے کہ اس کو مار کوئش لے گیا ہے۔ میں نے اُس کے پیچھے آدمی لگا رکھے ہیں۔ جب تک مجھے سچی بات کا پتہ نہ چلے میں نہیں ٹھیروں گا اور جس شخص کا یہ کام ہے خدا کی قسم ہے۔ میں اُس کو اس کا مزا چکھا کر چھوڑوں گا۔

یہ تو نہایت ہی عجیب طرح کی قسم ہے میں یہ تو نہیں کہتا کہ دنیا میں عزت دار سوداگر ہی نہیں ہیں۔ مگر میں اتنا ضرور جانتا ہوں کہ اگر ان سے تم ایک غالیچہ اُدھار مانگو تو وہ دو شلنگ فی گز زیادہ لیں گے۔ اُس نے میرے پاس پشمینہ کی چادر بھیجی اور کہا کہ یہ فلورنتین کی ہے حالانکہ یہ موڈینا کی نکلی۔ اور جب کبھی میں اُسکے پاس روپے لیکر جاتا ہوں تو وہ کہتا ہے کہ اس روپے کا وزن کم ہے اسلئے وہ اُسکے دام کم دیگا۔

ہسپانوی

اس دنیا میں ہمارے لئے سوائے اس کے اور کچھ نہیں ہے کہ ہم اپنے ہنروں اور خودداری سے کام لیں۔ کیونکہ خودداری کے بغیر ہنر کی قدر کم ہو جاتی ہے۔ میرے خیال میں سب سے اچھی بات یہ ہے کہ جہاں تک ہو سکے بہت کم بولا جائے اور جب کبھی بولا جائے تو نہایت متانت سے گفتگو کی جائے اور بولتے وقت ایک شریف آدمی کی سی صورت بنائی جائے جب کوئی شخص تم سے کوئی سوال کرے اُس کو جواب نہایت حیا داری سے دیا جائے۔ اور اگر تم اپنی مرضی سے مُنہ کھولو اور کچھ کہو تو یاد رکھو کہ وہ رعب داب کے ساتھ ہو گویا کہ تم ایک لفظ کا تلفظ بیان کر رہے ہو۔ آجتک تم نے صرف اس قدر سیکھا کہ اپنے وسیلوں کو قطع کرو۔ حالانکہ اُس وقت تمہیں اُس سے فائدہ اُٹھانا چاہئے۔ تم اپنے آپ کو میرے حوالے کر دو۔ انسان کے لئے اس سے بہتر کوئی چیز نہیں ہے کہ کوئی شخص اُسے ایسا مل جائے جو اسکی خوبیاں اُسکو بتاتا رہے۔ کیونکہ حیا انسان کے لئے ایک ہمیشہ پہننے والا زیور ہے اور خود بڑا سمجھنا دیوانہ پن ہے۔ ان دونوں حالتوں کے درمیان رہکر ہم دنیا میں بُرے سمجھے جائیں گے۔ آدمی سوداگری کے مال کی طرح سے ہے۔ اُن کی قیمت اسی طرح گھٹتی بڑھتی رہتی ہے جس طرح کہ اُن کا بیچنے والا لائق ہو یا نالائق اگرچہ تم ایک کیچڑ سے بھرے ہوئے شیشے کے ٹکڑے کے مانند ہو۔ مگر میرے ہاتھوں میں رہکر تم ایک ہیرے کی قیمت پا سکتے ہو۔"

لاطینی

اگر تمہیں نزلہ ہو گیا ہو اور درد کے مارے تمہیں سخت تکلیف ہو۔ یا خدانخواستہ کسی چوٹ کے سبب تم اپنے بستر سے اُٹھ نہ سکتے ہو۔ تو ایسی حالت میں تمہارے پاس کوئی ہو گا جو تمہارے لئے دوائی تیار کرے گا۔ اور ڈاکٹر سے کہیگا کہ وہ تمہارا علاج اچھی طرح کرے تاکہ تم جلد بستر سے اُٹھو اور اپنے بال بچوں کی نگرانی کرو۔

یہ کیسے؟ تمہاری تو بیوی بھی تم سے محبت نہیں کرتی۔ نہ تمہارا بیٹا۔ ہر ایک آدمی تم سے نفرت کرتا ہے۔ کیا ہمسائے اور کیا دوست اور نوکر! کیا تم اس بات پر حیران ہو کہ تم کو سب سے زیادہ اپنے روپے سے محبت ہے۔ اور تم کسی چیز کو اس کے برابر نہیں سمجھتے۔ اور یہی سبب ہے کہ کوئی تم سے بھی محبت نہیں کرتا جیسی کرنی چاہئے۔

میں تو یہ کہوں گا کہ آؤ اس روپے کی محبت کو ہمیں ختم کریں۔ کیونکہ جتنا روپیہ تمہارے پاس زیادہ ہے اُتنے ہی تمہارے فکر کم ہونے چاہئیں۔ جب تم اپنا مطلب حاصل کرو تو اپنی مصیبتوں کا خاتمہ کر دو۔ تاکہ کہیں تمہارا بھی وہی حال نہ ہو جیسا کہ ایک دفعہ امیدئیس کا ہوا تھا۔ یہ ایک لمبی کہانی ہے وہ اس قدر امیر تھا کہ اپنی دولت کو وزن کر کے شمار کیا کرتا تھا۔ اور ایسا کنجوس تھا کہ ایک بھکاری سے بہتر اُس کے کپڑے نہ ہوتے تھے۔ اور مرتے دم اُس کو یہی غم تھا کہ کہیں دولت ختم ہو جانے سے اُس کو بھوکا نہ مرنا پڑے۔ مگر جانتے ہو کہ اُس کا نتیجہ کیا ہوا؟ ایک آزاد عورت نے کلہاڑی سے اُس کے دو ٹکڑے کر ڈالے" +

جرمن

جبتک میری رگوں میں خون کا ایک قطرہ بھی دوڑ رہا ہے میں تمہاری مخالفت کرونگی۔ اصلاح خانہ (جیل) میں میرا بچہ خراب ہو جائیگا۔ ایک شیطان لڑکی تو وہاں جاکر کچھ اصلاح پا سکتا ہے لیکن ایک نیک خصلت والا بچہ یقیناً وہاں جاکے شیطان ہو جائیگا۔ جیسے کہ ایک پودا تباہ ہو جاتا ہے جب اس کو سورج کی روشنی اور ہوا نہ ملے۔ میں اچھی طرح اس بات کو سمجھتی ہوں کہ میں ایسا کہنے میں اس کے واسطے کوئی بُرائی نہیں کر رہی ہوں۔ میں خدا کا لاکھ لاکھ شکر ادا کرتی ہوں کہ اُس نے میری رہبری کی کہ میں اپنے بچے کے دل میں عمدہ اخلاق اور شرافت کا مادہ پیدا کروں۔ پھر اُس نے ایسا خطرناک کام کونسا کیا ہے؟ اگر وہ اسکول سے نکالا گیا ہے تو میں اُس کو اس طرح اپنے ہاتھوں مصیبت میں نہیں ڈال سکتی۔ اور اگر اس میں اُس کا قصور بھی ہو تو اُس کی سزا اُس نے کافی طور سے بھگت لی ہے۔ اور تم اس بات کو اچھی طرح جانتے ہو یہ ممکن ہے کہ یہ خیال صحیح ہو۔ مگر اپنے بچے کی تباہی دیکھی نہیں جا سکتی۔

مگر اس کا تعلق ہم سے نہیں ہے۔ یہ ایک ایسا خطرہ ہے جو ہم نے خود بخود اپنے ذمے دوسری خوشیوں کے ساتھ لے رکھا ہے۔ جو شخص چلنے میں بہت سست ہو اُس کو قافلے والے پیچھے چھوڑ کر چلے جاتے ہیں ہمارا فرض ہے کہ بھٹکنے والے کو جہانتک ممکن ہو ٹھیک راستے پر چلانے کی کوشش کریں۔

ترکی

اوہو! پھر میرا دل خون سے بھرا ہے۔ اپنے محبوب سے جُدا ہوتے وقت میں اُس کے پاؤں پر گرا۔ میرے وحشی دل پر غم اور غصہ نے حملہ کرکے اُس کو جیت لیا۔

محبوب نے آنکھیں پھیرلیں! میری محبت سے انکار کر دیا۔ آسمان مجھ سے پلٹ گیا، رنج و غم کی گھٹائیں چھا گئیں۔ یار دوست جُدا ہو گئے! دشمن کا ستارہ روشن اور بلند اور میں بے یار و مددگار رہ گیا۔!

دنیا کے باغ میں اگرچہ لوگ خوش نظر آتے ہیں۔ مگر جب تم غور سے دیکھو تو دنیا رنگا رنگ کی مصیبتوں کا گھر ہے۔ اگر تم انصاف سے خوش و خرم رہ سکتے ہو تو دنیا میں وہ بہت کم ملتا ہے۔ کیا ہزار سال میں ایک عاشق بھی محبوب سے ملتا ہے۔ اگر کسی کو ایسا نصیب ہوا ہے تو اُس کو ناز کرنا چاہیے۔

اے دل! ذرا سوچ تو سہی! افسوس! پھرنے والی زمین کے انقلابات! اگر ایک منٹ آرام کا آتا ہے تو سینکڑوں دن رنج و الم کے ہوتے ہیں۔ اس لئے دنیا کی بادشاہت پر نہ تو حسد کرو اور نہ اس کا لالچ کرو۔ کیونکہ یہ سب عیش و آرام اور ملک و سلطنت فنا ہونے والے ہیں۔

فرانسیسی

تاہم میں درخواست کرتا ہوں کہ آپ میرا اعتبار کریں کہ بدمعاش لوگوں کے دلوں میں اس قدر محبت نہیں ہوتی جتنی کہ اُن کی زبان پر ہوتی ہے۔ آپ یقین جانئے کہ اگر ایک لڑکی ایک ایسے بدمعاش کی محبت میں مر بھی جائے تو وہ بجائے کچھ غم کرنے کے ہنسے گا۔ مضبوط اور خوشنما پروں والے پرندے جو درختوں کی ٹہنیوں پر بڑے مزے سے چہچہاتے ہیں۔ اُن کا وہ چہچہانا اُسی طرح بدل جاتا ہے جس طرح کہ اُن کے پروں کے رنگ کی چمک عمر کی وجہ سے گھٹ جاتی ہے وہ اب بوڑھے ہو چکے ہیں۔ نہ تو اُن کی زبان میں مزا ہے اور نہ اُن کے پر و بر رنگت ہے۔ اُن کی خوبصورتی سب جاتی رہی۔ مگر ہمیں دیکھو کہ محبت سچی اور پاک محبت میں ہے۔ ہمارے قدم آہستہ اُٹھتے ہیں اور ہماری آنکھیں مدہم پڑی ہوئی ہیں۔ ہمارے ابروؤں پر بل پڑے ہوئے ہیں مگر دل میں کبھی بل نہیں پڑتا۔ جب کوئی شخص بڑھاپے میں محبت ظاہر کرے تو اُسے معذور سمجھنا چاہیئے۔ کیونکہ دل ہمیشہ جوان ہوتا ہے۔ میری محبت کوئی شیشہ جیسی کمزور چیز سے نہیں بنی ہے کہ ذرا سی ٹھوکر سے ٹوٹ کر ٹکڑے ٹکڑے ہو جائے۔ ایک پاک اور ہمیشہ رہنے والی محبت ہے۔ میری پدرانہ محبت تمہارے ساتھ ایسی ہی مضبوط ہے جیسے ایک پہاڑ کی چٹان۔

یونانی

حکماء کی اولاد کا یہ خیال ٹھیک ہے کہ بے وقوف لوگوں کے سب کام محبوب ہے۔ (حقیقت میں وہ خدا کا پیارا ہے۔ کیونکہ وہ خدا کی یاد کرنا

ناپاک ہوسکتےہیں اور جہالت کو وہ دیوانہ پن سمجھتے ہیں۔ اُن کی رائے ہے کہ اکثر لوگ دیوانے ہیں عقل ہمیں ذرا سا شبہ کرنے کی بھی اجازت نہیں دیتی کہ آیا عقلمند ہونا بہتر ہے۔ یا دیوانہ ہونا۔ سچائی پر مضبوطی سے قائم رہ کر ہم خدا کے حکموں کی تعمیل عقل کی درستی سے کرتے ہیں اور یہ ہمارا اعتقاد ہے کہ سب چیزوں کا مالک وہی ہے۔ اس کے علاوہ ہمیں اس بات کو ماننا پڑیگا کہ ہم اسکی بہترین مخلوق ہیں اور اپنے آپ کو اُس کے حوالے کرتے ہیں۔ ہم کو خدا سے سچی محبت ہونی چاہیئے۔ اور تمام عمر ایسا کرنا ہمیں اپنا فرض سمجھنا چاہیئے۔ اور اگر دوستوں کا مال ملا جُلا ہے اور آدمی خدا کا رہتا ہے) پھر سب چیزوں کا مالک انسان ہو جاتا ہے۔ کیونکہ سب چیزیں خدا کی ہیں اور انسان اور خدا دوست ہیں۔ دوستوں کی ملکیت ملی جلی ہوتی ہے اس لئے دنیا کی تمام چیزوں کا مالک انسان اور خدا ہے لہذا ہمیں اس بات کو ماننا چاہیئے کہ صرف خدا سے ڈرنیوالے لوگ ہی امیر اور عقلمند ہیں۔

یہ کیونکر ٹھیک ہوسکتا ہے کہ تم نے خود تو انسان کے لئے قانون بنائے۔ اور خود ہی تم گناہ کے کام کرو۔ میں یہ ضرور کہوں گا کہ اگرچہ ایسا نہیں ہوسکتا۔ مگر تم ضرور ایسے گناہ کیلئے جرمانہ ادا کرو۔

ریویو

پیشوا کا رسول نمبر

معراج النبی و محفل میلاد کی دھوم دھام نے مسلمانوں میں جو بیداری کا جذبہ پیدا کر دیا ہے وہ امیدوں سے کہیں بڑھ چڑھ کر ہے کیونکہ اس مبارک تحریک کی طرف مسلمانوں کا یہ پہلا قدم تھا۔ اسی سلسلہ میں اسلامی اخباروں اور رسالوں نے جو رسول نمبر اور رحمۃ العالمین نمبر نکالے اُن میں ہمارے نقطۂ نظر سے پیشوا کے رسول نمبر کو خاص وقعت ہے اسمیں مشہور مقامات مقدسہ مثلاً حرم بیت اللہ۔ مزار رسول پاک و دیگر مزارات مقدسہ۔ اور دنیا کی مشہور مساجد عمارات و قلعہ جات تقریباً ۳۰ عدد فوٹو بلاک نہایت دیدہ زیب ہیں جن سے رسالہ کی شان دوبالا ہوگئی ہے۔ اسمیں ہندوستان کے مشہور اہل قلم کے بلند پایہ مضامین بھی مطالعہ کے قابل ہیں۔ ہم اس محنت و جانفشانی کی جو رسالہ تزئین و تحسین میں صرف کی گئی ہے۔

پیشوا کے ادارۂ تحریر و تنظیم جتنی بھی داد اور مبارکباد دیں کم ہے۔ غرض یہ صحافت اسلامی کا ایک بہترین مرقع ہے۔ گویا دریا کو کوزے میں بند کیا ہے ہم ناظرین "آدبی دنیا" سے اس کے مطالعہ کی پُرزور سفارش کرتے ہیں۔ اس خاص پرچہ کی قیمت ڈیڑھ روپیہ ہے۔ جو اصحاب دو روپیہ سالانہ چندہ بھیجکر منگائیں ان کو مفت بھیجا جاتا ہے مینجر رسالہ پیشوا دہلی سے طلب فرمائیں۔

نظام المشائخ کا رسول نمبر

پیشوا کی طرح نظام المشائخ نے رسول نمبر شائع کیا ہے جو عمدہ گئے مضامین ہیں جن کی اس فتنہ و فتن کے زمانہ میں اشد ضرورت تھی وہ اس رسالہ میں موجود ہیں یہ رسالہ جن مقاصد کو لیکر جاری ہوا تھا اُمیں بیکامیاب رہا ہے۔ جولائی و اگست کا یکجائی نمبر رسول نمبر کے نام سے ۲۳۲ صفحے پر علیحدہ ۸ صفحہ ضمیمہ کے شائع ہوا ہے۔ لکھائی۔ چھپائی نہایت دیدہ زیب ہے۔ اس رسالہ میں نبی کریم کے متعلق تقریباً ۲۸ صفحات مندرج ہیں۔ عوام کیلیے اس کی قیمت ایکروپیہ ہے۔ اور رسالہ کے مستقل خریداروں کو مفت بھیجا جاتا ہے۔ مینجر نظام المشائخ دہلی سے طلب فرمائیں۔

خضر راہ:۔ اس نام کا رسالہ امیناگاؤں لکھنؤ سے مولانا حامد علی ندوی کے زیرادارت نکلا ہے۔ مضامین دلچسپ اور بلند پایہ ہیں۔ ہندوستان کے ادیب مولانا نیاز فتحپوری کی سرپرستی اسکو بام ترقی پر پہونچا دینے کے لئے خضر راہ ہے چندہ سالانہ للعہ چار روپے

فرہنگ الفاظ

الفاظ	معنی
(الف)	
اشربہ۔	شراب کی جمع۔
ارتقا۔	ترقی۔عروج
انفرادی حیثیت۔	اکیلے پن کی حالت
ابتدائے آفرینش	پیدائش کا شروع
انتشار	پریشانی۔بے اطمینانی
الوداع کرنا۔	رخصت کرنا
احترام۔	عزت۔بڑائی
اتالیق۔	استاد
اندازِ تکلم۔	بات کرنے کا ڈھنگ
اثبات۔	ثابت کرنا
اعزہ واقربا	اعزہ جمع عزیز کی۔اقربا جمع قریب
اعتراف۔	اقرار۔ماننا
(ب)	
بے نیاز	بے پروا
بوس وکنار کرنا۔	چومنا اور بغل میں لینا۔
بدعنوانی۔	بدچلنی
باطنی صفات۔	اندرونی خوبیاں
بادی النظر میں۔	ظاہر میں
بصارت	بینائی۔
برہم زنِ دیوار۔	دیوار کو توڑنے پھوڑنے والا
بلند پروازی	اونچا اڑنا
(ت)	
تحسین۔	خوبصورت بنانا
ترحم	رحم کرنا
ترک وتاز۔	لڑائی جنگ
تعاقب کرنا۔	پیچھا کرنا
تنازع بقا۔	زندگی کی کشمکش
تموّل۔	امیری۔مالداری
تابش۔	چمک
تزئیں	سجاوٹ
(ج)	
جبین۔	پیشانی۔ماتھا
جراحت۔	زخم
جدت طرازی۔	نئی بات پیدا کرنا۔
(ح)	
حزین۔	غمگین رنجیدہ
حسبِ معمول۔	عادت کے مطابق
حالت اضطراری۔	بے اختیاری کی حالت
(خ)	
خلوت	تنہائی
خوابیدہ	سویا ہوا
(د)	
دعوتِ طرب	خوشی اور مسرت کا [illegible]
دل آویز۔	دل کو اچھی معلوم ہونے والی چیز
در آنا۔	آگھسنا
دوُن	کمینہ
(ر)	
روایات۔	روایت کی جمع
(ز)	
زینت افزا۔	خوبصورتی بڑھانے والا
(س)	
سرگرم خرام ہونا۔	نازسے چلنا
سلاست ذوق۔	طبیعت کی عمدگی۔
سمع خراشی کرنا۔	کان کھانا
(ش)	
شرفاء۔	شریف کی جمع۔
شدت تشنگی	پیاس کی زیادتی
شوق آموز۔	شوق پیدا کرنیوالی
شرفِ باریابی۔	ملاقات کی عزت
شب تار	اندھیری رات
(ض)	
ضوفشاں۔	روشنی ڈالنے والا
ضعیف العمر۔	بوڑھا
(ظ)	
ظلمت۔	اندھیرا۔تاریکی
(ع)	
علم العقائد۔	انسان کے عقیدوں کا علم
عروج۔	بلندی۔ترقی
علم موسیقی	گانے کا علم۔
(غ)	
غمزہ۔	ناز وادا
(ف)	
فراوانی دولت۔	دولت کی زیادتی
فرخندہ۔	مبارک۔اچھا
فریب خوردہ	دھوکہ کھائے ہوا۔
(ق)	
قصرِ آزادی۔	آزادی کا محل
قشقہ۔	وہ نشان جو برہمن لوگ ماتھے پر لگاتے ہیں۔
(ک)	
کورٹ مارشل۔	فوجی عدالت
کرخت لہجہ۔	سخت لہجہ
کشیدہ قامت	دراز قد
کلید برداری۔	دربانی
کاسۂ گدائی۔	فقیری پیالہ
(گ)	
گنبد نیلگوں۔	نیلے رنگ کا گنبد۔مراد آسمان
گردشِ ایام	زمانہ کا الٹ پھیر
(ل)	
لازمہ زندگی۔	زندگی کی ضروری چیز۔
لب لباب۔	خلاصہ
(م)	
مرصع۔	جڑاؤ
ملک الشعراء۔	شاعروں کا سردار
موجزن۔	موج مارنے والا
مشیر۔	جس سے مشورہ لیا جائے۔
مشائخ۔	بزرگ لوگ
معلق	لٹکا ہوا۔
مسکرات۔	مسکر کی جمع نشہ لانیوالی چیز
مہوشان۔	مہوش کی جمع چاند سی صورت والا مراد محبوب
مقہور۔	جس پر غصہ و ناراضگی ہوئی ہو
مسخ ہونا۔	صورت بدل جانا
مخلوط	ملا جلا
ملبوسات۔	ملبوس کی جمع لباس
مغالطہ۔	غلطی میں ڈالنا
معذرت کرنا۔	معافی مانگنا
مجروح۔	زخمی
(ن)	
نقیض۔	الٹا۔برعکس
نیک ضمیری۔	دل کی اچھائی
نقاد۔	پرکھنے والا
(و)	
وسعت۔	کشادگی پھیلاوٹ
وعیدوں۔	وعید کی جمع دھمکیاں

امیر کشور معنی امیر مینائی

نیرنگ کا خاص معیار علم و ادب کی تنقید ہے

اس مقصد کی تکمیل کیلئے ابتدا سے ابتک جو خدمات انجام دیگئی ہیں اُن سے ارباب نظر واقف ہیں اور معترف ہیں کہ "نیرنگ" نے ہمیشہ روایات کو برقرار رکھا ہے اس لئے جنوری ۱۹۳۰ء میں ملک الشعرا حضرت امیر مینائی مرحوم لکھنوی کے فضل و کمال سے معنون کر کے نیرنگ کا امیر نمبر شایع کیا جائیگا۔ امیر نمبر جنوری ۱۹۳۰ء کے پہلے ہفتہ میں شایع ہوگا۔ تقریباً دو سو صفحات کی ضخامت ہوگی اور متعدد فوٹو بلاک عکس تحریرات جنمیں حضرت امیر اور اُن کے صاحبزادگان اور ارشد تلامذہ کی تصاویر بھی قابل ذکر ہیں۔ بہترین مضمون پر پچیس ۲۵ روپیہ کا حقیر ہدیہ نیرنگ کی جانب سے صاحب مضمون کی نذر ہوگا۔ مضامین مندرجہ ذیل عنوانات پر ہوں گے :۔

(۱) حضرت امیر کے حالات زندگی۔

(۲) امیر کے فضل و کمال اور تصانیف پر تحقیقی نظر۔

(۳) شاعرانہ کمالات اور معاصرین میں امیر کا مرتبہ۔

(۴) کلام پر تبصرہ۔

(۵) تذکرہ تلامذہ۔

ارباب قلم ۱۵ اکتوبر ۱۹۲۹ء تک حسب پسند عنوان پر مضمون ارسال فرمائیں، مضامین میں اختصار کے ساتھ جامعیت کا لحاظ ضروری ہے۔ انعامی رقم یکم جنوری ۱۹۳۰ء تک بھیج دی جائیگی۔ مدیر نیرنگ رامپور

ہفتہ وار اتحاد

ہفتہ وار اتحاد جو مولانا تاجور کے زیر ادارت عرصہ سے ملک و قوم کی خدمت میں مصروف ہے۔ اس کے مضامین اور خبریں میں آج تک کسی شخص کو دفعہ شکایت پیدا نہیں ہوئی۔ اسکی پالیسی اور اسکا مسلک ہمیشہ یہی رہا ہے کہ ہندوستان کی مختلف اقوام اور مذاہب کے پیرو باہم شیر و شکر ہو کر مادر ہند کی ترقی میں مصروف ہیں

یہ اخبار بڑی آب و تاب کے ساتھ باقاعدہ طور پر شائع ہو کر ناظرین کی خدمت میں وقت پر ارسال کر دیا جاتا ہے۔ اس کے ہر نمبر میں کئی تصاویر ہوتی ہیں۔ اس کا سالانہ چندہ پانچ روپیہ

مشتہر

منیجر اخبار اتحاد لاہور

لاہور ٹرنک ہاؤس انارکلی بازار لاہور سے

عمدہ سستے مضبوط اور خوبصورت ٹرنک سوٹ کیس ٹب بالٹی آہنی کرسیاں لیٹر بکس وغیرہ ہر قسم و حسب پسند دستیاب ہو سکتے ہیں

ہر قسم کے سپورٹس کا تازہ سامان۔ کرکٹ۔ ہاکی ٹینس۔ بیڈمنٹن۔ فٹ بال۔ والی بال وغیرہ نہایت سستے نرخوں پر پتہ ذیل سے طلب فرمائیں

نوٹ:۔ "پرائس لسٹ مفت طلب فرمائیں"

چراغدین اینڈ سنز۔ لاہور سپورٹس ورکس انارکلی لاہور

تمغہ یافتہ

رجسٹرشدہ ۱۹۰۰ء

خاص رعایت

صرف دیہاتی مڈل سکولوں کیواسطے

مکرمی جناب ہیڈ ماسٹر صاحب جی

تسلیم ہم آپ کی خدمت میں اطلاع دیتے ہیں کہ ہم نے اس دفعہ اپنے کارخانہ میں کھیلوں کا سامان نہایت ہی اعلیٰ درجہ کا تیار کروایا ہے۔ اور چونکہ ہمارا کارخانہ بہت مدت سے عمدہ اور اعلیٰ درجہ کا سامان کھیل پہنچانے کے واسطے مشہور ہے۔ اس واسطے آزمائشی آرڈر دے کر ہمارے سامان کی عمدگی مضبوطی اور رعایت کی آزمائش فرماویں۔ اور عرصہ چوبیس سال میں ہمارے کارخانہ نے جو شہرت پنجاب و دیگر صوبجات میں حاصل کی ہے وہ صرف مندرجہ ذیل وجوہات سے ہے۔

(۱) کمیشن ۱۲½ فی صدی (۲) اگر کوئی سامان ناپسند ہو تو بخوشی واپس یا تبدیل کر دیا جاتا ہے۔ (۳) اگر کوئی چیز جلدی ٹوٹ جائے۔ تو اس کو مفت مرمت کر کے دیتے ہیں۔ اس کے علاوہ دعوتیہ نمائش شملہ کا سلور میڈل یعنی تمغہ بہت سی سندیں اور سرٹیفکیٹ اور ہز ایکسیلنسی ہز ہائی نس مہاراجہ صاحب فرید کوٹ کی سپیشل اپائنٹمنٹ ہی ہمارے مال کی پائیداری اور بہتری کا ثبوت ہے۔

نام اشیا	درجہ اول	درجہ دوم	درجہ سوم	درجہ چہارم
کرکٹ بیٹ میچ کیواسطے	۱۰-۰	۸-۰	۷-۰	۵-۰
کرکٹ بیٹ آل کین پریکٹس	۵-۰	۴-۸	۴-۴	۴-۰
کرکٹ گیند	۳-۰	۲-۸	۲-۰	۱-۸
وکٹیں فی سیٹ ۶ عدد	۶-۸	۶-۰	۵-۰	۴-۸
فٹ بال میچ کیواسطے مکمل	۱۰-۰	۸-۰	۷-۰	۶-۰
فٹ بال پریکٹس کیواسطے مکمل	۵-۸	۵-۰	۴-۰	۳-۸
فٹ بال بلیڈر	۲-۸	۲-۴	۲-۰	۱-۸
فٹ بال پچکاریاں	۵-۰	۴-۰	۳-۸	۳-۰

نام اشیا	درجہ اول	درجہ دوم	درجہ سوم	درجہ چہارم
سٹو مپ	[illegible]	۳-۰	۲-۸	۲-۰
ہاکی سٹک ان کین بنت	۵-۰	۴-۸	۴-۰	۳-۰
ہاکی گیند	۳-۰	۲-۸	۲-۰	۱-۰
والی بال میچ مکمل	۷-۸	۶-۸	۵-۸	۴-۰
والی بال بلیڈر	۵-۰	۳-۸		
والی بال جال	۶-۰	۵-۰	۴-۰	۳-۰
فٹ بال سیٹی	۱-۴	۱-۰	۰-۱۲	۰-۰
سلولیشن بڑی	۱-۰	۰-۱۲	۰-۸	۰-۴

مال بذریعہ وی پی روانہ ہوگا۔ نزدیک کے ریلوے اسٹیشن کا نام دیویں۔ پتہ خوش خط اور صاف حروف میں لکھیں۔

ملنے کا پتہ

گورنداتامل اینڈ سنز رائل سپورٹس ورکس شہر سیالکوٹ۔

۵۸۶

رجسٹرڈ

ایل نمبر ۲۴۸۲

فہرست مضامین

جلد (۱) بابت ماہ نومبر ۱۹۲۹ نمبر (۷)

تصاویر:- سیفو۔ سہ رنگی (۲) پروفیسر روس اور ان کے شاگرد (۳) مسٹر گرنیبے (۴) سفری یونیورسٹی "فن مصوری کی تعلیم (۵) پیرا کی کی مشق (۶) سلطان خلجی کا مقبرہ (۷) چمپا باولی (۸) شاہی محل کا نظارہ (۹) زار روس کی بھتیجی ٭

عنایت کریم کاتب سیالکوٹی

"ادبی دنیا" کا بے نظیر خیر مقدم

"ادبی دنیا" کے پہلے نمبر پر سب سے پہلے ہندوستان کی مشہور خبر رساں ایجنسیوں (ایسوشی ایٹڈ پریس اور فری پریس) نے شاندار الفاظ میں ایک ریویو کرکے زبانِ برق کی معرفت ہندوستان بھر کے روزانہ اخبارات میں شائع کرایا تھا۔

اُس وقت سے اب تک کہ رسالے کے چھ نمبر شائع ہو چکے ہیں۔ ادبی دنیا کی شہرت سے ہندوستان کا آباد حصہ روشناس ہو چکا ہے۔ ملک کے مقتدر انگریزی اخبارات میں سے بمبئی کرانیکل۔ ڈیلی کرانیکل۔ انڈین نیشنل ہیرلڈ انگلشمین، ٹائمز آف انڈیا۔ پانیر۔ لیڈر۔ ہندوستان ٹائمز۔ ٹریبیون، مسلم آؤٹ لک۔ سول ملٹری گزٹ وغیرہ نے بلند لہجے میں ادبی دنیا پر اظہارِ رائے کیا۔ ٹریبیون نے دو مرتبہ اور سول ملٹری گزٹ نے تین بار مختلف نمبروں پر ریویو کیا۔ اردو اخبارات و رسائل میں سے شاذ و نادر ہی کوئی پرچہ ہوگا۔ جس نے اپنے ریویو میں ادبی دنیا کو اردو ادب کا بہترین پرچہ نہ بتایا ہو۔ گورمکھی اور ہندی کے پرچے ہمارے مضامین کا ترجمہ شائع کرتے رہتے ہیں۔

اس کے علاوہ ہندوستان کے مشہور اہلِ قلم منتخب اہلِ علم اور اہل الرائے جن میں یونیورسٹیوں کے پروفیسر کونسلوں کے ممبر، حکومت کے وزیر۔ تعلیمی رہنما۔ ملکی لیڈر بھی شامل ہیں۔ اپنی رایوں میں ادبی دنیا کی اشاعت کو اردو ادب میں ایک نئے دور کے آغاز سے تعبیر کر چکے ہیں۔ مذکورہ بالا طبقات کے افراد کی بیش قیمت رائیں ہر نمبر میں شائع کی جاتی رہی ہیں۔ اس مرتبہ ہم پنجاب لیجسلیٹو کونسل کے قابلِ عزت پریزیڈنٹ جناب آنریبل خان بہادر چودھری شہاب الدین صاحب قبلہ۔ پنجاب کے مشہور شاعر خان بہادر چودھری خوشی محمد ناظر سابق گورنر کشمیر اور گورنمنٹ کالج لاہور کے قابل قدر استاد قاضی فضل حق صاحب ایم اے کی قابلِ فخر رائیں شایع کرکے اس سلسلے کو ختم کرتے ہیں۔ (ایڈیٹر)

آنریبل خان بہادر جناب چودھری شہاب الدین صاحب بی۔ اے ایل ایل بی۔ پریذیڈنٹ پنجاب لیجسلیٹو کونسل

میں نے آپ کا مرسلہ رسالہ "ادبی دنیا" بڑی مسرت کے ساتھ مطالعہ کیا۔ آپ کے اس نادر تحفے کا شکریہ جسقدر ادا کیا جائے کم ہے!

میری ذاتی رائے ہے کہ "ادبی دنیا" اپنے صُوری و معنوی محاسن کے اعتبار سے اردو دنیا کی ایک بالکل نئی چیز ہے۔ نثر کا لہجہ قدرتی، زبان شستہ اور سلیس ہے۔ نظم کی بحروں میں ہندی موسیقی اور دیسی تلمیحات کی چاشنی اردو کو اپنے من بھاتے لباس میں پیش کرتی ہے اور یہ روپ یقیناً تمام اہلِ ملک کے لئے وہ ہندو ہوں یا مسلمان یکساں طور پر مرغوب اور جاذبِ نظر ہونا چاہیئے۔ اردو رسائل کی ترقی کے میدان میں غالباً یہ سب سے پہلا مؤثر اور جادہ شناس قدم اٹھا ہے جس کے نقوش میں ادبی اور علمی یگانگت کے ذرے چمکتے نظر آتے ہیں!

خصوصیت سے اس کالم نے مجھے محظوظ کیا ہے جس میں نہ صرف ہندوستان کی علمی زبانوں سے اردو میں اقتباس کیا گیا ہے بلکہ ادبیاتِ عالم کے لطیف و نظیف شہ کارے اور اُن کے اسالیبِ نفیسہ کے مرقعے اردو ترجمے کی روشنی میں پیش کئے گئے ہیں!

اس ہندوستانی رسالے کی ظاہری شان بھی یورپ اور امریکہ کے ادبی رسائل کی ہم شبیہ ہے! آپ کی یہ ادبی خدمت بجا طور پر تحسین و ستائش کی مستحق ہے۔ میری خواہش ہے کہ آپ کی سعی مشکور ہو اور آپ کا رسالہ مقبول!

چودھری خوشی محمد صاحب ناظر بی۔ اے سابق گورنر کشمیر:۔

رسالہ "ادبی دنیا" نظر سے گزرا اس کا ظاہر دلکش اور باطن دلنواز پایا۔ ادبی دنیا کے اضافے سے اب لاہور یقیناً ادبی دنیا کا ہیڈ کوارٹر ہو گیا ہے میں تہ دل سے آپ کو مبارکباد دیتا ہوں؛

قاضی فضل حق صاحب ایم۔ اے۔ پی۔ ای۔ ایس پروفیسر گورنمنٹ کالج لاہور:۔

واقعی "ادبی دنیا" اپنی ظاہری اور باطنی خوبیوں کے لحاظ سے ہندوستان بھر کے "ہنگامی جرائد" پر تفوق رکھتا ہے اور میری دعا ہے کہ جن مقاصد عالیہ کو مدنظر رکھ کر آپ نے اس جریدے کو جاری فرمایا ہے انہیں آپکو بوجہ اتم کامیابی حاصل ہو۔ آمین ثم آمین؛

حال وقال

"ادبی دنیا" کا یہ نمبر مضامین کے لحاظ سے پہلے نمبروں سے بہت بلند ہے۔ عملہ ادارۃ (ایڈیٹوریل سٹاف) کی قابلیت وسعت مطالعہ، اور رسالے کو اپنا سمجھ کر دل سے کام کرنے کی کوششوں کا ہر مضمون پتہ دے رہا ہے۔ مولینا صدیق بہاری رکن ادارۃ عربی لٹریچر سے بلند ترین مضامین کا اس خوبی سے ترجمہ کرتے ہیں کہ انداز بیان میں اصل و نقل کا امتیاز اٹھ جاتا ہے۔ ملک کے مشہور شاعر اور اُس سے زیادہ مشہور افسانہ نگار سید عابد علی بی۔ اے ایل ایل۔ بی سابق ایڈیٹر ہزار داستان کو ہم نے مجبور کر کے گجرات سے لاہور کھینچ بلایا ہے۔ اب وہ اپنی تمام تر توجہ ادبی دنیا کے معیار کو بلند کرنے پر صرف کر رہے ہیں۔ اُن کے بلند پایہ افسانے، شگفتہ نظمیں اور مغربی ادبیات سے منتخب مضامین کے ترجمے ادبی دنیا کے ہر نمبر کو گراں پایہ بنا رہے ہیں۔ مولینا حامد انصاری رکن ادارۃ نے ایرانی ادبیات سے ایسے مضامین ترجمے کئے ہیں کہ اردو ادب میں اس پائے کے بلند مضامین بہت کم ملیں گے۔ مولینا عشرت رحمانی اگرچہ چند مجبوریوں سے ابھی تک لاہور نہیں پہنچ سکے لیکن اُنکے دماغ کی نزیں مصروفیتوں میں ادبی دنیا سب سے زیادہ حصہ دار بن رہا ہے۔ غرضیکہ اسٹاف کا ہر ممبر ادبی دنیا کو دلچسپ بنانے میں سرگرمی سے کام کر رہا ہے۔ عملہ ادارۃ کو بڑھانے میں اگرچہ اخراجات بہت بڑھ گئے ہیں۔ لیکن ادبی دنیا کے بلند معیار کو قائم رکھنے کے لئے ہمارے اسٹاف نے مشرقی و مغربی ادبیات سے اعلیٰ سے اعلیٰ مضامین کا ترجمہ کر کے ایک ذخیرے کی صورت میں جمع کر دئے ہیں۔ ہمیں فخر ہے کہ ادبی دنیا کا اسٹاف ایسے مشہور و منتخب انشا پردازوں پر مشتمل ہے جو مشرقی و مغربی زبانوں کے ماہر علم و ادب کے نقاد اور اردو زبان کے لئے مایۂ ناز ہیں۔

اہل نظر اور اہل رائے ادبی دنیا کی بے نظیر خصوصیات کو اچھی طرح جانتے ہیں۔ اور سچ تو یہ ہے کہ جو نظر رکھتے ہیں اُنہیں بتانے کی ضرورت نہیں اُن کے لئے تو یہ اظہار حقیقت خودستائی اور اپنے مُنہ میاں مٹھو بننے کے ہم معنی ہوگا۔

ہم بھی جانتے ہیں کہ خودستائی کوئی اچھی چیز نہیں لیکن جان بوجھ کر اس برائی کو اختیار کرنے پر حالات نے مجبور کر دیا ہے کیونکہ آنکھوں والوں میں اہل نظر بہت کم ہیں۔ اصل و نقل، نور و ظلمت حقیقت اور نمائش میں فرق کرنے والے اکسیر کی طرح نایاب رہے ہیں۔ پروپیگنڈے کا طلسم صدف کو گوہر اور خزف کو جواہر میں تبدیل کر رہا ہے۔ ایسے بے حس لوگوں سے واسطہ پڑ رہا ہے جو مشک کو خوشبو سے معلوم کرنے کی بجائے عطار کی رہنمائی کے محتاج ہیں۔

تصاویر:۔ ادبی دنیا کی تصاویر کے متعلق ہمارے مخالفین کو بھی اعتراف ہے کہ ادبی دنیا کی تصویروں نے رسالوں میں تصاویر کا معیار بہت بلند کر دیا ہے۔ ہماری رنگین تصاویر تو عموماً رسالے سے نکال کر فریم میں لگائی جاتی ہیں۔ تصویروں کے انتخاب میں ہم نے ابتدا سے بڑی احتیاط برتی ہے۔ کسی تصویر سے چھچھورپن نہ ٹپکے، بازاری رنگ نہ پیدا ہو جائے۔ کوئی ایسی تصویر نہ ہو جو عموماً تصویری کارڈوں پر ہوتی ہیں۔ کسی تصویر میں عریانی اور حیا سوزی کا عنصر نہ ہو۔ تصویر چھوٹی اور بے حیثیت نہ ہو۔ غرضیکہ جتنی احتیاطیں ممکن تھیں انکو پیش نظر رکھ کر تصاویر شائع کی جاتی ہیں۔

محترم خان محمد افضل خان صاحب سب جج جھنگ (پنجاب) تصویری آرٹ میں خاص مہارت رکھتے ہیں ادبی دنیا کی تصویروں کے متعلق اُنکی ہمدردانہ تنقیدوں اور مشوروں نے ہمیں بہت فائدہ پہنچایا ہے۔

مسٹر گوبند سروپ کپور (عطر چند کپور اینڈ سنز) نے نہ صرف اپنے بے نظیر البموں میں سے ہمیں اعلیٰ درجے کی تصاویر ہی بہم پہنچائیں بلکہ اپنے کپور آرٹ پرنٹنگ ورکس لاہور کے باکمال ایچروں سے تصاویر کے نہایت اچھے بلاک بھی بنوا کر ہماری تصویری مشکلات کو حل کرتے رہتے ہیں۔

کپور آرٹ پرنٹنگ ورکس میں کلکتے کے ماہر بلاک میکر بڑی بڑی تنخواہوں پر ملازم رکھے گئے ہیں اور اب یہ پریس جہاں اپنی اعلیٰ طباعت کے لئے صوبے بھر میں سب سے بازی لے گیا ہے وہاں بلاک بنانے میں بھی کلکتہ کا مقابلہ کر رہا ہے۔

ایک پتلے دُبلے دائم الرمض منتظم لالہ گوراندتا مل کپور نے اپنی انتظامی قابلیت سے دستی پریس سے شروع کر کے اس پریس کو صوبے کا واحد پریس بنالیا ہے۔ تاجور

ناظرینِ "ادبی دنیا" اور ایجنٹ حضرات

(از مینیجر رسالہ ادبی دنیا۔ لاہور)

اخبارات کے ایجنٹوں کی بدمعاملگی اور نادھندی کے حالات عموماً اخبارات میں شائع ہوتے رہتے ہیں۔ بہت سے اخبارات صرف اپنے ایجنٹوں کی نادہندی کے سبب بند ہو چکے ہیں۔ چند خوش معاملہ ایجنٹوں کو الگ کر کے عام طور پر ایجنٹوں کی ذہنیت یہ ہے کہ چونکہ اخبارات و رسائل کے مالک ایجنٹوں سے بہت دور رہتے ہیں۔ اس لئے ہم خوش معاملگی دکھائیں یا بدمعاملگی۔ اخبارات کی فروخت سے جو روپیہ آئے اس میں سے جتنا جی میں آئے رکھیں جتنا چاہیں بھیج دیں کبھی بھیجدیں کبھی نہ بھیجیں بالکل ہی نہ بھیجیں اس بارے میں اپنے دل کے مختار ہیں۔ مالک اخبار کو نہ اتنی فرصت ہو گی نہ اتنی زحمت اٹھائیگا کہ تھوڑی سی رقم کے لئے نالشیں کرتا پھرے۔ اسی یقین کی بنا پر اخبارات کے ایجنٹ اخبارات کے مالکوں کو تنگ کرتے رہتے ہیں اور چونکہ اخبارات و رسائل کی فروخت زیادہ تر ایجنسیوں کے ذریعہ ہوا کرتی ہے۔ اس لئے ایجنٹوں کے ستم رسیدہ اخبارات کبھی نہیں پنپتے۔ اور کبھی کبھی تو صرف اسی وجہ سے کوئی اخبار بند ہو جاتا ہے کہ بے رحم ایجنٹوں نے واجب الادا رقموں کی ادائیگی کی ضرورت نہیں سمجھی۔

ادبی دنیا کو بھی ایک لقمۂ تر سمجھ کر ان حضرات نے دست درازیاں شروع کی تھیں مگر چونکہ ادبی دنیا کی زندگی کسی پہلو سے بھی ایجنسیوں کی منت گزار نہیں ہے۔ اس لئے ہم ایجنٹوں کی غارتگری سے بہت حد تک بچے رہے۔ ادبی دنیا کے پرچے دفتر سے اُسی ایجنٹ کو بھیجے جاتے ہیں جو یا تو مطلوبہ پرچوں کی قیمت پیشگی بھیجدے یا وی۔ پی بھیجنے کی اجازت دے۔ اب کچھ دنوں سے وی پی منگوانے والے ایجنٹوں کا بھی تلخ تجربہ ہو رہا ہے۔ کیونکہ بعض ایجنٹ جو وی پی کے ذریعہ پرچے طلب کرتے ہیں ریلوے والوں سے اسٹامپ دیکر پرچوں کا پارسل تو چھڑا لیتے ہیں مگر ریلوے کی رسید کا لفافہ جو وی پی کے ذریعے پہنچتا ہے اسے واپس کر دیتے ہیں اور اس طرح دفتر والوں کو بے بس کر کے من مانا کمیشن وصول کر لیتے ہیں۔ اس لئے ہم نے ارادہ کر لیا ہے کہ آئندہ سے (۱) صرف انہیں ایجنسیوں کو پرچہ بھیجا کریں گے جو کمیشن کے دام کاٹ کر مطلوبہ پرچوں کی قیمت پیشگی بھیجدیا کریں گے۔ (۲) اگلے نمبر سے ۲۵ فی صدی کمیشن دیا جائیگا۔ (۳) جو ایجنٹ ڈاک خانے کی معرفت پرچے منگائیں گے انہیں آدھا محصول ڈاک بھی ادا کرنا پڑے گا۔ (۴) کسی ایجنٹ سے کوئی پرچہ واپس نہیں لیا جائیگا۔

"ادبی دنیا" کے ناظرین میں سے جو حضرات مقامی ایجنسیوں سے پرچہ خریدا کرتے ہیں وہ اگر کسی مہینے اپنے شہر کی ایجنسی پر ادبی دنیا کو نہ پائیں تو سمجھ لیں کہ مقامی ایجنسی کی کسی بدمعاملگی کی وجہ سے دفتر سے پرچہ نہیں بھیجا گیا۔ بدمعاملہ ایجنٹوں نے ایک اور شرارت یہ شروع کی ہے کہ جب ان کی نادھندی کے سبب انہیں پرچہ بھیجنا بند کر دیا جاتا ہے تو یہ مشہور کرنے لگتے ہیں کہ (خاکش بدہن) ادبی دنیا بند ہو گیا ہے۔ اس لئے ناظرین ادبی دنیا کو کسی ایجنٹ کی بات پر اعتبار کرنے سے پہلے دفتر ادبی دنیا سے معلوم کرنا چاہئے۔ اور ایسی صورت میں سب سے محفوظ طریقہ یہ ہے کہ براہ راست ادبی دنیا کے دفتر سے پرچہ طلب کیا جائے کیونکہ دفتر سے جو پرچہ روانہ کیا جاتا ہے ڈاک کا ٹکٹ لگانے کے علاوہ الگ محصول دے کر ڈاک خانے سے اُس پرچے کی رسید بھی لی جاتی ہے۔

سید امام علی نازش نے صرف دو ڈھائی ماہ تک ادبی دنیا کے انتظامی عملے سے متعلق ہو کر کام کیا تھا اس کے بعد وہ ہمارے لئے اور ہم اُن کے لئے غیر ضروری ہو گئے۔ اسی بنا پر ان کی ملازمت کا تعلق منقطع ہو گیا۔ مگر ہم دیکھتے ہیں کہ کہیں پوسٹروں میں کبھی اخباروں میں اُن کے نام کے ساتھ "ایڈیٹر ادبی دنیا" کا ضمیمہ بھی لکھا جاتا ہے۔ اس سے ادبی دنیا کے مفاد کو سخت نقصان پہنچنے کا خطرہ ہے۔ اس لئے ہم یہ اعلان کرنے پر مجبور ہوئے ہیں کہ نازش صاحب ادبی دنیا کے ایڈیٹوریل سٹاف سے کبھی ایک لمحہ کے لئے بھی وابستہ نہیں ہوئے اور نہ ہو سکتے تھے۔ اُنکی ملازمت کا تعلق مینیجنگ اسٹاف سے تھا اور اب چار ماہ سے ادبی دنیا کے کسی عملے سے اُن کا کوئی تعلق نہیں

ہم پہلے بھی عرض کر چکے ہیں کہ ادبی دنیا کے ایک پرچہ پر ایک روپیہ لاگت آتی ہے مگر ہم صرف اپنے ادبی پروگرام کو کامیاب بنانے کے لئے نو سو روپے ماہوار کے نقصان پر اس کو چلا رہے ہیں۔ ادھر یہ حالت ہے اُدھر ایجنٹوں کا تقاضا ہے کہ کمیشن پچیس فی صدی کر دیا جائے اور ان کی اسی روز روز کی ہائے ہائے سے مجبور ہو کر ہم نے آئندہ ماہ سے پرچے کی قیمت میں ایک آنہ کا اضافہ کر دیا ہے۔ دسمبر سے ادبی دنیا ایجنٹوں سے نو آنے میں ملا کریگا۔ البتہ جو صاحب دفتر سے طلب کریں گے ان کو بدستور سابق صرف آٹھ آنے میں بھیجا جائیگا۔

مینیجر

آئینۂ عالم

پنجاب یونیورسٹی اور تصانیف شبلی

سرسید اسکول کے ممبر مغربی ادبیات اور ان کی ترقیوں سے بے خبر رہتے ہوئے بھی اُردو زبان میں جس پائے کی کتابیں لکھ گئے گئے۔ چوتھائی صدی گزر جانے کے بعد بھی اب تک اردو بولنے والوں میں کوئی ایسا مصنف نہیں اُٹھا جسے شبلی۔ حالی۔ نذیر احمد اور آزاد کا جانشین کہا جا سکے۔

اہلِ علم وفضل کی اِس برگزیدہ جماعت میں یُوں تو ہر فرد بجائے خود یکتائے روزگار تھا۔ لیکن خصوصیت سے علامہ شبلی مرحوم کی بلند پایہ تصانیف تو نہ صرف اردو ادب اور نصف ہندوستانی لٹریچر بلکہ مشرقی ادبیات پر بین الاقوامی تصانیف میں شمار کی جاتی ہیں۔

مشہور مستشرق ڈاکٹر براؤن نے شبلی کی شعر العجم کی ایک جلد کا ترجمہ کرا کے اُسے اپنی کتاب "ہسٹری آف پرشیا" کا حصہ بنا لیا ہے۔ پروفیسر براؤن اس وقت دنیا میں ایرانی ادبیات کا بے نظیر مبصر اور اسپیشلسٹ خیال کیا جاتا ہے۔

اِس واقعے سے ہندوستان کے ایک بوریا نشین اور یورپی تحقیقات سے بے خبر مولوی کے تصنیفی رتبے کا اندازہ کرو کہ دنیا کا ایک بے نظیر مستشرق یورپ میں بیٹھ کر ہندوستان کے ایک دیسی مصنف کی تحقیق و تنقید کے سامنے قلم ہاتھ سے رکھ دیتا ہے۔ اِس سے جہاں براؤن کی وسیع الخیالی اور قدر شناسی قابلِ صد ہزار تحسین ٹھہرتی ہے وہیں بحیثیت ایک مصنف و محقق کے شبلی بھی ہندوستان اور ایشیا کیلئے مایۂ عزت و افتخار بن جاتا ہے۔

ہندوستان کے موجودہ اردو مصنفوں۔ نقادوں اور انشا پردازوں میں سے کون شخص ہے جو ایمان داری سے یہ کہہ سکے کہ میں نے شبلی کی کتابوں سے کچھ نہیں سیکھا؟ اس حقیقت سے کیسے انکار ہو سکتا ہے کہ ہندوستانی یونیورسٹیوں کے مشرقی نصاب شبلی کی تصانیف کے بغیر نامکمل رہ جاتے ہیں۔

پنجاب یونیورسٹی جس کے جاری کرنے کا اہم مقصد یہ بتایا گیا تھا کہ اسکے ذریعے مشرقی زبانوں اور مشرقی علوم کو زندہ کیا جائے گا۔ یوں تو مشرقی لٹریچر کی زندگی اور ترقی سے اس کی بے پروائی ایک حقیقت بن چکی ہے لیکن سرسید اسکول کے مصنفوں سے تو اسکی بے نیازی بہت افسوسناک صورت اختیار کرتی جاتی ہے۔

مولینا آزاد کے بعد اب اس یونیورسٹی کی الوداعی توجہات علامہ شبلی کو اپنا مرکز بنا رہی ہیں۔

شبلی کی جس بے نظیر تصنیف شعر العجم سے یورپ کے اہلِ علم رہنمائی حاصل کرنا ضروری سمجھتے ہیں۔ پنجاب یونیورسٹی سے اُسے رفتہ رفتہ رخصت کیا جا رہا ہے۔ کل تک جو شعر العجم دوسری یونیورسٹیوں کی طرح پنجاب یونیورسٹی کے مشرقی امتحانات اور فارسی کے ایم۔ اے تک نصابوں کا ضروری عنصر تھی آج اُس کا صحیح قائم مقام تلاش کئے بغیر اُسے ان نصابوں سے خارج کیا جا رہا ہے۔ اور یونیورسٹی کے "سٹڈی بورڈ" کی ضرورت سے زیادہ توجہ فرمائی سے تو یہ نظر آ رہا ہے کہ علامہ شبلی کی کتابوں کا پنجاب یونیورسٹی کے حدود میں داخلہ بند ہونے والا ہے۔ بہرحال مولوی عبدالحق صاحب علمی دنیا کی طرف سے مبارکباد کے مستحق ہیں کہ شبلی کے خلاف اُن کے اجیر کی ریشہ دوانیاں پنجاب میں حسب مراد کامیاب ثابت ہو رہی ہیں۔

بچّوں کا عجائب خانہ

کسی ملک کا عجائب خانہ بھی ایک خاموش مدرسہ ہوتا ہے۔ بسا اوقات اس کی تعلیم دوسرے مدرسوں سے زیادہ موثر ہوتی ہے۔

امریکہ والے کوشش کر رہے ہیں کہ اپنے عجائب خانوں کو پبلک کے فہم کے مطابق بنا دیں۔ تاکہ لوگ اُن کی طرف کھنچیں اور ان سے فائدہ حاصل کریں۔ بچّوں کے لئے بھی انہوں نے کئی عجائب خانے کھولے ہیں۔ جن کی رنگ برنگ چڑیوں اور دوسری چیزوں کو اسکول کے بچے اپنے گھر لے جا کر کئی کئی دن رکھ سکتے ہیں۔

امریکہ کے ایک مخیر امیر مسٹر جون نے اُن کے منتظموں کو پینتالیس لاکھ روپیہ اس غرض سے عطا کیا ہے کہ اُن میں ایک تاریخی منظر کا سامان کیا جائے جس میں انسان کے عصر حجری (The Stone age) سے لیکر اس وقت تک کی درجہ بدرجہ ترقی کو بیک وقت بچوں کے سامنے پیش کیا جا سکے۔

ہمارے ملک میں بھی عجائب خانے اور چڑیا گھر ہیں اور روزانہ ان میں تماشائیوں کا ہجوم رہتا ہے۔ پھر کتنے ہندوستانی بچے، اور کتنے بچوں کے باپ ہیں جو کبھی ان عجائب گھروں سے ایک بے معنی حیرت کے سوا کسی قسم کی معلومات لائے ہیں؟

آبادی کے لحاظ سے تصنیف و تالیف کے اعداد و شمار

گذشتہ اعداد و شماری سے معلوم ہوتا ہے کہ تالیف و تصنیف میں ڈنمارک تمام مہذب ملکوں میں سب سے آگے بڑھا ہوا ہے جیسا کہ ذیل کے نقشے سے ظاہر ہوگا۔

ہر دس ہزار آبادی پر ایک کتاب کے لحاظ سے

ڈنمارک	۱۱٫۴
ہالینڈ	۹٫۰
جرمنی	۵٫۲
فرانس	۳٫۸
انگلستان	۲٫۰
امریکہ	٫۸۵

اسی جدول سے یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ امریکہ تصنیف و تالیف میں سب سے پیچھے ہے۔ مگر اس کے باوجود امریکہ والے مطالعے میں کسی سے کم نہیں ہیں۔ بلکہ تصنیف و تالیف میں کمی کی وجہ یہی ہے کہ وہاں سے اخبار و رسالے اسقدر نکلتے ہیں کہ انہی کے پڑھنے سے لوگوں کو فرصت نہیں ملتی۔ اور بعض ہفتہ وار اخبارات کا وزن کئی کئی کتابوں کے برابر ہوتا ہے۔

بچوں کی تربیت

یورپ کے ایک مشہور ماہر تربیت سے پوچھا گیا تھا کہ بچوں کی تعلیم و تربیت کی ذمہ داری والدین پر عاید ہوتی ہے یا استاد پر؟ اس نے جواب دیا ہے کہ دونوں اس کے ذمہ دار ہیں کیونکہ آدمی جبتک بچہ ہوتا ہے اور لکھنے پڑھنے پر قادر نہیں ہوتا تو وہ جو کچھ سیکھتا ہے اپنے والدین سے سیکھتا ہے۔ مگر چار یا پانچ سال کا ہو جانے کے بعد اس کے اخلاق کی تعمیر کا کام استاد کے ہاتھ میں چلا جاتا ہے اور اس عمر کو پہنچ کر بچے اپنے استادوں ہی کا اثر لیکر جوان ہوتے ہیں۔

یورپ کے ولادتی اعداد و شمار

پہلے خیال کیا جاتا تھا کہ پیدائش کی تعداد میں کمی کی شکایت صرف فرانس کو ہے۔ مگر گزشتہ اعداد و شمار نے انگلستان اور جرمنی کو بھی اسی فکر میں مبتلا کر دیا ہے۔ انگلستان کی روزانہ پیدائش کی تعداد ۱۸۵۵ء سے بھی کم ہو گئی ہے۔ حالانکہ اس وقت آبادی تقریباً دس لاکھ کم تھی اسی طرح جرمنی کی پیدائش ۱۸۷۰ء میں ہر ایک ہزار خاندان میں ۳۰۷ تھی۔ مگر اب صرف ۱۳۸ ہے۔

اس کمی کی سب سے بڑی وجہ یہ ہے کہ اب خود والدین نہیں چاہتے کہ ان کے زیادہ اولاد ہو، اور ان کی حسب منشا پرورش نہ ہو سکے۔

دنیا کا سب سے پرانا اخبار

دنیا کا سب سے قدیم اخبار چین کا اخبار "پیکن" ہے جسے جاری ہوئے ایک ہزار سال سے زیادہ ہو گئے ہیں۔ اس طویل مدت میں جتنے اہل قلم اس میں کام کر چکے ہیں اُن میں سے اب تک ۱۵۰۰ آدمیوں کو باغیانہ تحریر کی پاداش میں قتل کی سزا دیجا چکی ہے۔ ملک چین کی یہ عجیب صفت ہے کہ ہر چیز کی طرف پہلا قدم وہی اٹھاتا ہے۔ مگر انتہا تک پہنچنے سے پہلے ہی اس سے مستعفی ہو کر بیٹھ جاتا ہے۔ چین ہی نے پہلے پہل کاغذ بنایا۔ اسی نے چھاپہ خانہ ایجاد کیا۔ اسی نے سب سے پہلے اخبار بھی جاری کیا۔ مگر اس کی ترقی اور انتہا تک پہنچانیکا کام یورپ کیلئے چھوڑ دیا۔

خودبخود جلنے والا چراغ

ایک الیکٹرک کی انگریزی کمپنی نے ایک ایسا لمپ ایجاد کیا ہے جس کو کہربائی مرکز سے کوئی تعلق نہیں بلکہ جب کہر پڑتی ہے تو اس کا مشتعل ہونیوالا حصہ اس سے متاثر ہو کر خود بخود روشن ہو جاتا ہے۔ کہر والے دنوں میں یہ لمپ اسکولوں اور کالجوں میں استعمال کیا جانے لگا ہے۔

ملیریا ہندوستان میں

ڈاکٹر روس لندن کی ایک علمی تقریر میں فرماتے ہیں کہ سیلون کے تین حصوں میں سے دو حصے صرف اس لئے غیر آباد ہیں کہ وہاں ملیریا کا دَور دورہ رہتا ہے۔ آباد حصے میں بھی بہت سے مقامات کی آبادی اس کی وجہ سے کم ہوتی جا رہی ہے۔ ایک شہر کا ذکر کرتے ہوئے آپ نے فرمایا کہ چند سال پہلے وہاں کی آبادی ۸۰۰۰۰ تھی مگر ملیریا کی وجہ سے اب صرف ۲۳۰۰ رہگئی ہے۔

تاجور

سیفو

یونان کی مشہور شاعرہ

امشب آتشیں روئے گرم ترنم خوانی ہاست (غالب)

رنگینیٔ شباب کی دُنیا کہوں اسے　　باغِ نشاط کا گلِ رعنا کہوں اسے
یہ وقت ہے شگفتنِ گلہائے ناز کا　　رعنائیِ "بہارِ نظارا" کہوں اسے
اس جسمِ زرنگار سے جاری ہی موجِ رنگ　　شادابیوں میں جلوۂ مینا کہوں اسے
اس چشمِ سحر کار میں لرزاں ہیں مستیاں　　آئینہ دارِ عشرتِ صہبا کہوں اسے
روشن ہے اسکے عشق سے تصویرِ کائنات　　اک پرتوِ چراغِ تجلّا کہوں اسے
اسکے فروغِ حسن سے ذرے ہیں رقص میں　　مستی کا ایک فتنۂ برپا کہوں اسے
اسکی سہیلیوں کو کہوں انجمِ نشاط　　اور ماہتابِ آئینہ سیما کہوں اسے
وہ گیت گا رہی ہے بہارِ شباب کے　　اس انجمن کی انجمن آرا کہوں اسے
اشعار اس کے نورِ ترنم میں غرق ہیں　　نغموں کی لرزشِ طرب افزا کہوں اسے

یہ حُسنِ باوقار ہو صرفِ نیازِ عشق　　سرگشتۂ جنونِ تمنّا کہوں اسے
یہ روئے شعلہ کار ہو رہنِ گدازِ عشق　　وارفتۂ فسونِ تماشا کہوں اسے

تو آپ اپنے خواب کی تعبیر دیکھ لے
اے عشق پائے ناز میں زنجیر دیکھ لے

(عابد)

سفری یونیورسٹی

گذشتہ دنوں امریکہ کی سفری یونیورسٹی کے ساتھ ڈاکٹر روس کلکتہ پہنچے تو خیال ہُوا کہ دُنیا کے اس بڑے سیاح اور فلسفۂ عمران کے سب سے بڑے ماہر سے مِل کر امریکہ کے متعلق کچھ سنوں اور ہندوستان کے متعلق کچھ سناؤں۔ مغرب کے وقت یہ سوچکر گھر سے چلا کہ ہوٹل کے کسی گوشۂ تنہائی میں ان کے ساتھ تھوڑی دیر بیٹھونگا وہ مجھ سے ہندوستان کی حالت پوچھیں گے میں اُن سے امریکہ کی کیفیت دریافت کرونگا۔ اور ڈیڑھ دو گھنٹے پُر لطف علمی صحبت رہیگی۔

لیکن ڈاکٹر روس نے مجھ سے ملنے کا جو سامان کر رکھا تھا وہ میرے خیال اور میری آرزو کے خلاف نکلا۔ میں ہوٹل میں پہنچا تو وہ خندہ پیشانی کے ساتھ ملے مگر جب مَیں نے اردگرد دیکھا تو کئی اور اہل علم بھی بیٹھے نظر آئے۔ جو غالباً میری ہی جیسی تمنا لیکر اُن سے ملنے آئے تھے۔ میں کسی مناسب گوشے میں بیٹھنے کی فکر میں لگا ہوا تھا کہ ڈاکٹر روس نے کہا" میں اپنی یونیورسٹی کے طلبہ کے ایک گروپ کے سامنے آپ حضرات سے ہندوستان کے متعلق کچھ بات کرنی چاہتا ہوں"۔ یہ کہکر ہم کو ایک بڑے کمرے میں لے گئے۔ جو خاصا لکچر ہال معلوم ہو رہا تھا۔ ساٹھ طلبہ جن میں تقریباً نصف لڑکیاں تھیں بیٹھے ہمارا انتظار کر رہے تھے۔ ہم اپنی جگہ پر بیٹھ گئے۔ تو ڈاکٹر روس نے ایک فہرست نکالی۔ جس میں انہوں نے ہندوستان کی اجتماعی زندگی اور سوسائٹی کے متعلق سیکڑوں سوالات پہلے ہی سے لکھ رکھے تھے۔ اُنہوں نے اس میں سے دیکھ دیکھ کر ہم سے سوال کرنا شروع کیا ہم اُن کے سوال کا جواب دیتے پھر طلبہ اور پروفیسر ہم پر جرح کرتے جب اُن کی تشفی ہو جاتی تو دوسرا سوال ہوتا۔ تقریباً ڈھائی گھنٹے اسی سوال جواب میں مصروف رہنے کے بعد ہمیں فرصت ملی اور میں یہ سوچکر چلا آیا کہ کل جب ہم سائل ہونگے اور ڈاکٹر صاحب جواب دینے والے۔ تو آج کا بدلہ لے لیا جائیگا۔

ڈاکٹر روس کو فلسفہ اور علم اجتماع میں کافی شہرت حاصل ہے۔ اور ان دونوں علوم پر بائیس ۲۲ کتابیں لکھ چکے ہیں۔ یہ امریکہ کے ایک گاؤں میں پیدا ہوئے بچپن میں والدین کے ساتھ کاشتکاری میں مشغول رہے جب ذرا ہوش سنبھالا تو ایک سکول میں داخل ہو گئے۔ اور وہاں کی تعلیم ختم کر کے کالج کی تعلیم حاصل کرنے لگے۔ اس کے ساتھ ہی کالج کا خرچ پورا کرنے کے لئے ایک سکول میں نوکری کر لی۔ یونیورسٹی کی ڈگری مل گئی تو مختلف زبانوں کی تحصیل کے لئے جرمنی گئے مگر برلن پہنچ کر انہوں نے دیکھا کہ زبان سے فلسفہ افضل سمجھا جاتا ہے۔ اس لئے انہوں نے بھی اپنا خیال بدل دیا۔ اور صرف فلسفہ کی تکمیل میں لگ گئے۔ امریکہ واپس آئے تو سٹانفورڈ یونیورسٹی میں اقتصادی سیاست (پولیٹیکل اکانومی) اور علم اجتماع کے پروفیسر مقرر ہوئے۔ اسی درمیان میں ایک واقعہ رونما ہُوا۔ جو ہماری عبرت پذیری کے قابل ہے۔ یونیورسٹی نے ان کو اپنے عہدے سے اس جرم میں برخاست کر دیا کہ وہ دوسروں کی تحقیقوں اور رایوں سے بے پروا ہو کر اپنے ضمیر کی رہنمائی میں درس دیا کرتے ہیں۔ لیکن ان کی برطرفی کے بعد یونیورسٹی کے تمام پروفیسروں نے محسوس کیا کہ وہ بڑی حد تک مقید ہیں اور آزادی کے ساتھ اپنی رائے نہیں ظاہر کر سکتے۔ سات پروفیسروں نے احتجاج (پروٹسٹ) کے طور پر استعفا بھی دیدیا۔ اخبارات نے بھی اس موضوع پر لکھنا شروع کیا اور سارے ملک میں شور مچگیا کہ یونیورسٹیوں کے پروفیسر اپنی تحقیق اور اپنے نظرئے کے خلاف درس دینے پر مجبور کئے جاتے ہیں اور جو اپنے ضمیر کے مطابق بولنے کی جرأت کرتا ہے وہ برطرف کر دیا جاتا ہے! آخر یونیورسٹی کے ارباب حل وعقد کو رائے عامہ کے سامنے جھکنا پڑا۔ آزادی نے فتح پائی۔ ڈاکٹر روس اور دوسرے پروفیسر دوبارہ یونیورسٹی میں اپنے اپنے عہدوں پر واپس آ گئے۔

ڈاکٹر روس اقتصادیات اور فلسفۂ اجتماع کے اُن چند مصنفوں میں سے ہیں جو اپنی تصنیف وتالیف اور تعلیم وتدریس کی بنیاد حقیقی زندگی اور اس کے مشاہدات پر رکھتے ہیں۔ یہ صرف نئے نئے نظریئے نہیں پیش کیا کرتے۔ بلکہ دنیا کی سیاحت کرتے ہیں۔ شہروں کو دیکھتے ہیں۔ دیہاتوں میں جاتے ہیں۔ ہوٹلوں اور گھروں کی زندگی کا مقابلہ کرتے ہیں۔ خود وہاں کے رہنے والوں سے وہاں کے حالات

سنتے ہیں۔ اس کے بعد کسی ملک کے متعلق کچھ لکھتے یا بولتے ہیں جنوبی امریکہ۔ یورپ اور جنوبی افریقہ کی کئی بار سیاحت کر چکے ہیں۔ ۱۹۱۰ء میں جمہوریت کے اعلان کے بعد چین گئے اور وہاں کی تہذیب و معاشرت کے متعلق ایک جامع کتاب شایع کی۔ سوویٹ گورنمنٹ قائم ہو جانے کے بعد ۱۹۱۸ء میں روس تشریف لے گئے۔ اور وہاں سے آکر روس کے ماضی، حال اور مستقبل پر تین جلدوں میں ایک بہترین کتاب لکھی۔ اتنی علمی پختگی کے بعد بھی وہ ہمیشہ علم و معرفت کے پیاسے نظر آتے ہیں۔ اور صرف عقلی اور نظری ہی معرفت کے نہیں بلکہ ایسی بارآور اور نتیجہ خیز معرفت کے جو مختلف ملکوں اور مختلف قوموں کی معاشرتی زندگی سے اخذ کیا گیا ہو

سفری یونیورسٹی

تو ہاں دوسرے دن وقت مقررہ پر میں پھر ہوٹل پہنچا اور ڈاکٹر روس سے امریکہ کے متعلق بہت سے سوالات کئے۔ جن میں سے بعض یہ تھے:۔

میں نے پوچھا کہ "آپ نے یہ دنیا کا چکر کاٹنے والی سفری یونیورسٹی کی بدعت خوب جاری کی ہے؟"

انہوں نے جواب دیا کہ "اس سے ہمارا مقصد یہ ہے کہ تعلیم کتابوں کے دائرے سے نکلکر کرۂ ارض کے مشاہدات پر قائم ہو۔ اور طلبہ علم جغرافیہ کتابوں اور لکچروں سے حاصل کرنے کے بجائے خود دنیا کی سیاحت کر کے حاصل کریں۔ اور جہاں جہاں جائیں وہاں کی سیاسیات اقتصادیات اجتماعیات۔ وہاں کی تاریخ۔ وہاں کے مذاہب اور تہذیب و تمدن کے متعلق سنی سنائی باتوں کا اپنی آنکھوں سے مطالعہ کریں ہماری یونیورسٹی کے طلبہ ہندوستان کی تاریخ یہاں کی سیاست۔ یہاں کی سوسائٹی اور یہاں کے اجتماعی مسائل پر خاص خاص کتابیں پڑھ چکے ہیں اب خود یہاں آئے ہیں کہ اپنی آنکھوں سے دیکھ کر ان کے متعلق صحیح رائے قائم کر سکیں گے۔ وہ تقریباً ایک ماہ ہندوستان میں رہینگے۔ یہاں کی کیفیت یہیں کے مشہور رہنماؤں اور بڑے بڑے لوگوں سے سنینگے یہاں کی تاریخی یادگاروں اور یہاں کی عظمت رفتہ کے نقوش اپنی آنکھوں سے دیکھینگے۔ یہ ظاہر ہے کہ ہم دنیا کا ہر ملک اور کسی ملک کا ہر حصہ نہیں دیکھ سکتے۔ اس لئے ہم نے ایسے ملک اور ایسے مقامات منتخب کر لئے ہیں جو اپنے اردگرد کے طرز معاشرت کی نمایندگی کرتے ہوں۔ ہم امریکہ سے چل کر جزائر فیلیپائن میں پہنچے۔ ہمارے طلبہ نے وہاں کے باشندوں اُن کی طرز معاشرت ان کے آپس کے خاندانی تعلقات۔ ان کے مذہبی اور معاشرتی رسم و رواج اور امریکہ کے ساتھ اُن کے تعلقات کا بغور مطالعہ کیا۔ پھر چین آئے اور وہاں کے حالات دیکھے۔ چینی راہنماؤں سے وہاں کی کیفیات سنیں۔ اس کے بعد ہم سیام پہنچے اور وہاں سے ہندوستان آرہے ہیں۔ یہاں سے فارغ ہو کر مصر جائیں گے۔ وہاں سے فلسطین اور ترکی جائیں گے۔ اس کے بعد یورپ کا دورہ کریں گے۔"

"اس یونیورسٹی کے طلبہ اور اساتذہ کی تعداد ۵۱۱ ہے جن میں تقریباً نصف لڑکیاں ہیں۔"

"ہر طالب علم سالانہ ۵۶۰ پونڈ فیس ادا کرتا ہے۔ جس میں اس کی رہایش۔ تعلیم اور سیاحت کے تمام اخراجات شامل ہیں۔"

"امتحان ہم جہاز ہی میں لیتے ہیں یا ان شہروں میں جہاں اترتے ہیں۔"

"جب تک جہاز میں رہتے ہیں۔ لکچر دوپہر سے پہلے اور دوپہر کے بعد ہوا کرتے ہیں۔ مگر جب کہیں اترتے ہیں۔ تو دوپہر سے پہلے ہی ختم کر دئے جاتے ہیں۔ تاکہ طلبہ وہاں کی سیر کر سکیں اور فطرت کے لکچر میں شامل ہو سکیں"۔

جی ہاں! امریکی حکومت اس یونیورسٹی کے ڈپلومہ کو معتبر سمجھتی ہے اور اس کی خدمات کا اعتراف کر چکی ہے۔

میں نے پوچھا کہ "ایسی یونیورسٹی جاری کرنے کا خیال آپ کو کیسے اور کب ہوا؟"

ڈاکٹر روس نے جواب دیا کہ ۱۸۷۵ء میں ایک شخص نے ایک خیالی افسانہ لکھا جس میں اُس نے دکھایا تھا کہ ایک یونیورسٹی کے طلبہ دنیا کے مطالعے کے لئے کتاب دیکھنے اور پڑھنے کی بجائے خود دُنیا کا چکر لگا رہے ہیں۔ یہی تخیل تھا جس نے ۱۹۲۶ء میں عملی صورت اختیار کی جب ۵۰۰ طلبہ کی ایک جماعت امریکہ سے ایک جہاز میں بیٹھکر دنیا اور دنیا والوں کے مطالعے کو چلی۔ لیکن اس وقت مطالعہ اور درس کا کوئی خاص نظم نہیں تھا۔ صرف چند اساتذہ اُن کی رہنمائی کے لئے ساتھ تھے۔

گذشتہ سال رسالہ "ایشیا" کے ایڈیٹر مسٹر گرینیہ نے سوچا کہ اس جدت کو رواج دینے اور کامیاب بنانے کے لئے ایک باضابطہ سفری یونیورسٹی جاری کرنی چاہئے۔ پبلک نے بھی ان کی آواز پر لبیک کہا اور یہ نئی یونیورسٹی ظہور میں آگئی۔ جو اپنی پہلی سیاحت میں آپ کے سامنے ہے۔ مسٹر گرینیے آجکل اس کے رجسٹرار ہیں۔"

امریکہ اور یورپ کے تمدن کا فرق

میں نے کہا کہ آپ کی یونیورسٹی غالباً خاص امریکن تمدن کی پیداوار

ہے کیونکہ میرے خیال میں یورپ میں ایسی یونیورسٹی نہیں جاری ہو سکتی۔ پھر امریکہ اور یورپ کے تمدن میں خاص فرق کیا ہے ؟"

انہوں نے جواب دیا کہ" امریکن تمدن یورپ ہی کے تمدن کی بنیاد پر قائم ہے لیکن وہ یورپین تمدن سے آگے بڑھ گیا ہے اور قدامت پرستی کو بالکل ترک کر چکا ہے۔ ہم امریکہ میں کسی کا احترام اُس کے اصل و نسل کی وجہ سے نہیں کرتے بلکہ اس کی ذاتی خوبیوں کی وجہ سے کرتے ہیں۔ ہم خاندان اور حسب و نسب کے اُن جھگڑوں کو جانتے تک نہیں جو یورپ میں رائج ہیں۔ علاوہ بریں ہم کسی ایسے پیشے اور دستکاری کو حقیر نہیں سمجھتے جس میں کسی حد تک ذہنی مہارت بھی شامل ہو اور محض جانوروں کے عمل کی طرح صرف جسم اور رگ پٹھوں تک محدود نہ ہو یہی وجہ ہے کہ ہماری یونیورسٹیوں کے اکثر طلبہ اپنی روزی اپنے گاڑھے پسینے سے حاصل کرتے ہیں۔ اس سفری یونیورسٹی میں بھی لڑکے تو الگ رہے بعض لڑکیاں ایسی ہیں جو ہمارے کپڑے دھو کر اپنا خرچ نکالتی ہیں۔ جب میں سٹانفورڈ یونیورسٹی میں پروفیسر تھا تو ریاستہائے متحدہ امریکہ کے موجودہ پریذیڈنٹ مسٹر ہوور وہاں کے ایک غریب طالب علم تھے۔ اپنا کھانا اپنے ہاتھ سے پکایا کرتے تھے۔ اور پڑھنے سے جو وقت بچتا اس میں دوسروں کا کام کر کے اپنے اخراجات پورے کرتے تھے۔ امریکہ میں علمی روح یورپ سے بہت زیادہ پھیلی ہوئی ہے۔ اسی کی وجہ سے وہاں صنعت بھی بہت ترقی کر گئی ہے۔ اور یورپ سے بہت زیادہ عام ہو چکی ہے۔ ہم میں اور یورپ میں سب سے بڑا فرق یہ ہے۔ کہ ہم خوشحالی پر ایمان رکھتے ہیں اور اس کو حاصل کرنے کے لئے عملی جدو جہد کرتے ہیں۔ رہبانیت اور فقر و فاقہ کے فضائل پر ایمان نہیں لاتے اور ہم اُس شخص کا احترام کرتے ہیں۔ جو مالدار ہونے کے لئے کچھ کام کرتا ہے۔ جب وہ مالدار ہو جاتا ہے تو اس کا احترام بھی ہمارے لئے اسوقت غیر ممکن ہے۔ جب وہ کوئی کام نہ کرے اور امریکن قوم کا ایک عضو معطل بنجائے۔ اس لئے ہم میں کوئی بیکار نہیں رہتا۔ نہ کوئی بھوکوں مرتا ہے اور نہ کوئی بیٹھکر عیش اڑاتا ہے"

غربت اور فقیری کا علاج

میں نے کہا" لیکن آپ میں جو غریب ہیں اُن کا آپ کیا سامان کرتے ہیں ؟"

انہوں نے جواب دیا کہ" امریکہ میں ایک مزدور کی اُجرت ساری دنیا کی مقررہ اُجرت سے زیادہ ہے پھر بھی ہم ہمیشہ مزید اضافے کی فکریں لگے رہتے ہیں۔ ہمارا اعتقاد ہے کہ امریکہ کی عام خوشحالی اسی مزدوری کی زیادتی پر موقوف ہے۔ وہاں اُجرت اتنی کافی ملتی ہے کہ ایک مزدور مزے میں کھا پی کر اپنی بیکاری اور بیماری وغیرہ کیلئے کچھ پس انداز بھی کرسکتا ہے۔ میکسیکو میں مزدوروں کی کمائی قمار بازی کی نذر ہو جاتی ہے اس لئے وہ ہمیشہ فقر و فاقہ میں مبتلا رہتے ہیں۔ مگر ہم نے قمار بازی قانوناً بند کر دی ہے۔ اِس لئے ہمارے پاس کافی دولت جمع ہو گئی ہے۔ روپیہ جمع کرنے کے وسائل بھی ہمارے ہاں بہت ہیں جن میں سب سے زیادہ اہم بیمہ کمپنیاں ہیں جو اس وقت ۳۰ ملین (تین کروڑ) امریکیوں کی غربت۔ مرض اور موت وغیرہ کی ضامن ہیں۔ اس کے علاوہ ہم فقر و فاقہ کا علاج تعلیم سے کرتے ہیں۔ ریاستہائے متحدہ امریکہ کی بعض ریاستوں میں ۱۴ سال اور اکثر میں ۱۶ سال کی عمر سے پہلے کوئی لڑکا مزدوری نہیں کرسکتا۔ ہر ریاست میں ابتدائی اور ثانوی (سکنڈری) تعلیم جبری ہے۔ لڑکے اپنی ۱۴ یا ۱۶ سال کی عمر تک قانوناً تعلیم میں لگے رہتے ہیں۔ اور اسی درمیان میں کوئی کام کرنے کے قابل ہو جاتے ہیں۔ حالات اجازت دیں تو ان میں سے ذہین طلبہ یونیورسٹی میں داخل ہو جاتے ہیں۔ آجکل ہماری یونیورسٹیوں میں ایک ملین (دس لاکھ) طلبہ تعلیم پا رہے ہیں اور یہ ایسی تعداد ہے کہ ساری دنیا کی تمام یونیورسٹیوں کے طلبہ کی مجموعی تعداد بھی اس سے کم ہے۔ غریبوں کی امداد کے لئے امریکہ میں سیکڑوں انجمنیں قائم ہیں۔ کئی صورتوں میں حکومت بھی ان کی مدد کرتی ہے۔ لنگڑے۔ لولے اور دائمی مریضوں کے لئے خاص خاص جائے پناہ بنی ہوئی ہیں۔ امریکہ کی سڑکوں پر آپ کو کوئی بھیک منگا تلاش کرنے پر بھی نہیں ملسکتا۔ لاوارث بچوں اور غریب ماؤں کو حکومت کی طرف سے ضروریات مہیا کی جاتی ہیں۔

عورتوں کی آزادی

میں نے دریافت کیا کہ" امریکہ کی عورتوں پر نئے حالات کا کیا اثر پڑا ہے ؟"

ڈاکٹر روس نے جواب دیا کہ" آجکل امریکن عورت روسی عورتوں کے سوا تمام دنیا کی عورتوں سے زیادہ آزاد ہے۔ اس کے لئے امریکہ میں مردوں کی طرح ہر کاروبار کا دروازہ کھلا ہوا ہے۔ اس لئے ایک امریکن عورت کے نزدیک طلاق کوئی اہم چیز باقی نہیں رہی ہے۔ اس وقت وہاں طلاق کی اوسط ہر سات شادی میں ایک ہے۔ طلاق کے طلبگاروں میں ایک تہائی مرد ہیں اور دو تہائی عورتیں۔ پہلے کی

بہ نسبت اب عورتوں کی قدر و منزلت بہت بڑھ گئی ہے - آجکل کوئی عورت گھر کی خدمتگاری بڑی بڑی تنخواہوں پر بھی مشکل ہی سے قبول کرتی ہے - عورتوں کی آزادی کا ظاہری اثر یہ پڑا ہے کہ وہاں کے مرد پہلے سے زیادہ صاف ستھرے اور زیادہ پاکیزہ نظر آتے ہیں - اور عورتوں کو رجھانے کے لئے بننے سنورنے اور چہرے کی صفائی کا بہت خیال رکھتے ہیں :-

شراب کی بندش

میں نے پوچھا کہ شراب کے خرید و فروخت کی بندش کا کیا اثر ہوا ہے ؟ رائے عامہ اس کے موافق ہے یا نہیں ؟ اور اس بندش کی وجہ سے نشے کی دوسری چیزوں کا رواج تو نہیں بڑھ گیا ہے ؟

انہوں نے جواب دیا کہ " نہیں - شراب کی جگہ دوسری چیزیں نہیں رائج ہوئی ہیں - بلکہ ایک امریکن پہلے جو روپیہ شراب میں برباد کرتا تھا اب اُسے اپنی بہبودی پر صرف کرتا ہے - اس لعنت سے نجات پانے کی وجہ سے آرام سے اچھے مکان میں رہتا ہے - اچھا کھاتا ہے - اچھا پہنتا ہے - آمد و رفت میں وقت ضائع ہونے سے بچانے کے لئے ایک موٹر خرید لیتا ہے - اور پھر اتفاقی ضروریات اور بڑھاپے کے لئے کچھ پس انداز بھی کر لیتا ہے - مختصر یہ کہ شراب کی بندش کی وجہ سے امریکہ کی خوشحالی بہت بڑھ گئی ہے - اور وہاں کی معاشرت بہت بلند ہو گئی ہے - اب امریکہ شراب کو بھول چکا ہے اور نہیں چاہتا کہ یہ مصیبت پھر واپس آئے - بعض لوگ اس مصیبت کو پھر دعوت دینا چاہتے ہیں مگر وہ ملک کے لئے باعث ننگ و عار سمجھے جاتے ہیں - مالدار ہونے کے باوجود ملک میں ان کی کوئی وقعت نہیں ان کو سوسائٹی کا ایک بیکار رکن اور ملک کی دولت ناجائز طور پر صرف کرنے والا خیال کیا جاتا ہے - فقط انہی لوگوں کے لئے شراب کی ناجائز درآمد کی جاتی ہے - ورنہ عام باشندے ہر طرح اس بندش پر راضی ہیں اور اخلاق کو برباد کرنے والی اس لال پری کو منہ نہیں لگانا چاہتے "

صدیق طبیب

بیسویں صدی کے خدا سے

بندے پکارتے ہیں کہ خالق کوئی نہیں — ایک اور آب و گل کا تماشہ بنا تو دے
ایک شور ہے کہ بعد فنا زندگی نہیں — پردے اُٹھا کے حشر کا منظر دکھا تو دے
جنّت بنی ہوئی ہے خود آرائی خیال — کوثر کی ایک موج جہاں میں بہا تو دے
یوسف کا حسن قصّۂ پارینہ ہو گیا — دنیا تڑپ اُٹھے کوئی ایسا بنا تو دے
دنیا کو آستانۂ وحدت پہ پھیر دوں — مالک مجھے رموزِ الٰہی سکھا تو دے

عالم کی بے رُخی پہ نہ جا میں تو محو ہوں
کچھ عہد ماسلف کے فسانے سنا تو دے

سیّد ہاشم لکھنوی

ہندو فلسفے کی تعلیمات

(از رایٹ آنریبل پنڈت سر نواس شاستری)

چار ہزار سال سے زیادہ کا عرصہ ہوتا ہے کہ شمالی ہندوستان میں دریاؤں کے کنارے عظیم آرین خاندان کی ایک شاخ آباد تھی، فطرت نے انکی خورد و نوش کے ذرائع اس کثرت سے بہم پہونچائے تھے کہ انہیں بہت کم جسمانی محنت کرنا پڑتی تھی۔ کیونکہ کھانے پینے کی تمام اشیا انہیں آسانی سے حاصل ہو جاتی تھیں۔ گھنے جنگلوں کی کامل اور مہیب خاموشی نے اس زمانے کے رشیوں کو فطرت کا راز دار بنا دیا تھا۔ ان کے اور فطرت کے درمیان ایک روحانی رشتہ قائم ہو گیا تھا۔ اور وہ فطرت کے رموز و اسرار کو اس طرح سمجھتے تھے کہ ہم لوگوں کو اس کا خواب و خیال بھی نہیں آسکتا۔ وہ اندنوں فطرت کی پیچیدہ گتھیاں سلجھانے میں مصروف تھے۔ اور دنیا محوِ حیرت تھی۔ ہندوستانی دماغ خصوصیت سے تفکر و تدبر میں ممتاز ہے۔ اور یہی وجہ ہے کہ ہندوستانی ہمیشہ مابعد الطبیعیات کی گرہیں کھولنے کی کوشش کرتے رہے ہیں۔

اُن دنوں فلسفے کے بہت سے سکول قائم ہوئے اور آخر کار اُن میں اختلافی مسایل اسقدر بڑھ گئے۔ کہ ہر سکول ایک علیحدہ نام سے موسوم ہو گیا۔ ان میں سے کچھ وہ لوگ تھے جو خدا کی ہستی سے انکار کرتے تھے۔ کچھ متشککین کے لقب سے یاد کئے جاتے تھے۔ کچھ مادیین کہلاتے تھے، کچھ ایسے بھی تھے جو دنیا کی ہر شے کو فانی سمجھتے تھے۔ اور عالم خواب و خیال کہتے تھے۔ ایک گروہ تھا اپنے آپ کو محققین کا لقب دیتا تھا۔

ان تمام لوگوں میں ایک بات مشترک تھی۔ اور وہ یہ تھی کہ یہ لوگ تفکر و استدلال کی بجائے ادراک باطنی سے کائنات کی صداقتوں تک پہنچتے تھے۔

میں نہیں کہہ سکتا کہ ادراک باطنی میں اور استدلال کے طریقوں میں کون کون سے اختلافات تھے۔ عام طور سے یہ خیال کیا جاتا تھا۔ کہ "رشی" کسی فطری منظر یا مظہر کو دیکھکر فوراً اس کی حقیقت کو معلوم کر لیتے ہیں کیونکہ ان کا تعلق فطرت سے اسقدر گہرا ہوتا تھا کہ ان کی نظر فوراً تہہ تک پہنچ جاتی تھی۔

ان رشیوں کے انکشافات کتابوں میں نہیں لکھے جاتے تھے۔ بلکہ سینہ بہ سینہ استاد سے شاگرد کی طرف منتقل ہوئے تھے۔

انہیں انکشافات کا نام "وید" ہے۔ جس کے لغوی معنی "علم" کے ہیں۔ "وید" ان "انکشافات" سے متعلق ہے جو ادراک باطنی اور زہد و عبادت سے حاصل ہوئے ہیں۔ اس لئے اس کو ایک مقدس اور الہامی کتاب تصور کیا جاتا ہے۔

جو کچھ اس کتاب مقدس میں درج تھا۔ اسے ناقابل تردید اور قاطع تصور کیا جاتا تھا چنانچہ کسی شخص کو اجازت نہ تھی کہ وہ فلسفے کے ایسے مسایل پیش کرے جن کی تائید میں وہ وید مقدس سے ثبوت نہ لاسکتا ہو۔

بلاشبہ ایسے لوگ بھی موجود تھے جو اس کتاب کی الہامی نوعیت سے انکاری تھے مثال کے طور پر بودھ مذہب کے پیرو پیش کئے جاسکتے ہیں۔

تاہم ہندوؤں کی ایک بہت بڑی تعداد اسی کتاب مقدس کی پیرو تھی۔ ہمیں اس زمانے کے صرف دو فلسفیانہ مذاہب کا حال معلوم ہو سکا ہے۔ پہلا مذہب صرف ان رسم و رواج سے متعلق تھا جو وید مقدس میں درج ہیں۔ اور اس اعتبار سے اس کا تفصیلی تذکرہ کرنے کی ضرورت نہیں محسوس ہوتی۔

دوسرا مذہب "ویدانت" نام سے موسوم ہے۔ جس کا مطلب "انتہائے علم" ہے۔ اور یہی شے ہے جو "وید مقدس" کے انکشافات کا مقصد ہے۔ چار مسایل ایسے تھے۔ جن کی صداقت پر تمام مذاہب متفق تھے۔ پہلا مسئلہ یہ تھا کہ انسان کے جسم میں ایک لطیف شے موجود ہے جسے "روح" کہا جاسکتا ہے۔

اس شے کو فنا نہیں۔ چنانچہ خیال کیا جاتا تھا کہ قدیم رشیوں کی روحیں زندہ ہیں۔ اور ابد تک رہینگی۔

دوسرے یہ کہ انسان کے افعال و اعمال سے خاص اثرات پیدا ہوتے ہیں۔ جو ایک نہ ختم ہونے والے چکر کے ساتھ گردش کرتے رہتے

ہیں اور علت و معلول کا ایک سلسلہ قائم کر دیتے ہیں۔ ہم مختلف نہ نظر آنے والے محرکات سے اثر پذیر ہو کر خاص اعمال کے مرتکب ہوتے ہیں۔ پھر ان اعمال سے چند نتائج بر آمد ہوتے ہیں۔ اور اس طرح ایک چکر قائم ہو جاتا ہے۔

یہی وہ نظریہ ہے جس کو "کرم" کہتے ہیں۔ اور "کرم" کے لغوی معنی بھی "عمل" کے ہیں۔ انسان کا کوئی ایسا فعل نہیں تھا۔ جو اس نے شعوری حالت میں کیا ہو۔ اور پھر خود بخود ہی اس فعل کی سزا یا جزا نہ پالی ہو۔ سزا اور جزا خود ہر فعل کی سرشت میں داخل ہیں۔ اسی "چکر" کا ایک لازمی نتیجہ "تناسخ" ہے۔ روح اس بات پر مجبور ہے کہ اپنے اعمال و افعال کا خمیازہ بھگتے۔ اور مختلف صورتوں میں منتقل ہو کر گناہوں کا کفارہ ادا کرے۔ موت "روح" کی فنا کے لئے ناکافی ہے۔ موت صرف "جسم" کے فنا کا نام ہے۔

چوتھا مسئلہ بہت اہم تھا۔

یہ عالم اسباب لازمی طور پر ایک "دنیائے الم" تھا۔ کیونکہ دیکھا جاتا تھا کہ انسان پیدا ہوتا تھا اور مر جاتا تھا۔ نہ اس کے پیدا ہونے کا کوئی مقصد سمجھ میں آتا تھا۔ نہ اس کی موت کی کوئی غایت معلوم ہوتی تھی۔ پھر معاملہ یہیں ختم نہیں ہو جاتا تھا۔ بلکہ ایکبار فنا ہو کے انسان کی رُوح پھر کئی شکلوں میں منتقل ہو جانے پر مجبور تھی۔ اور اس طرح یہ بے رحم چکر ازل سے ابد تک قائم تھا۔

اس کرب و الم سے کس طرح چھٹکارا حاصل کیا جائے؟ یہی وہ ضروری سوال تھا جو تمام فلسفیوں کو دعوت عمل دے رہا تھا۔ ظاہر تھا کہ جب تک انسان "خلقت و فنا" کے دائرے سے نکل نہ جائے "الم" ناگزیر تھا۔ چنانچہ ہر مذہب کا مقصد یہ تھا کہ انسان کو اس قسم کی ہدایات دی جائیں کہ وہ اس زندگی اور موت کے چکر سے آزاد ہو جائے۔

ان مذاہب میں سب سے زیادہ اہم تعلیمات "ویدانت" ہی کی ہیں۔ سن عیسوی کے آغاز میں "شنکر" نے جو ایک وسیع النظر عالم تھا۔ پرانے فلسفہ کی تفسیریں شائع کیں۔ میں اسی عالم کے فلسفے سے بحث کرونگا۔

شاید بعض جگہ میں اپنا مطلب واضح نہ کر سکوں۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ میں نے سکول میں فلسفے کی تعلیم نہیں پائی۔ بلکہ اپنی عمر کے مختلف حصوں میں شوقیہ اس کا مطالعہ کیا ہے۔

ہماری شعوری حالت اور اس حالت کا ہر ایک فعل دو عناصر میں تقسیم ہو سکتا ہے۔ خارجی۔ اور باطنی یا فاعلی اور انفعالی۔

یہ دونوں عناصر ایک دوسرے کی ضد نظر آتے ہیں۔ اور ان دونوں کے درمیان جو تعلق قایم ہے وہ ایسا پیچیدہ کہ تمام دنیا کے فلسفی شروع ہی سے اس کے متعلق تفکر کرتے رہے ہیں۔

"شنکر" نے جو نظریہ پیش کیا وہ حسب ذیل ہے۔

اس کا خیال ہے کہ فاعلی اور انفعالی۔ خارجی اور باطنی دونوں کیفیات واقعی اور حقیقی ہیں۔ اس کے ساتھ ہی وہ کہتا تھا کہ یہ دونوں کیفیتیں شعوری حالت کا ایک فعل ہیں۔ اس کے خیال میں ہمارے شعوری حالت کے ذہنی تصورات اور دنیا کے مادی مناظر دونوں ایک ہی انسانی تجربے کے مختلف پہلو ہیں۔ تمام اشیا کی تہ میں ایک روشن صداقت پوشیدہ ہے۔ مادہ۔ رُوح۔ اور تمام خارجی مناظر و مظاہر اسی روشن حقیقت کے عکس ہیں۔ یہی صداقت ہے جو ہندستانی ادب میں "براہمان" کے نام سے پکاری جاتی ہے۔

یہ صداقت ازلی اور غیر محدود تھی۔ اس کے علاوہ باقی تمام اشیا محدود تھیں۔ ہمارا ذہن اور ہمارا علم مشروط تھا۔ مقید تھا۔ دوسری چیزوں پر منحصر تھا۔ لیکن یہ حقیقت تمام شرائط اور پابندیوں سے ملورا تھی۔ مکان و زماں کی قیود۔ اور علت و معلول کی زنجیریں اس صداقت کے لئے بے معنی تھیں۔

ہمارے الفاظ۔ ہمارے تصورات و احساسات۔ ہمارا تخیل جو نادیدہ اشیاء و حقایق کی تجسیم کرتا ہے۔ یہ تمام صفات اس حقیقت کو واقعتاً سمجھنے اور دیکھنے سے قاصر تھیں۔ یہ شے دونوں جہان سے بالاتر تھی۔ نہ الفاظ میں ادا ہو سکتی تھی نہ ذہن میں آ سکتی تھی۔ اس کے متعلق صرف یہ کہا جا سکتا تھا۔ کہ "وہ موجود ہے"۔ اندریں۔ اس کی تعریف صرف نفی سے کی جا سکتی تھی۔ جب اس کی تعریف کسی اثباتی پہلو سے کی جاتی تو وہ صداقت مکان و زمان کی زنجیروں میں جکڑی ہوئی نظر آتی۔

دنیا میں سوائے اس حقیقت کے اور کچھ نہیں۔ کائنات کی تمام اشیاء۔ روحانی ہوں یا مادی۔ اس نور ازلی کا پرتو ہیں۔

مادہ مختلف شکلوں میں جلوہ گر ہوتا ہے۔ رُوح کے احساسات عجیب عجیب نوعیتیں اختیار کر لیتے ہیں۔ لیکن وہ تمام کے تمام اس صداقت ہی سے پیدا ہوئے ہیں۔ یہاں سوال پیدا ہوتا ہے کہ اگر

وہ روشن حقیقت ناقابلِ تغیر ہے۔ تو اس کے مظاہر میں اس قدر تغیر کیا معنی رکھتا ہے۔ کسی شخص کو اس کا جواب معلوم نہ تھا۔

ہندوستانی فلسفیوں نے اس کا جواب یہ دیا کہ اوسے کے یہ تمام تغیرات یہ فریب یہ نقاب۔ جو حقیقت کی روئے روشن کو چھپائے ہوئے ہے "مایا" ہے۔

اور ہم آفتاب حقیقت کی درخشندگی کو اسی پردے کے ذریعے دیکھتے ہیں۔

یہی وجہ ہے کہ "مایا" کی جسمانی صورت ایک دغاباز خوبصورت نازنین کی بنائی جاتی ہے۔ کیونکہ قدیم زمانے کے رشیوں کا خیال تھا کہ "دغا" اور "فریب" عورت کی فطرت کا ایک جزو لازمی ہے۔
اس اعتبار سے "مایا" ایک ایسی چیز ٹھہری جس میں کچھ حصہ آفتاب حقیقت کی شعاعوں کا تھا اور کچھ عالمِ اسباب کی ظلمت کا۔ اسی وجہ سے یہ مختلف ناموں سے موسوم ہے۔

شنکرا کی تعلیم تھی کہ "مایا" ایک نقاب ہے۔ جو ظلمت جہل کا دوسرا نام ہے۔ انسانی روح نے اپنی حقیقت کو فراموش کر دیا ہے۔ اور یہی وجہ ہے کہ وہ موت اور زندگی کے چکر سے رہا نہیں ہو سکتی۔ اگر ایکبار انسان اپنی روحانی آنکھیں کھول کر دیکھے تو اسے معلوم ہو جائے کہ "مایا" کی حقیقت کچھ نہیں۔ اور اس احساس لوہیت کے ساتھ ہی الم و کرب کے تمام پردے چاک ہو جائیں۔

عام طور پر مغربی فلسفی "ویدانتا" کی تعلیمات کو یاس آشنا تصور کرتے ہیں۔ لیکن "شنکرا" کی تعلیم اس بات کو جھٹلاتی ہے۔ اس کا قول ہے کہ انسانی روح کی جلا "علم" پر منحصر ہے۔ لیکن یہ "علم" وہ نہیں جسے ہم کتابوں کے ذریعے حاصل کرتے ہیں۔ بلکہ نور ازلی کی ایک شعاع ہے کہ جب اس کا عکس آئینۂ دل میں آجاتا ہے تو کائنات کے تمام رموز حل ہو جاتے ہیں۔ اور روح "کرب و الم" کی دشواریوں سے چھوٹ جاتی ہے۔

"ویدانت" کی تعلیمات کا مقصد یہ تھا کہ بجائے کتابی علم کے علم الٰہی حاصل کرنے کے طریقے سمجھائے جائیں۔

کہا جاتا ہے کہ "شنکرا" کے فلسفے میں "اخلاقیات" کی کوئی تعلیم نہیں لیکن یہ بات غلط ہے۔ شنکرا نے اس بات کی تخصیص کر دی ہے کہ نور حقیقت کو وہی لوگ دیکھ سکتے ہیں جن کے دل پاک و صاف ہیں جو تمام عمر نیک کام کرتے رہے ہیں۔ اور جن کا خیال کبھی گناہ کے تصور سے آلودہ نہیں ہوا!

یہی وہ لوگ ہیں جو مایا کو مفتوح کر کے اپنی روح کو نور ازلی میں گم کر سکتے ہیں۔

تنوعاتِ بہار

پھر جھوم کے وہ سحاب برسا — اترائے چمن شباب برسا
یوں رحمتِ کردگار برسی — پانی کے عوض بہار برسی
ہر قطرۂ آب گل بدامن — ہر بوند کی کف میں روحِ گلشن
شورش سے فضا ہوئی ہم آغوش
پانی سے خلا ہوئی ہم آغوش

فہمی

لاہور کا نغمہ

پچھلے دنوں مجھے موسیقی کے کیف و ترنم سے متاثر ہو کر خیال ہوا کہ جس طرح کائنات کی تمام اشیا میں باہم ایک خاص متناسب رابطہ پایا جاتا ہے۔ اسی طرح مختلف مشہور اور حسین شہر بھی ذہن پر ایک خاص اثر مترتب کرتے ہوں گے۔ اس اعتبار سے تخیل کو آوارہ چھوڑ دیا گیا تو ذہن میں عجیب عجیب کیفیات پیدا ہوئیں میں نے کوشش کی کہ شہروں کے مجموعی تاثرات کو کسی مادی چیز سے تشبیہہ دی جائے اور ان کا کوئی معہود خارجی مقرر کر لیا جاوے۔

انسان شاعر کے وجدانی نغموں کو مادی نام دے سکتا ہے تنقید میں ان کو کبھی ایک بحر زخار سے۔ کبھی ایک جوئے کم آب سے۔ کبھی ایک خودرو چشمے سے تشبیہہ دی گئی ہے۔

انسان حسین و جمیل پھولوں کی زبان بھی سمجھ سکتا ہے۔ محبت کی رنگینیوں نے مختلف پھولوں سے مختلف جذبات ادا کرنے کا کام لیا ہے۔

انسان نہایت مشکل اور پیچیدہ معمے حل کر سکتا ہے ریاضی کے اشکال اور فرعون کی قبر کے حروف و نشانات اس بات کا ایک روشن ثبوت ہیں۔

انسان فطرت کے مناظر و مظاہر کی رموز کو منکشف کر سکتا ہے چشم تخیل سے ستاروں کو رقص کرتے ہوئے دیکھ سکتا ہے۔ کیا وجہ ہے کہ شہر جو نغمہ پیدا کرتے ہیں انسان صرف اسی کو سمجھنے سے قاصر ہو؟

یہ مقصد مد نظر رکھ کر میں نے مختلف شہروں کی سیر کی :-

بمبئی کا سواد ناز آفریں سب سے زیادہ دلکش ثابت ہوا۔ ایسا معلوم ہوتا تھا گویا ایک نازنین اپنی گذشتہ جوانی کے ایام بہار کو یاد کر رہی ہے چہرہ نقوش غم سے پاک ہے مگر دل میں ایک میٹھا میٹھا درد ہے جس کے اثرات آنکھوں میں ایک موج افسردگی کی صورت اختیار کر چکے ہیں اُن کے ہاتھوں میں ایک رباب ہے۔ جو مشرقی اور مغربی تاروں کی آمیزش سے بنایا گیا ہے۔ اس کے نغمے کبھی مشرق کی سحر کار پاکیزگی سے لبریز ہوتے ہیں۔ کبھی مغرب کی بے عشرت کاریوں سے۔

کلکتہ ایک خوبصورت دلہن ہے جو شوہر کے انتظار میں چشم براہ بیٹھی ہے اس کا چہرہ ساری کے ایک رنگین آنچل میں چھپا ہوا ہے۔ مگر روئے روشن کی تابانی چاند کی کرنوں کی طرح مجروح دلوں پر آبپاشی کر رہی ہے اس کے گیت انتظار کے سوز و گداز سے ایک شعلۂ جانسوز بن گئے ہیں۔

دہلی ایک سالخوردہ مدبر خاتون ہے۔ جس نے حوادث زمانہ سے دانشمندی اور تجربے کا سبق سیکھا ہے اس کی عمر شباب کی خطرناک اور روح سوز راہوں سے گذر چکی ہے۔ مگر اس کے چہرے پر مٹی ہوئی خوب صورتی کے نشان باقی ہیں اس کے سفید بال اور پیشانی کی جھریاں تقدس اور پاکبازی کے اثرات سے پُر ہیں۔ اس نے اپنے بچوں کو خون کے گھاٹ اترتے ہوئے دیکھا ہے لیکن اس کے گراں وقار اور رشا مدار نغمے امید کے رنگین پیغام سے لبریز ہیں ایسا معلوم ہوتا ہے۔ گویا وہ نغموں کی رہبری میں ایک درخشاں مستقبل کی طرف جا رہی ہے +

ان تمام شہروں کے نغمے میں نے پہچان لئے۔ مگر جب لاہور کی باری آئی تو مجھے احساس ہوا کہ اس شہر میں ایک ایسی شئے ہے جو الفاظ میں ادا نہیں ہو سکتی۔ ایک ایسی کیفیت ہے جو مادی اشیا کے قفس میں مقید ہونا نہیں چاہتی جسے چھُوا جائے تو نظر نہ آنے والے پروں پر سوار ہو کر کہیں دُور جا چھپتی ہے۔

آخر کار میں نے اپنے عزیز دوست حامد سے اس پریشانی کا تذکرہ کیا۔

"میں نے کہا" یا تو لاہور کے نغمے بے معنی ہیں۔ یا میری عقل کی رسائی اُن اتھاہ گہرائیوں تک نہیں ہوتی۔ تم تو لاہور میں بچپن سے رہے ہو۔ کیا تمہیں کچھ محسوس ہوتا ہے کہ یہ عظیم الشان شہر رات کی ہیبت ناک خاموشی میں دن کے خوفناک ہنگامہ ائے کار میں تم سے کیا کہتا ہے؟ مجھے اس گنجینۂ معنی کو کھولنے کا طلسمی حرف نہیں ملتا۔

حامد نے بے پروایانہ جواب دیا" طلسمی حرف! طلسم ہوشربا کیوں نہیں پڑھتے؟"

مجھے حامد کی بے نیازی دیکھ کر کچھ غصہ سا آگیا۔

حامد! تم بالکل کور ذوق ہو کیا تمہیں احساس نہیں ہوتا کہ یہ

شہر اپنے چاہنے والوں سے کچھ راز کی باتیں کہتا ہے مگر تمہیں کیا معلوم ہو سکتا ہے تم نے کائنات کی تمام دلچسپیاں صرف اپنی ذات میں جمع کر لی ہیں تمہیں دنیا میں کوئی شئے اپنے آپ سے زیادہ دلکش اور نتیجہ خیز نہیں نظر آتی۔

حامد مسکرایا اور پھر کہنے لگا۔ "بھائی میرے لئے تو تمام شہر ایک سی طرح کے ہیں"

میں نے فلسفیانہ لہجے میں کہا "اس دنیائے حُسن وعشق میں بنی آدم کا ایک بہت بڑا گروہ سنجات ...... یا تباہی کی طرف چلا جا رہا ہے۔ اور تم ہو کہ ان تمام لوگوں سے بے پروا اپنی ایک علیحدہ دنیا بنائے ہوئے ہو۔

میں ایسا بد ذوق نہیں۔ اب تک مجھے اس جستجو میں ناکامی ہوئی ہے۔ کون کہہ سکتا ہے کہ آیندہ کیا ہوگا لیکن میں اتنا ضرور کہوں گا کہ اگر انسان اس راز کو بے نقاب کر سکتا ہے تو وہ انسان میں ہونگا۔" وہاں سے میں ایک شرابخانے کے دروازے پر پہونچا۔ شراب خانے کے "پیر مغاں" باہر کھڑے ہوئے تھے میں نے بے تابانہ ان سے سوال کیا "حضرت! آپ ہر رنگ کے آدمی سے ملتے ہیں۔ لاہور کے لوگ آپ کے سامنے مصنوعی تہذیب کا لبادہ اتار دیتے ہیں کچھ آپ کو معلوم ہے کہ لاہور کو کس شئے سے تشبیہہ دی جاسکتی ہے اور اس شہر کے نغموں میں کیا بات ہے جو دوسرے شہروں سے مختلف ہے"

وہ میری طرف دیکھ کر ایک انداز تفوق سے مسکرائے پھر ایک "میخوار" کو آتے ہوئے دیکھ کر اندر چلے گئے۔ لیکن جاتی دفعہ جو نگاہ انہوں نے مجھ پر ڈالی اس سے صاف ظاہر تھا کہ وہ مجھے سڑی تصور کرتے ہیں۔

میں بادل ناخواستہ وہاں سے رخصت ہو کر مال روڈ کے چوراہے پر جا پہونچا۔ پولیس کا سپاہی اپنے دونوں ہاتھ اُٹھائے ہوئے آمد ورفت کے انتظام میں مصروف تھا۔ میں نے قریب جا کر اس کے شانے پر ہاتھ رکھ دیا اور کہا:۔

"دوست لاہور کے امرا تمہارے سامنے سے تیز رفتار موٹروں پر موج برق کی طرح گذر جاتے ہیں مگر قانون نے تمہارے بازو کو یہ طاقت بخشی ہے کہ جب چاہو اپنی ایک جنبش نادری سے ان کی موٹروں کو روک سکتے ہو۔ کیا تم نے کبھی اسبات پر بھی غور کیا ہے کہ لاہور کے نغموں کو کس شئے سے تشبیہہ دی جاسکتی ہے؟

سپاہی نے میری طرف دیکھا پھر کہنے لگا۔ "دوست میری اپنی کوئی رائے نہیں۔ میری وہی رائے ہے جو میرے افسروں کی رائے ہے۔"

یہ کہکر وہ پھر آمدورفت کے انتظام میں مشغول ہو گیا۔ تھوڑے عرصے کے بعد سے جب گاڑیوں کا نہ ختم ہونے والا سلسلہ ذرا رُک گیا۔ اُس نے میرے کان میں راز دارانہ انداز میں کہا۔ "میری شادی کو صرف ایک ماہ ہُوا ہے ذرا یہاں ٹھہرے رہو تو میں بیوی سے مل آؤں میرا گھر قریب ہی ہے۔"

یہ کہہ کر وہ بڑھتی ہوئی تاریکی میں مشرق کی طرف غایب ہو گیا تھوڑی دیر کے بعد وہ واپس آگیا۔ اور میرا شکریہ ادا کرنے کے بعد کہا۔ "لاہور کے نغمے؟ ہاں۔ آجکل باہر سے ایک کمپنی آئی تو ہوئی ہے سنتا ہوں وہاں ایک دو اچھے گانیوالے ہیں۔"

یہ کہہ کر اس نے اپنا منہ میری طرف سے پھیر لیا۔ گویا کمپنی کے متعلق اطلاع دے کر وہ مجھے اس تکلیف کا کلی معاوضہ دے چکا تھا۔ جو میں نے اُس کے لئے برداشت کی تھی۔

وہاں سے چل کر میں ملکہ وکٹوریہ کے مجسمے کے پاس سے گزر رہا تھا کہ یکایک سامنے سے جناب عاشق نمودار ہوئے۔ وہ شاعر تھے اور خود بھی سراپا شعر تھے۔ ایک خود فراموشانہ انداز میں وہ میری جانب بڑھے چلے آرہے تھے۔ اور اگر میں نے راستہ نہ دیدیا ہوتا تو یقیناً وہ مجھ سے ٹکرا جاتے۔

میں نے انہیں روک لیا:۔

"عاشق صاحب" میں نے کہا۔ "آپ ایک نہایت اہم ادبی مسئلے میں میری مدد کر سکتے ہیں؟۔ آپ خاموش بے زبان فطرت کی ترجمانی کرتے ہیں۔ اور آپ کی نگاہ دوربین قطرہ میں خورشید کا لہو دیکھتی ہے کیا آپ مجھے بتا سکتے ہیں کہ لاہور بے زبان اور خاموش لاہور۔ اگر گویائی کی طاقت رکھتا تو اپنے منہ سے پہلا لفظ کیا نکالتا۔ کیا آپ مجھے بتا سکتے ہیں کہ لاہور کے نغمے کس شیریں پیغام کے حامل ہیں"

میری اس تقریر کے دوران میں وہ نہایت بیتابی سے میری تقریر کے ختم ہونے کا انتظار کر رہے تھے۔ کیونکہ میرے خاموش ہوتے ہی انہوں نے آسمان کی طرف مُنہ اُٹھا کے کہنا شروع کیا "فضاؤ۔ رنگین ہو جاؤ۔ ہواؤ۔ عطر برساؤ۔ ایک شاعر۔ اپنی منگیتر۔ اپنی محبوبہ کے رخ درخشاں سے شاد کام ہونے والا ہے"

یہ کہہ کر انہوں نے اپنی ٹائی کی طرف دیکھا۔ پھر مجھ سے پوچھا

" ذرا دیکھنا۔ ٹھیک ہے نا؟" اور جواب کا انتظار کئے بغیر اپنی راہ لی۔

میں مایوس ہوکر آگے بڑھا۔ پھر ....

ایسا معلوم ہُوا گویا آسمان میرے سر پر آرہا۔ دماغ چکرا گیا! ....

مجھے ہوش آیا۔ تو میں ایک صاف ستھرے کمرے میں لیٹا ہُوا تھا۔ میرے سر میں شدت کا درد ہو رہا تھا۔ ایسا محسوس ہوتا تھا گویا تمام محسوس کرنے والے اعصاب دماغ میں جمع ہو گئے ہیں اور کوئی انہیں کند سوئیوں سے کرید رہا ہے۔

فضا میں ایک ہلکی سی خوشبو پھیلی ہوئی تھی جس میں کوئی ناگوار عنصر بھی ملا ہُوا محسوس ہوتا تھا۔

اتنے میں میرے اوپر ایک فرشتۂ رحمت جھک گیا اُس کی آنکھیں گہری نیلی تھیں اور بالوں کا رنگ سنہری تھا۔ اُس کی آنکھوں سے ہمدردی اور رحم جھلک رہا تھا۔

میں نے اٹھنا چاہا لیکن اُس نے مجھے روکا پھر کوئل کی سی شیریں آواز میں کہا ۔

آپ لیٹے رہیں آپ کے سر پر سخت چوٹ آئی ہے۔ آپ کو یاد ہے نا کہ آپ ایک موٹر کے نیچے آگئے تھے۔

یہ کہہ کر اُس نے اپنا ہاتھ میری پیشانی پر رکھ دیا۔ درد یکبارگی رفع ہوگیا۔

میں نے جواب دیا۔ " مجھے کوئی تکلیف نہیں اور اگر ہو بھی۔ تو اس تکلیف پر ہزاروں راحتیں قربان ہیں۔ میں نے اس تکلیف کے ذریعے لاہور کا راز معلوم کر لیا ہے۔ مجھے معلوم ہوگیا ہے کہ لاہور ایک شوخ چنچل لڑکی سے مشابہ ہے جو بظاہر دنیا سے بالکل بے پروا نظر آتی ہے مگر اس کے دل میں انسانی ہمدردی ایک سمندر کی طرح موجزن ہے۔ لاہور کے نغمے ایک وحشی کے ہیبتناک گیتوں سے ملتے جلتے ہیں۔ مگر ان میں گداز اور محبت بھی موجود ہے"۔

نرس نے میری طرف مسکرا کے دیکھا۔ شاید اُسے اس قسم کے مریض سے کبھی سابقہ نہ پڑا تھا +

ع ...

ڈل دھرم سالہ

دھرم سالہ سے سات آٹھ میل اوپر ایک نہایت ہی مصفا اور شفاف جھیل ہے ۔ جس کے چاروں طرف بلند پہاڑ اور دیو دار کے خاموش اور حسرت بار درخت کھڑے ہیں۔ پانی کی ساکن سطح پر کبھی کبھی ہلکا سا تموج ہوا سے پیدا ہوتا تھا اور کبھی کبھی ہلکی سی بدلی اوپر سے گذر کر پہاڑ کی درمیانی گہرائیوں میں غرق ہو جاتی تھی :

لہرا رہا ہے چار طرف سبزہ زارِ حسن　　اللہ رے سحر کلک زمرد نگار حسن
اے وہ کہ تیرے جذبے سے ہے بیقرار حسن　　چل اُٹھ کے دیکھ شوکتِ شانِ بہار حسن
یہ ڈل نہیں ہے معجزۂ کردگار ہے
محبوبۂ جمیل دلِ کوہسار ہے

وہ زیرِ آب عکس رُخِ آفتاب کا　　وہ حُسن دلنواز خرام سحاب کا
موجِ ہوا سے ٹوٹ کے مٹنا حباب کا　　عالم وہ سطحِ آب پر اک اضطراب کا
میرے سکونِ شوق کو بیتاب کر گئے
سرمایۂ شکیب کو سیماب کر گئے

منظر سکوت خیز دیو دار کے　　اور سلسلے بلند اُدھر کوہسار کے
جلوے نشاط کارئ فصلِ بہار کے　　شاہد ہیں حسنِ صنعت پروردگار کے
ہلکی سی ایک بدلی جو آکر بکھر گئی
جذباتِ حسن و عشق کو بیتاب کر گئی

ہر منظر اک نقش ہے ذوقِ وجود کا　　یا آئینہ ہے فطرتِ جوشش نمود کا
قائم اسی سے سلسلہ ہے ہست و بود کا　　یہ ڈل کہ انتخاب ہے بزمِ شہود کا
یہ ڈل نہیں ہے پیکرِ رعنائے حسن ہے
پانی نہیں ظہورِ تمنائے حسن ہے

خالد بٹالوی ایم۔ اے پی سی ایس

ترجمہ کرنے کا فن

معیاری ادبی صحیح لٹریچر کا ترجمہ، برعکس سائنٹفک کتابوں اور اس کے متعلقہ رسالوں کے ترجمے کے کہ جن کا ترجمہ کرنے میں نسبتاً زیادہ دشواری پیش نہیں آتی۔ لیکن کن اجزائے ترکیبی سے مرکب ہوتا ہے ایک ایسا سوال ہے کہ جس پر خیالات و آراء کا سخت اختلاف ہے۔

مسٹر جارج برنارڈ شا (انگلستان کے مشہور انشا پرداز) نے اُن مسائل کی اہمیت کو سمجھ کر جو مترجمین کو پیش آتے رہتے ہیں "نوبل پرائز فنڈ" کو چھ ہزار پونڈ اس غرض سے عطا کئے ہیں۔ کہ "اینگلو سویڈش فونڈیشن" کو سویڈن کی زبان کے شاہکاروں کے انگریزی تراجم شایع کرنے کے لئے دئے جائیں۔ چنانچہ ان کے اس گرانقدر اور ہمت افزا عطیہ کا خاطر خواہ نتیجہ بھی برآمد ہونا شروع ہو گیا ہے۔ جس شخص کو بھی تھوڑا بہت ادبی مذاق ہو اس کے لئے ترجمہ کا فن توجہ و مطالعہ کا مستحق ہے اور بالخصوص اس وجہ سے اور بھی کہ فی زمانہ بیسیوں کتابوں کے تراجم آئے دن شایع ہوتے رہتے ہیں۔

ترجمہ کرنے کا فن حد درجہ مشکل ہے اور اس خیال پر کہ کوئی "مکمل ترجمہ" موجود ہے یا ہو سکتا ہے بیسیوں اعتراضات کئے جا سکتے ہیں۔ جو مترجم کسی مصنف کو مخلصانہ طور پر اس کے رنگ و روپ میں ظاہر کرنا چاہے۔ اس کے لئے لازمی طور پر ضروری ہے کہ وہ اس کام کے لئے موزوں بھی ہو۔ یعنی یہ کہ وہ بھی مصنف کی طرح کا مزاج اور اُسی جیسی طبیعت رکھتا ہو۔ اس کے خیالات و آراء میں شریک ہو سکے۔ نیز اس کا سٹایل (طرز) بھی مصنف کے سٹایل پر منطبق ہو سکے۔ مترجم کو اپنا کام شروع کرنے سے پہلے بہت سے ابتدائی مراحل طے کر لینے چاہئیں۔ یعنی یہ کہ اس بات کا خیال رکھنا کہ اس کا مصنف کس وقت اور کس زمانے سے تعلق رکھتا ہے اور جہانتک اس کی تحریر پر اثر ڈالنے کا تعلق ہے۔ اس زمانے کی قومی، ملکی، ادبی و معاشرتی خصوصیات کیا کیا ہیں، وغیرہ وغیرہ۔

مکمل ترجمہ بعض لوگوں کا خیال ہے کہ مترجم کو مصنف کے اصل خیالات کو پوری طرح ذہن نشین کر لینا چاہئے اور جب وہ ان خیالات پر پوری طرح عبور حاصل کر لے تو پھر ان خیالات کی ترجمانی کا کام نہایت آزادی کے ساتھ اُسی کے فیصلہ پر چھوڑ دیا جائے تاکہ وہ ان کے اظہار کے وقت ان کی مناسب تکمیل و تزئین کر سکے۔ یہاں پر ان لوگوں کی رائے بھی ظاہر کر دینی چاہئے جو اس کے برعکس یہ سمجھتے ہیں کہ ایک مخلص مترجم کو ترجمہ کرتے وقت نہ صرف مصنف کی عبارت کا اصل الاصول (Substance) ظاہر کر دینا چاہئے بلکہ جہانتک ممکن ہو سکے اس کی طرز تحریر کو بھی ہر پہلو سے نباہنا چاہئے۔

اکثر اوقات تحت اللفظ ترجمہ بدترین ترجمہ ہوتا ہے۔ کیونکہ اس وقت مترجم لفظی ترجمہ کرنے میں باوجود سخت محنت و دماغ سوزی کے بھی مصنف کی رُوح کو برقرار نہیں رکھ سکتا۔

ترجمہ کرتے وقت اگر کوئی مترجم اوریجنل (طبعزاد تحریر) کا طرز اختیار کرتا ہے تو ایک دقت یہ آپڑتی ہے کہ ممکن ہے وہ جس طرز کو اختیار کرتا ہے۔ وہ اس کی زبان کے معیار پر پُورا نہ اُتر سکے اور اس کی زبان میں اس قسم کا یا اس قسم کے طرز کا استعمال جائز نہ ہو۔ لیکن اس کے برخلاف اگر کوئی مترجم اپنے ترجمہ کو اپنی قوم کے مخصوص ادبی رنگ میں رنگنا چاہتا ہے۔ تو یہ خطرہ ہے کہ وہ اصل مصنف کے خیالات میں اُلجھن پیدا کر کے کہیں خبطِ مطلب، یا خلطِ مبحث، نہ کر دے اور بسا اوقات ایک بالکل نئی کتاب ہی نہ پیدا کر دے۔

اس لئے ایک مکمل ترجمے کا مقصود یہ ہونا چاہئے کہ اس میں اوریجنل کی رُوح کو نہایت ایماندارانہ طریقے سے ظاہر کر دیا جائے، اور محاورہ اور اسالیب بیان کو تھوڑی دیر کے لئے نظر انداز کر کے مصنف کی طبعزاد عبارت کے طرز کا پورا پورا تتبع کیا جائے۔ علاوہ بریں مترجم کو اس بات کا بھی خیال رکھنا چاہئے۔ کہ اس کا یہ "جبریہ طرز" آخر تک نبھ جائے اور اس میں کہیں بھدا پن نہ پیدا ہونے پائے۔ اور اپنی طرف سے ترجمہ میں جگہ جگہ مناسب زیب و زینت بھی دیتا رہے۔ تاکہ اس میں بھی اوریجنل تصنیف کی مانند روانی اور قوت بیان کی قدرتی شان جھلکنے لگے۔

مکمل ترجمے کی تعریف میں یہ بھی شامل ہے کہ ترجمہ میں اوریجنل کی قومی خصوصیات کو بھی اُبھار کر اور کافی نمایاں طریق پر ظاہر کیا گیا ہو۔ کیونکہ اصل میں ترجمہ کرنے کا مقصد ہی یہ ہے کہ ہم غیر زبان کے مصنفوں کو اپنی زبان میں منتقل کریں ان کے جذبات و حسیات کو بخوبی سمجھیں اور ان کے مطمح نظر (Outlook) کو جانیں اور ان کے سٹائل کا کوئی صحیح تصور قائم کر سکیں۔ ظاہر ہے کہ یہ مقصد صرف اسی وقت حاصل ہو سکتا ہے جب مترجم اپنے ذاتی و قومی وجود کو بھلا کر اوریجنل میں محو نہ کر دے۔

اور ساتھ ہی ... اپنی انفرادی "خودی کو بھی ضائع نہ ہونے دے"۔

اشعار کا ترجمہ ڈرامہ یا ناول کے ترجمے سے اشعار کا ترجمہ کہیں زیادہ مشکل ہوتا ہے، کیونکہ شاعری میں قومی و ملکی خصوصیات کا عنصر غالب آجاتا ہے۔ مگر پھر بھی مترجم کو لٹریچر کی دیگر شقوں کی مانند یہاں بھی تقریباً اسی طرح کا کام انجام دینا ہوتا ہے لیکن ہم سرجون ڈینہم کی اس بات سے ہرگز متفق نہیں ہو سکتے کہ "اشعار کو ایک زبان سے دوسری زبان میں ترجمہ کرتے وقت ان کی دقیق روح بالکل اُڑ جایا کرتی ہے اور جب تک مترجم ان میں اپنی طرف سے ایک نئی رُوح نہ پھونکے وہ ایک بے جان قالب کی سی حیثیت رکھتے ہیں"۔

یہ بیشک مانا جاسکتا ہے کہ اشعار کا ترجمہ کرنے میں "دقیق روح" کا بہت کچھ حصہ اُڑ جایا کرتا ہے۔ مگر ایک اچھا مترجم وہی سمجھا جاتا ہے جو ترجمہ کرتے وقت اس "روح" کو کم سے کم اڑنے دے اور ساتھ ہی اس میں اپنی روح بھرنے کی کوشش نہ کرے۔

ممکن ہے بعض اوقات ترجمہ بذات خود اوریجنل سے بہتر ہو جائے اور فن شعر کی ایک بہت بڑی یادگار رہ جائے۔ لیکن اگر اس میں یہ نئی رُوح پھونک دی گئی تو پھر اس کی ترجمہ کی شان باقی نہیں رہی اور اسے ترجمہ کہنا ہی غلط ہوگا۔

حقیقت یہ ہے کہ یہی مترجم کا ایک فرض خیال کیا جاتا ہے کہ وہ اپنے ترجمے میں حتی الامکان اصل کی روح کو کامیابی کے ساتھ شامل کئے رکھے لیکن اگر وہ بدقسمتی سے اس روح کو برقرار نہیں رکھ سکتا تو یہ زیادہ بہتر ہے کہ ترجمہ کو ہاتھ ہی نہ لگائے۔

ظفر قریشی دہلوی

چاند اور ہم

چاندنی افسردہ بھی ہے زرد بھی — چھن رہا ہے ہلکا ہلکا درد بھی
دل کی دھڑکن گویا دل کو چھوڑ کر — منتشر ہے چاندنی کے فرش پر
کچھ پریشانی ہے ایسی ماہ میں — جیسے کھو جائے مسافر راہ میں
چاندنی میں کوئی شے بیتاب ہے — حسن کا شاید پریشاں خواب ہے
چاند ہے اشکوں سے منہ دھوئے ہوئے — نغمے غم انگیز ہیں سوئے ہوئے
بے سکوں ہے آج کچھ آشفتہ حال — یا تڑپ کے بعد ہے کوئی نڈھال
خامشی جو ہمرہِ مہتاب ہے — بولنے کے واسطے بیتاب ہے

چاندنی کا حسن اس کے دم سے ہے
اور محبت اس کو افسرؔ ہم سے ہے

افسر میرٹھی

بچّے کا خواب

دونوں خورد سال بچے فطرت کی طرف سے ایک عجیب دل و دماغ لے کر پیدا ہوئے تھے۔ وہ ہر چیز کو ایک خاص گہری نظر سے دیکھتے تھے۔ [illegible] صنعتیں مثلاً پھولوں کی رنگینی، نیلگوں آسمان کی بلندی شفاف پانی کی گہرائی ہمیشہ اُن کے لئے تعجب کا باعث ہوا کرتی تھیں۔

وہ اکثر ایک دوسرے سے کہا کرتے "فرض کرو روئے زمین پر کے تمام بچے مرجائیں، تو کیا یہ پھول، یہ سمندر، یہ آسمان مغموم نہ ہوں گے؟ انہیں یقین تھا کہ وہ ضرور غم محسوس کریں گے، کیونکہ کلیاں پھولوں کے بچے ہیں۔ چھوٹی چھوٹی خوشنما ندیاں جو پہاڑوں کے دامن میں اٹھکھیلیاں کرتی ہوئی بہتی ہیں، سمندر کی اولاد ہیں۔ اور یہ چمکدار ننھے ننھے دھبے جگنو جو تمام رات فضا میں آنکھ مچولی کھیلتے پھرتے ہیں ستاروں کے بچے ہیں۔ جب وہ اپنے ہمجولیوں یعنی انسان کے بچوں کو نہ پائیں گے تو یقیناً مغموم ہونگے۔

ہر شام گرجے کی چوٹی کے نزدیک قبرستان کے اوپر سے ایک صاف جگمگاتا ہؤا ستارا نظر آیا کرتا تھا، یہ نسبتاً بڑا اور چمکدار تھا۔ وہ بلا ناغہ دریچے میں سے ایک دوسرے کے ہاتھ میں ہاتھ ڈالے اُسے دیکھا کرتے۔ دونوں میں سے جسے پہلے دکھائی دیتا وہ چلا اُٹھتا۔ "وہ دیکھو ستارا" اور کبھی کبھی دونوں بیک آواز انگلیوں سے اُس کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہتے "وہ دیکھو ستارا"

انہیں خوب معلوم تھا کہ وہ کس وقت اور کس جگہ سے طلوع ہوگا۔ وہ اس سے اسقدر مانوس ہوگئے تھے کہ سونے سے پیشتر ایک بار اسے ضرور "دیکھتے" اور جب بستر پر لیٹتے تو کہتے "پیارے تارے خدا تمہیں برکت دے"۔

اتفاق ایسا ہؤا کہ بہن بیمار پڑ گئی۔ اور اتنی کمزور ہوگئی کہ اپنے بھائی کی معیت میں کھڑکی کے پاس کھڑے ہو کر ستارے کو دیکھ نہ سکتی تھی، بچے کو اس کا بے حد افسوس تھا۔ وہ جب ستارے کو دیکھتا تو بہن کی طرف منہ موڑ کر کہتا۔ "وہ دیکھو ستارا" یہ سُنکر بہن کا کمزور مگر مسکراتا ہؤا چہرہ یوں گویا ہوتا "خدا میرے بھائی اور ستارے کو برکت دے"

وہ وقت جلد ہی آپہنچا جب بچہ تنہا رہ گیا، جب بستر پر بہن کا پیارا چہرہ دکھائی نہ دیا۔ جب قبرستان میں ایک ننھی سی قبر کا اضافہ ہوگیا۔ اور جب ستارے نے اپنی لمبی شعاعیں اکیلے بچے ہی پر ڈالیں اور اس نے اُسے ڈبڈبائی ہوئی آنکھوں سے دیکھا۔ اب شعاعیں پہلے کی نسبت زیادہ روشن تھیں، اُن کے زمین پر پڑنے سے ایسا معلوم ہوتا تھا کہ آسمان تک ایک روپہلی راستہ بن گیا ہے، بچہ جب اپنے بستر پر سویا تو اُس نے خواب میں دیکھا کہ "لوگوں کا ایک تانتا لگا ہؤا ہے، جو اس درخشاں راستے پر روحوں کی معیت میں چل رہے ہیں، اور ستارہ نور کی ایک وسیع دنیا ہے۔ جہاں بیشمار روحیں اُن لوگوں کے استقبال کیلئے کھڑی ہیں۔ تمام منتظر رُوحوں نے اپنی نگاہیں آنیوالوں پر گاڑ رکھی ہیں۔ بعض جو زیادہ بے تاب تھیں اپنی اپنی قطاروں سے نکل کر اُن سے لپٹ گئی ہیں۔ اور اُن کی پیشانیوں کو چومنے لگی ہیں۔"

ان کی یہ ملاقات ایسا دل خوش کُن منظر تھا کہ وہ بھی اس سے متاثر ہوئے بغیر نہ رہ سکا، اور فرطِ مسرت سے اُس کی آنکھوں سے آنسو نکل پڑے۔

لیکن بہت سی روحیں ایسی بھی تھیں جو اُن لوگوں کے ساتھ نہیں جاتی تھیں، اور اُن میں سے ایک کو وہ پہچانتا بھی تھا —— ایک کمزور اور زرد چہرہ جو کبھی بسترِ علالت پر دکھائی دیا کرتا تھا —— یہ اُس کی بہن تھی۔

اُس کی بہن کی رُوح دروازہ ہی پر انتظار کرتی رہی، اس نے رہنما (جو لوگوں کو اس نور کی دنیا میں لایا تھا) سے دریافت کیا۔

"کیا میرا بھائی آگیا ہے"؟

جواب ملا "نہیں"

وہ امیدوارانہ پیچھے کو مڑی۔ بچے نے فرطِ اشتیاق سے اپنے بازو پھیلا دئے اور چلایا

"پیاری بہن! میں یہاں ہوں مجھے بھی لے جاؤ"

ننھی بچی نے اپنی روشن نگاہیں اپنے بھائی پر ڈالیں اور اُس کی آنکھ کھل گئی —— رات تاریک تھی، ستارہ اپنی طویل درخشاں شعاعیں کمرے میں ڈال رہا تھا اور وہ پُرنم آنکھوں سے اُسے دیکھ رہا تھا۔

بہن کی وفات کے بعد جب وہ ستارے کی طرف دیکھتا تو اُس کی آنکھوں میں مسافر کی ان حسرت پاش نگاہوں کی جھلک پائی جاتی تھی جو دشتِ غربت میں بار بار اپنے وطن کی طرف اٹھتی ہوں ——— اور ہونا بھی ایسے ہی چاہیئے تھا۔

اُس نے خیال کیا کہ اُس کا تعلق صرف زمین ہی سے نہیں ہے بلکہ ستاروں سے بھی ہے۔ اور جب اُسے اپنی بہن کی رُوح کا خیال آتا جو ستارے کی طرف پرواز کر گئی تھی تو اس کے خیال کو مزید تقویت پہنچتی۔

کچھ عرصے کے بعد اُن کے گھر میں ایک بچہ پیدا ہُوا جو اُس کا چھوٹا بھائی کہلایا لیکن وہ ابھی بہت چھوٹا ہی تھا اور اس نے ایک لفظ بھی بولنا نہ سیکھا تھا کہ دنیا سے سدھار گیا۔

بچے نے دوبارہ خواب دیکھا "ستارے تک شعاعوں کا ایک راستہ بنا ہُوا ہے، لوگ رُوحوں کی معیت میں اُس پر چلے جا رہے ہیں۔ اور اُس کی بہن کی رُوح نے انہی سے دریافت کیا ہے "کیا میرا بھائی آ گیا ہے؟"

انہی نے جواب دیا "وہ نہیں بلکہ دوسرا"

جب بہن نے اس ننھے بھائی کی رُوح کو اپنے بازوؤں میں محبت سے لپٹایا تو بچہ چلا اُٹھا

"بہن میں یہاں ہوں مجھے بھی لے چلو"۔

اس نے جواب میں اس کی طرف مُڑ کر دیکھا اور مسکرا دی ———

——— ستارہ اس کی طرح چمک رہا تھا۔

وہ بچہ اب نوجوان تھا۔ ایک دن اپنے کمرے میں بیٹھا مطالعہ میں مصروف تھا کہ بوڑھا خادم داخل ہُوا اور عرض کیا۔

"جناب کی والدہ قضا کر گئی ہیں، میں اُن کی آخری دعائیں اور برکتیں آپ کے لئے لایا ہوں" رات کو خواب میں اُسے پھر وہی منظر نظر آیا اور حسب سابق اس کی بہن کی رُوح نے رہنما سے دریافت کیا

"کیا میرا بھائی آ گیا ہے؟"

جواب ملا "بھائی نہیں تمہاری والدہ آئی ہیں"

ماں کے اپنے دو بچھڑے ہوئے بچوں سے دوبارہ جا ملنے پر ستارے کی فضا میں ہر طرف مسرت کی لہریں دوڑ گئیں۔ ذرہ ذرہ جوشِ مسرت سے رقصاں نظر آتا تھا۔ بچہ اس منظر کو دیکھ کر اس قدر متاثر ہُوا کہ اُس نے اپنے دونوں بازو پھیلا دیئے اور چلا اٹھا "امی جان! پیاری بہن! پیارے بھائی! میں یہاں اکیلا پڑا ہوں مجھے بھی بلا لو"

انہوں نے جواب دیا "تمہارے آنے کا ابھی وقت نہیں آیا"

——— ستارہ حسب معمول چمک رہا تھا ———

وہی بچہ اب ایک ادھیڑ عمر کا آدمی تھا۔ اُس کے بال سفید ہو رہے تھے۔ آتشدان کے سامنے کرسی کے بازو پر کہنی ٹیکے مغموم بیٹھا تھا۔ آنکھوں میں آنسو تھے۔ ایک بار پھر ستارہ اور اسکی وسیع فضا اُس کے سامنے تھی۔

اس کی بہن کی رُوح نے رہنما سے پوچھا

"کیا میرا بھائی آ گیا ہے؟"

جواب ملا .... "تمہاری بھتیجی آئی ہے"

اُس ادھیڑ عمر کے آدمی نے جو کبھی بچہ تھا اور جس نے تھوڑی ہی دیر ہوئی اپنی شفقت بھری گود سے قضا و قدر کے حکم سے اپنی پیاری بیٹی کو جُدا کیا تھا۔ دیکھا وہ متبرک روح اُن تینوں کے ساتھ ہے۔ وہ بولنے لگا

"میری بچی کا سر میری بہن ...... کے سینے پر ہے۔ اُس کے بازو میری والدہ کی گردن میں حمائل ہیں۔ اور اس کے پیروں کی طرف میرا ننھا بھائی بیٹھا ہے۔ اب میں اُس کی جدائی کو برداشت کر لونگا اور یہ سب خدا کی مہربانی ہے جس کے لئے سب تعریفیں ہیں"

——— ستارہ فضا میں حسب معمول جگمگا رہا تھا"

وہ بچہ اب ایک پیر مرد تھا اُس کے صاف، خوبصورت چہرہ پر جُھریاں پڑ چکی تھیں۔ اُس کے قدم لڑکھڑانے لگے تھے اور اُس کی کمر جھک گئی تھی۔

ایک رات وہ بستر پر پڑا تھا، اُس کے بچے اُس کے گرد کھڑے تھے، وہ اپنے بچپن کے لہجے میں چلایا

"وہ دیکھو ستارا"

اُس کے لڑکے بالے آپس میں سرگوشیاں کرنے لگے۔

"افسوس ابا جان کا آخری وقت آ گیا"

پیر مرد نحیف آواز میں

"میں اب مر رہا ہوں، میری عمر کا لباس اب اُتر رہا ہے اور میں ستارے کی طرف ایک بچے ہی کی طرح جا رہا ہوں۔ اے خدا! تیرا ہزار ہزار شکر ہے، میں اب ان سے جا ملونگا جو میرے انتظار میں ہیں"

——— ستارہ اسوقت بھی چمک رہا تھا، اور اب بھی اسکی قبر پر چمکتا ہے ———

(چارلس ڈکنسز)

حمدی

عربوں کا نقدِ شعری

نقد کے معنی ہیں پرکھنا اور کھرا کھوٹا الگ کرنا - روپے پیسے میں کھرا کھوٹا جانچنے کو نقدِ دراہم اور اشعار میں اچھے بُرے کی تمیز کو نقد شعر کہتے ہیں -

فنِ نقد کی حیثیت دوسرے علوم و فنون کے مقابلے میں ایک محافظ اور نگہبان کی ہے - کیونکہ اسی کی بدولت دوسرے فنون خرافات اور رطب یابس سے محفوظ رہتے ہیں - اور اسی کا خوف اہلِ کمال کو صرف اچھی چیز پیش کرنے پر مجبور کرتا ہے - اسی طرح ناقد بھی اہلِ علم کو گمراہی سے بچانے والا اور سیدھے راستے پر چلنے کے لئے مجبور کرنے والا محافظ اور رہنما سمجھا جاتا ہے - مگر ہر فن کے ناقد کیلئے ضروری ہے کہ وہ اُس فن میں پُوری مہارت رکھتا ہو اور اس کے رموز و نکات سے خود مصنف سے کہیں زیادہ واقف ہو - اس کے ساتھ ہی نقد کے مختلف اسلوب میں بھی کامل دستگاہ رکھتا ہو - اور موقع کے مناسب ایسے طرز پر تبصرہ کر سکتا ہو کہ مصنف پر اس کا اثر پڑے اور وہ اپنی کجروی ترک کرنے پر تیار ہو جائے -

ظہورِ اسلام سے پہلے عرب میں شاعروں کی کمی نہ تھی مگر ناقد مفقود تھے - جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ جاہلیت کی شاعری سے اخلاقی عنصر فنا ہو گیا - سخاوت اور شجاعت کی خوبیاں اگر کچھ باقی بھی رہ گئی تھیں - تو ان پر بداخلاقی اور فحش نگاری کے پردے پڑ چکے تھے - کوئی نہیں تھا کہ ان کی روک تھام کرے - اور شاعروں کی بیجا خرچ ہونے والی قوت فکر کو قوم کی فلاح و بہبود کی طرف مائل کر سکے - ظہورِ اسلام کے بعد عرب کے شاعروں کی سب سے پہلی گرفت خداوند تعالیٰ کی طرف سے کی گئی اور اس آیت کے نزول کے ساتھ نقد کی بنیاد پڑی :-

وَالشُّعَرَاءُ يَتَّبِعُهُمُ الْغَاوُونَ - اَلَمْ تَرَ اَنَّهُمْ فِي كُلِّ وَادٍ يَهِيمُونَ -

شاعروں کی پیروی گمراہ لوگ کرتے ہیں - کیا تم دیکھتے نہیں ہو کہ وہ (اچھے بُرے کی تمیز کئے بغیر) ہر وادی میں بھٹکتے پھرتے ہیں -

اس آیۂ کریمہ کے نازل ہونے کے بعد صحابۂ کرام نقد شعر کی طرف متوجہ ہوئے - اور مذموم اشعار کی مذمت اور اچھے اشعار کی مناسب تعریف سے شعر و شاعری سے بداخلاقی کے عناصر کو تقریباً فنا کر دیا -

اسلامی علوم و فنون کے ساتھ شاعری بھی ترقی کرنے لگی اور پہلی صدی ہجری ہی میں اس کی ضرورت محسوس کی جانے لگی کہ شعر کے محاسن اور عیوب کو کتابوں کی صورت میں جمع کر دیا جائے تاکہ شاعر بھی گمراہی سے بچیں - اور ناقدوں کے لئے بھی آسانی ہو جائے - اس خیال کے ماتحت عربوں نے اس فن پر بہت سی کتابیں لکھیں جن کے رواج پا لے کے بعد نقد کے علاوہ شعر گوئی میں ان سے مدد لیجانے لگی - اور اب تو ساری شعر و شاعری کا دار و مدار انہی کے مقرر کردہ اوزان و قوافی پر ہے

بعض لوگوں کا خیال ہے کہ یہ فن ظہورِ اسلام سے پہلے بھی موجود تھا - اس کے ثبوت میں بعض روائتیں بھی بیان کیجاتی ہیں جو چنداں قابل اعتماد نہیں ہیں - مثلاً اس فن کی کئی کتابوں میں دورِ جہالت کے نقد و تبصرہ کا ایک واقعہ یوں بیان کیا گیا ہے کہ نابغہ ذبیانی (ایک جاہلی شاعر) نے حضرت حسان سے ان کا یہ شعر سُنا :-

لَنَا الْجَفَنَاتُ الْغُرُّ يَلْمَعْنَ فِي الضُّحٰى
وَاَسْيَافُنَا يَقْطُرْنَ مِنْ نَجْدَةٍ دَمَا

(ہماری شرافت کی نشانی، ہماری لمبی لمبی چمکدار پلکیں ہیں جو آفتاب کی روشنی میں چمکا کرتی ہیں اور (ہماری شجاعت کی علامت) ہماری تلواریں ہیں جن سے خون ٹپکتا رہتا ہے -

تو کہا کہ اگر تم اَلضُّحٰی (روشن دن) کے بجائے اَلدُّجٰی (تاریک رات) کہتے تو زیادہ بہتر ہوتا - کیونکہ دن کو تو ہر چیز چمکتی ہے تمہاری پلکیں چمکیں تو کون بڑا کمال ہوا - اسی طرح یَقْطُرْنَ کی جگہ یَجْرِيْنَ کہنا چاہئے تھا - تلوار سے قطرہ قطرہ خون ٹپکنا کونسی بڑی بات ہے - شجاعت تو جب معلوم ہو کہ اُس سے خون کی دھار بہ نکلے -

قدامہ بن جعفر اپنی کتاب "نقد الشعر" میں نابغہ کی تردید میں لکھتے ہیں کہ الضحی کی جگہ الدجی کو بہتر بتانا اور یہ کہنا کہ دن کو ہر چیز چمکتی ہے واقعے اور مشاہدے کے سراسر خلاف ہے - دن کو کو صرف وہی چیز چمکتی ہے جو بیحد صاف اور اتنی چمکدار ہو کہ آفتاب کی روشنی اور چمک میں فنا نہ ہو سکے - رات کو البتہ معمولی چمک والی چیزیں جگمگانے لگتی ہیں - چاند، ستارے - چراغ - آگ اور درندوں کی آنکھیں وغیرہ آفتاب کی روشنی

میں اپنی معمولی چمک کی وجہ سے خیرہ ہو جاتی ہیں - مگر سورج ڈوبتے ہی سب روشن نظر آنے لگتی ہیں - ظاہر ہے کہ روشن آفتاب کے مقابلے میں چمکنا ایک کمال کہا جا سکتا ہے - نہ کہ رات کی تاریکی میں ٹمٹمانا - اسی طرح نابغہ کا یہ کہنا کہ یقطُرن کے بجائے یجرین بہتر ہوتا محاورے کے خلاف ہے - کسی کی شجاعت اور بہادری بیان کرنا چاہتے ہیں تو کہتے ہیں کہ سیفُہٗ یقطرُ دَماً (اس کی تلوار سے خون ٹپکتا رہتا ہے) یہ کبھی سننے میں نہیں آیا کہ سیفُہٗ یجْرِی دَماً (اس کی تلوار سے خون جاری رہتا ہے) اگر حسانؓ یقطُرن کی جگہ یجرین فرماتے تو یہ شعر محاورے سے خارج ہو جاتا -

قدامہ نے نابغہ کے نقد پر جتنا اچھا نقد کیا ہے اس میں کسی کو کلام نہیں ہو سکتا مگر ہمیں تو روایت ہی سرے سے من گھڑت معلوم ہوتی ہے - ایسے لفظی جھگڑے اس زمانے کی پیداوار ہیں جب اگلوں کی فصاحت و بلاغت کا دور ختم ہو چکا تھا - اور معانی تو الگ رہے پچھلے الفاظ تک میں غلطیاں کرنے لگے تھے - اسی شعر کے متعلق بعض دوسرے راویوں کی روایت سے ہمارے خیال کی اور بھی تائید ہوتی ہے - وہ بیان کرتے ہیں کہ نابغہ نے یہ شعر سنکر حضرت حسانؓ سے یہ بھی کہا تم نے الجفنات اور اسیاف کہکر اپنی پیالوں اور اپنی تلواروں کی تعداد گھٹا دی ہے - گویا نابغہ کو سو سال بعد پیدا ہونے والے نحویوں کا اختلاف معلوم تھا - اور سیبویہ (ایک مشہور نحوی کا نام) کے مذہب کو ترجیح دیکر اس نے فیصلہ کر لیا تھا کہ جمع مونث سالم[1] جمع کثرۃ نہیں جمع قلۃ ہے - اور صرف یہی نہیں بلکہ اس کو ابن مالک کی الفیہ کا یہ شعر بھی یاد تھا - [2]

اَفْعِلَۃٌ اَفْعُلٌ ثُمَّ فِعْلَۃٌ
ثُمَّتَ اَفْعَالٌ جُمُوعُ قِلَّۃٌ

(یہ سارے وزن جمع قلۃ کے لئے خاص ہیں -)

واقعہ یہ ہے کہ نابغہ کے مرکھپ جانے کے سیکڑوں سال بعد نحویوں میں اختلاف پیدا ہوا - اور بعضوں نے حضرت حسان کے شعر کے لفظ جفنات سے جمع مونث سالم کو جمع کثرۃ ثابت کرنا چاہا تو جھٹ ان کے مخالف نابغہ کے نقد کی حکایت گڑھ کر جمع مونث سالم کو اسی شعر اور اسی لفظ سے جمع قلۃ ثابت کرنے کی کوشش کرینگے

کیا نابغہ جیسا بڑا شاعر ان وزنوں سے اس قدر نا آشنا تھا؟ یا کیا حضرت حسانؓ کو اس کی خبر نہ تھی؟ یہ سب کچھ نہیں حقیقت یہ ہے کہ یہ حکایت بھی نحویوں اور لغویوں کے سیکڑوں جھوٹوں میں سے ایک معمولی سا جھوٹ ہے - ورنہ کہاں نابغہ کا زمانہ اور کہاں ایسی لفظی گرفتیں! شروع سے عہد عباسی کی ابتدا تک عربوں کی فصاحت و بلاغت اپنے اصلی رنگ میں قائم تھی اور اس سے پہلے ایسے لفظی نقد کی ضرورت ہی نہیں پڑ سکتی تھی - ہاں تو جب اسلام کا دائرہ وسیع ہونے لگا اور عجمیوں کے میل ملاپ سے عربوں کی فطری سادگی اور بدوی فصاحت و بلاغت میں فرق آنے لگا تو لفظوں اور وزنوں کی گرفت کرنے والے ناقد بھی پیدا ہو گئے - دور جہالت میں تو نقد و تبصرہ کا نام و نشان ہی نہ تھا - ابتداء اسلام میں اس کی طرف توجہ بھی کی گئی تو صرف معنوی حیثیت سے - اور اس وقت ضرورت بھی صرف اسی کی تھی -

اسی قسم کی ایک اور جھوٹی روایت یوں بیان کی جاتی ہے کہ اللہ تعالیٰ کا قول اِنَّکُمْ وَمَا تَعْبُدُوْنَ مِنْ دُوْنِ اللّٰہِ حَصَبُ جَہَنَّمَ (تم اور جن چیزوں کو تم پوجتے ہو وہ دوزخ کا ایندھن ہیں) نازل ہوا اور مشرکوں نے سنا تو ایک نے دربار نبوت میں حاضر ہو کر بطور اعتراض دریافت کیا - کہ حضرت عیسیٰؑ کو عیسائیوں کے بعض فرقے پوجتے ہیں - تو کیا وہ بھی دوزخ کا ایندھن ہیں؟ حضورؐ نے جواب دیا کہ "تم اپنی قوم کی زبان سے کسقدر ناواقف ہو - کیا تمہیں معلوم نہیں کہ "ما" غیر ذوی العقول (عقل والوں کے سوا) کیلئے آتا ہے -

اس روایت کو گھڑنیوالا بھی کتنا احمق اور کیسا جاہل تھا - کاش وہ اس افترا سے پہلے خدا تعالیٰ کے قول سَبَّحَ لِلّٰہِ مَا فِی السَّمٰوٰتِ وَ مَا فِی الْاَرْضِ (خدا کی پاکی بیان کی ان تمام چیزوں نے جو آسمان میں ہیں اور ان تمام چیزوں نے جو زمین میں ہیں) پر غور کر لیتا - اسمیں تو "ما" غیر ذوی العقول کے ضمن میں ذوی العقول (عقل والوں) کیلئے بھی استعمال کیا گیا ہے - کیا معترض کو جو عرب کے فصحا میں سے تھا - اپنی زبان کے ایسے مشہور اور بار بار آنے والے لفظ کا محل استعمال معلوم نہ تھا - یا کیا رسول اکرم صلعم جو تمام فصیحوں سے فصیح تھے - نعوذ باللہ منشاء وحی سے ناآشنا تھے - کاش انہیں معلوم ہوتا کہ صحیح روایتوں کی بنا پر تو اس

---

[1] جمع مونث سالم اس جمع کو کہتے ہیں جو مفرد پر الف اور ت بڑھا کر بنائی جائے - اور جمع کثرۃ وہ جمع ہے جسمیں ایک ہی قسم کی دس یا اس سے زیادہ چیزیں شامل ہوں اور جمع قلۃ اسے کہتے ہیں جو دس سے کم پر بولی جائے - جمع مونث سالم کے متعلق بعض نحویوں کا خیال ہے کہ جمع قلۃ ہے اور بعض اسے جمع کثرۃ سمجھتے ہیں -

[2] حضرت حسانؓ کے شعر کا لفظ اسیاف اسی وزن پر ہے اور یہ وزن ابن مالک کے نزدیک الفیہ کے اس شعر کے دوسرے وزنوں کی طرح جمع قلۃ کیلئے ہے - مگر ان کے نزدیک جمع مونث سالم قلۃ کے لئے نہیں ہے - اور سیبویہ کے نزدیک اسیاف (افعال) کا وزن جمع قلۃ کے لئے نہیں آتا - مگر نابغہ نے گویا آدھی سیبویہ کی پیروی کی - اور آدھی ابن مالک کی - اور حضرت حسان کے شعر پر اعتراض جڑ دیا - چہ خوش!

اعتراض کا جواب خود وحی سے یہ نازل ہوا تھا:-

اِنَّ الَّذِیْنَ سَبَقَتْ لَھُمْ مِّنَّا الْحُسْنٰۤی اُولٰٓئِکَ عَنْھَا مُبْعَدُوْنَ

جن لوگوں کے حق میں ہماری طرف سے پہلے ہی بلند درجے (یا بھلائیاں) مقرر ہو چکے ہیں وہ یقینی طور پر دوزخ سے دور رکھے جائیں گے۔

نحویوں۔ لغویوں اور خود غرض راویوں کی اس قسم کی بیسیوں من گھڑت روایتیں مشہور ہیں۔ مگر ان میں سے اکثر اتنی سطحی ہیں اور جھوٹ ایسے بھونڈے پن سے بولا گیا ہے۔ کہ ناقد اُس زمانے کی ادبی اور لغوی ترقی کے مدارج اور اس وقت کے افکار و خیالات سے معمولی سی واقفیت بھی رکھتا ہو تو بڑی آسانی سے سچ اور جھوٹ میں تمیز کر سکتا ہے۔

ہماری نظر سے تو ظہور اسلام سے قبل کی نقد شعری کے متعلق یا اس کے ضمن میں جتنی روایتیں گزری ہیں سب تقریباً اسی طرح لغو اور نحویوں یا لغویوں کی خانہ ساز معلوم ہوتی ہیں۔ اور ان کے ناقدانہ مطالعے کے بعد ہم اس نتیجے پر پہنچے ہیں کہ ایام جاہلیت میں عرب میں فن نقد کا سرے سے وجود ہی نہ تھا۔ مسلمانوں کے ہاتھوں اس کی بنیاد پڑی اور انہی کے ہاتھوں یہ پروان چڑھا۔ مگر اسلام کے ابتدائی ایام میں جبکہ قرآن کریم کی فصاحت و بلاغت نے ہر شاعر و غیر شاعر کو اپنی طرف متوجہ کر رکھا تھا۔ انسانی کلام کی طرف چنداں توجہ نہیں کی گئی۔ بلکہ جب مسلمان کلام الٰہی پر اچھی طرح حاوی ہو گئے اور مخالفین اسلام کی مدافعت اور غزوات سے بھی ایک حد تک فرصت ملگئی تو کلام الٰہی کی روشنی میں عربی شاعروں کے دیوانوں کی چھان بین اور ان پر نقد و تبصرہ کا سلسلہ شروع ہوا۔ اور سو سال کے اندر اندر عہد عباسی کے ابتدائی دور میں یہ فن اپنی ترقی کے آخری زینے تک پہنچ گیا۔

اس کے بعد جیسے جیسے عربوں میں عجمی تمدن و تہذیب کا دخل ہوتا گیا۔ ان کی زبان بھی عجمیت سے متاثر ہونے لگی۔ صرف یہی نہیں کہ عربی کے عجمی شاعروں کی زبان خراب تھی بلکہ ان کے اثر سے خاص عربوں میں بھی پہلی سی وہ فصاحت و بلاغت اور ان کی امتیازی سادگی باقی نہ رہی۔ اور اس طرح لفظی اور بلاغتی غلطیوں کی وجہ سے زیادہ تر لفظی حیثیت ہی سے نقد و تبصرہ ہونے لگا۔ اور صحابہ کرامؓ یا تابعینؒ نے اس فن کے ذریعے سے شعر و شاعری میں اخلاقیات داخل کرنا اور اشعار سے اصلاح قوم کا جو کام لینا شروع کیا تھا اس کا سلسلہ تقریباً بند ہو گیا بلکہ اس کے ساتھ ہی حقیقی معنوں میں عربوں کے سیدھے سادے معنوی نقد کا دور ختم ہو گیا۔

آج بھی ہم دیکھتے ہیں کہ شعر سے ایک طرف سلطنتیں پلٹ جاتی ہیں تو دوسری طرف اس سے ذہنیتیں بدل جاتی ہیں۔ اور لبا اوقات تو اس کا نشہ اتنا زبردست ہوتا ہے کہ بادۂ کہن سے بھی اتنی کیفیت نہیں حاصل ہو سکتی۔ شعر کے اس جادو بھرے اثر سے عرب مدتوں سے واقف تھے۔ صحبت نبوی صلعم کی تربیت کے بعد انہوں نے اس کو گمراہی اور کذب و افترا کی نشر و اشاعت کا ذریعہ اور بغض و عداوت کا باعث رہنے دینے کے بجائے لوگوں کے دلوں میں حسن اخلاق اور حق و صداقت کا بیج بونے کا ذریعہ بنالیا۔ اور اس طرح جو قوت دارِ جلجل جیسی شرمناک صحبتوں کے شرمناک واقعات کے فکر کرنے میں صرف ہوتی تھی وہ حکمت اور فلسفۂ الٰہی اور درس اخلاق کے نظم کرنے میں خرچ ہونے لگی۔ سوق عکاظ اور دوسرے میلوں کے مشاعرے۔ سوقیانہ شاعری کے بلند بانگ مقابلے۔ عریاں نگاری اور بے حیائی کے مظاہرے بند ہو گئے۔ شاعروں اور ان کے راویوں کے جو ترانے پہلے مختلف قبیلوں میں آتش فساد مشتعل کر دیا کرتے تھے۔ ان کا جو تغزل پہلے کنواروں اور کنواریوں کے جذبات شہوانی میں ہیجان برپا کر دیتا تھا۔ وہی اب ان کو اخلاق و مروت کا درس دینے لگا۔ اسی سے اب ان کے کینہ بھرے سینوں میں خلوص و محبت کا سمندر ٹھاٹھیں مارنے لگا۔ پہلے شاعروں کو اپنی زبردستی کی محبوبہ کو آفتاب کی روشنی میں اس کی ہجولیوں کے سامنے ننگا کر کے اس کے حسن محبوب کی ایک ایک کیفیت ٹیلے پر کھڑے ہو کر بھرے میلے کے سامنے بیان کرنے پر جو داد ملا کرتی تھی اب وہ کلمۂ حق اور فلسفۂ الٰہی کی تفسیر پر ملنے لگی۔ جب داد دینے والے اور نقد و تبصرہ کرنے والے ہی بدل جائیں تو کون کہہ سکتا ہے کہ شاعر نہ بدل جائیں گے۔ ان کی نکیل تو دراصل ناقدوں اور داد دینے والوں ہی کے ہاتھ میں ہوتی ہے۔ اگر ان کا ذوق نکھرا ہوا ہو تو غیر ممکن ہے کہ ان کے عہد میں کوئی بدمذاق یا لغوگو شاعر پنپ سکے۔

حضرت عمرؓ نے ایک بار بنی غطفان کے وفد سے گفتگو فرماتے ہوئے پوچھا کہ یہ شعر کس نے کہا ہے:-

حَلَفْتُ فَلَمْ اَتْرُکْ لِنَفْسِکَ رِیْبَۃً

وَلَیْسَ وَرَاءَ اللّٰہِ لِلْمَرْءِ مَذْھَبُ

میں نے تو خدا کی قسم کھائی اور تمہارے لئے شک کی گنجائش چھوڑی ہی نہیں۔ اور حقیقت تو یہ ہے کہ آدمی کے لئے اللہ کے سوا اور کسی طرف جانے کا راستہ ہی نہیں ہے۔

ارکانِ وفد نے جواب دیا کہ یہ شعر نابغہ ذبیانی کا ہے۔ پھر آپ نے دریافت کیا کہ اور یہ کس نے کہا ہے:۔

أتيتك عاريا خلقا ثيابي — على وجل تظن بي الظنون
فألفيت الأمانة لم تخنها — كذلك كان نوح لا يخون

میں پھٹے پرانے کپڑوں میں بے ستری کی حالت میں ڈرتا ڈرتا تمہارے پاس پہنچا۔ (میری بدحالی کی وجہ سے) میرے متعلق طرح طرح کی بدگمانیاں کی جارہی تھیں (اور تم میری امانت کو دبا لیتے تو نہ میں خود وصول کرسکتا تھا اور نہ دوسرے اس میں میری امداد کرسکتے تھے۔ مگر) میں نے اپنی امانت جوں کی توں پائی اور تم نے اس میں ذرا بھی خیانت نہیں کی۔ حضرت نوح بھی اسی طرح کسی کی امانت میں خیانت نہیں کیا کرتے تھے۔

انہوں نے جواب دیا کہ یہ اشعار بھی نابغہ ہی کے ہیں۔ آپ نے فرمایا کہ وہ تمہارے شاعروں میں سب سے بڑا شاعر ہے (ہو أشعر شعرائكم)

کسی شاعر کو دوسرے شاعروں کے مقابلے میں فضیلت دینا بھی دراصل نقدِ شعر ہی میں داخل ہے کیونکہ اس کا مطلب بھی یہی ہوتا ہے کہ اس کے اشعار دوسروں کے اشعار سے اچھے ہیں حضرت عمرؓ کے اسی نقد سے معلوم ہو سکتا ہے کہ ابتداء اسلام میں نقد شعری کا معیار کیا تھا اور کس قسم کے اشعار پسندیدگی کی نگاہ سے دیکھے جاتے تھے۔ اور اصحابِ نظر ایسے اشعار کی کتنی داد دیتے تھے جن میں کسبِ فضائل اور ترکِ رذائل کے لئے برانگیختہ کیا گیا ہو۔

اس قسم کی اخلاقی شاعری سے مسلمانوں کی دلچسپی اس لئے اور بھی بڑھ گئی تھی۔ کہ بعض اوقات شاعروں کی بروقت فکر۔ قوم اور رہنمایانِ قوم کو بڑی بڑی غلطیوں اور نقصانوں سے بچا لیتی تھی۔ حضرت عمرؓ علمیت فقاہت اور سیاست میں اپنا ثانی نہیں رکھتے تھے مگر بسا اوقات وہ بھی شاعروں کی یاد دہانی اور شعر کے اثر سے متاثر ہو جایا کرتے تھے۔ مالک بن انسؓ روایت کرتے ہیں کہ حضرت عمرؓ کے عہد خلافت میں عمال حکومت کے پاس بے انتہا دولت جمع ہو گئی تھی۔ رعایا کو یہ بات بُری معلوم ہوئی اور ایک شاعر نے دربار خلافت میں یہ اشعار لکھ بھیجے:۔

نحج إذا حجوا ونغزو إذا غزوا
فأنى لهم وفر ولسنا بذي وفر

إذا التاجر الهندي جاء بفأرة
من المسك راحت في مفارقهم تجري
فدونك مال الله حيث وجدته
سيرضون إن شاطرتهم منك بالشطر

وہ (عمال حکومت) حج کرتے ہیں تو ہم بھی حج کو جاتے ہیں وہ جنگ میں شریک ہوتے ہیں تو ہم بھی شریک ہوتے ہیں (احکام اسلام پر عمل کرنے میں ہم اور وہ برابر ہیں) مگر ان کے پاس مال و دولت بہت زیادہ ہو گئی ہے اور ہم غریب کے غریب ہی ہیں۔

ہندوستانی تاجر مشک نافہ لیکر پہنچ جاتا ہے تو ان کی مانگیں مشک ہی مشک سے بسی رہتی ہیں۔

اللہ کا مال آپکو جہاں بھی ملے اس پر قبضہ کرلیں اگر آپ اپنے عاملوں کی دولت تقسیم کرکے نصف خود (بیت المال میں) لے لیں تو رعایا کی خوشی کا باعث ہوگا۔

حضرت عمرؓ نے یہ اشعار سنکر زبانی داد تو نہیں دی مگر اس پر عملی نقد یوں کیا کہ شاعر کی آرزو کے مطابق تمام وابستگان خلافت کی نصف دولت بیت المال میں داخل کر لی۔

حضرت علیؓ ذیل کے شعر کو بیحد پسند فرمایا کرتے تھے اور میدان کارزار میں جاتے وقت اکثر پڑھا کرتے تھے۔

أي يومي من الموت أفر — يوم لا يقدر أم يوم قدر
يوم لا يقدر لا أرهبه — ومن المقدور لا ينجي الحذر

موت سے بچنے کے لئے کس دن کو بھاگ سکتا ہوں جس روز اجل مقرر نہیں اس دن سے یا جس روز مقرر ہے اس سے؟

تقدیر میں جس دن مرنا نہیں ہے اس دن کا مجھے کوئی خوف ہی نہیں اور جس دن مقدر ہے اس روز میرا خوف اور میرا کترانا موت سے مجھے بچا ہی نہیں سکتا۔ (باقی آئندہ)

تاجور

قسمت

فرعونِ مصر کے شاہی محل کے دروازے کے آگے دو سپاہی گشت کر رہے ہیں کچھ وقفے کے بعد دونوں ٹھہر جاتے ہیں۔

پہلا سپاہی۔ ہوا بند ہے۔ دن کا سانس گھٹتا ہوا معلوم ہوتا ہے۔

دوسرا۔ میرا جی چاہتا ہے جس وقت پھلوں سے لدے ہوئے درخت دریائے نیل پر اپنا گہرا سایہ ڈالیں تو میں اس کی ٹھنڈی لہروں میں اپنے آپ کو غرق کر دوں۔

پہلا۔ شاید بجلی کڑکے گی۔ یا کوئی بادشاہی خاندان برباد ہوگا۔

دوسرا۔ شام کو کچھ ٹھنڈک ہو جائے گی۔ فرعون کہاں ہے؟

پہلا۔ اپنی سنہری کشتی میں دریا کی سیر کر رہا ہوگا۔ یا اپنے سپہ سالاروں سے آئندہ لڑائیوں کے متعلق مشورہ کرنے میں مصروف ہوگا۔

ابھی ستارے اس پر رحم کرتے ہیں۔ ابھی ستاروں نے اُسے آزاد چھوڑ رکھا ہے۔

دوسرا۔ تم نے یہ کیا کہا؟ ستارے اس پر رحم کرتے ہیں؟ ستاروں نے اسے آزاد چھوڑ رکھا ہے؟

پہلا۔ میں نے یہ اس لئے کہا ہے۔ کہ جب ستارے کسی بادشاہ کو سزا دیتے ہیں تو اس کا تمام ملک۔ اس کی تمام رعیت اس سزا میں شریک ہوتی ہے۔ اس کے ارد گرد کی چیزیں بھی فنا ہو جاتی ہیں۔ اس کا محل زمین پر آ رہتا ہے۔ اس کے مکانوں اور قلعوں کی دیواریں گر پڑتی ہیں۔ جنگل سے بندر پھلانگتے ہوئے شہر میں آ جاتے ہیں۔ صحراؤں سے وحشی درندے نکل آتے ہیں۔ ایسا معلوم ہوتا ہے۔ گویا کبھی کوئی بادشاہ تھا ہی نہیں۔

دوسرا۔ لیکن ستارے بادشاہ کو کیوں سزا دیں گے۔

پہلا۔ اس لئے کہ اس نے کبھی ستاروں کو خوش رکھنے کی کوشش نہیں کی۔

دوسرا۔ ہاں میں نے اس کے متعلق یہ بات اور لوگوں سے بھی سُنی ہے

پہلا۔ کیسے ہو سکتا ہے۔ کہ کوئی شخص ستاروں کی پروا نہ کرے۔ طاعون۔ زلزلے۔ بجلیاں۔ سب بلائیں انہیں کے اختیار میں ہیں۔ بادشاہ کے ساتھ ہر وقت دوسرے ملکوں کے سفیر موجود رہتے ہیں۔ اس کے سپہ سالار دور دور سے اس کے قانون ساز دار الخلافے میں آ کر قانون بناتے ہیں۔ لیکن ستاروں کے رازدار۔ ستاروں کے عالم۔ ستاروں کو جاننے والے کبھی نہیں دیکھے جاتے۔

دوسرا۔ سنو! کیا یہ بجلی کا کڑکا تھا؟

پہلا۔ یقین کرو۔ ستارے فرعون سے ناخوش ہیں۔

ایک اجنبی داخل ہوتا ہے۔ وہ فرعون کے دروازے تک پہنچنا چاہتا ہے۔ سپاہی اپنے بھالے اونچے کر لیتے ہیں۔

دونوں۔ جاؤ۔ واپس چلے جاؤ۔

اجنبی۔ کیوں؟

پہلا سپاہی۔ فرعون کے دروازے کو ہاتھ سے چھونا موت ہے۔

اجنبی۔ میں مصر کے جنوبی حصے سے آیا ہوں۔ اور اجنبی ہوں۔

پہلا سپاہی۔ اجنبی بھی اُسے نہیں چھو سکتا۔ وہ بھی مارا جائے گا۔

اجنبی۔ تمہارا دروازہ حیرت انگیز طور پر مقدس ہے۔

اجنبی واپس چلا جاتا ہے۔

دو بچے داخل ہوتے ہیں۔

لڑکا (سپاہی سے) میاں سپاہی میں فرعون سے ایک گیند مانگنا چاہتا ہوں۔

سپاہی مسکراتا ہے

لڑکا دروازے کو دھکیلتا ہے۔

(لڑکی کی طرف مخاطب ہو کر)

میں دروازہ نہیں کھول سکتا۔

(سپاہی سے) میں گیند دروازے ہی سے نہ مانگ لوں؟

سپاہی۔ ہاں ٹھیک ہے۔

—۔ دوسرے سپاہی کی طرف مخاطب ہوتا ہے۔

پہلا سپاہی۔ راستے میں کوئی نظر آتا ہے۔

دوسرا۔ (آنکھوں پر ہاتھ سے سایہ کرتے ہوئے) نہیں۔ دور میدان میں ایک کتا نظر آ رہا ہے۔ اور بس۔

پہلا۔ تو آؤ۔ ذرا بیٹھیں اور کھانا کھا لیں۔

لڑکا۔ دروازے! دروازے! مجھے گیند دے۔

سپاہی کھانا کھاتے ہیں۔

لڑکی۔ (سپاہی کی طرف اشارہ کر کے۔) میرے ابا اس سے زیادہ لمبے ہیں۔

لڑکا۔ میرے ابا لکھ سکتے ہیں۔ مجھے بھی انھوں نے لکھنا پڑھنا سکھایا ہے۔

لڑکی۔ کوئی لکھنے پڑھنے سے نہیں ڈرتا میرے ابا سپاہی ہیں۔
لڑکا۔ میرے پاس ایک سونے کا ڈلہ ہے۔ میں نے ندی میں سے نکالا تھا
لڑکی۔ میرے پاس ایک نظم ہے۔ میں نے اپنے دماغ سے نکالی ہے۔
لڑکا۔ کیا یہ نظم لمبی ہے۔
لڑکی۔ نہیں۔
لڑکا۔ بھلا سناؤ تو
لڑکی۔ (پڑھتی ہے)

اِک نغمہ ریز طائر۔ پر جسکے ارغواں تھے
عرش بریں کی جانب۔ پرواز کر گیا ہے۔

لڑکا۔ "مر گیا ہے"
لڑکی۔ یہ میری نظم کے مصرعوں سے چھوٹا مصرع ہے۔
لڑکا۔ کیا ہرج ہے!
لڑکی۔ تمہیں میری نظم پسند آئی؟
لڑکا۔ پرندے ارغوانی نہیں ہوتے۔
لڑکی۔ لیکن میرے والد کا پرندہ تو ارغوانی ہی تھا۔
لڑکا۔ اوہ!
لڑکی۔ تمہیں میری نظم پسند نہیں؟
لڑکا۔ کیوں نہیں!
لڑکی۔ تم غلط کہتے ہو۔ تمہیں یہ نظم ذرا بھی بھلی نہیں معلوم ہوتی۔
لڑکا۔ نہیں نہیں۔ مجھے یہ بہت بھلی معلوم ہوتی ہے۔
لڑکی۔ تو پھر تم نے کہا۔ کیوں نہیں؟ میں جانتی ہوں۔ تم اس کو پسند نہیں کرتے۔
لڑکا۔ لو میں تمہیں خوش کرنے کے لئے نظم دیوار پر لکھ دیتا ہوں خفگی جانے دو۔
لڑکی۔ تم لکھ سکتے ہو؟
لڑکا۔ ہاں میں لکھ سکتا ہوں۔
لڑکی۔ تو ضرور لکھو۔ دیکھوں بھلا دیوار پر لکھی ہوئی میری نظم کیسی معلوم ہوتی ہے۔

لڑکا نظم لکھنے میں مصروف ہو جاتا ہے۔ لڑکی دیکھ رہی ہے۔

پہلا سپاہی۔ عنقریب کسی اور ملک سے ہماری لڑائی چھڑ جائیگی۔
دوسرا سپاہی۔ معمولی سی لڑائی ہوگی۔ پہاڑی قوموں سے ہم ہمیشہ لڑتے رہے ہیں۔ لیکن معرکے کی جنگ کوئی نہیں ہوئی۔
پہلا۔ جب کوئی شخص لڑائی کے لئے جاتا ہے۔ تو اس کی آنکھوں اور مستقبل کے درمیان پردے زیادہ گہرے ہو جاتے ہیں۔ کون کہہ سکتا ہے۔ کہ لڑائی کس طرح شروع ہوگی اور کس طرح ختم ہوگی۔ کتنے آدمی کام آئینگے۔ کیا نتیجہ ہوگا۔
دوسرا۔ لیکن پہاڑی قوموں سے تو جو بھی لڑائی ہو۔ اسے معرکے کی جنگ نہیں کہنا چاہئے۔
پہلا۔ ہاں، لیکن کبھی کبھی دیوتا ہنستے ہیں۔
دوسرا۔ کس پر ہنستے ہیں۔
پہلا۔ بادشاہوں پر۔
دوسرا۔ نہیں پہاڑی لوگوں سے لڑائی کا اتنا کیوں فکر ہے۔
پہلا۔ اس لئے کہ ہمارے فرعون کے پاس اپنے باپ دادا سے زیادہ دولت جمع ہو گئی ہے۔ اس کے پاس ان گنت جنگی گھوڑے ہیں۔ لاتعداد خزانہ ہے بیشمار فوج ہے۔ فرعون بہت طاقتور ہو گیا ہے۔
دوسرا۔ تو وہ پہاڑی لوگوں کو بہت جلدی مغلوب کر لے گا۔
پہلا۔ جب بادشاہ بہت طاقتور ہو جاتے ہیں۔ تو ستارے رشک کرتے ہیں۔

لڑکا۔ لو میں نے تمہاری نظم لکھدی۔
لڑکی۔ سچ مچ۔
لڑکا۔ میں تمہیں سناتا ہوں۔

محل کی دیوار پر لکھی ہوئی نظم پڑھتا ہے۔

اک نغمہ ریز طایر
پر جس کے ارغواں تھے
عرش بریں کی جانب
پرواز کر گیا ہے
مر گیا ہے!!

لڑکی۔ آخری مصرع چھوٹا ہے۔
لڑکا۔ کیا ہرج ہے!

دبے پاؤں ایک سپاہی داخل ہوتا ہے۔
پھر یکایک غایب ہو جاتا ہے۔

لڑکی۔ اُف۔ میں تو ڈر گئی۔
لڑکا۔ کیوں؛ وہ تو ایک معمولی سپاہی تھا۔
لڑکی۔ مجھے سپاہی بڑے معلوم ہوتے ہیں۔
لڑکا۔ تو آؤ۔ گھر بھاگ چلیں۔
سپاہی (بچوں کو دیکھکر) بچو۔ بھاگ جاؤ۔ فرعون آرہا ہے۔ وہ تمہیں کھا جائے گا۔

لڑکا سپاہی کی طرف ایک پتھر پھینک کر بھاگ جاتا ہے لیکن سپاہی

داخل ہوتا ہے۔ دیوار پر لکھی ہوئی نظم پڑھ کر اُلو کی طرح چیخ مارتا ہے۔ ایک دوسرا سپاہی آجاتا ہے۔ نظم پڑھ کر وہ بھی چیخ اٹھتا ہے۔ پھر دونوں خاموش ہو جاتے ہیں۔

فرعون مصر اور حاجب داخل ہوتے ہیں۔

فرعون نے ایک ارغوانی قبا پہنی ہوئی ہے۔ سپاہی اپنے بھالوں کو بائیں ہاتھ میں تھام لیتے ہیں۔ اور پھرتی سے جنگی سلام کرتے ہیں۔

پہلا سپاہی۔ (فرعون کے قدموں پر جھک جاتا ہے۔)

شہنشاہ زماں: دروازے پر کچھ لکھا ہوا ہے؛

حاجب۔ انہی دروازے پر!

فرعون کسی احمق کا کام ہے۔ کل سے آج تک یہاں کون کون آیا ہے۔

پہلا سپاہی۔ (سوچ کر) کوئی نہیں۔ عالیجاہ۔ صرف جنوبی مصر کا ایک اجنبی آیا تھا۔

فرعون۔ کیا اُس نے دروازے کو چھوا تھا؛

سپاہی۔ نہیں عالیجاہ۔ وہ چاہتا تھا۔ کہ دروازے کو چھوئے لیکن ہم نے اُسے اپنے بھالوں سے پیچھے دھکیل دیا تھا۔

فرعون۔ وہ کہاں تک آیا تھا؛

پہلا سنتری۔ ہمارے بھالوں کی زد میں آچکا تھا۔

فرعون۔ تمہیں کچھ معلوم ہوا۔ کہ وہ دروازے کو کیوں چھونا چاہتا تھا۔

سپاہی۔ نہیں عالی جاہ۔

فرعون۔ وہ کس طرف کو گیا تھا۔

سپاہی۔ (اشارہ کرتے ہوئے) اِس طرف!

بادشاہ ایک سپاہی کے کان میں کچھ کہتا ہے۔ سپاہی واپس چلا جاتا ہے۔

فرعون۔ (باقی ماندہ سپاہیوں سے مخاطب ہو کر)
اِس تحریر کے کیا معنی ہیں۔

ایک سپاہی۔ عالیجاہ۔ ہم نہیں پڑھ سکتے۔

فرعون۔ سپاہی کو ہمہ دان ہونا چاہیئے۔

دُوسرا سپاہی۔ عالیجاہ۔ ہم نگرانی کرتے ہیں۔ حفاظت کرتے ہیں ہم سال کے معنی جانتے ہیں۔ قدموں کے نشان پہچانتے ہیں۔ اور پُراسرار جگہوں میں جو باتیں چُپکے چُپکے ہوتی ہیں۔ انہیں بھی سن لیتے ہیں۔ لیکن ہم پڑھ نہیں سکتے۔

فرعون۔ (حاجب سے) دیکھو۔ یہ کیا لکھا ہے۔

حاجب۔ (پڑھکر) عالیجاہا۔ یہ صریح بغاوت ہے۔ تحریر تمام باغیانہ ہے۔

فرعون۔ پڑھو۔

حاجب پڑھتا ہے۔

ایک نغمہ ریز طائر
پر جس کے ارغواں تھے
عرش بریں کی جانب
پرواز کر گیا ہے
"مر گیا ہے"

سپاہی۔ (اپنے آپ سے) ستاروں نے فیصلہ سنا دیا۔

فرعون۔ اجنبی کے علاوہ کوئی اور بھی یہاں آیا تھا۔

سپاہی۔ (جھک کر) نہیں عالیجاہ۔ کوئی نہیں۔

فرعون۔ تم نے اور کچھ نہیں دیکھا۔

سپاہی۔ نہیں۔ عالیجاہ۔

حاجب۔ عجیب ماجرا ہے۔

فرعون۔ شاید یہ کوئی غیبی اور پُراسرار پیغام ہے جو میری تنبیہ کے لئے بھیجا گیا ہے۔

حاجب۔ تحریر باغیانہ ہے۔

فرعون۔ یہ پیغام ستاروں کا ہے۔

حاجب۔ نہیں۔ عالی جاہ۔ یہ ستاروں کا نہیں۔ کسی انسان کا کام ہے، تاہم تحریر کا مطلب سمجھنے کی کوشش ضروری ہے۔ ارشادِ عالی ہو تو ستاروں کے عالم طلب کئے جائیں۔

فرعون سپاہیوں کو اپنے قریب طلب کرتا ہے۔

فرعون۔ جاؤ۔ ستاروں کے رازداروں کو بلا لاؤ۔ (حاجب سے مخاطب ہو کر) شاید اب ہم کبھی نیل کی سیر نہ کر سکینگے۔ معلوم ہوتا ہے۔ کہ ہم نے ستاروں کی نسبت اپنی رعیت کا خیال زیادہ رکھا ہے۔ اور جوئے کہکشاں پر جوئے نیل کو ترجیح دی ہے۔

حاجب۔ عالی جاہا۔ یہ تحریر کسی احمق نے لکھی ہے۔ حضور پر نور کے سپاہی اس باغی کو گرفتار کر لینگے۔ اور پھر یہ تمام پریشانی رفع ہو جائے گی۔

فرعون۔ شاید۔ مگر سپاہیوں نے کسی شخص کو یہ تحریر لکھتے ہوئے نہیں دیکھا۔

حاجب۔ دیکھئے حضور والا۔ وہ دو عالم آرہے ہیں۔ وہ حضور کی تشفی کر دیں گے۔

دو عالم داخل ہوتے ہیں۔ ان کے ساتھ ایک بچہ بھی ہے۔

فرعون۔ کسی فتنہ پرداز نے میرے دروازے پر کچھ شعر لکھ دئیے ہیں۔ اور ہم نے آپکو طلب کیا ہے۔ کہ آپ دیکھیں آیا ان اشعار میں کوئی معنی ہیں؛

حاجب۔ بے معنی تحریر!

عالم تحریر کا مطالعہ کرتے ہیں۔

پہلا عالم۔ بچے اِدھر آ۔ جا ہمارے سرخ جبے لے آ۔ کون کہہ سکتا ہے۔ کہ تحریر کا مطلب کیا ہوگا۔ شاید ایسا ہو کہ ستاروں نے فرعون کو مسرت اور کامیابی کا پیغام بھیجا ہو۔ اور دیکھ ہماری سبز قبائیں بھی لیتا آ۔ شاید ستاروں نے فرعون کو ان نئی خوبصورت چیزوں سے آشنا کرنا چاہا ہو۔ جو اسے آئندہ حاصل ہونے والی ہیں۔ سن بچے۔ ہمارے سیاہ ملبوس بھی لیتا آ۔ ہو سکتا ہے۔ کہ ستاروں نے فرعون کی تقدیر کا فیصلہ کر دیا ہو۔

پہلا عالم۔ (تحریر کو غور سے پڑھتا ہے)

ستاروں نے اپنا فیصلہ صادر کر دیا۔ تحریر خالص سونے سے لکھی ہوئی ہے۔

پہلا عالم سیاہ لباس پہن لیتا ہے۔

فرعون۔ کیا کہتے ہیں ستارے؟

پہلا عالم۔ کچھ پتا نہیں۔ لاہی۔ لاہی۔ الیرکھٹوں۔ الیاب۔ ایرلیولز۔ چلا جاتا ہے۔

فرعون۔ (دوسرے عالم سے) آپ دیکھئے کیا کہتے ہیں ستارے؟

دوسرا عالم۔ (تحریر پڑھتا ہے)

ستاروں نے اپنا فیصلہ صادر کر دیا۔

فرعون۔ کیا کہتے ہیں ستارے؟

دوسرا عالم۔ کچھ پتا نہیں۔ لاہی لاہی۔ لاری مونز۔ الیاب۔ ایرلیولز۔

فرعون۔ لو عالموں نے سیاہ لباس پہن لئے۔ اب لوگ انکو دیکھینگے تو انہیں معلوم ہو جائے گا۔ کہ ستارے مجھ سے ناخوش ہیں۔

حاجب۔ عالیجاہا۔ میں ستاروں کے سب سے بڑے عالم کو طلب کرتا ہوں۔ حضور تسلی رکھیں۔ اس تحریر کا مطلب ضرور حل ہو گا۔

فرعون۔ کہیں ایسا نہ ہو۔ کہ وہ بھی ان دونوں کی طرح سیاہ کپڑے پہنکر۔ سر جھکا کر۔ واپس چلا جائے۔ کاش مجھے معلوم ہو جائے کہ میری تقدیر میں کیا لکھا ہے۔

حاجب۔ عالیجاہا۔ یقین فرمائیے کہ یہ کام کسی بیوقوف کا ہے جس نے محنت سے جمع کئے ہوئے سونے کے ڈلے حماقت سے ضائع کر دیئے ہیں۔

فرعون۔ آہ! میں نے ویران اور بنجر زمینوں کو آباد کیا۔ جہاں وحشی درندے بستے تھے۔ وہاں انسانوں کو بسایا۔ میں نے اپنے ملک کی حدیں لڑائیوں سے وسیع کیں۔ اور رعیت کو امن کی برکتوں سے بہرہ ور کیا۔ میں نے دانشمندانہ قانون وضع کئے۔ کہ میری رعیت خوش رہے۔ اور ستارے مجھ سے ناخوش ہو گئے۔ آہ!

ستاروں کا سب سے بڑا عالم داخل ہوتا ہے۔

فرعون۔ یہ تحریر پڑھو اور مجھے اس کا مطلب سمجھاؤ۔ میں تمہاری گردن میں فیروزے کا ہار ڈالونگا۔ اور ان نیلموں سے مالامال کر دونگا۔ جو میرے ملک کی سرحد پر برف سے منجمد پہاڑوں میں دفن ہیں۔

عالم سیاہ لباس پہن لیتا ہے۔

عالم۔ کون ہے۔ جس کا لباس ارغوانی رنگ کا ہے۔

فرعون۔ کون ہے جو آسمان کی طرف پرواز کر رہا ہے۔

فرعون۔ کون ہے جس نے ستاروں کو فراموش کر رکھا ہے۔

فرعونِ مصر!

فرعون۔ یہ تحریر کس نے لکھی ہے۔

عالم۔ کسی دیوتا نے۔ خالص سونے سے لکھی ہے۔

کسی ایسے دیوتا نے جو امیر ستاروں میں رہتا ہے۔

پہلا سپاہی۔ (اپنے آپ سے) کل ایک ستارہ شعلہ برساتا ہوا زمین کی طرف گر رہا تھا

عالم۔ لاہی۔ لاہی۔ لاری مونز۔ الیاب۔

فرعون۔ میں نے اپنی رعایا کو خوشحال رکھا ہے۔ ستارے کیوں مجھ سے خفا ہیں۔ میرا ثانی روئے زمین پر کوئی نہیں۔ آئندہ نسلیں کہینگی۔ فرعون مصر کو کوئی انسانی طاقت نہ مٹا سکی۔ آخر ستاروں نے ایک دیوتے کو بھیجا۔

عالم۔ ستاروں کو فراموش کرنا گناہ ہے۔ بہت اچھا تھا۔ اگر فرعون رعیت کی بجائے ستاروں کا زیادہ خیال رکھتا۔

فرعون۔ میں ستاروں کو قربانی دینے کے لئے تیار ہوں۔ اگر ستارے اپنا فیصلہ بدل دیں۔ تو میں ٹمٹماتے ہوئے تاروں کو ایک حسین لڑکی قربانی چڑھاؤں گا۔ اور دوسرے تاروں پر ایک تنومند لڑکے کا خون قربان کرونگا۔ سنا جاتا ہے۔ ستارے بچوں کو پیار کرتے ہیں۔

عالم (ملازموں سے)

قربانی کے چاقو تیز کرو۔

(دوسرے عالموں سے) قربانی کا پتھر لے آؤ۔

فرعون۔ کیا یہ قربانی کافی ہو گی۔

عالم۔ شاید۔

فرعون۔ تو ممکن ہے۔ کہ اس قربانی کے باوجود ستاروں کا حکم بحال رہے

عالم۔ ہو سکتا ہے، بہتر ہو گا۔ اگر فرعون بچوں کے خون سے زیادہ قیمتی چیز کی قربانی کرے۔

فرعون۔ کس شئے کی؛

عالم۔ اپنے غرور کی۔

فرعون۔ کس طرح؟

عالم۔ اپنے تاج کی قربانی کرو۔ کیونکہ تمہیں صرف اسی تاج کے غرور کی وجہ سے سزا مل رہی ہے۔

فرعون۔ میں بسر چشم تیار ہوا۔ میں اپنا تاج قربانی کے پتھر پر رکھ کر جلا دونگا۔ اور تمام عمر بغیر تاج کے بادشاہت کرونگا۔

عالم۔ نہیں۔ اس تاج کو آہنی دروازے کے پاس رکھ دو۔ جب عذاب کا دیوتا رات کو تمہیں سزا دینے کے لئے آئیگا۔ تو وہ اس تاج کو دیکھیگا۔ شاید اس کے دل میں رحم آ جائے۔ کیونکہ تم نے اپنے سر سے اس مایۂ غرور کو اتار کر ستاروں کی نذر کر دیا ہے۔

فرعون۔ تاج اتار کر پتھر پر رکھ دیتا ہے۔ پھر عصائے شاہی بھی وہیں رکھ دیتا ہے۔

فرعون۔ اے تاج سلطنت۔ خدا حافظ۔ بادشاہوں نے تیری تمنا کی ہے۔ ستاروں نے تجھ پر رشک کیا ہے۔ خدا حافظ۔

عالم۔ دیکھو ستاروں سے انکار کرنے والا آفتاب غروب ہو گیا ہے۔ دیوتا زمین پر اترنے والے ہیں۔ چلو۔ یہاں سے لوٹ چلیں۔

فرعون۔ (سپاہیوں سے) دیکھو۔ تمام رات کسی شخص کو تاج کے قریب نہ آنے دو۔

سپاہی۔ ایسا ہی ہوگا۔ عالیجاہا۔

پہلا سپاہی۔ فرعون پر ستاروں کی بجلی گرنے والی ہے۔ چلو بھاگ چلیں۔

دوسرا سپاہی۔ اگر ستاروں نے تاج کو قبول نہ کیا تو کیا ہوگا۔

پہلا۔ مصر برباد ہو جائے گا۔ ایسا معدوم ہوگا۔ گویا کبھی کوئی بادشاہ تھا ہی نہیں۔

دونوں بھاگ جاتے ہیں۔

لڑکا داخل ہوتا ہے۔

دروازے! دروازے! میرا گیند دے۔

لڑکا دروازے کے پاس جاتا ہے۔ تاج کو دیکھکر متحیر رہ جاتا ہے۔ پھر عصائے شاہی کو اٹھا لیتا ہے۔ اور اس سے تاج کو گیند کی طرح لڑھکاتا ہوا لے جاتا ہے۔

دو سپاہی داخل ہوتے ہیں۔ تاج کو نہ دیکھکر متحیر رہ جاتے ہیں۔

پہلا۔ دیوتا زمین پر اتر آئے۔

دونوں بھاگ جاتے ہیں۔

فرعون۔ اور حاجب داخل ہوتے ہیں۔

فرعون۔ ستارے خوش ہیں۔ انہوں نے میری نذر قبول کرلی۔

عابد

ہو گیا اب دلِ گم گشتہ کا ملنا معلوم
خاک اڑتی نظر آتی ہے جدھر جاتے ہیں

دُودِ دل کا شبِ فرقت میں کچھ انداز نہ پوچھ
تیرے گیسو مرے شانوں پہ بکھر جاتے ہیں

مجھ گرفتارِ بلا کو یہ بتا دے کوئی؛
زندہ رہتے ہیں محبت میں کہ مر جاتے ہیں

موجِ رفتار اگر تیغ نہیں ہے تو کیا ہے
جب وہ جاتے ہیں تو بسمل مجھے کر جاتے ہیں

ہے محبت میں یہ کس رات کی آمد یارب
شامِ غربت نظر آتی ہے جدھر جاتے ہیں

وصلِ دلدار کی بیباک تمنا کیسی
خارِ حسرت بھی کھٹکتا ہے تو ڈر جاتے ہیں

بیباک
شاہجہانپوری

انسانی عقل تجربے کی کسوٹی پر

نفس لوجی (علم النفس) کے ماہر ہمیشہ عقل کی تحلیل اور آزمائش میں لگے رہتے ہیں۔ اور بسا اوقات ان کے تجربے کے ایسے نتائج برآمد ہوتے ہیں جو ہمارے گمان اور مشہور خیالات کے بالکل خلاف ہوتے ہیں۔ ڈاکٹر لیرڈ نے جو اس فن کے ماہر سمجھے جاتے ہیں۔ اپنے ایک مضمون میں ذیل کے چند نتائج کا ذکر کیا ہے :۔

۱۔ عام طور پر مشہور ہے کہ جلد بازی سے کام خراب ہو جاتا ہے مگر عقلی کاموں میں تجربہ اس کے خلاف ثابت کرتا ہے۔ کیونکہ ہم غور و فکر میں جتنی جلدی کرتے ہیں اتنا ہی مفید ثابت ہوتا ہے۔

۲۔ عام طور پر مشہور ہے کہ جس کا حافظہ اچھا ہوتا ہے اس کا ذہن اچھا نہیں ہوتا۔ مگر نفس لوجی کے ماہروں کے تجربے ثابت کر رہے ہیں کہ اچھے حافظے والے ہی ذہین ہوتے ہیں۔

۳۔ حافظہ یا ذہن کو کسی ایک موضوع میں صرف کرنا دوسرے موضوع کو کوئی فائدہ نہیں پہنچاتا۔ مثلاً ایک شخص جبر یا مقابلہ میں مشق بہم پہنچائے تو یہ مشاقی جغرافیہ اور تاریخ میں اس کی ذرا بھی مدد نہیں کر سکتی۔ اسی سے یہ بھی ظاہر ہوتا ہے کہ ہم حافظہ کو کسی ایک ہی موضوع کے لئے استعمال کر سکتے ہیں۔ اور اس کو کئی موضوع پر صرف کرنا ہمارے امکان سے باہر ہے۔

۴۔ ہر سو آدمیوں میں تین چار آدمی سُرخ اور سبز میں تمیز نہیں کر سکتے۔ اور یہ نقص عورتوں کی بہ نسبت مردوں میں زیادہ پایا جاتا ہے۔

۵۔ پڑھنے کا سب سے بہتر زمانہ ۱۶ اور ۲۵ سال کی عمر کے درمیان کا ہوتا ہے۔ مگر چالیس سال کی عمر میں بھی پڑھنے کی قابلیت بیس سال کی عمر کی بہ نسبت تھوڑی ہی سی کم ہوتی ہے۔

۶۔ دماغ کی چھوٹائی بڑائی اور شکل کو عقل کی کمی بیشی سے برائے نام تعلق ہے۔ حالانکہ مشہور یہ ہے کہ بڑے دماغ والا بڑا عقلمند ہوتا ہے۔

۷۔ قوت تقریر کو بسا اوقات قوت تحریر سے کوئی علاقہ نہیں ہوتا۔ اور ایک بہترین مقرر ممکن ہے کہ ایک سطر بھی درست نہ لکھ سکے۔

۸۔ مشاقی قوائے عقلیہ میں مزید بُعد کا باعث ہوتی ہے۔ مثلاً دو فنوں سے ناآشنا ہونے کی صورت میں اگر دونوں میں ۱۰ درجے کی دوری فرض کی جائے تو دونوں کو سیکھنے اور دونوں سے مساوی حیثیت سے آشنا ہونے کے بعد ان دونوں کی دُوری ۳۰ سے ۴۰ درجے تک بڑھ جاتی ہے۔

۹۔ ہمارا سن جتنا زیادہ ہوتا جائے ہمارے دماغ کے کیئے حیات (...) کم اور ناقص ہوتے جاتے ہیں۔ حتیٰ کہ ۱۵ سال کی عمر میں دماغ کا وزن سو گرام کم ہو جاتا ہے۔

۱۰۔ جوں جوں عمر زیادہ ہوتی جاتی ہے انسان کی قوت حافظہ اور قوت ایجاد کمزور ہوتی جاتی ہے۔

۱۱۔ عورت کے حواس مرد سے ضعیف ہوتے ہیں مگر اس کا حافظہ مرد سے قوی ہوتا ہے۔

۱۲۔ عورتوں کی بہ نسبت مردوں میں اختلاف زیادہ ہوتا ہے یعنی عقلمندی اور بیوقوفی کے اختلافات عورتوں سے مردوں میں زیادہ پائے جاتے ہیں۔

۱۳۔ بچوں کے قویٰ پر والدین کی عمر کا کوئی اثر نہیں پڑتا۔

۱۴۔ انسان کو ایک کامیاب باورچی بننے کے لئے ایک کامیاب کاشتکار بننے کی بہ نسبت زیادہ بیدار مغزی کی ضرورت ہے۔

۱۵۔ شہری سکولوں کے طلبہ دیہاتی سکولوں کے طلبہ سے زیادہ ہوشیار ہوتے ہیں حالانکہ دونوں جگہ نصاب اور تعلیم کا معیار ایک ہے۔

۱۶۔ تقریباً ہر شخص کسی نہ کسی کام میں کامیاب ہو سکتا ہے۔

۱۷۔ کسی خاص کام کے لئے ایک مناسب شخص بسا اوقات دوسرے کاموں کے لئے بالکل غیر مناسب ہوتا ہے۔ نپولین کو کسی کی ہجو کرنی نہیں آتی تھی۔ لیکن اس نے مشہور ریاضی داں وزیر کی ہجو شروع کر دی مگر اس فن میں پورا نہیں اترا۔

۱۸۔ اندھا آنکھ والوں سے زیادہ نہیں سُنتا۔

۱۹ - تقریباً ہر شخص کی عقلی قوت میں کچھ نہ کچھ ضعف ہوتا ہے۔

۲۰ - مختلف آدمیوں میں عقل کی کمی بیشی خون کے اجزا کی کمی بیشی کا نتیجہ ہوتی ہے۔

۲۱ - انسان کی ساری قوتیں بچپن سے آہستہ آہستہ نہیں بڑھتیں بلکہ بعض قوتیں ایسی حالت میں بڑھ جاتی ہیں کہ دوسری قوتیں اپنی کمزور حالت میں پڑی رہتی ہیں۔

۲۲ - ۱۲ سال کی عمر میں لڑکیوں کا ذہن یکبارگی بہت ترقی کرجاتا ہے مگر لڑکوں کا ذہن ۱۶ - ۱۷ سال کی عمر ترقی کرتا ہے۔

۲۳ - اکثر مجرموں کی عقل ناقص ہوتی ہے۔ خواہ ان کے جرم میں بظاہر کتنی ہی عقلمندی نظر آئے۔

۲۴ - گوری قوموں کی بہ نسبت کالے جلد بالغ ہوتے ہیں۔ اور ان کی عقل بھی جلد پختہ ہوجاتی ہے۔

۲۵ - بعض اوقات کسی شخص میں کلوں کے بنانے کا سلیقہ ہوتا ہے۔ پھر بھی وہ کچھ زیادہ عقلمند نہیں ہوتا۔

ص ......

غزلیات

نگاہ لطف گر اے ساقیٔ مے خانہ ہو جائے / میں بن جاؤں شرابِ ناب دل پیمانہ ہو جائے
دلِ مضطر پہ رحم آتا ہے اند ہوتی ہے وحشت بھی / کہیں رسوا نہ کردے اور خود رسوا نہ ہو جائے
کروں ایجاد وہ رنگِ محبت بزمِ دنیا میں / طریقِ راہ و رسمِ قیس اک افسانہ ہو جائے
مری مٹی میں اک برقِ تپاں ہے دیکھ کر چلنا / غبارِ راہ میں فتنہ کوئی برپا نہ ہو جائے
بقدرِ وسعتِ دل اور دنیا خلق کرتا ہوں / مگر ڈر ہے کہ دل اُس سے بھی بے پروا نہ ہو جائے

مرا جینا ہو جینا یاسؔ مرنا ہو مرا مرنا
اگر یہ زندگی صرفِ رہِ میخانہ ہو جائے

یاسؔ

جرأتِ پروانہ ہے تکمیلِ بیدادِ جنوں / لوگ کہتے ہیں کہ جوشِ ہمتِ مردانہ ہے
ذوقِ مستی سے ہیں مرے ہاتھ لرزاں ساقیا! / یا ترے ساغر کو شوقِ لغزشِ مستانہ ہے
کرچکا ہوں حشر میں اُن کی شکایت، کیا کروں / کاش وہ کہدیں خدا سے یہ کوئی دیوانہ ہے
میری توبہ محفلِ زاہد تک محدود ہے / میکدے میں دل کو پاسِ مشربِ رندانہ ہے

جنتِ امید ہے خوابِ طلسمِ آرزو / کامیابی کا ہوا جاتا ہے کیوں دھوکا مجھے
جرأتِ اظہارِ الفت اور اُن کے سامنے؟ / کردیا ہے اضطرابِ شوق نے رسوا مجھے
زیبِ ویرانہ ہے خاکِ کامگارانِ جنوں / داستانِ عشق ہے ہر ذرۂ صحرا مجھے

ہو گیا ہے دل کو پھر اخترؔ جنونِ آرزو
آگئی امید دینے کے لئے دھوکا مجھے

سید عبدالحمید اخترؔ

ایک دِن

داناؤں نے کہا ہے۔ کہ جب تک کوئی شخص غربت۔ محبت اور لڑائی کے مزے نہ چکھ لے وہ زندگی کے رموز سے بے خبر رہے گا۔

جو لوگ فلسفے سے ذوق رکھتے ہیں۔ وہ یقیناً اس مقولے کی سچائی اور اختصار سے متاثر ہونگے۔ مندرجہ بالا تینوں چیزیں اس نوعیت کی ہیں۔ کہ کائنات کی تمام کیفیات انہیں سے تعلق رکھتی ہیں شاید کوئی معترض یہ کہے کہ اس مجموعے میں "دولت" کو شامل کر لینا چاہئے۔ ورنہ زندگی کے عناصر نامکمل رہینگے۔ لیکن یہ تجویز غلط اور محض غلط ہے۔ جب کوئی مفلس اپنی جیب میں غیر متوقع طور پر ایک روپیہ پڑا ہوا پاتا ہے جسے جیب میں ڈالکر بھول گیا تھا۔ تو اسے اس قدر مسرت حاصل ہوتی ہے۔ کہ کسی کروڑ پتی کو لاکھوں کے حصول سے نہ ہوتی ہوگی۔

معلوم ہوتا ہے کہ مشیت خداوندی نے یہ اٹل قانون مقرر کر دیا ہے۔ کہ عالم اسباب کا کوئی فرد ان تینوں اشیا سے ناآشنا نہ رہے۔

چھوٹے چھوٹے قصبوں میں یہ چیزیں اتنی اہمیت نہیں رکھتیں غربت کی تکلیف نسبتاً کم محسوس ہوتی ہے۔ محبت میں جوش نہیں پایا جاتا۔ لڑائی صرف مرغیوں اور بچوں کی وجہ سے ہوتی ہے۔ اور عام طور پہ زبانی نزاع کی صورت اختیار کرتی ہے۔

اس مقولے کی سچائی اس وقت صحیح معنوں میں ثابت ہوتی ہے۔ جب بڑے بڑے شہروں میں رہنے والے لوگ بھی مجبوراً فطرت کے قانون کے آگے جھک جاتے ہیں۔

یہ سب سچ ہے مگر اس بات کا فخر صرف خورشید انور ہی کو حاصل ہے۔ کہ ایک دن کی مختصر ساعتوں میں وہ زندگی کے تمام مراحل کو طے کر گیا۔

خورشید انور ریلوے کے دفتر میں ایک معمولی کلرک تھا۔ ہزاروں دوسرے کلرکوں کی طرح اس کی زندگی فرسودگی اور تسلسل کے ایک چکر سے عبارت تھی۔ صبح ناشتہ۔ دفتر کی تیاری۔ کھانا۔ دفتر۔ سہ پہر کا ناشتہ۔ شام کا کھانا۔ سونا۔ صبح کا ناشتہ . . . . .

ماہ و سال اسی طرح ختم ہوتے چلے جا رہے تھے۔ اُسے اپنے مستقبل کے افق پر کوئی روشن تحریر نظر نہیں آتی تھی۔

بعض دفعہ وہ تنگ آ کر سینما چلا جایا کرتا۔ اور وہاں کے تخیلی مناظر دیکھ کر اس کے دِل میں عجیب عجیب خواہشات کا طوفان اٹھتا تھا۔ اس کا جی چاہتا تھا۔ کسی طرح وہ بھی غربت اور ذلت کی زنجیروں سے آزاد ہو کر محبت کی رنگین فضا میں داخل ہو جائے۔ رات کو اکثر وہ اپنے بستر پر لیٹا سوچا کرتا۔ بار الہا! میں نے کیا گناہ کیا ہے۔ کہ مجھے آرام نصیب نہیں ہوتا۔ کاش مجھے تعلیم نہ دلائی گئی ہوتی۔ اور اگر تعلیم دلائی گئی تھی۔ تو حساس دل نہ عطا ہوا ہوتا سوچتے سوچتے وہ پاگل سا ہو جاتا۔ اور جب اس کی نیند بالکل اچاٹ ہو جاتی تو وہ اپنی بیوی کے بستر کی طرف دیکھتا۔

اس کی بیوی وفا شعار۔ ایشیائی بیوی۔ نہایت آرام کی نیند سو رہی ہوتی۔ خورشید کا جی چاہتا تھا۔ اس کا منہ نوچ لے۔ اس کے چہرے کے تبسم کو اپنے ناخنوں سے مجروح کر دے۔ اس کے اطمینان قلب۔ اس کی آرام کی نیند دیکھکر خورشید کے دل میں اپنی بے آرامی کا احساس اور زیادہ گہرا ہوتا جاتا۔

ایک شام کا واقعہ ہے خورشید دفتر سے واپس آ کر چائے پی رہا تھا۔ اور تھکی ہوئی آنکھوں سے ان تصویروں کی طرف دیکھ رہا تھا۔ جو دیواروں پر آویزاں تھیں۔ یہ تصویریں اس قسم کی تھیں کہ خورشید کا ذوق سلیم انہیں ایک لمحے کے لئے بھی برداشت نہ کر سکتا تھا مگر اسے اپنی بیوی کی خاطر داری منظور تھی جو انکو کمرے کا ایک جزو لازمی تصور کرتی تھی۔

انگیٹھی کے پاس ایک بلی خرخر کر رہی تھی۔ خورشید کی بیوی مشین پر کپڑے سی رہی تھی۔ مشین کی مسلسل آواز نے خورشید کے تھکے ہوئے دماغ کو تقریباً مختل کر دیا تھا۔ وہ پھٹی پھٹی آنکھوں سے اپنی بیوی کیطرف دیکھ رہا تھا۔ یکایک وہ گھبرا کر اٹھ کھڑا ہوا۔ اور گھر سے باہر نکل گیا ناظرین کو علم ہوگا کہ لاہور عجیب و غریب کوائف و سوانح کا مخزن ہے۔

ممکن ہے کہ آپ دریا کے کنارے آہستہ آہستہ ٹہل رہے ہوں تو اپنے ایک ایسے دوست سے ٹکرا جائیں۔ جو بیس سال سے مفقود الخبر ہے۔ جس کو آخری بار آپ نے آسٹریلیا کے پتے پر خط لکھا تھا۔

ممکن ہے کہ آپ شہر کے باہر کوئی خودرو پھول دیکھ رہے ہوں تو ڈاکو آپ پر دھاوا بول دیں۔ اور آپ کا تمام مال و متاع لے کر رفو چکر ہو جائیں۔

ممکن ہے کہ شہر کے گنجان بازاروں میں سے گذرتے ہوں۔ آپ کو کوئی حادثہ پیش آ جائے اور آپ ہسپتال کی نرس سے شادی کر لیں۔

ممکن ہے کوئی مالدار پری وش آپ پر عاشق ہو جائے۔ اور اپنی شاندار فٹن میں بٹھا کر اپنے عالیشان مکان کی طرف روانہ ہو جائے۔

الغرض لاہور میں "ممکنات" کا دائرہ اس قدر وسیع ہے۔ کہ کوئی شخص محفوظ نہیں۔

جب خورشید نے باہر کی ہوا میں سانس لیا تو اس کی طبیعت شگفتہ ہو گئی۔ ہوا میں ایک خوشگوار خوشبو ملی ہوئی تھی۔ جو تھکے ہوئے دماغوں کے لئے پیغام سکون تھی۔

گلیوں میں بچے کھیل رہے تھے۔ اور اُن کی چیخ پکار میں بھی نغمہ کا سا تناسب پایا جاتا تھا۔

خورشید لاہور کے بارونق بازاروں میں سے گذرتا ہوا انارکلی جا پہنچا۔ ایک ہوٹل کی جگمگاتی ہوئی عمارت نے اس کی توجہ کو اپنی طرف کھینچ لیا۔ اس کا جی چاہا کہ وہ اس طلسمی محل میں داخل ہو جائے۔ اور ایک بار اس "زندگی" کے مناظر بھی دیکھ لے۔ جو اسے ناولوں اور افسانوں میں نظر آتی تھی۔ وہ اندر داخل ہو گیا۔

"ڈائننگ ہال" میں خوش پوش۔ خوش ادا آدمیوں کا مجمع تھا۔ جو مہذبانہ بے معنی باتوں میں مصروف تھا۔

وہ ایک خود فراموشی کے سے عالم میں ایک میز پر بیٹھ گیا۔ اور "آئس کریم" کی ایک پلیٹ طلب کی۔

جب وہ قیمت ادا کرنے کے لئے خزانچی کے قریب پہنچا۔ تو اسے جیب میں ہاتھ ڈالنے کے بعد محسوس ہوا۔ کہ وہ گھر سے کوئی نقدی ساتھ نہیں لایا۔

اس کا چہرہ زرد ہو گیا۔ پیشانی پر ندامت کا پسینہ آ گیا۔ اُسے ایسا محسوس ہوا گویا اس کا گلا بیٹھ گیا ہے۔ اور کسی نے دیکھتے ہوئے چمٹے سے اس کی زبان کھینچ لی ہے۔ اُس نے التجا کے لہجے میں کہا "مجھے افسوس ہے میرے پاس اس وقت کوئی نقدی نہیں ہے۔ میں اپنا بٹوا گھر بھول آیا ہوں۔ میں کل ہی آپ کا قرض چکا دوں گا"

خزانچی نے اس تقریر کو خاموشی سے سُنا۔ پھر بلند آواز میں پکارا "شبیر خان!"

ایک ہٹا کٹا تنومند نوجوان جس کے چہرے کی سُرخی شانوں کی چوڑائی اور لباس کی وضع قطع اس کے پٹھان ہونے کا ثبوت دے رہی تھی۔ اور جو اسی کام کے لئے مخصوص تھا۔ کہ خورشید جیسے گاہکوں کی خبر لیا کرے۔ دوڑتے آتا ہوا دکھائی دیا۔

خورشید نے بھاگنے کی کوشش کی۔ مگر اس کے پاؤں گویا سنگ مرمر کے فرش پر جم گئے تھے۔ اتنے میں شبیر خان آ پہنچا۔۔۔

خورشید بھی جوان تھا صحت مند تھا۔ اور بڑی بات یہ کہ حق پر تھا۔

دونوں گتھم گتھا ہو گئے۔ مکوں اور گھونسوں نے اپنا کام کرنا شروع کیا۔ اسی طرح اُلجھے ہوئے وہ کمرے کے وسط میں آ گیا۔ ایک میز اُلٹ گئی۔ اور شراب کے بلوریں کنٹر گر کے ریزہ ریزہ ہو گئے۔ ایک لمحے کے لئے دونوں علیحدہ ہوئے۔ خورشید نے پاس ہی سے ایک گملا اُٹھا لیا۔ اور تاک کر مارا۔ مگر شبیر خان۔ اپنی فطری چالاکی سے کام لے کر عین وقت پر جھک گیا۔ گملا ایک کھڑکی میں لگا شیشے کے ٹوٹنے کی آواز آئی پھر نیچے سے راہگیروں کا شور بلند ہوا۔ اور ہوٹل کے کارپردازوں کو معلوم ہو گیا۔ کہ اس لڑائی کا حلقہ صرف ہوٹل تک ہی محدود نہیں۔ بلکہ اس کا اثر بازار تک بھی جا پہنچا ہے۔ مہذب خوش پوش آدمی گھبرا کر اُٹھ کھڑے ہوئے۔ ہوٹل کے دوسرے ملازمین بھی آ گئے۔ مگر اس اثنا میں خورشید اور شبیر خان اپنے جوش میں دروازے سے باہر نکل چکے تھے۔ کچھ عرصہ لڑائی زور و شور سے بازار میں جاری رہی۔ یکایک ایک پولیس کا سپاہی آ گیا۔ شبیر خان خورشید کو چھوڑ کر ہوٹل میں گھس گیا۔ خورشید سا تھ ہی ایک گلی تھی۔ اندھا دھند اس طرف مُڑ گیا۔

پولیس کا سپاہی اس کا تعاقب کر رہا تھا۔ اور خورشید اس قدر تیز دوڑ رہا تھا۔ گویا اس کے پاؤں کے ساتھ پنکھ لگے ہوئے ہیں۔

آخر خورشید سپاہی سے بہت آگے نکل گیا۔ اس دوڑ کے دوران میں اُسے محسوس ہوتا تھا۔ کہ ایک سرخ رنگ کی موٹر اس کے ساتھ ساتھ چل رہی ہے۔

جب فوری خطرے سے نجات حاصل کرنے کے بعد اس کے قدم ذرا سست پڑ گئے۔ تو اس نے دیکھا کہ شوفر نے اسے موٹر میں بیٹھ جانے کا اشارہ کیا۔ خورشید بن سوچے سمجھے کود کر موٹر میں بیٹھ گیا۔ اور موٹر فراٹے بھرتی ہوئی روانہ ہو گئی۔ پانچ منٹ کے بعد خورشید نے اپنے آپ کو گنجان بازاروں سے باہر راوی روڈ کی کھلی اور نسبتاً ٹھنڈی ہوا میں پایا۔ شوفر ابھی تک موٹر کو نہایت تیز رفتار پر لئے جا رہا تھا۔

خورشید نے ہانپتے ہوئے شوفر کا شکریہ ادا کیا۔ لیکن اسے کوئی جواب نہیں ملا۔ تھوڑے عرصے کے بعد موٹر ایک عالیشان کوٹھی کے بیرونی دروازے کے سامنے کھڑی ہو گئی۔

شوفر اترا۔ اس کا چہرہ بخوبی نظر نہیں آتا تھا کیونکہ اس نے

بڑی سیاہ عینک لگارکھی تھی، اور اُسکے چہرے کا نچلا حصہ ایک اونی مفلر میں لپٹا ہوا تھا اُسنے دروازے کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا "تشریف لے چلئے۔ ایک مصیبت زدہ خاتون آپ کی انتظار میں ہے"

"حیرانی" اس قدر فرسودہ لفظ ہو چکا ہے کہ خورشید کے جذبات کو اس سے موسوم کرنا شاید ناکافی ہو۔ اسکا دماغ چکرا رہا تھا۔ "مصیبت زدہ خاتون"، "انتظار" یہ لفظ اُسکے دل میں ایک طوفان عظیم پیدا کر رہے تھے۔ اس نے کوٹھی کی طرف غور سے دیکھا۔ راوی روڈ کی طرف وہ اکثر آتا تھا۔ اور یہاں سے بھی ضرور گذرا ہوگا۔ مگر اس نے کبھی اس جگہ کی طرف خیال نہ کیا تھا۔

بیرونی دروازے سے اندر کا باغ صاف نظر آتا تھا۔ اور ایک روش سیدھی کوٹھی کی طرف جاتی ہوئی دکھائی دیتی تھی اب شام ہو چکی تھی۔ مگر پھولوں کے رنگ پہچانے جا سکتے تھے گلاب دنار بخ کی ہلکی ہلکی خوشبو آ رہی تھی۔ خورشید گویا دیوانہ سا ہوگیا۔ وہ خود فراموشی کے سے انداز میں شوفر کے پیچھے چل رہا۔ شوفر نے ایک کمرے کا دروازہ کھولا۔ اور خورشید کو محسوس ہوا گویا۔ اُسکے افق حیات پر ایک درخشاں ستارے کا طلوع ہوا ہے کمرے میں قیمتی قالین بچھے ہوئے تھے۔ جنکے نقوش وخطوط کا رنگ [illegible] کے رنگ سے متناسب تھا۔ اور ایک صوفے پر ایک موج رنگ و بو پر ایک شعاع ماہ جلوہ ریز تھی۔

وہ ایک مہتاب مثال نازنین تھی۔ جسکے چہرے پر کائنات کی مسرتیں تبسم بنکر کھیل رہی تھیں۔ اسکی سیاہ۔ گہری سیاہ آنکھوں میں دنیا کی تمام عشرتیں رقص کر رہی تھیں۔ اسکے بالوں میں وہ بال جو شبہائے مصیبت سے زیادہ تاریک تھے۔ نکہتوں نے آکر پناہ لی تھی۔

شوفر نے عینک اتاری۔ مفلر کو الگ کیا۔ اور پھر ایک عجیب انداز میں چھاتی پر ہاتھ رکھکر جھک گیا۔

وہ مسکرا رہا تھا۔

"محترم خاتون! شاہد صاحب دہلی تشریف لے گئے ہیں۔ اسلئے حاضر نہ ہو سکے۔ انکی جگہ میں انکو (خورشید کی طرف اشارہ کرکے) لے آیا ہوں۔ میں آپ کو یقین دلاتا ہوں کہ اپنے سے زیادہ اور طاقتور آدمیوں سے مقابلہ کرنے میں یہ اپنا جواب نہیں رکھتے اور انکی تیز رفتاری تو شاید آیندہ کیلئے ضرب المثل ہوگی۔"

یہ کہکر شوفر: واپس چلا گیا۔

خاتون نے انور کی طرف دیکھا۔ آہ وہ نگاہ! خورشید کی تمام آرزوئیں اور تمنائیں۔ اس نگاہ کے ساتھ کھینچی ہوئی چلی گئیں اسے معلوم ہوا گویا وہ جسد بیجان رہ گیا ہے۔ گویا اُسکی روح ان سیاہ پتلیوں میں سما گئی ہے۔

خورشید نے اپنے دل کی گہرائیوں میں اس جذبے کو محسوس کیا جسے "عشق" کہا جاتا ہے۔

خاتون نے کہا۔ (آہ وہ آواز نغمے اُس آواز کے اتار چڑھاؤ میں لرز رہے تھے اور خورشید کو تو اب محسوس ہوتا تھا گویا دنیا تمام لرز رہی ہے) "میں نے اپنے شوفر (شوفر کا لفظ کہتے ہوئے اسکے چہرے پر سرخی دوڑ گئی) کو بھیجا تھا کہ وہ میرے چچازاد بھائی شاہد حسین کو بلا لائے۔ بات یہ ہے کہ اسوقت یہاں ایک بدتہذیب مرد موجود ہے۔ جس نے میری توہین کی ہے۔ میں نے اسباب کی شکایت اپنی والدہ سے کی۔ مگر وہ صرف مسکرا کے چپ ہو رہیں۔ اسلئے مجھے شاہد حسین صاحب کو بلانے کی ضرورت محسوس ہوئی۔ افسوس ہے کہ وہ یہاں نہیں ہیں۔

اس زمانے میں شجاع اور غیور مردوں کی کمی ہے۔ کیا میں آپ کی مدد پر بھروسہ کر سکتی ہوں"

خورشید کے دل میں ایک طغیانِ غرور برپا ہوگیا۔

اُسنے بھرائی ہوئی آواز میں کہا "مجھے وہ بدتہذیب شخص دکھایئے اور اُسکے بعد جو اُس کا حشر ہوگا وہ آپ دیکھینگی"

خاتون نے ایک کمرے کی طرف اشارہ کرکے کہا "اُس کمرے میں وہ موجود ہے۔ آپ ڈرتے تو نہیں"

خورشید جواب دینے کی بجائے اُس کمرے کی طرف بڑھا اور دروازہ کھول کے اندر داخل ہوگیا۔ وہ اسوقت اژدہا اور شیر سے لڑنے کے لئے تیار تھا۔ انسان کی کیا بساط ہو سکتی ہے۔ کمرے میں ایک نوجوان خوشرو۔ بلند بالا۔ ایک آرام کرسی پر بیٹھا ہوا پڑھ رہا تھا

خورشید نے جاتے ہی طعنے کے لہجے میں کہا "مناسب ہے کہ تم تہذیب وآداب معاشرت پر جو کتابیں تصنیف کی گئی ہیں صرف وہی پڑھا کرو۔"

نوجوان نے نظر اُٹھا کے دیکھا۔ اس کے چہرے پر تعجب کے آثار

پیدا ہوئے پھر اُسنے خورشید کے پیچھے خاتون کو بھی داخل ہوتے ہوئے دیکھا۔ وہ ہنسنے لگا۔ اپنی جگہ سے اُٹھا۔ اور پھرتی سے خورشید کی باہوں کو ایک ایسی آہنی گرفت میں تھام لیا کہ خورشید باوجود کوشش کے حرکت کرنے سے معذور ہوگیا۔ اسی طرح ٹہلاتے ہوئے نوجوان خورشید کو باہر کے دروازے تک لے گیا۔ اور دروازہ بند کرنے کے بعد واپس اسی کمرے میں آگیا۔

پھر خاتون کی طرف دیکھکر کہنے لگا۔

"سلمیٰ! تمہارے دل میں یہ کیا سمائی ہے کہ بالکل اجنبی آدمیوں کو بلالیتی ہو"

سلمیٰ "تم بہت برے آدمی ہو۔ پہلے تم نے میری کتاب اس بھلانے آگ میں جھونک دی کہ میرے لئے بہت پڑھنا مضر ہے۔ اور اب تم میرے مددگاروں کو "اجنبی" کہ کر پکارتے ہو۔ وہ نوشکر گرو شاہد حسین موجود نہ تھا ورنہ

وہ خاموش ہوگئی۔

نوجوان کھلکھلا کر ہنس

اچھا یہ غصہ تھا۔ دیکھ

آئیں اور پردہ اُتار دیا۔ تو میں

کے خلاف ہوں۔ مگر تاریخی

خراب ہوگیا ہے کہ تم پرا

دہرانا چاہتی ہو۔ اس

ڈاکٹر نے منع نہیں کیا کہ

نہ دی جائے۔ مجھے تمہار

حق بھی ہے یا نہیں

سلمیٰ خاموش

سیاست اور ارباب سیاست

(مشہور اطالوی مؤرخ فریرو کے ایک مضمون کا خلاصہ)

جنگ عظیم سے پہلے دنیا کی سیاست پر صرف مالداروں اور اونچے طبقے والوں کا قبضہ تھا مگر جنگ نے دنیا کی کایا پلٹ دی مزدوروں اور صناعوں کی قدر و قیمت بڑھ گئی۔ اب آہستہ آہستہ سیاست بھی انہی کے ہاتھوں میں چلی جارہی ہے۔

گزشتہ دنوں ریاستہائے متحدہ امریکہ کی پریزیڈنٹی کے لئے مسٹر ہوور کے انتخاب نے ہر شخص کو مزدور اور سیاست کے تعلق کی طرف متوجہ کردیا ہے۔ مسٹر ہوور ایک مہندس ہیں اور انہوں نے اپنی عمر کا زیادہ حصہ مشرقِ اقصیٰ کی کانوں میں گزارا ہے۔ جنگ عظیم کے موقعہ پر یہ معدن سے نکلکر میدانِ سیاست میں آگئے۔ اور امریکہ میں اتنی مقبولیت حاصل کی کہ اب وہاں کے پریزیڈنٹ ہیں۔

مسٹر ہوور سے پہلے امریکہ کے چھ پریزیڈنٹ ایسے ہوچکے ہیں جن کو ذہنی کام کرنے والا کہا جاسکتا ہے اور سیاسی تدبر سے ان کا واسطہ بظاہر تسلیم کیا جاسکتا ہے۔ مسٹر کولج ایک وکیل تھے۔ مسٹر ہارڈنگ ایک اخبار کے ایڈیٹر تھے۔ مسٹر ولسن ایک یونیورسٹی کے رجسٹرار تھے۔ مسٹر ٹافٹ بھی وکیل تھے۔ مسٹر روزفیلٹ ایک مشہور اخبار نویس اور ادیب تھے

لحاظ سے ارباب ذ

کے ایک رمزِ جدید ہ

اور نہ ارباب ذہن

جنگ عظیم کی پیداو

جنگ عظیم

وہ اپنے تمام ذرا

سے بھی کام لے

کی اور حکومت کا

انگلستان اور

پیروی کی۔ مز

اور دنیا کا سـ

ہمیں امریکہ

نظر آرہا ہے

گذ

ادبی دنیا بر ۲۹ء

کیلئے اسی د

مگر مزدوروں

کے ہاتھ سے

بڑے زمیندار

خانوں میں ا

نظر آتے ہیں بلکہ صرف آدھ گھنٹہ

کیلئے خاص ہوری میں صبح و

نہیں ہے میش

اور اب حکومتوں نے لی اور آخرکار

خاص نہیں ہیں بنا بیٹھے میں لکھ

حاصل کرتے ہیں نی ملاقات کا

پہلے یورپ میں س"

اسی طرح اب کار نے کہا:۔

سمجھا جاتا تھا کہ ملک پورا یقین ہے

ماہرین جنگ سے حیرت اور تعجب

خیال کیا کہ ملک سنبھالیگا۔ اور اخبارات

لوگ ہو سکتے ہیں اس کا وہ حصہ

سے سلجھ سکتی ہیں

ہیں کہ سیاست کا رشید ایک گمنام

کے تجربے۔ گرم وہ پوشیدہ ہیں

کی وجہ سے وہی ملک کے موجد بھی نہیں

ان باتوں کی وجہ سا منظرِ عام پر آئینگی

اور اپنی ساری زندگی بھر کے موجد اس

والوں کی بہ نسبت رشید دنیا کے

اور اس قابل ہے کہ

و بہبود اس کے سپرد کر وہ اپنے عالیشان مکان

پرانے سیاست دانوں نے مکان سے باہر نکلت

سیاست دان نئے سـ نا ہے جو اس کے مکان

کی سیاست پر زیادہ حاوی نیچے کی طرف اس

وزیروں کے اغراض و مقـ سے بعض انگلی کے

مہارت پیدا ہوجاتی تھی رح باریک ہیں جھت

کی مختلف قوموں کی اجتمـ لعیار بیٹری میں چاروں

ہے۔ مختلف جماعتوں اور دعاتوں کے چھوٹے

بڑی سیاارح خاص تھی جس طرح بادشاہی مخصوص خاندانوں کیلئے۔
ادنیٰ مفلر کے نئے طبقے کے ظہور کے بعد اپنے قدیم اجارہ دائرں
کہا "نتنہ" نکلکر نئے عناصر کی طرف منتقل ہوگئی ہے اور اب بڑے
ہیں ہے .ول اور خاندانی شرفا کے بدلے دارالعوام اور وزارت
خیبر شبار نولیس طبیب پروفیسر مہندس تاجر اور مزدور
جذبات کو جس کے معنی یہ ہیں کہ سیاست کسی ایک جماعت
تھا۔ "مصیدنے اور مالدار طبقے کا جس کے لئے دنیا میں دوسرا کام
ایک طوقا نغلہ بننے کے بجائے ہر شخص کے لئے عام ہوگئی ہے۔
سے دیکھا کو ایسے لوگ سنبھال رہے ہیں جو صرف اسی کیلئے
بھی ضرور گ۔ بلکہ سیاست کی تعلیم اپنے اُن پیشوں کے ساتھ ہی
تھا۔ جن سے اپنی روزی کماتے ہیں۔ گویا ۱۸۷۵ء سے
بیرونی جس طرح فوج سیاسیات کی درسگاہ بنی ہوئی تھی۔
ایک روشنخالے سیاسیات کے مدرسے بنگئے ہیں۔ اسوقت
اب شام ہو سکی ترقی اور حفاظت کا ضامن سپہ سالاروں اور
گلاب دنار ہے زیادہ اور کوئی نہیں ہوسکتا۔ اس کے بعد ہم نے
ہوگیا۔ وہ خوکے لئے سب سے زیادہ مفید ذہنی کام کرنے والے
شوفرنے ایک۔ اور سیاسیات کی گتھیاں انہیں کے ناخن تدبیر
ہوا گریا۔ اُسکے مگر اب حالات ہمکو یہ مان لینے پر مجبور کر رہے
کرے یہ دعوئی اہل ہے تو وہ صرف مزدور ہے۔ کیونکہ پیشے
کارنگ ... مرد کی برداشت حسن انتظام اور کفایت شعاری
ایک مو ... د قوم کی سستی رہنمائی کر سکتا ہے۔ اور
وہ ایک ہے فوج کے ناعاقبت اندیش بے رحم سپہ سالاروں
کی مسرتیں تبسم نئ خالی خولی عقلی نظرتوں میں "برباد" کر دینے
ہیں دنیا کی تمام قوم کے لئے ایک مزدور زیادہ مفید ہے۔
جو شبہاے مصیبتوں پر اعتماد کر کے حکومت اور ملک و قوم کی فلاح
لی تھی۔ دیجائے۔ لیکن دیانتداری کے ساتھ نتیجے اور
شوفرنے ل میں مقابلہ کیا جائے تو ہم کو اعتراف کرنا پڑیگا کہ پرانے
انداز میں جہانی باست دانوں سے زیادہ بہتر اور اپنے وقت
وہ مسکراری تھے۔ کیونکہ ان کو صرف شاہی خاندان اور انکے
"محترم خاناصد کا مطالعہ کرنا پڑتا تھا اور اسمیں ان کو بہت جلد
اسلئے حاضر نہ تھی۔ مگر آجکل کے سیاست دانوں کے لئے دنیا
کر کے) بے آیا ہوائی اور اقتصادی زندگی کا مطالعہ کرنا ضروری
اور طاقتور آدمیوں رپارٹیوں کے خیالات اور معتقدات سے باخبر

ہونا لازمی ہے۔ اسیطرح ان پر یہ بھی فرض ہے کہ بین الاقوامی سیاست کے تمام ایسے مسائل کا بھی مطالعہ کریں جن کا تقریباً کوئی حل نظر نہیں آتا۔ اسی بنا پر ہمارا خیال ہے کہ آجکل کے سیاست دانوں کو جن مشکلات کا سامنا کرنا پڑتا ہے وہ قدیم سیاست دانوں کو نہیں پیش آتی تھیں۔ اور وہ اپنے وقت کی سیاست پر ان کی بہ نسبت زیادہ حاوی ہوا کرتے تھے۔

علاوہ بریں مزدور جماعت سے تعلق رکھنے والے اصحاب کارخانوں میں مشینوں کی طرح کام کرتے ہیں۔ ان کی کارگزاری مقرر۔ ان کا وقت معین۔ اور ان کی صنعت آزمودہ ہوتی ہے۔ کبھی بھی ان کو ذہن سے کام نہیں لینا پڑتا۔ اس لئے نہ تو وہ خود جذبات کے مالک ہوتے ہیں اور نہ ان کو اسی کا موقع ملتا ہے کہ دوسروں کے جذبات۔ دوسروں کی خواہشوں اور تمناؤں سے باخبر ہوں۔ کارخانے میں انہیں جن ہم پیشہ لوگوں سے تعلق ہوتا ہے ان سے بھی ان کا واسطہ ایک مشین کے مختلف پرزوں کے آپس کے تعلق سے بڑھا ہوا نہیں ہوتا۔ ایسے لوگ جب میدان سیاست میں آتے ہیں تو ان کو سخت مشکلات کا سامنا کرنا پڑتا ہے اور ہمارا تو عقیدہ ہے کہ ہزار کوشش کے باوجود اصحاب ذہن کی طرح قوم کے جذبات اور طبائع سے بخوبی واقف نہیں ہوتے۔ آجکل ایک ماہر سیاست کے لئے سب سے زیادہ لازمی امر یہ ہے کہ وہ عوام کے خیالات سے اچھی طرح واقف ہو مگر مزدور جماعت کے افراد کو نہ اس کا موقع ملتا ہے اور نہ ان میں اس کا احساس ہی ہے۔ حالانکہ واقعہ یہ ہے کہ اصحاب ذہن یا ارباب عمل اگر وہ سیاسیات میں پڑنا چاہیں تو ان کو نہ انکی ذہانت کام دیسکتی ہے۔ نہ انکی جرأت کام دے سکتی ہے اور نہ ان کی قوت برداشت اور ان کے حسن انتظام ہی سے کچھ ہو سکتا ہے۔ کیونکہ سیاست میں سب سے اہم چیز قوم کے حالات کا مطالعہ اور اس کے ایک ایک جزو پر حاوی ہونا ہے۔ اور یہ چیز اسی شخص کو نصیب ہو سکتی ہے جو اسی کے لئے اپنی زندگی وقف کر دے۔ اور تعصبات سے بالکل آزاد ہو کر قوم کی ہر ہر چیز کا مطالعہ کرے۔

میلارام وفاؔ

صیدِ ایجاد

جب میں اس کو اپنی زندگی کا سب سے زیادہ عجیب واقعہ سنا چکا تو اس نے مسکراتے ہوئے کہا "معاف کیجئے ایک ایسے شخص کے لئے جس کی زندگی اس قسم کے واقعات سے پُر ہو، یہ واقعہ کچھ زیادہ دلچسپ نہیں ہوسکتا۔ ایک واقعہ جو میں آپ کو سُناتا ہوں میری زندگی کے عجیب واقعات میں بیحد حیرت انگیز ہے۔ یہ واقعہ ایک راز ہے اور آپ ہی پہلے اور آخری شخص ہیں جس کو میں اس راز میں اپنا شریک کر رہا ہوں۔"

پھر ہپناٹائیزر نے میرے چہرے پر اپنی تیز نظریں جما کر کہا:۔

"مسٹر بشیر عمل کے وقت معمول کی رسائی بہت دُور دُور تک ہوتی ہے۔ اور عامل کے حکم سے وہ ایسی چیزیں دیکھ سکتا ہے جو معمول کو بھی نظر نہیں آتیں۔ مثلاً اگر میں اپنے معمول سے پوچھوں کہ نیو یارک کی فلاں سٹریٹ کے فلاں مقام پر کیا ہو رہا ہے۔ یا فلاں مریض کی کیا حالت ہے۔ یا میرا فلاں دوست کیا کام کر رہا ہے تو وہ ہر سوال کا صحیح صحیح اور ٹھیک ٹھیک جواب دیگا" وہ تھوڑی دیر رُکا پھر کہنے لگا:۔

"ایک دن میں معمول کے سرہانے کھڑا ہوا۔ اس سے مختلف سوال پوچھ رہا تھا اسی دوران میں میں نے اس سے پوچھا کہ میرے دوست رشید کا کیا حال ہے اور وہ اس وقت کیا کر رہا ہے۔ اس سوال کے جواب میں میں اس سے کسی غیر معمولی جواب کے سننے کی امید نہ رکھتا تھا۔ چونکہ میں جانتا تھا کہ اس وقت رشید اپنی لیبارٹری میں بیٹھا ہوا مریخ جانے والے راکٹ کو مکمل کر رہا ہوگا۔ لیکن معمول نے جو میرے اس سوال کا جواب دیا اس نے مجھے متعجب اور پریشان کر دیا۔

معمول نے کہا کہ رشید اور ظہیر پر بجلی گری ہے اور رشید کا مکان جل رہا ہے۔ اتنا کہہ کر معمول چیخا کہ میں آگ کے شعلوں کی زد میں آگیا ہوں مجھے بچاؤ۔ یہ سُنکر میں نے رد عمل کیا اور معمول کو بڑی مشکل سے ہوش آئی۔

میں نے کھڑکی کھولی اور باہر جھانکا، لوگ دوڑ رہے تھے۔ فائر برگیڈ بڑی تیزی سے جا رہا تھا خطرے کی گھنٹی بج رہی تھی، ہر شخص کی زبان پر "آگ لگ گئی، آگ لگ گئی" کے الفاظ تھے اور یہ سب باتیں معمول کے بیان کی تائید کرتی تھیں۔ لیکن میں متعجب تھا کیونکہ صرف آدھ گھنٹہ پہلے میں رشید سے ملکر آیا تھا۔ اور اُسے اس کی لیبارٹری میں صحیح و سلامت چھوڑا تھا۔

میں نے آتشزدگی کی اصل وجہ معلوم کرنے کی ٹھان لی اور آخرکار کامیاب ہؤا۔ جو کچھ مجھے معلوم ہؤا وہ میں نے اپنے روزنامچے میں لکھ لیا۔ اب میں آپ کو اپنے روزنامچے سے رشید سے اپنی ملاقات کا حال اور پھر آتشزدگی کے اصل حالات پڑھ کر سناتا ہوں۔"

اس نے میز پر سے اپنا روزنامچہ اٹھاتے ہوئے کہا:۔

"مسٹر بشیر میرا روزنامچہ بھی بڑا دلچسپ ہے مجھے پورا یقین ہے کہ میری وفات کے بعد جب یہ چھپے گا تو لوگ اسے حیرت اور تعجب کے ساتھ پڑھیں گے۔ یہ اپنی قسم کا یکتا روزنامچہ مانا جائیگا۔ اور اخبارات اس پر شاندار ریویو لکھیں گے۔ اچھا اب میں آپ کو اس کا وہ حصّہ پڑھ کر سناتا ہوں جو اس واقعہ سے متعلق ہے۔"

"آج میں اپنے دوست رشید سے ملنے گیا۔ رشید ایک گمنام مُوجد ہے اور اس کی ایجادیں ابھی عوام کی نظروں سے پوشیدہ ہیں لیکن اس کی قوت ایجاد کا مقابلہ یورپ اور امریکہ کے موجد بھی نہیں کر سکتے۔ مجھے یقین کامل ہے کہ جب اس کی ایجادیں منظر عام پر آئینگی تو دنیا انہیں حیرت اور تعجب سے دیکھے گی۔ دنیا بھر کے موجد اس کی قوت ایجاد کا لوہا مان جائیں گے اور ہندوستانی رشید دنیا کے موجدوں کا سرتاج سمجھا جائیگا۔

اس وقت رشید پردہ گمنامی میں ہے۔ وہ اپنے عالیشان مکان میں اپنی زندگی گذار رہا ہے۔ وہ شاذ و نادر ہی اپنے مکان سے باہر نکلتا ہے اور اپنا سارا وقت اپنی لیبارٹری میں گذارتا ہے جو اس کے مکان کے بالائی حصے میں ہے۔ لیبارٹری کی چھت کے نیچے کی طرف اس نے بیشمار تاروں کا جال بچھا رکھا ہے۔ ان میں سے بعض انگلی کے برابر موٹی ہیں۔ اور بعض مکڑی کے جالے کی طرح باریک ہیں چھت کے اوپر کئی چھوٹے چھوٹے کھمبے کھڑے ہیں۔ لیبارٹری میں چاروں طرف شیشے کی الماریوں میں کیمیاوی مرکبات اور دھاتوں کے چھوٹے

بڑے ٹکڑے پڑے ہوئے ہیں۔ مختلف دھاتوں سے کئی صندوق بھرے رکھے ہیں۔ ایک طرف خالص پارے کے کئی پیپے سجے ہوئے ہیں۔ لیبارٹری کے وسط میں ایک بڑا میز ہے جس پر رشید تجربے کرتا ہے۔ یہیں پر تین سو گرام ریڈیم رکھا ہؤا ہے لیبارٹری میں کئی بڑے انجن ہیں جن کو وہ مختلف اوقات پر مختلف مقاصد کے لئے استعمال کرتا ہے۔ ان کے علاوہ بہت سی چھوٹی چھوٹی مشینیں ہیں کئی مہین پرزے ہیں جو خالص فولاد کی نہایت باریک تاروں سے بنائے گئے ہیں۔ ہال کمرے سے متصل اور بھی بہت سے فراخ کمرے ہیں جن میں سے ایک میں بہت سی فولادی کلیں اور ایک عجیب دھات کے بہت سے بڑے بڑے ٹکڑے پڑے ہوئے ہیں۔

اس نے ابھی تک شادی نہیں کی۔ اس کے بھائی اور والدین مکان کی نچلی منزلوں میں رہتے ہیں لیکن وہ کسی کو بھی اپنی لیبارٹری میں داخل نہیں ہونے دیتا۔ حتیٰ کہ اگر اس کے والدین بھی ایسا کرنا چاہتے ہیں تو ان کے ساتھ بھی نہایت سختی سے پیش آتا ہے۔

جب میں اس کے مکان پر پہنچا تو اس کے والد مجھ سے بڑے تپاک سے ملے۔ چونکہ وہ جانتے تھے کہ میں رشید کا دوست اور اس کا ہمراز ہوں۔ اس کے والد نے مجھے بتایا کہ اسے نیچے اترے ہوئے چھ ماہ گذر چکے ہیں۔ آخری دفعہ وہ آدھ گھنٹے کے لئے نیچے آیا تھا۔

مجھے اس کے والد سے معلوم ہؤا کہ وہ اس سے ملنے کے لئے ٹیلیفون کے ذریعے سے اجازت لیتے ہیں۔ میں نے بھی ٹیلیفون کی گھنٹی بجائی اور ریسور کو کان سے لگایا۔

"ہاں ہاں —— کیوں؟ کیا ہے؟ .... احمقو! یاد رکھو اگر تم بار بار مجھ کو تنگ کرنے سے باز نہ آؤ گے تو میں ٹیلیفون ہی کو توڑ ڈالونگا۔ تم میرے خاندان کے لوگ ہوتے ہوئے بھی میری مدد کرنے کی بجائے مجھے تکلیف دیتے ہو۔ افسوس تم کو معلوم نہیں کہ میرے پیش نظر کتنے اہم مقاصد ہیں۔ اور میرے ارادے تمہارے سطحی خیالات سے کسقدر زیادہ بلند اور کسقدر ارفع و اعلیٰ ہیں۔ تم تم ...."

"مسٹر رشید میں تو آپ کا دوست موہن ہوں"

"اچھا! اچھا! مسٹر موہن آپ ہیں ...... ہا ہا ..... دس برس بعد آپ ہی پہلے شخص ہیں جو مجھ سے ملنے کی غرض سے میرے مکان پر تشریف لائے۔ بیشک آپ بہت عقلمند ہیں۔ آپ میرے کنبے والوں سے بدرجہا زیادہ عقلمند ہیں۔ مجھے امید ہے کہ آپ طول طویل گفتگو میں میرا وقت ضایع نہ کریں گے۔"

"آپ جانتے ہیں مجھے آپ سے کسقدر اُنس ہے اور آپکی ایجادوں سے کسقدر دلچسپی ہے۔

کیا آپ چند منٹ کے لئے مجھے اپنی لیبارٹری میں بلا کر مجھ سے بالمشافہ گفتگو کرنی پسند فرمائیں گے۔"

کچھ دیر خاموش رہنے اور بڑبڑانے کے بعد

"اچھا! اچھا! خیر آج تو میں آپ کو بلا لیتا ہوں کیونکہ مجھے بھی آپ سے کچھ پوچھنا ہے۔ لیکن آئندہ آپ مجھے اس قسم کی کوئی تکلیف نہ دیں اور میرا وقت ضایع نہ کریں۔ آپ اس لفٹ میں بیٹھ جائیں تاکہ میں اسے اوپر کھینچ لوں"۔

میں لفٹ میں بیٹھ گیا لفٹ اوپر اٹھی اور جب یہ ٹھہری تو میں نے رشید کو اپنے سامنے کھڑا دیکھا۔ اس نے میرا ہاتھ پکڑ لیا اور مجھے اپنی لیبارٹری میں لے گیا۔ اس نے مجھے ایک کرسی پر بیٹھنے کو کہا میں اور وہ خود میرے سامنے دوسری کرسی پر بیٹھ گیا۔

"مسٹر موہن آپ ایک زبردست عامل مسمریزم مانے جاتے ہیں اور آپ کی اعلیٰ قابلیت کا دُور دُور شہرہ ہے۔ کیا آپ اپنے معمول کی مدد سے مجھے بتائیں گے کہ میں مریخ جانے میں کامیاب ہو جاؤنگا یا نہیں۔ لیکن ٹھہریے میرا یہ سوال بے سود ہے۔ میں خوب جانتا ہوں کہ جو راکٹ میں بنا رہا ہوں وہ مجھے ضرور منزل مقصود تک پہنچا دیگا۔ اچھا آپ مجھے یہ بتائیں کہ سطح مریخ پر جو ایک دوسرے کو کاٹتے ہوئے خطوط ہیں وہ کیا ہیں؟ آپ جانتے ہیں کہ مجھے آم بہت پسند ہیں۔ مجھے مریخ میں آم ملیں گے یا نہیں؟

میں کرہ مریخ میں لنگڑا، سندھوری، سفیدہ، وغیرہ آموں کے درخت پاکر بہت خوش ہونگا۔ مسٹر موہن ....

"ڈیئر رشید! میں ان سوالات کا جواب دینے کی نسبت یہ پسند کرتا ہوں کہ آپ مجھے اپنی لیبارٹری کی سیر کرا کے اپنی ایجادوں کا حال سنائیں۔"

"کیوں صاحب! اس کا مطلب یہی ہے نا کہ آپ ان سوالات کا جواب نہیں دے سکتے یا نہیں دے سکتے۔" اس نے منہ بنا کر کہا "محدود ہے —— محدود ہے۔ آپ کا علم یہ محض شعبدہ بازی ہے۔ لیکن پھر بھی میں آپ کی عزت کرتا ہوں کیونکہ آپ میرے بے تکلف دوست

ہیں - میرے کہنے والوں سے بہت زیادہ عقلمند ہیں - آپ اسقدر پرانے اور بے تکلف دوست ہونے کے باوجود بھی مجھ سے برسوں کے بعد چند منٹ کے لئے ملنے آئے ہیں - مسٹر موہن میں آپ کا مشکور ہوں "

پھر وہ اُٹھ کھڑا ہوا - اور مجھے اپنے پیچھے آنے کا اشارہ کیا -

"میرے مقاصد اعلیٰ ہیں - میں ——— میں" اس نے پرُ جوش لہجے میں کہا - "دنیا پر ثابت کرونگا کہ ہندوستان میں محض بیوقوف تنگ خیال اور کمزور لوگ ہی نہیں بستے اور ایجاد و اختراع یورپ اور امریکہ کی قسمت میں ہی نہیں لکھی بلکہ ہندوستانیوں میں بھی بہت سے ایسے لوگ پیدا ہوتے ہیں جو نادر روزگار دماغ رکھتے ہیں اور ہندوستانی بھی ایسی ایسی ایجادیں کر سکتے ہیں جو یورپ اور امریکہ کے موجدوں کے خیال میں بھی نہیں آسکتیں" "جب میں بڈھا ہو جاؤنگا جب میرے قویٰ سخت کام کرنے کے لائق نہ رہیں گے، جب میرا دماغ تھک جائیگا، اس وقت ——— ہاں اسیوقت میں اپنی ایجادیں دنیا کے سامنے پیش کرونگا - میری ایجادیں دنیا میں تہلکہ مچا دینگی - اس وقت دنیا میری طرف دوڑیگی - یورپ اور امریکہ کے متعصب لوگ مان جائیں گے کہ ہندوستانی قوم بھی ہم سے کسیطرح کم نہیں - حکومتیں مجھے مدعو کرینگی تاکہ وہ میرے دماغ سے فائدہ اٹھائیں لیکن یہ بیفائدہ ہوگا - میرے اعضا کام کرنے کے لائق نہ ہونگے - میں بڈھا ہو چکا ہونگا، اور اسوقت میں اپنی زندگی کا بہترین حصہ مادر وطن کی عزت و شہرت اور بنی نوع انسان کے آرام اور آسائش پر قربان کر چکا ہونگا -

میں ذاتی شہرت سے نفرت کرتا ہوں - شہرت خوشامدی اور غرض پرست لوگوں کو دوست بنا دیتی ہے - اور اپنے پیش نظر مقاصد کی تکمیل مشکل ہو جاتی ہے - اگر آج میں اپنی ایجادوں کو دنیا کے سامنے پیش کر دوں تو شہرت میرے قدم چومے، میرے گرد خوشامدیوں کا اور غرض پرستوں کا جمگھٹا لگ جائے اور میں اصل راہ سے بھٹک جاؤں - پس میں چاہتا ہوں کہ یہ کمبخت شہرت اسوقت میرے پاس آئے جب میں اپنے پیشِ نظر مقصد کی تکمیل کر لوں "

میں اس کے اس خیال کی تردید کرتا لیکن مجھے اس نے اس کا موقعہ ہی نہ دیا - اور ایک کھڑکی کو کھولتے ہوئے کہا :-

مسٹر موہن آپ اس جگہ سے تقریباً پندرہ میل کے فاصلہ پر ایک جہاز کے مستول دیکھتے ہیں" اس نے قریب کی ایک چھوٹی سی مشین کیطرف اشارہ کرتے ہوئے کہا "لیکن اس مشین کے ذریعہ سے آپ اس کے ہر چھوٹے بڑے حصہ کو نہایت اچھی طرح سے دیکھ سکتے ہیں - اور میں اسی مشین کے ذریعے سے اس جہاز کو یا اس کے کسی حصہ کو گولے بارود کے بغیر محض ایک برقی رو کے ساتھ تباہ کر سکتا ہوں "

پھر اس نے مجھے مشین کے ایک سوراخ میں سے جہاز کے مختلف حصے اور مسافر دکھائے اور کپتان کی شکل دکھا کر کہا " آپ کپتان کی کلائی پر ایک گھڑی دیکھ رہے ہیں - میں کپتان کی کلائی کو کچھ تکلیف پہونچائے بغیر ہی اس گھڑی کو ٹکڑے ٹکڑے کر دیسکتا ہوں" میرے دیکھتے دیکھتے رشید نے ایک چکر گھمایا اور گھڑی کپتان کی کلائی سے ریزہ ریزہ ہو کر گر پڑی - اس پر کپتان کی حیرانی اور پریشانی دیکھ کر میں خوب ہی ہنسا - رشید بھی مسکرا دیا - پھر رشید نے کھڑکی بند کر دی - بعد ازاں اس نے مجھے وہ آلہ دکھایا جسکے ذریعہ سے وہ سیاروں کا درجہ حرارت معلوم کرتا تھا - اسی آلہ کے ذریعے سے اس نے مجھے بتایا کہ سورج کا درجہ حرارت چھ ہزار ڈگری سنٹی گریڈ ہے - اس نے لیبارٹری کے وسط میں پڑے ہوئے مخروطی گولے کی طرف اشارہ کرکے کہا " یہ وہ راکٹ ہے جس کے ساتھ میں پندرہ منٹ میں ساری دنیا کے گرد گھوم چکا ہوں - میں نے اس کا نام براق رشید رکھا ہے - اسکے استعمال کے لئے میں بعض اوقات شمسی بھٹی کی حرارت سے بھی فائدہ اٹھاتا ہوں شمسی بھٹی کیا چیز ہے؟ یہ تو میں آپ کو پھر بتاؤنگا - پہلے اس چیز کو دیکھیں جو پندرہ منٹ میں اپنے موجد کے ساتھ تمام دنیا کے گرد گھوم چکی ہے - پہلے یہ تیر کی طرح زمین سے اٹھتی ہے - حتیٰ کہ زمین کی کشش ثقل سے باہر نکل جاتی ہے - اگر یہ وہاں پر ٹھہر جائے تو زمین چوبیس گھنٹے میں اس کے سامنے سے نکل جائے - یا یہ زمین کے گرد ۲۴ گھنٹے میں گھوم چکے لیکن نہیں - اسکا دو ہزار گھوڑے کی طاقت رکھنے والا انجن زمین کی حرکت سے مخالف سمت میں پوری رفتار سے دوڑتا ہے - اور اس طرح سے پندرہ منٹ میں زمین کے گرد ایک پورا چکر ختم ہو جاتا ہے - افسوس اسوقت دن ہے اگر رات ہوتی تو میں اپنے قیمتی وقت کے پندرہ منٹ ضائع کرکے آپکو دنیا کی سیر کرا دیتا - لیکن اس وقت دن ہے - میرے مکان کی چھت سے "براق رشید" کو آسمان کی طرف ناقابل تصوّر رفتار سے جاتے دیکھکر کراچی کے باشندے حیرت میں پڑ جائیں گے - اور میرا راز فاش ہو جائے گا -

مسٹر موہن اب میں آپ کو شمشی بھٹی دکھاتا ہوں ۔ کمرے کے وسط میں یہ جو ایک عجیب و غریب دھات کا بنا ہوا بڑا سا صندوق ہے ۔ یہی دراصل شمشی بھٹی ہے ۔ اس کے درجہ حرارت کو میں چھ ہزار ڈگری سنٹی گریڈ تک پہنچا سکتا ہوں ۔ جو سورج کا درجۂ حرارت ہے ۔ اس لئے میں اس کا نام شمشی بھٹی رکھا ہے ۔ یہ بہت کار آمد چیز ہے ۔ اسکے ذریعے ایک انجن کی مدد سے میں ہر دھات کو بخارات میں تبدیل کر سکتا ہوں لیکن جس دھات کی یہ بھٹی بنی ہوئی ہے وہ اس کی حرارت سے نہیں پگھلتی ۔ نہ اس پر گرمی اثر کرتی ہے ۔ نہ سردی ، نہ یہ ٹوٹتی ہے اور نہ مڑ ہی سکتی ہے ۔ اسی دھات کا ایک راکٹ بنا رہا ہوں جس میں مریخ کا سفر کرنے کا ارادہ ہے ۔

اس بھٹی کے ایک حصّہ میں میں نے آسمانی بجلی کو قید کر لیا ہے ۔ آپ لیبارٹری کی چھت میں دو لاکھ باریک اور موٹی تاریں ، اور اس کے اوپر چھوٹے کھمبے دیکھتے ہیں یہ بجلی کو قید کر لیتے ہیں ۔ موسم برسات کی تاریک اور ڈراؤنی راتوں میں چمک کر غائب ہو جانے والی بجلی کئی کروڑ وولٹ کی طاقت رکھتی ہے ۔ اور اس کی اس طاقت کو دیکھ کر یورپ اور امریکہ کے سائنسدانوں کے منہ میں پانی بھر آیا کرتا ہے ۔ لیکن یہ بھی میری غلام ہے ۔ رات کو جس وقت بادل آتے ہیں اور بجلی کڑکتی ہے ۔ یہ کھمبے بلند ہو جاتے ہیں حتیٰ کہ بادلوں تک پہنچ جاتے ہیں ۔ ان کے ذریعے بجلی آتی ہے اور شمشی بھٹی کے ایک حصے میں جمع ہو جاتی ہے ۔

اس بھٹی نے مجھے ورکشاپ سے بے نیاز کر دیا ہے ۔ اگر اسکو دس میل لمبی ، چوڑی ، اور گہری جھیل میں رکھکر وہ خانہ کھول دیا جائے جس میں دھاتیں بخارات میں تبدیل ہو جاتی ہیں ۔ تو جھیل کا پانی صرف آدھ گھنٹے میں بالکل خشک ہو جائے ۔

مسٹر موہن ! میں امید کرتا ہوں کہ اب آپ تشریف لیجائینگے ۔ چونکہ میں مریخ جانے راکٹ کو بہت جلد مکمل کرنا چاہتا ہوں ۔ میں وہ راکٹ بھی آپ کو دکھاتا لیکن ابھی وہ نامکمل ہے ۔ اب مریخ سے واپس آنے کے بعد ہی دیکھئے گا ۔ باقی یہاں ہر طرف عجیب و غریب چیزیں پڑی ہوئی ہیں جن کو دکھانے کے لئے کئی گھنٹے درکار ہیں ۔

میرے والدین سمجھتے ہیں کہ میں لیبارٹری میں اپنی عمر ضائع کر رہا ہوں ۔ حالانکہ میں کرّہ ارض کے گرد پندرہ بار گھوم چکا ہوں ۔ کئی گھنٹے ریڈیم کے تجربات کرنے کے لئے ماؤنٹ ایورسٹ پر گزار چکا ہوں ۔ سمندر کی بے تہاہ گہرائیوں کی کئی بار سیر کر چکا ہوں ۔ اور اکثر اوقات رات کے وقت میں انہی ہوائی موٹروں میں مختلف دھاتیں اور مرکبات خریدنے جاتا ہوں ۔

ان باتوں کے باوجود بھی میری ایجادوں سے میرے رشتہ داروں کے اور تمہارے سوا سب لوگ ناآشنا ہیں ۔ پچھلے دنوں کراچی کے مشہور موجد ظہیر کے کانوں میں میری ایجادوں کی کچھ بھنک پڑ گئی وہ چھپ کر میری لیبارٹری میں داخل ہونا چاہتا تھا ۔ لیکن میں نے دیکھ لیا اور برقی رو کے ذریعہ سے اس کا دایاں بازو شل کر دیا ۔ وہ بھاگ گیا ۔ اور پھر کبھی نہیں آیا ——— اچھا اب آپ تشریف لیجائیں آپ نے میرا آدھ گھنٹہ ضائع کر دیا ۔ میں مدتوں کسی کے ساتھ بات چیت نہیں کرتا ۔ یہ کہتا ہوا وہ مجھے لفٹ تک لایا اور جونہی میں اسمیں کھڑا ہوا اس نے بٹن دبا کر مجھے نیچے اتار دیا ۔

جسدن میں رشید سے ملنے گیا اسیدن کراچی کے مشہور سائنسدان ظہیر نے رشید کی لیبارٹری میں دوبارہ داخل ہونے کی کوشش کی اور کامیاب ہو گیا ۔ تجربہ کرنے کی بڑی میز کے نیچے چھپ کر بیٹھ گیا ۔ اس نے "براق رشید" "شمشی بھٹی" اور دیگر ایجادوں کے متعلق ہماری ساری گفتگو سن لی ۔

میرے جانے کے بعد رشید نے شمشی بھٹی کو کھولا پھر کچھ سوچکر اسے بند کر دیا ۔ اور لفٹ میں بیٹھ کر نیچے اتر گیا ۔ اس کے جانے کے بعد ظہیر میز کے نیچے سے نکلا اور شمشی بھٹی کی ساخت پر غور کرنے لگا ۔ اس نے دو ہینڈل دیکھے ۔ پہلے ہینڈل کو دیکھ کر اس نے یہ نتیجہ نکالا کہ یہ اس خانہ کو کھولنے کے لئے ہے جسمیں بخارات میں تبدیل کرنے کے لئے دھاتیں ڈالی جاتی ہیں اور دوسرے ہینڈل کے متعلق اس کا فیصلہ یہ تھا کہ اس کے گھمانے سے بھٹی میں چھ ہزار ڈگری سنٹی گریڈ کی حرارت پیدا ہو جاتی ہے ۔ لیکن اس کا یہ خیال غلط تھا ۔ وہ خانہ جس میں دھاتیں ڈالی جاتی تھیں دراصل ایک بٹن کے دبانے سے کھلتا تھا ۔ اور ڈھکنا تو بند تھا مگر اس پر پیچ نہیں لگا ہوا تھا ۔ پہلا ہینڈل "شمشی بھٹی" میں کئی ارب وولٹ بجلی داخل کرنے کے لئے تھا ۔ اور دوسرا ہینڈل اس بھٹی کو سورج کی چار مربع گز سطح سے اٹھنے والی شعاعوں کی کیس بنا دیتا تھا ۔ ظہیر پہلے ہینڈل کو دبا کر دھاتیں ڈالنے کے خانے کو کھول کر اس کی ساخت دیکھنا چاہتا تھا ۔ کہ رشید کمرے میں داخل ہوا اور شمشی بھٹی کے پاس ظہیر کو دیکھکر غضبناک ہو گیا ۔ وہ شعاعی پستول کے ذریعہ سے ظہیر کو ہلاک کرنا چاہتا تھا کہ ظہیر نے رشید کو دیکھے بغیر پہلا

ہینڈل دبا دیا وہ سمجھتا تھا کہ اب وہ خانہ جس میں دھاتیں ڈالی جاتی ہیں کھل جائیگا - لیکن اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ کئی ارب وولٹ بجلی بیس ہزار گھوڑے کی طاقت کے انجن کے ذریعے سے دس گنی طاقت حاصل کرکے بھٹی میں داخل ہوئی اور وہ ڈھکنا کھل گیا جو پیچ لگائے بغیر عملی طور پر بند تھا - چھت میں لگی ہوئی لاکھوں تاریں جل اٹھیں - اور رشید وظہیر بھی جلکر خاک ہوگئے - رشید کا مکان بھی جلنے لگا - بغل میں ٹی ٹی کا ایک کارخانہ تھا وہ بھی شعلوں کی لپٹ میں آگیا - لوگوں نے سمجھا کہ رشید کے مکان کو بھی اسی کارخانے سے آگ لگی ہے - اس طرح سے کراچی کی زبردست آتشزدگی وقوع پذیر ہوئی جس کی دور دور مثال نہیں ملتی - اور جس کی اصل وجہ میرے سوا کسی کو معلوم نہیں -

بوڑھے ہپناٹائیزر نے استقدر پڑھکر اپنا روزنامچہ بند کرکے مجھ سے مخاطب ہوا - اب رشید کو آپ کے اور میرے سوا کوئی جانتا بھی نہیں٭

٭ اس کے بدقسمت والدین اس کے ساتھ ہی اس فانی دنیا کو چھوڑ گئے -

اختر سبحانی

شامِ تاریک

چھائی ہے جہاں پہ شام تاریک　　سر پر آنچل سیاہ و باریک
دریا ہیں ظلمتوں کے جاری　　خاموش ہے کائنات ساری
طائر سب آشیاں میں روپوش　　خوابِ معصومیت سے مدہوش
گلزار و ہزار و سار خاموش　　یعنی ساری بہار خاموش
رنگینئ زرفشانِ انجم ٭　　شادابئ کاروانِ انجم
نورِ مہتاب کا تبسم　　دریا کے خرام کا ترنم
گلہائے نظر نواز کے رنگ　　گلہائے چمن طراز کے رنگ
تاریکئ انتظار میں گم　　اندوہ غم آشکا میں گم
مطرب کا ساز سو گیا ہے　　نغمہ خاموش ہوگیا ہے

(۲)
انوار سیاہ جاگ اٹھے ہیں　　عشرت کے گناہ جاگ اٹھے ہیں
روشن ہے دیا عیش کوشی　　رندی مستی - شراب نوشی
نغمے رقصاں ہیں عاشقی کے　　شہرے ہیں طریق آذری کے
غلبہ مستی نے پا لیا ہے　　نیکی نے منہ چھپا لیا ہے
برسیں گے یہاں گناہ کے پھول　　عشرت کی جلوہ گاہ کے پھول
تم زینتِ شامِ زندگی ہو

کچھ نشہ فضا میں پیرتا ہے　　شیطاں ہوا میں تیرتا ہے

(۳)
وہ حسنِ سیاہ کار نکلا　　وہ غیرتِ صد بہار نکلا
اک بار چمک اٹھیں فضائیں　　اک بار مہک اٹھیں ہوائیں
شاداب و کامران و گل پوش　　رنگینئ عاشقی سے بیہوش
پیراہنِ ریشمی بدن پر ٭　　گلرنگ و مرمریں بدن پر
اندازِ شباب گل بدامن　　آنکھوں میں شمعِ حسن روشن
ہر ایک ادا ہوس کا پیغام　　ہر ایک نگاہ عشرت انجام
شانوں پہ فتنہ خیز گیسو　　بکھرے ہوئے مشک ریز گیسو
ہر عشوۂ بیقرار عریاں　　ہر غمزۂ سحر کار عریاں
بالکل سرشار ہیں نگاہیں　　شاداب بہار ہیں نگاہیں
پاؤں میں لچک جوانیوں کی　　بارش ہے گلفشانیوں کی
ہونٹوں پہ موجزن تبسم　　گویا کہ چمن چمن تبسم ٭
اس حسن سے ہے بہارِ ہستی　　رنگینئ زرنگارِ ہستی ٭
ننگ و ناموس کو بھلا کے　　بس میں ہو تو میں کہوں جا کے
تم صبحِ دوامِ زندگی ہو

عابد

مسٹر موہن اب میں آپ کو شمسی بھٹی دکھاتا ہوں ۔ کمرے کے وسط میں یہ جو ایک عجیب و غریب دھات کا بنا ہوا بڑا سا صندوق ہے ۔ یہی دراصل شمسی بھٹی ہے ۔ اس کے درجہ حرارت کو میں چھ ہزار ڈگری سنٹی گریڈ تک پہنچا سکتا ہوں ۔ جو سورج کا درجۂ حرارت ہے ۔ اس لئے میں اس کا نام شمسی بھٹی رکھا ہے ۔ یہ بہت کار آمد چیز ہے ۔ اسکے ذریعے ایک انجن کی مدد سے میں ہر دھات کو بخارات میں تبدیل کر سکتا ہوں لیکن جس دھات کی یہ بھٹی بنی ہوئی ہے وہ اس کی حرارت سے نہیں پگھلتی ۔ نہ اس پر گرمی اثر کرتی ہے ۔ نہ سردی، نہ یہ ٹوٹتی ہے اور نہ مڑ ہی سکتی ہے ۔ اسی دھات کا ایک راکٹ بنا رہا ہوں جس میں مریخ کا سفر کرنے کا ارادہ ہے ۔

اس بھٹی کے ایک حصہ میں میں نے آسمانی بجلی کو قید کر لیا ہے ۔ آپ لیبارٹری کی چھت میں دو لاکھ باریک اور موٹے تاریں، اور اس کے اوپر چھوٹے کھمبے دیکھتے ہیں یہ بجلی کو قید کر لیتے ہیں ۔ موسم برسات کی تاریک اور ڈراؤنی راتوں میں چمک کر غائب ہو جانے والی بجلی کئی کروڑ وولٹ کی طاقت رکھتی ہے ۔ اور اس کی اس طاقت کو دیکھکر یورپ اور امریکہ کے سائنسدانوں کے منہ میں پانی بھر آیا کرتا ہے ۔ لیکن یہ بھی میری غلام ہے ۔ رات کو جسوقت بادل آتے ہیں اور بجلی کڑکتی ہے ۔ یہ کھمبے بلند ہو جاتے ہیں حتیٰ کہ بادلوں تک پہنچ جاتے ہیں ۔ ان کے ذریعے بجلی آتی ہے اور شمسی بھٹی کے ایک حصے میں جمع ہو جاتی ہے ۔

اس بھٹی نے مجھے ورکشاپ سے بے نیاز کر دیا ہے ۔ اگر اسکو دس میل لمبی، چوڑی، اور گہری جھیل میں رکھکر وہ خانہ کھولدیا جائے جس میں دھاتیں بخارات میں تبدیل ہو جاتی ہیں ۔ تو جھیل کا پانی صرف آدھ گھنٹے میں بالکل خشک ہو جائے ۔

مسٹر موہن! میں امید کرتا ہوں کہ اب آپ تشریف لیجائیں گے ۔ چونکہ میں مریخ جانے کے راکٹ کو بہت جلد مکمل کرنا چاہتا ہوں ۔ میں وہ راکٹ بھی آپ کو دکھاتا لیکن ابھی وہ نامکمل ہے ۔ اب مریخ سے واپس آنے کے بعد ہی دیکھئے گا ۔ باقی یہاں ہر طرف عجیب و غریب چیزیں پڑی ہوئی ہیں جن کو دکھانے کے لئے کئی گھنٹے درکار ہیں ۔

میرے والدین سمجھتے ہیں کہ میں لیبارٹری میں اپنی عمر ضائع کر رہا ہوں ۔ حالانکہ میں کرۂ ارض کے گرد پندرہ بار گھوم چکا ہوں ۔ کئی گھنٹے ریڈیم کے تجربات کرنے کے لئے مونٹ ایوریسٹ پر گزار چکا ہوں ۔ سمندر کی بے تہاہ گہرائیوں کی کئی بار سیر کر چکا ہوں ۔ اور اکثر اوقات رات کے وقت میں انہی ہوائی موٹروں میں مختلف دھاتیں اور مرکبات خریدنے جاتا ہوں ۔

ان باتوں کے باوجود بھی میری ایجادوں سے میرے رشتہ داروں کے اور تمہارے سوا سب لوگ ناآشنا ہیں ۔ پچھلے دنوں کراچی کے مشہور موجد ظہیر کے کانوں میں میری ایجادوں کی کچھ بھنک پڑ گئی وہ چھپ کر میری لیبارٹری میں داخل ہونا چاہتا تھا ۔ لیکن میں نے دیکھ لیا اور برقی رو کے ذریعہ سے اس کا دایاں بازو شل کر دیا ۔ وہ بھاگ گیا ۔ اور پھر کبھی نہیں آیا ——— اچھا اب آپ تشریف لیجائیں آپ نے میرا آدھ گھنٹہ ضائع کر دیا ۔ میں مدتوں کسی کے ساتھ بات چیت نہیں کرتا ۔ یہ کہتا ہوا وہ مجھے لفٹ تک لایا اور جونہی میں اسمیں کھڑا ہوا اُس نے بٹن دبا کر مجھے نیچے اتار دیا ۔

جسدن میں رشید سے ملنے گیا اسیدن کراچی کے مشہور سائنسدان ظہیر نے رشید کی لیبارٹری میں دوبارہ داخل ہونے کی کوشش کی اور کامیاب ہو گیا ۔ تجربہ کرنے کی بڑی میز کے نیچے چھپ کر بیٹھ گیا ۔ اس نے "براق رشید" "شمسی بھٹی" اور دیگر ایجادوں کے متعلق ہماری ساری گفتگو سن لی ۔

میرے جانے کے بعد رشید نے شمسی بھٹی کو کھولا ۔ پھر کچھ سوچکر اسے بند کر دیا ۔ اور لفٹ میں بیٹھ کر نیچے اتر گیا ۔ اس کے جانے کے بعد ظہیر میز کے نیچے سے نکلا اور شمسی بھٹی کی ساخت پر غور کرنے لگا ۔ اس نے دو ہینڈل دیکھے ۔ پہلے ہینڈل کو دیکھ کر اُس نے یہ نتیجہ نکالا کہ یہ اس خانہ کو کھولنے کے لئے ہے جسمیں بخارات میں تبدیل کرنے کے لئے دھاتیں ڈالی جاتی ہیں اور دوسرے ہینڈل کے متعلق اس کا فیصلہ یہ تھا کہ اس کے گھمانے سے بھٹی میں چھ ہزار ڈگری سنٹی گریڈ کی حرارت پیدا ہو جاتی ہے ۔ لیکن اس کا یہ خیال غلط تھا ۔ وہ خانہ جس میں دھاتیں ڈالی جاتی تھیں دراصل ایک بٹن کے دبانے سے کھلتا تھا ۔ اور ڈھکنا تو بند تھا مگر اس پر پیچ نہیں لگا ہوا تھا ۔ پہلا ہینڈل "شمسی بھٹی" میں کئی ارب وولٹ بجلی داخل کرنے کے لئے تھا ۔ اور دوسرا ہینڈل اس بھٹی کو سورج کی چار مربع گز سطح سے اٹھنے والی شعاعوں کو عکس بنا دیتا تھا ۔ ظہیر پہلے ہینڈل کو دبا کر دھاتیں ڈالنے کے خانے کو کھول کر اس کی ساخت دیکھنا چاہتا تھا ۔ کہ رشید کمرے میں داخل ہوا اور شمسی بھٹی کے پاس ظہیر کو دیکھکر غضبناک ہو گیا ۔ وہ شعاعی پستول کے ذریعہ سے ظہیر کو ہلاک کرنا چاہتا تھا کہ ظہیر نے رشید کو دیکھے بغیر پہلا

ہینڈل دبادیا وہ سمجھتا تھا کہ اب وہ خانہ جس میں دھاتیں ڈالی جاتی ہیں کھل جائیگا - لیکن اس کا نتیجہ یہ ہؤا کہ کئی ارب وولٹ بجلی بیس ہزار گھوڑے کی طاقت کے انجن کے ذریعے سے دس گنی طاقت حاصل کرکے بھٹی میں داخل ہوئی اور وہ ڈھکنا کھل گیا جو پیچ لگائے بغیر معمولی طور پر بند تھا۔ چھت میں لگی ہوئی لاکھوں تاریں جل اٹھیں - اور رشید وظہیر بھی جلکر خاک ہو گئے - رشید کا مکان بھی جلنے لگا - بغل میں ہی ٹی کا ایک کارخانہ تھا وہ بھی شعلوں کی لپیٹ میں آگیا - لوگوں نے سمجھا کہ رشید کے مکان کو بھی اسی کارخانے سے آگ لگی ہے - اس طرح سے کراچی کی زبردست آتشزدگی وقوع پذیر ہوئی - جس کی دور دور مثال نہیں ملتی - اور جس کی اصل وجہ میرے سوا کسی کو معلوم نہیں -

بوڑھے ہسپتال ٹائیپر نے اسقدر پڑھکر اپنا روزنامچہ بند کرکے مجھ سے مخاطب ہؤا - اب رشید کو آپ کے اور میرے سوا کوئی جانتا بھی نہیں ۔ اس کے بدقسمت والدین اس کے ساتھ ہی اس فانی دنیا کو چھوڑ گئے ۔

اختر سبحانی

شامِ تاریک

چھائی ہے جہاں پر شام تاریک سر پر آنچل سیاہ و باریک
دریا ہیں ظلمتوں کے جاری خاموش ہے کائنات ساری
طائر سب آشیاں میں روپوش خواب معصومیت سے مدہوش
گلزار و ہزار و سار خاموش یعنی ساری بہار خاموش
رنگینیٔ زرفشانِ انجم ؛ شادابیٔ کاروانِ انجم
نورِ مہتاب کا تبسم دریا کے خرام کا ترنم
گلہائے نظر نواز کے رنگ گلہائے چمن طراز کے رنگ
تاریکیٔ انتظار میں گم اندوہ غمِ آشنا میں گم
مطرب کا ساز سو گیا ہے نغمہ خاموش ہو گیا ہے
انوارِ سیاہ جاگ اُٹھے ہیں عشرت کے گناہ جاگ اُٹھے ہیں (۲)
روشن ہے دیا عیش کوشی رندی مستی - شراب نوشی
نغمے رقصاں ہیں عاشقی کے شہرے ہیں طریق آذری کے
غلبہ مستی نے پالیا ہے نیکی نے منہ چھپا لیا ہے
برسیں گے یہاں گناہ کے پھول عشرت کی جلوہ گاہ کے پھول
تم زینتِ شامِ زندگی ہو

کچھ نشہ فضا میں پیرتا ہے شیطاں ہوا میں تیرتا ہے
وہ حسنِ سیاہ کار نکلا (۳) وہ غیرتِ صد بہار نکلا
اک بار چمک اُٹھیں فضائیں اک بار مہک اُٹھیں ہوائیں
شاداب و کامران و گل پوش رنگینیٔ عاشقی سے بیہوش
پیراہن ریشمی بدن پر ؛ گلرنگ و مرمریں بدن پر
انداز شباب گل بدامن آنکھوں میں شمعِ حسن روشن
ہر ایک ادا ہوس کا پیغام ہر ایک نگاہ عشرت انجام
شانوں پہ فتنہ خیز گیسو بکھرے ہوئے مشک ریز گیسو
ہر عشوۂ بیقرار عریاں ہر غمزۂ سحر کار عریاں
بالکل سرشار ہیں نگاہیں شاداب بہار ہیں نگاہیں
پاؤں میں لچک جوانیوں کی بارش ہے گلفشانیوں کی
ہونٹوں پہ موجزن تبسم گویا کہ چمن چمن تبسم ؛
اس حسن سے ہے بہارِ ہستی رنگینیٔ زرنگارِ ہستی ؛
ننگ و ناموس کو بھلا کے بس میں ہو تو میں کہوں یہ جا کے
تم صبح دوامِ زندگی ہو

عابد

مشرق و اہلِ مشرق

رُوپ متی اور باز بہادر کے غیر فانی عشق و محبّت کی سرزمین مانڈو گڑھ

ہر عروج میں زوال اور ہر ترقی میں انحطاط پنہاں ہے۔ ہر بہار کے بعد خزاں اور تعمیر کے بعد انہدام لازمی ہے۔ ہر عظمت کے لیے ذلّت اور ہر بلندی کے واسطے پستی ضروری ہے۔ فطرت کی کرشمہ سازیوں کو یکرنگی نہیں بھاتی۔ قدرت کی نیرنگیاں کسی کو ایک حالت میں نہیں دیکھ سکتیں۔ کل جو بالکل وحشی تھے آج مہذب بن گئے ہیں۔ کل جو مہذب تھے آج نرے بدتمیز نظر آرہے ہیں۔ مغرب کے ملاحوں کی جھونپڑیاں فلک بوس قصروں میں تبدیل ہوگئی ہیں۔ مشرق کے بادشاہوں کے محل زمیں بوس کھنڈروں سے بدل گئے ہیں۔ کل جہاں اُلّو بولتے تھے آج وہاں گلستاں نظر آرہا ہے۔ کل جہاں چمن تھا آج وہاں گدھے لوٹ رہے ہیں۔

مانڈو۔ روپ متی اور باز بہادر کے عشق و محبت کی سرزمین مانڈو جو کبھی اپنی سرسبزی و شادابی۔ اپنی آبادی اور چہل پہل۔ اپنے قلعے اور فصیل۔ اپنی قوت و نزاکت اور اپنی عشق و محبت کی بنا پر عالمگیر شہرت رکھتا تھا۔ آج اس کی گم نامی کی یہ حالت ہے کہ اسی ملک میں بسنے والے بہت سے لوگ اس کا نام تک نہیں جانتے۔ ممکن ہے آپ بھی اس نام سے ناآشنا ہوں اور اس کی عظمتِ رفتہ کی کیفیت سن کر متحیر ہو جائیں۔ مگر نہیں اس پر تعجب نہ کیجیے۔ تعجب کیجیے مشرق کی خود فراموشی پر۔ تعجب کیجیے اسلاف کے عروج اور اپنے زوال پر۔ تعجب کیجیے ان کی عظمت اور اپنی ذلت پر!

بے شک بہار کے بعد خزاں لازمی ہے۔ یقیناً ہر مد کے بعد جزر ضروری ہے۔ مگر یہ کیا ہے کہ ہماری خزاں ختم ہونے کو نہیں آتی۔ صدیاں گزر گئیں مگر جزر کی پستی مد کی بلندی سے بدلنے کا نام نہیں لیتی۔ ایک وہ تھے کہ مٹتے مٹتے بھی ان کی عظمت کے آثار اب تک باقی ہیں۔ ایک ہم ہیں کہ ان کی مستحکم بنیادوں پر بھی کوئی معمولی سی عمارت نہیں بنا سکتے۔ آپ مانڈو اور اس کے گڑھوں پر تعجب کر رہے ہیں۔ حالانکہ عموماً سارے مشرق اور خصوصاً دیارِ ہند کی سرزمین ہندوستان کا چپہ چپہ اسی قسم کی قیمتی یادگاروں سے بھرا پڑا ہے ——— یہاں مصریوں کا تمدن دفن ہے ——— یہاں عربوں کی تہذیب مدفون ہے ——— یہ یونانیوں کی شائستگی کا مزار ہے ——— یہ ایرانیوں کی ترقی کے کھنڈر ہیں ——— یہ آریوں کی عظمت کے نقشے ہیں ——— یہ اشوک نے بنوایا تھا ——— اسے چندر گپت نے تعمیر کیا تھا ——— یہ مغلوں کی یادگار ہے ——— یہاں سلطنت کے لئے بھائی بھائی میں جنگ ہوئی تھی ——— یہاں باپ بیٹے لڑ پڑے تھے ——— یہ ممتاز کا تاج ہے ——— یہ سارے قلعوں کا سرتاج ہے ——— یہ رائے پتھورا کی راج دھانی ہے ——— یہاں عدل و انصاف کے چشمے بہتے تھے ——— یہاں خون کا دریا رواں تھا ——— یہ مانڈو گڑھ ہے۔ یہاں قاف کی پریاں رہتی تھیں۔ اب اس میں چمگادڑ بستے ہیں! یہ روپ متی کی عشرت گاہ تھی۔ اب ابابیلوں کی خواب گاہ ہے! ——— یہ باز بہادر کا محل تھا اب درندوں کا مسکن ہے۔

متحیر کیوں ہو رہے ہیں؟! اگر آپ اپنے اسلاف کے کارناموں سے ناواقف ہیں تو ہم نے آپ ہی کی واقفیت کے لیے "ادبی دنیا" کے چند صفحے ہر ماہ "مشرق و اہلِ مشرق" پر وقف کر دیے ہیں۔ اور اگر آپ مشرق کی فراموش شدہ عظمت سے واقف ہیں تو بھی آپ کے زخم ہائے جگر کی تواضع کے لیے ان قصہ ہائے پارینہ کو ماہ بماہ دہرانا ہم اپنا فرض خیال کرتے ہیں۔ ہو سکتا ہے کہ جہاں کوئی تدبیر کام نہیں دیتی وہاں یہ کچھ کے باثر ثابت ہوں اور ہم اپنی کھوئی ہوئی عظمت کو نہ بھی پائیں تو کم سے کم اس کے حصول کا خیال ہی پیدا ہو جائے۔

مانڈو گڑھ۔ بندھیاچل کی ایک شاخ کی کشادہ سطح پر واقع ہے جو سمندر کی سطح سے دو ہزار ۹۰ فٹ بلند ہے۔ قدرت نے اپنے آسمانی اوزاروں سے اس پہاڑی کی چٹانیں کاٹ کر اس کے پہلو کچھ ایسے سیدھے بنا دیے ہیں کہ یہاں کے قلعوں کی ایک قدرتی فصیل تیار ہو گئی ہے۔ مانڈو گڑھ کی ابتدائی تاریخ پردۂ خفا میں ہے اس کی معتبر تاریخ کا آغاز چودھویں صدی عیسوی سے ہوتا ہے جب رائے مہالک دیو اس قدرتی قلعے پر قابض اور اردگرد کے علاقے کا حکمراں تھا۔ ۱۳۰۴ء میں عین الملک کے ہاتھوں پہلی بار مسلمانوں کے قبضے میں آیا اور مدتوں شاہانِ مالوہ کا دارالسلطنت بنا رہا۔ ہوشنگ شاہ غوری نے ۱۴۰۵ء سے ۱۴۳۲ء تک اپنے ایامِ سلطنت میں اسے کچھ کا کچھ بنا دیا۔ عظیم الشان قلعے تیار کیے۔ شاندار مسجدیں بنائیں۔ ان میں مدرسے جاری کیے۔ خوبصورت بازار سجائے سرسبز تو پہلے ہی سے تھا۔ اس نے چمن بندی کر کے اسے باغِ ارم کا ایک ٹکڑا بنا دیا۔ گجرات کے فرمانروا ہمیشہ اسے للچائی ہوئی نظروں سے دیکھا کرتے تھے۔ مگر ہوشنگ شاہ غوری کی زندگی میں کسی کی پیش نہ گئی۔ اس کی وفات کے بعد والیانِ گجرات نے کئی حملے کیے۔ آخر

۱۵۱۷ء میں مظفر شاہ کا حملہ کامیاب ہوا اور مانڈوگڑھ والئ گجرات کے زیر اقتدار آگیا لیکن جب مالوہ پر بہادر شاہ کا قبضہ ہوگیا تو ایک خوفناک معرکے کے بعد ۱۵۳۱ء میں مانڈوگڑھ پر بھی اسی کا اقتدار قائم ہوگیا۔ مگر اس کی حکومت بھی کچھ پائدار نہ ثابت ہوئی اور ۱۵۳۵ء میں قادر شاہ نے مالوہ کو فتح کرکے اس پر بھی قبضہ کرلیا۔ وہ بھی کیا زمانہ تھا اور کیسی طوائف الملوکی پھیلی ہوئی تھی۔ بنت بنت پر بادشاہوں کی سیاست بدلتی تھی۔ جان توڑ کوشش کے بعد ایک جگہ کو فتح کرتے تھے۔ مگر بسا اوقات جنگ کی تکان دور ہونے سے پہلے ہی ان کی رائے بدل جاتی تھی اور جس کے لیے ہزاروں انسانوں کا خون پانی کی طرح بہا دیا تھا اس کو خود ہی چھوڑ کر دوسری جگہ چل دیتے تھے۔

موجودہ معنوں میں قومیت اور وطنیت کے الفاظ گزشتہ صدی کی پیداوار ہیں۔ اگر اب سے تین چار سو سال پہلے یہ الفاظ ان ہی معنوں میں موجود ہوتے تو غالباً ایسی خانہ جنگیاں وجود میں نہ آتیں اور کوئی اسلامی فرماں روا کسی اسلامی حکومت پر۔ کوئی ہندو راجہ کسی ہندو ریاست پر چڑھائی نہ کرتا۔ اب چاہے خود غرض مورخ گزشتہ واقعات کو کسی رنگ میں پیش کریں۔ مگر واقعہ یہ ہے کہ اس وقت جنگ محض مال و دولت اور حکومت کی شان و شوکت کیلیے ہوا کرتی تھی۔ ایک مسلمان بادشاہ اپنی سلطنت بڑھانے کے لیے اگر موقع پاتا تو مذہب سے بے پروا ہوکر دوسری سلطنت پر حملہ کردیتا۔ اس کو اس کا کوئی خیال نہ ہوتا تھا کہ مقابل مسلمان ہے یا ہندو۔ اس کو تو اپنا علاقہ وسیع کرنے کی آرزو ہوتی تھی مسلمان کے قبضہ سے لے یا ہندو کے۔ اسی طرح ایک ہندو راجہ مال و دولت اور ملک گیری کی تمنا میں موقع پاکر جیسے ایک اسلامی سلطنت پر حملہ کرنا اپنا جائز حق سمجھتا تھا ویسے ایک ہندو راج پر بھی چڑھائی کرنے میں بھی اسکے نزدیک کوئی برائی نہیں تھی۔ آج جن خیالات کو زبردستی ہر دل کے دماغ میں ٹھونسنے کی کوشش کی جارہی ہے ان کو اس کا گمان بھی نہ تھا۔ ان کی جنگ صرف مال و دولت کے لیے ہوتی تھی اور صرف سلطنت کے لیے۔

فتح کے چند ہی دنوں بعد قادر شاہ مانڈوگڑھ چھوڑ کر چلا گیا اور ملوخاں نے میدان خالی پاکر اس پر اپنی حکومت قائم کرلی۔ مگر ابھی قدم بھی نہ جمانے پایا تھا کہ ۱۵۴۵ء میں شیر شاہ سوری مالوہ جا دھمکا۔ ملوخاں اپنی جان لے کر بھاگا اور مانڈوگڑھ شیر شاہ کے صوبہ دار مالوہ شجاول خاں کا دارالحکومت قرار پایا۔ سوری خاندان کا آفتاب اقبال جس سرعت سے نصف النہار پر پہنچا تھا اسی تیزی سے غروب بھی ہوگیا۔ شجاول خاں کے عاشق مزاج بیٹے باز بہادر نے اپنے باپ کے بعد خود مختاری کا اعلان کردیا۔ مگر ایک عاشق سے اور سلطنت سے کیا واسطہ؟! اور عاشق بھی باز بہادر جیسا جس کے عشق کے افسانے اب تک وسط ہند میں جذبات کا تلاطم برپا کیے رہتے ہیں اور جو کوہسار مانڈو کی لیلیٰ روپمتی کے مقابلے میں اب تک مجنونِ مالوہ کے نام سے یاد کیا جاتا ہے۔

۱۵۶۱ء میں مانڈوگڑھ سلطنت مغلیہ میں شامل ہوگیا۔ ۱۵۹۸ء میں اکبر نے مانڈو کو اپنے قدوم سے مشرف کیا اور سیر و شکار کے لیے پندرہ دن تک وہاں ٹھیرا رہا۔ ۱۶۱۷ء میں قدرتی مناظر کا شیدائی جہانگیر اور اس کی محبوبۂ دل نواز نورجہاں مانڈوگڑھ کے دلفریب مناظر سے کئی دن لطف اندوز ہوتے رہے۔ ان کے ساتھ شاہ انگلستان کا سفیر سر ٹامس راؤ اور پادری ٹیری بھی تھا۔ جہانگیر نے اپنے توزک میں بڑے فخر کے ساتھ لکھا ہے کہ اس سیاحت میں نورجہاں نے چار شیر شکار کیے۔ ۱۶۲۲ء میں مانڈو کی دلچسپیوں نے جہانگیر اور نورجہاں کو پھر اپنی طرف کھینچا اور وہ مہینوں وہاں ٹھیرے رہے۔ جہانگیر نے تین لاکھ روپے کی لاگت سے پرانے محلوں کی تعمیر و تجدید کرائی۔ شہزادہ خرم (شاہجہاں) نے باپ سے سرکشی کی تو اس کو کوئی جائے پناہ نہ ملتی تھی۔ آخر ۱۶۲۵ء میں مانڈوگڑھ نے اسے اپنی پناہ میں لے لیا۔ ۱۶۹۶ء میں اس پر مرہٹے قابض ہوگئے مگر وہ بھی چین سے اس پر سلطنت نہ کرسکے اور کئی معرکوں کے بعد ۱۷۳۲ء میں مانڈوگڑھ مہاراجہ دھار کے قبضہ میں آگیا اب بھی اس پر اسی خاندان کی ریاست ہے۔ مگر اس کی پرانی شان و شوکت مدت کی فنا ہوگئی۔ اب نہ وہ محل ہیں۔ نہ وہ سیرگاہیں ہیں۔ نہ وہ شوکت ہے نہ وہ عظمت ہے۔ اب مانڈوگڑھ نام ہے چند بے ترتیب جھونپڑوں کے مجموعے کا جہاں کبھی باز بہادر کی معشوقہ روپ متی رہتی تھی۔ آج وہاں مدہے بستے ہیں۔ جہاں کبھی جہانگیر اور نورجہاں ٹھیرتے تھے آج وہاں گھوسیوں اور گوالوں کی گائیں بھینسیں بندھتی ہیں۔

انسان کی بنائی ہوئی دلفریبیاں ایک ایک کرکے ختم ہوگئیں۔ مگر قدرت کی دلچسپیاں اب تک جوں کی توں موجود ہیں۔ اس کی سرسبزی و شادابی اب تک خوابیدہ جذبات میں ہیجان پیدا کرتی رہتی ہے۔ پرشوکت عمارتیں زمین کے برابر ہوکر اپنی مصنوعیت کھوچکی ہیں اور ہرے بھرے جنگلوں میں فطرت کے پرہیبت حسن میں خوفناک اضافہ کرتے ہیں۔ اور گرد خراسانی املی کے گاؤدم تنے والے درختوں کی قطار ایسی معلوم ہوتی ہے کہ گویا قدرت نے اپنے حسن کی نگہبانی کے لیے اپنی آسمانی فوج کے لاتعداد سپاہیوں کو پہرے پر مقرر کردیا ہے۔ اس علاقے کے لوگ اسے خراسانی املی کہتے ہیں مگر یہ دراصل افریقہ کا ایک جنگلی درخت ہے جسے عہد اسلامی کے کسی شوقین فرمانروا نے ابی سینا سے منگا کر یہاں لگایا تھا۔

آج کل مانڈوگڑھ سے ۲۴ میل جنوب مشرق کی جانب سی۔ پی (وسط ہند) کی ریاست دھار کا صدر مقام شہر دھار واقع ہے۔ مانڈوگڑھ کی سیر کرنے والے عموماً یہیں سے ہوکر جاتے ہیں۔ مانڈو کی فصیل کا گھیر تقریباً تیس میل ہے۔ جامع مسجد اور ہوشنگ شاہ کا مقبرہ دور ہی سے دکھائی پڑتے ہیں۔ شہر کے اندر داخل ہونے پر قدم قدم پر شوکت دیرینہ کے نقوش نظر آتے ہیں۔ کوئی عمارت اپنی اصلی حالت پر نہیں ہے۔ مگر ٹوٹے پھوٹے کھنڈر ہی ان کی ساری داستان سنا کر دیکھنے والے کے سامنے انسانی کارناموں کی بے ثباتی کا حسرتناک نقشہ پیش کردیتے ہیں۔ گنبد گرچکے ہیں مینارے پست ہوچکے ہیں۔ دیواریں ننگی ہوگئی ہیں۔ کوئی نہیں ہے جو ان کی تجدید تعمیر کرائے۔ صرف جنگلی درخت اور خودرو سبزے کی ہریالی ان کی پردہ پوشی کررہی ہے۔

غلجی بادشاہوں (پٹھانوں) کی یادگاریں ہنڈولا محل۔ جہاز محل اور چمپا باؤلی کو سوگوار اور سنجیدہ بنتے سیاحوں کو مبہوت بنادیتے ہیں مغلوں کے عشرت کدوں کی فرسودہ

نقش و نگار کو دیکھ کر انسان ششدر رہ جاتا ہے۔ چمپا باؤلی کا پانی جو کبھی حسن و جمال کی خوش ادائیوں کا مرکز تھا۔ اب کالے ناگ کی طرح کاٹنے دوڑتا ہے۔ اس کے کناروں کے محل جو کبھی بیگمات کے سرد خانے تھے اب بھیڑیوں کے بھٹ بنے ہوئے ہیں تالاب کے وسط میں ایک بارہ دری بنی ہوئی تھی۔ مگر اب اس کنول کے پھول کی بھی پتیاں بکھر چکی ہیں اور اس کی یادگار صرف ایک دیوار اور چبوترے کا کچھ حصہ باقی رہ گیا ہے۔ باز بہادر اور روپ متی کا محل اب تک ان کے عشق و محبت کی داستان دہراتا رہتا ہے۔ یہ اگرچہ بہت بڑا نہیں۔ مگر اسکے گوشے گوشے سے ایک عاشق کا پاکیزہ مذاق نمایاں ہے۔ روپ متی کی حسین چھتری بھی اب تک اپنے مکین کے حسن کی یاد تازہ کر رہی ہے۔

مانڈوگڑھ صدیوں مختلف قوموں اور مختلف خاندانوں کے بادشاہوں کی جولاں گاہ بنا رہا۔ جو پہنچا اس نے حسن کی اس دیوی کو اپنے مذاق کے مطابق سنوارنے کی کوشش کی۔ مگر نہ وہ رہے نہ ان کی آرائشیں رہیں۔ البتہ ان کے کھنڈر اب بھی ان کی عظمت و شوکت کا پتہ دینے کو موجود ہیں اور پچھلوں کو اگلوں کے کارنامے سنا کر عمل کی دعوت دے رہے ہیں۔ کاش! کوئی سنے اور اپنے اسلاف کی پیروی کرکے مشرق کو ایک بار پھر تہذیب و تمدن کا گہوارہ بنا دینے کیلئے سرگرم عمل ہو جائے!

میلا رام وفاؔ

خاکستر مشتعل

آج پھر کیا چیز ہے سینے کے اندر مشتعل
پھر خدا جانے کہاں سے آگیا پہلو میں دل

میں سوائے خاک پاتا ہی نہ تھا دل کا نشان
تجھ کو خاکستر میں کیونکر مل گئیں چنگاریاں

لے کے جن چنگاریوں کو شعلہ ساماں کر دیا
داغ روشن کر دیئے یکسر چراغاں کر دیا

یا مجھے بیگانۂ سوزِ محبت دیکھ کر
جوشِ غیرت میں غرورِ حسن نے ڈالی نظر

مشقِ تخلیقِ شرارِ بے نشاں کرنے لگا
اس طرح اپنے اثر کا امتحاں کرنے لگا

آگ پیدا کی شعارِ عشوہ و انداز سے
آگ میں بھڑکا دیئے شعلے ہوائے ناز سے

یا یہ فطرت حسن کی ہے جو بروئے کار ہے
جلوہ افروزی بشوقِ گرمیِ بازار ہے

واقعی ذوقِ نمائش اقتضائے حسن ہے
کس کو تابِ یک نظر ہے یہ صلائے حسن ہے

برق پاشِ جلوہ کو اس کی ذرا پروا نہیں
ہوش کھو بیٹھے کوئی یا آگ لگ جائے کہیں

یا یہ صورت ہے کہ دل آئینہ ہے تو آفتاب
یوں ہوئی آغوشِ دل جلوے سے تیرے کامیاب

کیوں نہیں تو حسن ہے تیری طبیعت فیض ہے
تیری زینت ہے محبت تیری طینت فیض ہے

آئینہ کیا، جب نوازش تیری آئے جوش میں
تیرے پرتو سے ہو تابش ذرۂ روپوش میں

کوئی صورت بھی ہو، استعداد لازم ہے مگر
جوہرِ قابل ہو تب ہوتی ہے ترتیبِ اثر

آبِ نیساں ہے گہر، لیکن صدف کیواسطے
ہے سعادت مہر میں برجِ شرف کے واسطے

کیا اُگا تا مینہ، زمیں میں جب نہ تھی روئیدگی
کیا جلاتی برق، خاکستر میں اہلیت نہ تھی

مجھ میں استعداد کیا، ایسی بلا کی بے حسی
بے دلی میں یاس کے ہاتھوں بنا جس کی پڑی

تو نے اس عالم میں کیونکر سوز پیدا کر دیا
دل تو خاکستر تھا، کیسے دل کو شعلہ کر دیا

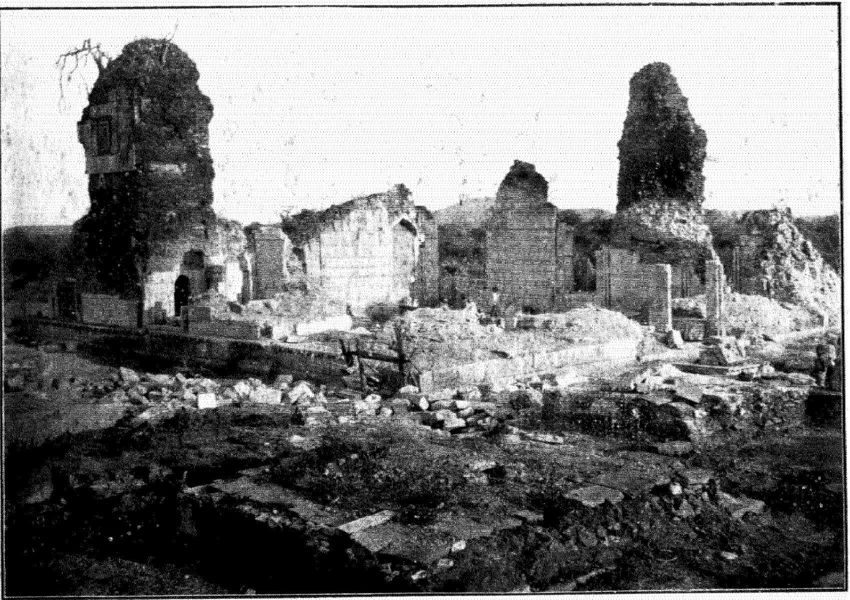
سحر ہے یہ، خرقِ عادت ہے، یہ وہ اعجاز ہے
جس کی حامل ایک تیری ہی نگاہِ ناز ہے

آسمانِ حسن کی زہرہ! ہے وہ قدرت تجھے
نذر دیتا ہے فرشتہ ہدیۂ الفت تجھے

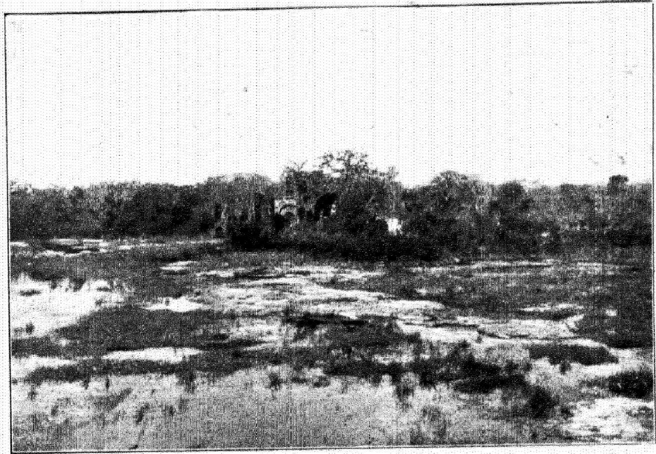
تو لگائے آگ پانی میں کہ چھا جائے دھواں
تو جھکائے عصمتِ قدسی کو بابل کا کنواں

آہ تو اور مانیؔ ناکام کی بزمِ حیات
کیا ترے جلوے کو کم تھی یہ فضائے کائنات

مانیؔ جائسی



مانڈو گڑھ میں سلطان خلجی کا شکستہ مقبرہ



مانڈو گڑھ شاہی محل کی مشہور جھیل "چمپا باولی" کا



مانڈو گڑھ کی دوسری جھیل سے شاہی محل کا نظارہ

اردو کی سب سے پہلی شاعرہ

چندا

اردو کے ساتھ جہاں اور بے اعتنائیاں کی گئیں وہاں یہ ظلم بھی کیا گیا کہ کسی نے کوئی عمدہ اور سنجیدہ تذکرہ اردو شعر کہنے والی عورتوں کا آجتک نہیں لکھا — لالہ سری رام نے "خمخانۂ جاوید" - مولوی عبدالحئی نے "گل رعنا" - مولوی عبدالسلام نے "شعرالہند" اور مختلف اصحاب نے مختلف طریقوں سے انتخابات تذکرے وغیرہ لکھ کر مردوں کی شاعری کی تدریجی ترقی ظاہر کی مگر عورتوں کی شعر گوئی کی طرف کوئی نظر اعتنا نہیں کی گئی - گذشتہ پچاس سال کے عرصے میں بعض لوگوں نے اردو فارسی شعر کہنے والی عورتوں کے اکثر تذکرے لکھے مگر اسی پرانی طرز اور اسی قدیم روش پر جدید طریقے سے کسی نے بھی روشنی نہیں ڈالی - حال میں نولکشور پریس سے ایک تذکرہ اردو و فارسی شعر کہنے والی عورتوں کا شایع ہوا ہے - مگر بالکل ناقص اور بیحد غلط سلط - ہم نے ڈیڑھ سال کی محنت میں اس کے متعلق کافی مواد جمع کر لیا ہے - اور تلاش جاری ہے انشاء اللہ بشرط حیات ایک مستقل تذکرہ شایع کر کے مردوں کے دامن سے بے اعتنائی کے داغ کو مٹانے کی کوشش کریں گے -

جہانتک ہماری معلومات کا تعلق ہے اردو میں سب سے پہلے خان کی دکنی کی بیوی نے شعر کہے ہیں اور دوسری چند عورتوں نے بھی مگر اردو زبان میں دیوان ترتیب دینے کا فخر ماہ لقا بائی چندا اور صرف چندا کو حاصل ہے - چندا کون تھی - یہ ایک آسان سوال ہے مگر اس کا تشفی بخش جواب ذرا ٹیڑھی کھیر ہے - تقریباً تمام تذکرے نویسوں نے اس خصوص میں بدحواسیاں کی ہیں - کسی نے چندا اور ماہ لقا کو الگ الگ شاعرہ قرار دیا ہے - کسی نے کچھ اور بدحواسی کی ہے - بہرحال ایک اچھا خاصا مواد اس کے متعلق جمع ہو گیا ہے -

۱۸۴۷ء میں منشی کریم الدین نے "طبقات الشعراء ہند" لکھی تو انہوں نے غالباً ہندوستان کو سب سے پہلے چندا کو روشناس کرایا - لکھتے ہیں کہ :-

چندا :- تخلص معشوقہ شیریں شمائل نیکو خصائل محبوبۂ بازاری رقاصۂ روشن اندام مہ لقا نام کا ہے کہتے ہیں کہ یہ حیدرآباد میں نہایت ترفہ و تنعم سے ایام بسر کرتی ہے - قریب پانسو آدمی سپاہی اور شاگرد پیشہ وغیرہ کے لازم رکھتی ہے اور عشوہ و ناز سے آدمیوں کے دلوں کو چھین لے جاتی ہے لیکن سر اس کا کسی سے نیچا نہیں ہوتا - شعراء دوں مزاج اس کے مدح میں اشعار کہہ کر لیجاتے ہیں - جائزات[1] اچھی پائی ہے اور وہ رنڈی بطور مردوں کے ورزش کرتی ہے - گھوڑا دوڑاتی ہے اور ناوک بازی و سنان کاری مژگاں سے گذر کر تیر اندازی اور نیزہ بازی سے میدان میں مشغول ہوتی ہے - غرض کہ نہایت ہوشمند پختہ کار نادرالعصر اور عجوبۂ روزگار ہے - اور دیوان مردّف مشتمل اوپر اکثر انواع سخن کے رکھتی ہے اور اپنی فکر کے عروسوں کو نظر شیر محمد خان ایمان سے گذرانتی ہے - یہ دو بیت اس کے جو میرے ہاتھ آئیں ہیں لکھتا ہوں صاحب دیوان ہے ایک جلد اس کی سرکار کمپنی کے کتب خانہ میں درمیان انگلینڈ کے موجود ہے - یہ کتاب اپنے تاریخ میں کپتان ملکم صاحب کو اس نے بطور نذر پہلی اکتوبر ۱۷۹۹ء کو دی تھی -

(دیکھو طبقات الشعراء ہند منشی عبدالکریم صفحہ ۳۲۷)

اسی تذکرے میں ماہ لقا کا حال دیکھئے تو غریب چندا عورت کی بجائے مرد نظر آتی ہے - لکھا ہے کہ -

ماہ لقا :- مصنف ایک دیوان اردو کا جس کی ایک جلد حیدرآباد کے راجہ چندو لال کے کتب خانہ میں موجود ہے - اور ایک بڑی دلچسپ مثنوی بنام "قصۂ خاور شاہ" جو دکھنی زبان میں شاہ عالم کے وقت میں تصنیف کی تھی اس میں اس کی مدح اور صوبہ داری کی بھی اور صوبے کی جہاں وہ تصنیف ہوئی ہے -

(دیکھو صفحہ ۱۳۶)

دراصل دیوان اور مثنوی دونوں کا تذکرہ کرنے میں غلطی کی ہے مثنوی ایک اور شخص کی ہے جس کے نام کا ایک جزو "ماہ" ضرور ہے مگر ماہ لقا نہیں انشاء اللہ ہم آئندہ کسی فرصت میں اس مثنوی کو پیش کریں گے اور اس وقت یہ بھی ظاہر کریں گے کہ اس مثنوی کا نام کیا ہے؟

---

[1] انعام و اکرام ؛

چنداؔ کے انہیں حالات کو مختلف تذکرہ نویسوں نے مختلف طور پر بیان کیا ہے کسی نے چندولعل کی محبوبہ ظاہر کیا ہے اور کسی نے نواب علیخاں بہادر کی منظورِ نظر لکھا ہے چنانچہ رائے درگا پرشاد تذکرۃ النساء نادری کے صفحات ۸۱ و ۸۲ و ۹۴ پر اور صاحبِ مشاہیر نسواں صفحات ۲۱۱ تا ۲۱۲ پر مولفِ حدیقۂ عشرت صفحہ ۵۳ و ۵۴ پر، مرتب ماہ درخشاں صفحہ ۱۵ و ۱۶ پر مصنف شمیم سخن صفحہ ۹۸ و ۹۹ پر مالکِ بہارستانِ ناز صفحہ ۳۸ و ۳۹ پر سخن شعراء میں مولوی صاحب نے صفحہ ۵۰۳ پر یہی لکھا ہے۔ اور سب کو یہی دہوکا ہوا ہے کہ ماہ لقا الگ ہے اور چنداؔ جدا! مگر غضب کیا ہے تذکرۃ الخواتین مطبوعۂ نولکشور پریس کے مرتب حضرت آسی نے کہ سب تذکرہ نویسوں سے ہٹ کر ارسطوجاہ کا نام لے دیا۔ چنانچہ لکھتے ہیں۔

چنداؔ:۔ تخلص بھی یہی ہے اور نام بھی یہی ہے ۱۷۹۹ء میں جبکہ صوبہ دار ارسطوجاہ کے رفعت وصولت کا بازار دکن میں گرم تھا وہی زمانہ تھا کہ چنداؔ کی شاعری آفتابِ نصف النہار بنکر دکن کے آسمان شہرت پر چمک رہی تھی۔
الخ (دیکھو صفحہ ۴۵ و ۴۶)

یہی نہیں بلکہ اور ایک غضب یہ بھی کیا ہے کہ ماہ لقا کے نام سے بھی ملاحظہ ہو۔

ماہ لقا (ط) یہی تخلص تھا اور یہی نام تھا حیدرآباد دکن کی شاہد بازاری تھی جو راجہ چندولعل کی سرکار میں ملازم رہ کر متمول ہوگئی تھی۔ اور اسی صحبت نے اس کو شاعر بھی بنا دیا تھا۔
(دیکھو صفحہ ۱۴۷)

اسی تذکرے کے دوسرے حصے میں فارسی شعر کہنے والی عورتوں کے حالات لکھتے ہوئے لکھا ہے۔ کہ

ماہ لقا:۔ اس شاعرہ کا اصلی نام چنداؔ پری تھا، حیدرآباد کی رہنے والی تھی، گانے بجانے والی عورت تھی نواب نظام علیخاں خلف نظام الملک آصف جاہ کی نوکر تھی، الخ
(دیکھو صفحہ ۲۵۴)

۱۳۲۴ھ ۱۹۰۶ء میں مولوی غلام صمدانی گوہر نے "حیاتِ ماہ لقا"[۱] کے نام سے چنداؔ کے حالاتِ زندگی کتابی صورت میں (۴۴) صفحات پر شائع کئے ہیں مگر افسوس ہے کہ اس رسالے کو قطعاً شہرت نصیب نہیں ہوئی اس کے ساتھ ساتھ "گلزارِ ماہ لقا"[۲] کے نام سے "انتخابِ دیوانِ چنداؔ" بھی (۴۸) صفحات پر کتابی صورت میں شائع کیا مگر وہ بھی گوشۂ گمنامی میں پڑا رہا۔ محبی مولوی ظفریاب خان صاحب سابق مدیر ادیب (حیدرآباد دکن) نے انجمن اربابِ اردو سُرور نگر حیدرآباد دکن کے آرگن رسالہ "تحفہ" بابت ماہ صفر ۱۳۴۳ھ میں ایک مختصر مضمون چنداؔ کی شاعری اور سوانح کے متعلق لکھا مگر افسوس ہے کہ اُسے بھی شہرت نہیں ہوئی، رسالہ انقلاب (لاہور) بابت ماہ دسمبر ۱۹۲۶ء میں کاظمہ بیگم نے ایک مضمون چنداؔ کی شاعری پر لکھا مگر وہ بھی مشہور نہ ہُوا۔ انتہا یہ کہ نولکشور پریس تک بھی اس لاہوری مضمون کی رسائی نہ ہو سکی۔

اب ہم ماہ لقا بائی چنداؔ کے حالات زندگی لکھ کر اس کی شاعری کے نمونے پیش کرتے ہیں۔

۱۲۳۵ھ میں منشی غلام حسین جوہرؔ نے ماہ لقا بائی کے کتب خانے سے فائدہ اٹھا کر ایک تاریخ ترتیب دی ہے۔ اور اس کا نام "ماہ نامہ" رکھا ہے۔ اس میں ماہ لقا کے خاندانی حالات تفصیل سے لکھتے ہیں۔ چنانچہ اس کا ایک قلمی نسخہ جو کتب خانۂ آصفیہ کی ملک ہے اور فہرست میں فن تاریخ ۱۴۱ پر موجود ہے۔ ہمارے پیشِ نظر ہے، یہ تاریخ ماہ لقا بائی کی فرمائش پر لکھی گئی ہے۔ چنانچہ اختتام پر جو قطعۂ تاریخ مولف نے لکھا ہے اس سے یہی ثابت ہوتا ہے ؂

شکرِ حق فرمائش ماہ سپہرِ دلبری ماہ نامہ گشت لامع چوں مہ بدر الدجیٰ
سال اتمامش چو جوہرؔ جست از ماہِ ملک گفت گویا مشرقِ انوارِ حسنِ مہ لقا

ابو الفتح نصیر الدین محمد شاہ بادشاہِ دہلی کے زمانۂ حکومت میں خواجہ محمد حسین نامی ایک شریف نوجوان دہلی آکر ملازمت سرکاری کا خواستگار ہُوا اور کسی کی سفارش پر احمد آباد گجرات میں کروڑ گیری (کسٹم) میں ملازم ہو گیا۔ چند روز کے بعد خواجہ زادگانِ کاٹھیاواڑ کے خاندان کی ایک لڑکی سے عقد بھی ہوگیا۔ اور اس نے مستقل طور پر گجرات میں سکونت اختیار کی، قدرت نے فیاضی سے ایک دو نہیں انیس (۱۹) لڑکے لڑکیاں دیں۔ جن میں سے اکثر مر گئے اور پانچ لڑکے لڑکیاں باقی رہ گئیں (۱۔ غلام حسین، ۲۔ غلام محمد، ۳۔ نور بی بی، ۴۔ بُول بی بی، ۵۔ میدہ بی بی) یہ وہ زمانہ تھا کہ حکومت کا انتظام یوں ہی سا تھا، نگرانی بھی برائے نام ہوتی تھی۔ محمد حسین نے بھی خوب ہاتھ رنگے۔ سرکاری روپیہ کو شیرِ مادر سمجھ کر نگلنا شروع کیا۔ مگر تا بکے، آخر ناظم کو اطلاع ملی اور ان کے دفتر کی پڑتال شروع ہوئی۔ چونکہ بے حساب روپیہ غبن کیا تھا اور سخت سزا کا احتمال تھا اس لئے نہایت سراسیمگی کے عالم میں گھر بار بیوی بچّوں کو چھوڑ کر فرار پر قرار کیا اور کہیں جا کر روپوش ہوگیا۔ ناظم نے

[۱] و [۲] یہ دونوں کتابیں مکتبۂ ابراہیمیہ امداد باہمی اسٹیشن روڈ حیدرآباد دکن سے مل سکتی ہیں۔

پڑتال کی ہزاروں روپیہ کا غبن ثابت ہوا۔ مال واسباب ضبط ہوگیا۔ بس عورت مع بچوں کے گھر سے باہر کردی گئی۔ اس زمانے میں خیانت بڑا جرم تھا خائن کی امداد اور اس کے لواحقین کی مدد کرنا سخت معیوب تصوّر کیا جاتا تھا۔ بچے کب تک فاقہ کشی کرتے جس جگہ حکومت کی تھی وہاں بھیک مانگنا بھی گوارا نہ ہوا۔ بچوں کی ماں نے ہجرت کی، اِدھر اُدھر کی خاک چھان کر قصبۂ دبولیہ پہنچی تو خدا ترس بھگتیوں نے اُسے پناہ دی اور اس کی لڑکیوں کو رقص وسرود کی تعلیم دینے لگے۔ قصبہ کے حاکم سالم سنگھ کو اطلاع ملی تو اُس نے ان غریبوں کو رہنے کے لئے مکان دلوادیا اور ہر طرح خبرگیری بھی کرنے لگا۔ مگر اللہ میاں سے ڈر کر نہیں بلکہ

ہرکہ خدمت کرد او مخدوم شد

کے اصول پر میدہ بی بی کی ہم آغوشی کی تمنا میں، چنانچہ اپنی شہرت وعزت حسن وجمال، سخاوت ومہربانی کے اثرات سے میدہ بی بی کو اپنی ہوسناکیوں کی بھینٹ چڑھایا اور میدہ بی بی میدہ بائی بنگئی۔ میدہ بائی کو راجہ سالم سنگھ سے ایک لڑکی مہتاب یا بی بی تولد ہوئی اور راجہ کی پہلی بیوی نے اس پر جادو کرانا شروع کردیا۔ چنانچہ میدہ بائی شدید علالت کے بعد مرتے مرتے بچی۔ اور اس کے بعد اس کی ماں نے انتقال کیا۔ چونکہ میدہ بی بی راجہ کی بیوی سے سہمی ہوئی تھی اور اُسے خوف تھا کہ کہیں رانی جادو وغیرہ کرکے مار نہ ڈالے اس لئے اپنی بہنوں اور چند بھگتیوں کے ساتھ اس نے دبولیہ چھوڑ کر مالوہ کا رُخ کیا۔ یہاں کچھ ایسی بے ترتیبی ہوئی کہ اس کے دونوں بھائی غلام حسین اور غلام محمد اس سے جُدا ہوگئے۔ اور وہ سخت پریشانی کی حالت میں سلا۱۱۶۲ھ میں برہان پور پہنچ گئی۔ نواب نظام الملک آصف جاہ بہادر برہان پور میں مقیم تھے لشکرِ دکن بھی تھا امراء ورؤسا سب موجود تھے یہاں بھگتیوں کے مشورے سے نام بدلے گئے اور میدہ بی بی، راج کنور بائی، نور بی بی، برج کنور بائی، بولن بائی، بولن کنور بائی اور مہتاب بائی، مہتاب کنور بائی بن گئیں —

نواب بسالت خاں بہادر بخشی فوج کی نظرِ انتخاب نے راج کنور بائی کو تاکا اس سے شادی کرلی۔ لشکر کیساتھ یہ گروہ "حیدرآباد دکن آرہا اور احتشام جنگ رکن الدولہ بہادر نے مہتاب کنور بائی کو اپنے عقد نکاح میں لیکر "صاحب جی صاحبہ" خطاب دیا اور یہ "عورت" مدار المہام دکن کی منکوحہ ہوگئی۔

راج کنور بائی کے بطن سے ۲۰ ذیقعدہ ۱۱۸۱ھ کو حیدرآباد میں چندا بی بی تولد ہوئی منشی غلام صمدانی لکھتے ہیں کہ "تولد کے وقت دفعتاً ایسی روشنی ہوئی کہ حجرہ منور ہوگیا[1]۔

نواب بسالت خاں نے دل بھر کر چاؤ چونچلے کئے۔ چھٹی اور چِلّہ بڑی دھوم سے کیا اور مہتاب کنور بائی "صاحب جی صاحبہ" نے چندا بی بی کو لاولدی کی وجہ سے گود میں لے لیا۔ چندا کی پرورش ایوانِ وزارت میں ہوئی اور اعلےٰ پیمانہ پر تعلیم وتربیت دلائی گئی۔ حضرت غفران مآب آصف جاہ ثانی کی خاص نظرِ عنایت تھی۔ چنانچہ سفر کولاس (۱۱۹۶ھ) میں معرکۂ نرمل ۱۱۹۷ھ میں اور مہم پانگل ۱۲۱۷ھ میں حضور والا نے چندا بی بی کو ساتھ رکھا تھا، آخرالذکر مہم سے فراغت پاکر دارالخلافہ کو مراجعت فرمائی اور جشن فتح آراستہ کیا تو چندا کو "ماہ لقا بائی" خطاب اور نوبت سے سرفراز فرمایا۔ اور ہر مجرے کے لئے ایک ہزار روپیہ مقرر ہوا۔ نوبت سے بھی معزز فرمایا۔ چنانچہ کسی نے اس کی تاریخ بھی کہی ہے۔

نوید آمد بعالم ماہ لقا را | نوازش کرد از نوبت شہنشاہ
ترانہ ساز سالش گفت ناہید | بلند آواز نوبت باد دلخواہ

اس کے بعد فیل دعماری نالکی پالکی اور جاگیر ومنصب سے بھی سرفراز ہوئی ماہ لقا بائی نہایت حسین وجمیل تھی ایک تصویر ہمارے ایک کرم فرمانے ہمیں دی ہے جس سے معلوم ہوتا تھا کہ "غضب کی عورت" تھی گو وہ تصویر اس وقت پیشِ نظر نہیں مگر آنکھوں میں پھر رہی ہے۔ سروسا قد۔ بھرا ہُوا جسم، سُرخ وسپید رنگ، نمایاں خط وخال، سوتواں ناک، گول تھوڈی، بھرے بھرے رخسارے، صاف چوڑی پیشانی تنگ دہاں۔ پتلے پتلے ہونٹ بڑی بڑی مخمور آنکھیں گھنی پلکیں، جڑی بھویں۔ چہرے سے بجائے شوخی کے متانت اور تمکنت ہویدا۔

ہندو دکن میں بے شمار طوائفیں گذری ہیں جو رقاصہ اور مطربہ ضرور تھیں۔ مگر اس کے ساتھ ہی ساتھ گرہستی یا اہل خانہ کی حیثیت رکھتی تھیں۔ ماہ لقا بائی کا بھی یہی حال تھا گانے بجانے کے لئے وہ امراء ورؤسا کے پاس ضرور جایا کرتی تھی مگر کسی سے ناجائز تعلقات نہ تھے۔ البتہ بعض امراء اس پر بُری طرح مٹے ہوئے تھے، جہاں تک میں نے دیکھا ہے طوائفوں کا کوئی مذہب نہیں ہوتا۔ ہندو طوائفیں پوجا پاٹ بھی کرتی ہیں اور فاتحہ ونیاز بھی دلواتی ہیں بعض بعض دل چلی تو نمازیں بھی پڑھ لیتی ہیں۔ اسی طرح ماہ لقا بائی کا بھی کوئی مذہب نہ تھا نہ تو وہ شیعہ تھی اور نہ سنی البتہ مسلمان ضرور تھی۔ وہ مولا[2] کے عرس میں خاص طور پر حصّہ لیتی تھی۔ اس کے ہاں مجالس حیدری "مجالسِ عزاداری" خاص اہتمام سے قائم ہوتی تھیں اور دوسرے کاروبار میں بھی پوری شیعیت کا اظہار کرتی تھی، مگر اس کے ساتھ ہی ساتھ سید عبدالقادر جیلانی رضی اللہ عنہ

[1] یہی نہیں بلکہ منشی جی نے چندا کی ماں کے کرامات اور خرقِ عادات بھی لکھے ہیں۔ گویا وہ بھی کوئی "رابعۂ عصر" تھی العجب ثم العجب (تمکین)

[2] حیدرآباد دکن میں اس نام کا ایک عظیم الشان پہاڑ ہے جس پر امیرالمومنین علیہ السلام کا چلّہ ہے اور شیعہ گروہ اس کا عرس بڑی دھوم دھام سے کرتا ہے۔ حیدرآباد دکن کا یہ میلہ نہایت مشہور ہے۔ (تمکین)

کی مشہور نیاز گیارہویں بھی بڑے ہی خلوص عقیدت اور تزک و احتشام سے کرتی تھی، اور دیگر بزرگانِ اہلِ سنت کی نیازیں بھی دلواتی تھی، نماز کی سخت پابند تھی اور شیعی طریقے پر ادا کرتی تھی۔ بعد نمازِ فجر تلاوت قرآن اور وظائف کا بھی شغل رہتا تھا۔ اور پھر تیر اندازی، شہسواری، تلوار، لکڑی، بانک۔ پٹا وغیرہ کی مشق بھی کرتی تھی۔ چونکہ خود فارسی اور معمولی عربی جانتی تھی اور علمی ذوق موجود تھا اس لئے شعراء اور علماء کی قدر دانی بھی کرتی تھی۔ اہلِ علم کا مجمع بھی درِ دولت پر موجود رہتا۔ کچھ لوگ گلچینیٔ گلشنِ جمال کرتے کچھ روپے پیسے سے دامن بھرتے، حاجت مندوں اور فقیروں کو بھی بہت کچھ ملتا تھا۔ سادات و مشائخ سب سے زیادہ فائدہ اٹھاتے تھے۔ کتابوں کا بہت شوق تھا، ایک عمدہ ترین کتب خانہ بھی جمع کر لیا تھا چنانچہ مولف ماہ نامہ نے اپنے وطن بیدر سے آکر اسی کتب خانہ سے فائدہ اٹھایا اور ماہ نامہ ترتیب دیا۔ لباس نہایت پُر تکلف پہنتی تھی اور پہننا بھی چاہیئے۔ اوقات کی پابندی بھی مشہور ہے کہتے ہیں کہ بہت پابند وقت تھی۔ موسیقی کی تعلیم باضابطہ پائی تھی مگر روزانہ "تعلیم" بھی ہوتی تھی حیدرآباد کے مشہور گوئے خوشحال خاں اس کے استاد تھے، ماہ لقا کی تین سو کنیزیں تھیں اور تقریباً سب کی سب گانے بجانے والی تھیں، ان میں سے حسن افزا اور حسین لقا بہت مشہور ہوئیں۔ مجی مولوی ظفریاب خاں نے اپنے مضمون میں حسین لقا کو ماہ لقا کی لڑکی لکھا ہے مگر جہاں تک ہمیں معلوم ہے ماہ لقا کے کوئی لڑکی یا لڑکا نہ تھا۔

ماہ لقا بائی کے عزت و احترام اور تمول کا یہ حال تھا کہ آج تک ہندوستان بھر میں نہ تو یہ عزت کسی طوائف کو نصیب ہوئی اور نہ یہ امارت ہی، مواضعات پنپال، سیدپلی، حیدر گوڑہ، چندا پیٹھ۔ پتلے پہاڑ۔ علی باغ، اڈی میٹھ[1]، جاگیرات اور مقطع تھے یہ اسقدر سیر حاصل دیہات ہیں کہ آجکل اگر کسی کو یہ مل جائیں تو آمدنی کے لحاظ سے مہاراجہ اور پھر ہز ہائنس کا خطاب ضرور ہی ملجائیگا۔ ماہ لقا بائی کی وفات کے بعد اس کی دولت کا جائزہ لیا گیا تو علاوہ باغات مکانات و زیورات کے ایک کروڑ روپیہ نقد برآمد ہوا۔ یہ روپیہ نجاست سے جمع کیا ہوا نہیں تھا بلکہ فیاضی دریادلی سے خرچ کرنے کے بعد بچ رہا تھا۔

تعمیر کا شوق بھی ماہ لقا بائی کو بہت تھا چنانچہ زندگی ہی میں اپنا شاندار مقبرہ بنوا لیا تھا۔ جو اب تک موجود ہے۔ کوہ مولا پر پختہ دالان بھی اسی کی یادگار اور عرس کوہ شریف کے تماشبینوں کے لئے موجب آسائش ہے وہیں گزرگاہ پر حوض بھی اب تک موجود ہے کسی نے اسی حوض کی تاریخ کہی تھی۔

انتخاب زمانہ ماہ لقا — درجہاں شد بکار خیر کفیل
سال این چشمہ خضر گفت ہمیں — یادگاری بہ آب فیض سبیل

کمان الیچی بیگ کی شاندار حویلی بھی اسی نے بنوائی تھی۔ ایک مسجد بھی اس جگہ بنوائی تھی۔ جس کی یہ تاریخ مشہور ہے۔

چو محرابش سجودِ خاص و عام است — فلک گفتا کہ ایں بیت الحرام است

حضور بندگان عالی ماہ لقا بائی کی بہت عزت کرتے تھے۔ اور بے انتہا پسند فرماتے تھے۔ چنانچہ حضرت مغفرت منزل فرمایا کرتے تھے کہ

"مانند ماہ لقا بائی دیگری بہ ایں کمالات پیدا شدن مشکل است"

حضور نے اکثر مقامات کے سفر میں ہمراہ رکاب رکھا تھا، کوئی مجلس یا بزم طرب ایسی نہ ہوتی تھی جس میں ماہ لقا بائی حاضر نہ ہو۔ سیر و شکار میں بھی ساتھ ہی ساتھ رکھا کرتے تھے۔ حضور بندگان عالی کے ہاتھی کے پیچھے دوسرا ہاتھی ماہ لقا بائی کا ہوا کرتا تھا۔

نواب اعظم الامراء ارسطو جاہ بہادر مدار المہام بھی بہت چاہتے تھے اور عزت بھی کرتے تھے۔ عموماً ان کے بزم نشاط کی رونق بھی یہی ہوتی تھی میر عالم بہادر تو بُری طرح مٹے ہوئے تھے۔ اکثر کہا کرتے تھے کہ

"جلیس باتمیزے بہ ایں حدت طبع و رسائی فہم مثل ماہ لقا بائی کم دیدہ شد"

ایک سراپا بھی تحریر فرمایا تھا جس میں سوا دو سو ابیات ہیں چنانچہ چند شعر نقل کئے جاتے ہیں۔ دیکھئے لفظ لفظ سے بے قراری ظاہر ہے۔

اے ماہ سپہر آشنائی — از سرتاپا تو دل ربائی
اے مردمِ دیدۂ محبت — سرتا قدمت طلسمِ الفت
اے ماہ لقائے ماہ پیکر — دے ماہ جبیں و ماہ منظر
اے مہر رخ و ماہ طلعتِ من — اے طلعت تو صداقتِ من
بردہ دہنت ز ساحر یہا — تیر نگ گرد ز ساحر یہاء
درچاہِ زمن بہ سحر کامل — آتش کدہ گشت شہر بابل
بازوے تو می کشد سوئے عشق — بازوئے تو زور بازوے عشق
از جلوۂ آں کف نگارین — باشد اشکم ہمیشہ رنگیں
اے نازِ تو فتنۂ زمانہ — اندازِ تو فتنہ را بہانہ
اے روئے تو رشکِ ماہ و خورشید — آغوش تو صبح زاد امید
از عکس رخ تو سینہ یکسر — غرق دریائے آبِ گوہر
خیر نام کمر نشاں نہ پیوند — خہر آنکہ بہ قتلِ من کمر بند

[1] جو آجکل "اڈک میٹ" کے نام سے مشہور ہے اور جہاں اب جامعہ عثمانیہ کی شاندار عمارت تعمیر ہو رہی ہے۔ (تمکین)

سرحدِ حیائے دانش آرا　　از موئے میان تست تا پا
اے حسن تو در جہاں فسانہ　　دل گرمیٔ عشق را بہانہ
ابروئے تو می کند کماں ساز　　چشمت بہ نگاہِ ناوک انداز
پنہاں پنہاں بگوش آں ماہ　　القصہ بگو و قصہ کوتاہ

نواب میر عالم بہادر کا ایک والہانہ خط ماہ لقا کے نام لکھا ہؤا ایک خاتون نے ہمیں دیا تھا۔ افسوس ہے کہ وہ کئی دنوں کی تلاش کے باوجود نہیں مل رہا ہے۔ یہ خط کسی تحفہ کے ساتھ بھیجا گیا تھا اور نواب صاحب نے دل کھول کر اظہارِ الفت کیا تھا۔

مہاراجہ چندو لال بہادر بھی ماہ لقا بائی کو بہت پسند فرماتے تھے۔ چنانچہ اپنے دربار میں بیٹھنے کے لئے مسند مرحمت فرمائی تھی۔ جب شاہ و وزیر مدار المہام اور پیشکار کا یہ حال ہو تو اس سے اندازہ ہو سکتا ہے کہ اور امراء و رؤسا کسقدر عزت و احترام نہ کرتے ہونگے۔

ماہ لقا بائی نے ساٹھ برس کے سن میں سنہ ۱۲۴۰ھ میں ہیضہ سے انتقال کیا۔ اور حیدر آباد سے ۷ میل کے فاصلہ پر کوہ مولا کے دامن میں اپنے بنائے ہوئے مقبرے میں جس پر ایک لاکھ روپیہ صرف ہؤا تھا۔ مدفون ہوئی۔ مزار پر قطعۂ تاریخ کندہ ہے جس کا مادہ ہے۔

راہیٔ جنت شدہ ماہ لقائے دکن

ماہ لقا بائی کے مقبرے کے عرس کے لئے سالانہ پانچسو روپیہ اور عاشور خانے کے لئے سالانہ ایک سو روپیہ شاید اب تک جاری ہے۔

ماہ لقا بائی کے انتقال کے بعد لاولدی کی وجہ سے اس کا مکان وغیرہ سرکاری نگرانی میں لے لیا گیا۔ جاگیرات ضبط کر لی گئیں۔ اس کے متعلقین میں سے نائکاؤں کو فی نائکہ دس روپیہ ماہوار اور فی کنیز پانچ روپیہ ماہوار اور خانہ زادوں کو فی نفر سات روپیہ ماہوار تنخواہ اجرا ہوئی۔ سنہ ۱۲۴۴ھ میں نواب ناصر الدولہ بہادر نے حسن افزا اور حسین لقا بائی کو ماہ لقا بائی کی وارث قرار دیکر مکانات زیورات وغیرہ زیورات مرحمت فرما دئے۔ اور جاگیرات بھی دونوں کے نام پر بحال فرمائی گئیں۔ اسٹیشن حیدر آباد (بڑی لائن) کے قریب محلہ نامپلی میں حسین لقا کا ایک باغ اور مکان اب تک موجود ہے اور محلہ النگم پلی میں حسن افزا کا مکان اور باغ بھی باقی ہے۔

حسن افزا نے بھی بہت سی لڑکیاں پال رکھی تھیں جن میں سے نگینہ بائی کامنی بائی، سالو بائی مشہور ہوئیں۔

ماہ لقا بائی نہایت طبیعت دار زندہ دل تھی اور یہی زندہ دلی موزونی طبع کی صورت میں اس کی شاعری ثابت ہوئی۔ حیدر آباد کے مشہور شاعر شیر محمد خاں ایمان کو اپنا کلام دکھلاتی تھی۔ سنہ ۱۲۳۳ھ میں دیوان ترتیب دیا جسمیں (۱۲۵) غزلیات ہیں اور ہر ایک غزل پانچ پانچ شعر کی ہے نہ صرف پنجتن کے نام کے پانچ شعر کہے ہیں بلکہ تمام غزلوں کے مقطعے منقبت میں ہیں۔

کہتے ہیں کہ ضلع جگت، پھکڑ، حاضر جوابی لطیفہ گوئی میں بھی وہ آپ اپنی نظیر تھی۔ سیکڑوں لطیفے اس کے نام سے مشہور ہیں۔

ایک دفعہ ماہ لقا بائی پالکی میں بیٹھی ہوئی جا رہی تھی نہ جانے خاص داں الٹ گیا یا کیا ہؤا کہ چونے کی سنہری ڈبیا لڑھک کر نیچے گر گئی۔ ایک صاحب جو قریب سے جا رہے تھے مسکرا کر کہنے لگے۔ "بائی جی! انڈا گرا" ماہ لقا نے مسکراتے ہوئے جواب دیا "کیا خوب گرتے ہی بانگ دینے لگا"!

اب ہم دیوان چنداؔ سے خاص خاص اشعار نقل کرتے ہیں۔ مقطع کے متعلق ہم نے قبل ازیں لکھا ہے کہ عموماً منقبت میں ہوتے ہیں۔ چنانچہ چند مقطعے نقل کئے جاتے ہیں جن سے اندازہ ہوگا کہ چنداؔ محبت امیر علیہ السلام والفت اہل بیت میں کسقدر ڈوبی ہوئی تھی۔ ؎

یا علی قلزم خونخوار ہے دنیا مشہور　　کھاوے چنداؔ نہ کبھی اسکے بھنور میں غوطہ
روشن رکھو جہاں میں مولا مثالِ مہر　　چنداؔ کے منہ سے نور کو تم دود مت کرو
کینزی سے ہے مرتضیٰ کی میتسر　　جو چنداؔ یہ لطفِ اتم دیکھتے ہیں
عمر بھر یوں رہے حسن کا جلوہ چنداؔ　　آرزو رکھتے ہیں یہ حیدر کرار سے ہم
ہے گلشنِ نجف میں تیرے ہاتھ یا علیؑ　　چنداؔ سی عندلیبِ غزلخواں کی احتیاط

حضرتِ امیر سے استمداد بھی چاہتی ہے تو اس انداز سے کہ جی لوٹ جاتا ہے، دیکھئے۔ ؎

یہی امید ہے چنداؔ کو خوبرویوں میں　　رکھے ہمیشہ ترا یا علی کرم گستاخ
چنداؔ کے خیر خواہ کو عزت ہو یا علیؑ!　　اس کا سدا رہے سر بدخواہ سوئے تیغ
گر ہی وہ ہووے حسن میں چنداؔ کہے یا علیؑ　　جلوے کو اس کے دیکھ کے لبِ لوٹ جائے برق
گنج کرم سے بخشئے چنداؔ کو اس قدر　　مولا نہ ہووے پھر کسی زردار کی تلاش

اب ذرا غزل کا نمونہ بھی ملاحظہ ہو، مطلع دیوان اور پہلی غزل یہ ہے۔

کہاں طاقت ہے راہِ حمد میں جو ہو زباں گویا　　کہ یاں جز عجز و خاموشی نہیں ہے اک جہاں گویا
نہ ہو نعتِ محمدؐ میں کبھی سے محفل آرائی　　بچا رکھ ہرزہ گوئی سے زبانکو شمع ساں گویا
تنائے راہ ہرگز نہ پہونچے پائے مقصد کو　　چلے اس دشت میں سر سے اگر سرِ دواں گویا
رسائی کب ہے اندیشہ کو یاں جز نارسائی کے　　زباں کو بند رکھ اشک گہر ہووے رواں گویا

بجز حق کے کوئی کب واصفِ وصفِ ائمہ ہے؟
رہا چنداؔ فلک پر بھی یہی نکتہ نہاں گویا

دیگر

اے حضرتِ دل! کیجئے نہ آہنگ خرابات　　کچھ اندنوں بگڑا ہے بہت رنگ خرابات

یوں اسکے مرے نشہ میں ہے صلح کا عالم   جسطرح کہ مستوں میں یہ ہے جنگِ خرابات
انگور کا دانا ہے ہر اک آبلۂ پا   طے ہوتے ہیں کس لطف سے فرسنگ خرابات
غش کھائے ہے جی سنتے ہی لہرائے ہے دل بھی
بجتی ہے عجب لے سے نَے وچنگِ خرابات
یا ساقی کوثر یہی چنداؔ کی دعا ہے
یہ دور رہے اس سے جو ہو ننگ خرابات

دیگر

گل کے ہونے کی توقع پہ جئے بیٹھی ہے   ہر کلی جان کو مٹھی میں لئے بیٹھی ہے
کبھی صیاد کا کھٹکا ہے کبھی خوفِ خزاں   بلبل اب جان ہتھیلی پہ لئے بیٹھی ہے
تیر و تلوار سے بڑھ کر ہے تیری ترچھی نگہ   سیکڑوں عاشقوں کا خون کئے بیٹھی ہے
تیرے رخسار سے تشبیہ اُسے دوں کیونکر   شمع تو چربی کو آنکھوں میں دئے بیٹھی ہے
تشنہ لب کیوں رہے اے ساقیٔ کوثر چنداؔ
یہ تیرے جامِ محبت کو پئے بیٹھی ہے

دیگر

ہم جو شب کو ناگہاں اس شوخ کے پالے پڑے   دل تو جاتا ہی رہا، اب جان کے لالے پڑے
ہجر میں روتا ہوں تیرے رات دن میں اسقدر   خون سے دل کے بہے جاتے ہیں پرنالے پڑے
چاند سا منہ اپنا دکھلا دے کبھی او گلبدن   سیکڑوں در پر تیرے ہیں دیکھنے والے پڑے
دست اس شانے تجھے یک مو نہیں اس زلف تک   جسکی ہر لٹ میں نکلتے ہیں سدا کالے پڑے
آئی چنداؔ آپ کے در پر ہے وہ یوں یا علی!
تکمے ہوں الماس کے اور لعل کے بالے پڑے

دیگر

چشم کافر بھی ہے اور غمزۂ خونخوار بھی ہے،   قتل کو پاس سپاہی کے تلوار بھی ہے
کفر و اسلام میں ثابت رہے دل کس پہ بھلا   صاحبِ سبحہ بھی ہے مالکِ زنار بھی ہے
گرچہ راحت تیرے ملنے سے ہے سوزش ہے وہی   جس جگہ گل ہے مری جان وہی خار بھی ہے
کچھ سمجھ کر ہی کیا اسنے تملق اے دل!   رحم پر صرف نہ جا اس کے ستمگار بھی ہے
حالِ دل کس سے یہ چنداؔ کہے ہر مشکل میں
یا علی! تیرے سوا کوئی مددگار بھی ہے؟

ان غزلوں کے مطالعہ سے معلوم ہوگا کہ چنداؔ کی غزل گوئی کا کیا حال تھا یہ غزلیں ہم نے بلا انتخاب سرسری طور پر درج کر دی ہیں۔ اگر دیوان کا گہرا مطالعہ کیا جائے تو بہترین شعر ملیں گے۔

چنداؔ کے پورے دیوان میں صرف چند مدحیہ شعر ہیں ایک غزل اور چند شعر اعلیٰ حضرت بندگانِ عالی کی مدح میں ہیں دو غزلیں نواب اعظم الامراء ارسطو جاہ بہادر کی شان میں اور بس نہ تو چندو لال بہادر کی مدح کی ہے اور نہ کبھی میر عالم کی تعریف ہی کی ہے، کسی اور کا ذکر ہی کیا؟

سدا پلتے ہیں چنداؔ سے ہزاروں جسکے سائے میں
نظام الدولہ و شاہِ دکن ہے رستمِ دوراں

اور یہ بسنتی غزل کسی موسمی جشن کے موقع پر شائد کہی گئی ہے۔

بسنت آئی ہے موجِ رنگِ گل ہے جوشِ صہبا ہے!   خدا کے فضل سے عیش و طرب کی اب کمی کیا ہے؟
بیاں میں کیا کروں اسکے شبستاں کا تعالی اللہ   قضا و قدر جس کے جشن کا اب کارفرما ہے
سخاوت میں کوئی ہمسر نہ ہوا اسکا زمانے میں   وہی کرتا ہے پورا جسکے دلمیں جو ارادہ ہے
خضر کی عمر ہو اسکی تصدق سے ائمہ کے   نظام الدولہ آصف جاہ جو سب کا مسیحا ہے
یہی خوانِ کرم سے ہے سدا امید چنداؔ کو
کسی کی بھی نہو محتاج تم سے یہ تمنا ہے

غالباً یہ غزل اُسی بسنت میں ارسطو جاہ[1] بہادر کے لئے کہی گئی ہے۔

بہار عیش لیکر باغ میں اب یوں بسنت آئی   کہ بے تکلیف ہے شبنم سے گل کی بادہ پیمائی
ضیاء اسکے لئے آئینہ دارِ چشمِ بلبل ہے   ہجومِ نو عروسانِ چمن کی ہے خود آرائی
کسی نے مجھ سے پوچھا ہے یہ چرچا بزم کا کسکی؟   کہا میں نے یہ دی ہے حاتمِ ثانی نے زیبائی
قدم رستم نہ چومے کیوں کہ میدانِ شجاعت میں   ازل سے تا ابد مشہور ہے اب جسکی مولائی
دیا جو شرط بھی بخشش کی تسپر بھی ہر اک دم میں
بہ رنگِ مہر ہے چنداؔ یہ جس کی جلوہ فرمائی

ایک اور بسنتی غزل میں ارسطو جاہ بہادر کا ذکر بھی کیا ہے، یہ غزل بھی منقولہ بالا غزل کے ساتھ کی معلوم ہوتی ہے۔

جب ہوا صحنِ چمن میں خسروِ گل کا گزار   عندلیبوں نے کئے ہر سمت سے مجرا پکار
سنکے یہ آوازِ خوش دل نے کہا مجھ سے کہ اُٹھ   چل بسنتی پوش ہو کر تو بھی اب دیکھیں بہار
الغرض پہنچا ہے اس جشن فریدوں فر تلک   مسند آرا اس جگہ دیکھا امیر نامدار
وہ نتیجہ ہے کئے[2] خسرو جس کے روبرو   رعب سے نام سخاوت سے نہ حاتم زینہار
مدعا چنداؔ کا ہے اب یہ ارسطو جاہ سے
فیل و زر بخشش تو کی جاگیر کا بھی ہو شمار

ایک اور غزل میں بھی ارسطو جاہ کی معدلت وغیرہ کا ذکر کیا گیا ہے۔ جس کا ایک شعر دیکھئے۔

---

[1] ارسطو جاہ نواب اعظم الامراء بہادر دیوانِ دکن۔ تاریخ سرفرازئ دیوانی ۱؍ شوال ۱۱۹۵ھ م ۳۰ ستمبر ۱۷۸۱ء وفات ۲۸ محرم ۱۲۱۹ھ مطابق ۹ مئی ۱۸۰۴ء مدتِ دیوانی (۲۴) سال،

[2] نواب ارسطو جاہ بہادر کیانی النسل تھے اس شعر میں نتیجۂ کے خسرو سے مراد شائد وہی خاندانی سلسلہ ہے۔

(تمکین)

ارسطو جاہ وہ فرخ نژاد اہلِ علم ہے
کہ جسکے فیض و بخشش کا جہاں میں ہے علم برپا

یہ صرف وہ شعر تھے جو منقبت یا مدح میں کہے گئے۔ اب ذرا متفرق شعر بھی سُن لیجئے۔

نازِ چنداؔ کو نہ ہو کیوں نوجوانی پر فلک
جس کو ہر دم ہے بھروسا مرتضےٰ سے پیر کا

ہم سے کرے ہے یار بیاں اپنی چاہ کا
حاضر ہیں ہم بھی گر ہو ارادہ نباہ کا

چنداؔ کے دیکھنے کی جو خواہش کرے سے کوئی
رکھتا ہو وصف اپنے میں وہ عز و جاہ کا

ہوا ہے اس طرح زندانِ غم میں گھُل کے کاہیدہ
ترے مجنوں پہ خنداں حلقۂ زنجیر ہوتا ہے

اٹھانا جور بے حاصل جو ایسا ہی مقدر تھا
مجھے تنہا ہی رہنا آپ کے ملنے سے بہتر تھا

آیا نہ ایک دن بھی تو وعدے پہ رات کو
اچھا کیا سلوک تغافل شعار! خوب!!

آگئے تھے یک فسانے پہ چڑیا کے ہم سے خوش
کرنے لگے ہو اب تو سوال و جواب خوب

پھر لو لگی ہے مجھ کو کس شمع رُو کی ہے ہے
دل اندنوں رہے ہے کچھ بے قرار ہر شب

نہیں ہے زُلف کی لٹ اُس رُخِ معرّق پر
یہ اوس چاٹنے نکلا ہے ماہتاب میں سانپ

روبرو چنداؔ کے ہووے کیا عجب ؎
مشتری و زہرہ و پروین کو مات ؎

نہیں ہے کچھ میرا نقصان گو غیروں کے ملنے سے
نہیں ملتے ہو مجھ سے کیا سبب کیا وجہ کیا باعث

دل میں میرے پھر خیال آتا ہے آج ؎
کوئی دل بر بے مثال آتا ہے آج ؎

ہوئے خیالات میں اب تک نہ تیرے ہم گستاخ
خدا کے واسطے ہم سے نہ ہو صنم گستاخ

اب مژدہ بہار آنے کا سنتے ہی قفس میں
تڑپا یہ کہ کچھ بال و پر اپنے نہ رکھا صید

جو پوچھے ہجر کی حالت مری وہ بے وفا ہنسکر
تصدق ہوکے کہ باآہِ سرد و چشم تر قاصد

آئینہ سکندر کا نہیں دل کے برابر ؎
ظالم نہ سمجھنا کہ ہے یہ سِل کے برابر ؎

ہے صراحی غنچہ ساغر گل ہے صحنِ باغ میں
یار ساقی ہو برستا ہووے ابرِ نوبہار

کوہکن پر بھی کیا جور مگر شیریں نے
تو نے اس طرح کیا ہے مجھے بیزار کہ بس

اشارہ پھر اسی ابرو سے چاہے ہو یہ دل پُر
کہ جس چشمِ سیہ نے سیکڑوں کے پل میں گھر گھالے
کہاں سمجھائے سے سمجھے ہے ناداں قدر تو دل کی
نہ تو جب تک پڑے ظالم کسی بے درد کے پالے

گر دام سے اپنے ہمیں آزاد کروگے!
پھر کس سے یہ کنجِ قفس آباد کروگے؟
ناشاد کئی دل ہیں نہ ملنے سے تمہارے!
ایسا بھی کبھی ہوگا انہیں شاد کروگے

رہی ہے ہم کو کیفیت سے اُن آنکھوں کی خونباری
چمن میں منتِ ساقی سے گذرے جام سے گذرے
رُخ و گیسو و خال و طاقِ ابرو دیکھ کر اُس کے
نماز و روزہ و تسبیح صبح و شام سے گذرے

داغ کا مطلوب بھی مٹھی میں دل لئے جاتا ہے اور چندا کا محبوب بھی ہتھیلی میں چھپا کر لے بھاگتا ہے۔

نگہ نکلی نہ دل کی چور زلفِ عنبریں نکلی
ادھر لا ہاتھ مٹھی کھول یہ چوری یہیں نکلی (داغ)

تقریباً یہی مضمون چندا بھی باندھتی ہے ؎

گر مرے دل کو چرایا نہیں تو نے ظالم
کھول دے بند ہتھیلی کو دکھا ہاتھوں کو؟

چنداؔ کے استاد شیر محمد خاں ایماںؔ نہایت پُرگو اور اچھے خاصے شاعر تھے اساتذہ میں شمار ہوتے تھے ایسے استاد اور ایسی شاگرد کو نکاٹ د کیا تھی ایماںؔ نے ایمانداری سے مشورہ دیا۔ اور چنداؔ نے بھی خوب جی کھول کر فکر سخن کی، یوں تو چنداؔ کے بعد سے سیکڑوں عورتوں نے شاعری کی اور اب تو بلا مبالغہ اردو شعر کہنے والی عورتیں اتنی ہی کثرت سے پیدا ہو گئی ہیں جتنے کہ ادبی اور علمی رسائل ہندوستان میں شایع ہوتے ہیں۔ مگر چنداؔ نے جو بات پیدا کی وہ کسی کو نہ ہو لی۔

دین اللہ کی ہے رنگ ہے اپنا اپنا
التدلیس

ماخذ

۱ - دیوان ماہ لقا چنداؔ قلمی موجودہ کتب خانۂ آصفیہ ۳۲۸/ن ن
۲ - تاریخ ماہ نامہ قلمی مولفہ غلام حسین خاں جوہرؔ آصفیہ ۱۸۲/ن ن
۳ - تاریخ گلزار آصفیہ " " مطبوعہ صفحہ ۲۳
۴ - حیاۃ ماہ لقا، مولفہ غلام صمدانی گوہر مطبوعہ صفحہ ۶۳۹
۵ - گلزار ماہ لقا " " " " "
۶ - طبقات الشعراء ہند مولفہ منشی کریم الدین مطبوعہ صفحہ ۳۲۶ و ۳۲۷۔
۷ - دکن میں اردو مولفہ مولوی نصیر الدین ہاشمی مطبوعہ صفحہ ۳۳۱
۸ - تذکرۃ النساء نادری مولفہ درگا پرشاد مطبوعہ صفحہ ۱۰ و ۲۸۲ تا ۲۸۴
۹ - بہارستان ناز مولفہ فصیح الدین رنجؔ " " ۳۸
۱۰ - ماہ درخشاں مولفہ حکیم قاسم مطبوعہ " ۱۵ و ۱۶
۱۱ - رسالہ نیرنگ رامپور بابت جون و جولائی ۱۹۲۹ء مضمون تمکین کاظمی صفحہ ۳۳ تا ۴۳ و ۳ تا ۱۰
۱۲ - شمیم سخن، مولفہ عبدالحی صاحب صفاؔ، مطبوعہ صفحہ ۹۸ و ۹
۱۳ - تذکرۃ الخواتین مولفہ عبدالباری آسیؔ " ۲۵۷ و ۱۴۲ و ۲۵۴
۱۴ مشاہیر النسواں مولفہ منشی فاضل محمد عباس بی۔اے مطبوعہ صفحہ ۲۱۰ تا ۲۱۲
۱۵ - قاموس المشاہیر مرتبۂ نظامی پریس بدایوں جلد اول، ۱۹۰
۱۶ - سخن الشعراء —— مطبوعہ صفحہ ۵۷۳
۱۷ - حدیقۂ عشرت، مولفہ درگا پرشاد مہرؔ مطبوعہ صفحہ ۵۳ و ۵۴
۱۸ رسالہ تحفہ مرتبۂ انجمن ارباب اردو سرور نگر بابتہ صفر ۱۳۴۴ھ مضمون مولوی ظفر یاب خاں صفحہ ۷۱ تا ۷۸
۱۹ رسالہ انقلاب لاہور بابتہ دسمبر ۱۹۲۶ء صفحہ ۷۵ مضمون کاظمہ بیگم صاحبہ۔
۲۰ جنتری مطابقت سنین وکیفیت وزرائے دکن وغیرہ مرتبۂ مولوی ناظم علی قلمی۔

تمکینؔ کاظمی

رباعی

ہے اتنی غرض دہر کے افسانے کی جو کچھ کر، صاف کر، بدی یا نیکی
ہوشیار کہ زندگی دو روزہ ہے رواںؔ نکلی ہوئی جان پھر نہیں آنے کی

رواںؔ ایم۔اے

سمندر کی بُوندوں کا جشن

ایک بڑی خلیج کے کنارے جو سبزے سے زمرد کا تخت بنا ہُوا تھا۔ اور خلیج آنکھ کی طرح فضاءِ لامتناہی کی طرف کھُلی ہوئی تھی۔ اسی کے قریب لکڑی اور لوہے سے بنی ہوئی ایک بھُول بھُلیاں تھی جس میں ہر دم ایک شور و غوغا مچا رہتا تھا۔ اور جہاں رات دن سیاہ نقطوں کے غول (انسان) گردش کرتے تھے۔

ایک دن صبح کو ان نقطوں میں سے ایک نیچے اُتر کر آیا اور سمندر کی طرف مُنہ کر کے ریت پر بیٹھ گیا۔ سمندر اس وقت ساکن تھا۔ آسمان بھی صاف اور خنداں تھا۔ موسمِ بہار کا آفتاب بھی اپنی چمک دمک دکھا رہا تھا۔ سمندر کے کنارے سبزے اور پھُولوں سے آراستہ تھے۔ نو بہار فضائے لامتناہی سے فرحت بخش نکہت لا رہی تھی۔ اس آدمی نے اس شاندار منظر پر ایک نگاہ ڈالی۔ آہستہ آہستہ ایک لہر اس کے پیروں تک آئی اور ایک سُریلی آواز کے ساتھ پیچھے ہٹ گئی۔ پھر قریب آئی اور پیچھے ہٹی تو ایک ننھی سی بوند نے عجیب پیاری زبان میں تقریر شروع کی:۔

میں تمہاری ننھی بہن ہوں۔ میرے عزیز تم مجھے نہیں جانتے لیکن میں تمہیں جانتی ہوں۔ تم میرے بھائی ہو۔ سنو! میں یہاں سے بہت دور پیدا ہوئی ہوں۔ بہت ہی دور نشیبوں میں چٹانوں کے اندر جہاں نہ انسان نظر آتے ہیں نہ پرندے ؛ وہاں دفعتاً ایک سُورج کی شعاع داخل ہوگئی۔ اس کے ساتھ میں کھیلتی رہتی اور اس کی دلچسپی کے لئے میں "قوسِ قزح" کے سات سات رنگوں سے اپنی آرائش کرتی۔ روزانہ صبح کو اس سے ملا کرتی اور شام کو جس طرح ایک سہیلی اپنی پیاری سہیلی کو رخصت کرتی ہے رخصت کر دیتی۔ ایکدن اس نے مجھ سے فضاءِ لامتناہی اور روشنی کی دوسری دنیا کا تذکرہ کیا۔ جہاں کی ہر چیز پاک صاف اور آزاد ہے۔ اس نے اپنے سر چشمہ سورج اور بھائیوں کا حال بیان کیا۔ اسی وقت سے میرے دل میں ایک نئی حرکت پیدا ہو گئی۔ میں نے اس سے دائمی محبت کا عہد و پیمان کر لیا۔ اور میں نے قسم کھائی کہ میں اس عجیب دنیا کو دیکھنے کے لئے اپنے قید خانے سے بھاگ چلونگی۔ آخر ایک دن بے خود ہو کر اس کے ساتھ ایک بہاؤ میں کود پڑی۔ میرے پیچھے میری بہنیں بھی کودیں۔ سب میری طرح آزادی کی پیاسی تھیں۔ اور بیحد خوش تھیں کہ اب ہماری ایک نئی زندگی شروع ہوتی ہے لیکن ہماری یہ خوشی زیادہ دیر قائم نہ رہی۔

...... "بوند" یہیں تک کہنے پائی تھی کہ ایک لہر نے اس کی پیاری آواز بند کر دی۔ — آدمی نے اپنے دل میں کہا بیشک یہ میری بہن ہے۔ اس کے دماغ میں گذشتہ زمانے کے واقعات تازہ ہو گئے۔ ایسے بچپن کی پیاری باتیں یاد آ گئیں جبکہ اس نے لامعلوم زندگانی میں پہلا قدم اٹھایا تھا۔ کن کن چیزوں سے خوشی ہوتی تھی۔ بچپنے کی کیا کیا تمنائیں اور آرزوئیں تھیں۔ کس طرح وہ اپنے چھوٹے چھوٹے ہمجولیوں کے ساتھ کھیلا کرتا تھا۔ بوند نے پھر اپنی آپ بیتی شروع کی۔

ہماری خوشی زیادہ دیر قائم نہ رہی۔ نیچے وادی میں ہمکو کیچڑ اور گھاس میں رُک جانا پڑا۔ یہاں ہم سب اپنی نغمہ سرائی بھول گئیں۔ ہمکو اوپر سے آنیوالی بہنوں کی خوشی کی آواز نے اور بھی غمگین کر دیا۔ ان بیچاریوں کو کچھ خبر نہ تھی۔ کہ یہاں کیا ہونے والا ہے۔ ہمارے لئے یہاں ایک عذاب یہ بھی تھا کہ گھنونے مینڈک ہر طرف سے حقارت کے ساتھ گھور رہے تھے۔ اس وقت ہم کہہ رہے تھے۔ کہ کاش ہم شام سے پہلے ہی ہوا پر سوار ہو کر یہاں سے روانہ ہو جاتے۔ اور اس عذاب سے چھٹکارا پاتے .... اس وقت گھاس نے آہستہ سے ناصحانہ انداز میں کہا "اے نادان بوندو! چپ رہو اور صبر کرو! زندگی صبر ہی کا نام ہے! تم کہاں جانا چاہتی ہو۔ ہم کو دیکھو کس طرح ایک ہی جگہ زندگی بسر کر رہے ہیں۔ تم بھی اسی طرح زندگی گذار دو۔ صبر کرو! شور و واویلا سے کچھ نہیں ہو سکتا"! افسوس وہ کیا جانتے تھے کہ ہم ان کی طرح گھاس نہیں ہیں۔ اور ہمارے دلمیں ہمیشہ جد و جہد کرنے اور زندہ رہنے کا ولولہ ہے۔ آخر ایک روز جب ہماری بے قراری اور بےچینی حد سے بڑھ گئی۔ تو ہم نے مصمم ارادہ کر لیا کہ اس تنگ جگہ سے نکل کر بھاگ جائیں۔

اس موقع پر پھر ایک لہر نے ننھی بوند کی کہانی میں خلل ڈالدیا —

اس آدمی نے اپنے دلمیں کہا :۔ بیشک یہ میری بہن ہے اس کو یاد آیا کہ پہلی مرتبہ گاؤں کی بد تہذیبی اور دہقانیت سے کس طرح میرے

دل میں بیزاری پیدا ہوئی تھی اور مینڈک اپنی ٹرابٹ سے کسطرح ناک میں دم کئے رہتے تھے۔

اس کو اپنے باپ کا یہ واقعہ بھی یاد آیا کہ وہ اسکو ایک مدت کے لئے مویشی چرانے کی خدمت سپرد کرنا چاہتا تھا۔ مگر وہ اپنے دو ہمعمروں کے ساتھ نزدیک کے شہر میں بھاگ گیا۔ کہ وہاں لکھنا پڑھنا اور کوئی کام سیکھ لے اور اپنی روزی خود پیدا کر سکے۔ اور اگر روزگار نہ بھی ملے تو کوئی پروا نہیں۔ گاؤں میں غلام بنے رہنے سے فاقوں مرجانا اچھا ہے........ یہ سب سمندر کی ننھی بوند کی کہانی سے مشابہ ہے۔

بوند نے پھر اپنی کہانی شروع کی :-

اس طرح ہم نے اس تنگ جگہ سے بھاگ جانے کی دلمیں ٹھان لی۔ اور بھاگ کھڑے ہوئے۔ نیچے ہم کو ہماری اور بہنیں بھی مل گئیں جو ہماری طرح بھاگ کر آئی تھیں۔ ایک چھوٹے سے بہاؤ پر ہم گاتے بجاتے خم دار پہاڑ کے درّے میں روانہ ہو گئے....... ہمارے راستے میں بہت سے پتھر۔ درخت اور فصیلیں تھیں...... اگرچہ ہم ان کو توڑ نہیں سکتے تھے۔ لیکن ہم ان پر سے پھسل گئے اور ان کو پھاند گئے اگر پھاند نہ سکے تو ان کا چکر کاٹ کر نکل گئے۔ آخر ہم ایک میدان میں پہنچ گئے۔ وہاں گاؤں اور شہروں نے اپنی گندگیوں سے ہم کو بھی گندا کر دیا اور ہم اپنی پہلی صفائی اور پاکیزگی پر حسرت کرنے لگے۔ لیکن ایک دن ہم کو ایک چیز روشن اور بے پایاں نظر آئی۔ تو ہم اسی طرف بڑھے چلے گئے.........

اب پھر ایک لہر نے کہانی میں خلل ڈالدیا :-

اس آدمی نے اپنے دلمیں کہا :- بے شک یہ میری بہن ہے۔ اور اس کو گاؤں سے بھاگنے۔ برسوں ایک شہر سے دوسرے شہر میں گھومنے مشکل سے روٹی دستیاب ہونے اور ذلت واہانت کے واقعات یاد آ گئے۔ اسکو یہ بھی یاد آیا کہ ایک مرتبہ اس نے اپنے گھر جانے کا ارادہ کیا تھا۔ لیکن یہ سوچ کر نہیں گیا کہ وہاں جا کر کیا کرونگا۔ یہاں شہروں میں اگرچہ مشکلات ہیں لیکن یہاں وہ محنت کرتا ہے اس کی عقل روشن ہو گئی ہے۔ زندگی کی جنگ کے لئے اس کا ذہن قوی ہو گیا ہے۔ اب وہ بھولا بھالا دہقانی نہیں ہے۔ بلکہ وہ ایک مزدور ہے جو سوچتا ہے اور سمجھتا ہے جس طرح سمندر کی ننھی بوند کو کوئی روشن اور بے پایاں چیز نظر آئی تھی ؛ اسی طرح ایک دھندلا لیکن بے خود کرنے والا نصب العین اس کے خیال میں منکشف ہوتا جا رہا تھا۔

"ننھی بوند" نے پھر اپنی تقریر شروع کی :-

پہلے مجھکو سمندر سے خوف پیدا ہوا۔ اس کی وسعت اور گہرائی دیکھکر میں گھبرا گئی۔ مجھے یہ اندیشہ ہوا کہ وہاں میری ہستی فنا ہو جائیگی مجھے آندھی سے بھی ڈر معلوم ہوا۔ لیکن بہت جلد میرا ڈر جاتا رہا۔ میرے ساتھ اور سب بہنیں بھی بےخوف ہو گئیں۔ صاف اور تازہ ہوا اور سورج کی شعاعوں نے جلد مجھ میں تازہ جان پیدا کر دی۔ اور میں اب پھر ویسی ہی پاک صاف ہوں۔ جیسی پہلے کسی زمانے میں تھی.... اب مجھے واپسی کا خیال بھی نہیں آتا........ میری زندگی اب ماضی میں نہیں ہے بلکہ مستقبل میں ہے۔ میں زمین کے کسی ٹکڑے میں نہیں ہوں۔ بلکہ سمندر میں ہوں۔ یہاں میں ایک نازک بوند نہیں ہوں۔ جسکو ہر پتّی اور کنکری روک دے اور راستے سے ہٹا دے۔ یہاں میں ایک قوت ہوں اور قوت بھی خوفناک کیونکہ میری لاکھوں بہنیں میرے ساتھ ہیں بہت سی چٹانیں ہمنے چکنا چور کر دیں۔ اور آئندہ بھی جو چٹان ہمارے راستے میں حائل ہو گی اُس کو پاش پاش کر دینگے۔ ہمارا تھپیڑا انسان کے آہنی گھن سے بھی زیادہ زبردست ہے اگر ہم چاہیں تو پانچوں براعظموں میں داخل ہو جائیں۔ اور پورے کرۂ ارض پر چھا جائیں۔ ہاں ہم عظیم الشان طاقت ہیں۔ ہم سمندر کی ناقابل تسخیر قوت ہیں۔

یہاں ایک لہر نے پھر اس کی جوش بھری تقریر میں خلل ڈالدیا

اس آدمی نے اپنے دلمیں کہا :- بیشک یہ میری بہن ہے اور اس کو یاد آیا کہ ایک مرتبہ میں بھی ایک بڑے تجارتی شہر کو دیکھکر ڈر گیا تھا۔ جہاں میں قفل سازی کے لئے آیا تھا اور رفتہ رفتہ میں مانوس ہو گیا۔ آج میں ۲۵ سالہ قوی جوان ہوں اور اپنے فن میں استاد۔ اب میں بھی ایک قوت ہوں۔ یہاں میں تنہا نہیں ہوں بلکہ ہمارے ہزاروں ہم پیشہ موجود ہیں۔ ہم سب ایک قوت ہیں اور جب ہم زندگی میں متحد ہو جائیں گے تو ہم میں ایک نئی جان پڑ جائیگی۔ سمندر کی ننھی بوندوں کی طرح دنیا کے مزدوروں کا اتحاد بھی ایک طوفان ہے۔

سمندر کی ننھی بوند نے پھر اپنی کہانی شروع کی :-

سال میں ایک دفعہ جب آسمان صاف اور خنداں ہوتا ہے۔ جب موسم بہار کا آفتاب اپنی چمک دمک دکھلاتا ہے۔ جب سمندر کے کنارے سبزے اور پھولوں سے آراستہ ہو جاتے ہیں۔ اس وقت ہم باہمی اتحاد اور قوت کا جشن مناتے ہیں۔ اس دن ہم اپنے

ماضی کی یاد اور اپنے مستقبل کا مشاہدہ کرتے ہیں۔

"میرے بھائی آج وہی دن ہے"

اس آدمی کے دل میں ایک حرکت پیدا ہوئی۔ مزدوروں کا جلوس چیونٹیوں کی قطار کی طرح شہر کی طرف چلا جا رہا تھا۔ وہ بھی ان کے ساتھ ہو گیا۔ فضا میں ایک شاندار ترانہ بلند ہوا ہر لمحہ جشن منانے والوں کی تعداد بڑھتی گئی۔ شہر کے راستے گرد و نواح کھیت، میدان اور تمام دنیا انہی سے بھر گئی .... ان کی تعداد سمندر کی بوندوں کی طرح لاتعداد تھی اور سمندر کے ترانے کی طرح ان کا ترانہ بھی زور اور قوت سے بھرا ہؤا تھا۔

آج تقریباً ساری دنیا کے معاملات کی باگ انہی مزدوروں کے ہاتھ میں ہے۔

فاطمہ بیگم انصاری

اُڑتی چڑیا سے

خوش باش! مسرت کی دیوی! خوش باش!! آسمان کے پہلو میں بیٹھ کر اپنی دلی تمناؤں کا مینہ برسائے جا، گائے جا، ہاں، وہی گیت سُنا جو موسیقی کے کانوں نے اب تک نہیں سُنا! چل، اُڑتی چل، ایک شرربار بادل کی طرح زمین سے صعود کر، ہاں، آسمان کی نیل گوں فضا میں مشقِ پرواز کئے جا۔ گائے جا، اُڑے جا۔ اُڑے جا، گائے جا!

ارغوانی کرنیں تیری پرواز کے گرد چکر لگا رہی ہیں اور تُو اُن میں پوشیدہ ہے۔ جیسے دن کی چمکیلی روشنی میں آسمان کا تارا۔ لیکن میں تیرا گیت اب بھی مسلسل سُن رہا ہوں! جیسے تاروں کی تیز کرنیں صبح صادق کے نور میں تحلیل ہو کر ستارۂ صبح کو نقاب پوش بنا دیتی ہیں ویسے ہی تو صرف میری نظروں سے پنہاں ہے۔ غیر محسوس ہرگز نہیں کیونکہ تیری میٹھی راگنیاں تیری کرنیں ہیں!

صحنِ زمین اور فضائے آسمان میں تیری رس بھری موسیقی کی لہریں کیا ہیں۔ گویا ایک برہنہ رات میں کسی تنہا اور خاموش بادل سے چاندنی کی پھوار پڑ رہی ہے اور آسمان کی کشتی اُس پر تیر رہی ہے!

میں نہیں جانتا کہ تو کیا ہے، کون ہے اور کس چیز سے زیادہ مشابہ ہے؟! رنگین بادلوں سے اتنے چمکدار قطرے ہرگز نہیں ٹپکتے جتنی ملوّرین اور خوش الحان بارش تیرے نورانی پروں سے ہو رہی ہے! اچھا، گائے جا، اُس خود فراموش شاعر کی طرح جو اپنے خیالات کے روشن پردوں میں چھپ گیا ہو۔ نئے نئے ترانے گائے جا، گائے جا۔ اس وقت تک کہ دنیا ایک مبہم سی امید و بیم کے ساتھ عالمگیر ہمدردی کا کاشانہ بن جائے!

تو ایک معصوم دوشیزہ ہے جو اپنے فلک نما محل پر سکتے کے عالم میں بیٹھی محبت کی میٹھی اور رسیلی راگنیوں سے اپنا دل بہلا رہی ہو۔ تو ایک سُنہرا جگنو ہے۔ جو کسی شبنم پاش وادی کے سبزے میں چپکے چپکے اپنے پروں سے ہلکا ہلکا گُلال اُڑا رہا ہو اور خود اس میں رَل مِل کر نظروں سے پنہاں ہو گیا ہو! تو گلاب کا ایک پھول ہے جو اپنی دھانی کونپلوں کی سیج پر سو رہا ہو۔ جس کی خوشبو ہوا کے چور اُڑا کر لے گئے ہوں اور پھر مست ہو کر بادہ خواروں کی طرح لڑکھڑا کر گرے پڑتے ہوں! زعفران زاروں میں ترنم ریز چڑیوں کی جھنکار، مرغزاروں میں موسیقی نوش پرندوں کی چہکار —— بہار پر بہار —— تیری نغمہ سنجی ان سب چیزوں سے زیادہ رسیلی اور نازک ہے! ہاں، ہاں، گائے جا، گائے جا!

ننھی سی چڑیا! —— پریم کی دیوی! میں تجھ سے التجا کرتا ہوں کہ تو مجھے بھی اپنا رازداں بنا لے۔ میں نے محبت اور شراب کی تعریف بارہا سُنی ہے۔ لیکن امنگوں کا ایسا بے دریغ سیلاب میرے عمقِ قلب سے کبھی نہیں اُٹھا جیسا کہ آج تیرے طوفان خیز راگوں نے برپا کر دیا ہے!

شادی کے گیت جلنے میٹھے ہوتے ہیں۔ فتح کے ترانے اُتنے ہی نمکین اور چٹکیلے، لیکن جب ان سے تیری موسیقی کا موازنہ کرتا ہوں تو ان میں ایک غیر محسوس سی چیز کی کمی محسوس ہوتی ہے! نام؟ اس چیز کا نام مجھ سے نہیں لیا جاتا!! اچھا تو خود ہی بتا کہ تیرے اس ساحر گیت کا سرچشمہ کیا ہے؟ —— میدان ہے؟ دریا ہے! پہاڑ ہے؟ آخر کیا ہے! کیا آسمان وزمین کا کوئی خاص سماں ہے! یہ بھی نہیں تو کیا پھر خدا کی طرح پاک اور نورانی محبت ہے؟! بتا، جلد بتا، وہ کیا چیز ہے؟

تیری خالص مسرت میں الائش وآمیزش کا نام نہیں، تکلیف کا سایہ تیرے قریب نہیں آسکتا! تُو نے محبت کا اصلی روپ نہیں دیکھا! رعنائیاں دیکھیں، الم نصیب ادائیں کیوں دیکھتی، اور قاتل نگاہوں کا شکار کس دل کو بناتی؟!

آہ! ہم! ناگفتہ بہ ماضی اور ناگفتنی مستقبل کا تردد ہماری قسمت ہے! ہمارا کوئی ترانہ سکھ، دکھ کی چاشنی سے خالی نہیں! ہمارے سب سے زیادہ شیریں گیت وہی ہیں جو سب سے زیادہ دُکھ بھری واردات کی داستان سنائیں! ہاں چل، ٹھہر نہیں، گائے جا!

مگر اے میری موسیقار چڑیا! اگر میں ایسا آفت پرست کلیجہ لے کر پیدا نہ ہوتا، اگر میرا دل جو یائے غم نہ ہوتا۔ اگر میری آنکھیں آنسو بہانا نہ جانتیں تو پھر تو ہی بتا کہ تیرے یہ فتنہ انگیز گیت کون سُنتا؟!

تیری ترنم ریزی میرے لئے تو اس دولت سے بھی زیادہ بیش قیمت ہے جو زمین کے سینے میں محفوظ ہے، بلکہ ان شہوار موتیوں سے بھی زیادہ قیمتی ہے جن کی لڑیاں کتابوں کے صفحات پر بکھری ہوئی ہیں! ہاں میں اعتراف کرتا ہوں کہ وہ میرے لئے —— میرے خانہ بدوش قلب کے لئے تنہا مایۂ مسرت وشادمانی ہے! کاش تو مجھے بھی اپنی خالص مسرت کا ایک جام پلا دیتی! ہائے، پھر کیا ہوتا؟ کچھ ایسی نشیلی باتیں میرے لبوں سے ٹپکتیں کہ دنیا مخمور ہو جاتی —— مجبور ہو جاتی! اسی طرح مجبور ہو جاتی جس طرح میں تیرے لئے مجبور ہُوا ہوں! چل اُڑتی چل، گائے جا، محبت —— مسرت —— محبت کا مینہ برسائے جا!

نمکین رامپوری

فطرت میں ہے شان خودنمائی

وہ دیکھ اُفق ہُوا فروزاں
آثارِ سحر ہوئے نمایاں
تاریکی شب ہوئی ہے روپوش
خورشید ہے نور سے ہم آغوش
تازہ ہوا شورِ سازِ ہستی
وہ نغمۂ دل نوازِ ہستی
دریاؤں میں آگیا تلاطم
لہروں میں پڑی ہے شورش قُم
گلزار کی خوشنما فضا دیکھ
اشجار کی دل رُبا ادا دیکھ
عُریاں ہے جمالِ دشت وصحرا
آزاد خرام ہے صبا کا
دل چھین رہی ہے ہر کلی کا
نرگس کی نگاہِ بے محابا
آغوش کشا کلی کلی ہے
ہر گل میں خلش نمود کی ہے
قدرت ہوئی بے نقاب یکسر
اک جلوۂ بے حجاب یکسر

ہر ذرہ ہے محوِ جلوہ زائی
فطرت میں ہے شان خودنمائی

اب تو بھی نقاب کو اُٹھا دے
پردے کو حجاب کو اُٹھا دے

تبسم

موجودہ بنگالی علم و ادب کی تاریخ

موجودہ بنگالی لٹریچر کا زمانہ انیسویں صدی سے شروع ہوتا ہے۔ اصل مضمون کے مطالعہ سے پہلے انیسویں صدی میں بنگال کے سوشل حالات سے باخبر ہونا ضروری ہے۔ اس لئے پہلے میں اسے مختصر طور پر بیان کر دیتا ہوں۔

راجہ رام موہن رائے اٹھارھویں صدی کے آخری حصے میں برھمو سماج کے بانی راجہ رام موہن رائے بنگال کے سب سے مشہور آدمی تھے۔ سوسائٹی کے لئے اُنہوں نے جو تحریک شروع کی تھی۔ اسی کا نتیجہ برھمو سماج ہے۔ اس تحریک کے ذریعے انیسویں صدی کی ابتدا میں راجہ رام موہن رائے نے بنگال میں ایک نئی زندگی پیدا کر دی تھی۔ سوسائٹی اور مذہب کی خدمت کے ساتھ ساتھ قوم کی ہر قسم کی اصلاح کو بھی اُنہوں نے مدِ نظر رکھا تھا۔ بنگالی زبان اور لٹریچر بھی اُن کی توجہ سے مستثنےٰ نہیں تھے۔ پہلے زمانے میں بنگالی لٹریچر صرف نظم تک محدود تھا۔ لیکن رام موہن رائے نے اس کو نثر کی صورت میں رائج کیا۔ انہوں نے خود بہت سی غزلیں اور نظمیں لکھیں۔ اور نثر میں بھی ان کی بہت سی تحریریں موجود ہیں۔ اس موحد شخص نے ہندو مذہب اور سوسائٹی کی برائیں کو دنیا کے سامنے پیش کر کے توحید کو قائم کرنا چاہا۔ توحید کی تعلیم کے ذریعے سے انہوں نے بہت سے جوشیلے نوجوانوں کو اپنی طرف کھینچ لیا - اور ان میں ایک نئی زندگی پیدا کر دی۔ ان سب نے مل کر برھمو سماج کی تحریک کو اتنی شدت کے ساتھ جاری رکھا کہ تمام بنگال میں اس نے ایک طوفان کی طرح اپنا اثر پھیلا دیا۔ اس سے فائدہ یہ ہوا کہ لوگوں کے دلوں میں ایک احساس پیدا ہوا۔ لوگ بیدار ہو گئے۔ اور اپنی اصلاح کے لئے مغربی قوموں کی طرف نظر ڈالنے لگے۔ مغربی لٹریچر کو دیکھ کر ان کے دلوں میں یہ خیال پیدا ہوا کہ وہ بھی اپنے لٹریچر کو اپنے فخر کا باعث بنا لیں۔

لٹریچر کی تیاری چونکہ برھمو سماج کی تحریک دراصل ایک مذہبی تحریک تھی۔ اور اس کا مقصد توحید کو قائم کرنا تھا۔ اس لئے راجہ رام موہن رائے اور ان کے پیرووں نے اپنشد کا ترجمہ شروع کیا۔ کیونکہ اپنشد میں توحید کی تعلیم پائی جاتی ہے۔ بعد میں اور لوگوں نے دیگر مذاہب کی کتابوں کا ترجمہ بھی شائع کیا۔ گرش چندر سین نے جو ایک مشہور برھمو مبلغ تھے عربی تعلیم حاصل کر کے بنگالی میں قرآن شریف کا پہلا ترجمہ شائع کیا۔ اسی طرح تحریر و تقریر کے ذریعہ سے برھمو مبلغین نے بنگالی لٹریچر کو ترقی دی۔ لیکن نہ صرف مذہبی لٹریچر ہی اُنہوں نے پیدا کیا تھا۔ بلکہ حقیقت میں جس کو لٹریچر کہا جاتا ہے۔ اس کے لئے بھی انہوں نے بنگالی زبان کی بڑی بڑی خدمات کیں۔ اسی طریق پر انیسویں صدی کا نصف حصہ گذر گیا۔

اس وقت تک بنگالی قوم بڑی حد تک بیدار ہو چکی تھی۔ ایک طرف برھمو سماج کی تحریک اور اس کے ساتھ نوجوانوں کا جوش و خروش اور دوسری طرف ایسٹ انڈیا کمپنی کی طرف سے بنگال میں انگریزی تعلیم جاری کرنے کی کوشش۔ اسکول اور کالج قائم ہونے لگے طلبہ کو موجودہ زمانے کے علوم سے واقفیت ہوئی۔ کثرت سے اہلِ قلم پیدا ہونے لگے اور بنگالی لٹریچر کی ترقی کے قسم قسم کی کتابیں لکھی جانے لگیں۔ یورپین زبانوں سے ترجمے کئے گئے۔ اور ان کے طرز پر اصل کتابیں بھی بنگالی زبان میں شائع ہوئیں۔

ودیا ساگر انیسویں صدی کے آخری حصے میں کثیر تعداد میں اہلِ قلم پیدا ہوئے ان میں سب سے زیادہ مشہور ایشور چندر ودیا ساگر۔ اکشائے چندر بڑال۔ بنکم چندر چیٹرجی۔ سورنا کماری دیوی۔ مائکل مدھو سودھن دت۔ ہیم چندر بینرجی۔ گرش چندر گھوش۔ نوین چندر سین تھے۔ ودیا ساگر نے بنگالی لٹریچر میں نثر کو سب سے زیادہ ترقی دی۔ یہ بھی سوشل اصلاح کے بہت بڑے حامی تھے۔ اور بڑی دلیری اور اخلاص کے ساتھ اس کام کو سرانجام دیتے رہے۔ انہوں نے ہندو بیواؤں کی افسوس ناک حالت کو بہت محسوس کیا۔ اور خود سنسکرت زبان اور ہندو شاستر کے عالم ہونے کی وجہ سے شاستروں سے دلیل دے کر ثابت کیا کہ بیواؤں کا دوسرا نکاح جائز ہے۔ انہوں نے شکسپیر کی کومیڈی آف ایررز کا اور سنسکرت شاعر کالی داس کی کتاب اوگیان شکنتلا کا ترجمہ شائع کیا — مہابھارت کے کچھ حصے کا بھی انہوں نے ترجمہ کیا۔ بدھوا بواہ (شادی بیوگان) نام کی مشہور کتاب انہیں کی تصنیف ہے۔ ان کے علاوہ اور بھی بہت سی کتابیں انہوں نے لکھی تھیں۔ ہندی بیتال پچیسی کا ترجمہ بھی انہوں نے کیا تھا۔ بچوں کی اخلاقی تعلیم کے لئے انگریزی سے ایسپ فیبلز (حکایات لقمان) کی کہانیوں کو بنگالی طبیعت کے موافق بنا کر کتھا مالا کے نام سے شائع کیا۔ بچوں کی ابتدائی تعلیم کے لئے جو چند کتابیں انہوں نے لکھی تھیں۔ وہ آج تک مکتبوں میں بچوں کو فائدہ پہنچا رہی ہیں۔

بنکم چندر چٹر جی بنکم چندر کلکتہ یونیورسٹی کے ابتدائی گریجوایٹوں میں سے تھے۔ سرکاری ملازم ہونے کے باوجود بنگالی لٹریچر کی جو خدمت انہوں نے کی ہے۔ بہت کم آدمیوں نے کی ہوگی۔ بنگالی میں بلند پایہ ناولوں کی بنیاد اُنہیں نے رکھی تھی۔ اُنہوں نے اپنی کتابوں میں بڑی حد تک سروالٹر سکاٹ کا طرز اختیار کیا۔ یہاں تک کہ ان کے ناول درگیش نندنی میں سکاٹ کے مشہور ناول آئیون ہو کا پلاٹ ہو بہو ظاہر ہوتا ہے۔ ان کو بنگال کا سکاٹ کہا جاتا ہے۔ ان کا ایک بہت بڑا نقص یہ تھا۔ کہ اپنی تصنیف میں جابجا مسلمانوں پر بے جا حملہ کیا کرتے تھے۔

بنکم چندر کی تصنیفیں صرف ناولوں تک محدود نہیں ہیں۔ وہ بہت بڑے علامہ تھے سنسکرت میں ان کو کافی عبور حاصل تھا۔ انہوں نے گیتا کا ترجمہ اور مختصر شرح شائع کی۔ سری کرشن کی مفصل سوانح عمری لکھی جس میں سری کرشن کے زمانہ وغیرہ کے متعلق بڑی عالمانہ کاوش (Research) موجود ہے۔ اور بھی بہت سی کتابیں انہوں نے شائع کی تھیں۔ اس کے علاوہ ایک رسالہ "بنگا درشن" بھی جاری کیا تھا۔ جو انیسویں صدی کے بنگالی لٹریچر میں سب سے زیادہ مشہور تھا۔

گرش چندر گھوش پچھلی صدی کے سب سے مشہور ڈرامہ نویس تھے انہوں نے شکسپیر کے چند ڈراموں کا ترجمہ بھی کیا تھا۔ بنگال میں تھیٹر کا رواج بہت دنوں سے ہے تھیٹروں کی ترقی کے لئے جن لوگوں نے کوشش کی ان میں گرش چندر صف اوّل میں ہیں۔ آجکل بنگال کے تھیٹر میں بڑی حد تک یورپ کے تھیٹر کا نظارہ پایا جاتا ہے۔ پہلے بنگالی تھیٹر میں عورت کا پارٹ بچوں سے کرایا جاتا تھا۔ لیکن اب یہ نقص دور کر دیا گیا ہے۔ ڈرامے اور تھیٹروں کا اس حیثیت تک پہنچنا۔ گرش چندر کی کوششوں ہی کا نتیجہ ہے۔

نوین چندر۔ ہیم چندر۔ مدھو سودھن وغیرہ پچھلی صدی کے مشہور شاعروں میں سے تھے۔ اُس عہد کے ادبی مصنفوں میں چند عورتیں بھی نظر آتی ہیں۔ جن میں سرناکماری دیوی کا نام خصوصیت سے نمایاں ہے۔ جو ٹیگور کی بہن ہیں۔ اور اب تک زندہ ہیں۔ تاریخ اور فلسفہ کا چرچا بھی ان دنوں میں بہت ہو گیا تھا۔

(۲۰) بیسویں صدی بیسویں صدی کی ابتداء سے بنگال کی ادبی دنیا میں مشہور مصنف۔ شاعر۔ مورخ فلسفی۔ سائنس داں۔ وغیرہ بکثرت ظہور میں آ رہے ہیں۔ اخباروں اور رسالوں کی تعداد بھی بہت بڑھ گئی ہے۔ بڑے بڑے مصنف اتنے موجود ہیں کہ ان کے نام درج کرنے کے لئے خاصی لمبی فہرست چاہئے۔ اس لئے میں صرف چند بہت زیادہ مشہور مصنفوں کا ذکر کر دینے پر کفایت کرتا ہوں۔

رابندر ناتھ ٹیگور انیسویں صدی کے آخر میں اپنی تصنیفات کے ذریعے سے اُن کو کافی شہرت حاصل ہو چکی تھی بیس سال کی عمر سے پہلے بھی اُنہوں نے جو کتابیں اور نظمیں لکھی تھیں۔ اُن کا طرز اور تخیل قابلِ تعریف ہے۔ اس صدی میں آج تک اُن کی جتنی کتابیں شائع ہو چکی ہیں۔ اُن کو شمار کرنا آسان نہیں ہے۔ کیا نظم اور کیا نثر میں۔ سوسائٹی اور زندگی کے تمام پہلوؤں کو انہوں نے کسی نہ کسی رنگ میں بیان کیا ہے۔ اگر کسی تصنیف میں بہت بڑے فلاسفر کی حیثیت میں انہوں نے بڑے بڑے خیالات کا اظہار کیا۔ تو کسی دوسری تصنیف میں نہایت چھوٹے چھوٹے بچوں کی طبیعت کے موافق کہانیاں بھی لکھ دیں۔ ایک طرف ان کی ایک نظم کی کتاب "شیشو" (بچے) میں بچوں کی دلی کیفیت، اُن کے حرکات اُن کی گفتگو کا طرز ان کا کھیل کودنا، پڑھنا، وغیرہ بالکل آسان اور صاف زبان میں بیان کیا گیا ہے۔ تو دوسری طرف سے "گیتا نجلی" "نے ویدیا" "کھیا" "بلیکا" وغیرہ کتابوں میں بہت بلند فلسفیانہ خیالات کا اظہار ہوا ہے۔ اُن کی ظریفانہ کہانیاں اور نظمیں بھی بہت مشہور ہیں۔ ٹیگور نے اپنی تصنیفات میں سوسائٹی کی حالت بیان کرتے ہوئے جابجا اُس کی برائیوں کو بیان کیا ہے۔ اور ان کی اصلاح کیلئے اپنا خیال ظاہر کیا ہے۔ گیتا نجلی۔ اور "نے ویدیا" میں توحید کی تعلیم تقریباً ہر صفحہ میں نمایاں ہے۔ ان دونوں کتابوں میں بہت سے گیت بھی موجود ہیں۔ جن میں ویدانت فلاسفی بیان کی گئی ہے۔ ویدانت فلاسفی اور تصوف کے درمیان بڑی مشابہت ہے اس لئے بہت سے لوگوں کا خیال ہے۔ کہ ٹیگور نے اپنی تحریر کے ذریعے سے جس طرح ویدانت فلاسفی کی تعلیم دینی چاہی ہے۔ اسی طرح تصوف کی طرف بھی انہوں نے لوگوں کو مائل کرنا چاہا ہے۔ اس بات کو ثابت کرنے کے لئے خصوصاً بنگالی کے مسلمان یہ دلیل پیش کرتے ہیں۔ کہ ٹیگور کے والد مہارشی دیوندرا ٹیگور۔ جو راجہ رام موہن رائے کے مشہور احباب میں سے تھے۔ فارسی زبان کی بہت اچھی لیاقت رکھتے تھے۔ اور "دیوان حافظ" ہمیشہ ان کے ساتھ ہوا کرتا تھا۔ مہارشی صوفیوں کے خیالات کو بہت پسند فرمایا کرتے تھے۔ اور اُن کی بہت تعریف بھی کیا کرتے تھے۔ اور ٹیگور بھی بچپن میں زیادہ تر اپنے صوفی والد کے ساتھ شانتی نکیتن میں رہتے تھے۔ اس سے اُن پر بچپن ہی سے حافظ کی نظموں کا بڑا اثر ہوا۔ اور اثر کا اظہار ٹیگور کی نظموں میں نظر آتا ہے۔ یہ بات بڑی حد تک ممکن ہے۔ لیکن اسی کی وجہ سے ٹیگور کے تخیل اور ان کی خیالات کی بلندی کے خلاف ایک حرف بھی نہیں کہا جا سکتا۔

بنگال میں ٹیگور کا اثر تعلیم یافتہ بنگالیوں خصوصاً نوجوانوں میں ٹیگور کی تعلیم بہت مقبول ہوئی ہے۔ ٹیگور کا گیت ہر جگہ گایا جاتا ہے اپنی تصنیفوں میں ٹیگور کی عبارت نقل کرنا لوگ باعثِ فخر سمجھتے ہیں۔ خاص کر

برھمو سماج میں تو ٹیگور کو ایک ہیرو سمجھا جاتا ہے۔ بلکہ ان کو ایک حد تک امام کی حیثیت دی جاتی ہے۔ لیکن چونکہ ٹیگور اور برھمو سماج موحد ہیں۔ اور بت پرستی کو ناپسند کرتے ہیں۔ اس لئے بعض تنگ دل ہندو ٹیگور کی تعلیم سے مستفید ہونا باعث توہین خیال کرتے ہیں۔ اس قسم کا خیال شروع میں بہت غالب تھا۔ مگر جب سے ٹیگور کی شہرت ساری دنیا میں ہو گئی اور ان کو نوبل پرائز بھی مل گیا۔ اس وقت سے ایسے لوگ بہت ہی کم نظر آتے ہیں۔ مسلمان نوجوانوں میں بھی ٹیگور کی قدر ہندوؤں سے کم نہیں ہے۔

ٹیگور کے خیالات ٹیگور کے خیالات کے متعلق اس مضمون میں تفصیل کی گنجائش نہیں۔ اس لئے میں اختصار کے ساتھ چند جملے عرض کر دیتا ہوں۔ انیسویں صدی کی تصانیف پرانے زمانے کی ہندوستانی تہذیب و تمدن پر اکثرت سے ٹیگور کے مضمون اور نظمیں موجود ہیں۔ موجودہ صدی کے ابتدائی چند سال میں جب کہ سودیشی تحریک شروع ہوئی۔ اور ہندوستان کی سیاسی آزادی کے لئے سرندرناتھ بنیرجی اور ان کے پیروؤں نے جدوجہد شروع کی۔ تو ٹیگور نے بھی بہت سے قومی گیت لکھے۔ جو آج تک سیاسی جلسوں میں گائے جاتے ہیں۔ لیکن آج کل کی تصنیفیں تقریباً تمام ہی فلسفیانہ ہیں۔ ان دنوں ٹیگور کی خاص توجہ ایک اور موضوع کی طرف ہے۔ جس کا مفہوم "دشوا بھارتی" کے لفظ سے ادا ہو سکتا ہے۔ اس کا مطلب یہ ہے۔ کہ بنی نوع انسان کو ہر طرح سے ایک حیثیت پر لایا جائے۔ جس طرح آجکل مغربی قومیں مشرقی ممالک کو نفرت کی نگاہ سے دیکھتی ہیں۔ یا جس طرح طاقتور قوم کمزور و ناتواں قوم پر ظلم کرتی ہے۔ اور اس کی بہبودی کیلئے امداد نہیں کرنا چاہتی۔ یہ ٹیگور کو پسند نہیں ہے۔ "گیتانجلی" کی ایک نظم ہے۔ "دنیا کی تمام قومیں ہندوستان کے سمندر کے کنارے پر اکٹھی ہو گئی ہیں۔ اس ملک کا تمدن زمانہ قدیم سے چلا آ رہا ہے۔ اور بیرونی ممالک سے بہت سی حملہ آور قومیں یہاں آ کر قدیم باشندوں میں رل مل گئی ہیں۔ اس لئے ہندوستان اس کے لئے سب سے مناسب ہے۔ کہ ساری دنیا کی تمام قوموں کو اسی ملک میں ملا دیا جائے۔ اس نظم میں یہ دعوت دی گئی ہے۔ کہ مغربی اور مشرقی، مسلمان اور عیسائی، برہمن اور اچھوت، اس پاک مقصد کے لئے اکٹھے مل جائیں۔

بابو شرت چند چیٹرجی موجودہ بنگال کے سب سے مشہور ناولسٹ ہیں۔ ان کی کتابیں دوسرے تمام ناول نویسوں کی کتابوں سے زیادہ مقبول اور مشہور ہیں۔ شرت چیٹرجی کی ناولوں میں جمہوریت کے خیالات بہت غالب ہیں۔ اور اُن کی کتابوں میں سوسائٹی کے صرف اعلیٰ طبقے کا ہی ذکر نہیں آتا۔ بلکہ عام لوگوں کی سوسائٹی کے حالات بیان کئے گئے ہیں۔ خواہ وہ شہری ہوں۔ خواہ دیہاتی۔ معمولی کاشتکار اور زمیندار کا معاملہ ساہوکار اور قرض خواہ وغیرہ کا ذکر ان کی کتابوں میں بہت ہے۔ ایک چھوٹی سی کتاب میں جس کا نام "دیہاتی سوسائٹی" (دیہی سماج) بنگال کے دیہات کی زندگی کو اس قدر صحیح طور پر بیان کیا گیا ہے۔ کہ کتاب پڑھتے وقت معلوم ہوتا ہے۔ کہ یہ تمام واقعات ہماری موجودگی میں ہو رہے ہیں۔ اس کتاب کو خود مصنف نے ڈرامے کی صورت میں بھی شائع کیا ہے۔ جو کلکتہ میں کئی بار دکھایا گیا ہے۔ "چرترہین" میں جو ایک مشہور کتاب ہے۔ اس میں انہوں نے دکھایا ہے۔ کہ عام لوگوں کے خیال میں جو چیزیں بری معلوم ہوتی ہیں۔ یہ ضروری نہیں کہ وہ چیزیں حقیقت میں بھی بری ہوں۔ اور تھوڑی سی کمزوری یا گستاخی کی وجہ سے سوسائٹی جن لوگوں پر لعنت بھیجا کرتی ہے۔ اُن کے اندر بھی جواہر پارے موجود ہوتے ہیں۔ اس کتاب کے ذریعے سے اس مشہور مصنف نے اخلاقی فضا میں ایک ہلچل پیدا کر دی ہے۔ گو اس کی وجہ سے اُن پر بڑے بڑے اعتراضات بھی کئے گئے ہیں۔ اور کتابوں میں بھی اس قسم کے خیالات موجود ہیں۔ مگر اختصار کی خاطر اُن کا الگ بیان نہیں دے سکتا۔

شرت چیٹرجی کی کتابوں کی ایک خاص خوبی یہ ہے۔ کہ ان میں مسلمانوں پر بے جا حملہ نہیں کیا گیا ہے۔ جو بہت سے ہندو مصنف اپنی تنگدلی سے کیا کرتے ہیں۔ اور دوسری خوبی یہ ہے کہ ان کی زبان بہت صاف اور سلیس ہے۔ فطری جذبات کا بیان آسان الفاظ میں اس خوبی سے کرتے ہیں۔ کہ پڑھنے والا حیران ہو جاتا ہے۔

مسلمان مصنفوں میں سے مولانا اکرم خان ایڈیٹر "محمدی" مولوی عبدالکریم "ساہتیا وشارد" شیخ فضل کریم، ڈاکٹر محمد شہید اللہ پروفیسر ڈھاکہ یونیورسٹی قاضی نذر الاسلام وغیرہ بہت مشہور ہیں۔ قاضی نذر الاسلام "باغی شاعر" کے نام سے مشہور ہیں۔ کیونکہ ہندوستان کی سیاسی اور سوشل آزادی پر ان کے ناول اور ان کی نظمیں بہت پرجوش ہوتی ہیں۔

بنگال کی خواتین میں سے بھی بہت اچھی اچھی لکھنے والی پیدا ہو چکی ہیں۔ ٹیگور کی بہن شریمتی سورنا کماری دیوی کا ذکر پہلے ہو چکا ہے۔ ناول اور افسانہ لکھنے میں انوروپا دیوی۔ نروپا ما دیوی۔ سرسی والا دیوی، اندرا دیوی، سیتا بالا دیوی، مسز آر۔ ایس حسین وغیرہ بہت مشہور ہیں۔ سوسائٹی اور عورتوں کی تعلیم کے اصلاح کے لئے سیتا بالا دیوی۔ جیوتر منی دیوی، وغیرہ کی خدمات قابل قدر ہیں۔ اور ان کی جدوجہد کے نتائج بہت خوش گوار اور امید افزا برآمد ہو رہے ہیں۔ مسلمان خواتین میں آر۔ ایس حسین نے اس کام میں بہت حصہ لیا ہے۔

اخبارات اور رسالے بعض بنگالی اخبارات مضمون، کاغذ، چھپائی قیمت اور اشاعت کے لحاظ سے اعلیٰ پائے کے انگریزی

اخبارات کا مقابلہ کرسکتے ہیں۔ مثال کے طور پر روزانہ "لبومتی" کا نام دیا جاسکتا ہے۔ رسالوں میں سے مضامین، تصاویر اور اشاعت و شہرت کے لحاظ سے "پرا واسی" "بھارت ورش" اور "دھور لبومتی" کے نام سب سے مقدم ہیں۔ مسلمانوں نے بھی کئی رسالے نکالے ہیں۔ جن میں سے "محمدی" اور "سوغات" کے نام قابلِ ذکر ہیں۔ ان رسالوں میں ہر قسم کے مضامین شائع ہوتے ہیں۔ نظموں کا بھی کافی حصہ ہوتا ہے۔ خاص ادبی مضمون سے لے کر ناول، ڈرامہ، سائنس، فلسفہ، تاریخ، تعلیم، موسیقی، مذہب، سیاست، صحت، علم طب وغیرہ کسی کو چھوڑا نہیں جاتا۔ رسالے بیشمار شائع ہوتے ہیں۔ اور مضمون نگار بھی ہندو مسلمان۔ مرد و عورت بیشمار ہیں۔

کئی سال سے خاص سائنس کی اشاعت کے لئے ایک رسالہ "پراکرتی" بھی شائع ہوتا ہے۔ اس میں ہر قسم کی سائنس پر مضمون لکھے جاتے ہیں۔ ڈاکٹر ستیہ چرن لاہا۔ بانی اور ایڈیٹر ہیں۔

بنگال کی اقتصادی حالت کی اصلاح کیلئے بھی ایک رسالہ نکالا گیا ہے۔ جس کا نام آرتھک کُنتی (اقتصادی ترقی) ہے۔ اس کے بانی اور ایڈیٹر پروفیسر بنیائے کمار سرکار ہیں۔ جو تیرہ سال تک مختلف ممالک کی سیاحت کر چکے ہیں۔ اور اقتصادیات کے بہت بڑے ماہر سمجھے جاتے ہیں۔

بنگالی ادبی سوسائٹی

بنگالی ادب کی اصلاح و ترقی کے لئے مدت سے ایک سوسائٹی قائم ہے۔ جس کو "بنگیا ساہتیا پریشد" کہتے ہیں۔ بڑے بڑے مشہور اہل قلم اس کے ممبر ہیں۔ اس کا رسالہ بھی شائع ہوتا ہے۔ اس کے اعزاض پر غور کرنے کے لئے ہر سال ایک کانفرنس ہوا کرتی ہے۔ جو بنگالی ادبی کانفرنس کے نام سے مشہور ہے۔ اس کانفرنس کی خاص شاخیں چار ہیں۔ ادب، تاریخ، فلسفہ اور سائنس۔ پوری کانفرنس کا ایک عام صدر ہوا کرتا ہے۔ اور پھر ہر ایک شاخ کے لئے الگ الگ صدر بنایا جاتا ہے۔ یہ کانفرنس تقریباً پچیس سال سے قائم ہے۔ اور ہر سال ایک بار منعقد ہوتی ہے ؏

عبداللہ بنگالی

دریائے راوی

ہے سکوتِ شب میں راوی ناز سے محوِ خرام — یا کوئی شمشیر صحرا میں پڑی ہے بے نیام
چاند کی کرنوں سے لہریں شوخیاں کرتی ہوئیں — ساحلِ خود دار کی اُلفت کا دم بھرتی ہوئیں
پتھروں سے بار بار آ آکے ٹکراتی ہیں یہ — شاید اس خاموش ویرانے میں گھبراتی ہیں یہ
کشتیاں ہیں نیل سطحِ آب پر بکھری ہوئی — کچھ اِدھر بکھری ہوئی ہیں کچھ اُدھر بکھری ہوئی
ہیں فضا میں منتشر آزاد ملاحوں کے گیت — کرتے ہیں دل پر اثر آزاد ملاحوں کے گیت

یہ کنارے پر مگر کس کا مزارِ پاک ہے — جس کے ماتم میں فرشتوں کا گریباں چاک ہے
یادگارِ عہدِ رفتہ ہے یہ ایوانِ کہن — ہے نمایاں ہر در و دیوار سے شانِ کہن
سو رہا ہے اس میں اِک خوابیدہ اختر تاجدار — خاندانِ مغلیہ کا عدل پرور تاجدار ؏
صاف آتی ہے نظر ٹوٹی ہوئی بارہ دری — رو رہا ہوں دیکھ کر ٹوٹی ہوئی بارہ دری
ایک فرسودہ عمارت کے کھنڈر میں سامنے — کر دیا پامال جس کو گردشِ ایام نے ؏
وہ کھجوروں میں نہاں ہے، آصف الدولہ کی قبر — شکوہ سنجِ آسماں ہے آصف الدولہ کی قبر
اور اس کے متصل نورِ جہاں کی قبر ہے — کعبۂ اربابِ دل نورِ جہاں کی قبر ہے ؏

ہیں یہ سب سامان اے دل تیری عبرت کیلئے
سرمۂ عرفاں ہے یہ چشمِ بصیرت کے لئے

عارف

جنّتِ جدید

مذہب کی گوناگوں بشارتوں ۔ برکتوں اور وعیدوں میں جو دل آویزی ۔ جذب اور کشش جنت کو حاصل ہے ۔ وہ بحیثیت مجموعی شاید ہی کسی کو نصیب ہو ۔ حضرت ملّاؔ اسے محض دل کے بہلانے کا سامان خیال کریں تو کریں ۔ ورنہ دنیا کے کثیر حصّہ کی مصیبت اس کی دلکش یاد میں کٹ جاتی ہے ۔ جنت کا واہمہ یا خیال یا اعتماد جو کچھ بھی ہو ۔ کسی ایک مذہب سے خاص نہیں ۔ بلکہ دنیا کے جملہ مذاہب کی مجالس اس شمع کے دم سے روشن ہیں ۔ فطرت انسانی کے ایک ماہر صناع کی طرح مذہب نے بھی حقیقت جنت کو بے نقاب کرنا نظر فریبی کے منافی خیال کیا ۔ اور استعارہ اور تشبیہ کے پردۂ زنگاری کی اوٹ سے ایک ایسی جھلک دکھادی ۔ کہ اس زنبیل عمر عیار میں ہر ہر درجہ کے انسان کی ضیافت طبع کا سامان نظر آیا ۔ ہم حقیقت جنت پر فقیہانہ یا فلسفیانہ انداز سے نظر نہیں ڈال رہے ۔ اس لئے اس موضوع پر کسی "عبدالحق نما" تبصرے کی توقع عبث ہے ۔ یہ مذہبی پیشواؤں اور شب زندہ دار زاہدوں کا کام ہے ۔ رند تباہ حال کو اُن کے احاطۂ اختیار میں در آنے کی نہ ضرورت ہے ۔ اور نہ اجازت ۔ ہمیں امید ہے ۔ کہ اس طرح یہ حضرات بھی ایک فسانہ نگار کی خلوت کا احترام فرمائیں گے ۔ اور ایسی جگہ قدم رنجہ کرنے کی زحمت نہ اٹھائیں گے ۔ جہاں ان کے نزول اجلال کی نہ ضرورت ہے ۔ اور نہ اجازت ۔ درجنت کی کلید برداری انہیں مبارک لیکن بیان و معانی کے وسیع میدان میں جولانیٔ طبع سے ہمیں اُن کا کوئی حربہ ۔ تکفیر سے لیکر رجم تک ۔ نہیں روک سکتا ۔ احسان فراموشی کی اور بات ہے ۔ ورنہ ہم نے تو باسی پھولوں کے ہار اُتار کر کھلائے نو دمیدہ کے گلدستے رکھدئے ہیں ۔ اگر ناگوار طبع ہو تو شامت قابل علاج ہے ۔ ہم سزاوار دار نہیں ۔ جنت کی پُر اسرار حقیقت کو احساس ظاہری کی عینک سے دیکھیں ۔ تو اس میں ہمیں آب زلال کے چشمے ۔ دودھ اور شہد کی نہریں ۔ خمر یا شکر کے حوض ۔ حور و غلماں کا جھرمٹ ۔ ذرا سے اشارے پر قدموں ہونیوالے میوہ دار درخت نظر آئیں گے ۔ مگر دراصل بجنسہ یہ چیزیں نہیں ۔ بلکہ ان کے تاثرات کی رُوح ہمیں جنت میں ملیگی ۔ اور اس پردے میں کیا ہوگا ۔ کوئی نہیں بتا سکتا ۔ تہذیب و تمدن کے موجودہ دور کو ملحوظ رکھکر اگر ان تشبیہات کو نئے سانچے میں ڈھالا جائے ۔ تو ایک لطیف جدت طرازی کے علاوہ وسعت نظر کا باعث ہوگا ۔ زمانہ کی ذہنیت کے ساتھ اگر جنت کا ہیولیٰ بھی بدل جائے تو کیا مضائقہ ہے ۔ ؎ تو بھی بدل کہ اب تو زمانہ بدل گیا ۔

شاید ہم ان حدود سے تجاوز کر رہے ہیں جن سے آگے بڑھنے کا فنِ فسانہ نگاری روادار نہیں ۔

لق و دق سنسان جنگل میں جو آمد و رفت کے تمام وسائل سے محروم ہے ۔ ایک رفیع الشان مکان آسمان سے باتیں کر رہا ہے ۔ اوّل تو کوئی آنکھوں والا اِدھر سے گذرتا ہی نہیں ۔ اور جو دیکھو کوئی مجنوں و فرہاد کا جانشین جوشِ جنوں میں آ ہی نکلے ۔ تو درخت اور بیلیں اس طرح پر گھٹا ٹوپ چھائی ہیں ۔ مجال کیا کہ کسی کو اس گنبد سبز پوش پر مکان کا گمان ہو ۔ صبح کی تازہ دم ہوا ۔ اور نو طلوع آفتاب کی زندگی بخش کرنیں کھڑکیوں سے مکان کے پُر تکلف کمروں میں گھوم رہی ہیں ۔ محفلِ شب کی گو اگلی سی باتیں نہیں رہیں ۔ پھر بھی خمار آلودہ آنکھیں کسی کی انگڑائی پر تڑپ جانے کو موجود ہیں ۔ شمع روشن تو ہے مگر روز روشن کے سامنے اس کا چراغ نہیں جلتا ۔ میز پر کھانے پینے کا سامان موجود مگر ایسا معلوم ہوتا ہے ۔ کہ اس کا اہتمام کسی پھوہڑ بیگم کے ہاتھ میں ہے ۔ جو سلیقہ سے کام لینا اپنی روایات کے نقیض خیال کرتی ہے ۔ میز کے گرد عورتوں اور مردوں کا جمگھٹا ہے ۔ ان کے چہرے بتا رہے ہیں ۔ کہ اس وقت سرور و مسرت سے سیر ہو گئے ہیں ۔ اور انہیں پھر سے تنازعِ بقا کی الجھنوں میں پھنسنے کا رد عمل مطلوب ہے ۔ آخر صدر محفل نے محسوس کیا ۔ کہ عیش و عشرت کا خمار شروع ہوگیا ۔ تو وہ بطور دعائے خیر آخری تقریر کرنے کے لئے کھڑا ہوا ۔ شامپین کے کاگ اُڑے اور ارغوانی جام اڑنے لگے ۔

میرے احباب کو نو روز مبارک ۔ سب سے پہلے اس فرخندہ روزگار جماعت کی صحت کا جام ! جس نے اس تھوڑی سی عمر میں اپنے ارکین کو فکرِ فردا سے نجات دلا دی ہے ۔ یہ رہی جسوا کی صحت ! جس نے پولیس کو ناک چنے چبوائے ہیں ۔ اور دن دہاڑے کوٹھیوں کا اوڑھنا بچھونا تک غنیمت میں حاصل کیا ہے ۔ ہم ایسے بہادر ۔ جفاکش ۔ اور ہمدرد بنی نوع انسان (قہقہہ) بھائی پر جسقدر ناز کریں بجا ہے ۔ میرن نے جیبوں کو روپے ۔ پیسے ۔ گھڑی زنجیر سے سُبکبار کرنے میں سماج کی جو عظیم الشان خدمت کی ہے ۔ محتاج بیان نہیں ۔ دہلی میں آج آپ کے کمال کے جھنڈے اُڑ رہے ہیں ۔ جسونت کے خنجر آبدار کی ہندوستان بھر میں دھوم ہے ۔ کون ہے ۔ جو اس کا لوہا نہیں مانتا ۔ دس انسانوں کا خون بہا کر بھی ۔ اللہ رے انکسار ۔ ہنوز اپنے تئیں سرخرو خیال نہیں کرتا ۔ زینؔ نے مجھن ملو

سیدانی کے لباس میں بیگمات کی تفریح طبع کا سامان بہم پہونچایا۔ وہ مضحکہ خیز تو ضرور ہے۔ لیکن عملی لحاظ سے قابل قدر ہے۔ کہ دس ہزار کی گرانقدر رقم خزانۂ عامرہ میں داخل کی ہوئی ہے۔ اس طرح متوالی کے عشوہ و ناز۔ راز۔ و نیاز اور ملاگ لگاوٹ سے امیرزادوں کا جو روپیہ ضائع ہونے سے اس کی تعداد اسوقت تک پچاس ہزار سے آگے نکل گئی ہے۔ سب کی خدمات کا جداگانہ اعتراف وقت کی بساط سے باہر ہے۔ لیکن وہ یقین رکھیں۔ کہ ہمارے دلی جذبات تشکر و احسان سے لبریز ہیں۔ اور ان کے وجود کو یہ جماعت رحمت پروردگار خیال کرتی ہے۔ لیکن معراج کمال پر پہونچنے کے لئے ابھی بہت محنت اور سرگرمی کی ضرورت ہے۔ حکومت کے خزانے۔ بنک۔ جوہریوں کی دکانیں۔ ارباب نشاط کے زیورات وہ چیزیں ہیں۔ جن کا ہمارے پاس کوئی نمونہ موجود نہیں۔ ہمارے اس سالانہ جلسہ کے آئندہ انعقاد میں ابھی ایک سال کا طویل عرصہ پڑا ہے۔ کون مرے کون جیئے۔ مگر ہمیشہ یاد رکھو۔ کہ موت کا پنجۂ آہنی بھی ہمیں ایک دوسرے سے جدا نہیں کرسکتا۔ جنت نہ سہی۔ دوزخ تو کہیں نہیں گئی۔ جہاں چار دوست مل بیٹھیں گے۔ دوزخ رشک بہشت ہو جائیگی۔ اٹھایئے"

سب نے گلاس اٹھائے۔ مگر دو ایک کانپ رہے تھے۔ اور چار پانچ کے چہرے زرد ہو رہے تھے۔ لیکن یہ زردی زعفران سے نہیں۔ سکرات سے ملتی تھی۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔

سالار اور زیتین کی موٹر اپنا راستہ آپ بناتی نکل گئی۔ اور شہر کے ایک خوبصورت بالاخانے کے نیچے جا کھڑی ہوئی۔ زیتین اُتری اور پائدان پر کھڑے کھڑے بولی:-

"ایک دفعہ نہیں بارہا کہہ چکی۔ کسی کا پابند ہو کر رہنا میری سرشت کے خلاف ہے۔ لیکن یہ شادی کا جھگڑا ختم ہونے کو نہیں آتا۔ اگر یہ زندگی مجھے پسند ہوتی۔ تو اسوقت میری موٹر قصر آزادی سے نہ آتی ہوتی"۔

"لیکن مجھ سے شادی آپکی آزادی میں مخل نہ ہوگی۔ اور ہم ایک جان ہو کر ساری جماعت کو مٹھی میں لے آئیں گے"۔

"تو کل جواب دونگی"

"ضرور"

"بلا تساہل"۔

سالار اپنے مسکن کے قریب پہنچا۔ تو دروازے سے ایک کریہہ صورت بڑے درجے کی غلیظ لڑکی نکلی۔ اس کے ایک ہاتھ میں روٹی کا ٹکڑا تھا۔ اور دوسرے میں دودھ کا ایک پیالہ۔ اسے دیکھکر سالار کی نفرت اور حقارت کی انتہا نہ رہی۔ اس کی شکل نے سالار کی نظر کو ایذا پہونچائی۔ پیشانی کا چمڑہ کھنچ گیا۔ اور سُرخ آنکھوں نے غصہ کی لہرائی کانپنے دیا۔ لڑکی سالار کی واحد خادمہ تھی۔ اور ہر ممکن طریق سے مالک کو دق کرنا اس نے اپنا شعار بنا رکھا تھا۔ سالار اسکے ہتھوں سے تنگ آگیا تھا۔ کئی دفعہ جواب دیا۔ گھر سے نکال باہر کیا۔ لیکن اُسے نہ جانا تھا نہ گئی۔

——— اور سالار کے سینہ پر مونگ دلنے کیلئے اس گھر میں اپنی موجودگی کو لازم بنا دیا۔ لڑکی آسمان کی طرف دیکھ رہی تھی۔ اور زمین پر چل رہی تھی۔ اس حرکت کا یہ نتیجہ لازم تھا۔ کہ وہ ٹھوکر کھائے۔ چنانچہ اس نے ٹھوکر کھائی۔ اور عین اسوقت گری جب ایک موٹر لاری بھی وہاں آ کر الٹ گئی۔ سالار نے جھپٹ کر لڑکی کو زد سے بچالیا۔ اور خود لپیٹ میں آگیا۔ لڑکی تو اپنے پاؤں پر کھڑی ہوگئی۔ مگر سالار ہسپتال جا پہونچا۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔

سالار صبح سے گھوم رہا تھا۔ خدا جانے کتنے میل نکل گیا۔ مگر وہ تازہ دم تھا۔ ذرا تھکان محسوس نہ ہوتی تھی۔ ہوا خوشگوار تھی۔ مگر دھوپ میں چلنا بھی گراں نہ گذرتا تھا۔ سب خوش و خرم نظر آتے تھے۔ ایک بھی تو ایسا نہ ملا۔ جسے گردش زمانہ کی شکایت یا دنیائے وطن سے شکوہ ہو۔ سالار نے دو ایک راہگیروں کی جیبوں کی طرف ہاتھ بڑھایا۔ مگر انہوں نے مسکرا کر خود ہی اپنی جیبیں خالی کردیں۔ حیران تھا یہ کون مقام ہے۔ دہلی؟ شاید!

بھوک محسوس ہوئی۔ تو ایک ہوٹل میں گیا۔ داخل ہوا۔ تو ایک خانساماں ملا۔ جس سے اسکی پہلے کی جان پہچان تھی۔ حیران تھا۔ کہ وہ یہاں کیسے آیا۔ کھانا کھا کر چپکے سے نکل آیا۔ مگر کسی نے بل کیلئے اس کا تعاقب نہ کیا۔ جیب میں ہاتھ ڈالا۔ تو سگرٹ کی ڈبیہ نکل آئی۔ ایک عدد نکالا سلگایا۔ اور ایک پارک میں بیٹھ کر کش لگانے لگا۔ اتنے میں چند رقاصہ آگئیں۔ گایا۔ بجایا۔ ناچیں۔ کودیں۔ اور چلی گئیں۔ سالار بہت محظوظ ہُوا۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔

دونوں وقت مل رہے تھے۔ مگر سالار ہنوز سرگرم خرام تھا۔ ایک لمبی سڑک سامنے تھی جس کے دونوں طرف صنوبر کے درخت جھوم رہے تھے۔ اور ان میں جابجا بجلی کے ہنڈے اور گیس لمپ روشن تھے۔ سڑک ایسی سیدھی تھی کہ حدِ نگاہ تک سے دو قدم آگے نکلتی تھی۔ پرسکوں اور پھولوں میں بسے ہوئے ہوا کے جھونکے مشام جان تک کو معطر کر رہے تھے۔ مگر اُسے مطلق یاد نہ تھا۔ کہ اس نے ابتک کیا کیا۔ کہاں کہاں پھرا۔ کیا کھایا اور وقت کا حساب کیا تھا۔ خیال آیا۔ ذرا گانا سنیں۔ اور قسمت آزمائیں۔ جیب میں ہاتھ ڈالا۔ دو اشرفیاں موجود تھیں۔ اس جیسے گھاگ قمار باز کے لئے یہ کافی سے زیادہ سرمایہ تھا۔ نظر اٹھا کر دیکھا۔ تو قمار خانہ سامنے تھا۔ وہ حیران تھا۔ کہ کس نے مانٹی کارلو کا تختہ اُٹھا

کر یہاں لا رکھا۔ خیر وہ داخل ہُوا۔ داؤں لگانے شروع کئے۔ اور تھوڑی دیر میں اس کے سامنے اشرفیوں کا انبار لگ گیا۔ اتنے میں اُس نے سُنا کوئی اس کا نام لیکر پکار رہا ہے۔ پھر کے دیکھا۔ تو ابراہیم تھے۔ بڑے تپاک سے ملے۔ ارے میاں ابراہیم بموقعہ خوب ملے۔ ذرا یہ تو بتا نا۔ مَیں ہوں کہاں آخر! کبھی سمجھتا ہوں۔ دلی ہے۔ کبھی مانٹی کارلو۔ اور چاروں طرف سے مہ جبیں۔ گل اندام لڑکیاں آکر ناچنے گانے لگیں ان کے ہاتھوں میں شراب کے گلاس تھے۔ اور ہر ایک آگے بڑھکر نہایت ادب سے سالار کے آگے پیش کرتی تھی۔ اور وہ چڑھائے جاتا تھا۔ جب سب گلاس ختم ہو گئے تو وہ چلی گئیں۔ سالار نے کہا۔ رنگ و بو تو خوب تھے۔ مگر حرام ہے۔ جو ذرا بھی سرور ہو۔ اونچی دکان پھیکا پکوان! کم بخت یہاں بھی پانی پلاتے ہیں۔ آبکاری والے خدا جانے کہاں مر گئے۔ کوئی نہیں پوچھتا"۔ ابھی سالار نے اپنا لیکچر نہ سمیٹا تھا۔ کہ ایک شخص وردی پہنے پرتلہ لگائے آیا۔ اور فرشی سلام کر کے کہنے لگا۔ کہ حضور کو اشربہ سے کیا شکایت ہے۔ ابراہیم نے بات کاٹ کر کہا "اجی نئے آئے ہیں۔ یہاں کی معاشرت سے آگاہ نہیں۔ آہستہ آہستہ جان جائیں گے۔ آپ جائیے۔ کوئی بات نہیں"۔ سپاہی مسکرا کر چلا گیا۔

سالار۔ حیرت پر حیرت ہو رہی مجھے۔ بھیّا! یہ کیوں نہیں کہتے۔ کہ کہاں ہوں۔ ظاہرا عالم خواب تو معلوم نہیں ہوتا"۔

ابراہیم۔ اسے جنت کہتے ہیں۔

سالار۔ ارے جنت! مجھے کیسے بار ملا۔ یہاں۔

ابراہیم۔ ایک بیکس یتیم لڑکی کی پرورش اور جان بچانیکے صلہ میں۔

سالار۔ بس۔ اور میرے گناہ۔ حرف غلط ہو گئے۔ اور میری ایک نیکی نے اتنا بڑا دفتر دھوڈالا۔ سچ ہے تیرے بخشنے کے ڈھنگ نیارے ہیں۔

نور الٰہی محمد عمر

طاؤس

یہ کیف گہِ وشت یہ برسات کا موسم ؛ یہ وجد کا عالم
ہے رقص میں طاؤس کہ اک رنگِ مجسم ؛ رقصیدۂ پیہم
سینا ہے کلیمی ہے کہ ہے سینۂ زریں ؛ یا چشمۂ سیمیں
جنبش میں ہے اعجاز سے اک وادیٔ رنگیں ؛ یا گردنِ پرخم

نیلوفری دم پہ ہیں یا پاشیدہ جواہر ؛ یا چرخ پہ اختر
یا نیند سے جاگے ہوئے سبزے کی جبیں پر ؛ ہے رقص میں شبنم
موسیقیِ صحرا تو نہیں وجد میں رقصاں ؛ صد رنگ بداماں
یا نغمہ سرا ہے کوئی طاؤس خراماں ؛ برہم زنِ عالم

اے جانِ ترنم! یہ تیری زمزمہ سازی ؛ جذبات نوازی
یہ سلسلۂ مستیِ الحانِ حجازی ؛ یہ نغمۂ پیہم
مدہوشیٔ "محویت کامل" سے جو جھوما ؛ طاؤس نہیں تھا
میں نے ہی نہیں آج تو فطرت نے بھی دیکھا ؛ نغمے کو مجسم

روش صدیقی

سیر یورپ

(طبقات شمالی کا ایک افسانہ)

گذشتہ سے پیوستہ

مس پارسنز کی عمر اس وقت قریب چالیس سال کے تھی۔ انیس کو حیرت ہوا کرتی تھی کہ ایک ایسی خوبصورت تربیت یافتہ اور سنجیدہ مزاج خاتون نے اس عمر تک شادی کیوں نہیں کی۔ پہلے ہی دن سے یہ خاتون انیس کے ساتھ بڑی شفقت سے پیش آتی تھیں اور رفتہ رفتہ اُن کی آپس میں اسقدر بے تکلفی ہوگئی تھی۔ کہ انیس انہیں خالہ کہہ کر پکارتا تھا یہ بھی ہر مرحلے پر اس کی رہنمائی کرتیں اور کوشش کرتیں کہ غیر ملک کی رہائش اسے اداس نہ کرے۔ بعض دفعہ جب ان دونوں میں اختلاف رائے ہوجاتا۔ تو مس پارسنز تحکم کے ساتھ بھی اپنی بات منوا لیتیں۔ انیس کو بھی ان کا اسقدر پاس خاطر ملحوظ تھا کہ وہ ہر بات میں ان کا مشورہ لیا کرتا اور ان کی رائے کے مطابق عمل کیا کرتا۔

جب ان دونوں میں سے کوئی لندن سے باہر جاتا تو متواتر خط و کتابت کا سلسلہ جاری رہتا۔ چنانچہ خط و کتابت ہی کے سلسلہ میں انیس کو معلوم ہوا کہ پارسنز کی دو دفعہ نسبت ہوئی تھی لیکن دونو دفعہ نکاح کے دن سے دو چار روز پہلے ان کا منسوب کسی حادثہ کا شکار ہو کر مارا گیا۔ دوسرے واقعہ کے بعد ان کی طبیعت شادی کے نام سے ہمیشہ کے لئے ڈر گئی۔ اور انہوں نے اپنی زندگی دینی کاموں کے لئے وقف کردی۔ جب انیس لندن پہنچا تو یہ انجمن اشاعت انجیل کی ایک شاخ کی سیکرٹری تھیں۔ ان کا دفتر گرد و ہی میں واقع تھا۔ اسی سہولت کی وجہ سے انہوں نے اس مکان میں رہائش بھی اختیار کررکھی تھی۔

جو صاحب انیس اور اس کے دونوں ساتھیوں کو سٹیشن پر ملے تھے۔ وہ بھی بیرسٹری کے طالب علم تھے اور کچھ عرصے سے اسی مکان میں رہتے تھے۔ چند دن کے بعد انیس کے دونوں ساتھی تو کیمبرج چلے گئے۔ اور یہ کسی دوسرے مکان میں تشریف لے گئے۔ ان کے بعد مسز بیکر بھی اپنی صاحبزادی کے پاس چلی گئیں۔ ان کی جگہ اور مہمان آتے جاتے رہتے۔ کوئی چند دن ٹھیرتا۔ کوئی کچھ زیادہ عرصہ تک قیام کرتا۔ ان میں سے بعض کا تذکرہ مناسب مقامات پر آتا رہیگا۔ انیس کے ساتھی جب کیمبرج چلے گئے تو انیس کو رہائش کے لئے ایک بڑا کمرہ مل گیا۔

پہلے دن ناشتے کے دوران میں انیس کے دماغ میں طرح طرح کے خیالات آرہے تھے۔ سب سے پہلے اُسے یہ تشویش ہوئی کہ یہاں سب کے لباس ایک طرح کے ہیں۔ اور سب کی شکل و شباہت بھی ایک ہی جیسی ہے۔ مجھے تو انہیں شناخت کرنا بھی مشکل ہوا کریگا۔ پھر اسے خیال آیا کہ سڑکیں بازار اور چوک بھی قریب قریب ایک ہی جیسے ہیں۔ میں اپنا راستہ کیسے معلوم کرونگا۔ جہاز کے کھانوں کی فہرست کے مطابق اس کا خیال تھا کہ عام گھروں میں بھی کھانوں کی ویسی ہی افراط اور کثرت ہوا کریگی۔ اس میں بھی اس کو مایوسی ہوئی۔ کیونکہ کھانا گو اچھا اور کافی تھا لیکن جہاز کی طرح قسم قسم کا نہیں تھا ایسے ہی مختلف خیالات کے ساتھ ساتھ اُسے مکان کی مالکہ اور دوسری دونوں خاتونوں کے سوالات کا جواب بھی دینا پڑتا تھا۔ سفر کیسے کٹا؟ تکان تو نہیں ہے؟ اداسی تو نہیں معلوم ہوتی؟ آب وہوا تو موافق ہے نا؟ کیوں یورپ کیسا پسند آیا؟ وغیرہ وغیرہ۔ انیس کو حیرت ہوئی کہ اتنی سنجیدگی اور اصرار کے ساتھ یہ باتیں پوچھی جارہی ہیں۔ کچھ عرصہ انگلستان رہ چکنے کے بعد اسے معلوم ہوا کہ اس قسم کے سوالات مہمان کی تواضع کا ایک ضروری جزو ہیں۔ چنانچہ دوسری صبح جب انیس ناشتے پر آیا۔ تو مقررہ سلام کے بعد مالکہ مکان نے دریافت کیا کہ رات سوئے تو اچھی طرح؟ اجنبیت کی وجہ سے نیند میں خلل تو نہیں آیا؟ اور بڑی خوشی کے لہجہ میں کہا کہ موسم تو آج اچھا ہے۔ سورج نکلا ہوا ہے! انیس نے مسکرا کر ہاں کہدیا۔ لیکن پھر اُسے

تعجب ہوا کہ بھلا یہ کونسی خصوصیت کے ساتھ بتانے کی بات تھی کہ سورج نکلا ہوا ہے۔ لیکن جب انگلستان کے موسم خزاں اور موسم سرما کا کچھ تجربہ ہو چکا تو انہیں معلوم ہو گیا کہ یہاں سورج کا چمکتے ہوئے نظر آنا واقعی ایک ایسا نظارہ ہے جسے دیکھ کر طبیعت میں بشاشت پیدا ہو جاتی ہے اور دل چاہتا ہے کہ ایکدوسرے کو اس پر مبارکباد دی جائے۔

ناشتے کے بعد انیس کے ساتھیوں سے ملنے کے لئے ان کے ایک ہندوستانی دوست آ گئے۔ اور تجویز یہ ہوئی کہ کک کے دفتر میں جا کر اپنے روپے کا پتہ لگایا جائے کہ اب تک آیا ہے یا نہیں اگر آ گیا ہو تو بنک کا حساب کھولدیا جائے۔ اور ڈاک کے لئے پتہ بھی لکھوا دیا جائے۔ چنانچہ ہیمرسمتھ کے سٹیشن سے سب لوگ ڈسٹرکٹ ریلوے پر سوار ہو کر بلیک فرائس سٹیشن تک گئے۔

گو یہ ریلیں بازاروں کی سطح سے نیچی چلتی ہیں اور بعض جگہ سرنگوں میں سے ہو کر مکانوں کے نیچے سے بھی گذرتی ہیں۔ لیکن ٹیوب ریلوے کی طرح یہ زمین دوز نہیں ہیں۔ دونوں قسم کی ریلیں برقی طاقت سے چلتی ہیں۔ اور دونوں "انڈر گراؤنڈ" ہیں فرق یہ ہے کہ موخر الذکر تو محض بازاروں کی سطح سے نیچی چلتی ہیں۔ اور ٹیوب گاڑیاں بعض بعض جگہ کئی سو فیٹ سطح زمین سے نیچے گویا زمین کے پیٹ کے اندر چلتی ہیں۔ لندن کے نیچے ان دونوں قسم کی ریلوں کا ایک جال بچھا ہوا ہے۔ شہر کے باہر کے حصوں میں جہاں آبادی کھلی کھلی ہے یہ ریلیں زمین کے اوپر آ جاتی ہیں لیکن شہر کے پرانے اور گھنی آبادی والے حصوں میں سب زمین کے اندر ہی چلتی ہیں۔ ہولبورن کے سٹیشن پر پکاڈلی ٹیوب کی ریلیں سطح زمین سے قریباً تین سو فیٹ نیچے چلتی ہیں۔ چیرنگ کراس اور واٹرلو کے سٹیشنوں کے درمیان ہیکر لو ٹیوب کی ریلیں دریائے ٹیمز کے نیچے سے بھی گزرتی ہیں۔

انڈر گراؤنڈ ریلوں کے سلسلوں میں سے دو بڑے سلسلے ڈسٹرکٹ ریلوے اور میٹروپولیٹن ریلوے کے ہیں۔ اول الذکر کی ریلیں ومبلڈن۔ رچمنڈ۔ ہونسلو۔ ایلنگ۔ ہیرو اور آکسبرج سے چلکر شہر کے مرکز کو جاتی ہیں۔ اور مرکز سے نکل کر مشرق کی طرف بارکنگ اور سوتھینڈ تک پہنچا دیتی ہیں۔ میٹروپولیٹن کی ریلیں لندن کے نیچے ایک حلقے میں چکر لگاتی رہتی ہیں جسے انر سرکل یعنی اندرونی حلقہ کہتے ہیں۔ ایک شاخ ہیمرسمتھ سے چلکر اندرونی حلقے کو جا ملتی ہے اور ایک شاخ بیکر سٹریٹ سے نکلکر ویمبلے ہیرو اور سڈبری کو چلی جاتی ہے۔

ٹیوب ریلوں کے سلسلوں میں سے زیادہ مشہور یہ ہیں:۔

پکاڈلی ٹیوب۔ جو ہیمرسمتھ سے چل کر سوتھ کنسنگٹن اور پکاڈلی سرکس ہوتی ہوئی فنسبری پارک کو چلی جاتی ہے۔

سنٹرل لندن ریلوے پہلے وُڈ لین سے بنک تک جاتی تھی۔ لیکن اب ایک طرف تو بنک سے لورپول سٹریٹ تک اور دوسری طرف وُڈ لین سے ایلنگ براڈوے تک وسیع کی جا چکی ہے یہ لائن آکسفورڈ سرکس برٹش میوزیم اور چانسری لین وغیرہ سے گذرتی ہے۔

بیکرلو ریلوے اب جنوبی لندن سے شروع ہو کر ہیمسٹڈ ہائی گیٹ۔ گولڈرس گرین اور اب مورڈین تک جاتی ہے۔ ان کے علاوہ اور بھی سلسلے ہیں لیکن وہ بہت زیادہ مشہور نہیں ہیں۔ ہر سلسلے کی ریلیں مرکزی لندن کے نیچے سے گذرتی ہیں جہاں دوسرے سلسلوں کے ساتھ ان کے مقامات اتصال ہیں۔ تاکہ مسافر زمین کے اندر ہی اندر سلسلہ بدل کر لندن کے جس حصے میں چاہیں پہنچ سکیں۔

بازاروں میں ان ریلوں کے سٹیشن دکانوں کی قطار میں بنے ہوئے ہیں۔ صرف باہر لکھا ہوا ہوتا ہے کہ یہ فلاں سٹیشن ہے۔ اندر داخل ہوتے ہی سامنے ٹکٹ لینے کی کھڑکیاں نظر آتی ہیں۔ اکثر سٹیشنوں پر ٹکٹ لینے کی مشینیں بھی لگی ہوئی ہیں۔ ایک آنہ۔ دو آنے۔ تین آنے کے ٹکٹوں کی الگ الگ مشینیں ہوتی ہیں۔ مسافر کرایہ کی مقررہ رقم مشین میں ڈالدیتا ہے اور ٹکٹ خود بخود مشین سے نکل آتا ہے۔ البتہ اگر ریزگاری واپس کرانی ہو تو کھڑکی سے ٹکٹ خریدنا پڑتا ہے۔ ٹکٹ لیکر مسافر لفٹ یعنی مسافروں کو اوپر نیچے لے جانے والے برقی پنجرے میں داخل ہو جاتا ہے۔ یہ پنجرے ایک ایک منٹ کے بعد نیچے اوپر جاتے رہتے ہیں۔ نیچے پہنچ کر کئی سرنگیں نظر آتی ہیں۔ جن میں برقی روشنی سے دن چڑھا ہوا معلوم ہوتا ہے ان میں بہت سے نشان لگے ہوئے ہوتے ہیں کہ فلاں طرف کی ریل پر فلاں راستے سے جاؤ۔ پلیٹ فارم پر نہ کوئی سٹیشن ماسٹر ہوتا ہے۔ نہ ٹکٹ کلکٹر نہ قلی۔ ٹکٹ کا کٹر کی تو اس لئے ضرورت نہیں کہ مسافر صرف لفٹ سے داخل ہو سکتے ہیں۔ اور لفٹ ہی سے نکل سکتے ہیں۔ اور لفٹ میں داخل ہوتے یا اس سے نکلنے وقت ٹکٹوں کا معائنہ ہو جاتا ہے۔ قلی کی اس لئے ضرورت نہیں کہ یہ ریلیں صرف شہر کے نیچے چلتی ہیں۔ اکثر مسافروں کو بھاری اسباب

ساتھ لیجانے کی ضرورت نہیں پڑتی - اور جو تھوڑا بہت سا سامان کسی وقت لیجانا بھی پڑے تو مسافر اُسے خود اٹھا لیتے ہیں - دو - دو تین تین منٹ کے وقفے پر ریلیں آتی جاتی رہتی ہیں - ریل کے کھڑے ہوتے ہی دروازے خود بخود برقی طاقت سے کھل جاتے ہیں - پہلے اُترنے والے مسافر اُترتے ہیں اور جب تک تمام مسافر اتر نہ لیں کوئی مسافر چڑھنے کی کوشش نہیں کرتا - جب تمام اترنے والے مسافر اُتر جاتے ہیں تو چڑھنے والے مسافر نہایت اطمینان سے سوار ہو جاتے ہیں - اس ترتیب کے اختیار کرنے سے دس پندرہ سکنڈ میں بیسیوں مسافر ہر سٹیشن پر اُتر جاتے اور سوار ہو جاتے ہیں - نہ کسی قسم کا شور و غوغا ہوتا ہے - نہ کسی قسم کی بےچینی پیدا ہوتی ہے - جب سب مسافر سوار ہو چکتے ہیں تو ریل کے دروازے خود بخود بند ہو جاتے ہیں اور ریل روانہ ہو جاتی ہے -

ٹکٹ لیتے وقت - لفٹ میں داخل ہوتے وقت - لفٹ سے نکلتے وقت بھی ہر شخص ترتیب اور باری سے چلتا ہے اور اس طرح تمام کاروبار اطمینان سے چلتا رہتا ہے - سُرنگوں میں اور پلیٹ فارموں پر مصنوعی طور پر پیدا کی ہوئی تازہ ہوا ہر وقت تیزی سے چلتی رہتی ہے اس لئے طبیعت پر کسی قسم کا بوجھ نہیں پڑتا - اور تنگی کا احساس نہیں ہوتا - برقی ریلوں کے علاوہ ٹریم اور موٹر بس کے ذرائع آمد و رفت بھی ہر جگہ موجود ہیں - ایک دو مقامات پر ٹریم کو بھی زمین کے نیچے سے گذرنا پڑتا ہے - موٹر بس ہمیشہ زمین کے اوپر ہی چلتے ہیں - برقی ریلوں - ٹریم اور بسوں میں کرایہ بالکل سستا ہے اور سوائے ڈسٹرکٹ اور میٹروپولیٹن ریلوں کے جن میں دو درجے ہوتے ہیں باقی سب میں ایک ہی درجہ ہوتا ہے - مرکزی لندن میں انسان ایک جگہ سے دوسری جگہ دو تین آنے میں پہنچ سکتا ہے - اور دور کے حصوں میں زیادہ سے زیادہ چھ سات آنے ہیں -

شہر کے جس حصے میں بھی کسی کی رہائش ہو - ٹریم یا بس کی کوئی لائن یا برقی ریل کا سٹیشن ضرور اس کے قریب ہی ہوگا - بلیک فرائرس سٹیشن سے باہر نکل کر انیس کی نظر جب بازار پر پڑی تو وہ بیحد متحیر ہوا - اس جگہ چار سڑکیں ملتی ہیں - اور چونکہ یہ جگہ مرکزی حصے میں ہے - اس لئے یہاں آمد و رفت کی اتنی کثرت تھی اور ہر قسم کی گاڑیوں کا اسقدر ہجوم تھا کہ چوک کے ایک طرف سے دوسری طرف پہنچنا ناممکن نظر آتا تھا - لیکن انیس کو معلوم ہوا کہ سڑک کے اوپر سے گذرنا لازمی نہیں چوک کے نیچے ایسے راستے بنے ہوئے تھے جن کے ذریعے سڑکوں کے نیچے ہی نیچے مسافر دوسرے پار جا سکیں - ان راستوں کو "سب وے" کہتے ہیں - چنانچہ انیس اور اس کے ساتھی نچلے رستے سے ہو کر سڑک کی دوسری طرف پہنچ گئے - اور دو تین فٹ کے بعد لڈگیٹ سرکس میں داخل ہو گئے - جہاں کُک کا دفتر واقعہ تھا - اس چوک میں بھی آمد و رفت کی بڑی بھیڑ تھی - لیکن اس کے باوجود ہر چیز ایک ترتیب اور اطمینان کے ساتھ حرکت کر رہی تھی - چوک کے وسط میں دو سپاہی کھڑے تھے جو آمد و رفت کو ایک مقررہ نظام کے ماتحت چلا رہے تھے اور ہر گاڑی والا ان کے بازو کے اشارے کے مطابق حرکت کرتا یا رک جاتا تھا - اسباب کی گاڑیوں کے آگے جو گھوڑے جُتے تھے وہ اس قدر جسیم اور خوبصورت تھے اور ایسے وقار کے ساتھ چلتے کہ انیس کا دل چاہتا کہ گھنٹوں کھڑا اس نظارے کو دیکھتا رہے -

کُک کے دفتر میں روپیہ کا انتظام کرنے کے بعد یہ لوگ اسی دفتر کے ڈاک کے محکمے میں گئے - انیس کے نام کا صرف ایک خط اس کے ایک دوست کی طرف سے آیا تھا - گھر والوں کی جانب سے کوئی خط نہ تھا - اور اگرچہ اسے معلوم تھا کہ اس کے رخصت ہونے کے بعد جو خط لکھے گئے ہونگے وہ ابھی آئندہ ڈاک میں ملیں گے - پھر بھی اسے مایوسی سی ہوئی -

کُک کے دفتر سے نکل کر لڈگیٹ ہل پر یہ لوگ ہوپ برادرس کی دوکان میں گئے اور کچھ رومال - جرابیں - کالر - نکٹائی - بنیان - دستانے وغیرہ خریدے - سامنے سینٹ پال کے گرجے کی عالیشان عمارت نظر آ رہی تھی - لیکن چونکہ ابھی کچھ ضروری امور انجام دینے تھے اس لئے انیس نے سیر کے خیال کو فی الحال ملتوی کر دیا -

(باقی آئندہ)

رباعی

رازِ رحمت کسی کو معلوم نہیں
اسکی غایت کسی کو معلوم نہیں
عالم ہے اسیر دامِ نیرنگِ نمود
اصلی حالت کسی کو معلوم نہیں

روآں
ایم۔ اے

دنیائے ادب

حسن و عشق کی داستان

یہ آج کی بات نہیں ہے بلکہ اس وقت کی بات ہے جب دنیا بالکل نئی نئی تھی لوگ لباس کی بندشوں سے آزاد اور حسن و عشق کی دل فریبیوں سے ناآشنا تھے۔ اس وقت اس دنیا پر نہ مشرقی تمدن چھایا ہوا تھا۔ اور نہ مغربی تہذیب کی سحر کاریاں تھیں۔ دنیا والے انتہائی سکون کے ساتھ زندگی گذار رہے تھے۔ اور اگرچہ حسن و عشق کے کیف سے محروم تھے لیکن اس کے ساتھ ہی ساتھ فراق و ہجر کے نشتروں سے بھی ان کے جگر محفوظ تھے۔ میں تو یہ کہوں گا کہ وہ زندگی بڑے امن کی زندگی تھی۔

جب دنیا کو پُرسکون اور بے کیف زندگی گذارتے ہوئے ایک زمانہ گذر گیا تو قدرت کی طلسم کاریاں حسن و عشق کو عالم وجود میں لائیں۔ حسن کو عشق سے اور عشق کو حسن سے جدا رکھا گیا۔ ان دونوں میں ہزارہا میل کا فاصلہ تھا۔ اور یہ دونوں بالکل ایک دوسرے سے ناآشنا تھے۔ لیکن قدرت کا یہ فیصلہ تھا کہ جب روز حسن کی مستانی کیفیات عشق کی بیچینی سے ہم آغوش ہو جائیں گی اس روز دنیا پر حسن و عشق کی حکومت ہوگی۔

خیال کے حدود سے بہت دور ایک خوشنما جزیرے میں ایک غیر معمولی گلاب کی کلی دیکھی گئی۔ اور کہا جاتا ہے کہ اس گلاب کے شگفتہ ہونے کے بعد حسن کی پیدائش ہوگی۔ انسان اس روز سے بالکل بے خبر تھا۔ لیکن اس خوشنما جزیرے کے خوشنما پرندوں کے کان میں چپکے سے کوئی یہ راز کہ گیا تھا۔ اس زمانہ کا دستور تھا کہ ہر صبح کو طائران خوش الحان اس گلاب کی کلی کے گرد مستانہ وار گاتے ہوئے پرواز کیا کرتے تھے۔ جس وقت یہ ننھے پرند عالم کیف میں رقص کرتے تھے تو یہ معلوم ہوتا تھا کہ گویا وہ اس غنچے کے شگفتہ ہونے کے لئے بے چین ہیں۔

اس جزیرہ سے بہت دور لامحدود فاصلے پر ایک ایسی جگہ جہاں سمندر میں طلاطم برپا رہتا تھا۔ اور بنی نوع انسان کا وہاں گذار دشوار ہی نہیں بلکہ ناممکن تھا۔ ایک کنول کا ناشگفتہ پھول پانی پر تیرتا ہوا دکھائی دیا۔ سمندر کی موجیں اس ناشگفتہ پھول کو اپنی آغوش میں لئے ادھر سے اُدھر پھرتی تھیں۔ اور اس کے متعلق مشہور تھا کہ شگفتہ ہونے کے بعد اس پھول سے عشق پیدا ہوگا۔ سمندر کی موجوں کا طلاطم عشق کی پیدائش کا راگ سالہا سال تک اسی طرح گاتا رہا۔

اور بے چین سمندر کی موجیں عشق کے دیدار کے لئے تڑپ رہی تھیں۔ لیکن ابھی اس کی پیدائش کا وقت دور تھا۔

ایک زمانہ گزر گیا۔ آخرکار ایک صبح کو خوشنما جزیرے میں جہاں گلاب کا ایک نیم شگفتہ غنچہ معطر فضا میں پھیلا رہا تھا۔ ایک پر سکون ہلکی روشنی رونما ہوئی — اس روشنی میں صدہا حسن کے مجسمے فضا میں رقص کرتے ہوئے دکھائی دئے — عین صبح صادق کے وقت گلاب کی کلی کھلی۔ اور اس میں سے ایک پیکر جمال نے مستانہ انداز کے ساتھ اس زمین پر قدم رکھا جس پر قدرت کی گلکاریوں نے پھول کی پتیوں کا فرش بچھا رکھا تھا۔ اس کا حسن انسانی آنکھ کو خیرہ کر دینے کے لئے ایک طلسم و رعنائی کا مجسمہ تھا۔ حسن کی ملکہ تھی۔ جوں ہی اس پیکر جمال نے اپنے چہرہ کو بے نقاب کیا مست خوشبوئیں دنیا میں پھیل گئیں۔ اور اس کے حسن کی شعاعوں نے لطیف کرنوں کا جامہ پہنکر دنیا کو منور کر دیا۔

حسن کی لطیف کرنوں نے سمندر کی آغوش میں رہنے والے ناشگفتہ پھولوں کی سوئی ہوئی پنکھڑیوں کو چھوا ہی تھا۔ کہ سمندر میں ایک زبردست طوفان آیا۔ کچھ دیر کے بعد سمندر کا بے شمار پانی ایک جگہ جمع ہوا۔ اور جمع ہو کر وہ سطح آب سے ناشگفتہ پھول کو لئے ہوئے غیر معمولی بلندی پر اٹھ گیا۔ کچھ دیر کے بعد ناشگفتہ کنول کے ناشگفتہ پھول کی پنکھڑیوں کے اندر ایک ہلکی سی جنبش ہوئی۔ اور اس جنبش کے بعد ناشگفتہ پھول شگفتہ پھول کی صورت میں تبدیل ہو گیا۔ اور اس سے ایک جوان رعنا پوری شان دلبری کے ساتھ نکل کر سطح سمندر پر اس طرح کھڑا ہو گیا جیسے کوئی پتھر کی چٹان پر کھڑا ہو جاتا ہے جس جگہ یہ جوان رعنا کھڑا تھا وہاں سمندر بالکل ساکت رہا۔ لیکن چاروں طرف طوفان پر طوفان آنے شروع ہوئے۔ ایسا معلوم ہوتا تھا کہ دنیا اس طوفان میں غرق ہو جائے گی۔ مردانہ حسن کی شعاعیں فضا میں پھیلیں اور وہ حسن کی شعاعوں سے ہم آغوش ہوئیں۔ لیکن اس کے باوجود ایک دوسرے کا کوئی علم نہ تھا۔

حسن مجرد سالہا سال تک ایک پیکر جمال دوشیزہ کی طرح جزیرہ میں رہا حسن کی ملکہ اپنے حسن کی شعاعوں سے دنیا کو منور کر رہی تھی۔ لیکن اس کا دل تڑپ

اور بھی محسوس کر رہا تھا۔ وہ ہمیشہ جزیرہ کے ساحل پر کسی کی تلاش میں گھنٹوں بالوں کو فضا میں پھیلائے ہوئے انتظار کیا کرتی تھی۔ لیکن ابھی اس کی بے چینیوں کے ختم ہونے کا زمانہ نہیں آیا تھا۔ حسن مجرد مست خوشبو بنکر سمندر کے ساحل پر لوٹتا تھا۔ اور اس کے دل کی تڑپ کسی کو پیام وصل دے رہی تھی لیکن اس کیلئے ابھی دیر تھی۔ اسطرف عشق کی تباہیوں نے سمندر کے اندر ایک طلاطم برپا کر رکھا تھا۔ اور جوان رعنا کی بے چینیاں اسے اس جزیرے کی طرف کھینچ رہی تھیں۔ لیکن قدرت کی مجبوریوں نے اس جوان رعنا یعنی عشق کو پابند کر دیا تھا۔ اور اس میں اتنی قوت نہ تھی کہ وہ پانی کی گرفت سے آزاد ہو کر اپنی تمناؤں کے مرکز کو تلاش کر سکے۔ کیونکہ ابھی اس کا وقت نہیں آیا تھا۔

آخر وہ زمانہ آگیا جب حسن مجرد عشق سے ہم آغوش ہونے والا تھا۔ اور عشق حسن مجرد سے زندگی کا کیف حاصل کرنے کا منتظر تھا۔ جزیرہ حسن میں ایک صبح کو ہزاروں پیکر جمال حسن کی دیویاں پھولوں سے نمودار ہوئیں۔ اور ان مہ جبینوں نے نازک پھولوں سے بہت سی کشتیاں تیار کیں۔ اور ایک کشتی کو ضرورت سے زیادہ آراستہ کر کے پھولوں سے سجایا۔ حسن کو اس کشتی میں بٹھایا اور سمندر کا لطف حاصل کرنے کے لئے یہ حسین جماعت سمندر کی سطح پر تیرنے لگی۔

اس طرف بحر عشق میں سمندر کے قطروں سے ہزارہا جوان رعنا پیدا ہوگئے اور انھوں نے سمندر کی لہروں پر بیٹھ کر دنیا کی سیاحت کا ارادہ کیا ایک صاف شفاف خوشنما سمندر کی لہر پر عشق بیٹھا۔ اور اس کے بعد سمندر میں نہایت سکون کے ساتھ یہ لہریں عشق اور ہزاروں نوجوانوں کو لئے ہوئے آگے بڑھیں۔

آسمان پر ایک خوشنما ہلکا گلابی رنگ کا ابر چھایا ہوا تھا۔ اور اس ابر سے خوشنما پھولوں کی پتیاں سمندر پر برس رہی تھیں۔ دنیا کے تمام خوشنما پرندے رقص کر رہے تھے۔ فضا نے موسیقی کا ایک کیف پیدا کر دیا تھا۔ یہ وہ جگہ تھی جہاں حسن و عشق کا اتصال ہونیوالا تھا۔ حسن نے عشق کو اپنی طرف آتے ہوئے دیکھا عشق نے حسن کی جلوہ گری کا نظارہ کیا۔ اور حسن و عشق کے بیڑے اس سمندر میں جہاں پھولوں کی بارش ہو رہی تھی آکر ملے۔ حسن بیتابانہ عشق کی طرف بڑھا۔ اور عشق نے بیتابانہ حسن کی جانب رخ کیا حسن و عشق ایک دوسرے سے ملے۔ دونوں پر ایک بیخودی کا عالم طاری ہوگیا۔ یہ معلوم ہوتا تھا کہ جیسے وہ سالہا سال سے ایک دوسرے کیلئے بیتاب تھے حسن کی سہیلیوں نے عشق کے ساتھیوں کو پھولوں کی زینت بنایا۔ اور عشق کے ساتھیوں نے حسن کی سہیلیوں کی گردنیں بیتابانہ باہیں حائل کر دیں ایک عجیب کیف پیدا ہوئی اور فضا نے حسن و عشق اور حسن و عشق کے ساتھیوں کو اپنی آغوش میں لیکر تمام دنیا میں پھیلا دیا۔ یہ عشق اور حسن کی ابتدا ہے جس کے چرچے تمام دنیا میں سننے جا رہے ہیں۔ اور آج دنیا کا کوئی حصہ اس سے خالی نہیں ہے۔ اور یہ چرچے اسوقت تک رہیں گے جبتک دنیا باقی ہے۔ (دین و دنیا)

لالہ زاروں پر برستی ہے مئے نابِ جنوں ۔۔۔ چاند کی رنگیں شعاعیں ہیں کہ سیلابِ جنوں
حسن مخمورِ مسرت حسن معمورِ بہار ۔۔۔ عشق بربادِ تمنا عشق بیتابِ جنوں
جام کی رنگینیوں سے شمع کا لیتے ہیں کام ۔۔۔ کیف سے کرتے ہیں روشن دلکو اربابِ جنوں
جانتا ہوں میں کہ وحشت ہے مآلِ آرزو ۔۔۔ دیکھتا ہوں میں کہ خوابِ عشق ہے خوابِ جنوں
جوش آتا ہے بہارِ لالہ و گل دیکھ کر ۔۔۔ مٹ چکا ہے دل مگر قائم ہیں آدابِ جنوں
عشق کی بیتابیاں ہیں مجھکو سامانِ نشاط ۔۔۔ حسن کی رعنائیاں ہیں مجھکو اسبابِ جنوں
کر لیا دنیا کو آنکھوں نے تری مسحورِ ناز ۔۔۔ ہوگئی دنیا میں ارزاں جنسِ نایابِ جنوں
دیکھتا ہوں دل میں عابد پرتوِ انوارِ حسن ۔۔۔ ضوفشاں ہے مرے دل میں نورِ مہتابِ جنوں

عابد

ہندی

اے میرے مالک! رات گذر چکی ہے۔ صبح صادق کی سفیدی وسعت فلک پر نورانی چادر پھیلا چکی ہے۔ سیارے ساری رات کی گردش سے تھک کر چور ہو چکے ہیں۔ ان کی خواب آلودہ آنکھیں آہستہ آہستہ بند ہوتی جا رہی ہیں۔ باغوں میں کلیاں خواب عشرت سے بیدار ہو کر انگڑائیاں لے رہی ہیں۔ اور جوش طرب سے کھل کر پھول بنتی جا رہی ہیں۔ مگر میں بدنصیب ابتک محو انتظار ہوں۔

اے میرے پتی میں تجھے کہاں ڈھونڈوں! تیری تلاش میں کہاں کہاں نہ گئی۔ تیری جستجو میں کون کون سی جگہ نہ چھانی۔ میں نے کن بیابانوں کو طے نہ کیا۔ کن دریاؤں کو عبور نہ کیا۔ کن پہاڑوں پر نہ چڑھی۔ کن جنگلوں اور کن وادیوں میں نہ گھومی۔ مگر افسوس! تجھے نہ ملنا تھا نہ ملا۔ او مجھے بھول جانے والے اب تو خود ہی مجھ حرماں نصیب کی خبر لے۔ آ۔ اور میری دل کی پیاس کو شربت دیدار سے بجھا

بنگالی

یادِ محبوب

میرے پیارے! آؤ اور دیکھو کہ تمہاری۔ آہ! صرف تمہاری سندرا کسطرح اداس بیٹھی ہے، میرے دل کے دکھ کی دوا آؤ۔ اور اپنی آنکھوں سے دیکھو کہ وہ کتنی غمگین ہے۔ اسکے پھول سے گال زرد ہو چکے ہیں، اسکے خوبصورت بال بکھر کر پریشان ہو رہے ہیں۔ میری جان! آؤ۔ ذرا دم بھر کے لئے آؤ اور اسکی بری حالت دیکھ جاؤ

تمہاری جدائی کا غم میری جان کا روگ بن گیا ہے، میرا دل میرے اختیار سے باہر ہو چکا ہے۔ میری آنکھیں روتے روتے اپنا حسن کھو چکی ہیں، مگر آہ! اب بھی تمہاری آمد کے انتظار میں کھلی ہوئی ہیں۔ ان میں ابھی تک محبت جھلکتی ہے۔ مگر ہائے دل میرے اختیار سے باہر ہوا جاتا ہے۔ میں جتنا ضبط کرتی ہوں، اتنی ہی اسکی بے قراری بڑھتی ہے، میں جتنا اس کو روکتی ہوں، اتنا ہی رہ رہ کر تمہیں ڈھونڈتا ہے۔ میں چاہتی ہوں کہ دنیا کے رسم و رواج کو توڑ کر آزاد ہو جاؤں، جوگن بنکر چپہ چپہ چھان ماروں۔ اور تمہیں ڈھونڈ نکالوں یا راہِ طلب میں جان سے گزر جاؤں۔

میرا یہ خوبصورت گورا بدن میرے یہ سیاہ اور لانبے بال جنہیں تمہارا پیار ہمیشہ معطر کرتا رہتا تھا۔ آج تمہاری جدائی میں خاک آلودہ ہو رہے ہیں۔

میری یہ کالی ناگنیں یہ گھونگروالی زلفیں جنہیں تم چوما کرتے تھے آج تمہارے فراق میں فقیروں کی لٹوں میں تبدیل ہو گئی ہیں۔ میرا سینہ جس پر تم اکثر اپنا سر رکھا کرتے تھے، آج پیٹا جا رہا ہے۔ اف! میں نے اس قدر پیٹا ہے کہ ضرور پھٹ گیا ہوگا۔ پچھلی بہار کا تحفہ۔ گزشتہ محبت کی نشانی۔ فراموش شدہ پیار کی یاد۔ میری یہ چوڑیاں جو تم نے مجھے دی تھیں۔ اب فقیروں کے کڑے بنگئی ہیں۔ اور تھالی جس میں ہم تم کھایا کرتے تھے میرے در بدر بھیک مانگنے میں کاسۂ گدائی کا کام دیرہی ہے

میری جان۔ میرے دل آرام میں اس دنیا سے تنگ آگئی ہوں، جب تم ہی نہ رہے بھلا میرا یہاں کیا کام؟ میری ماں مجھے روکتی ہے۔ میرا حسن۔ میری جوانی۔ آہ! تمہاری دولت۔ تمہاری امانت مجھے باہر نہیں نکلنے دیتی۔ ورنہ میری دیوانگی کا تقاضا ہے۔ کہ اس دنیا کو چھوڑ کر تمہاری تلاش میں جنگل کی راہ لوں لیکن میں مجبور ہوں لاچار ہوں بے بس ہوں۔ مگر تمہاری یاد میرے دل سے نہیں نکل سکتی۔ میں تمہاری ہو چکی ہوں اور ہمیشہ کیلئے تمہاری ہو چکی ہوں۔ میں تمہاری یاد میں آنسو بہاتی ہوں اور ہمیشہ بہاؤنگی۔ مگر تم کیا مجھے بالکل ہی بھول گئے۔ میرے مالک۔ میرے پتی تم نہیں آسکتے تو کبھی کبھی سپنے ہی میں درشن دے جایا کرو۔

گجراتی

عالم جودی میں تیری مدہ بھری سُریلی آواز کو سنتی ہوں تو میرا دل بلیوں اچھلنے لگتا ہے۔ میرے مردہ جسم میں زندگی کی رو دوڑ جاتی ہے اسوقت تیری آواز ایسی بھلی معلوم ہوتی ہے کہ میرا سارا وجود مسرت کی دنیا میں کھو جاتا ہے۔

مگر آہ جب چونک اٹھتی ہوں تو یہ ساری باتیں خواب و خیال معلوم ہوتی ہیں۔ خوشی کے سال گھڑیوں میں گذر جاتے ہیں۔ مگر فراق کی گھڑیاں صدیاں معلوم ہوتی ہیں۔ تیرے انتظار میں ٹکٹکی باندھے بیٹھی ہوں۔ پلک جھپکانا میرے لئے حرام ہو گیا ہے۔ میرے مالک اب بھی تو آ +

تامل

اے سرمایہ دار و تم جو رات دن مکاریوں سیہ کاریوں حرام کاریوں سے دولت اکھٹی کرتے رہتے ہو۔ ان غریبوں کی دستبرد اور زمانے کی ہوا سے بچانے کیلئے زمین میں دفن کرتے جاتے ہو۔ یاد رکھو کہ ایک دن طائر روح قفس سے پرواز کر جائیگا تم مٹی کا ایک ڈھیر رہ جاؤ گے اور تمھاری دولت غریبوں ہی کے ہاتھوں میں چلی جائیگی

تلنگو

اگر تم سنسان جنگلوں اور ویران وادیوں کے باشندے ہو تو تمھیں جنگل کے خونخوار جانوروں کا ڈر کیسا؟

اگر تم سمندر کے کنارے پر بسنے والے ہو تو تمھیں لہروں کے بے پناہ سیلاب کا خوف کیوں؟

اگر شہروں کی گنجان اور پرشور محلوں کے رہنے والے ہو۔ تو تمھیں دلخراش آوازوں کی پروا کیسی؟

ہر حالت میں زندگی بسر کرنے کی خو پیدا کرو۔ جدھر ہوا کا رخ دیکھو ادھر ہو جاؤ شہرت اور بدنامی کو ٹھنڈے دل سے سننے کے عادی بن جاؤ ٭

مرہٹی

اگرچہ پروردگار عالم ظاہری وجود سے پاک ہے۔ مگر پھر بھی میری متلاشی آنکھوں نے اسکے پر جلال جلوے کو دیکھ لیا ہے۔ اسکی عظمت، اسکی شان کی تصویریں میرے دل کی آنکھوں پر کھچ چکی ہیں جنکو دنیا کے تمام توہمات بھی نہیں مٹا سکتے۔

اگرچہ الفاظ اسکے اوصاف نہیں بیان کر سکتے، اور استعارے اسکی کیفیت نہیں سمجھا سکتے پھر بھی وہ مجھ میں پنہاں ہے۔ تو چاہے تو اسکو دل کی آنکھوں سے دیکھ سکتا ہے۔ مگر پہلے اپنے میں شوق جستجو پیدا کر اور یقین کامل کی روشنی میں اسکی تلاش میں کھو جا۔

سنسکرت

مجھے اس سے محبت ہے، جو جمنا کے سرسبز کناروں پر ٹہلتا ہے جس نے کنس کو قتل کیا، جو برائیوں کا دشمن ہے،

مجھے اس سے محبت ہے، جسے برج کے تمام گوالے پیار کرتے ہیں، جسے گوپیاں محبت بھری شرمیلی آنکھوں سے تاکا کرتی ہیں۔

مجھے اس سے عشق ہے، جس کا سر مور کے نورانی پروں سے سجا ہوا ہے۔ جسکے خوبصورت بال گھنگریالے ہیں، اور جسکے سڈول بازو بڑے بھلے معلوم ہوتے ہیں۔ میں اس دیوتا کی پوجا کرتی ہوں جو تمام دکھوں کا علاج ہے جسکی بانسری مصائب و تکالیف کے تاریک پردوں کو چاک کر دیتی ہے

پالی

چار بار۔ نہیں! پانچ بار۔ میں اپنی کٹیا سے تلملا کر نکلی۔ میں مسرت کو ڈھونڈتی تھی۔ خوشی کو تلاش کرتی تھی۔ مگر آہ! یہ نعمت میری قسمت میں نہ تھی۔

بینے کھیتوں کی وسعت میں اسے ڈھونڈا، میں ان میں گھومی بار بار چکر لگایا۔ مگر میں نے قلب کی یکسوئی کو کہیں نہ پایا، آہ! خوشی مجھ سے کوسوں دور ہی رہی

ایک روز بیٹھے بیٹھے میرے دل کے منجدھار میں خواہشوں کا طوفان اٹھا

اُف! اسقدر بیتابی تھی؟ کتنی بے قراری تھی مگر سب بیکار گئی، اور میں خوشی کے پاس بھی نہ پھٹک سکی، ہاں میں نے دور سے مسرت کی دلہن کو دیکھا۔ اور حسرت سے ہاتھ ملکر رہ گئی۔

مایوس ہو کر میں نے مسرت کی تلاش ہی ترک کر دی، میری خواہشوں کا خاتمہ ہو گیا، میری امیدیں ابھر ابھر کر مٹ گئیں، کہ اچانک مجھے دائمی خوشی بخش دی گئی، میرا مالک مجھ سے خوش ہو گیا، اور اب میں مسرت کی دنیا میں بے فکری کے ساتھ گامزن ہوں ٭ (اقبال)

کشمیری

یہ عالم رنگ و بو مختلف انسانوں، متضاد طبیعتوں اور عجیب الخلقت انواع کے لوگوں کا مرکز ہے۔

ہزاروں ایسے ہیں کہ محو خواب ہیں پھر بھی انکے دل بیدار ہیں۔

لاکھوں ایسے ہیں کہ بظاہر ہوشیار ہیں مگر حقیقتاً خواب غفلت میں سرشار ہیں

لا انتہا ہستیاں ایسی ملینگی کہ وہ جمنا چھوڑ گنگا میں بھی اشنان کریں تو بھی وہ ناپاک ہی رہینگی

اور سینکڑوں ایسی شخصیتیں بھی ملیں گی جو دنیا میں منہمک رہ کر اور دنیاوی الجھنوں میں پھنس کر بھی پاک و صاف ہیں ♦

عربی

میں دیکھتا ہوں کہ سراب امید کی جھلکیاں تیرے ساتھ تمسخر کر رہی ہیں۔ اور تو امید موہوم کی بنا پر عظیم الشان قصروں کی تعمیر میں مشغول ہے۔ کیا تجھے کبھی یہ سوچنے کی توفیق نہیں ہوتی کہ اگلوں نے اس سے بڑے بڑے محل بنوائے تھے۔ مگر آخر وہ کیا ہوئے۔ اور اُن کی کوششوں کا انھیں کیا صلہ ملا۔ جا عاد و ثمود کی شکستہ قبروں پر جا اور پوچھ کہ اُن کے تخت و تاج کیا ہوئے۔ ان کی مضبوط بنیادیں کہاں گئیں۔ پوچھ کہ ان کا لاؤ لشکر کہاں گیا۔ ان کی ہما ہمی کدھر گئی۔ قصر شاہی کے وہ حور و غلمان کیا ہوئے۔ محافظ ہمیشہ ان کی حفاظت کیا کرتے تھے۔ مگر موت کے فرشتے کے سامنے کسی کی کچھ پیش کیوں نہ گئی۔ ہر شخص کی ہوس ختم ہو گئی۔ تیری ہوس کب تک نہ ختم ہوگی۔ فانی دنیا میں ہمیشہ باقی رہنے کی غلط آرزو میں اپنا عزیز وقت کیوں برباد کر رہا ہے۔ تجھے سیری نہیں ہوتی مگر سوچ تو سہی کہ یہ لا انتہا دولت تیرے بعد آخر تیرے کس کام آئیگی۔ جمع ہی کرنا ہے تو بھلائیاں کیوں نہیں جمع کرتا۔ جو دنیا میں تجھے دوامی زندگی بخشیں گی۔ اور آخرت میں بھی تیرے خالق کے سامنے تجھے سرخرو بنائیں گی

(المشرق۔ بیروت)

فارسی

دساتیر اور اوستا

ایران قدیم کا ذخیرۂ علمی و ادبی

اوستا ایران قدیم کی ایک مشہور کتاب ہے جو باختری زبان میں لکھی گئی ہے۔ ضرورت تھی کہ ایران علمی اور ادبی حیثیت سے اس کی طرف توجہ کرتا لیکن افسوس ہے کہ معاملہ اس کے بالکل برخلاف ہے۔

نہ صرف یہ کہ اس مشہور کتاب سے وہ لوگ ناواقف ہیں جن کو دوسرے مذاہب کی معلومات سے دلچسپی نہیں۔ بلکہ وہ لوگ جو ایران میں بحیثیت ایک مشہور ادیب اور فاضل کے روشناس ہیں انہوں نے بھی اب تک اس کی طرف توجہ نہیں کی۔

حالانکہ ایران کے فاضل ادیبوں کا یہ فرض تھا کہ وہ ایران کے قدیم اور جدید علمی کارناموں کو کوشش سے تلاش کرتے اور اُن کی بقا کے مسئلہ پر توجہ کرتے۔

آج ہم دیکھتے ہیں کہ ایران میں ایک شخص بھی ایسا موجود نہیں جو اوستائی، پہلوی یا کسی ایسی زبان سے واقف ہو۔ جس کا تعلق ایران قدیم سے ہے۔

لیکن اس سے بھی زیادہ قابل تعجب یہ ہے کہ بجائے اس کے کہ ہم اپنی قدیم زبانوں کے مسئلہ پر غور کرتے اور اوستا کی زندگی کے سوال کو اٹھاتے۔ ہمارے سامنے ایک نئی کتاب آجاتی ہے

اس کتاب کا نام دساتیر ہے اس کی زبان عجیب قسم کی ہے اور اس کو ہندوستان میں چھاپا گیا ہے۔

تعجب ہے کہ ایک مجہول الصفت کتاب کی طرف اہل علم حضرات دست طلب دراز کر رہے ہیں۔ اور اس کی اشاعت سے دلچسپی لے رہے ہیں اور اس کو ایران قدیم کی تاریخی۔ مذہبی اور لغتی معلومات کا ماخذ قرار دے رہے ہیں۔

سب سے پہلے ۱۷۷۸ء میں ملا کاؤس نامی ایک شخص اس کا ایک نسخہ ایران سے ہندوستان لے گیا اور ۱۸۲۲ء میں اس کے لڑکے مُلا فیروز نے انگریزی ترجمہ کے ساتھ اس کو چھاپ کر شائع کرا دیا ♦

لطف یہ ہے کہ ایران کے آخری دور کے ادیبوں نے اس بے اصل اور جعلی کتاب کی خوب قدر کی۔

حتیٰ کہ "دبستان المذاہب" کے مصنف نے تو یہ غضب کیا کہ ایران کے مذہب قدیم کے متعلق اس سے نتائج اخذ کئے۔

اس سے بھی زیادہ قابل افسوس یہ امر ہے کہ ماہرین لغت اور ایران کے ادیب لوگ بھی اس کو ایران کا صحیح اور اصلی لغت تصوّر کر رہے ہیں اور اس کے لغات کو فرہنگوں۔ اور لغات کی کتابوں میں داخل کر کے عوام کو گمراہ کر رہے ہیں۔ اس لئے ہم یہ کہہ سکتے ہیں کہ اگر متاخرین کے لغات میں کسی لفظ کی تحقیق کی جائے تو اس وقت تک اس پر یقین نہ کیا جائے جب تک متقدمین کے اشعار سے اس کے صحیح ہونے کی کوئی دلیل نہ مل جائے کیونکہ یہ عین ممکن ہے کہ جس لغت کی تم تحقیق کر رہے ہو وہ فرہنگوں میں دساتیر کی مصنوعی اور جعلی زبان سے لیا گیا ہو جس کے لغات سے متاخرین کی فرہنگیں بھری پڑی ہیں

کتاب دساتیر کو ہرگز وہ مرتبہ حاصل نہیں ہو سکتا جو اوستا کو حاصل ہے کیونکہ غالب خیال یہ ہے کہ یہ فرقہ اسمٰعیلیہ کی بنائی ہوئی کتاب ہے یہ یقین کرنیکے کافی وجوہ موجود ہیں کہ یہ کتاب بالکل من گھڑت۔ نقلی اور جعلی ہے۔ جس کا ایران کی قدیم ادبیات سے کوئی تعلق نہیں اس لئے ضروری ہے کہ ایران کے فاضل ادیب اور مؤرخ اس سے لغات کے استنباط اور تاریخی واقعات کے استخراج سے محترز ہیں۔

(کاوہ) حامد انصاری

ترکی

اے میرے بیٹو! تم امیر باپ کے لختِ جگر ہو۔ اُس کی آنکھوں کا نور اور سرور ہو، عیش کرو۔ خوشی کی زندگی بسر کرو تمہارے باپ کا دِل مردہ ہو چکا ہے۔ سفید بالوں کی سپیدی نے اُسکے جذبات کی گھنگور گھٹا کو روشن کر دیا ہے آہ! یہ دل جو کبھی عیش و عشرت کی جولانگاہ تھا آج اسمیں خاک اڑ رہی ہے، تم مجھے نہ چھیڑو۔ میرا خون سرد ہو چکا ہے اور تمہارا خون گرم ہے، جاؤ! تم زندگی کی سردی میں اپنے خون کی گرمی کو آزماؤ۔ یہ تمہارا وقت ہے۔ میں تمہیں نہیں رکھنا چاہتا۔ جاؤ میدانِ زندگی میں سرگرم عمل ہو جاؤ۔ اور مجھے میرے حال پر چھوڑ دو میں اسی میں خوش ہوں۔ وہ وقت اب خواب و خیال ہو گیا جب ہم عطر میں بس کر نکلا کرتے تھے۔ لوگوں کی انگلیاں ہماری طرف اٹھا کرتی تھیں دز دیدہ نگاہوں سے کسی کا دیکھنا اور دیکھ دیکھ کر مسکرانا دل میں ایک قیامت برپا کر دیتا تھا۔ اب مجھے پھولوں سے نفرت ہے۔ خوشبو سے نفرت ہے دوستوں کی محفلوں سے نفرت ہے۔ بلکہ مجھے خود اپنے سے بھی نفرت ہے۔

اب میں اپنے باقی دن سادگی میں گزارنا چاہتا ہوں۔ جاؤ۔ جاؤ مجھے نہ ستاؤ۔ موت کے پیغام کو لبیک کہنے کی تیاری میں لگا ہوا ہوں۔

قبطی

میری محبوبہ دریائے نیل کے اس پار رہتی ہے۔ اس سے ملنے کے لئے میرا دل بیقرار ہے۔ ہم دونوں کے درمیان پانی کا خوفناک اژدھا حائل ہے۔ مگر مچھ اپنے لذیذ شکار کی تاک میں چھپا بیٹھا ہے مگر میری محبت ان چیزوں کو خاطر میں نہیں لاتی۔ محبوبہ سے ملنے کی آرزو نے مجھے نڈر بنا دیا ہے۔ ہاں۔ محبوبہ نے سلامتی کے ساتھ دریا عبور کرنیکے لئے ایک تعویذ بھی تو دیر کھا ہے۔ پھر مجھے خوف کیسا۔ میں دریا میں کودتا ہوں۔ . . . . لہریں میرے پاؤں تلے خشک ریگ سی معلوم ہو رہی ہیں۔ اے محبت میرا ساتھ نہ چھوڑ! تیری ہی وجہ سے مجھ میں دس گنی طاقت پیدا ہو گئی ہے۔ اپنی محبوبہ کے تعویذ کی برکت سے میں صحیح سالم پار اتر جاؤنگا۔ وہ تعویذ کیا ہے۔ اسکی صبح صادق جیسی پاک محبت۔

جاوی

زندگی کی کشمکش سے دور دنیا کے ہنگاموں سے الگ میں نے اپنی جھونپڑی بنا رکھی ہے۔ دنیا کی آرزوؤں، اور نفسانی خواہشوں کا وہاں تک گزر نہیں ہوتا۔ میری جھونپڑی خوشی راحت اور اطمینان کا گہوارا ہے میرا گھر آمد و رفت اور میل ملاپ کی قیود سے آزاد ہے۔ اسکے گرد آسمانی فرشتوں کی جماعت طواف کرتی ہے۔ اسکے اندر مالک حقیقی کا نور جلوہ گر رہتا ہے۔ شاید تم نہیں جانتے میری جھونپڑی میرا دل ہے۔

بابلی

(اب سے پانچ ہزار سال پہلے کی اہل بابل کے خطِ میخی کی ایک لوح پر لکھی ہوئی مناجات)

اے خدا میرے گناہ بہت بھاری ہیں۔ میں نے حرام چیز کھائی ہے میں جن گناہوں کا مرتکب ہوتا ہوں مجھے انکی خبر ہو جاتی ہے۔ خدایا مجھ سے خفا ہو کر میرے پاس سے واپس نہ جا۔ اور مجھے معصیت کی تاریکی میں پھنسا ہُوا نہ چھوڑ۔ تیری مدد کے بغیر میں اپنے کو کیسے بچا سکتا ہوں۔ تو میرا خدا ہے میں تجھی سے فریاد کرتا ہوں اور تیرے ہی حضور میں اپنی دعا پیش کرتا ہوں۔ خدایا اپنے خادم ستائے کو میری نگرانی کے لئے بحال کردے۔ گناہوں کے خوفناک سیلاب میں بہا جا رہا ہوں تو میرا ہاتھ پکڑ اور میرے گناہوں سے درگزر کر کے مجھے برکت دے۔ خدایا ہوا کو حکم دے کہ میری خطاؤں کو اڑا لے جائے۔ اے خدا آسمان میں تجھ سے بڑا کون ہے؟ تو ہی سب سے بڑا ہے۔ زمین پر تجھ سے کون بڑا ہے؟ تو ہی تو ہے۔ آسمان پر تیری آواز کڑکتی ہے تو سارے دیوتا فرشِ خاک پر گر جاتے ہیں۔ زمین پر تیری آواز گونجتی ہے تو روحیں خاک چاٹنے لگتی ہیں۔ دیوتا جو تیرے بھائی ہیں انہیں تجھ جیسا کون ہے؟ تیرے حکموں کو ٹالے کِسکی مجال ہے؟ تیرا کون مقابلہ کرسکتا ہے۔ اے خدا۔ اے میرے خالق تو ہی مجھے سہارا دے تو میرے منہ کے دروازے پر نگہبان رہ۔ اور میرے ہاتھوں کو بدکاریوں سے محفوظ رکھ۔ تو نور کا خدا ہے۔ ✦

~~~~~~

یونانی

دیدارِ الٰہی کا شوق ہے تو چشمِ بصیرت کھول۔ اپنی تمام قوت سے اپنے دل کی آنکھ کو اس پر جما دے۔ اور دلیری سے اس وقت تک ٹکٹکی باندھے رکھ جبتک کہ ساری کائنات کے فرمانروا کو نہ دیکھ لے۔ ان فانی آنکھوں کی فانی پتلیوں سے تو اُسے نہیں دیکھ سکتا۔ اسکے ارد گرد بادل کا حلقہ ہے۔ تیری یہ کمزور آنکھیں تو زمین کو بھی نہیں دیکھ سکتیں۔

روسی

کاش! اموتیوں کے انبار، سونے کی اینٹیں، ریشمی لباس، حسن کی جلوہ افروزیاں، مسخر القلوب تقریریں، انقلاب انگریز تحریریں، نوبہارانِ ناز کی ادائیں میرے دلکی تسلی کا باعث بن سکتیں۔

کاش! یہ مدبر اصحاب یہ شہرۂ آفاق ہستیاں، یہ حسین چہرے، یہ دلوں کو مسحور کرنے والے مقرر۔ یہ خوابیدہ جذبات کے جگانے والے مصنف محبت بھرا دل بھی رکھتے۔

کاش! انکے سینے الفت و پیار کی روشنی سے منور ہوتے اور کاش انکے دل پاک محبت کے چشموں کا مخزن ہوتے، مگر افسوس! صد افسوس! یہ تمام حسین شکلیں، یہ سارے رہنما، یہ خضر صورت ہستیاں اور نیکی کے یہ پُتلے بے لوث محبت سے بالکل خالی ہیں، یہ ظاہری شان و شوکت کے دلدادہ نام و نمود پر مٹے جارہے ہیں۔

میں ان سے تنگ آگیا ہوں۔ میرے دلکی آنکھوں نے ان کے پوشیدہ جذبات کو اچھی طرح دیکھ لیا ہے دنیا انہی بدمذاقوں سے بھری ہوئی ہے اسلئے میں دنیا ہی سے اکتا گیا ہوں۔ کاش! میرا مسکن وہاں ہو، جہاں سبزہ لہلہاتا ہو۔ پھول کھلتے ہوں۔ فضا مہکتی ہو جہاں گھنے درختوں کی قطاریں اپنی بہار دکھا رہی ہوں۔ جہاں پہاڑ نالے اپنے دلکش نغموں سے ساکن فضا میں غلغلہ برپا کر رہے ہوں اور جہاں خوش الحان چڑیوں کے جانفزا ترانوں نے دھوم مچا رکھی ہو۔

بس الوداع! اے جہاں بے رنگ و بو کے بسنے والو! الوداع! الوداع! اے ظاہر پرست انسانو! الوداع الوداع! اے دنیا کی مرغوب ترین چیزو! الوداع الوداع! اے بدی کی شاہراہو! الوداع! میں تم سے اکتا گیا ہوں اور اب پہاڑ کی خاموش چوٹی سے تمہاری بدنصیبی، بے بسی، مکاری، ظاہر پرستی، اور تمہاری خود غرضی، کو ایک معنی خیز نظر سے دیکھ کر صرف مسکرا دیا کرونگا ✦

سندھی

عورت جب ایک بار ہمارے تصور پر قبضہ پالیتی ہے۔ تو پھر ہم کو ہر طرف اسی کا جمال نظر آتا ہے۔ پہلے اسکے ابرو کی دلفریبی اپنا گرویدہ بنالیتی ہے پھر اس کی سیپیں آنکھیں ہم پر ڈورے ڈالتی ہیں پھر اسکی شرم و حیا ہمیں فریب دیتی ہے۔ اسکے بعد اسکا کھلکھلا کر ہنسنا اور اس کی پیاری ادائیں ہمیں اپنا مفتوں بنالیتی ہیں ✦
~~~~~~

چینی

میرا دل تو جوں کا توں ہے۔ مگر نہ معلوم تمہارا دل کیوں پھر گیا۔ میں تین سال تک تمہاری بیوی رہی۔ اور تم کو آرام پہنچانے کے لئے اپنا خون پسینہ ایک کر دیا۔ صبح سب سے پہلے اُٹھتی۔ رات کو سب کے بعد سوتی۔ میں نے اپنے عہد کو دل و جان سے نباہنے میں کبھی دریغ نہ کیا۔ مگر تم نے جو اقرار کئے تھے وہ اب جھوٹے ثابت ہو رہے ہیں۔ میں اپنے بھائیوں کو صورت حال سے آگاہ نہیں کرتی اور اندر ہی اندر جلتی اور کُڑھتی ہوں۔ کتنا اچھا ہوتا کہ ہم دونوں خلوص کے ساتھ مل کر اپنے مستقبل کی تعمیر میں مشغول ہوتے۔ مگر افسوس! ایسا معلوم ہوتا ہے کہ تنہائی ہی میری قسمت میں لکھی ہوئی ہے۔ —— ہم دونوں دریا کے کنارے کیسے مزے کی سیر کیا کرتے تھے۔ اور اس وقت ہم جو باتیں کرتے تھے وہ کتنی سچی معلوم ہوتی تھیں۔ اس وقت میرے سان گمان میں بھی یہ نہ آتا تھا کہ تم عہد وفا کو یوں بھول جاؤ گے۔ اور مجھے جُدائی کے یہ دن دیکھنے پڑینگے اور رو رو کر زندگی گذارنی ہوگی۔

جاپانی

بہار کا خوشگوار موسم ہے۔ ہر شخص مسرور نظر آ رہا ہے مگر میرے دل کے زخم اور بھی ہرے ہو گئے ہیں۔ میری کائنات میرے شور گریہ میں کھو گئی ہے۔ مجھے اپنے نالہ و شیون کے سوا اور کوئی صدا سنائی نہیں دیتی۔ جسطرح ریشم کا کیڑا اپنے خول کے اندر بند پڑا رہتا ہے اسی طرح میں بھی اپنے جگر شگاف آہوں کے حلقے میں بیٹھا آنسو بہا رہا ہوں۔ رات کے سیاہ پردے پھیلتے جا رہے ہیں اور میری سفید آستین آنسوؤں سے تر ہوتی جا رہی ہے۔ کسی سے بولنے کو میرا جی نہیں چاہتا۔ اپنے محبت کی دردناک داستان کس کو سناؤں میرا دل تیرے لئے بے قرار ہے۔ اگر تیرا دل بھی میرے لئے بے چین ہے تو تاخیر اور یہ حیلے بہانے کیوں ہیں۔ کوئی راہگیر اس آہ و زاری کی وجہ پوچھ بیٹھا تو تو ہی بتا کہ کیا جواب دونگا۔ کہیں تیرا پیارا نام منہ سے نکل گیا تو میرے چہرے کی شرم آلود کیفیت سے ہماری محبت رسوا ہو جائیگی۔ مگر نہیں۔ ایسا نہیں ہو سکتا۔ میں کہدونگا کہ چاند دیکھنے کے لئے بے چین ہو رہا ہوں جو اس پہاڑی کے پیچھے سے نمودار ہو رہا ہے۔ راہگیر تو مان جائے گا مگر میرا دل تیرے بغیر کیسے مان سکتا ہے!

فرانسیسی

قسمت

ابتدائے ازل سے عام لوگ یہ کہتے آئے ہیں۔ کہ قسمت بھی ایک پوشیدہ طاقت ہے، انسانی خیالات، انسانی جذبات، انسانی دماغ، انسانی عقل و فہم کو انسانی حوادثات میں کوئی دخل نہیں، کشتئ حیات حوادث میں قسمت ہی کے بے پناہ تھپیڑوں کے بس میں ہے، مصائب کی بھیانک راتوں میں قسمت ہی انسان کی مددگار ہوتی ہے۔ انسانی ادراک کی پرواز صرف معمولی واقعات کی سطح تک ہوتی ہے اور اسکے آگے انکی رسائی امر محال ہے۔ دنیا کے تمام واقعات صرف قسمت ہی کے ممنون ہیں عدل و انصاف کا انسانی دنیا میں کوئی دخل نہیں۔ جو ہوتا ہے وہی ہوتا ہے۔ اور جو ہونے والا ہے وہی ہوگا۔

مگر عقلمندوں کے نزدیک قسمت کوئی چیز نہیں یہ صرف انسانی توہمات کی تصویر کا ایک رُخ ہے یہ صرف لفظوں کا مجموعہ اور انداز بیان کا ہیر پھیر ہے۔ ہم بزرگوں کے مقولوں داناؤں کی تدبیروں اور اگلوں کے خیالات کی پیروی اُسی حد تک کرتے ہیں جہاں تک اُن سے ہم کو فائدہ پہنچ رہا ہو، انکی اُسی وقت تک قدر کیجاتی ہے جب تک وہ خوشی راحت اور آرام و آسائش کا باعث بن سکیں اور اگر وہی باتیں تکالیف و مصائب کا ذریعہ بنجائیں تو یہ ہماری قسمت کا قصور ہم اپنے مقاصد کی تکمیل میں کامیاب ہو جاتے ہیں تو اس کامیابی کو اپنے شب و روز کی محنت کا ثمر بتاتے ہیں ناکام رہیں تو اسکو قسمت کے سر تھوپ دیتے ہیں (اقبال)

انگریزی

فنّ مصوّری کے متعلق ایک [illegible] خیالات

بعض اوقات انسان کو اپنے معتقدات میں یکسر تبدیلی کرنا پڑتی ہے۔ مجھے یاد ہے کہ میں کہا کرتا تھا "مصوری اپنے عروج کے آخری زینہ تک پہنچ چکی ہے۔ کوئی ایسی جمیل شے نہیں جس کو مصور کے موقلم نے غیر فانی نہ بنا دیا ہو۔ کوئی ایسا حسین منظر نہیں جسے انسان کی چابکدستی نے فطرت کے خزانے سے چرا نہ لیا ہو۔ نقوش و رنگ کا کوئی ایسا مجموعہ نہیں جو کاغذ پر منتقل نہ ہو چکا ہو۔ یہ صنعت اب انحطاط و زوال کی طرف جا رہی ہے:

یکایک ۳۰ سال کی عمر میں مجھے محسوس ہوا کہ میری روح الفاظ کے علاوہ کسی اور مظہر کے تلاش میں سرگرداں ہے میرے احساسات حروف کے مجموعے میں اپنی نہ ختم ہونے والی تشنگی کو سیراب نہیں کر سکتے۔ اور نقوش کے پُراسرار موزونیت میں گم ہو جانا چاہتے ہیں۔

میں نے بارہا اپنے آپ سے سوال کیا ہے۔ کیا وجہ ہے کہ میری روح اظہار احساس کے لئے رنگ آمیزی کی محتاج ہے؟ ۲۰ سال کے عرصے سے میری شخصیت مترنم الفاظ کے آبشار میں کھو جاتی رہی ہے یکایک میری روح کو اس شیریں موسیقی سے کیوں دلبستگی نہیں رہی؟

لیکن دنیا میں اکثر ایسا ہوتا ہے۔ گردش روزگار انسان کی تدبیر سے متاثر نہیں ہوتی۔ اور جو کچھ ہم چاہتے ہیں اکثر اس کے خلاف ظہور پذیر ہوتا ہے۔

بارش ہو رہی تھی۔ اور مجھے اپنے کمرے میں سے باغ کا کچھ حصہ نظر آتا تھا کائنات پر ایک افسردگی سی چھائی ہوئی معلوم ہوتی تھی ایسا محسوس ہوتا تھا گویا مینہ کی بوچھاڑ گلہائے نازنین کو طمانچے مار رہی ہے۔

اتنے میں ایک شکستہ حال فقیر نے دروازے پر دستک دی۔ اس طوفان باد و باراں میں دروازہ نہ کھولنا گویا اس کے قتل میں معاون ہونے کے برابر تھا۔ وہ اندر داخل ہوا۔ اس کے پاس تصویری کینوس (canvas) کے چار ٹکڑے تھے۔ نہایت صاف دودھیا رنگ۔ میں نے انہیں خرید لیا۔

کچھ رنگ۔ اور چند موقلم بافراط میرے پاس موجود تھے۔ میں ایک ٹکڑے کو سامنے لیکر بیٹھ گیا۔ اسوقت کے احساسات کی تشریح نہیں ہو سکتی۔ موقلم کو رنگ میں ڈبو لیا۔ اپنے خیالات کا ایک دھندلا سا خاکہ میں اس طرح کھینچ سکتا ہوں اور یہ کہوں کہ میرے سامنے ایک بحر ذخار تھا۔ اور میں ان میں غوطہ زن ہونا چاہتا تھا۔ خدا جانے مجھے سمندر کی تہ میں خوفناک آبی جانوروں سے پالا پڑیگا یا کوئی جگمگاتا ہوا لعل بے بہا ہاتھ آئیگا۔

اس بحر ذخار میں غوطہ لگا کر انسان فوراً اپنی جان بچانے کے لئے دیوانہ وار ہاتھ پاؤں مارتا ہے۔

اس میں کوئی شک نہیں کہ ایک ماہر مصور کی تیز نظر ہر ایک فنی اصول کی خلاف ورزی کو ایک ناقابل معافی گناہ تصور کرتی ہے۔ اور ایک تیز سوئی کی طرح عیوب کو کرید کر نکال لیتی ہے۔

مگر یہ بھی ایک حقیقت ہے کہ مصوری کے شاہکار مشق اور صنعتی اصولوں کے پیروی سے تخلیق نہیں کئے گئے۔ بلکہ وجدان ذوق کے کیف آفریں اثرات کا نتیجہ ہیں۔ میری پہلی تصویر "ایک مقدس خاندان" محض ایک وجدانی کیفیت کی آواز بازگشت ہے۔ یہ تصویر آدھ گھنٹے میں مکمل ہو گئی۔ ایک معمر شخص ایک ادھیڑ عمر کی عورت۔ ایک بچہ نیلگوں لباس پہنے ہوئے کمرے فضا میں کچھ تاریکی سی۔ عصر حاضرہ "واقفیت" کے اعتبار سے حیرت انگیز ہے۔ ہم سب کچھ جانتے ہیں۔ لیکن ہمارے احساسات بالکل مردہ ہیں۔ شاید ہی کوئی ایسا شعلہ بدامن جذبہ ہوتا ہو جو ہمارے دل میں کوئی شرار احساس مشتعل کرتا ہو۔

مصوری کا فن بھی اسی مردہ دلی کا شاکی ہے۔ فن کے متعلق نظرئے قائم کئے جاتے ہیں مگر کوئی شخص فن کی روح کو واضح نہیں کر سکتا۔ شاید یہی وجہ ہے کہ مصوری میں "شاہکار" ایک لفظ بے معنی ہو گیا ہے۔ آجکل کا فن نقوش و سطوح کے ایک مہمل مجموعے کا نام ہے۔ میں کہتا ہوں نظرئے قائم کئے جاؤ مگر جب کسی حسن و جمیل شے کے عکاسی کرنے لگو تو سوائے اپنے احساسات کے دنیا کی ہر شے کی طرف سے اپنی آنکھیں بند کر لو۔

میں اصول فن کا قائل نہیں - شاید میں "مصوّر" نہیں - مگر اتنا میں بلاخوف تردید کہہ سکتا ہوں کہ میں تصویر کھینچ سکتا ہوں - اور میرے لئے یہی کافی ہے -

ہزارہا مصوّر ایسے ہیں جو "کیوتیں" کے [illegible] لیکن مصوّری سے انہیں کوئی تعلق نہیں - وہ "کینوس" پر [illegible] سکتے ہیں - نادر رنگ آمیزی کر سکتے ہیں - مگر ان کے نقوش میں [illegible] وہ شعلہ جو صفحہ تصویر کو ازل سے روشن کرتا ہے [illegible] "مسرت" کی چمکتی ہوئی بجلی نہیں - یا "غم" کی گہری ظلمت نابود ہے - تو گویا تصویر مردہ ہے -

"مصوّر" ہونے کے لئے ضروری ہے کہ انسان کی رُوح میں جلا ہو - ورنہ اصطلاحی اصول اور فنی نکات بالکل بے کار ہیں - صنعت کے ہر مدرسے کے دروازے پر یہ لکھ دینا چاہیئے - "مبارک ہیں وہ لوگ جن کی روح مجلی اور روشن ہے - کیونکہ آسمانی بادشاہت انہیں کی ہے"

یہ ضروری نہیں کہ "مصور" خوش اخلاق ہو - یا "زہد" کے امتیاز سے زبان زد خلائق ہو - اگر وہ ایک سیب کی تصویر اس طرح کھینچ سکتا ہے کہ اس کا "رنگ" "زندگی کے جوش سے جگمگا اُٹھے - تو یقیناً" اس کی رُوح کو "مجلی" کہنا پڑیگا -

"روح کی جلا" "نیکی" کی ہم معنی نہیں - لیکن اس سے متضاد بھی نہیں - "رُوح کی جلا" تو ایسی شے ہے کہ اس کے ڈانڈے "الوہیت" سے ملے ہوئے ہیں -

"الوہیت" فطرت کی حقیر اشیا میں بھی جلوہ گر ہوتی ہے - مجھے تو یہ شے گلاب کی نازک گلابی پتیوں اور ان کی زوال پذیر فطرت میں متاثر ہو کر کسی گلاب کے پھول کی تصویر کھینچوں تو یقیناً وہ مصوری ہے - ورنہ نقالی سے زیادہ نہیں - کاش صنعتی مدرسوں میں مدرس بجائے یہ کہنے کے

"یہ نقوش غلط ہیں - متوازی نہیں - بے پروایانہ انداز سے کھینچے گئے ہیں"

یہ کہا کریں "یہ نقوش ذوق سلیم کے منافی ہیں - انہیں "زندگی" کی تڑپ نہیں ہے" -

افسوس ہے کہ صنعت کو ایک سائنس تصور کیا جاتا ہے - حالانکہ صنعت مذہب کا ایک شعبہ ہے - جس "دس احکام" کی پیروی اشد ضروری ہے - صنعت ایک کامل وحدت ہے جو ایک درمیانی کڑی کی طرح "تخلیق" اور "خالق" میں ایک نہ ٹوٹنے والا رشتہ قائم کرتی ہے - (ماخوذ سٹوڈیو)

جرمن

یہ زندگی - ہاں یہ خوشتر زندگی موت سے کم نہیں - اگر اشعار کی چاشنی سے لطف اندوز نہ ہو - شعر خوابیدہ جذبات کا ترجمان ہے - حسیات کے خاموش ستار کے لئے مضراب ہے - شعر فطرت کے پوشیدہ جمال کا آئینہ ہے - اور شاعر اس کا راز دار - شعر ابد اور ازل کے واقعات کا خزینہ ہے - شعر انسانی خیالات کی تصویر ہے - شعر ہم کو دائمی بہار عیش وعشرت کے زمانے - خوشی و مسرت کی دنیا - اور لازوال حسن کی کائنات بخش دیتا ہے - کسی وارفتہ سے پوچھو کہ شعر کیا ہے؟ شعر آئینہ ہے تصویر حسن کا - شعر شوخی ہے تحریر الفت کی - شعر قطرہ ہے خون جگر کا - اور شعر دفتر ہے اثر و تاثیر کا - شعر پیکر فرقت کا نالہ بھی ہے اور لطف انتظار کی شرح بھی - شعر ہی تنزل کی دوا ہے - اور مردہ قوموں کے لئے صور اسرافیل بھی +

تبصرہ

سیر عراق: ۔ دنیا کے قدیم تمدن کا مرکز ہونیکی حیثیت سے عراق کا جو مرتبہ ہے مدت ہوئی اس کا اندازہ ایک حد تک الہامی کتابوں اور آسمانی صحیفوں سے کر لیا گیا تھا مگر اب علوم و فنون کی ترقی اور آثاریات (آرکیالوجی) کے ماہروں کی کوششوں سے اس کے پنہاں گوشے بھی نمایاں ہو چکے ہیں۔ کلام الٰہی اور جدید تحقیق کی مطابقت نے اہل ایمان کے لئے روحانی تسکین اور اپنے مذہب کی حقانیت کی مزید تصدیق کا سامان مہیا کر دیا ہے۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ مشرق کا یہ خطہ قدرت کے جلال و جبروت اور فطرت کی نیرنگی کا ایک مظہر ہے۔ کتنے بڑے بڑے ناموراس سرزمین سے اٹھے مگر آخر فنا ہو کر کس طرح گمنامی و بے نشانی کے پردے میں چھپ گئے۔

اسلام نے بھی اس سرزمین میں پہنچکر کوئی معمولی ترقی نہیں کی۔ اسلامی علوم و فنون کے آفتاب کے لئے یہی خطہ خط نصف النہار ثابت ہوا مگر اسلام کی خونی روایتیں بھی سب سے زیادہ اسی سرزمین میں دفن ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ اسکی سیاحت متضاد کیفیات کی حامل ہوتی ہے۔ کلدانیوں کے آثار۔ بخت نصر کی یادگاریں۔ سکندر کی عظمت اور اس کے قبر کی بے نشانی انسان کو مرعوب کر دیتی ہے۔ ہارون و مامون کی یاد۔ علوم و فنون کی تابانی کا خیال۔ اسلامی تہذیب و تمدن کی سرزمین کی زیارت طبیعت میں مسرت اور جوش کی ایک لہر دوڑا دیتی ہے۔ مگر اس کے ساتھ ہی شہدائے اسلام اور ائمۂ کرام کی خونیں داستان کے منتشر اوراق خون کے آنسو بہانے پر مجبور کر دیتے ہیں۔ در و دیوار شجر و حجر بلکہ اس کائنات کا ایک ایک ذرہ انسان کو حق پرستی اور ایثار و قربانی کی دعوت دینے لگتا ہے۔ اور کچھ بھی نہ ہو تو کم سے کم اس خطۂ پاک کی سیاحت کرنے والا فطرت کی چگونگی کا بچشم خود مطالعہ کر کے اپنے میں ایمان و ایقان کی ایک پائدار اور تسلی بخش کیفیت محسوس کرتا ہے۔ لاکھوں آدمی جب دنیا کی آلائشوں سے گھبرا اٹھتے ہیں تو روحانی تسکین کی گراں مایہ جنس کی تلاش میں اسی منبع کی طرف دوڑتے ہیں۔

نارتھ ویسٹرن ریلوے مبارکباد کی مستحق ہے کہ اس نے شائقین کی سیاحت کیلئے ایک بے نظیر پروگرام تیار کیا ہے اور کرسمس کی چھٹیاں عراق کی مقدس سرزمین کی سیر و سیاحت میں گزارنے والوں کے واسطے برٹش انڈیا سٹیم نیویگیشن کمپنی اور عراق ریلوے سے ملکر ہندوستان سے عراق تک کے سفر کا سامان مکمل کر دیا ہے۔ سیاحوں کی آسانی کیلئے اخراجات کی پوری تفصیل کے علاوہ اس تاریخی سیاحت کے مشہور مقامات کی مختصر مگر جامع تاریخ بھی ایک رسالے کی شکل میں جمع کر دی ہے۔ یہی رسالہ اسوقت ہمارے زیر نظر ہے۔ اسمیں بصرہ۔ بغداد۔ کربلائے معلےٰ۔ نجف اشرف۔ کاظمین شریفین۔ بابل۔ کش۔ حضرت ابراھیم خلیل اللہ کے مولد شہر اُر وغیرہ کی قدیم و جدید کیفیت نہایت شگفتہ زبان میں بیان کیگئی ہے۔ یہ رسالہ پبلسٹی آفیسر نارتھ ویسٹرن ریلوے لاہور سے مفت مِلسکتا ہے۔

"دین دنیا": یہ رسالہ ۱۹۲۱ء سے دہلی سے نکل رہا ہے اور اس نے اسلام اور مسلمانوں کی خدمت کے ساتھ ہی اردو کی ادبی خدمت میں بھی بڑا حصہ لیا ہے۔ کلام الٰہی کے اسرار۔ مدنی کا فلسفہ عارفانہ سرسنیاں حافظ کا میکدہ۔ گلستاں کے پھول۔ علم و عمل وغیرہ اس کی مستقل سرخیاں ہیں۔ انشاء لطیف کے ماتحت جو چیزیں لکھی جاتی ہیں ان میں ادب کی چاشنی کے علاوہ غور و فکر اور عبرت و بصیرت کا کافی سامان مہیا کر دیا جاتا ہے۔ تقریباً ہر پرچے میں التزام کے ساتھ دلچسپ انداز بیان میں مغربی تہذیب و تمدن کے "برکات" پر روشنی ڈالکر مشرق کو اس کی آفتوں سے بچانے کی کوشش کی جاتی ہے۔ چند صفحات صنف نازک کے لئے مخصوص ہیں۔ جن کے ذریعے سے بہو بیٹوں کو مذہبی، اخلاقی اور معاشرتی تعلیم دیجاتی ہے۔ اور انہیں نسوانی ذمہ واریوں کو محسوس کرنے اور ان کو خوش اسلوبی کے ساتھ انجام دینے کے طریقوں کی رہنمائی کی جاتی ہے۔ اس کے چھوٹے چھوٹے دلکش افسانے بھی بڑے دلچسپ اور عموماً اخلاقی ہوتے ہیں "علم و ادب کی روح" کی سرخی کے ماتحت ہر مہینے ہندوستان بھر کے رسایل کی روح کھینچکر رکھدی جاتی ہے۔ وقتی سیاست پر بھی اسلامی نقطۂ نظر سے بحث کیجاتی ہے۔ ہر پرچے میں کم سرمایہ والوں کے لئے روزی حاصل کرنے کے چار پانچ آسان طریقے بتائے جاتے ہیں۔ مختصر یہ کہ ۸۸ صفحے کے اس رسالے میں دین و دنیا کے متعلق اتنا کچھ بھر دیا جاتا ہے کہ اس سے زیادہ ممکن ہی نہیں۔ عام طور پر مذہبی رسالے زبان کی صحت اور اسلوب بیان کی جدت کا خیال نہیں رکھتے مگر دین و دنیا کے ایڈیٹر مفتی شوکت علی فہمی مبارکباد کے مستحق ہیں کہ انہوں نے مذہب اور ادب دین اور دنیا کو کامیابی کے ساتھ ایک جگہ جمع کر کے نہ صرف اردو کی

خدمت کی ہے بلکہ اُن لوگوں کے لئے اسلام کے مطالعے کا سامان کر دیا ہے۔ جو خشک مذہبی رسائل اور ان کی شکستہ اور پراگندہ زبان کے پڑھنے سے گھبراتے ہیں۔ رسالے کی ظاہری شکل و صورت بھی بیسیوں میں ایک ہوتی ہے۔ اگرچہ کتابت بہت باریک ہوا کرتی ہے مگر صاف ستھری ہونے کی وجہ سے پڑھنے میں دقت نہیں ہوتی۔ کاغذ سفید اور چکنا لگایا جاتا ہے۔ بلاک کا چھپا ہوا رنگین ٹائٹل ہر دیکھنے والے کو رسالے کے مطالعے کی دعوت دیتا ہے۔ ان تمام خوبیوں کے باوجود قیمت قابلِ تعجب حد تک کم یعنی صرف دو روپیہ سالانہ ہے۔

"چمن" - یہ ادبی رسالہ مسٹر چمن لال سیوک کے زیرِ ادارت تین سال سے امرتسر سے نکل رہا ہے۔ پہلے صرف نومشق شاعروں اور نوجوان مضمون نگاروں کی جدت طرازیوں کا نمائندہ سمجھا جاتا تھا۔ مگر جب سے سردار پورن سنگھ ہنر کی نگرانی میں آیا ہے۔ بڑے بڑے کہنہ مشق مشاہیر کے مضامین بھی اس میں نظر آنے لگے ہیں۔ اور موجودہ علمی و ادبی حیثیت کے لحاظ سے پنجاب کے بہت سے پرانے رسالوں سے بھی بڑھ گیا ہے۔ اور اس کی تدریجی ترقی کو دیکھتے ہوئے ہمیں امید ہے کہ آئندہ بھی روز بروز اس کا معیار بلند ہوتا جائیگا۔ لکھائی۔ چھپائی۔ کاغذ ہر چیز اعلے درجے کی ہے۔ ٹائٹل بھی دیدہ زیب ہے۔ ہر پرچہ ۲۰×۳۰/۸ کے ۸۴ صفحات پر شائع ہوتا ہے۔ فوٹو بلاک کی دو ایک تصویریں بھی ہوتی ہیں۔ سالانہ چندہ ۱۲/۶ رہے۔

ص...